تفسیرِ کبیر

مُصنّفہٗ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود

رضی اللہ عنہٗ

جلد چہارم

مشتمل بر

نظارت نشر و اشاعت قادیان

الفہرست

نوٹ :۔ تفسیر کبیر کا یہ حصہ پہلی بار ۱۹۴۱ء میں قادیان سے سورۃ یونس کے ساتھ طبع ہؤا تھا۔

سُوْرَۃُ الْحِجْرِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ الحجر ۱۵ یہ سورۃ مکی ہے

وَھِیَ مَعَ الْبَسْمَلَۃِ مِائَۃُ اٰیَۃٍ وَّ سِتَّۃُ رُکُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی ایک سو آیات ہیں۔ اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

(میں) اللہ (تعالےٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

(سورہ مکی ہے)

۱۵ بحر محیط میں ہے۔ ھٰذِہِ السُّوْرَۃُ مَکِّیَّۃٌ بِلَا خِلَافٍ۔ خدا کی قدرت ہے کہ اس سورۃ میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی شان ہی اس سورۃ کے مکی ہونے سے بڑھتی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے ایسا تصرف کیا کہ اسے مکیہ بلا اختلاف قرار دلوا دیا۔

(اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق)

اس سورۃ کا تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے۔ کہ اس میں بتایا گیا تھا کہ پہلے انبیاء بھی بغیر ظاہری سامانوں کے خدا تعالےٰ کے کلام کی مدد سے فتح پاتے رہے ہیں اب بھی اس طرح ہو گا۔

اب اس سورۃ میں بھی کلام الٰہی کی طاقت پر بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ کلامِ الٰہی ایسی زبردست طاقت ہے۔ جس کے سامنے کوئی ٹھیر نہیں سکتا اور جھوٹا کلام بنانا آسان کام نہیں۔ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے والا بچ نہیں سکتا۔ پس یہ کلام سچا ہے اور اپنا ثبوت اپنے ساتھ لایا ہے۔

(سورۃ کے مضامین کا خلاصہ۔)

اس سورۃ کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ یہ ایسا کلام ہے کہ اپنا مشابہ آپ ہے۔ یہاں تک کہ ایسے بہت سے مواقع پیش آتے ہیں اور آئیں گے۔ کہ اس کی خوبیوں کو دیکھ کر دشمن بھی دل میں حسرت کرتے ہیں۔ اور کرینگے کہ ایسا کلام ان کے پاس کیوں نہ ہوُا۔ مگر اپنی خودغرضیوں کی وجہ سے اس کی طرف قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ اور سمجھتے نہیں کہ اس قسم کی سستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان صداقت سے محروم رہ جاتا ہے اور عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آخر جب ہم نے ایک کلام اُتارا ہے تو یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ مٹ جائے۔ وہ قائم رہے گا اور رکھا جائے گا۔ پس جو اسے قبول کرنے میں سستی کرینگے وہ اپنا نقصان خود کریں گے۔

پہلے نبیوں کے کلام سے بھی تمسخر ہوُا۔ مگر لوگ یہ نہیں خیال کرتے کہ خدا تعالےٰ پر افترا کرنا معمولی بات نہیں۔ خدا خود اس امر کی حفاظت کرتا ہے کہ اس پر افترا نہ کیا جائے اور سچے کلام کو خاص امتیاز عطا فرماتا ہے۔ اس کی قبولیت کے سامان پیدا کر دیتا ہے اور جو اسے قبول کرتے ہیں۔ انہیں ادنےٰ حالت سے اُٹھا کر کمال تک پہنچا دیتا ہے۔

پس جس طرح پہلے انبیاء کے کلام ہی خزانے تھے۔ جن کے ذریعہ سے دُنیا فتح ہوئی۔ اسی طرح اب بھی ہو گا اگر مخالف پرواہ نہیں کرتے نہ کریں۔ وہ اس کی سزا پائیں گے۔ تُو اس خزانہ کو مومنوں میں تقسیم کر۔ اور جو اسے نہیں قبول کرتے اُنہیں سمجھاتا رہ۔ اور خدا سے دعائیں کر۔ کہ اسی ذریعہ سے تبلیغ کا رستہ صاف ہو گا۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ○

الرٰ۔ یہ (ایک) کامل کتاب اور (اپنے مطالب کو خود ہی) واضح کردینے والے قرآن کی آیات ہیں ۲؎

تِلْكَ

مُبِين

۲؎ حل لغات۔ تِلْكَ۔ اٰيٰتُ۔ اَلْكِتٰبُ کی تشریح کے لئے دیکھیں سورۃ یونس ۲؎

مُبِيْنٌ۔ اَبَانَ سے اسم فاعل ہے اور اَبَانَ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے یعنی کبھی اس کے معنے ظاہر کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور کبھی ظاہر ہونے کے۔ چنانچہ اقرب الموارد میں ہے۔ اَبَانَ الشَّيْءُ: اِتَّضَحَ۔ کوئی چیز ظاہر ہوگئی۔ (لازم) وَفُلَانٌ الشَّيْءَ: اَوْضَحَهٗ کسی چیز کو واضح اور ظاہر کیا (متعدی) سورہ یوسف میں اَلْمُبِيْن کے معنے ظاہر کرنے والی کتاب کے تھے۔ اور اس جگہ خود ظاہر ہونے کے ہیں یعنی یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کتاب اپنی آپ شاہد ہے۔ قرآن کی تنوین تفخیم (بڑائی کے اظہار) کے لئے ہے۔

کیا الکتٰب اور قرآن مبین میں کوئی فرق ہے؟

تفسیر۔ اس جگہ لوگوں نے بحث کی ہے کہ کیا اَلْكِتٰبُ اور قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ میں کوئی فرق ہے؟ کیونکہ یہاں پر درمیان میں واؤ عاطفہ لائی گئی ہے۔ اور عطف بالعموم مغائر اشیاء میں ہوتا ہے۔ دراصل انہیں یہ غلطی اس بات سے پیدا ہوئی کہ انہوں نے اَلْكِتٰبُ سے کاغذوں میں لکھی ہوئی کتاب سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے اَلْكِتٰبُ اور قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ کے الفاظ کو مقابل پر رکھ کر اس بات کو پیش کیا ہے۔ کہ قرآن مجید کی حفاظت تحریر اور یاد دونوں ذریعوں سے کی جائے گی۔ یہ لکھا بھی جائے گا اور بکثرت پڑھا بھی جائے گا۔ گویا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ والے مضمون پر زور دیا گیا ہے

لفظ کتاب اور قرآن کو آگے پیچھے لانے کی وجہ

الکتٰب اور قرآن مبین کے الفاظ کو مقابل پر رکھنے کی وجہ۔

اور اس جگہ معنوی طور پر قرآن مجید کی دو صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ كِتٰبٌ کے لفظ میں اس کے تحریر میں آنے کی طرف اشارہ ہے اور قُرْاٰن کے لفظ میں اس کے بکثرت پڑھے جانے کی خبر دی گئی ہے۔ گویا یہ دو نام نہیں۔ بلکہ دو صفات ہیں۔ جیسا کہ کبھی محمد کا لفظ بطور صفت کے یعنی بہت تعریف کیا گیا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں صفات یکجائی طور پر صرف قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے سوا اور دنیا کی کسی الہامی کتاب میں یہ صفات جمع نہیں ہیں۔ انجیل اور تورات کثرت سے پڑھی جاتی ہیں لیکن ان کو یاد کرنے والا کوئی نہیں۔ وید کو یاد کرنے والا چھوڑ۔ ان کے معنے جاننے والے بھی شاذ ہیں۔ اس زمانہ میں سنا ہے پچیس کروڑ ہندوؤں میں سے معارف تو الگ رہے۔ صرف چار آدمی سارے ہندوستان میں ویدوں کا ترجمہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہی حال ژند اوستا کا ہے صرف اور صرف قرآن کریم ہے جو کتابی صورت میں بھی پڑھا جاتا ہے اور حفظ بھی کیا جاتا ہے۔ اور دونوں صورتوں میں لاکھوں کروڑوں آدمی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

الکتٰب میں قرآن کے تحریر میں آنے کی طرف اشارہ ہے اور قرآن مبین میں اس کے پڑھے جانے کی طرف۔

اس جگہ ایک اور لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید کے متعلق دو جگہ پر کتاب اور قرآن کا لفظ اکٹھا آتا ہے۔ ایک جگہ قرآن کا لفظ پہلے ہے۔ اور کتاب کا بعد میں (نمل ع ۱) اور ایک جگہ کتاب کا لفظ پہلے اور قرآن کا لفظ بعد میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں کتاب کا لفظ پہلے ہے اور قرآن کا بعد میں۔ میرے نزدیک یہ فرق درجہ کے تفاوت کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے سورہ حجر میں کتاب کی صفت سے زیادہ قرآن کی صفت کے اظہار پر زور دیا گیا ہے۔ اس لئے کتاب کو پہلے اور قرآن کو بعد میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب درجہ بیان کرنا ہو تو بڑی شے کو چھوٹی کے بعد بیان کیا جاتا ہے۔ اور سورہ نمل میں چونکہ قرآن کریم کی زبانی تلاوت سے زیادہ اس کی تحریر کے اثر کو نمایاں کرنا تھا۔ اس لئے اس میں قرآن کا لفظ پہلے رکھا گیا ہے اور کتاب کا لفظ بعد میں

رکھا گیا۔

ایک اور امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں الکتاب کے ساتھ مُبِین کا لفظ نہیں ہے مگر قرآن کے ساتھ مبین کا لفظ آیا ہے۔ اس کے برخلاف سورۂ نمل کے پہلے رکوع میں اس آیت کے مضمون کو اُلٹ کر بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ یعنے قرآن کا لفظ پہلے رکھ دیا گیا ہے۔ اور مبین کا لفظ کتاب کے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ ممکن ہے۔ بعض ناواقف لوگ جو اسرارِ قرآنیہ سے واقف نہیں یہ خیال کریں کہ سجع کی خاطر ایسا کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اگر مبین سجع کی خاطر لگایا گیا تھا۔ تو قرآن کو کتاب سے پہلے کیوں کیا گیا۔ سورۂ حجر والی ترتیب قائم رکھی جاتی اور کتاب کو پہلے اور قرآن کو بعد میں رکھا جاتا۔ پس ان الفاظ کی ترتیب کو بدل دینے سے صاف ظاہر ہے کہ مُبین کا لفظ سجع کی غرض سے کتاب کے ساتھ نہیں لگایا گیا۔ بلکہ کسی اور حکمت کے ماتحت لگایا گیا ہے۔ مُبین کا لفظ انہی دو سورتوں میں قرآن اور کتاب کے الفاظ کے ساتھ نہیں لگایا گیا۔ بلکہ اور سورتوں میں بھی ایسا کیا گیا ہے۔ قرآن کے ساتھ ایک تو اس سورۃ میں۔ دوسرے سورہ یٰس ع ۵ میں مبین کی صفت استعمال کی گئی ہے اور کتاب کے ساتھ ایک تو سورۃ نمل کی مذکورہ بالا آیت میں اور دوسرے مندرجہ ذیل سورتوں میں یہ صفت بیان کی گئی ہے۔ مائدہ (ع ۳) ہود (ع ۱) انعام (ع ۷) یونس (ع ۶) سباء (ع ۱) نمل (ع ۶) شعراء (ع ۱) قصص (ع ۱) یوسف (ع ۱) زخرف (ع ۱) دخان (ع ۱) گویا بارہ جگہ کتاب کی صفت مبین آئی ہے اور دو جگہ قرآن کی۔ پس سجع وغیرہ کا کوئی سوال نہیں یہ تغیر یقیناً کسی حکمت کے ماتحت ہے۔

قرآن اور کتاب کے الفاظ اس قسم کے موقعہ پر دو ہی جگہ جمع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک میں تو کتاب کو پہلے رکھا گیا ہے اور قرآن کو بعد میں اور قرآن کی صفت مبین بیان ہوئی ہے اور دوسری جگہ قرآن کو پہلے بیان کیا ہے اور کتاب کو بعد میں اور کتاب کے ساتھ مبین کا لفظ بیان ہوا ہے۔ اور اصل مواقع یہی ہیں۔ جو غور طلب ہیں۔ کہ کیوں ایک جگہ قرآن کے ساتھ اور دوسری جگہ کتاب کے ساتھ مبین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ حجر اور سورہ نحل کے مضامین میں ایک فرق ہے سورۂ حجر میں ان انبیاء کا ذکر ہے۔ اور ان کے حالات زندگی کو بطور تمثیل پیش کیا گیا ہے۔ جن میں کتابت کا رواج کم تھا۔ اور علوم کو زبانی یاد رکھا جاتا تھا یعنے حضرت آدمؑ حضرت ابراہیمؑ۔ ان کے رشتہ دار۔ حضرت لوطؑ اور اصحاب ایکہ یعنے بن والے لوگ اور قوم صالحؑ۔

کتاب اور قرآن کے لفظ کے ساتھ مختلف طور پر مبین کا لفظ ہونے کی وجہ۔

سورۂ حجر و نحل کے مضامین میں فرق۔

حضرت آدمؑ کا زمانہ ابتدائی تھا۔ اور غالباً تحریر کا فن ابھی شروع بھی نہ ہوا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ عربی قبائل میں سے تھے۔ اور عراق ان کا مولد تھا۔ ان میں بھی تحریر کا رواج کم تھا۔ اصحاب الایکہ بھی عرب کا قبیلہ تھے۔ اور قوم صالحؑ بھی اور ان سب میں تحریر کا رواج کم تھا۔ پس ان مثالوں سے ثابت ہے۔ کہ سورۂ حجر میں زیادہ تر خطاب ان اقوام سے ہے۔ جن میں تحریر کا رواج کم تھا۔ اور جنہوں نے حفظ کے ذریعہ سے قرآنی علوم سے زیادہ فائدہ اُٹھانا تھا۔ پس اس سورۃ میں قرآن کے ساتھ مبین کا لفظ رکھا یہ بتانے کے لئے کہ ان اقوام میں اس کلام کی صفت قرآن لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچائے گی۔ لیکن کتاب کی صفت بھی ساتھ بیان کی تاکہ مکمل حفاظت کا اظہار ہو۔ اس کے بالمقابل سورۂ نحل میں کتاب کے ساتھ مبین کا لفظ لگایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤدؑ کے واقعات پر زور دیا گیا ہے۔ جو بنی اسرائیل میں سے تھے جن میں لکھنے کا رواج بہت تھا اور زبانی یاد رکھنے کا رواج کم تھا اور ان انبیاء کے اتباع نے محمد رسول اللہ صلعم پر نازل ہونے والے کلام کی صفت کتاب سے زیادہ فائدہ اٹھانا تھا بہ نسبت صفت قرآن کے۔ اس لئے اس کی مناسبت سے سورۂ نحل میں قرآن کے لفظ پر زور کم دیا اور کتاب پر زیادہ۔

تبیین کی صفت کا الگ الگ استعمال ہونا سجع کی غرض سے نہیں۔

قرآن مبین کہنے سے وہ قومیں مخاطب ہیں جن میں تحریر کا رواج کم تھا۔

تبیین کی صفت کے کتاب کے ساتھ آنے کے بارہ مقامات

سورۂ نحل میں کتاب کے ساتھ مبین کی صفات آنے کی وجہ۔

الجزء ۱۴ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ○

جن لوگوں نے (اس کا) انکار کیا ہے۔ وہ بسا اوقات آرزو کیا کرتے ہیں۔ کہ کاش وہ (بھی اسکی) فرمانبرداری اختیار کرنیوالے ہوتے ۵۳

اس سورۃ میں تعلیم اسلام کی حفاظت کا ذکر ہے۔

غرض سورۃ حجر میں تو یہ بتایا ہے۔ کہ قرآن کریم کو لکھا بھی گیا ہے۔ مگر بعض اقوام جو حافظہ سے زیادہ کام لینے والی ہیں۔ اس کو یاد کر کے اور سُن کر زیادہ فائدہ اُٹھائیں گی۔ اور اس سورۃ میں وہی ہماری بڑی مخاطب ہیں اور سورۃ نمل میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کو حفظ بھی کیا جائے گا لیکن لکھا بھی جائے گا اور بعض قومیں جو تحریر سے زیادہ فائدہ اُٹھانے والی ہیں۔ وہ اسے کتاب سے پڑھ کر زیادہ فائدہ اٹھائینگی اور اس سورۃ میں وہی ہماری بڑی مخاطب ہیں۔

تحریر اور حفظ دونوں طور پر حفاظت کرنے

قرآن مجید سے تمام قومیں فائدہ اُٹھائینگی حافظہ سے کام لینے والی بھی اور تحریر سے بھی۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم قرآن ہونے کے لحاظ سے بھی مبین ہے۔ اور کتاب ہونے کے لحاظ سے بھی۔ اور چونکہ وہ سب دُنیا کی طرف ہے۔ اس سے وہ قومیں بھی فائدہ اُٹھائینگی جو حافظہ سے زیادہ کام لیتی ہیں۔ ان کے لئے وہ قرآن مبین ہوگا اور وہ قومیں بھی فائدہ اُٹھائینگی جو تحریر سے وابستہ ہیں اور ان کے لئے وہ کتاب مبین ہوگا۔

رُبَمَا

کتاب کے ساتھ مبین کی صفت کا کثرتِ استعمال

جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ قرآن مبین کا لفظ دو دفعہ استعمال ہوا ہے۔ اور کتاب مبین کا بارہ دفعہ۔ اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ قرآن کریم کا کتاب ہونے کے لحاظ سے حلقہ وسیع ہوگا اور اکثر لوگ اس کے کتاب ہونے کے لحاظ سے فائدہ اٹھائینگے یعنی کثیر التعداد اقوام میں وہ پھیل جائے گا۔ جو کتابت سے علوم کو محفوظ کرتی ہیں۔ میرے نزدیک قرآن کریم میں دس جگہ کتاب کے ساتھ مبین کے لفظ کا استعمال کرنا اور دو جگہ قرآن کے ساتھ مبین کے لفظ کا استعمال اس امر کی طرف اشارہ کرنیکے لئے ہے کہ کتاب سے فائدہ اُٹھانے والے زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت حفظ سے فائدہ اُٹھانے والوں کے۔ اور مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ مسلمانوں میں تعلیم کے رواج کو زیادہ کریں۔ تاکہ مسلمان قرآنی فوائد سے محروم نہ رہ جائیں۔

اس سورۃ میں تعلیم اسلام کی حفاظت کا ذکر ہے اس لئے اس کی دونوں صفات یعنے کتاب اور قرآن بیان کی گئی ہیں کسی مضمون کی حفاظت کبھی مکمل طور پر نہیں ہوسکتی جب تک وہ تحریر اور حفظ دونوں ذریعہ سے محفوظ نہ کیا جائے انسانی حافظ بھی غلطی کر جاتا ہے اور کاتب بھی بھول چوک جاتا ہے لیکن یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی غلطی کو نکال دیتے ہیں اور ان دو سامانوں کے جمع ہونے کے بعد غلطی کا امکان باقی نہیں رہ سکتا۔ قرآن کریم کو یہ دونوں حفاظتیں حاصل ہیں۔ یعنے وہ کتاب بھی ہے۔ رسول کریم صلعم کی زندگی سے ہی اس کے الفاظ تحریر کے ضبط میں لائے جاتے رہے ہیں اور وہ قرآن بھی ہے۔ یعنے نزول کے وقت سے آج تک سینکڑوں ہزاروں لوگ اسے حفظ کرتے اور اس کی تلاوت کرتے چلے آئے ہیں۔

رُبَ کے معنوں کے متعلق اختلاف

۵۳ حل لغات - رُبَمَا۔ رُبَ اور مَا کا مرکب ہے۔ رُبَ کبھی رُبَّ یعنی ب کی تشدید سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے متعلق یہ اختلاف ہے۔ کہ یہ حرف ہے یا اسم بصریوں کے نزدیک اور نیز اکثر ائمہ لغت و نحو کے نزدیک یہ حرف ہے لیکن کوفی نحوی اسے اسم بتاتے ہیں۔ بصری کہتے ہیں۔ کہ رُبَ کے بعد مَا کا لفظ اس لئے لایا گیا ہے کہ یہ حرف تھا۔ کیونکہ حرف جر فعل پر نہیں آسکتا۔

رُبَ کے معنوں کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ اکثر لوگوں نے اسے تقلیل کے لئے قرار دیا ہے۔ یعنی جس واقعہ پر رُبَمَا داخل ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اور شاذ و نادر کے طور پر ہوتا ہے۔ ابو عبداللہ رازی نے لکھا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ یہ تقلیل کے لئے آتا ہے۔ زمخشری کا بھی یہی خیال ہے

مگر سیبویہ کی طرف ایک روایت منسوب ہے۔ کہ یہ تکثیر کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ زجاج کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ رُبَمَا نہ تقلیل کے لئے آتا ہے نہ تکثیر کے لئے۔ بلکہ سیاق وسباق کے ماتحت تکثیر یا تقلیل کے معنی دیتا ہے جب تقلیل کا موقع ہو۔ تو تقلیل کے معنے دیتا ہے اور اگر تکثیر کا موقع ہو۔ تو تکثیر کے۔ اس کے ذاتی معنے کوئی نہیں۔ یہ صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ما بعد کا واقعہ ضرور ہوا ہے (محیط)

اس آیت میں رُبَمَا کے معنے تکثیر کے ہی لئے جاتے ہیں جن لوگوں نے رُبَمَا کو تقلیل کے لئے قرار دیا ہے انہوں نے بھی اس جگہ تاویل کر کے تکثیر ہی کے معنی لئے ہیں۔

اسی طرح رُبَ کے متعلق ایک اور بحث ہے۔ اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ رُبَمَا ہمیشہ ماضی کے معنوں کے بیان کرنیکے لئے آتا ہے خواہ اسکے بعد فعل مضارع ہی کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں نے رُبَمَا یَوَدُّ کے معنے رُبَمَا وَدَّ کئے ہیں۔ اور پھر کہا ہے۔ کہ رُبَمَا یَوَدُّ فعل جو قاعدہ کے رو سے ماضی کے معنے دیتا ہے۔ اس جگہ مستقبل کے لئے اس لئے استعمال کیا گیا ہے۔ تا کہ یقین کے معنوں پر دلالت کرے لیکن عربی زبان کا تفحص کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رُبَ کا لفظ مستقبل کے معنے میں بھی آتا ہے۔ ہندہ زوجہ ابوسفیانؓ کہتی ہے ؎

یَا رُبَّ قَائِلَةٍ غَدًا
یَا لَهْفَ أُمِّ مُعَاوِيَة۔ (محیط)

اس میں یقیناً مستقبل کے معنے ہیں۔ جیسا کہ غَدًا کا لفظ دلالت کرتا ہے پھر اسی طرح ایک شاعر سلیم القشیری کا شعر ہے ؎

وَمُعْتَصِمٍ بِالْجُبْنِ مِنْ خَشْيَةِ الرَّدَى
سَيُرْدَى وَ غَازٍ مُشْفِقٍ سَيَؤُوبُ

یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے بزدلی کی پناہ لینے والا ہلاک ہو جائے گا۔ لیکن جو ڈر کو دُور پھینک دیتا ہے اور جنگ کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ زندہ سلامت واپس آئیگا۔

اس جگہ پر رُبَّ محذوف ہے۔ جیسا کہ مُعْتَصِمٍ کی جَر سے ظاہر ہے اور شعر کے معنے یقیناً مضارع پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ سَيُرْدَى اور سَيَؤُوبُ مضارع کے صیغے ہیں۔ غرض رُبَ مستقبل کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اور تکثیر کے لئے بھی۔ جیسا کہ سیبویہ اور زجاج کے قول سے اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

أَسْلَمَ

أَسْلَمَ سے اسم فاعل مُسْلِمٌ آتا ہے۔ اور مُسْلِمُوْنَ اسکی جمع ہے أَسْلَمَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں تَدَيَّنَ بِالْإِسْلَامِ مذہب اسلام قبول کر لیا۔ اور أَسْلَمَ أَمْرَهٗ إِلَى اللّٰهِ کے معنے ہیں سَلَّمَهٗ کہ اپنے معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دیا (اقرب) پس رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ کے معنے ہونگے۔ بسا اوقات منکر یہ آرزو کرتے ہیں یا کرینگے کہ وہ اسلام کو قبول کر لیتے (۲) وہ اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کر دیتے۔

رُبَمَا کے متعلق ایک اور بحث۔

تفسیر کفار کی اس خواہش کے متعلق مفسرین نے بحث کی ہے کہ کب انہوں نے خواہش کی کہ وہ مسلمان ہوں؟ بعض نے مجبور ہو کر کہا کہ وہ اس وقت یہ خواہش کرینگے جب مسلمانوں کی فتح ہو گی۔ بعض نے قیامت پر چسپاں کیا ہے کہ اس وقت کہیں گے کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔ اور بعض نے اس سے ترقیات اسلامی مُراد لی ہیں۔ یعنی جب بھی ترقی ہوگی وہ یہ خواہش کریں گے۔

کفار کی خواہش کے متعلق مفسرین کی بحث۔

رُبَمَا کا لفظ مستقبل کے معنے میں بھی آتا ہے۔

یہ معنے بھی درست ہیں۔ ان پر کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ جب دشمنی بلاوجہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ کفار عرب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تھی۔ تو دشمن کی ترقی پر انسان کو اکثر یہ خیال آجاتا ہے کہ میں اس کی دشمنی نہ کرتا۔ تو بڑا اچھا تھا۔ آج فائدہ ہی اُٹھا لیتا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی محض حسد کی وجہ سے تھی۔ اور آپ کی غیر معمولی ترقیات سے وہ حسد کے مواقع ہی جاتے رہے۔ اس لئے

آنحضرت کی غیر معمولی ترقی سے کفار مسلمان ہونے کی خواہش کرتے۔

ان کو بارہا خیال آتا ہوگا کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔
اسی طرح جب وہ بدر کے مقام پر قتل ہو رہے تھے
تو ان کا دل بھی چاہتا ہوگا۔ کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔

اس زمانہ میں اسلامی تعلیم کے قابل رشک مسائل

غرض اسلام کی فتوحات دشمنوں کے دلوں میں یہ حسرتیں ضرور پیدا کرتی ہونگی۔ کہ کاش ہم بھی ساتھ ہوتے منافقوں کا قول تو قرآن مجید میں صریح طور پر بیان ہوا ہے۔ کافروں کی بھی یہی حالت ہوتی ہوگی۔ یہ ایک طبعی بات ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔

اس آیت کے ایک اور معنے

میرے نزدیک ان کے علاوہ آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں۔ مفسرین عام طور پر ظاہری لطافت۔ فصاحت وبلاغت اور معجزات پر بحث کرتے ہیں۔ اور قرآن مجید کی تعلیمی خوبیوں پر بہت کم بحث کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے بڑی چیز جس کے لئے قرآن کریم آیا ہے۔ وہ اسکی کامل اور دلکش تعلیم ہے اور اسی کی طرف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ میں اشارہ کیا ہے اور آیت رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں انہی تعلیمی خوبیوں پر رشک کا ذکر کیا ہے یعنی فرماتا ہے۔ کہ اسلام کی تعلیمات کی خوبیوں کو دیکھ کر بارہا کافر کہہ اُٹھتے ہیں اور کہہ اٹھیں گے۔ کاش ہم بھی مسلمان ہوتے اور یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔

ایک ہندو کا اسلامی ازدواجی قانون پر رشک۔

مُسْلِم کے معنے سپرد کردینے والے

حضرت عمرؓ سے ایک یہودی نے کہا کہ قرآن مجید میں ایک آیت ہے۔ اگر وہ ہماری کتاب میں اُترتی۔ تو ہم اس دن عید مناتے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ وہ کونسی آیت ہے۔ اس نے جواب دیا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الآیہ۔ آپ نے فرمایا۔ وہ دن تو ہمارے لئے دو عیدوں کا دن تھا۔ یعنی جمعہ کا دن اور عرفہ کے دن یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ (بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) ایسا ہی ایک اور یہودی نے کہا کہ آپ کی شریعت میں ایک بات دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی حصہ نہیں جس پر اس شریعت نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ یہ خواہشات ہیں جو ہزاروں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہونگی۔ مگر اظہار ان کا

ایک یہودی کا اسلامی شریعت کے اعلیٰ ہونے کا اعتراف۔

دو ایک کے مُنہ سے ہؤا۔ اور قرآن مجید نے بھی فرمایا ہے يَوَدُّ (ان کے دل چاہتے ہیں) يقول نہیں فرمایا (کہ وہ مُنہ سے بھی اظہار کرتے ہیں) اس زمانہ میں بھی طلاق کا مسئلہ۔ شراب کا مسئلہ ورثہ کا مسئلہ۔ اور ایسے ہی اور بہت سے مسائل ہیں کہ جن پر دُنیا رشک کر رہی ہے۔ جب ایک یورپین کے دل میں خیال آتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی طلاق کا قانون بننا چاہیئے۔ تو دوسرے معنوں میں وہ یہی کہتا ہے کہ کاش میں مسلمان ہوتا۔ ایسا ہی جب ایک امریکن کے دل میں یہ تحریک پیدا ہوتی ہے کہ شراب بند ہونی چاہیئے۔ تو وہ گویا رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کی تصدیق کرتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہؤا۔ ہندوستان کی لیجسلیٹو اسمبلی کے ایک ہندو ممبر نے صغرسنی کی شادی کے متعلق مسودہ قانون پیش کیا تھا۔ اس نے دوران تقریر میں کہا۔ مَیں بڑی حسرت سے دیکھتا ہوں کہ جس طرح اسلام نے شادی کا قانون بنا کر مسلم قوم کو محفوظ کر دیا ہے۔ ویسا قانون ہمارے ہاں کوئی نہیں۔

آیت میں بھی رُبَمَا کا لفظ رکھا گیا ہے۔ جو کئی دفعہ پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو بحیثیت مجموعی اسلام لانے کا خیال پیدا نہ ہوگا۔ بلکہ الگ الگ مسائل پر انکے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ کاش یہ مسئلہ بھی ہمارے پاس ہوتا۔ یہ بھی ہوتا مُسْلِم کے معنے سپرد کر دینے والے کے بھی ہیں۔ جیسے فرمایا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (بقرہ ع ۱۵) یعنے اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا۔ پس اس آیت کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ جب کفار اپنی دنیوی تدابیر کو بیکار جاتے دیکھتے ہیں اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کئے بیٹھے ہیں۔ کامیاب ہوتے دیکھتے ہیں۔ تو ان کا غرور ایک وقت کے لئے کمزور پڑ جاتا ہے اور ان کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کہ کاش ہم بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتے اور اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیتے۔ تو ان ذلتوں اور شکستوں کا مُنہ نہ دیکھتے۔

مُسْلِم کے معنے امن دینے والے کے بھی ہوتے ہیں۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ

تو ان کو (اپنے حال پر) چھوڑ دے کہ وہ (بیٹھے کھانے) کھاتے رہیں۔ اور وقتی سامانوں سے نفع اُٹھاتے رہیں۔ اور (ان کی

فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا

جھوٹی) امیدیں انہیں غافل کرتی رہیں۔ کیونکہ وہ جلد (ہی حقیقت) معلوم کر لینگے ۵۴ اور ہم نے کبھی کسی بستی کو بغیر

ان معنوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی ترقیات کو دیکھ کر کبھی کبھی کافروں کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش ہم اس قوم سے لڑائی نہ چھیڑتے اور صلح رکھتے اور یہ روزِ بد نہ دیکھتے۔ جو اَب دیکھنا نصیب ہوا ہے۔

۵۴ حل لغات ۔ اَلْاَمَلُ وَالْاَمْلُ اسکی جمع آمال ہے۔ اور الامل کے معنے ہیں۔ الرّجاءُ۔ امید تَاَمَّلْتُ الشَّیْءَ اَیْ نَظَرْتُ اِلَیْهِ مُتَثَبِّتًا لَهٗ تاملتُ الشَّیْءَ کے معنے ہیں۔ اسے غور سے دیکھا۔ ٹکٹکی لگا کر دیکھا (اقرب)

تفسیر ۔ اس آیت میں یہ بتلایا ہے کہ یہ لوگ مختلف مسائل میں اسلام کی برتری تو تسلیم کرتے ہیں۔ اور کریں گے۔ مگر پھر بھی اسلام کی طرف قدم اُٹھانا نصیب نہ ہوگا۔ یورپ کے لوگ اسلامی مسائل کی برتری کو مانتے ہیں مگر اسلام لانے کے لئے تیار نہیں کیونکہ سوسائٹی کا سوال ہے۔

فرمایا وہ اپنے اکل و شرب کی وجہ سے اپنی تجارتوں اور صنعتوں کی وجہ سے اور اپنی بعید آرزوؤں کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوتے۔ اس میں گویا پہلی آیت کے مفہوم پر جو سوال پیدا ہوتا تھا۔ اس کا جواب دیا گیا ہے۔ یعنی جب وہ لوگ خواہش کرتے ہیں اور کرینگے "کاش وہ مسلمان ہوتے" تو وہ مسلمان ہوتے کیوں نہیں؟ فرمایا ان کی عیاشی دولت کی حرص۔ اور طولِ امل ان کے راستہ میں روک بن رہے ہیں۔

اس آیت سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے۔ کہ صداقت کو قبول کرنے کے لئے کھانے پینے میں سادگی۔ دُنیا کی حرص سے اجتناب اور طول امل سے بچنا ضروری امور ہیں۔ جو شخص صداقت کا جویا ہو۔ اس کے لئے ان سے بچنا ضروری ہے۔ اگر کوئی ان تین باتوں سے نہیں بچتا تو اس کا صداقت کی جستجو کرنا فضول امر ہے۔ اگر حق اس پر کھل بھی جائے گا۔ تب بھی وہ اس کے قبول کرنے سے محروم رہے گا۔ یہ اشارہ بھی اس آیت میں ہے۔ کہ کفار لوگوں پر رُعب جمانے کے لئے اپنے دسترخوان کو خوب وسیع کرتے۔ دولت کماتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فتح پانے کے لئے دُور دُور کی تدابیر اختیار کرتے تھے۔ جبکہ محمد رسول اللہ صلعم ان سب باتوں سے خالی تھے۔ مگر باوجود اس کے فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی جیتیں گے اور کفار کے دلوں میں آپؐ کی کامیابی دیکھ کر حسرت پیدا ہوگی۔

اس آیت سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کفار کا عارضی جذبہ ہے ورنہ اصل میں وہ کھانے پینے اور دولت کمانے میں لگے ہوئے ہیں اور عارضی جذبات انسان کو نفع نہیں دیتے۔ بلکہ مستقل جذبات فائدہ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کا مستقل جذبہ مسلم ہونے کا ہے۔ عارضی طور پر وہ کھاتے پیتے۔ دولت کماتے اور بعض تدابیر بھی آیندہ کے لئے کر لیتے ہیں۔ پس باوجود ان کاموں کے وہ ہدایت پا رہے ہیں۔ جبکہ کافر ہدایت نہیں پاتے۔

(حاشیہ:)
مُسلم کے معنی ماننے والے کے ہیں۔
اَلْاَمَل
لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کہنا کفار کا عارضی جذبہ ہے۔
صداقت قبول کرنے کے لئے کھانے پینے میں سادگی ضروری ہے۔

وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ○ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ

اس کے کہ اس کے متعلق (پہلے سے) ایک معلوم فیصلہ ہو چکا ہو۔ ہلاک نہیں کیا ۵ کوئی قوم بھی اپنی (ہلاکت کی) میعاد سے بھاگ

اَلْقَرْيَة

۵ حل لغات۔ اَلْقَرْيَة۔ کے معنی بستی کے ہیں۔ نیز قریہ بول کر اہل قریہ بھی مراد لیتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھو یوسف ۵ یونس ۹۵

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ

وَلَهَا میں واؤ حالیہ ہے۔

وَلَهَا میں واؤ حالیہ ہے۔ قاضی منذر نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد کا مذکور اس کے قبل کے مذکور سے زمانہ میں پہلے واقعہ ہو چکا ہے۔ جیسا کہ آتا ہے حَتّٰى اِذَا جَاۤءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (زمر ع ۸) (محیط)

قریہ سے مراد نبی کے تمام مخاطب ہوتے ہیں۔

تفسیر۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ قریہ سے مُراد گاؤں یا بستی نہیں۔ بلکہ وہ قوم مُراد ہے۔ جن کی طرف نبی آتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا محاورہ ہے۔ کہ وہ قریۃ کا لفظ بول کر مُراد نبی کے تمام مخاطب لیتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے مخاطب نبی کے گاؤں یا شہر والے ہی ہوتے ہیں۔ دوسروں کو ان کے تابع کر دیا جاتا ہے۔

نبی کی بستی کو اُمّ القری قرار دیا جاتا ہے۔ جب ماں مرجائے تو بچے آپ ہی بے غذا مرجاتے ہیں۔

اَهْلَكْنَا مِنْ قریۃ سے مراد۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں عرب پر خصوصًا عذاب آیا۔

اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ میں مُراد وہی قریۃ ہے جس میں نبی آتا ہے۔ دوسری بستیوں کا ذکر اس لئے چھوڑ دیا۔ کہ وہ اس بستی کے تابع ہیں۔ اس کا مزید ثبوت اگلی آیت میں مِنْ اُمَّةٍ کے لفظ سے مِل جاتا ہے۔

ایک اعتراض کا جواب۔ کتاب معلوم سے مراد۔

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں۔ فلاں گاؤں ہلاک ہوگیا۔ فلاں شہر میں بیماری پڑی۔ مگر اس میں کوئی نبی نہ تھا۔ ان کا یہ اعتراض غلط ہے۔ اس آیت میں اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ جب نبی مبعوث ہو تو اس کے مخاطبین کی سب بستیاں اسکی بستی کے تابع سمجھی جاتی ہیں اور اس بستی میں نبی کی بعثت کے بعد سب بستیاں عذاب کی مستحق ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ ایک قوم کی طرف مبعوث

نبی کی بعثت کے بعد اس کے مخاطبین کی سب بستیاں عذاب کی مستحق ہو جاتی ہیں۔

ہو۔ تو وہ ساری قوم انکار کے باعث مستحقِ عذاب ہوتی ہے خواہ ان کی بستیوں میں سے وہ نبی گزرا بھی نہ ہو اور اگر وہ سب دُنیا کی طرف ہو تو سب دنیا مستحق عذاب ہو جاتی ہے نیز اس آیت سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے۔ کہ کسی بستی پر عذاب آنا اس بات کی علامت نہیں کہ ضرور کوئی نبی آیا ہو بلکہ جس قدر وسیع عذاب جس قدر وسیع نبی کا حلقہ ہو۔ نبوت کی دلیل ہوتا ہے۔ اگر ایک قوم کی طرف نبی ہو تو قومی عذاب نبی کی علامت ہے۔ اور اگر ایسے نبی کا زمانہ ہو جو سب دنیا کی طرف مبعوث ہُوا ہو۔ تو پھر عالمگیر عذاب ہی اسکی علامت ہے۔ یہ کہنا حماقت ہے کہ اگر عذاب بغیر نبی کے نہیں ہوتا تو فلاں گاؤں کیوں ہلاک ہُوا تھا۔ اس وقت کون نبی آیا تھا۔ یہ عذاب جو نبوت کی علامت ہوتا ہے۔ اس وسیع حلقہ کا احاطہ کرتا ہے جو نبی کا مخاطب ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے نبیوں کے لئے کسی ایک گاؤں کا عذاب نہیں۔ بنی اسرائیل کی قوم کا عذاب علامت تھا۔ اور محمد رسول اللہ صلعم کے لئے کسی قوم کا عذاب نہیں۔ بلکہ دُنیا بھر کی تباہیاں علامت تھیں۔ جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب پر خصوصًا عذاب آیا۔ مگر ساری دنیا پر بھی اللہ تعالٰی نے ایک قلیل عرصہ میں تباہی نازل کی۔

کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ سے مُراد وہ مدت ہے جو انبیاء کے ذریعہ سے بتا دی جاتی ہے۔ اور اس جگہ قریۃ سے مُراد وہی لوگ ہیں۔ جن کو نبیوں کی مخالفت کی وجہ سے عذاب ملتا ہے۔ ایسے لوگوں پر عذاب ہمیشہ کھُلی پیشگوئیوں کے بعد آتا ہے۔

اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ○ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ

(کہ نہ آگے) نہیں سکتی۔ اور نہ ہی پیچھے رہ (کر اس سے بچ) سکتی ہے [۶] اور انہوں نے (بڑے زور سے) کہا ہے (کہ) اے

نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ○ لَوْمَا

وہ شخص جس پر یہ ذکر اُتارا گیا ہے تو یقیناً دیوانہ ہے [۷]

[۶] حل لغات۔ الاجل کی تشریح کے لئے دیکھو سورۃ رعد [۳۹]۔ اَلامۃ۔ الجماعۃ۔ امت کے معنے ہیں۔ جماعت۔ الجیل من کل حیّ۔ ہر قبیلے کے ہمعصر لوگ (اقرب)

تفسیر۔ ماتسبق اور مایستاخرون کا مفہوم بالعموم لوگوں نے مبہم سا بیان کیا ہے۔ میرے نزدیک ماتسبق کا مطلب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ عذاب سے کوئی قوم جس کے متعلق عذاب کی خبر ہو دامن چھڑا کر نکل جائے یعنے عذاب تو وقت پر آجائے لیکن نقصان نہ پہنچائے اور وہ ہلاکت سے بچ جائے۔ اور نہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ قوم عذاب سے پیچھے رہ جائے یعنے عذاب ٹلتا ہی چلا جائے۔ اور ملتوی ہوتا جائے گویا ڈھیل بیشک ایک ضروری شے ہے اور نبی کے مخالفوں کو ضرور ملتی ہے۔ تا جو ہدایت پانے کے قابل ہیں۔ ہدایت پا جائیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا۔ کہ ڈھیل ہی ملتی جائے۔ اور عذاب نبی یا اس کے اتباع کے زمانہ میں ظاہر ہی نہ ہو۔ اس آیت میں کفار کو اس سے متنبہ کیا ہے۔ کہ اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھیں۔ کیونکہ وہ دو ہی طرح محفوظ رہ سکتے ہیں (۱) یا تو عذاب آئے۔ مگر ان کو ہلاک نہ کرے (۲) یا پھر عذاب ٹلتا ہی جائے۔ فرمایا یہ دونوں باتیں نہ ہونگی۔ پس ڈھیل پر دلیر نہ ہوں۔

[۷] حل لغات۔ اَلذِّكْرُ۔ اَلتَّلَفُّظُ بِالشَّيْءِ وَاِحْضَارُهٗ فِي الذِّهْنِ بِحَيْثُ لَا يَغِيْبُ عَنْهُ۔ ذکر کے معنی ہیں کسی چیز کا منہ سے ذکر کرنا اور ایسے طور پر یاد اور مستحضر فی الذہن کرنا کہ وہ بھول نہ جائے۔ اَلصِّيْتُ۔ شہرت ومنہ لہ ذکر فی النّاس۔ اور انہی معنوں میں لہٗ ذکرٌ فی الناس کا فقرہ بولتے ہیں کہ فلاں شخص کو لوگوں میں شہرت حاصل ہے۔ الثناء۔ تعریف۔ الشرف۔ شرف۔ وفی القرآن اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ۔ اور قرآن مجید میں اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہ قرآن مجید کا نزول تیرے اور تیری قوم کے لئے شرف کا موجب ہے۔ وَالصَّلٰوةُ لِلّٰهِ تَعَالٰى وَالدُّعَاءُ اللہ تعالےٰ کے حضور دُعا۔ چنانچہ انہی معنوں میں یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے۔ اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ فَزِعَ اِلَى الذِّكْرِ کہ جب مصیبت کا سامنا ہوا۔ تو اس نے دُعا کی طرف جلدی کی۔ اَلْكِتَابُ فِيْهِ تَفْصِيْلُ الدِّيْنِ وَوَضْعُ الْمِلَلِ ایسی کتاب جس میں دین کی تفصیل ہو اور شریعت کے اُصول بیان کئے گئے ہوں۔ مِنَ الرِّجَالِ۔ القویّ الشجاعُ الاَبیّ۔ ایسا بہادر شخص جو کسی کا رعب برداشت نہ کرے۔ مِنَ الْمَطَرِ۔ اَلْوَابِلُ الشَّدِيْدُ۔ سخت موسلا دھار بارش۔ مِنَ الْقَوْلِ۔ الصُّلْبُ الْمَتِيْنُ۔ پکی بات (اقرب)

اَلْمَجْنُوْنُ۔ جُنَّ الرَّجُلُ۔ جَنًّا وَجُنُوْنًا زَالَ عَقْلُهٗ وَقِيْلَ فَسَدَ عقل جاتی رہی یا عقل میں فتور آگیا۔ اَلْجُنُوْنُ مصدر جَنَّ۔ جنون۔ جَنَّ کا مصدر ہے جس کے معنے ہیں۔ چھپانا۔ زَوَالُ الْعَقْلِ۔ عقل کا جاتے رہنا۔ وقیل فَسَادُهٗ۔ عقل میں خرابی کا پیدا ہونا۔ المجنونُ من زَالَ عقلُہٗ او فَسَدَ۔ اور مجنون ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل جاتی رہے۔ یا عقل میں فتور پیدا ہو جائے (اقرب)

[۱] اس آیت میں کفار کو ایک تنبیہ۔

[۲] المجنون

[۱] الذکر

القاموس العصری میں (جو انگریزی اور عربی کی اچھی لغت ہے) مجنون کے معنے میں لکھا ہے:-

MAD, CRAZY INSANE FOOL, FOOLISH

دیوانہ۔ کم عقل۔ پاگل۔ احمق۔ بے وقوف۔
مفردات میں ہے۔ اَلْجِنَّةُ۔ جَمَاعَةُ الْجِنِّ۔ قال تعالٰی مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ وقال تعالٰی وَجَعَلُوْا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا۔ جِنَّةٌ کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ لفظ جن کی جمع ہے جیسا کہ قرآن کریم کی مذکورہ بالا دو آیات سے ظاہر ہے۔ یعنی مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ اور جَعَلُوْا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا سے۔ اور دوسرے معنے اس کے جنون کے ہیں جیسا کہ لکھا ہے۔ اَلْجِنَّةُ الْجُنُوْنُ وقال تعالٰی مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ۔ اے جُنُوْنٍ۔ یعنی جِنَّةٌ کے معنے جنون کے بھی ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم کی آیت مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ سے ظاہر ہے۔ وَالْجُنُوْنُ حَائِلٌ بَيْنَ النَّفْسِ وَالْعَقْلِ اور جنون ایک قسم کی روک کا نام ہے جو انسان کی طبیعت اور اس کی عقل کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے۔ وجُنَّ فُلَانٌ قِيْلَ اصابه الجِنُّ یعنی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب جُنَّ فُلَانٌ کہا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے جن چمٹ گئے ہیں۔ وَبُنِيَ فِعْلُهٗ عَلٰى فُعِلَ كَبِنَاءِ الْاَدْوَاءِ نَحْوُ زُكِمَ وَلُقِيَ وَحُمَّ۔ اور جُنَّ بصیغہ مجہول اس لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہ یہ بھی ایک بیماری ہے اور بیماریوں کے لئے یہ صیغہ بالعموم استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً زکام والے لقوہ والے اور تپ والے کے متعلق زُكِمَ۔ لُقِيَ اور حُمَّ استعمال ہوتا ہے۔ وقیلَ اُصِيْبَ جَنَانُهٗ۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے دل کو صدمہ پہنچ کر عقل ماری گئی ہے۔ وقِيْلَ حِيْلَ بَيْنَ نفسهٖ وعقلهٖ فَجُنَّ عَقْلُهٗ بذلك۔ اور بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس کے اور اس کی عقل کے درمیان کوئی روک پیدا ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے وہ عقل سے کام نہیں لے سکتا یہ مفردات والے نے مختلف لوگوں کا خیال جنون کی ماہیت کے متعلق بتایا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ ضروری نہیں کہ جب کسی کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ مجنون ہے تو عربی زبان میں اس کے یہی معنے ہوں کہ اسے جن چمٹ گئے بلکہ اس کے اصل معنے تو یہی ہوں گے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ باقی بعض لوگ جو وہمی ہیں جنون کی تشریح یہ کریں گے کہ کسی جن نے ناراض ہو کر اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ بعض لوگ جو احساسات کو بیماریوں کا منبع قرار دیتے ہیں۔ یہ کہیں گے کہ اس کے دل کو کوئی صدمہ پہنچا ہے اور بعض لوگ جو طبیعی ہیں یہ قرار دیں گے۔ کہ اس کے دماغ میں کوئی نقص ہو گیا ہے۔ غرضکہ جنون کے معنے جن چمٹ جانے کے نہیں۔ بلکہ جنون کا سبب بعض کے نزدیک جن کا چمٹ جانا ہے۔ وَقَوْلُهٗ مُعَلَّمٌ مَجْنُوْنٌ اے ضَامَّةُ من يُعَلِّمُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَكَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى اَئِنَّا لَتَارِكُوْا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ قرآن مجید کی آیت مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ اور لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ میں مجنون کے معنے مَنْ يُعَلِّمُهُ الْجِنُّ کے ہیں۔ یعنی جسے جن سکھاتے ہیں۔ (مفردات کے یہ معنے تفسیری ہیں یعنی مختلف تفاسیر کے اثر کے نیچے انہوں نے یہ معنے لکھ دیئے ہیں۔ ورنہ محقق لغت میں یہ معنے نہیں۔ لغت میں مجنون کے معنے یہی ہیں۔ کہ جسے جنون کی بیماری ہو

تفسیر: پہلے فرمایا تھا۔ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ۔ کہ بارہا کفار مسلم ہونے کی خواہش کریں گے۔ اب فرمایا کہ کفار اس بات کو سن کر کہ وہ ہلاک کر دیئے جائیں گے نہایت تعجب کریں گے اور کہیں گے کہ تو ضرور پاگل ہے۔ جو ایسی باتیں کرتا ہے ہم تو جلد ہی تجھے اور تیرے متبعین کو کچل ڈالیں گے۔

رُبَمَا کے معنے مستقبل کے کیئے جائیں اور یہ مُراد ہو۔ کہ اسلام کی ترقیات کو دیکھ کر کفار کبھی کبھی یہ خواہش کریں گے۔ کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔ یا کاش ہم مسلمانوں کا مقابلہ نہ کرتے۔ یا کاش ہم اللہ تعالیٰ کے توکل پر عمل پیرا ہوتے تو اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ جب کفار اس اعلان کو سنتے ہیں۔ کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ اسلام کی ترقی کو دیکھ کر کفار کہیں گے۔ کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔ تو وہ اس دعویٰ کو مجنونانہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو پاگل ہے جو ایسے دعوے کرتا ہے۔ ہم اسلام کے دشمن ایسی خواہش کس طرح کر سکتے ہیں اور ایسی ترقی تجھے اور تیرے اتباع کو کب مل سکتی ہے۔

اس آیت میں اَلذِّكْر کا لفظ آیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا نام کفار میں بھی معروف معلوم ہوتا ہے۔ ذکر کے معنی شرف کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (انبیاء ع) ہم نے تمہاری طرف وہ کتاب اُتاری ہے جس میں تمہاری عزت کے سامان ہیں چونکہ اس جگہ اسلام کی ترقی کا ذکر ہے اور کفار کی ذلت کا۔ اس لئے کفار طنزاً الذکر کے لفظ سے قرآن کا ذکر کرتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ " اے وہ شخص جس پر ایسا معزز اور ممتاز کلام اُترا ہے کہ ہم جیسے بھی خواہش کریں گے کہ ہم اسکے ماننے والے ہوتے۔ تو پکا پاگل ہے"۔ بظاہر اس کلام کا پہلا حصہ دوسرے کے خلاف ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ اے وہ شخص جس پر یہ دُنیا کو عزت دینے والا کلام نازل کیا گیا ہے اور دوسری طرف کہتے ہیں۔ کہ تُو پاگل ہے۔ مگر طنزیہ کلام کی صورت میں یہ اختلاف باقی نہیں رہتا۔ یہ فقرہ ویسا ہی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوزخیوں کے متعلق آتا ہے کہ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (دخان ع) اے معزز اور شریف انسان دوزخ کا عذاب چکھ یعنی تم اپنے آپ کو عزیز و کریم کہتے تھے۔ اب دیکھو کہ تمہاری عزت اور کرم نے تم کو کس حالت تک پہنچا دیا ہے۔

اِنَّكَ الْمَجْنُوْن سے عیسائیوں کا استدلال

اِنَّكَ مَجْنُوْن۔ اس کے متعلق عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں ضرور کوئی جنون کا مادہ تھا ورنہ عرب لوگ آپؐ کو کیوں مجنون کہتے۔ اچھے بھلے آدمی کو کون پاگل کہتا ہے۔

رُبَمَا کے معنے مستقبل کے لینے کی صورت میں اس آیت کے معنے

مجنون کے معنوں کی تعیین میں عیسائیوں کی غلطی۔

اس اعتراض کے بیان میں انہوں نے پہلے تو مجنون کے معنوں کی تعیین میں غلطی کی ہے۔

سیل اس آیت کا ترجمہ یوں کرتا ہے:۔

THOU ART CERTAINLY POSSESSED BY A DEVIL

ضرور تجھ پر کوئی شیطان قابض ہے

روڈویل اس کا ترجمہ یوں کرتا ہے:۔

اَلذِّكْر قرآن مجید کا نام ہے۔

THOU ART SURELY POSSESSED BY A JINN

تجھ پر یقیناً کسی جن کا سایہ ہے

پامر لکھتا ہے:۔

VERILY THOU ART POSSESSED

تو تو بُری رُوحوں کے قبضہ میں ہے۔

کفار الذکر کا لفظ طنزاً کہتے ہیں۔

گویا مجنون ان کے نزدیک وہ شخص ہوتا ہے جس پر کوئی شیطان یا جن قابض ہو۔ حالانکہ اس جگہ یہ معنی مراد نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہیں۔ بلکہ جیسا کہ اوپر حل لغات میں بتایا گیا ہے مجنون کے معنے پاگل یا دیوانہ ہوتے ہیں۔

مجنون کے معنے دیوانہ یا پاگل کے ہوتے ہیں۔

مجنون کے معنے اقرب الموارد میں لکھے ہیں مَنْ زَالَ عَقْلُهٗ اَوْ فَسَدَ جس کی عقل جاتی رہے یا عقل میں خرابی آجائے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو حل لغات)

اصل میں یوروپین مصنفین نے اپنے عیب کو چھپانے

آنحضرتؐ پر عیسائیوں کا الزام اپنے عیب کو چھپانے کے لئے ہے

کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ یہودی حضرت مسیحؑ کو کہتے تھے کہ اس پر جن سوار ہے۔ مگر انہوں نے اتنا غور نہ کیا کہ وہاں کہنے والے یہودی ہیں اور اس جگہ مشرکین یہودیوں کے نزدیک تو جن ایک ناپاک رُوح ہے جس پر وہ سوار ہو۔ اس کے معنے ہیں کہ وہ گندا ہے۔ مگر مشرکین کے ہاں تو جنوں کی پُوجا کی جاتی تھی۔ اگر کفار کا یہی مطلب ہوتا۔ تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت نہ کرتے۔ بلکہ آپؐ سے ڈرتے۔

یسُوعؑ کو لوگ آسیب زدہ کہتے تھے

عیسائی معترضین کا غلط استدلال

پھر عیسائی معترضین نے دوسرا ظلم یہ کیا ہے کہ وہ لکھتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اہل مکہ جو مجنون کہتے تھے۔ اس کا ضرور کوئی سبب چاہیئے اور وہ سبب وہ یہ بتاتے ہیں۔ کہ آپؐ کو نعوذ باللہ من ذالک مرگی کے دَورے پڑتے تھے۔ اسکی تائید میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ واقعہ نقل کیا ہے۔ جو آپؐ کو حلیمہ دائی کے ہاں بقول بعض مؤرخین پیش آیا تھا۔ وہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ آپؐ نے جنگل میں دیکھا (جہاں بعض بڑے بچے جانور چرا رہے تھے) کہ دو آدمی براق لباس پہنے ہوئے آئے ہیں۔ انہوں نے آپؐ کو گرالیا اور آپؐ کے سینہ کو چاک کیا۔ اور کوئی سیاہ سی چیز اندر سے نکال کر پھینک دی عیسائی اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت بچے تھے۔ اس لئے جھوٹ تو نہیں بولتے تھے۔ لہٰذا مرگی کا دورہ ماننا پڑیگا

مسیحی معترضین کے اعتراض کا بطلان

مَیں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتا۔ کہ مرگی کے دورہ میں انسان اس قسم کے واقعات اور نظارے دیکھتا سوچتا۔ اور انہیں یاد رکھ سکتا ہے۔ یا کہ نہیں مَیں نے ڈاکٹری کتابیں دیکھی ہیں۔ جن میں اس مرض کی اقسام اور انکی کیفیات بیان ہیں۔ ان میں یہ ہرگز نہیں لکھا کہ انسان اس دورے کی حالت میں کسی نظارہ کو دیکھ کر با ترتیب یاد رکھ سکتا ہے اور پھر مرگی کے دورے والے کی آنکھیں شکل اور عقل اور دوسرے حالات سے ہی ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ مرگی کا مریض ہے۔ بلا وجہ معمولی سی تکالیف کو بار بار دُوہرانا۔ خالی الذہن نظر آنا۔ اور معمولی معمولی باتوں پر غصہ کرنا ایسے شخص کی عادت میں داخل ہوجاتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایسی کوئی بات پائی نہ جاتی تھی۔

عیسائی پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی وجہ نہ تھی تو ساری قوم انہیں کیوں مجنون کہہ رہی تھی۔ مَیں کہتا ہوں کہ خدا تعالےٰ نے دُنیا میں یسُوع نامی ایک اور آدمی بھی پیدا کیا ہے جس کو لوگ آسیب زدہ قرار دیتے تھے اور مجنون کہتے تھے۔ چنانچہ یوحنا ۱۰/۱۹-۲۰ میں لکھا ہے۔ کہ "ان باتوں کے سبب یہودیوں میں پھر اختلاف ہوا۔ ان میں بہتیرے تو کہنے لگے کہ اس میں بدرُوح ہے۔ اور وہ دیوانہ ہے۔ تم اسکی کیوں سنتے ہو" اس بزرگ کے ایک شاگرد پولوس نامی کی نسبت بھی لکھا ہے" جب وہ اس طرح جوابدہی کر رہا تھا۔ تو فیستس نے بڑی آواز سے کہا۔ اے پولوس تُو دیوانہ ہے۔ بہت علم نے تجھے دیوانہ کر دیا ہے" (اعمال ۲۶/۲۴) اب عیسائیوں کو چاہیئے کہ وہ پہلے مسیح اور پولوس کو دیوانہ کہنے کا سبب مرگی کا دورہ ثابت کریں اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ اپنے گھر کا کام مقدم ہوتا ہے۔

کاش یہ مسیحی معترضین انصاف سے کام لیتے اور غور کرتے۔ تو اگر حضرت مسیح کو بغیر مرگی کے دوروں کے صرف وعظ سُن کر پاگل کہا جا سکتا ہے۔ تو کیوں رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ کے عظیم الشان دعوے کرنے والے کو روحانی عالم سے ناواقف لوگ پاگل نہیں کہہ سکتے تھے۔

مسیحیوں کا یہ اعتراض اور بھی قابل تعجب ہوجاتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیات میں کفار کی پیش کردہ وجہ بھی بیان ہے جس کی بنا پر وہ آپؐ پر جنون کا الزام لگاتے تھے۔ وہ اس الزام کی وجہ مرگی کو بیان نہیں کرتے۔ بلکہ

تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

اگر تو سچا ہے تو کیوں ملائکہ کو ہمارے سامنے نہیں لاتا ۵۸

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا

(کیا انہیں معلوم نہیں کہ) ہم (جب بھی) فرشتوں کو (اتارتے ہیں تو) حق کے مطابق اُتارتے ہیں۔ اور (جب کافروں کے لئے اتارتے

مُّنْظَرِيْنَ ○ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ

ہیں تو) اس وقت انہیں (ذرہ بھی) مہلت نہیں دی جاتی ۵۹ اس ذکر کو ہم نے ہی اُتارا ہے اور ہم یقیناً اسکی

آپ کے دعاوی کے بعید از عقل ہونے کو اسکی وجہ قرار دیتے ہیں اور یہ بات ہر نبی میں پائی جاتی ہے۔ کوئی نبی نہیں جس نے وہ باتیں نہ کی ہوں جن کو اس زمانہ کے لوگ ماننے کو تیار نہ تھے۔

۵۸ حل لغات۔ لَوْمَا اور لَوْلَا اور هَلَّا ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ نحاس کا قول ہے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کیوں ایسا نہیں کرتے۔ مطلب یہ کہ ایسا کرو۔

تفسیر۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دعوےٰ گزشتہ سورتوں میں پیش کیا گیا تھا اور اس سورۃ کا شروع بھی اسی تسلسل میں تھا کہ اسلام کی فتح اس کلام کے ذریعہ سے ہوگی۔ جو خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا ہے وہ کلام اپنے اندر ایسی خوبیاں رکھتا ہے کہ اس کے مقابل پر کفار کا زور نہ چل سکے گا۔ کفار نے اس دعویٰ کے بالمقابل لاجواب ہوکر یہ دعویٰ پیش کر دیا کہ تم تو مجنون ہو اور مجنون ہونے کی یہ دلیل دی کہ تم کہتے ہو کہ یہ کلام تم پر فرشتے لے کر آتے ہیں۔ اگر تمہارا یہ قول درست ہوتا تو پھر وہ فرشتے دوسرے لوگوں کو بھی نظر آتے لیکن چونکہ وہ دوسرے لوگوں کو نظر نہیں آتے معلوم ہوا کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ اور تمہارے جنون کی علامت ہے۔

۵۹ حل لغات۔ حق کی تشریح کے لئے دیکھیں سورۃ رعد ۵ا

مُنْظَرِيْنَ۔ اَنْظَرَهُ الدَّيْنَ۔ اَخَّرَهٗ۔ قرض ادا کرنے کے لئے قرضدار کو مزید مہلت دی۔ يُقَالُ كُنْتُ اَنْظُرُ الْمُعْسِرَ اَىْ اُمْهِلُهٗ یعنی کنت انظر المعسر کا فقرہ انہی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہ میں تنگدست قرضدار کو مہلت دیا کرتا تھا۔ (اقرب)

مُنْظَرِيْنَ

لَوْمَا

تفسیر۔ حَقّ کے معنے پہلے گزر چکے ہیں۔ اس جگہ بِالْحَقِّ یا تو اس کے معنے سچے کلام کے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ فرشتے کلام الٰہی کے ساتھ اُترا کرتے ہیں۔ مگر تم نہ رسول ہو کہ تم پر فرشتے اُتریں۔ اور نہ ہی تم اس بات کے مستحق ہو کہ تمہیں کلام الٰہی سے مشرف کیا جائے۔ یا اس جگہ پر حق کے معنے استحقاق کے ہیں۔ یعنے جیسا جیسا کسی کا حق ہو اس کے مطابق فرشتے اُترتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے نبیوں اور مومنوں پر ان کے حق کے مطابق۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو فرشتے اترتے ہیں۔ وہ تو رحمت کے فرشتے ہیں۔ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی نظر آسکتے ہیں وہ آپؐ خدا تعالیٰ کا غضب سہیڑنے والوں کو کس طرح نظر آجائیں ان پر تو جب فرشتے اُتریں گے غضب ہی کے اُتریں گے اور اس وقت فرشتوں کا دیکھنا انہیں نفع نہ دے گا۔ کیونکہ وہ ان کے ہلاک کرنے کے لئے آئیں گے۔ اور ان کے آنے کے بعد آئمۃ الکفر کو ڈھیل نہ ملے گی۔ چنانچہ بدر کے موقعہ پر یہ

بِالْحَقِّ کے تین معنے

کفار کا لاجواب ہوکر آنحضرتؐ کو مجنون کہنا۔

تحقق

لَحٰفِظُوْنَ ○ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ

حفاظت کریں گے ۔ شنہ اور ہم نے (زمانہ کے) لوگوں کی جماعتوں میں (بھی) تجھ سے پہلے رسول بھیجے

سزا دینے والے فرشتے آئے اور بعض کفار کو کشفی حالت میں وہ نظر بھی آئے مگر وہ وقت ان کی ہلاکت کا تھا۔ اس سے وہ کیا فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔

ہر ایک نبی کا کلام اسکی شان کے مطابق ہوتا ہے۔

اس جگہ ایک بہت بڑا نکتہ بیان فرمایا گیا ہے وہ یہ کہ ملائکہ کا کلام انسان کے قلب کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسا انسان ہوگا۔ ویسے ہی اس کے الہام ہونگے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ الہام ہوگیا۔ تو ہم بڑے آدمی ہوگئے حالانکہ یہ کافی نہیں۔ کیونکہ الہام انسان کی اپنی فطرت کے مطابق ہی ہُوا کرتا ہے۔ قادیان میں ایک پہاڑی شخص مزدوری وغیرہ کی غرض سے آیا کرتا تھا۔ وہ عموماً ہمارے ہاں ہی مزدوری وغیرہ کرتا تھا۔ بعض اوقات کسی کام کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کے پاس چلا جاتا۔ تو حضرت خلیفہ اوّلؓ اسے نماز کی تاکید فرمایا کرتے تھے جس پر وہ جواب دیا کرتا کہ "نماز سانوں بجدی نیں" (یعنی نماز ہمارے حسب حال نہیں) اتفاقاً ایک روز آپ نے اسے مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا۔ فراغت کے بعد پوچھا کیا بات ہے؟ تو اس نے جواب دیا۔ آج مجھے الہام ہوا ہے کہ "اُٹھ اوئے سورا نماز پڑھ" اے سور اٹھ کر نماز پڑھ۔ اس لئے میں نے نماز شروع کر دی ہے۔ اب ظاہر ہے۔ کہ یہ الہام شیطان کی طرف سے تو ہو نہیں سکتا۔ یہ یقیناً خدائی الہام تھا۔ مگر اس کے درجہ کے مطابق تھا۔ پس خالی الہام کو نہیں دیکھا جائے گا۔ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس الہام کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا محبت کا بھی اظہار ہے یا اس بندے کی شان کے اظہار کی بھی کوئی صورت ہے۔

ملائکہ کا کلام انسان کے قلب کے مطابق ہوتا ہے۔

پہاڑی مزدور کا واقعہ۔

اَلذِّکْر

زیرِ تفسیر آیت سے تعلق۔

اس آیت سے ایک عام قانون کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ فرشتے بالحق نازل ہُوا کرتے ہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ نبیوں میں ادنیٰ۔ اعلیٰ۔ مامور و غیر مامور سب ہی شامل ہیں۔ اسی طرح نبیوں میں مرتبہ کا تفاوت پایا جاتا ہے۔ حضرت خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اسی طرح نبی کہلاتے ہیں جس طرح زکریا۔ الیاس اور یوسف علیہم السلام۔ پس جس طرح درجہ میں نام کی شرکت سب کو برابر نہیں بنا دیتی۔ اسی طرح سب کی وحی۔ وحی کہلا کر ایک سی نہیں ہو سکتی۔ ہر ایک نبی کا کلام اسکی شان کے مطابق ہوگا۔ اس اصل کو مدِ نظر رکھیں تو یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے۔ کہ تورات۔ انجیل زبور وغیرہ کیوں قرآن کریم کی طرح بے نظیر نہیں۔ جن انبیاء پر وہ کلام نازل ہوئے انہی کی شان کے مطابق ان میں خدا تعالیٰ نے برکت رکھی۔ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ مختلف درجوں کے کام مختلف نبیوں کو سُپرد کرتا لیکن سامان سب کو ایک سا دیتا۔ بہرحال کام کے مطابق ہی اس نے سامان دیئے تھے۔ اور کام کے مطابق ہی اس نے کارکن مقرر کرنے تھے۔

شنہ حل لغات۔ الذِّکْر کی تشریح کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ ہذا ۷ ؎ و سورہ یوسف ۱۰۵ ؎

تفسیر۔ ذکر کے معنے بتائے جا چکے ہیں کہ علاوہ اور معنوں کے اس لفظ کے معنے شرف اور نصیحت کے بھی ہیں۔ اس جگہ یہی معنے ہیں کفار نے طنزاً کہا تھا۔ کہ اے وہ شخص جس پر یہ عزت بخش کلام نازل ہُوا ہے۔ تو یقیناً مجنون ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے۔ یقیناً ہم نے ہاں ہم نے اس عزت بخش کلام کو نازل کیا ہے۔

یہ ایک نہایت ہی زبردست آیت ہے۔ اور ایسی عجیب ہے۔ کہ اکیلی ہی قرآن مجید کی صداقت کا بیّن ثبوت ہے۔ اس میں کتنی تاکیدیں کی گئی ہیں پہلے اِنَّ لایا گیا ہے۔ پھر نَا کی تاکید نَحْنُ سے کی گئی ہے۔ اور پھر آگے چل کر ایک اور اِنَّ اور لام لایا گیا ہے۔ گویا تاکید پر تاکید کی گئی ہے۔ کفار نے اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ کے جملہ میں دوسری تاکید سے کام لیکر تمسخر کیا تھا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ تاکید کے چار ذرائع استعمال کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ

إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ. سُنو! ہم نے ہاں یقیناً ہم نے ہی اس شرف و عزت والے کلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اُتارا ہے۔ اور ہم اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یقیناً ہم اسکی خود حفاظت کریں گے۔ اللہ اللہ کتنا زور ہے۔ کس قدر حتمی وعدہ ہے۔

اس آیت کے متعلق یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کفار کے طنز میں ایک یہ معنے بھی پائے جاتے ہیں کہ ایسا بڑا زبردست کلام جس نے دُنیا کو شرف بخشنا ہے اس کے ساتھ تو فرشتے بھی آنے چاہیئے تھے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اے نادانو! تم فرشتے کہتے ہو۔ اس کلام کی تو وہ عظمت ہے کہ اسکی حفاظت کے لئے ہم خود آئیں گے اور دیکھیں گے کہ کون اس کلام پر بدنیتی سے ہاتھ ڈالتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرشتے قرآن کریم کی حفاظت نہیں کرتے۔ کیونکہ جب خدا جو آقا ہے۔ وہ حفاظت کرتا ہے۔ تو فرشتے تو بدرجہ اولیٰ حفاظت کریں گے۔ مگر إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ فرما کر ایک زائد بات بیان کی کہ اس میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جنکی حفاظت فرشتے بھی نہیں کر سکتے بلکہ ان کی حفاظت اللہ تعالےٰ نے خود اپنے ذمے لی ہے۔ ہر چیز کی حفاظت فرشتے کرتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کے براہِ راست حفاظت کرنے میں ایک حکمت ہے۔ اور قرآن مجید کو عام چیزوں سے ممتاز کرنے والا فرق ہے جسے میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

یہ آیت اسلام کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ اور اگر کوئی بے تعصب انسان اس آیت پر غور کرے تو سمجھ سکتا ہے کہ یہ دعویٰ انسانی نہیں۔ تمام مفسر متفق ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ ابن ہشام کا بیان ہے۔ کہ یہ آیت دعویٰ نبوت کے چوتھے سال میں نازل ہوئی۔ انگریز مصنف عام طور پر اس بات کے شائق ہوتے ہیں کہ وہ مسلمان مفسرین سے اختلاف کریں۔ اور اسکے لئے انہوں نے ایک انٹرنل شہادت (اندرونی شہادت) کا قاعدہ بنا رکھا ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ بات قرآن کے اندر سے نکلتی ہے۔ مگر وہ اس طریق کو ایسا غلط اور بے جا استعمال کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ اندرونی شہادت قرآن کی نہیں ہوتی بلکہ ان کے نفس کی ہوتی ہے۔ مگر اس ضمن میں مجھے انگریزی حوالے دیکھتے ہوئے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس بارہ میں مستشرقین کو بھی اختلاف کی گنجائش نہیں ملی۔ چنانچہ سپرینجر نے کہا ہے۔ کہ یہ سورۃ دعویٰ نبوت کے چوتھے سال میں نازل ہوئی تھی۔ روڈویل جس نے ترتیب کی تحقیق کے متعلق بزعم خود ایک کمال حاصل کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ یہ سورۃ ابتدائی سالوں کی سورتوں میں سے ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ترتیب میں اسے ابتدائی سالوں کی سورتوں میں ہی رکھا ہے۔ نولڈک نے کسی قدر اختلاف کیا ہے۔ اور اس کی بنیاد وہی غلط قاعدہ (انٹرنل شہادت کا) ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

(۱) اس میں کفار کی سختیوں کا ذکر ہے۔ اس لئے یہ ابتدائی سالوں کی سورۃ نہیں ہوسکتی۔

(۲) اس میں يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ آتا ہے۔ یہ باقی ابتدائی سورتوں میں نہیں آتا۔ لہٰذا یہ بھی ابتدائی زمانہ کی نہیں۔

(۳) اس میں مشرکین کا لفظ ہے۔ اس لئے یہ ابتدائی زمانہ کی نہیں ہوسکتی۔ ہاں مکی ضرور ہے۔ مکی زندگی کے آخری ایام میں اُتری ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں۔ کہ نولڈک کی بات درست ہے یا دوسروں کی۔ مَیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نئی تحقیق والے عرب اور یوروپین مصنف مفسرین کے ساتھ مل کر بالاتفاق کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ مکی زندگی کے آخری سال بھی نہایت ہی خطرناک تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں سمیت شعب ابی طالب میں محبوس تھے۔ جبکہ مسلمانوں کو اپنی حفاظت کے لئے جگہ نہ ملتی تھی۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ فرشتوں کی کیا ضرورت ہے۔ ہم خود اسکی حفاظت کرینگے

کتنا زور دار اور پُرشوکت دعویٰ ہے۔ اس فقرہ
(اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ)
کی طاقت کو وہی لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو عربی
جانتے ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جب مسلمان خود گھرے
ہوئے تھے۔ اور ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے
کہا جاتا ہے کہ تم سارا زور لگالو اور قرآن مجید کے مٹانے
کے لئے پُوری طاقت خرچ کردو۔ ہم خود اسکی حفاظت
کریں گے۔ اور ایک دن ایسا آتا ہے کہ ان مخالفتوں
کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے
ساتھی آزاد ہوتے ہیں۔ آپ کو ترقی ملتی ہے۔ ایک عظیم الشان
جماعت آپ کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اور قرآن مجید کی کما حقہ
حفاظت ہوتی ہے۔ اور آج تک ہو رہی ہے۔ اور ہوتی
رہے گی۔ کیا یہ بے نظیر حفاظت دنیا کی اور کسی مذہبی کتاب
کو حاصل ہوئی ہے؟ سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمدؐ
میں بحث کے بعد لکھتا ہے۔

"WHAT WE HAVE, THOUGH POSSIBLY CREATED AND MODIFIED BY HIMSELF, IS STILL HIS OWN."

ترجمہ۔ اب جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ گو یہ بالکل ممکن
ہے کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے زمانہ
میں اسے خود بنایا ہو۔ اور بعض دفعہ اس میں خود ہی بعض
تبدیلیاں بھی کر دی ہوں۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ وہی
قرآن ہے۔ جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں دیا تھا

(۲) پھر وہ لکھتا ہے۔

"WE MAY UPON THE STRONGEST PRESUMPTION AFFIRM THAT EVERY VERSE IN THE QUR'AN IS GENUINE AND UNALTERED COMPOSITION OF MUHAMMAD HIMSELF."

ترجمہ۔ ہم نہایت مضبوط قیاسات کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں۔
کہ ہر ایک آیت جو قرآن میں ہے وہ اصلی ہے۔ اور محمدؐ
(آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی غیر محرّف تصنیف ہے

(۳) پھر یہ بحث کرنے کے بعد کہ قرآن کی ترتیب ہمیں سمجھ
نہیں آتی۔ لکھتا ہے۔ کہ:۔

"THERE IS OTHERWISE EVERY SECURITY INTERNAL AND EXTERNAL THAT WE POSSESS THE TEXT WHICH MUHAMMAD HIMSELF GAVE FORTH AND USED"

ترجمہ۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس ہر ایک قسم کی ضمانت
موجود ہے۔ اندرونی شہادت کی بھی اور بیرونی کی بھی۔ کہ یہ
کتاب جو ہمارے پاس ہے۔ وہی ہے جو خود محمدؐ (صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم) نے دُنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ اور اسے استعمال
کیا کرتے تھے۔

(۴) پھر لکھتا ہے:۔

"AND CONCLUDE WITH ATLEAST A CLOSE APPROXIMATION TO THE VERDICT OF VAN HAMMER THAT WE HOLD THE QUR'AN TO BE AS SURELY MUHAMMAD'S WORDS AS THE MUHAMMADANS HELD IT TO BE THE WORD OF GOD."

ترجمہ۔ ہم وان ہیمر کے مندرجہ ذیل فیصلہ کے بالکل مطابق
نہ سہی۔ کم سے کم اس کے خیال کے بہت موافق فیصلہ تک
پہنچتے ہیں۔ وان ہیمر کا فیصلہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو
قرآن موجود ہے۔ اس کے متعلق ہم ویسے ہی یقین سے کہہ
سکتے ہیں۔ کہ وہ اصلی صورت میں محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

کا بنایا ہوا کلام ہے۔ جس یقین سے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ وہ خدا کا غیر مبدل کلام ہے۔

(۵) نولڈک کا قول ہے۔

"SLIGHT CLERICAL ERRORS THERE MAY HAVE BEEN, BUT THE QUR'AN OF OTHMAN CONTAINS NONE BUT GENNINE ELEMENTS, THOUGH SOMETIMES IN VERY STRANGE ORDER. EFFORTS OF EUROPEAN SCHOLARS TO PROVE THE EXISTENCE OF LATER INTERPOLATIONS IN THE QUR'AN HAVE FAILED."

ترجمہ — ممکن ہے کہ تحریر کی کوئی معمولی غلطیاں (طرز تحریر) ہوں تو ہوں۔ لیکن جو قرآن عثمانؓ نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس کا مضمون وہی ہے جو محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پیش کیا تھا۔ گو اسکی ترتیب عجیب ہے۔ یوروپین علماء کی یہہ کوششیں کہ وہ ثابت کریں کہ قرآن میں بعد کے زمانہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن)

یہ وہ شہادتیں ہیں جو اسلام کے شدید ترین دشمنوں کی ہیں۔ اور۔ اَلْفَضْلُ مَاشَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ۔

قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے پر کتنی بڑی شہادت ہے کہ قرآن کریم امیوں میں آتا ہے اور ہر طرح سے محفوظ رہتا ہے، مگر تورات اور انجیل اپنے زمانہ کی علمی قوموں میں آئیں۔ لیکن محفوظ نہ رہ سکیں۔ میور اس کے متعلق کیا ہی پُرحسرت الفاظ لکھتا ہے۔

"TO COMPARE THEIR PURE TEXTS WITH THE VARIOUS READINGS OF OUR SCRIPTURES IS TO COMPARE THINGS BETWEEN WHICH THERE IS NO ANALOGY."

ترجمہ۔ مسلمانوں کی بالکل پاک اور غیر تبدیل شدہ کتاب اور ہماری کتب کے مختلف نسخوں کے باہمی اختلاف کا مقابلہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ دو ایسی چیزوں کا مقابلہ کیا جائے جن میں باہمی کوئی بھی مشابہت نہیں۔

(قرآن مجید کے غیر محرف ہونے کے متعلق میور کا اعتراف)

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ایک اتفاق ہے کہ قرآن شریف آج تک محفوظ ہے؟ اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ اسکی ظاہر حفاظت الکتاب اور قرآن مبین کے دو ذریعوں سے ہوتی ہے۔ جن کا ذکر اس سورۃ کے شروع ہی میں کیا گیا ہے۔ شروع نزول ہی سے اسکی آیات لکھی جانے لگیں اور اسکی حفاظت ہوتی گئی اور پھر اللہ تعالےٰ نے اسے ایسے عشاق عطا کئے۔ جو اس کے ایک ایک لفظ کو حفظ کرتے اور رات دن خود پڑھتے اور دوسروں کو سُناتے تھے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کے کسی نہ کسی حصے کا نمازوں میں پڑھنا فرض مقرر کر دیا اور شرط لگا دی کہ کتاب میں سے دیکھ کر نہیں بلکہ یاد سے پڑھا جائے۔ اگر کوئی کہے۔ کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک بات سوجھ گئی تھی تو ہم کہتے ہیں کہ یہی بات زرتشت۔ موسیٰ اور وید والوں کو کیوں نہ سوجھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سوجھانے والا کوئی اور ہے۔ کولمبس جب امریکہ کو دریافت کر کے واپس آگیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ ہم جاتے تو ہم بھی امریکہ کو دریافت کر لیتے۔ مگر کولمبس نے اس کے جواب میں ایک انڈا دے کر کہا کہ تم یہ انڈا میز پر کھڑا کر دو۔ سب نے کوشش کی۔ مگر وہ کھڑا نہ ہوا۔ آخر میں کولمبس اُٹھا اور اس نے

(قرآن شریف کا محفوظ ہونا اتفاقی بات نہیں)

(نولڈکی کا اعتراف کہ قرآن مجید میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔)

ایک سوئی سے اس میں چھید کیا اور اس سے جو لعاب نکلا

قرآن مجید کی حفاظت کے چار سامان

اس کی مدد سے اسے میز پر کھڑا کر دیا۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ ایسا تو ہم بھی کر سکتے تھے کولمبس نے کہا کہ امریکہ کی دریافت کے بارہ میں تو تم نے کہدیا کہ ہمیں موقعہ نہیں ملا۔ مگر اس بارہ میں تو تم کو موقعہ مل گیا تھا۔ کیوں نہ تم نے اپنی عقل سے کام لیا

قرآن کریم کو بے معنے پڑھنے پر عیسائیوں کا اعتراض اور اس کا جواب

پس ایسا ہی ہم بھی کہتے ہیں کہ وہ ذرائع حفاظت کے جو قرآن کے بارہ میں استعمال کئے گئے آخر کیوں قرآن کریم کے پیش کرنے والے کو ہی سوجھے کیوں دوسری جماعتوں نے اسے استعمال نہ کیا۔

یہ بھی یاد رہے کہ ایسے آدمیوں کا میسر آنا جو اسے حفظ کرتے اور نمازوں میں پڑھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طاقت میں نہ تھا۔ ان کا مہیا کرنا آپؐ کے اختیار سے باہر تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ کہ ایسے لوگ ہم پیدا کرتے رہیں گے جو اسے حفظ کریں گے۔ آج اس اعلان پر تیرہ سو سال ہو چکے ہیں اور قرآن مجید کے کروڑوں حافظ گذر چکے ہیں بعض یوروپین ناواقفیت کی وجہ سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ اتنا بڑا قرآن کس کو یاد رہتا ہوگا۔ مگر قادیان ہی میں کئی حافظ مل سکتے ہیں جنہیں اچھی طرح سے قرآن یاد ہے چنانچہ میرے بڑے لڑکے ناصر احمد سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی گیارہ سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

قرآن مجید ایسی لغۃ میں نازل ہوا ہے کہ وہ سہولت سے یاد ہو جاتا ہے۔

نے قرآن مجید کو اپنے خاص تصرف سے ایسے الفاظ اور ایسی ترکیب سے نازل فرمایا ہے کہ وہ سہولت سے حفظ ہو جاتا ہے قرآن شعر نہیں مگر شعر سے بھی زیادہ جلد یاد ہو جاتا ہے اُردو یا انگریزی کی عبارتوں کی نسبت قرآن شریف کے حفظ کرنے پر نصف وقت بھی صرف نہیں ہوتا

ایک انگریز مترجم قرآن لکھتا ہے کہ قرآن ایسی عبارت میں ہے کہ اس کو بغیر ترتیل کے پڑھنے کے چارہ ہی نہیں۔ پس قرآن مجید کی زبان ان اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ سامانوں میں سے ہے جن کے ذریعہ سے قرآن مجید کی حفاظت کی جاتی ہے۔ سب سے اوّل اللہ تعالیٰ نے ایسے آدمیوں کو پیدا کیا جو اسے شروع سے لے کر آخر تک حفظ کرتے تھے۔ دوسرے اسکی زبان ایسی سہل اور دلنشین بنائی کہ سہولت سے یاد ہو جائے۔ سوم اسکی تلاوت نمازوں میں فرض کر دی چہارم۔ لوگوں کے دلوں میں اس کے پڑھنے کی غیر معمولی محبت پیدا کر دی۔

عیسائی لوگ ہمیشہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ مسلمان قرآن کریم کو بے معنی ہی پڑھتے رہتے ہیں۔ اس کے معنی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بھی اس آیت میں مذکور وعدہ کی تصدیق ہے مسلمانوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح قرآن کریم کی محبت ڈال دی ہے کہ معنی آئیں یا نہ آئیں وہ اسے پڑھتے چلے جاتے ہیں یقیناً ہر مسلمان کا فرض ہے کہ قرآن کریم کو بامعنی پڑھے اور اس طرف سے تغافل بڑی تباہی کا موجب ہوا ہے۔ مگر باوجود معنے نہ جاننے کے مسلمانوں کا قرآن کریم کو یاد کرتے چلے جانا یقیناً اس آیت میں مذکور وعدہ کے پورا ہونے کی دلیل ہے۔

آج اگر بائیبل کے سارے نسخے جلا دیئے جائیں تو بائبل کے پیرو اس کا بیسواں حصہ بھی دوبارہ جمع نہیں کر سکتے لیکن قرآن مجید کو یہ فخر حاصل ہے کہ اگر (بفرض محال) سارے نسخے قرآن مجید کے دنیا سے مفقود کر دیئے جائیں تب بھی دو تین دن کے اندر مکمل قرآن مجید موجود ہو سکتا ہے اور بڑے شہر تو الگ رہے ہم قادیان جیسی چھوٹی بستی میں اسے فوراً حرف بحرف لکھوا سکتے ہیں۔

دنیا کی کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں کہ جسے مٹا دیا جائے اور وہ پھر بھی محفوظ رہے۔ سوائے قرآن پاک کے۔

ایک ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کیلئے یہ مقرر فرمایا کہ ایسے سامان کر دیئے کہ قرآن مجید اپنے نزول کے معاً بعد تمام دنیا میں پھیل گیا اور اب اس میں تغیر و تبدل کا امکان ہی نہیں۔ ہاں کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ روسی حکومت نے ارادہ کیا کہ جہاد کی آیات نکال کر قرآن چھپوائیں۔ مگر اسے بتایا گیا کہ قرآن مجید تو تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ آیات

ہر جگہ موجود ہیں۔ پھر تم ان کو کیسے نکال سکو گے۔ اس سے وہ اپنے ارادوں سے باز رہی۔

ایک ذریعہ قرآن مجید کی حفاظت کا یہ تھا کہ اسلامی علوم کی بُنیاد قرآن مجید پر قائم ہوئی۔ اس ذریعہ سے اسکی ہر حرکت و سکون محفوظ ہو گئے۔ مثلاً نحو پیدا ہوئی تو قرآن مجید کی خدمت کے لئے۔ چنانچہ نحو کے پیدا ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ابوالاسود دؤلی حضرت علیؓ کے پاس آئے کہ ایک نیا مسلمان "اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ" کی بجائے "وَرَسُوْلِهٖ" پڑھ رہا تھا۔ جس سے ڈر ہے۔ کہ نومسلموں کو قرآن مجید کے مطالب سمجھنے میں مشکل پیش آئے حضرت علیؓ اس وقت گھوڑے پر سوار جا رہے تھے۔ اسی حالت میں آپ انہیں بعض قواعد نحو بتلاتے چلے گئے اور فرمایا کہ اس قسم کے قواعد کو ضبط میں لے آؤ۔ اس سے ان نومسلموں کو صحیح تلاوت کی توفیق ملے گی اور کچھ قواعد بنا کر فرمایا۔ اُنْحُ نَحْوَهٗ یعنی اسی رنگ میں اور قواعد تیار کر لو اس فقرہ کی وجہ سے عربی گرامر کا نام نحو پڑ گیا۔ پھر مسلمانوں نے تاریخ ایجاد کی۔ تو قرآن مجید کی خدمت کی غرض سے۔ کیونکہ قرآن مجید میں مختلف اقوام کے حالات آئے تھے۔ ان کو جمع کرنے لگے۔ تو باقی دُنیا کے حالات بھی ساتھ ہی جمع کر دیئے۔ پھر علم حدیث شروع ہُوا۔ تو قرآن مجید کی خدمت کے لئے۔ تا معلوم ہو سکے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے کیا معنے کئے ہیں۔

پھر اہل فلسفہ کے قرآن مجید پر اعتراضات کے دفعیہ کے لئے مسلمانوں نے فلسفہ وغیرہ علوم کی تجدید کی اور علم منطق کے لئے نئی مگر زیادہ محقق راہ نکالی۔ پھر طب کی بنیاد بھی قرآن مجید کے توجہ دلانے پر ہی قائم ہوئی۔ نحو میں مثالیں دیتے تھے۔ تو قرآن مجید کی آیات کی۔ ادب میں بہترین مجموعہ قرآن مجید کی آیات کو قرار دیا گیا تھا۔ غرض ہر علم میں آیاتِ قرآنی کو بطور حوالہ نقل کیا جاتا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان سب کتابوں سے آیات کو جمع کیا جائے۔ تو ان سے بھی سارا قرآن جمع ہو جائے گا۔ مسلمانوں میں قرآن کریم کی خدمت کے لئے دوسرے علوم کی طرف رجوع کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہُوا کہ پہلی کتابوں سے تو دنیوی علماء کا طبقہ سخت بیزار تھا مگر مسلمانوں میں سے ان علوم کے ماہر ہمیشہ قرآن مجید کے خادم رہے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم سچے علوم کا دشمن نہیں۔ بلکہ مؤید ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت کے لئے علمی عربی زبان کی تبدیلی بند ہوگئی

ایک بہت بڑا ذریعہ قرآن مجید کی حفاظت کا یہ بھی ہُوا کہ نزول قرآن کے بعد علمی عربی زبان کی تبدیلی بند ہو گئی۔ عربی کے سوا دنیا میں کوئی ایسی زبان نہیں پائی جاتی۔ جو آج بھی وہی ہو جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھی۔ چار سو سال کے شیکسپیئر کی تین سو سال قبل کی انگریزی کی تشریح کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بہت بدل چکی ہے۔ مگر قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے پُرانی لغتوں کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جو شخص علمی عربی آج پڑھتا ہے وہ قرآن کریم کو بھی بغیر کسی کی مدد کے سمجھ سکتا ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت الہام کے ذریعہ

ان ظاہری سامانوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ایک ایسا ذریعہ بھی مقرر کیا۔ جس میں ملائکہ کا بھی دخل نہیں اور وہ الہام ہے۔ الہام میں ملائکہ بعض اوقات صرف پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ مگر انہیں اس کا سبب نہیں قرار دیا جا سکتا۔

حق یہ ہے کہ خدا کا کلام بندے کے ساتھ براہ راست ہوتا ہے۔ ملائکہ صرف بطور واسطے کے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ہم اس کلام کی آیندہ تازہ بتازہ الہام کے ذریعہ سے حفاظت کرتے رہیں گے۔ یعنی مجدد اور مامور وغیرہ مبعوث کرتے رہیں گے۔

قرآن مجید کی حفاظت مامورین اور مجددین کے ذریعہ

قرآن مجید کی حفاظت کیلئے علوم کی بحث

یہ ظاہر ہے کہ جس کتاب کے لفظ تو محفوظ ہوں۔ مگر معنوں کی حفاظت نہ ہو وہ محفوظ کتاب نہیں کہلا سکتی۔ مثلاً وید ہیں اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ لفظاً محفوظ ہیں۔ تو بھی وہ کتاب کامل ہونے کے لحاظ سے محفوظ نہیں۔ کیونکہ جس زبان میں وہ نازل ہوئے ہیں وہ محفوظ نہیں رہی۔ اس لئے اسکے

معانی بالکل مشتبہ ہوگئے ہیں۔ اب اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام پاکر کوئی شخص اس کے صحیح معانی نہ بتائے۔ تو کون یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس کا صحیح مطلب بیان کر رہا ہے۔ یا اس کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ یہ نقص اسی صورت میں دُور ہو سکتا ہے کہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد ایسے لوگ کھڑے ہوتے رہیں جو کتاب کے صحیح مفہوم کی طرف لوگوں کو بلاتے رہیں اور یہ حفاظت دائمی طور پر قرآن کریم ہی کو حاصل ہے۔ بیشک دوسری کتب سماویہ کو بھی اُس عرصہ میں کہ وہ زندہ کتب تھیں یعنے دُنیا کے لئے قابلِ عمل تھیں۔ یہ حفاظت حاصل تھی۔ مگر اب نہیں۔ اب صرف قرآن کریم ہی کو یہ حفاظت حاصل ہے۔ صرف اس کے ماننے والے ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ سے براہِ راست الہام پانے کے مدعی ہوتے چلے آئے ہیں اور اس زمانہ میں کہ دین سے غفلت انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا مامور مبعوث فرمایا ہے۔ جس نے کلی طور پر قرآن کی تفسیروں کو زوائد اور حشو سے پاک کر کے اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ حتّٰی کہ قرآن جو اسی زمانہ کے علوم کے سامنے ایک معذرت خواہ کی صورت میں کھڑا تھا۔ اب ایک حملہ آور کی صورت میں کھڑا ہے جس کے سامنے سب فلسفے اور مذاہب اس طرح بھاگ رہے ہیں جیسے شیر کے سامنے سے لومڑ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ الْمَلِكِ الْعَزِيْزِ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرا دعویٰ ہے کہ اس مامور کی اتباع کی برکت سے کسی علم کا تبع خواہ قرآن کریم کے کسی مسئلہ پر حملہ کرے۔ میں اس کا معقول اور مدلل جواب دے سکتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر ذی علم کو ساکت کر سکتا ہوں۔ خواہ وقتی جوش کے ماتحت وہ علی الاعلان اقرار کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ میں نے اس کا ربع صدی سے زیادہ عرصہ میں تجربہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب سے اس میدان میں داخل ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ظاہر و باطن میں کبھی مجھے اس بارہ میں شرمندہ ہونے کا موقعہ نہیں ملا۔

قرآن مجید کی معنوی حفاظت

قرآن مجید کا نام ذکر رکھے جانے کی وجہ

قرآن مجید کی حفاظت کے لئے حضرت مسیح موعود کی بعثت

غرض خدا تعالیٰ نے قرآن مجید کی معنوی حفاظت کا مدار صرف عقل پر ہی نہیں رکھا اور اسکی تشریح کا انحصار صرف انسانی دماغ پر ہی نہیں چھوڑا۔ بلکہ خود اپنے کلام سے اس کو ظاہر فرمانے کا ذمہ لیا ہے۔ جس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب اس طرح سے عملی پھل ظاہر ہوتے ہیں تو قرآن مجید کے محفوظ ہونے کا ایک بیّن ثبوت ملتا رہتا ہے۔ دوائی اگر فائدہ کرتی ہے۔ تو ہم اسے تازہ سمجھتے ہیں۔ ورنہ بوسیدہ سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید کے تازہ پھل بھی ثابت کرتے رہتے ہیں کہ قرآن مجید محفوظ اور زندہ کتاب ہے اور یہ قرآن مجید کی حفاظت کا ایسا زبردست ذریعہ ہے۔ جو اور کسی کتاب کو میسر نہیں اور نہ کبھی ہوگا۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ ذِکر کے معنے شرف اور نصیحت کے بھی ہیں۔ قرآن کریم کا نام ذکر اس لئے رکھا گیا کہ اس کے ذریعہ سے اس کے ماننے والوں کو شرف اور تقویٰ حاصل ہوگا پس اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ یہ کلام جس کا یہ دعویٰ ہے کہ میرے ذریعہ سے ماننے والوں کو شرف اور عزت اور تقویٰ ملے گا ہمارا ہی اُتارا ہوا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں یعنی ان صفات کو عملاً پورا کرنا ہمارا ہی کام ہے۔ اگر یہ صفات اسکی ظاہر نہ ہوں تو گویا اسکی تعلیم ضائع گئی۔ مگر ہم ایسا نہ ہونے دیں گے۔

اس آیت میں کفار کی تباہی اور مسلمانوں کے غلبہ کی بھی پیشگوئی ہے کیونکہ قرآن کریم ہر قسم کی سیاسی، اقتصادی اور نظامی تعلیمات کا مجموعہ ہے اور شرعی کلام جب تک اپنے ابتدائی ایام میں ایک حکومت کے ساتھ متعلق نہ ہو۔ اسکی تعلیم کے عملی حصہ کی خوبیاں پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ پس الذکر کی حفاظت کے لئے ایک حاکم قوم کی ضرورت تھی اور ایسی قوم کے قیام سے پہلے عرب کی موجود الوقت حکومت کی تباہی لازمی تھی۔

لوگ اسلامی حکومت کے قیام کو ایک اتفاق کہہ دیا کرتے ہیں۔ اول تو محض اسلامی حکومت کا قیام بھی ان حالات کو دیکھتے ہوئے جن میں وہ قائم ہوئی کسی صورت میں اتفاق نہیں کہلا سکتا۔ لیکن اس پیشگوئی کو دیکھتے ہوئے تو کوئی انسان جس میں

ذرا بھر بھی عقل ہو۔ اسے اتفاق نہیں کہہ سکتا۔

قرآن یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عربوں کی حکومت ٹوٹ کر انکی جگہ مسلمانوں کی حکومت ہو جائے گی۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئے گی۔ (۱) جو خدا ترس ہوں گے۔ (۲) جو دُنیا کی نگاہ میں اعلیٰ شرف والے قرار پائینگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہزاروں حکومتیں ٹوٹتی ہیں اور دوسری انکی جگہ لیتی ہیں۔ مگر کیا ہر حکومت کے ٹوٹنے کے بعد جو دوسری حکومت جگہ لیتی ہے وہ انہی صفات کی حامل ہوتی ہے۔ جن کا اوپر ذکر ہوا ہے؟ مگر اس پیشگوئی کے نتیجہ میں عرب کی حکومت ٹوٹ کر کیسی حکومت قائم ہوئی؟ شدید سے شدید دشمن بھی جو اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالیاں دیتا ہے جب ابوبکرؓ اور عمرؓ تک پہنچتا ہے۔ تو عزت سے گردن جھکا لیتا ہے اور ان کے تقویٰ اور عقل اور فہم اور نیک انتظام اور ایثار اور قربانی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس قسم کی حکومت کا قائم ہو جانا بھی کیا اتفاق کہلا سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ پیشگوئی کے ماتحت تھی اور قرآن کریم میں صاف کہہ دیا گیا تھا کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (انبیاء ع) ہم نے یقیناً تمہاری طرف ایک ایسی کتاب اُتاری ہے۔ جس میں تمہارے شرف دینی اور دنیوی عزت کے سامان موجود ہیں۔ پھر تم کیوں مخالفت سے باز نہیں آتے۔ اسی صفت کے کمال کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن کریم کا نام بعض دفعہ اَلذِّكْر آتا ہے اور آیت زیر تفسیر میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اے کفار! تم طنز سے کہتے ہو کہ اے وہ شخص جس پر وہ کلام نازل ہوا ہے جس میں ماننے والوں کے لئے بڑی عزت اور تقویٰ کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ تو پاگل ہے مگر میں تم کو بتاتا ہوں کہ یہ کلام میرا ہی نازل کیا ہوا ہے اور میں اس شرف کے وعدہ کو ضرور پورا کرکے رہوں گا۔ کیونکہ یہ شرعی کلام ہے اور بغیر اس کے کہ ابتدائی زمانہ میں اس کے ماننے والوں کو حکومت ملے اور دینی رتبہ کے ساتھ دنیوی رتبہ بھی حاصل ہو۔ یہ کلام عملی جامہ نہیں پہن سکتا اور غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ میں موجودہ نظام کو توڑ کر وہ نظام قائم کروں جس میں مسلمانوں کو قرآنی تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملے اور ان کو ایسے شرف اور تقویٰ کے اظہار کا موقعہ ملے جس کا وعدہ قرآن میں کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اس آیت کو وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ والی آیت کے ساتھ ملاکر دیکھنے سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

ہر نبی کے کلام کی حفاظت کی وجہ کے متعلق ایک سوال کا حل

ایک سوال کا حل اس موقعہ پر ضروری ہے۔ میں نے اس نوٹ کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ ہر نبی کے کلام کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اگلی آیات اس مضمون کی تصدیق کرتی ہیں اور یہ قانون ہر نبی کے متعلق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ درست ہے تو کیا (۱) پہلے انبیاء کی وحی اب تک بعینہٖ محفوظ ہے؟ (۲) اگر نہیں تو پھر یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ قرآن کریم ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ یہ بھی پہلے انبیاء کی وحیوں کی طرح کسی وقت بگڑ جائے گا

لفظ ذکر میں مسلمانوں کی ترقی کی پیشگوئی

اس سوال کا جواب خود آیت زیر تفسیر کے الفاظ ہی دے رہے ہیں۔ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ ہم قرآن کی حفاظت کریں گے یا کتاب کی حفاظت کریں گے بلکہ اَلذِّكْر کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ اس لفظ کو استعمال کرکے حفاظت کے دائرہ کو محدود کر دیا گیا ہے۔ جب تک

جب تک کوئی کلام الذکر رہے اسکی حفاظت کی جاتی ہے

کوئی کلام الذکر رہے یعنے (۱) ایک طرف تو بندہ اور خدا تعالیٰ کے تعلق کو قائم کرتا رہے (ذکر کے معنے یاد کرنے کے ہیں) اور بندہ کو ایسے قیام پر کھڑا رکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں سرشار رہے۔ اور (۲) دوسری طرف اسے ایسا مقام عطا کرے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتا ہے یعنے خدا تعالیٰ کی وحی اور نصرت اور امداد بندہ کو حاصل ہے۔ اسکی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے جو کلام ان خوبیوں کا حامل رہے گا۔ خدا تعالیٰ اسکی حفاظت کرے گا اور جو کلام ان خوبیوں کا حامل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسکی حفاظت چھوڑ دیگا۔

یہ امر ظاہر ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی کلام کو دنیا کے لئے قابل عمل سمجھے گا۔ اس میں یہ خوبیاں پائی جائیں گی۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی کلام کو ضرورت زمانہ کے پورا کرنے

الْاَوَّلِيْنَ ○ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا

تھے ۱۱ۃ اور جو رسول بھی ان کے پاس آتا تھا وہ اُس کی

قاصر قرار دے دیگا اور اس کی حفاظت چھوڑ دے گا تاکہ نئے سرے سے ایسا کلام نازل کرے۔ جو ضرورت زمانہ کے مطابق ہو تو مذکورہ بالا امور اس نئے کلام کے ذریعے پورے ہونے لگیں گے۔ اور سابق کلام سے پورے نہ ہونگے۔ اور جب وہ ضرورت جس کے لئے کلام الٰہی نازل ہوتا ہے۔ پوری نہ ہوگی۔ تو اسکی حفاظت کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ اور جب اللہ تعالےٰ کی حفاظت اُٹھ جائے گی تو شرارتی لوگوں کو اس کلام میں دخل دینے کا اور تحریف کرنے کا موقعہ بھی ملتا رہے گا۔

قرآن مجید ابتک الذکر ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ باوجود اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے کہ وہ ہر نبی کی وحی کی حفاظت کرے گا۔ پہلے انبیاء کی وحی اگر محفوظ نہیں رہی۔ تو قابلِ اعتراض نہیں۔ کیونکہ قرآن نے الذکر کی شرط لگائی ہے۔ جب تک وہ الذکر رہے۔ انکی حفاظت ہوتی رہی۔ جب وہ الذکر نہ رہے انکی حفاظت کا وعدہ بھی ختم ہو گیا۔ اور یہ کہ وہ الذکر نہ رہے۔ ایک بدیہی بات ہے۔ کم سے کم اپنے زمانہ میں ہم ہر سے ہر ایک اس کا تجربہ کرسکتا ہے۔ آجکل سوائے اسلام کے ایک مذہب بھی نہیں جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ اس کے پیروؤں میں کوئی ایسا شخص موجود ہے۔ جو الذکر کا عملی ثبوت ہو یعنے اس کا یہ دعویٰ ہو کہ اپنے مذہب کی کتاب پر عمل کر کے اسے خدا تعالےٰ کا قرب حاصل ہوگیا ہے۔ اور خدا تعالےٰ اسے یاد کرتا ہے یعنے اس سے کلام کرتا ہے اور اس کے لئے اپنی قدرتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جو الذکر کا مفہوم ہے۔ پس جب عملاً وہ کتب الذکر کا مصداق نہیں رہیں تو انکی حفاظت بھی جاتی رہی اور ان کے تحرّف و مبدّل ہونے میں کوئی آسمانی روک نہیں۔

ہر نبی کی وحی جب تک الذکر رہی اس کی حفاظت ہوتی رہی۔

باقی رہا سوال کا یہ حصہ کہ پھر کیوں قرآن کریم کی نسبت بھی یہ نہ تسلیم کیا جائے کہ وہ بھی حفاظت سے باہر ہوگیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اب تک الذکر ہے۔ اس پر چل کر آج بھی انسان خدا تعالےٰ کو پا سکتا ہے۔ پس چونکہ وہ اس ضرورت کو پُورا کر رہا ہے۔ جس کے لئے اسے نازل کیا گیا تھا۔ وہ خدا تعالےٰ کی حفاظت سے باہر نہیں ہوسکتا اور کسی کی جرأت نہیں ہوسکتی کہ اس کے اندر کوئی تغیر و تبدّل کرے۔

اب رہا سوال آیندہ کا سو اس کا اوّل تو یہ جواب ہے کہ اس وقت تک اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اور آیندہ کے لئے قرآن کریم میں پیشگوئیاں موجود ہیں کہ جب بھی مسلمان اسلام سے غافل ہوں گے اللہ تعالیٰ مامور بھیجتا رہے گا۔ پس اس وعدہ کی موجودگی میں ہم یقین رکھتے ہیں کہ چونکہ قرآن کریم سے ہمیشہ دُنیا کی ضرورت پوری ہوتی رہیگی وہ نسخ کو قبول نہیں کرے گا اور جب وہ نسخ کو قبول نہیں کرے گا۔ تو یقیناً وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے گا کیونکہ کوئی عقلمند اپنی کارآمد شے کو تباہ نہیں ہونے دیتا اور اللہ تعالیٰ تو سب عقلمندوں سے بڑھ کر عقلمند ہے۔

شِيَعٌ

۱۱ۃ حل لغات۔ شِيَعٌ۔ شِيْعَةٌ کی جمع ہے شِيْعَةُ الرَّجُلِ۔ اَتْبَاعُهٗ وَاَنْصَارُهٗ۔ شِيْعَةُ الرَّجُلِ کے معنے ہیں آدمی کے اتباع اور مددگار (اقرب) شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ کے متعلق فراء نے کہا ہے کہ یہ اضافۃ الشیٔ الی صفتہ کی طرز پر ہے یعنی اس کے معنے ہیں۔ پہلے جتھے۔

اللہ تعالےٰ نے تمام گروہوں کو شیعہ کہا ہے۔

تفسیر۔ اللہ تعالےٰ نے تمام گروہوں کو شیعہ کہا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو کہا کرتے ہیں کہ ہم ہر طرح سے آزاد ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں وہ نہ آزاد ہوتے ہیں اور نہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں وہ یہ فقرہ صرف چالاکی سے کہتے ہیں تاکہ وہ تو اعتراض کرتے چلے جائیں لیکن ان پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ اللہ تعالےٰ

بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ

ہنسی اُڑانے تھے ١٢ھ اسی طرح ہم اس (عادت استہزاء) کو مجرموں کے دلوں میں

فرماتا ہے کہ یہ بات ہی غلط ہے۔ کہ کوئی آزاد بھی ہوتا ہے ہر آدمی کسی نہ کسی کے ماتحت یا کسی نہ کسی جتھے میں ضرور ہوتا ہے۔ خواہ مذہب کی بناء پر ہو۔ خواہ رسم کی بناء پر۔ خواہ فلسفہ کی بناء پر کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ آزاد ہو ہر انسان کو اپنی زندگی میں اتنے امور سے واسطہ پڑتا ہے۔ کہ ہر امر کی بابت تحقیق کرنا اس کے لئے ناممکن ہوتا ہے اس لئے کچھ نہ کچھ امور میں وہ ایسے لوگوں کے خیالات کو قبول کر لیتا ہے۔ جن پر اسے اعتقاد ہوتا ہے سائیکالوجی والے (علم النفس کے ماہرین) کہتے ہیں کہ انسان میں نقل کرنے کا مادہ اس کا سب سے بڑا خاصہ ہے۔ اسی بات کو اس جگہ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ یعنے مختلف جتھے جو کسی نہ کسی سبب سے آپس میں متحد تھے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے بھی نبی گزرے ہیں۔ اور انکی تعلیم کی بھی اللہ تعالٰے نے حفاظت کی ہے۔ اسی طرح اس رسول کی تعلیم کی بھی حفاظت کرے گا۔ حفاظت سے مُراد جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ نہ صرف لفظی حفاظت ہے بلکہ معنوی حفاظت بھی ہے۔ جو شرعی نبیوں کے زمانہ میں علاوہ اور ذرائع کے اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ان کے زمانہ میں ہی حکومت ان کی جماعت کو مل جاتی ہے اور وہ عملاً اس شریعت کو رائج کر کے اس کے اصلی معنوں کو ظاہر کر جاتے ہیں اور جو شرعی نبی نہ ہوں۔ ان کی جماعت کو بھی اللہ تعالٰے غلبہ دیتا ہے تا کہ ان کی تعلیم کے عملی ثمرات ظاہر ہوں۔ لیکن ان کے لئے فوری حکومت کا ملنا ضروری نہیں غرض اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ یہ کلام الہٰی کی حفاظت کا سلسلہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ اسی رنگ میں تم اب نشان دیکھ لو گے۔

نہایت تعجب کی بات ہے کہ انبیاء کے منکرین اس سہل ترین راستہ کو قبول کرنے سے ہمیشہ پہلو تہی کرتے ہیں جو انہیں یقینی طور پر سچے نبی کی شناخت میں ممد ہو سکتا ہے اور وہ راستہ منہاج نبوت کے مطابق مدعی کے دعویٰ کو پرکھنا ہے۔ اگر منہاج نبوت کے مطابق مدعی کے دعویٰ کو پرکھا جائے تو اسکی صداقت یا اس کے کذب کو معلوم کرنا ایک ساعت کا کام ہوتا ہے۔ مگر اسی راستہ کو قبول کرنے سے وہ پہلو تہی کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صداقت کو معلوم کرنا مطلوب نہیں ہوتا۔ بلکہ غلط مبحث کر کے سچائی سے گریز کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

آزادی کا دعوے کرنا غلط ہے

١٢ھ تفسیر۔ استہزاء اس ہنسی کو کہتے ہیں جس میں تحقیر پائی جائے۔ اس آیت کا تعلق ایک تو يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ سے ہے۔ کہ اس میں کفار کے تمسخر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے اس نبی سے تم نے تمسخر کر لیا تو کیا ہوا وہ انبیاء جن کو تم مانتے ہو۔ ان سے بھی تو تمسخر ہوتا رہا ہے۔ دوسرے یہ بتایا کہ ہر نبی کے کلام اور اس کی تعلیم کی حفاظت کا وعدہ ہوتا ہے اور یہ امر کفار کو عجیب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری مخالفت کے باوجود یہ تعلیم کس طرح باقی رہ جائے گی۔ اور وہ اس دعویٰ کو غیر معقول سمجھ کر اس سے ہنسی کرتے رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ ہر نبی سے تمسخر ہوا ہے۔ پھر بھی جب کوئی نیا نبی آتا ہے۔ دنیا اس سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ کیوں اسے خاص شان نہیں ملی۔ اگر خاص شان اور طاقت سے نبی آتے تو گزشتہ نبیوں سے تمسخر کیونکر ہو سکتا تھا۔

شِيَعِ الْاَوَّلِيْن سے انسان کے نقل کرنے کی طرف اشارہ۔

اس آیت کا پہلی آیات سے تعلق

کفار کا انبیاء سے تمسخر

الْمُجْرِمِيْنَ ○ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ

داخل کرتے ہیں ۱۳؎ یہ (لوگ) اس پر ایمان نہیں لاتے۔ حالانکہ پہلوں (کے متعلق اللہ تعالیٰ) کی سنّت

الْاَوَّلِيْنَ ○ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ

گزر چکی ہے ۱۴؎ اور اگر (بالفرض) ہم ان پر (شناخت کی) کوئی آسمانی راہ کھول (بھی) دیتے۔ اور وہ اس

نَسْلُكُهٗ

۱۳؎ حل لغات۔ نَسْلُكُهٗ۔ نَسْلُكُ سَلَكَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے اور سَلَكَ المَكَانَ سَلْكًا وسُلُوكًا کے معنی ہیں دَخَلَ فِيْهِ کسی جگہ میں داخل ہوا اور اس کے اندر گیا سَلَكَ الطَّرِيْقَ اَیْ دَخَلَهٗ وسارَ فِيهِ مُتَّبِعًا اِيَّاهُ فَهُوَ سَالِكٌ۔ اور سلك الطريقَ کے معنی ہیں۔ راستہ اختیار کرکے اس پر چل پڑا اور اس سے اسم فاعل سالك (یعنی راستہ اختیار کرکے اس پر چلنے والا) آتا ہے۔ سلك الشَّئَ فِی الشَّئِ۔ اَدخله فيه كَمَا تُسْلَكُ الْيَدُ فِی الْجَيْبِ وَالْخَيْطُ فِی الْاِبْرَةِ۔ اور سلك الشَّئَ فی الشَّئِ کے معنی ہیں۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے اندر داخل کیا۔ جیسے گریبان میں ہاتھ ڈالنا یا سوئی کے سوراخ میں تاگہ ڈالنا۔ وَفِی القرآن سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ۔ اور قرآن مجید کی آیت سلكنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ میں یہ لفظ بھی معنوں میں آیا ہے وسلك فُلَانًا المكانَ کے معنے ہیں اَدْخَلَهٗ فلاں شخص کو مکان میں داخل کیا۔ (اقرب)

نَسْلُكُهٗ کی ضمیر کے مرجع کے متعلق اختلاف۔

نَسْلُكُهٗ کی ضمیر کا مرجع استہزاء ہے

المجرمین

اَلْمُجْرِمِيْنَ (جَرَمَ۔ يَجْرِمُ۔ جَرْمًا) جَرَمَهٗ کے معنی ہیں قَطَعَهٗ۔ کاٹا۔ ومنه جَرَمَ النَّخلَ جَرْمًا اِذا صَرَمَهٗ کھجور کو کاٹ کر جدا کردیا۔ جَرَمَ زَيْدٌ: اَذْنَبَ۔ زید نے جرم کا ارتکاب کیا۔ جَرَمَ عَلٰى قَوْمِهٖ وَاِلٰى قومه جريمة جَنٰى۔ جِنَايَةً۔ قوم پر زیادتی کی۔ وَجَرَمَ لِاَهْلِهٖ: كَسَبَ۔ کمایا۔ ومنه فی القرآن لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اَیْ لَا يَكْسِبَنَّكُمْ وقيل اَيضًا۔ بِلَا يَحْمِلَنَّكُمْ۔ اور قرآن مجید کی آیت لَا يَجْرِمَنَّكُمْ میں جرمَ کے معنے کمانے کے کئے گئے ہیں۔ یعنے دشمن کی دشمنی تمہارے لئے اس امر کی محرک نہ ہو کہ تم ظلم کماؤ۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بھی مراد لی گئی ہے۔ کہ لَا يَحْمِلَنَّكُمْ یعنی تم کو آمادہ نہ کرے۔ اَجْرَمَ۔ اَذْنَبَ۔ عَظُمَ جُرْمُهٗ۔ اجرم کے معنے ہیں قصور کیا۔ اور اس کا قصور بڑا تھا۔ اَجْرَمَ عَلَيْهِمْ جَنٰى ظلم کیا۔ (اقرب) ان تمام محاورات سے ظاہر ہے کہ اصل میں جرم کے معنے قطع کے ہوتے ہیں۔ گناہ چونکہ خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کرواتا ہے اور بنی نوع انسان سے بھی۔ اس لئے اسلامی شریعت میں گناہ کو جرم کہا جاتا ہے۔ اور گناہ وہی ہوتا ہے۔ جس سے یا خدا سے تعلق ٹوٹے یا بندوں سے بگاڑ پیدا ہو۔ پس المجرم کے معنے ہونگے صَادَ ذَا جُرْمٍ یعنی تعلق کو کاٹنے والا۔

تفسیر۔ اس آیت میں نَسْلُكُهٗ کی ضمیر کے مرجع کے متعلق مفسرین میں اختلاف ہوا ہے بعض نے اسے لَا يُؤْمِنُوْنَ کی طرف بطور ضمیر مقدم کے راجع کیا ہے اور بعض اس کو پہلی آیت کی طرف لے گئے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس کا مرجع استہزاء ہے۔ جو پہلی آیت میں مذکور ہوا ہے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ۔ کہہ کر اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ جب انسان برے فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو صرف اس گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ بلکہ گناہ کی نفرت بھی اس کے دل سے کم ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے دل میں گناہ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور گناہ اسکے دل میں گھر بنا لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ گناہ کے طبعی نتائج نکالتا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو گنہگار نہیں بناتا۔ بلکہ گناہ کے طبعی نتائج نکالتا ہے۔ اور اس کا الزام اللہ تعالیٰ پر نہیں بلکہ خود گنہگار پر آتا ہے۔

السُّنَّةُ

۱۴؎ حل لغات۔ اَلسُّنَّةُ: اَلسِّيْرَةُ۔ سنّت کے معنی ہیں دستور۔ الطَّرِيْقَةُ۔ طریقہ۔ اَلطَّبِيْعَةُ۔ طبیعت عادت۔ (اقرب)

فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ۝ لَقَالُوٓا إِنَّمَا سُكِّرَتْ

میں چڑھنے لگتے۔ (اور قرآن مجید کا منجانب اللہ ہونا ان پر ظاہر ہو جاتا) تو (بھی) وہ (یہی) کہتے (کہ) محض ہماری نظروں پر پردہ ڈال دیا

أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ۝ وَلَقَدْ

گیا ہے (ورنہ حقیقت کچھ بھی نہیں بلکہ ہم (لوگوں) پر (کوئی) جادو کر دیا گیا ہے ۱۵؎ اور یقیناً

ع ۱

تفسیر یعنے استہزاء کی جب عادت ہو جاتی ہے۔ تو دل سخت ہو جاتے ہیں اور آخر باوجود کھلے نشانات دیکھنے اور واضح ثبوت موجود ہونے کے لوگ ایمان سے محروم ہو جاتے ہیں یہی حال پہلی قوموں کا ہوا۔ یہی ان کا ہوگا۔ استہزاء کر کے کس نے ہدایت پائی۔ کہ اب یہ پائیں گے۔

(استہزاء سے دل سخت ہو جاتے ہیں)

۱۵؎ حل لغات

يَعْرُجُونَ۔ عَرَجَ يَعْرُجُ عروجًا سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے اور عَرَجَ الرَّجُلُ فِي الدَّرَجَةِ وَالسُّلَّمِ کے معنی ہیں ارْتَقَى۔ آدمی سیڑھی پر چڑھا۔ وعُرِجَ بِهِ عَلَى المجهول۔ صُعِدَ بِهِ۔ اور مجہول ہو۔ تو اس کے معنے ہیں۔ اس کو چڑھا کر لے جایا گیا۔ (اقرب)

سُكِّرَتْ:۔ سَكَرَ (يَسْكُرُ سَكْرًا) الإِنَاءَ کے معنے ہیں مَلَأَهُ۔ برتن کو بھر دیا۔ سَكَرَتِ الرِّيحُ۔ سَكَنَتْ بعد الهبوب ہوا چلنے کے بعد تھم گئی۔ سَكَرَتْ عينه۔ تَحَيَّرَتْ وَسَكَنَتْ عَنِ النَّظَرِ۔ آنکھ حیران ہو گئی۔ اور دیکھنے سے رک گئی۔ سَكَرَ الْبَابَ۔ سَدَّهُ۔ دروازہ بند کر دیا۔ سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا مجهولاً۔ حُبِسَتْ۔ آنکھیں روکی گئیں۔ سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا مجهولاً۔ حُبِسَتْ وحُيِّرَتْ آنکھیں حیران کر دی گئیں اور روکی گئیں۔ (اقرب)

أَبْصَارُنَا۔ أَبْصَار بَصَر کی جمع ہے۔ اور البَصَرُ کے معنی ہیں حَاسَّةُ الرُّؤْيَةِ۔ دیکھنے کی حس۔ اَلْعَيْنُ۔ آنکھ۔ اَلْعِلْمُ علم (اقرب)

مَسْحُورُونَ۔ سَحَرَ۔ يَسْحَرُ سِحْرًا کے معنے ہیں۔ عَمِلَ لَهُ السِّحْرَ وخَدَعَهُ۔ اس پر سحر کیا اور اسے دھوکا دیا۔ سَحَرَ عَنْهُ۔ تَبَاعَدَ۔ دور ہو گیا۔ سَحَرَ فُلَانًا عَنِ الأَمْرِ صَرَفَهُ۔ کام سے روک دیا۔ سَحَرَ بِكَلَامِهِ ذَا الحافظه۔ اِسْتَمَالَهُ وَسَلَبَ لُبَّهُ۔ اپنے کلام اور نظروں سے مائل کر لیا اور عقل کو چھین لیا۔ سَحَرَ المطرُ الطِّينَ والتراب سحرًا أَفْسَدَهُ فَلَمْ يَصْلُحْ لِلْعَمَلِ۔ بارش نے مٹی اور کیچڑ کو خراب کر دیا اور وہ کام کے قابل نہ رہی۔ المسحور ایضا المُفْسَدُ مِنَ الطَّعَامِ وَالمَكَانِ لِكَثْرَةِ المَطَرِ أَوْ مِنْ قِلَّةِ الْكَلَأِ۔ مسحور کے ایک معنے برے کھانے کے ہیں اور ایسی جگہ پر بھی مسحور کا لفظ بولتے ہیں۔ جو کثرت بارش یا گھاس کی کمی کی وجہ سے خراب ہو جاوے (اقرب)

(يَعْرُجُون)

تفسیر لَوْمَا تَأْتِينَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ کی آیت میں کفار کی طرف سے مطالبہ بیان ہوا تھا کہ اگر اس کا دماغ (نعوذ باللہ) خراب نہیں اور اسے وہم نہیں تو جو فرشتے اس پر نازل ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں کیوں نہیں دکھاتا۔ اس کا جواب ایک تو یہ دیا تھا کہ فرشتے ہر ایک کے مناسب حال نازل ہوتے ہیں۔ یہ تو عذاب کے مستحق ہیں۔ عذاب ہی کے فرشتے ان پر نازل ہونگے۔ مگر ان کے نزول سے یہ ہلاک ہونے کے بعد کیا فائدہ اُٹھائیں گے۔ دوسرا جواب یہ دیا کہ تم فرشتوں کا کہتے ہو۔ اور ان کے نزول پر تعجب کرتے ہو ہم تو اس پر نازل ہونے والے کلام کی خود حفاظت کریں گے۔ کیونکہ وہ ہمارا کلام ہے اور اسکی حفاظت کی ذمہ واری سب سے زیادہ ہم پر پڑتی ہے۔ آخر ہم پہلے نبیوں کے زمانہ میں بھی یہ کام کرتے آئے ہیں اب کیوں نہ کریں گے پھر فرمایا تھا کہ یہ استہزاء ان کا تعجب انگیز نہیں کہ سب نبیوں کے دشمنوں نے ان سے استہزاء کیا اور اس قدر استہزاء کیا کہ آخر گناہ انکی غذا ہو گیا اور

(سُكِّرَت)

(کفار کی طرف سے فرشتوں کے دکھانے کے مطالبہ پر دو جواب)

(پہلا جواب)

(دوسرا جواب)

(أَبْصَارُنَا)

(مَسْحُورُون)

جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝

ہم نے آسمان میں (ستاروں کی) کئی منزلیں بنائی ہیں اور ہم نے اسے دیکھنے والوں کیلئے (ستاروں کے ذریعہ) خوبصورت بنایا ہے

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ اِلَّا مَنِ

اور (نیز) ہم نے اسے ہر ایک سرکش (اور) دھتکارے ہوئے (کی رسائی) سے محفوظ کر دیا ہے۔ ۱۸ (ہاں) مگر جو شخص

اس میں ان کو لذت آنے لگی اور وہ ایمان سے محروم ہو گئے یہی ان کا حال ہے۔

کفار کی حالت

اب ایک اور طریق پر انہیں جواب دیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ فرشتے ہمیں کیوں نہیں دکھاتا۔ آپ ہی گھر میں بیٹھا دیکھ لیتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا ہر بات کو ہر شخص سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ جب تک دل میں اس سے مناسبت نہ ہو۔ بات سمجھ میں نہیں آسکتی تم کو تو الٰہی علوم سے اس قدر بُعد ہے۔ کہ اگر اسی قسم کے نظارے تم کو نظر آنے لگیں۔ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نظر آتے ہیں اور تم کو رُوحانی مدارج کی سیر بھی کرائی جائے۔ تو تم کبھی نہ مانو گے بلکہ یہی کہو گے کہ ہماری آنکھوں پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ہمیں عجیب عجیب قسم کے نظارے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ تمہارے قلوب میں رُوحانی علوم سے کوئی لگاؤ نہیں

کفار مطالبہ کا ایک اور طریق پر جواب

گویا آسمانی دروازہ کے کھلنے سے مراد اس جگہ آسمانی انکشاف ہے اور اوپر چڑھنے سے مُراد بعض روحانی مدارج کا کھلنا ہے۔

آسمانی دروازہ کھلنے اور اوپر چڑھنے سے مراد

اگر کہا جائے کہ جس پر آسمانی دروازہ کھولا گیا وہ ایمان سے کس طرح محروم رہ سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ کہا گیا ہے۔ یعنے کوئی دروازہ جس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ کلی طور پر آسمانی علوم سے آشنا نہ کیا جائے اور ہر قسم کی معرفت کی راہیں اس کے لئے نہ کھولی جائیں۔ بلکہ بوجہ اسکے انکار کے اسے ایک نمونہ دکھایا جائے اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جب تک دل میں مناسبت پیدا نہ ہو جائے انسان محض نمونہ دیکھ کر فائدہ نہیں اُٹھاتا اور وہ نظارہ صرف حجت پوری کرنے کے کام آتا ہے۔ ایمان کا موجب نہیں بنتا۔

بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ سے ایک نمونہ دکھانے جانے کی طرف اشارہ ہے۔

یہ ایک تجربہ شدہ امر ہے کہ کئی لوگ ماموریں کا انکار کرتے ہیں۔ اور یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی نشان نظر آجائے۔ تو پھر مانیں گے۔ لیکن جب نشان نظر آجائے تو پھر کبھی تو کوئی بہانہ بنا لیتے ہیں کبھی تعبیر غلط کر لیتے ہیں کبھی کہہ دیتے ہیں کہ خواب الہام کیا شے ہے یونہی وہم ہے۔ غرض نشان دیکھ کر بھی فائدہ نہیں اُٹھاتے اور اسکی وجہ یہی ہوتی ہے کہ دل میں خشیت اللہ نہیں ہوتی۔ اس لئے نشان سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اسی حالت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ ماننے کے لئے پہلے دل کی حالت کی درستی ضروری ہے خشیت اللہ ہو تو پھر ایمان نصیب ہوتا ہے ورنہ ایک چھوڑ سو فرشتے نظر آئیں انسان اپنے دل کی تسلی کے لئے کئی بہانے بنا لیتا ہے اور ایمان لانے سے انکار کر دیتا ہے

اس آیت کے یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں۔ کہ ان پر عذاب آتے ہیں۔ عذاب کو دیکھ کر ان میں خشیت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ عذاب ٹل جائے تو ہم مان لینگے جیسا کہ فرعون کے ذکر میں قرآن کریم میں آتا ہے۔ ان معنوں کی رو سے فَتَحْنَا بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ کے معنے رحمت کے دروازے کا کھولنا اور عذاب کا ٹلا دینا ہوگا۔ اور ظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ سے مراد آرام کی ساعتوں میں دنیوی ترقیات کے حاصل کرنے میں مشغول ہو جانا ہوگا۔ عذاب کا ذکر پہلے مَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ میں آچکا ہے مطلب یہ ہے کہ تم لوگ تو ایسے سنگدل ہو کہ عذاب آنے پر ندامت کا اظہار کرو گے اور پھر منکر ہو جایا کرو گے۔

۱۷ حل لغات ۱۷ السماء کے معنے ہیں آسمان مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس ۳

بُرُوْجًا۔ بُرُوج کا مفرد بُرْجٌ ہے۔ اور البرج کے معنے ہیں۔ الرُّکْنُ وَالْحِصْنُ مضبوط سہارا۔ پناہ گاہ قلعہ۔ اَلْقَصْرُ محل۔ وَاحِدُ بُرُوْجِ السَّمَاءِ آسمان کے بُرجوں میں سے ایک بُرج یعنی ستاروں کے چکر لگانے کی منزل۔ بُرج کی جمع بُرُوج کے علاوہ اَبْرَاجٌ اور اَبْرِجَةٌ بھی آتی ہے۔ (اقرب)

البُرُوج۔ القصور۔ محلات۔ منازل۔ وَبِہٖ سُمِّیَ بُرُوْجُ النُّجُوْمِ لِمَنَازِلِهَا الْمُخْتَصَّةِ بِهَا۔ اور ستاروں کی منازل کو بھی بروج کہا جاتا ہے (مفردات)

لِلنّٰظِرِیْنَ۔ نَظَرَ سے اسم فاعل نَاظِرٌ آتا ہے اور اس کی جمع نَاظِرُوْنَ آتی ہے۔ نَظَرَ اِلَیْهِ نَظَرًا کے معنے ہیں اَبْصَرَهٗ۔ کسی چیز کو دیکھا۔ وتَأَمَّلَهٗ بِعَيْنِهٖ کسی چیز کو آنکھ سے خوب غور سے دیکھا۔ مَدَّ طَرْفَهٗ اِلَيْهِ رَاٰهُ اَوْ لَمْ يَرَهٗ۔ کسی چیز کی طرف نگاہ اٹھائی خواہ چیز کو دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے۔ وَنَظَرَتِ الْاَرْضُ۔ اَرَتِ الْعَيْنَ نَبَاتَهَا۔ زمین نے اپنی سرسبزی آنکھ کو دکھائی نَظَرَ بَيْنَ النَّاسِ۔ حَكَمَ وَفَصَلَ دَعَاوِيَهُمْ لوگوں کے دعاوی کا فیصلہ کیا۔ نَظَرَ فِی الْاَمْرِ نَظَرًا تَدَبَّرَهٗ وَفَكَّرَ فِيْهِ يُقَدِّرُهٗ وَيَقِيْسُهٗ۔ کسی معاملہ کو کسی اور معاملہ پر قیاس کرتے ہوئے اس پر غور کیا (اقرب)

شیطان۔ کے معنے کے لئے دیکھو سورۃ یوسف ع ۹

رَجِیْم۔ رَجَمَ میں سے ہے اور رَجَمَهٗ رَجْمًا کے معنے ہیں۔ رَمَاهُ بِالْحِجَارَةِ۔ اس پر پتھر برسائے قَتَلَهٗ۔ اس کو قتل کیا۔ قَذَفَهٗ اس پر تہمت لگائی۔ لَعَنَهٗ لعنت کی۔ شَتَمَهٗ۔ گالی دی۔ هَجَرَهٗ۔ چھوڑ دیا۔ ترک کر دیا۔ اَلْقَبْرَ عَلَّمَهٗ۔ قبر پر نشان لگایا جائے۔ یَرجم کے معنے ہیں۔ اِذَا مَرَّ وَهُوَ يَضْطَرِمُ فِی عَدْوِهٖ۔ تیزی سے دوڑتا ہوا گزرا۔ الرَّجُلُ تَكَلَّمَ بِالظَّنِّ ظنی بات کی۔ (اقرب)

اَلرَّجْمُ اَيْضًا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِالظَّنِّ۔ رجم کے معنے غیر یقینی بات کرنے کے بھی ہیں جیسے آیت رَجْمًا بِالْغَيْبِ میں رجم کے معنے ہیں۔ لَا يُوْقَفُ عَلٰى حَقِيْقَتِهٖ۔ یعنی بات کی حقیقت سے واقف نہ تھا۔ اِسْمٌ مَا يُرْجَمُ بِهٖ۔ جس چیز سے مارا جائے اس کو بھی رجم کہتے ہیں۔ اس کی جمع رُجُوْم آتی ہے (اقرب)

الرِّجَامُ۔ اَلْحِجَارَةُ۔ رِجَام کے معنے پتھروں کے ہیں۔ اور الرَّجْمُ کے معنے ہیں۔ الرَّمْیُ بِالرِّجَامِ کسی کو پتھر مارنا۔ جب کسی پر پتھراؤ کیا جائے تو رُجِمَ بصیغہ مجہول استعمال کرتے ہیں۔ وَيُسْتَعَارُ الرَّجْمُ لِلرَّمْيِ بِالظَّنِّ۔ اور استعارةً رجم کا لفظ خیالی اور غیر یقینی بات کے کرنے پر بھی بولا جاتا ہے وَالتَّوَهُّمِ وَلِلشَّتْمِ وَالطَّرْدِ۔ نیز یہ لفظ وہم سے بات کرنے۔ گالی دینے اور دھتکارنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور الشیطان الرجیم کے معنے ہیں۔ اَلْمَطْرُوْدُ عَنِ الْخَيْرَاتِ۔ نیکیوں سے دُور خوبیوں سے محروم و عاری۔ وعن مَنَازِلِ الْمَلَاِ الْاَعْلٰى فرشتوں کے مقامات سے دُور کیا ہوا (مفردات) اور مجمع البحار میں ہے۔ وَرُجُوْمًا لِلشَّيَاطِيْنِ وَعَلَامَاتٍ هُوَ جَمْعُ رَجْمٍ مَصْدَرٌ سُمِّيَ بِهٖ۔ رجم کا لفظ مصدر ہے۔ جو اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے اور رُجوم اس کی جمع ہے۔ وَيَجُوْزُ كَوْنُهٗ مَصْدَرًا لَا جَمْعًا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رجوم مصدر ہو نہ کہ جمع۔ وَمَعْنَاهُ اَنَّ الشُّهُبَ الَّتِیْ تَنْقَضُّ مُنْفَصِلَةٌ مِنْ نَارِ الْكَوَاكِبِ وَنُوْرِهَا لَا اَنَّهُمْ يُرْجَمُوْنَ بِاَنْفُسِ الْكَوَاكِبِ لِاَنَّهَا ثَابِتَةٌ لَا تَزُوْلُ كَقَبَسٍ تُؤْخَذُ مِنْ نَارٍ۔ یعنی وہ شہب جو ستاروں کی آگ سے علیحدہ ہو کر ٹوٹتے ہیں۔ وہ خود ستارے نہیں ہوتے بلکہ ستاروں سے روشنی گرتی ہے کیونکہ ستارے اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ اور شہب کا گرنا اسی طرح ہوتا ہے جیسے ایک چنگاری آگ سے لی جاتی ہے۔ وقیل المراد بِالرُّجُوْمِ الظُّنُوْنُ الَّتِیْ تُحْزَرُ وَمِنْهُ يَقُوْلُوْنَ

بُرُوْجًا
اَبْرُوج
شیطان
رَجِیْم
الرجم

اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ○ وَ

(وحیٔ الٰہی کی کوئی) سُنی ہوئی بات (جس کا اعلان ہو چکا ہو) چُرالے تو (یہ اور صورت ہے۔ اور اس صورت میں بھی) ایک روشن شعلہ اس کا پیچھا کرے گا۔ ۵

خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ۔ اور بعض محققین نے یہ کہا ہے کہ رجوم سے مُراد وہ خیالات ہیں جو اپنے قیاس سے بغیر دلیل کے انسان بنا لیتا ہے۔ اور انہی معنوں میں قرآن میں لفظ رجمًا بالغیب استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ غیب کے متعلق صرف اندازے لگاتے ہیں۔ (اس آیت کی تفسیر اگلی آیت کے ساتھ دیکھیں)

استرق

۵ حل لغات۔ اِسْتَرَقَ۔ سَرَقَ سے باب افتعال ہے۔ اور سَرَقَهٗ وَمِنْهُ الشَّیْءَ کے معنے ہیں۔ اَخَذَهٗ خُفْيَةً مِنْ حِرْزٍ۔ کہ کسی چیز کو محفوظ جگہ سے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتے ہوئے لے لیا۔ والسرقة اَخْذُ الشَّیْءِ فِی خِفَاءٍ وَحِيلَةٍ۔ نیز حیلہ سے مخفی طور پر کسی چیز کو نکال لینے کا نام بھی سرقہ ہے اور استرق السمع کے معنے ہیں اِسْتَمَعَ مُسْتَخْفِيًا۔ پوشیدہ ہو کر کسی بات کو سُنا۔ اَلْكَاتِبُ بَعْضَ الْمُحَاسَبَةِ لَمْ يُبْرِزْهُ۔ محرر نے اپنے بعض حسابات کو چھپایا یعنی ظاہر نہ کیا (اقرب)

اتبعه

السمع

السَّمْعُ:۔ یہ سَمِعَ يَسْمَعُ کا مصدر ہے۔ اور سَمِعَ الصَّوتَ يَسْمَعُ سَمْعًا کے معنے ہیں۔ اَدْرَكَهٗ بِحَاسَّةِ الْاُذُنِ۔ آواز کو کان کی حس کے ساتھ محسوس کیا۔ اور السمع کے معنے ہیں۔ حِسُّ الْاُذُنِ شنوائی۔ والاذن۔ کان۔ وما وقر فيها من شیءٍ تسمعه۔ جو آواز کان میں پڑے اس پر بھی سمع کا لفظ بولتے ہیں۔ الذِّكْرُ الْمَسْمُوْعُ سُنی ہوئی بات۔ لفظ سمع واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے کیونکہ در اصل یہ مصدر ہے۔ جو قلت اور کثرت کا احتمال رکھتا ہے۔ اس کی جمع اَسْمَاع ہے (اقرب)

شہاب

اَلسَّمْعُ: قُوَّةٌ فِی الْاُذُنِ بِهٖ يُدْرَكُ الْاَصْوَاتَ یعنی سمع کان کی ایک قوت (شنوائی) کا نام ہے جس کے ذریعہ سے انسان آواز کو معلوم کرتا ہے۔ وفعله يُقَالُ لَهٗ السَّمْعُ ايضًا۔ اور سُننے کے فعل کا نام بھی سمع رکھا جاتا ہے۔ وَيُعَبَّرُ تَارَةً بِالسَّمْعِ عَنِ الْاُذُنِ۔ اور کبھی لفظ سمع بولکر کان مراد ہوتا ہے۔ وَتَارَةً عَنْ فِعْلِهٖ كَالسِّمَاعِ۔ اور کبھی لفظ سمع سے اس کا فعل مراد لیا جاتا ہے جیسے اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ۔ کہ ان کو سننے کے فعل سے روک دیا گیا ہے۔ وَتَارَةً عَنِ الْفَهْمِ۔ اور کبھی لفظ سمع سے مُراد بات کا سمجھنا ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔ لم تسمع ما قلت کہ جو میں نے کہا۔ تُو نے نہیں سمجھا۔ وتارةً عن الطاعة اور کبھی اس سے مراد اطاعت ہوتی ہے (مفردات)

اَتْبَعَهٗ:۔ تَبِعَ سے ہے۔ اور تبعہ کے معنے ہیں۔ سَارَ فِی اَثَرِهٖ۔ اس کے قدموں کے نشانات پر چلا۔ اَوْ مَشٰی خَلْفَهٗ اَوْ مَرَّ بِهٖ فَمَضٰی مَعَهٗ۔ اس کے پیچھے چلا۔ یا اس کے پاس سے گزرا۔ اور پھر ساتھ چل پڑا۔ اَتْبَعَهٗ تَبِعَهٗ وَذٰلِكَ اِذَا كَانَ سَبَقَهٗ فَلَحِقَهٗ۔ اس سے پیچھے رہ گیا۔ اور پھر اس سے جا ملا۔

شِهَابٌ:۔ شُعْلَةٌ مِنْ نَارٍ سَاطِعَةٍ بھڑکتی ہوئی آگ کا شعلہ۔ اَوْ كُلُّ مُضِیءٍ مُتَوَلِّدٌ مِنَ النَّارِ۔ یا ہر چمکتی ہوئی چیز جو آگ سے پیدا ہو۔ وَمَا يُرٰی كَاَنَّهٗ كَوْكَبٌ اِنْقَضَّ۔ ٹوٹتا ہوا ستارہ۔ وقد يُطْلَقُ عَلَى الْكَوْكَبِ اَوِ الدَّرَارِیِّ مِنَ الْكَوَاكِبِ لِشِدَّةِ لَمَعَانِهَا۔ اور کبھی شہاب کا لفظ ستارے پر یا چمکتے ہوئے ستاروں پر ان کی شدت چمک کے باعث بولا جاتا ہے۔ يُقَالُ اِنَّ فُلَانًا شِهَابُ حَرْبٍ اِذَا كَانَ مَاضِيًا فِيهَا۔ اور اس شخص کو جو لڑائی میں تیز ہو۔ اور جہاں جائے مارتا چلا جائے شہاب حرب کہتے ہیں۔ وَقَدْ يُطْلَقُ شُهُبٌ عَلٰى ثَلَاثٍ مِنَ اللَّيَالِی وَهِیَ اللَّيَالِی الْبِيْضُ۔ اور شہب کا لفظ تین پوری چاندنی راتوں (۱۳-۱۴-۱۵) پر بھی بولتے ہیں

پس شہاب مجازاً ان چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو روشن ہوں اور اسی طرح ان لوگوں کے لئے بھی جو چست ہوں اور کام میں خوب ہوشیار ہوں (اقرب)

اَلشِّہَابُ۔ اَلشُّعْلَۃُ السَّاطِعَۃُ مِنَ النَّارِ الْمُوْقَدَۃِ جلتی ہوئی آگ کا روشن شعلہ۔ وَالشُّعْلَۃُ السَّاطِعَۃُ مِنَ الْعَارِضِ فِی الْجَوِّ فضا میں کسی چیز کے گزرنے کے باعث کسی روشنی اور شعلے کے پیدا ہونے کو بھی شہاب کہتے ہیں۔ (مفردات)

مبین۔ واضح کرنے والا اور واضح اور ظاہر۔ مزید تشریح کے لئے دیکھیں سورۃ حجر ۲۔

تفسیر۔ بعض نے بروج کے معنے ستاروں کے کئے ہیں۔ جیسے قتادہ نے (بحر محیط۔ درمنثور۔ ابن کثیر زیر آیت وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا)۔ لیکن لغت میں بُروج جس کا مفرد بُرج ہے اس کے معنے ستاروں کی منزل کے ہیں یعنی جن دائروں میں ستارے چکر لگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بُرج کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ محل اور قلعہ کے بھی ہیں۔ علماء ادب میں سے بھی زجاج نے بُروج کے معنے کوکب یعنی ستارہ کے کئے ہیں (تاج) جن مفسرین نے بُروج کے معنے ستاروں کے کئے ہیں۔ وہ اس سے دلیل پکڑتے ہیں۔ کہ چونکہ دوسری جگہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ نِ الْکَوَاکِبِ (الصافات ع ۱) ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں کی زینت کے ساتھ مزین کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بُروج سے مراد ستارے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ائمہ نے بُروج کے معنے کواکب یعنے ستاروں کے کئے ہیں۔ لیکن مذکورہ بالا آیت سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ یقینی نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وَزَیَّنّٰہَا لِلنّٰظِرِیْنَ میں دوسرا مضمون ہو اور آیت کا مفہوم یہ ہو کہ ہم نے آسمان میں ستاروں کی منازل بنائیں۔ اور ان میں چلنے کے لئے ستارے بنائے۔ جنکی وجہ سے آسمان خوبصورت نظر آتا ہے۔ پس جبکہ ضروری نہیں کہ اس آیت کے یہی معنی ہوں کہ بُروج ہی سے زینت کا اظہار کیا گیا ہے۔ بروج کے معنی ستارے کرنے کی کوئی خاص مجبوری نہیں ہے۔

بروج کے معنے ستارے کرنا ضروری نہیں

بہرحال بُروج سے مراد خواہ متداول معنی یعنے ستاروں کی منازل کے کئے جائیں یا ستاروں کے معنے لئے جائیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ قرآن کریم یا اس سے پہلے کی کتب سماوی کی حفاظت اور آسمانوں کی حفاظت کا آپس میں جوڑ کیا ہے اور کیوں کلام الٰہی کی حفاظت کے ذکر کے بعد آسمانوں کی حفاظت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مفسرین نے اس بارہ میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن میں سے بعض محض قصوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ ان کا کوئی ثبوت ہے۔ اور نہ خدائی کلام سے وہ کوئی دُور کی بھی مناسبت رکھتے ہیں۔ مگر بہرحال ان قصوں اور حدیثوں اور تفسیروں کے متعلق میں۔ اصل مضمون بیان کرنے کے بعد اپنی تحقیق بیان کروں گا پہلے میں وہ معنے بیان کر دیتا ہوں۔ جو میرے نزدیک قرآن کریم کے سیاق و سباق کو دیکھ کر ان آیات سے نکلتے ہیں۔

کلام الٰہی کی حفاظت اور آسمانوں کی حفاظت کا جوڑ

بُروج کے مختلف معانی

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ظاہری نظام اور رُوحانی نظام میں ایک شدید مماثلت اور مشابہت کا دعویٰ کرتا ہے اور بار بار روحانی عالم کے سمجھانے کے لئے جسمانی عالم کی مثالیں دیتا ہے۔ کبھی الہام کو پانی کے مشابہ قرار دیکر اس کے اثرات اور کلام الٰہی کے اثرات کی مشابہت کو پیش کرتا ہے۔ کبھی زمین و آسمان کے تعلقات سے رُوح اور جسم کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔ کبھی روشنی اور آنکھ کے تعلقات سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اندرونی قابلیتوں کے بغیر صداقت نفع نہیں دیتی۔ غرض بیسیوں بلکہ سینکڑوں سبق جسمانی نظام سے حاصل کرنے کے لئے وہ ہمیں توجہ دلاتا ہے اس آیت میں بھی ایسی ہی مشابہت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

ظاہری نظام اور رُوحانی نظام میں مماثلت۔

بعض مفسرین نے بُروج کے معنے ستاروں کے کئے ہیں۔

زمین کے رہنے والوں کو ایک آسمان اپنے سروں پر نظر آتا ہے۔ اس میں ستاروں کا ایک نظام ہے جو اپنے اپنے وقت پر اور اپنے اپنے دائرہ میں کام کر رہے ہیں۔ اس نظام کو بدلنے

کی کوئی طاقت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی حفاظت
کے سامان موجود ہیں۔ اسی مثال کو لے کر قرآن کریم میں متعدد بار
رُوحانی آسمان کے نظام کو پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس جگہ بھی
میرے نزدیک اسی نظام کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتا ہے کہ
جس طرح جسمانی نظام مضبوط بُنیادوں پر قائم ہے۔ روحانی
نظام بھی مضبوط بُنیادوں پر قائم ہے اور ہم نے اسے بھی
جسمانی نظام کی طرح کئی طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ جو اس کے اوپر
کے طبقے ہیں۔ وہ تو محفوظ ہیں ہی۔ جو نیچے کا طبقہ ہے۔ اس
میں شرارت کا امکان ہو سکتا تھا۔ سو اسے بھی ہم نے ستاروں
سے مزین کیا ہے اور ان کے ذریعے اس نچلے آسمان کی
حفاظت کی ہے۔

ظاہری نظام کی مثال سے رُوحانی نظام کو پیش کیا گیا ہے۔

مطلب یہ کہ جس طرح ظاہری آسمان کا نچلا حصہ ایک نظام
اور اس کے ماتحت کے ستاروں اور سیاروں کا نام ہے اسی
طرح روحانی آسمان کا نچلا حصہ بھی ایک نظام اور چند ستاروں
کا نام ہے جو روحانی آسمان کی حفاظت کرتے ہیں جس طرح
جسمانی ستاروں کے وجود سے جسمانی آسمان کا قیام ہے۔ اسی
طرح روحانی ستاروں کے وجود سے روحانی آسمان کا قیام ہے
بلکہ جس طرح جسمانی سماء الدنیا ستاروں کے مجموعہ کا نام
ہے۔ اور وہی اس کی زینت کا موجب ہیں۔ اسی طرح روحانی
سماء الدنیا روحانی ستاروں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور
وہی اس کی زینت کا موجب ہیں اور جس طرح جسمانی ستارے
سماء الدنیا کی حفاظت کا موجب ہیں۔ کیونکہ وہ اس کے
اجزاء ہیں۔ اگر اُن میں خرابی ہو تو سارا نظام درہم برہم ہو
جاتا ہے۔ اسی طرح رُوحانی ستارے رُوحانی سماء الدنیا
کی حفاظت کا موجب ہیں۔ اگر ان میں خرابی ہو تو رُوحانی
سماء الدنیا درہم برہم ہو جائے۔ اس لئے جب کوئی
اس میں خرابی پیدا کرنا چاہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر
مار پڑتی ہے اور آگ اور پتھر برستے ہیں۔ جیسا کہ رجوم اور
شہب کے الفاظ سے بتایا گیا ہے۔

رُوحانی نظام کو جسمانی نظام سے قرآن مجید میں مشابہت

جس طرح جسمانی ستاروں سے جسمانی آسمان کا قیام ہے۔ اسی طرح روحانی ستاروں سے روحانی آسمان کا۔

جس طرح ظاہری ستارے ظاہری آسمان کی زینت کا موجب ہیں ایسے ہی رُوحانی ستارے روحانی آسمان کی زینت کا۔

آگ اور پتھر کے محاورہ سے مراد آسمانی عذاب ہوتا ہے۔

یہ آگ اور پتھر کا محاورہ آسمانی عذاب کے متعلق عام
ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں کفار کی نسبت آتا ہے کہ وہ ایک ایسے
عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔ جو آگ اور پتھروں پر مشتمل ہوگا
چنانچہ فرماتا ہے فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (بقرہ ع ۳) اس
آگ سے بچو جس میں دوزخی لوگ اور پتھر ڈالے جائیں گے۔ یعنے
اُس آگ کے بھڑکانے کا رُوحانی موجب تو گنہگار انسان ہوں گے
اور جسمانی ذریعہ پتھر ہوں گے۔ غرض قرآن کریم سے معلوم ہوتا
ہے کہ عذاب الٰہی کو آگ اور پتھر سے تشبیہ دی جاتی ہے
اور ان آیات میں بھی شہب اور رجم کا ذکر کر کے یہی بتایا ہے
کہ ایسے آدمی عذاب الٰہی میں مبتلا ہوں گے۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ قرآن کریم میں رُوحانی نظام کو
جسمانی نظام سے مشابہت دی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ
رسول کریم کی نسبت فرماتا ہے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ
شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ
وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (ع ۶) اے نبی ہم نے تجھے گواہ اور بشارت
دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی
طرف بلانے والا اور روشن سورج بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ
دوسری آیات سے ظاہر ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نظام نبوت کے لئے بطور مرکز کے ہیں۔ جس طرح سورج نظام
دنیاوی کے لئے بطور مرکز کے ہے۔ پس آپ کو سورج کہہ کر
بتایا ہے کہ رُوحانی آسمان میں تیرے سوا اور ستارے اور چاند
بھی ہیں جو سب کے سب تیرے گرد گھومتے ہیں۔ یہ ستارے
اور چاند دوسرے انبیاء ہیں جنکی نبوتیں رسول کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے لئے بطور ارہاص کے تھیں اور سب نبی آپ
کے گرد ستاروں کی طرح چکر کھاتے ہیں جس طرح وسیع روحانی نظام
میں دوسرے انبیاء رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بمنزلہ
ستاروں کے تھے اور آپ اُن میں سورج کے طور پر تھے۔ اسی
طرح ایک چھوٹے دائرہ میں آپ بمنزلہ سورج کے تھے اور آپ
کے صحابہ بمنزلہ ستاروں کے تھے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم فرماتے ہیں کہ أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ

اهتدیتم۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب مناقب الصحابہ) میرے صحابہ میرے گرد ایسے ہیں جس طرح سورج کے گرد ستارے اور جس طرح ستارے جب تک سورج کے نظام سے وابستہ رہتے ہیں۔ لوگوں کو راہ دکھانے کا موجب ہوتے ہیں۔ اسی طرح میرے اصحاب میں سے جو میرے نظام سے وابستہ رہیں گے وہ ستاروں کا کام دیں گے۔ جزوی اختلافات کے باوجود ان میں سے جس کی اتباع بھی تم کروگے ہدایت پا جاؤ گے۔

اس امر کا مزید ثبوت کہ روحانی نظام کو سورج چاند ستاروں سے مشابہت دی جاتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی رؤیا سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک دن اپنے والد سے کہا کہ یٰاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَعَشَرَ کَوْکَبًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُھُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ (یوسف ع ۱) اے میرے باپ میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو دیکھا کہ میری فرمانبرداری میں مشغول ہیں اور اس کی تعبیر آگے چل کر اس طرح بیان ہوئی ہے۔ وَرَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا وَقَالَ یٰاَبَتِ ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَھَا رَبِّیْ حَقًّا (یوسف ع ۱۱) یعنے یوسف کے بھائیوں کے آنے کے بعد جب اُن کے ماں باپ بھی آ گئے اور انہوں نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اپنے پاس بٹھایا اور وہ شکرانے کے طور پر سجدہ میں گر گئے تو حضرت یوسف نے فرمایا کہ اے میرے باپ یہ میری اس خواب کی جو میں پہلے زمانہ میں دیکھ چکا ہوں تعبیر ہے۔ میرے رب نے اس خواب کو آخر سچا کر ہی دکھایا کہ باپ ماں اور بھائیوں کو میرے ماتحت علاقہ میں لے آیا۔ اس خواب اور اس کی تعبیر سے جو خود قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے ظاہر ہے کہ الہامی زبان میں خاندانی یا مذہبی نظام کو نظامِ شمسی سے مشابہت دی جاتی ہے اور میرے نزدیک آیت زیر بحث میں بھی یہی معنے مراد ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کلام الٰہی کی حفاظت کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی نظام شمسی کی تمثیل سے یہ سمجھایا کہ کس طرح یہ حفاظت کی جائے گی۔ چنانچہ بتلایا کہ ظاہری مادی نظام میں جس طرح ایک آسمان ہے یعنی مختلف ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ اسی طرح نظام روحانی بھی مختلف انبیاء کا ایک مجموعہ ہے۔ اور وہ روحانی آسمان کہلاتا ہے۔ جس طرح ہر ستارہ اپنی اپنی جگہ اس آسمان کے لئے زینت کا موجب ہے اور کشش ثقل کے اصول سے اور دیگر ایسے ذرائع سے جن کا علم شاید بندوں کو ابھی تک حاصل نہیں ہوا اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ اسی طرح ہر نبی نظام روحانی کے لئے زینت کا موجب ہے اور اس کی حفاظت کا موجب ہے۔ ایک نبی بھی نہیں جو بے موقعہ یا بلا ضرورت آیا ہو۔ ہر نبی کا ایک معیّن کام تھا جو اس کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا تھا اور ہر نبی نے آسمان روحانی کی حفاظت کا کام انجام دیا ہے اور کلام الٰہی کی خدمت کی ہے اور اس کی حقیقت اور برتری اور تاثیر کو اپنے وجود سے اور اپنے تابعین کے وجود سے ثابت کیا ہے اور وہ شیطانی صفت لوگ جنہوں نے خدائی کلام کو بگاڑنا چاہا انہیں شکست دی اور ذلیل کیا۔ گویا وہ اُن پر پتھر اور آگ کی طرح گرے اور انہیں ناکام کر دیا۔

اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح نظام جسمانی میں شیطانوں کا یعنی بُرے انسانوں کا زمین پر تو تصرف ہے کہ وہ اس جگہ ظلم اور فساد پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آسمان پر کوئی تصرف نہیں۔ ظالمانہ طور پر وہ دنیوی نعمتوں پر تو قابض ہو جاتے ہیں۔ لیکن آسمانی نعمتوں جیسے ستاروں کی تاثیرات اور ہوا وغیرہ کے فوائد سے لوگوں کو محروم نہیں کر سکتے اور نہ آسمان پر ان کا کوئی اختیار ہے۔ سورج چاند ستارے ان کے تصرف سے بالا ہیں۔ یہی حال روحانی عالم کا ہے کہ شیطانوں کا کوئی تصرف انبیاء اور اُن کے کامل متبعوں پر نہیں ہو سکتا جیسے دوسری جگہ فرمایا۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (سورہ حجر ع ۳) میرے کامل بندوں پر تیرا کوئی اثر اور قبضہ نہ ہوگا۔ نیز جس طرح آسمانِ جسمانی کی نازل کردہ برکات پر شیطانوں کا کوئی تصرف نہیں۔

آنحضرتؐ اپنے صحابہؓ کے درمیان ایک سورج کی طرح تھے

ظاہری ستارے ظاہری آسمان کی حفاظت اور زینت کا موجب ہیں۔

نظام کو سورج چاند اور ستاروں سے مشابہت۔

ہر نبی روحانی آسمان کی زینت اور حفاظت کا موجب ہوتا ہے

نظام جسمانی میں تو شیطانوں کا تصرف ہے لیکن آسمان پر نہیں

الہامی زبان میں خاندانی یا مذہبی نظام کو نظام شمسی سے مشابہت دی جاتی ہے۔

کلام الٰہی کی حفاظت کے ذکر کے ساتھ نظام شمسی کی تمثیل۔

وہ روشنی جو اسطور تاثیرات سماوی میں روک نہیں ڈال سکتے اسی طرح روحانی آسمان یعنی انبیاء کے ذریعہ سے ظاہر ہونے والے فیض یعنی کلام الٰہی اور معجزات ونشانات پر بھی شیطانوں کو کوئی تصرف حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالےٰ آسمانِ روحانی یعنے انبیاء کو اور انکی تاثیرات کو کلی طور پر شیطانی دخل سے پاک رکھتا ہے۔ یہ گویا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کی تشریح فرمائی ہے

شیطانوں کا انبیاء کے کلام کو چُرانا۔

تعجب ہے اس آیت کی موجودگی میں مسلمان اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ سوائے حضرت عیسٰی اور انکی ماں مریم کے کوئی بھی خواہ نبی ہو مس شیطان سے پاک نہیں۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ اس آیت میں آسمان رُوحانی کے محفوظ ہونے کا ذکر فرماتا ہے جس میں آدم سے لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سب نبی اور ان کے کامل اتباع شامل ہیں۔

جملہ انبیاء مس شیطان سے پاک ہیں۔

انبیاء اور ان کے اتباع چوروں کے فریب کو ظاہر کردیتا

اس کے بعد فرماتا ہے اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ الآیہ ہاں اگر کوئی سُنی سنائی بات چُرالے تو اس پر شہاب مبین گرتا ہے اس آیت نے صاف واضح کردیا۔ کہ یہاں آسمان اور نظام شمسی کو بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے ورنہ جسمانی نظام مُراد نہیں۔ کیونکہ اوّل تو سُنی سُنائی بات کے چُرا لینے کا آسمانِ جسمانی سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے شہاب کے ساتھ جو مبین کی صفت لگائی ہے۔ اس کا جسمانی شہاب سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ شہاب یا تو آگ کے شعلے کو کہتے ہیں یا وہ روشنی جو آسمان پر نظر آتی ہے اور یُوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ستارہ ٹوٹا۔ ان دونوں چیزوں کے لئے مبین کی صفت بے محل اور بے معنی ہے لیکن اگر رُوحانی آسمان مُراد لیا جائے اور شہاب سے مُراد انبیاء لئے جائیں جو آسمانی تائیدات اور نشانات لے کر آتے ہیں اور کلام الٰہی میں رخنہ ڈالنے والوں کے خلاف کام کرتے ہیں تو مبین کی صفت بالکل برمحل اور مناسب حال معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں شہاب کے ساتھ مبین کے لفظ کا استعمال ایک مزید فائدہ کے لئے اور ایک روشن نشان کے معنوں پر دلالت کرنے کے لئے ہے اور بتایا ہے

کلام الٰہی کے چرا لینے سے مراد

شہاب کے ساتھ مبین کی صفت لگانا ظاہر کرتا ہے کہ جسمانی نظام کی حفاظت مُراد نہیں۔

شہاب کے معنے۔

جس طرح چور کا لباس چور کے بدن پر ٹھیک نہیں آتا۔ اسی طرح انبیاء کی تعلیم چوروں کے معتقدات کے ساتھ مطابق نہیں آتی۔

شہاب سے مراد انبیاء لئے جاویں تو مبین کی صفت برمحل بلکہ مناسب معلوم ہوتی ہے

ہر نبی کا کلام چرایا گیا۔

کہ اللہ تعالیٰ کا کلام جب تک آسمان پر ہوتا ہے اور جب تک رُوحانی آسمان کے اجرام یعنی انبیاء پر نازل ہوتا ہے اس وقت تک تو بالکل محفوظ ہوتا ہے لیکن نچلے آسمان پر نازل ہونے کے بعد جب بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور مسموعات میں سے ہو جاتا ہے یعنی سُنی ہوئی باتوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ پردۂ غیب سے پردۂ شہود پر آجاتا ہے۔ اور لوگ ایک دوسرے کو وہ کلام سُنانے لگ جاتے ہیں۔ تو شیطان یعنے انبیاء کے دشمن اس کلام کو چُرا لیتے ہیں یعنی بغیر حق کے اس کلام کو لے لیتے ہیں۔ اس کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ تب یا تو وقت کے نبی کی معرفت ان پر آسمانی عذاب نازل ہوتا ہے یا پھر انبیاء اور ان کے اتباع اس کلام کی اصل حقیقت کو دُنیا پر ظاہر کرکے ان چوروں کے فریب کو ظاہر کردیتے ہیں۔ اور وہ ذلت کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اور سچائی کی روشنی میں ان چوروں کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔

اس آیت میں کلام کے چُرا لینے سے مُراد یہ ہے کہ جس طرح چور ناحق دوسرے کے مال کو لیتا ہے۔ اسی طرح وہ کلام الٰہی کو ناحق لیتے ہیں یعنے اس کے معنوں کو سمجھ کر ایمان نہیں لاتے۔ بلکہ صرف اس لئے کلام کو اخذ کرتے ہیں۔ تا اس کا ناجائز استعمال کریں اور اس کے غلط معنے کرکے لوگوں کو گمراہ کریں۔

کلام کی چوری کرنے کے یہ معنی بھی ہیں کہ انبیاء کی بعض تعلیمات کو اس زمانہ کے لوگ اپنا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اور اس طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گویا اُن کو بھی الٰہی علوم پر دسترس ہے جن پر انبیاء کو ہے بلکہ انبیاء نے ان کے علوم چرا لئے ہیں لیکن جس طرح چوری کا لباس پہچانا جاتا ہے۔ وہ چور کے بدن پر ٹھیک نہیں آتا اسی طرح انبیاء کی چوری کی ہوئی تعلیم چونکہ ان چوروں کے دوسرے معتقدات کے ساتھ مطابق نہیں آتی۔ جب انبیاء اور ان کے اتباع ان کی حقیقت کو کھولتے ہیں۔ تو ان کی چوری ظاہر ہو جاتی ہے۔

یہ دونوں امر سب نبیوں کے ساتھ پیش آئے ہیں۔ انبیاء کی اعلیٰ تعلیمات کو لوگ اپنی تعلیمات ظاہر کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔

اور اس طرح اُن کی اہمیت کو گرانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حملہ سب نبیوں سے زیادہ ہُوا ہے۔ مسیحی اور آریہ مصنفین کثرت سے قرآن کریم کی تعلیمات کے ٹکڑے لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اُن کے مذاہب کی کتب میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نور کو ظاہر کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے۔ کہ جس ٹکڑے کو تم نے لیا ہے۔ وہ تو ایک لمبی زنجیر کی کڑی ہے اور وہ ساری زنجیر ایسے وسیع مطالب رکھتی ہے۔ کہ تمہارے خواب و خیال میں بھی موجود نہیں۔ تو انکی پردہ دری ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی حملہ کرنے والوں میں ینابیع الاسلام کا مصنف ہے۔ جس نے نہایت دیدہ دلیری سے قرآنی مطالب کے ٹکڑوں کو لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گویا وہ پہلے مذاہب کی کتب سے لئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ٹکڑے ایک کُل کا حصہ ہیں اور اُن کو کُل سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور اس کُل میں وہ اس طرح جڑے ہوئے ہیں۔ کہ اُن کو کسی اور شئے کا جزو قرار دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کے لئے دیکھو سورہ فاتحہ کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ پر بحث۔ جیسے مصنف ینابیع الاسلام نے زردشتی کتب کی چوری قرار دیا ہے۔

دوسرے معنے جو کلام چُرا لینے کے معنے پر کئے ہیں کہ الٰہی کلام کے بعض ٹکڑوں کو لے کر غلط طور پر انہیں دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی سب نبیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ہر نبی کے الہام کو اس کے مخالف بگاڑ کر پیش کرتے رہے ہیں۔ تا لوگوں کو ان کے خلاف جوش دلائیں۔ وہ اصل مطلب کو بگاڑ بگاڑ کر ان کے الہامات کو پھیلاتے رہے ہیں۔ اور چوروں کی طرح اُن کا ناجائز استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کی نشانات اور معجزات سے مدد کی۔ اور ایک طرف تو دلائل سے معترضین کے غلط معنوں کو رد کیا۔ اور دوسری طرف قہری اور قدرت نمائی کے نشانات کے ذریعہ سے اپنے نبیوں کی تائید کر کے ان کے دشمنوں کو ہلاک کروایا اور اس طرح اپنے کلام کی حفاظت کی۔

مسیحی مصنفین کے قرآن کریم کی تعلیمات پر بیجا اعتراضات

بعض دفعہ نبی کے اتباع بھی دین سے بے بہرہ ہو کر اور بے دینی کا شکار ہو کر دین کو بگاڑ دیتے ہیں اور کلام الٰہی کے معنی کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور اس کی خوبیوں کو غلط تفسیروں سے چھپا دیتے ہیں تب اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے اتباع میں سے کسی کو شہاب ثاقب یا شہاب مبین بنا کر یعنی اپنا تازہ الہام دے کر اور اپنے نشانات سے مؤید کر کے آسمان روحانی سے نازل کرتا ہے۔ تا وہ ایسے شیاطین کی سرکوبی کر کے کلام الٰہی کو پھر اسکی اصل جگہ پر لے آئیں اور اس طرح وہ کلام جو بگڑ جانے اور تباہ ہونے کے خطرہ میں پڑ گیا تھا پھر محفوظ ہو جائے۔ اور اس کے صحیح مطالب پھر لوگوں پر آشکار ہو جائیں۔

مصنف ینابیع الاسلام کے قرآنی مطالب پر اعتراضات

اوپر کے مضمون سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان آیات میں ستاروں سے انبیاء مراد ہیں اور شہاب مبین یا شہاب ثاقب سے مراد وقت کا نبی ہے کیونکہ ہر نبی ایک ستارہ ہے اور آسمان رُوحانی کے لئے زینت کا موجب ہے لیکن ہر نبی ہر وقت شہاب کا کام نہیں دے رہا۔ یعنی وہ شیطان جو دین میں رخنہ اندازی کر رہے ہیں۔ ان کی ہلاکت کا موجب نہیں بن رہا۔ یہ کام صرف وقت کا نبی کرتا ہے۔ یا وہ نبی کرتا ہے جسکی نبوت زندہ ہو۔ اور جسکی شریعت قابلِ عمل ہو ایسے نبی کی اُمت میں خرابی پیدا ہو کر اگر دوسرا تابع نبی مبعوث بھی ہو تب بھی چونکہ اس کی قوت قدسیہ اس تابع نبی کے ذریعہ سے کام کر رہی ہوتی ہے۔ وہ شہاب ہی کہلاتا ہے چنانچہ اس تشریح کے ماتحت حضرت موسیٰ۔ حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے سابق انبیاءؑ آسمان روحانی کے ستارے تو ہیں۔ مگر شہاب نہیں۔ کیونکہ اس وقت شیطانوں کے مارنے کے لئے اللہ تعالیٰ انہیں استعمال نہیں کر رہا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہاب ہیں۔ کیونکہ ان کے اظلال یہ کام قیامت تک کریں گے۔

خدا تعالیٰ کا قہری نشانوں اور قدرت نمائی سے دشمنوں کو ہلاک کرنا۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان آیات میں اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ کی حقیقت بتائی گئی ہے اور بتایا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر اس کلام کی جو اسکی طرف سے اُترا ہوا اور الذکر کہلانے کا مستحق ہو کس کس طرح حفاظت کرتا ہے۔ ظاہر میں بھی

آیات میں نحن نزلنا الذکر کی حقیقت بتائی گئی ہے

اور باطن میں بھی اور نبی کے زمانہ میں بھی اور اس کے بعد بھی۔ اور یہ کہ وہ قرآن کریم کی حفاظت بھی ان سب سامانوں کے ذریعہ سے کرے گا۔ یہ آیات گویا سورہ حج کی مندرجہ ذیل آیات کے ہم معنے ہیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (الحج ع ۷) یعنی ہر نبی اور رسول کے ساتھ یہ معاملہ گزرا ہے۔ کہ جب اس نے خدا کا کلام پڑھ کر لوگوں کو سنایا شیطان نے ہمیشہ ہی اُن کے سُنائے ہوئے کلام میں اپنی طرف سے کچھ معنے شامل کرکے لوگوں کو یہ بدلے ہوئے مضامین سُنانے شروع کئے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اسکی ملائی ہوئی باتوں کو تو مٹا دیا اور خدائی کلام کو قائم رکھا۔ یعنے لوگ کلام الٰہی کو بگاڑ بگاڑ کر لوگوں کو گمراہ تو کرتے ہیں۔ مگر آخر کلام کی سچائی ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ لوگ ناکام و نامُراد ہو جاتے ہیں۔

شہاب کے معنے

کلام الٰہی کی حفاظت کا ذکر سورہ حج میں

ان دونوں آیتوں میں شدید مشابہت ہے۔ سورہ حجر میں بھی یہ ذکر ہے۔ کہ رُوحانی آسمان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور یہاں بھی یہ بیان ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کلام الٰہی کی حفاظت کرتا ہے سورہ حجر میں بھی ہے کہ شیطان آسمان میں دخل دینا چاہتے ہیں اور سورہ حج میں بھی ہے کہ وہ کلام الٰہی میں دخل دینا چاہتے ہیں۔ سورہ حجر میں بھی ہے کہ دخل دینے والوں کو خدا تباہ کر دیتا ہے اور سورہ حج میں بھی ہے۔ کہ کلام الٰہی کو بگاڑنے کی سعی کرنے والوں کے فعل کو خدا تعالیٰ مٹا دیتا ہے غرض دونوں کے مفہوم سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں میں ایک ہی مضمون بتایا گیا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آسمانوں کی زینت اور ان کی حفاظت کا بیان ہر جگہ کلام الٰہی کے ذکر کے بعد بیان ہوا ہے۔ تو صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اس جگہ رُوحانی آسمان اور اس کی حفاظت کا ذکر ہے نہ کہ جسمانی آسمان اور اس کی حفاظت کا۔ جسمانی آسمان سے صرف تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سے زیادہ اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

شہاب کے پیچھے لگنے سے مراد

کلام الٰہی کی حفاظت کیلئے شہاب بھیجنے سے مراد مامورین کی بعثت

ان آیات میں یہ بھی بتایا گیا کہ ذکر محفوظ کی یہ علامت ہے کہ اس کے اندر جب کوئی دخل دینا چاہے اسکی حفاظت کے لئے شہاب اُترتے ہیں پس جس کلام کی حفاظت کیلئے شہاب نہ اُتریں ماننا پڑے گا کہ اب وہ کلام محفوظ نہیں رہا اور الذکر کے مقام سے گر گیا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ شہاب کے تین معنے ہیں (۱) شعلہ (۲) ستاروں کی طرح چمکنے والی روشنی جو آسمانی پتھروں کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور (۳) ستارہ لیکن اس جگہ ستارہ ہی مُراد ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ صافات (ع۱) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ڹِالْكَوَاكِبِ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ یعنی آسمان پر ستارے زینت کے لئے اور حفاظت کے لئے بنائے گئے ہیں پس حفاظت کا کام ستاروں کے سپرد کیا گیا ہے پھر سورہ مُلک میں ہے۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (ع۱) یعنی ہم نے آسمان قریب کو ستاروں سے مزین کیا ہے اور ان ستاروں کو شیطانوں پر پتھراؤ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہاب ستاروں کا ہی نام رکھا گیا ہے۔ پس شہاب کے پیچھے لگنے سے یہ مُراد ہے کہ جب تک کوئی کلام الٰہی زندہ ہوتا ہے اور الذکر کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دشمنوں سے اس کی حفاظت کے لئے شہاب یا ستارے یا دوسرے الفاظ میں مامورین بھیجتا رہتا ہے اور زیر بحث آیات میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے خاص طور پر اس طریق کے استعمال کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس سے زیادہ مضبوط طریق حفاظت کا ناممکن ہے کیونکہ مامورین نہ صرف نشانات سے شیطانوں کے حملوں سے شریعت حقہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ بلکہ بوجہ الہام سے مؤید ہونے کے ان کی تشریحات سے مومنوں کو کلام الٰہی کے وہ صحیح معنے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ جن کے بارہ میں شک کیا ہی نہیں جا سکتا اور ان کی وجہ سے وہ ان تفسیری اختلافات سے نجات پا جاتے ہیں

جو اس سے پہلے لوگوں کے خیالات کو مشوش کر رہے ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ کلام سابق کی حفاظت یعنے اسے شیطانی وساوس سے پاک کرنے اور اس کی زندگی کا تازہ نشانات سے ثبوت دینے کے لئے ماموروں کا آنا نہایت ضروری ہے۔ لیکن افسوس کہ آج مسلمان اس فضیلت کے منکر ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی تابع نبی بھی نہیں آسکتا۔ حالانکہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ جب تک کوئی کلام الذکر ہے۔ اسکی حفاظت اور دشمنوں کے حملوں سے بچانے کے لئے آسمانِ رُوحانی کے ستارے اور شہاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے رہیں گے۔ پہلے مذاہب میں جو انبیاء کی بعثت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کی کتب الذکر نہیں رہیں۔ قرآن کریم چونکہ الذِّکر ہے اور قیامت تک رہے گا۔ اسکی حفاظت کا یہ ذریعہ بھی قائم رہے گا اور اس سے اس کا درجہ گھٹتا نہیں بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم اب تک الذِّکر ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور بندہ میں تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اسکی ظاہری حفاظت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ مامورین بھیج کر اندرونی اور بیرونی شیطانوں کے حملوں کو دُور کر کے اس کی معنوی حفاظت بھی کرتا ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے۔ کہ اب شہاب مبین یعنے آسمانِ رُوحانی کے ستارے بھیجنے کا سلسلہ قرآن کریم کی حفاظت کے لئے بھی بند ہو گیا ہے۔ وہ دوسرے لفظوں میں یہ کہتا ہے کہ نعوذ باللہ من ذالک قرآن کریم اب الذکر نہیں رہا اور اسکی حفاظت کے لئے اور شیطانوں کی سرکوبی کے لئے اب روحانی آسمان سے ستاروں کا نزول بند ہو گیا ہے۔

ایک موجودہ زمانہ کے مفسر نے لکھا ہے۔ کہ قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اس سے پہلے الہاموں کی حفاظت بندے کرتے تھے۔ اور اس کے ثبوت میں اس نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اور سورہ مائدہ کی مندرجہ ذیل آیت کو پیش کیا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (مائدہ ع ۷) ہم نے تورات کو جس میں ہدایت اور نور تھے نازل کیا تھا۔ اس کے ذریعہ سے وہ انبیاء جو تورات کے مومنوں میں شامل تھے۔ نیز ربانی اور احبار لوگ یہودیوں کے فیصلے کیا کرتے تھے کیونکہ ان کے سپرد کتاب اللہ کی حفاظت کی گئی تھی اور وہ اس پر بطور نگران تھے۔ میرے نزدیک یہ استدلال اسی صورت میں درست ہو سکتا تھا۔ اگر اس جگہ نبیوں کا ذکر نہ ہوتا مگر اس جگہ تو یہ بتایا گیا ہے کہ نبیوں کے سپرد تورات کی حفاظت کی گئی تھی اور یہ ظاہر ہے۔ کہ نبی اپنی طاقت سے کام نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ کی طاقت سے کام کرتا ہے۔ پس اس صورت میں کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ بندوں کے سپرد تورات کی حفاظت تھی۔ فرض کرو کہ کسی نے تورات کے مضمون کو بدل دیا ہوتا اور خدا تعالیٰ ایک نبی کو اسکی اصلاح کا کام سپرد کرتا۔ تو وہ نبی غلطی کیونکر معلوم کر سکتا تھا۔ خدا تعالیٰ کے الہام کے سوا اس کے پاس اصل حقیقت معلوم کرنے کا کونسا ذریعہ ہو سکتا تھا اور جب خدا تعالیٰ نے الہام سے کسی کو کسی غلطی پر اطلاع دے گا۔ تو وہ حفاظت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔ نہ کہ بندہ کی طرف سے۔ یا مثلاً چند شیطان اگر اس کلام کے معانی کو بگاڑنے کی کوشش کرتے اور دُنیا کو گمراہ کرتے۔ تو نبی جو معجزات اور نشانات اور براہین ساویہ سے ان کا مقابلہ کرتا تھا وہ اس کا کام نہیں کہلا سکتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا کام کہلائے گا۔ پس یہ درست نہیں کہ پہلی کتب کی حفاظت بندوں کے سپرد تھی اور قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب ذکروں کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے۔ جیسا کہ اوپر کی آیات سے ثابت ہے۔ ہاں اگر بعض کام وہ بندوں سے لیتا تھا۔ تو وہ صرف اس کا ہتھیار ہونے کی صورت میں وہ کام کرتے تھے۔ اب قرآن کریم جو سب دُنیا میں پھیل گیا اور زبردست حافظہ والوں نے اسے حفظ کیا۔ یہ بظاہر بندوں کا کام ہے لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کریم کی حفاظت بندوں کے سپرد ہے کیونکہ یہ انتظام

کلام الہٰی کی حفاظت کے لئے مامورین کا آنا نہایت ضروری ہے۔

پچھلے مذاہب میں انبیاء کی بعثت کا بند ہونا انکی کتب کے الذکر نہ ہونے کی علامت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے سب ذکروں کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے

یہ خیال کہ پچھلے الہاموں کی حفاظت بندے کرتے تھے درست نہیں۔

نبیوں کے ظہور کے وقت دو قسم کے نشانات۔

بھی تو اللہ تعالیٰ نے ہی کیا ہے۔

حفاظت کے سلسلہ میں قرآن کریم کو دوسری کتب پر فضیلت اس بارہ میں نہیں کہ اسکی حفاظت اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اور دوسری کتب کی حفاظت انسان کرتے ہیں۔ بلکہ اس بارہ میں ہے کہ وہ ایک محدود عرصہ تک الذکر تھیں اور قرآن کریم قیامت تک کے لئے الذکر ہے اور اس کی تائید کے لئے ہمیشہ مامورین آتے رہیں گے۔ جبکہ دوسری کتب کی حفاظت اللہ تعالیٰ دیر سے چھوڑ چکا ہے اور شیطانوں کے حملوں سے انہیں بچانے کے لئے اب آسمان سے شہاب نازل نہیں ہوتے۔ دوسری فضیلت اس بارہ میں قرآن کریم کو یہ حاصل ہے کہ وہ سب کا سب کلام اللہ ہے۔ یعنے اس کا ایک ایک لفظ الہامی ہے۔ جبکہ پہلی کتب کا یہ حال نہ تھا۔ وہ کلام الٰہی اور تشریح کلام الٰہی کے مجموعہ ہوتے تھے۔ جیسا کہ عہد قدیم کی کتب اور انجیل سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہے پس ان کتب کے مضمون کی حفاظت کافی سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں الذکر مفہوم کا نام تھا۔ الفاظ کا نہیں اور خدائی الہام کو انبیاء یا ان کے تابع اکثر اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے اور اس میں حرج نہ سمجھا جاتا تھا قرآن کریم کی وحی چونکہ دائمی وحی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے وقت سے طریقِ وحی کو بدل دیا اور خود الفاظ کا محفوظ رکھنا انکی حرکات سمیت ضروری قرار پایا۔ پس قرآن کریم کا ہر ہر لفظ لکھا گیا یاد کیا گیا اور محفوظ رکھا گیا۔ اس قسم کی حفاظت پہلی کسی وحی کو حاصل نہ تھی۔ نہ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ سے۔ نہ بندوں کے ذریعہ سے۔ ان معنوی حفاظت ایک محدود عرصہ کے لئے اسی طرح دوسری کتب کو حاصل تھی۔ جس طرح کہ قرآن کو قیامت تک کے لئے حاصل ہے۔

انبیاء کے ظہور کے وقت شہب کے گرنے کا نشان۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں شہب بکثرت گرے۔

ظاہری شہب کو انبیاء سے تشبیہ دینے کا مطلب۔

ایک سوال ابھی قابلِ جواب رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ظاہری آسمان پر سے جو شہب گرتے ہیں۔ ان کی کیا توجیہہ ہے۔ آخر ان سے جو انبیاء کو مشابہت دی ہے۔ تو ضرور ہے کہ وہ بھی کوئی ایسا فائدہ دیتے ہوں۔ جو شیطان پر چوٹ سمجھے جانے کے قابل ہو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سے یہ سنت ہے کہ نبیوں کے ظہور کے وقت وہ دو قسم کے نشان دکھاتا ہے۔ ایک قسم کے نشان تو انسانوں کے قریب ہوتے ہیں یعنی اس دُنیا کی اشیاء میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ بعض شکی مزاج لوگ ان کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ شائد نبی کی چالاکی یا ہوشیاری کا ان میں دخل ہو۔ وہ ایک دوسری قسم کے نشان بھی ظاہر کرتا ہے۔ جو آسمانی اجرام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک نشان ستاروں یعنے شہب کے ٹوٹنے کا بھی ہے۔ جہاں تک تاریخی انبیاء کا تعلق ہے۔ حضرت مسیح ناصری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ امر تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت ستارے کثرت سے ٹوٹے تھے اور یہ نشان یا تو اس نبی کی اپنی پیشگوئی کے ماتحت ظاہر ہوتا ہے یا اس سے پہلے کے نبیوں یا ولیوں کی پیشگوئیوں کے ماتحت ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بھی شہب کثرت سے گرے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو اس کثرت سے گرے کہ کفار نے خیال کیا کہ شائد آسمان و زمین تباہ ہونے لگے ہیں۔ اور اہلِ سماء ہلاک ہو گئے ہیں چنانچہ ابن کثیر نے یہ حوالہ لکھا ہے:۔ کہ فَلَمَّا بَعَثَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيًّا رَسُوْلًا رُمُوا لَيْلَةً مِنَ اللَّيَالِي فَفَزِعَ لِذٰلِكَ أَهْلُ الطَّائِفِ فَقَالُوا هَلَكَ أَهْلُ السَّمَاءِ لِمَا رَأَوْا مِنْ شِدَّةِ النَّارِ فِي السَّمَاءِ وَاخْتِلَافِ الشُّهُبِ فَجَعَلُوا يُعْتِقُوْنَ أَرِقَّاءَهُمْ وَيُسَيِّبُوْنَ مَوَاشِيَهُمْ فَقَالَ لَهُمْ عَبْدُ يَالِيْلَ بْنُ عَمْرِو بْنِ عُمَيْرٍ وَيْحَكُمْ يَا مَعْشَرَ أَهْلِ الطَّائِفِ أَمْسِكُوا عَنْ أَمْوَالِكُمْ وَانْظُرُوا إِلَى مَعَالِمِ النُّجُوْمِ فَإِنْ رَأَيْتُمُوْهَا مُسْتَقِرَّةً فِي أَمْكِنَتِهَا فَلَمْ يَهْلِكْ أَهْلُ السَّمَاءِ إِنَّمَا هٰذَا مِنْ أَجْلِ ابْنِ أَبِي كَبْشَةَ يَعْنِي مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنْ نَظَرْتُمْ فَلَمْ تَرَوْهَا فَقَدْ هَلَكَ أَهْلُ السَّمَاءِ فَنَظَرُوْا فَرَأَوْهَا فَكَفُّوْا عَنْ أَمْوَالِهِمْ (ابن کثیر تفسیر سورۂ جن زیر آیت اِنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ یعنے

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول بناکر مبعوث فرمایا۔ تو ایک رات شیطانوں پر سخت سنگ باری ہوئی (یعنے شہب گرے) تو اسے دیکھ کر طائف کے لوگ سخت گھبرا گئے اور آسمان پر بار بار اور کثرت سے شہب کے ٹوٹنے کا نظارہ دیکھ کر کہنے لگے، کہ معلوم ہوتا ہے آسمان کے باشندے ہلاک ہو گئے ہیں۔ اس گھبراہٹ میں انہوں نے اپنے غلام آزاد کرنے شروع کر دئے اور جانوروں کی رسیاں کھولکر انہیں کھلا چھوڑ دیا۔ اس پر ان کے سردار عبدیالیل نے کہا کہ اے طائف کے لوگو! تمہارا بُرا حال ہو اپنے مالوں کو سنبھال کر رکھو اور آنکھیں اُٹھا کر ستاروں کو دیکھو۔ اگر وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں تو معلوم ہوا ستارے نہیں ٹوٹ رہے شہب گر رہے ہیں اور آسمان کے ساکن ہلاک نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ نشان ابن ابی کبشہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے دکھایا گیا ہے۔ اور اگر تم دیکھو کہ ستارے آسمان پر اپنی جگہوں پر نہیں ہیں۔ تو سمجھو کہ آسمان کے لوگ ہلاک ہو گئے ہیں (اور قیامت آگئی ہے) اس پر انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تو ستاروں کو اپنی جگہ پر پایا اور اپنے اموال لٹانے بند کر دیئے۔

یہ نشان سابق پیشگوئیوں کے مطابق ظاہر ہوا تھا چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض آسمانی تغیرات کی انبیاء بنی اسرائیل نے زمانہ نبوی کے وقت کے متعلق خبر دی تھی بخاری میں ہے اِنَّ هِرَقْلَ حِيْنَ قَدِمَ اِيْلِيَا ءَ اَصْبَحَ خَبِيْثَ النَّفْسِ فَقَالَ بَعْضُ بَطَارِقَتِهٖ قَدْ اَنْكَرْنَا هَيْئَتَكَ. قَالَ ابْنُ نَاطُوْرَ وَكَانَ هِرَقْلُ هٰذَا يَنْظُرُ فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ لَهُمْ حِيْنَ سَأَلُوْهُ اِنِّيْ نَظَرْتُ اللَّيْلَةَ حِيْنَ نَظَرْتُ فِي النُّجُوْمِ اَنَّ مَلِكَ الْخِتَانِ قَدْ ظَهَرَ (باب بدء الوحی بخاری جلد اوّل) یعنی ہرقل زمانہ نبوی میں دورہ کرتے ہوئے ایلیا کے مقام پر آیا۔ تو ایک دن صبح کے وقت اسکی طبیعت پریشان تھی۔ اسپر کلیسائی جرنیلوں میں سے ایک نے پوچھا کہ آج آپ کی طبیعت کچھ پریشان معلوم ہوتی ہے۔ ابن ناطور کہتا ہے کہ یہ ہرقل علم ہیئت کا ماہر تھا اور رسدگاہوں میں بیٹھ کر ستاروں کو دیکھا کرتا تھا۔ اس نے اس سوال کا یہ جواب دیا کہ جب آج رات میں ستاروں کا معائنہ کر رہا تھا میں نے وہ علامات دیکھیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کا بادشاہ (یعنی نبیؐ آخر الزمان) ظاہر ہو گیا ہے اس لئے پریشانی ہے۔

آنحضرتؐ کے وقت بعض آسمانی تغیر کی انبیاء نے خبر دی تھی

اوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں شہب غیر معمولی طور پر نیلا گرے تھے اور اسی طرح بعض دوسری علامات آسمان میں ظاہر ہوئی تھیں جو آپ کی آمد کا نشان تھیں اور جیسا کہ بعض اور احادیث سے ثابت ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی شہب کثرت سے گرنے تھے (مجمع البحار)

مسیح کی آمد ثانی کے وقت شہب گرنے کی پیشگوئی۔

انجیل میں بھی مسیح کی دوبارہ آمد کے متعلق لکھا ہے "سورج اور چاند اور ستاروں میں نشان ظاہر ہوں گے" (لوقا باب ۲۱- آیت ۲۵) پس یہ امر واقعات اور احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کے ظہور کی علامت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے شہب کا گرنا سنت کے طور پر مقرر کر رکھا ہے اسکی ظاہری وجہ تو جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں یہ ہے کہ تا اس آسمانی نشان کو دیکھ کر لوگ اس وسوسہ سے نجات پائیں کہ شاید اس کے معجزات کسی انسانی تدبیر کا نتیجہ ہوتے ہوں۔ مگر کوئی تعجب نہیں کہ اس کے علاوہ بھی کوئی مخفی وجہ نبی کے زمانہ میں شہب کے گرنے کی ہو۔ اور اس میں کوئی روحانی تاثیرات بھی ہوں۔ جو گو انسانی نگاہ سے مخفی ہوں۔ لیکن ان شیطانی تدابیر کا ناکام کرنے میں ممد ہوتی ہوں۔ جو انبیاء کے دشمن کرتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد میں ان مختلف آیات اور انکی تفاسیر کو لیتا ہوں جو مفسرین نے کی ہیں۔ قرآن کریم میں آسمان سے شہب یا پتھر پڑنے کا ذکر یا آسمانوں کی حفاظت کا ذکر مندرجہ ذیل سورتوں میں ہے

قرآن مجید میں مختلف مواقع پر آسمانوں کی حفاظت اور شہب گرنے کا ذکر۔

(۱) سورۂ حجر زیر تفسیر آیت (۲) سورۂ ملک (ع ۱) اس میں آتا ہے وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ

شُہب پھینکے جانے کا ذکر سورۂ صٰفّٰت، جن، اور حٰم سجدہ میں۔

وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ ہم نے سماءِ دُنیا کو ستاروں سے مزیّن کیا ہے اور انہیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے (۳) سورۂ صٰفّٰت (رکوع ۱) اس میں ہے اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۣالْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں سے مزیّن کیا ہے اور ہر باغی شیطان سے اسے محفوظ بنایا ہے۔ وہ مَلاءِ اعلیٰ کی بات نہیں سُن سکتے اور ہر طرف سے انہیں بھگانے کے لئے ان پر پتھراؤ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ بھی انہیں قائم رہنے والا عذاب ملے گا (وہ سُن تو نہیں سکتے) لیکن اگر کوئی بات اچک لے جائے۔ تو اس کے پیچھے چمکتا ہوا شہاب جاتا ہے (اور اسے تباہ کر دیتا ہے) (۴) سورۂ جن میں ہے وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ (رکوع ۱) اور ہم نے آسمان کے بارہ میں جستجو کی ہے اور یہ معلوم کیا ہے۔ کہ اس میں سخت پہرہ لگا ہوا ہے۔ اور شُہب بھی مقرر ہیں۔ اور اس سے پہلے تو ہم آسمان میں سُننے کی جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ مگر اب جو سُننے لگتا ہے وہ اپنے پر ایک شہاب کو نگران پاتا ہے (۵) حٰم سجدہ میں ہے وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (رکوع ۲) اور ہم نے ورلے آسمان کو چراغوں سے مزیّن کیا ہے اور ان کو ذریعہ حفاظت بھی بنایا ہے۔ یہ غالب اور علم والے خدا کی تقدیر ہے۔

شُہب کے گرنے کے متعلق تحقیق مفسرین کا بیان

یہ پانچ مقام ہیں جن میں اس مضمون کو تفصیلاً یا اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ مفسرین اس کی حقیقت یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب اپنی وحی ملائکہ پر نازل کرتا ہے تو وہ درجہ بدرجہ نیچے اُترتی ہے جب سَماء الدنیا تک پہنچتی ہے تو جن ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان تک پہنچتے ہیں اور اس خبر کو اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کچھ خبریں اُچک اُچک کر جب وہ دوڑتے ہیں۔ تو انکے پیچھے شُہب مارے جاتے ہیں۔ اس کے آگے اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی طرف یہ روایت منسوب کی جاتی ہے کہ شُہب شیطانوں کو مار نہیں سکتے۔ بلکہ زخمی کر دیتے ہیں۔ یا بعض عضو توڑ ڈالتے ہیں۔ لیکن حسن بصریؒ اور ایک اور گروہ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ شیطان قتل کر دیئے جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ شیطان قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ آگے پھر مختلف الخیال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جب وہ ساحروں اور کاہنوں کو خبر پہنچا لیتے ہیں تو پھر مار دیئے جاتے ہیں۔ اور ماوردی کا قول یہ ہے کہ خبر پہنچانے سے پہلے ہی شُہب ان کو جا پکڑتے ہیں اور مار دیتے ہیں۔ (تفسیر فتح البیان بحوالہ قرطبی) پھر مفسرین نے یہ بحث بھی کی ہے۔ کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی شہاب پھینکے جاتے تھے اکثروں نے تو کہا ہے۔ کہ ہاں پہلے بھی پھینکے جاتے تھے۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ نہیں آپ کی بعثت سے پہلے (یعنی زمانہ فترۃ میں) نہیں پھینکے جاتے تھے۔ دوسرے خیال کے ظاہر کرنے والوں میں علامہ زجاج بھی ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی علامت تھی۔ آپؐ کی بعثت سے پہلے شُہب نہ گرتے تھے ورنہ شعراء کے کلام میں اس کا ذکر ہوتا۔ مؤلف فتح البیان لکھتے ہیں کہ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو شُہب کثرت سے گرے تا کہ غیب کی حفاظت اچھی طرح کی جاوے اور آپؐ کی بعثت سے پہلے کم گرتے تھے تو دونوں اقوال میں تطابق ہو سکتا ہے (فتح البیان) درمنثور میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ (درمنثور سورۂ جن زیر آیت اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ) بیان ہوا ہے کہ شیطان آسمان کی باتیں سنا کرتے تھے جو سُنتے اس میں سو جھوٹ ملا دیا کرتے تھے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو وہ اس سے روکے گئے۔ اس پر انہوں نے ابلیس سے ذکر کیا۔ اس نے تحقیق کے لئے ایک وفد بھجوایا۔ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جَبَلَیْ نخلة میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اور ابلیس کو خبر دی۔ اس نے کہا۔ بس یہی سبب مار پڑنے کا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ابلیس نے زمین

کی مٹی منگوائی۔ اور سونگھ کر کہا کہ تہامہ کی زمین میں نبی ظاہر ہوا ہے
افسوس کہ ان بزرگ مفسرین نے جنہوں نے قرآنی تفسیر کے
بیان کرنے میں نہایت محنت اور کوشش سے کام کیا ہے اس معاملہ
میں سخت بے احتیاطی برتی ہے اور غیر معروف روایات کے
رعب میں آگئے ہیں۔ حالانکہ وہ قرآن کریم کے صریح خلاف ہیں
ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) شیطان آسمان کی باتوں
کو سُن لیتے تھے (۲) ان خبروں میں غیب بھی ہوتا تھا (۳) ابلیس
کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر ان شُہب کی مار پیٹ
سے ہوئی پہلے نہ تھی۔ ان تفاسیر کے یہ تین بنیادی اصول ہیں۔ ان
تینوں باتوں کو نکال دیا جائے۔ تو روایات میں کچھ رہتا ہی
نہیں۔ لیکن یہ تینوں باتیں کیسی غلط ہیں پہلی بات کہ شیطان
آسمان سے باتیں سُن سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات
کے خلاف ہے (۱) سورہ طور میں ہے۔ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ
فِيْهِ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (ع ۲)
یعنی کیا آسمان کی بات سُننے کے لئے ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے
جس کے ذریعہ سے یہ آسمان پر جا کر خدا تعالیٰ کی بات سُن لیتے
ہیں (یعنے ایسا ہرگز نہیں) اگر ان میں سے کوئی اس امر کا مدعی
ہے تو وہ سامنے آئے اور اپنی دلیل پیش کرے۔ اس آیت
سے صاف ظاہر ہے کہ آسمان پر جا کر بات سُننا تو الگ رہا وہاں
تک جانے کی قابلیت بھی کفار اور ان کے مددگاروں میں تسلیم
نہیں کی گئی۔ اگر یہ درست ہوتا کہ جن ایک دوسرے پر چڑھ کر
آسمان تک جا پہنچتے تھے تو کیا کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کو یہ جواب نہ دیتے۔ کہ ایک طرف آپ اس امر کے قائل ہیں کہ
جن ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان تک جا پہنچتے ہیں۔ اور دوسری
طرف آپ یہ کہتے ہیں۔ کہ آسمان تک جانے کی ان کے پاس کونسی
سیڑھی موجود ہے (۲) سورۂ شعراء میں ہے۔ وَمَا تَنَزَّلَتْ
بِهِ الشَّيٰطِيْنُ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ؕ
اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ؕ (ع ۱۱) یعنے کفار کا یہ
الزام کہ اس شخص پر شیطان کلام نازل کرتا ہے درست نہیں کیونکہ
(الف) اس کا اپنا چال چلن ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ ہے۔ کہ ایسے
آدمیوں سے شیطان کو کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔
(ب) جو تعلیم اس پر نازل ہوئی ہے وہ ایسی مطہر اور پاک
ہے۔ کہ ناپاک شیطان اس تعلیم کو لا تا ہی نہیں سکتا۔ کس طرح ممکن
ہے کہ شیطان خود اپنے خلاف تعلیم لاتا ہے (ج) اس میں آسمانی
علوم ہیں اور شیطان آسمانی علوم کے سُننے کی طاقت بھی نہیں
رکھتے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے انہیں آسمان کی باتیں سننے سے معزول
کیا ہوا ہے۔

شُہب کے گرنے والی آیات کی تفسیر میں مفسرین کی بے احتیاطی۔

ان زبردست قرآنی دلائل کی موجودگی میں یہ خیال کیونکر کیا
جا سکتا ہے کہ شیطان آسمان کی باتیں سُن لیتے ہیں۔ دوسرا دعویٰ
ان روایات میں یہ کیا گیا ہے۔ کہ شیطانوں یا جنوں کو بعض غیبی
امور بھی معلوم ہو جاتے تھے اور وہ زبردستی اخبار غیبیہ کو اچک
لیتے تھے۔ یہ دعویٰ بھی مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ سے بالبداہت
غلط ثابت ہوتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر کے تین غلط اصول۔

(۱) فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ
مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (یونس ع ۲) غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ
کو ہے (اگر وہ غیب تم کو ملے گا تو تم سچے مجھے ملے گا تو میں سچا)
پس آؤ دونوں خدائی فیصلہ کا انتظار کریں۔ اس آیت کے ہوتے
ہوئے کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ کہ قرآن کریم کے رُو سے جنات
غیب کا علم آسمان سے اُچک لیتے تھے (۲) سورہ طور میں
ہے۔ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (ع ۲)
کیا ان کے پاس غیب معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہے جس سے
غیب معلوم کرکے وہ لکھ لیتے ہیں یعنے ایسا ہرگز نہیں ہے
(۳) یہی آیت سورۂ قلم میں بھی ہے۔ (۴) سورۂ سبا میں ہے
وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ
مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا
يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ
اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۝ (ع ۶/۱۲) یعنے یہ
لوگ تیرا انکار شروع سے کرتے چلے آئے ہیں۔ اور غیب کے
امور کے دریافت کرنے کے لئے دُور سے بیٹھے ہوئے ڈھکوسلے
مارتے رہے ہیں۔ مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان کی غیب دانی کی

شیطان آسمان سے باتیں نہیں سُنتے۔

شیطانوں و جنوں کو غیب معلوم ہو جانے کے متعلق قرآن مجید کا بیان۔

خواہش کے راستہ میں اللہ تعالےٰ نے روکیں پیدا کر رکھی ہیں جس طرح ان لوگوں کی خواہش کو پورا کرنے میں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں روکیں پیدا کر رکھی تھیں۔ اور یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں (ایسے لوگوں کو غیب مل ہی کب سکتا ہے یعنی غیب تو اس قلب پر نازل ہوتا ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہو) اور یقین اور ایمان کے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا ہو۔ اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ وہ آسمان پر نہ جاتے تھے۔ بلکہ دُور بیٹھے ڈھکوسلے مارا کرتے تھے۔

غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے

(۵) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (انعام ع ۱۴) یعنے جس طرح تیرے زمانہ میں ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہم نے ہر نبی کے زمانہ میں انسان شیطانوں اور جن شیطانوں کو چھوڑ رکھا تھا۔ کہ وہ ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے لئے جھوٹی باتیں سُناتے تھے اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ بھی نہ کر سکتے۔ (مگر اسکی مشیت یہی ہے) اس لئے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے اور ان کے افتراؤں کی طرف توجہ ہی نہ کر۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ انبیاء کے دشمن جن و انس ایک دوسرے کو غیب کی باتیں نہیں بتاتے بلکہ جھوٹ بتاتے ہیں۔ آیت کے آخر میں بھی یہ نہیں کہا کہ یہ آسمان کی باتیں سنتے ہیں۔ تو ان سے الگ رہ۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ یہ افترا کرتے ہیں۔ اس لئے تو ان سے الگ رہ۔ اس افترا کا جواب خدا تعالیٰ ہی دے گا۔

[illegible] مفید ... کرتا ہے۔

جب تک رسول لوگوں تک کلام پہنچا نہیں دیتے شیطان کو اس کا علم ہی نہیں ہوسکتا۔

(۶) عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (جن ع ۲) یعنے اللہ تعالےٰ غیب کا جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب کو سوائے اپنے رسولوں کے جو اس کے منتخب ہوتے ہیں اور کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس رسول کے آگے اور پیچھے نگران اور پہرہ دار چلتے ہیں۔ تاکہ اسے یہ علم بھی حاصل ہو جائے۔ کہ ان رسولوں نے اپنے رب کی بات لوگوں تک پہنچا دی ہے اور ان کے تمام امور کا وہ احاطہ کئے رکھتا ہے اور ہر اک چیز کی تعداد بھی اس کے پاس محفوظ رہتی ہے یعنے کمیت اور کیفیت دونوں کا ریکارڈ اس کے پاس ہوتا ہے کسی چیز میں کمی بیشی کا ہونا ممکن نہیں۔

یہ آیت کس وضاحت سے مذکورہ بالا تفاسیر کو باطل کرتی ہے۔ فرماتا ہے نہ صرف یہ کہ غیب کا علم اللہ تعالےٰ کو ہے بلکہ اس غیب کا پہلا اظہار صرف رسولوں پر ہوتا ہے۔ رسول بھی وہ جن کو اللہ تعالےٰ خود منتخب فرماتا ہے نہ بندوں کے چنے ہوئے رسول۔ پھر فرماتا ہے کہ جب تک وہ کلام رسول تک پہنچ نہ جائے ہم اسکی حفاظت کرتے ہیں تا اس میں کوئی دوسرا دخل نہ دے سکے جب رسولوں تک وہ کلام پہنچ جاتا ہے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ حفاظت نہیں چھوڑتا۔ بلکہ حفاظت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ رسول اس کلام کو بندوں تک پہنچا دیں اور اس طرح مکمل طور پر پہنچا دیں۔ کہ اسکی کمیت اور کیفیت دونوں میں کوئی فرق نہ آئے۔ گویا جب تک رسول لوگوں تک خدا تعالیٰ کا کلام پہنچا نہ دیں۔ اس وقت تک شیطان کو اس کلام کے متعلق کوئی علم ہی نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب وہ انسانوں میں پھیل جاتا ہے تو جیسا کہ دوسری آیات سے ثابت ہے شیطان اس کلام کے بارہ میں شرارتیں شروع کرتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ ناکام رہتا ہے غرض اس آیت سے ثابت ہے کہ شیطان کا کلام الٰہی کو اچکنے کا کام کلام الٰہی کے اعلان کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور اس بارہ میں سماء الدنیا سے مراد نبی کی مجلس ہے۔ نہ کہ وہ فضا ریا جو۔ جو ہمیں اپنے سروں کے اوپر نظر آتا ہے (۷) یہ تو عام آیات تھیں۔ ایک آیت خاص جنوں کے متعلق بھی ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں نہ اس سے پہلے کبھی بھی جنوں کو غیب کا علم حاصل ہوا ہے نہ پورا نہ ادھورا۔ اور وہ آیت یہ ہے۔ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ

الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ؁ (سبا ع ۲) یعنے جب حضرت سلیمان پر ہم نے موت وارد کی تو انکی موت کا علم جنوں کو اس وقت تک نہ ہو سکا جب تک کہ دابۃ الارض نے جو ان کے عصا کو کھا رہا تھا انہیں خبر نہ دی پھر جب وہ گر گئے تو جنوں نے یہ امر معلوم کر لیا کہ اگر انہیں غیب کا کچھ بھی علم ہوتا تو وہ اس ذلیل کرنیوالے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے زمانہ میں بھی جنوں کو غیب کا علم حاصل نہ تھا۔ اگر وہ آسمان پر سے سنا کرتے ہوتے تو انہیں حضرت سلیمان کی وفات کا علم کیوں حاصل نہ ہوتا۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان چونکہ نبی تھے انکی وفات کی خبر ضرور الہاماً اور خاص اہتمام سے فرشتوں پر نازل ہوئی ہوگی۔ کیونکہ نبی کی بعثت اور موت دونوں اہم امور ہوتے ہیں۔

تیسرا دعویٰ تفاسیر میں یہ کیا گیا ہے۔ کہ جنوں کو بلکہ ابلیس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا علم آسمانی شہب کے بعد ہوا ہے اور وہ بھی جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باجماعت نماز پڑھتے ہوئے انہوں نے دیکھا۔ جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز باجماعت پبلک میں کئی سال بعد شروع کی ہے پس اگر یہ معنے درست ہیں۔ تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے کئی سال بعد تک ابلیس کو یہ معلوم ہی نہ تھا۔ کہ کوئی رسول مبعوث ہوا ہے حالانکہ یہ صریح تعلیم قرآن کے خلاف ہے اور واقعہ کے خلاف ہے۔ نبی کے دعویٰ کے ساتھ ہی شیطان کے گھر میں ماتم پڑ جاتا ہے اور اسی وقت سب شیطان خواہ شیاطین الانس ہوں۔ خواہ شیاطین الجن ہوں اسکی اور اس کی جماعت کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ پس یہ کہنا۔ کہ کئی سال تک ابلیس کو اور دوسرے شیاطین کو اس کا علم ہی نہ تھا۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو چکے ہیں سنت الٰہیہ کا رد ہے اور واقعات کے خلاف۔ اگر شیطان کو آپؐ کی بعثت کا علم نہ تھا۔ تو مکہ میں مخالفت کا طوفان بے تمیزی کہاں سے اُٹھ رہا تھا۔ ابلیس کے کوئی بھی معنی کرو۔ اس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ناواقف رہنا خلاف عقل۔ خلاف قرآن اور خلاف سنت الٰہیہ ہے۔ قرآن کریم صاف فرماتا ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ (انعام ع ۱۴) جس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ خود شیاطین الانس والجن کو نبیوں کی بعثت کا علم مناسب ذرائع سے دے دیتا ہے اور وہ نبی کی بعثت کے معاً بعد اُسکی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی مدد شروع کر دیتے ہیں پھر ابلیس یا اس کے چیلوں کا اس خبر سے ناواقف رہنا کیا معنے رکھتا ہے

یاد رہے کہ اس مضمون میں بغرض سہولت اور تحت ابلیس یا جن وغیرہ کے الفاظ کے متداول معنے لئے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میرے نزدیک وہی معنے درست ہیں۔ اسکی بحث اپنے موقعہ پر آئے گی کہ میرے نزدیک ابلیس شیطان یا جن کے کیا معنے ہیں۔

اس جگہ ایک سوال رہ جاتا ہے۔ کہ جب غیب کا علم آسمان سے لینا یا آسمان سے خبروں کا سُننا جنوں کے لئے ناممکن ہے تو پھر حدیثوں میں جو آتا ہے کہ جن ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان کی خبر سنتے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اس سے مُراد انبیاء کی باتوں کو سُننا ہے۔ اور ایک دوسرے پر چڑھ کر سننے سے یہ مُراد ہے کہ آئمۃ الکفر خود انبیاء کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے اور براہ راست اپنے دلوں کے شکوک کو دُور نہیں کرواتے۔ بلکہ ہمیشہ کئی واسطوں اور بزعم خود ہوشیاری سے ان کی تبلیغ اور تعلیم کو معلوم کرتے ہیں پھر چونکہ اوّل تو انکی اپنی نیت خراب ہوتی ہے۔ دوسرے وہ سنی سنائی باتوں پر اپنی مخالفت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قدر جھوٹ ان کے بیان میں مل جاتا ہے کہ ایک بات سچی ہو تو سو جھوٹی ہوتی ہیں۔

اور یہ جو حدیثوں میں آتا ہے کہ کبھی شیطان لوگوں تک

رسول کریم صلعم کے وقت سے پہلے کبھی جنوں کو غیب کا علم نہ ہوا۔

شیٰطین الانس والجن کو نبی کی بعثت کا علم فوراً ہو جاتا ہے۔

تفاسیر کا یہ دعویٰ کہ جنوں کو رسول کریم صلعم کی بعثت کا علم شہب کے گرنے سے ہوا غلط ہے

جنوں کا ایک دوسرے پر چڑھ کر غیب کا علم حاصل کرنے کا مطلب

نبی کی بعثت پر شیطان کے گھر میں ماتم۔

شیطانوں پر شہاب گرنے سے مراد۔

بات پہنچا دیتے ہیں۔ اور پھر شہاب ان پر گرتا ہے۔ اور کبھی بات پہنچانے سے پہلے شہاب ان پر گرجاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ بعض لوگ نبیوں پر گستاخی کرنے کے جرم میں فوراً پکڑے جاتے ہیں۔ اور بعض کو حکمت الٰہی لمبی مہلت دے دیتی ہے۔ اور وہ لوگوں کو خوب بھڑکاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن شہاب ان کو بھی آکر پکڑ لیتا ہے۔

میں اس جگہ دو حدیثیں بھی درج کر دیتا ہوں تاکہ اصل الفاظ حدیث کے بھی مستحضر رہیں۔ ایک روایت بخاری کی ہے جو یہ ہے۔ .... عن ابی

شیطانوں پر شہب کے گرنے کا دو حدیثوں میں ذکر۔

هريرة يبلغ به النبي صلى الله عليه وسلم قال إذا قضى الله الامر في السماء ضربت الملائكة بأجنحتها خضعانا لقوله كالسلسلة على صفوان قال علي وقال غيره صفوان ينفذهم ذلك فاذا فزع عن قلوبهم قالوا ماذا قال ربكم قالوا للذي قال الحق وهو العلي الكبير فيسمعها مسترقوا السمع ومسترقوا السمع هكذا واحدٌ فوق آخر ووصف سفيان بيده وفرج بين اصابع يده اليمنى نصبها بعضها فوق بعضٍ فربما ادرك الشهاب المستمع قبل ان يرمي بها الى صاحبه فيحرقه وربما لم يدركه حتى يرمي بها الى الذي يليه الى الذي هو اسفل منه حتى يلقوها الى الارض وربما قال سفيان حتى تنتهي الى الارض فتلقى على فم الساحر فيكذب معها مائة كذبة فيصدق فيقولون الم يخبرنا يوم كذا وكذا يكون كذا وكذا فوجدناه حقا للكلمة التي سمعت من السماء (بخاری جزء ثالث کتاب التفسیر) دوسری روایت ابن ابی حاتم کی ہے جو یہ ہے۔ قال ابن ابی حاتم .... عن النواس بن سمعان رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا اراد الله تبارك وتعالى ان يوحي بامره تكلم بالوحي فاذا تكلم اخذت السمٰوٰت منه رجفة او قال رعدة شديدة من خوف الله تعالى فاذا سمع بذلك اهل السمٰوٰت صعقوا وخروا لله سجدا فيكون اول من يرفع راسه جبريل عليه الصلوٰة والسلام فيكلمه الله من وحيه بما اراد فيمضي به جبريل عليه الصلوٰة والسلام على الملائكة كلما مر بسماء سماء يسأله ملائكتها ماذا قال ربنا يا جبريل فيقول عليه السلام قال الحق وهو العلي الكبير. فيقولون كلهم مثل ما قال جبريل فينتهي جبريل بالوحي الى حيث امره الله تعالى من السماء والارض (ابن کثیر جلد ۵ ص ۱۴۶)

ابن ابی حاتم کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وحی جبریل کی حفاظت میں اس مقام تک پہنچا دی جاتی ہے جو وحی کے لئے مقرر ہے یعنی رسول تک۔ پس دوسری روایات جو بتاتی ہیں۔ کہ جن اسے اچک لیتے ہیں۔ ان کے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ مورد وحی کے پاس جب وحی پہنچ جاتی ہے۔ اور جب وہ اس کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس کے بعد شیطان اسے اچکتے ہیں اور کئی جھوٹ ملا کر انہیں اپنے اتباع میں پھیلا دیتے ہیں۔ نبیوں کی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے لئے عجیب تو ہوتی ہی ہیں پہلے تو لوگ حیران ہوتے ہیں کہ کیا یہ مدعی ایسی ایسی باتیں کرتا ہے۔ مگر کبھی نبی کے اتباع سے جب وہ اس حصہ کو سنتے ہیں جو شیطانوں نے صحیح بیان کیا تھا۔ تو ان کے اتباع یقین کر لیتے ہیں۔ کہ جو دوسری باتیں انہوں نے بیان کی تھیں۔ وہ بھی صحیح تھیں۔ اور آپس میں کہتے ہیں کہ دیکھا فلاں بزرگ نے فلاں دن ان کے بارہ میں یہ بات کہی تھی۔ وہ درست نکلی۔ اس مدعی کے مرید خود اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ پس اس سے ان کو ان جھوٹوں پر بھی یقین آجاتا ہے۔ جو ان کے سرداروں نے نبیوں کی طرف منسوب کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ نبی کے اتباع ان باتوں کو ہم سے چھپاتے ہیں۔ اصل بات وہی ہے

جو ہمارے لیڈروں نے کہی تھی۔ یہ ایک عجیب سلسلہ ہے جو ہر نبی کے وقت میں چلتا ہے اور لاکھوں آدمی جو اپنی تحقیق کا مدار اپنے لیڈروں کے بیانات پر رکھتے ہیں۔ اور ذاتی تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اس بلا میں گرفتار ہو کر صداقت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

ان آیات کے متعلق جو معانی عوام میں مشہور ہیں۔ یا بعض مفسرین نے صحیح روایات کا مفہوم غلط سمجھنے کی وجہ سے یا کمزور روایات کو صحیح تسلیم کرنے کی وجہ سے قرآن کریم کے منشاء کے خلاف لکھے ہیں۔ ان کے متعلق بعض اور غور طلب امور بیان کر کے میں اس تعلیق کو ختم کرتا ہوں۔

گرنے والے وجود سے مُراد ستارے نہیں بلکہ شُہب ہیں پس وہ معترضین جو کہتے ہیں کہ گویا قرآن کریم کے نزدیک آسمان سے گرتی ہوئی نظر آنے والی روشنی حقیقی ستارے ہوتے ہیں۔ درست نہیں۔ نہ یہ بات قرآن کریم میں ہے نہ اس کے معتبر مفسر یہ معنے کرتے ہیں۔ بلکہ مفسرین تو الگ رہے کفار تک بھی اس امر کو سمجھتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی علامت یہ نہ تھی۔ کہ ستارے ٹوٹیں۔ بلکہ یہ تھی۔ کہ شُہب گریں (جیسا کہ اوپر طائف والوں کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔)

قرآن کریم میں متواتر یہ بیان ہوا ہے کہ ہم نے آسمان کی حفاظت کی ہے پس جبکہ حفاظت اللہ تعالٰے نے کی ہے اس سے شیطان کس طرح کوئی بات اُچک سکتے ہیں۔

جب سماءِ دُنیا تک کلام اُترآتا ہے۔ اور شیطان وہاں سے اسے اُچک لیتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا فرشتے اس کلام کو نبی پر جلدی اُتارتے ہیں۔ یا شیطان اپنے اولیاء پر۔ اگر فرشتے پہلے اُتار دیتے ہیں۔ تو شیطانوں کو آسمان سے اُچکنے کا کیا فائدہ ہوا۔ نبی کے مُنہ سے اس خبر کو دُنیا پہلے ہی سُن چکی ہوگی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ فرشتے نبی تک دیر میں پہنچتے ہیں۔ شیطان اپنے اولیاء تک جلد پہنچ جاتے ہیں۔ تو سارے خدائی سلسلہ پر اعتراض ہوگا۔

اگر باوجود اس قدر حفاظت کے جو اللہ تعالٰی بیان فرماتا ہے۔ شیطان کلام کے پہنچنے سے پہلے ہی اسے اچک لیتے ہیں تو پھر نبیوں کے کلام پر کیا اعتبار رہا۔ جس طرح شیطان اسے اُچک سکتے ہیں۔ اس میں کچھ ملا بھی سکتے ہیں۔ (گو بعض لوگوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے۔ کہ شیطان نبی کی زبان پر بھی بعض کلمات جاری کر دیتا ہے۔ العیاذ باللہ)

اگر یہ ممکن ہے کہ شیطان باوجود حفاظت کے خدائی کلام کو اُچک لیتے ہیں۔ تب تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ ممکن ہے خدا تعالٰے کی حفاظت کے باوجود وہ نبی کو ہلاک بھی کر دیں نعوذ باللہ من ذالک۔ مگر جس طرح یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ الٰہی کلام کو شیطان اُچک کر لے جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ یا اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فرما کر خود ہی فرمایا ہے۔ کہ شیطان کچھ سُن لیتا ہے یا اچک لیتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اِلَّا اللہ تعالٰی کے فعل کے بارہ میں نہیں۔ بلکہ شیطان کے بارہ میں ہے۔ اگر اللہ تعالٰی یہ فرماتا۔ کہ ہم اپنے کلام کی حفاظت کرتے ہیں سوائے کچھ تھوڑے سے کلام کے جو ہم شیطان کو دے دیتے ہیں۔ تب تو یہ جواب صحیح ہوتا۔ کہ خدا تعالٰی کی طاقت پر اعتراض نہیں کیونکہ وہ اپنی مرضی سے دیتا ہے لیکن عبارت یوں نہیں۔ عبارت تو یہ ہے کہ خدا تعالٰی تو حفاظت کرتا ہے لیکن شیطان اچک لے جاتا ہے اور یہ معنی نہ صرف نبی اور کلام الٰہی کی شان کے خلاف ہیں بلکہ ان سے تو نعوذ باللہ من ذلک اللہ تعالٰی کی بے بسی اور بے کسی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

اگر یہ معنے درست ہوں۔ تو چاہیئے کہ جب کوئی نجومی حساب لگائے اور کوئی زائچہ تجویز کرے۔ اسی وقت شُہب آسمان سے گرنے لگیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا۔ پس واقعات ان معنوں کو رد کر رہے ہیں۔ رات دن ہزاروں نجومی۔ کاہن۔ رمال جفار جوتشی۔ پنڈت بسترا نو مرپٹار ولو جران کاموں میں مشغول ہیں اور غیب کی خبریں معلوم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا تعلق شیطانوں سے ہے اور شیطان آسمان سے اچک کر انہیں خبریں بتاتے ہیں۔ تو رات اور دن شہب کی

گرنے والے وجود سے مراد ستارے نہیں بلکہ شہب ہیں۔

آسمان کے محفوظ ہونے کے باعث شیطان وہاں سے کوئی بات نہیں اچک سکتے

بارش ہوتی رہنی چاہیئے۔ اگر کہا جائے کہ شُہب اسی وقت گرتے ہیں۔ جبکہ شیاطین باتیں سُنیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ نبیوں کے زمانہ میں شیطان زیادہ باتیں سُنتے ہیں اور اچک کر لے جاتے ہیں۔ حالانکہ نبی کا زمانہ تو زیادہ محفوظ زمانہ ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ پھر سوال یہ ہے۔ کہ یہ امتیاز کیونکر کیا جائے کہ نبی کے زمانہ میں تو نجومی شیطانوں سے خبریں سُنکر لوگوں کو سُناتے ہیں اور دوسرے زمانہ میں صرف حساب لگا کر سُنا دیتے ہیں۔ کیونکہ دونوں قسم کی خبروں میں کوئی فرق کرنا پڑے گا۔ یا تو یہ کہنا ہوگا۔ کہ نبی کے زمانہ میں نجومیوں کی باتیں زیادہ سچّی ہوتی ہیں۔ جو بالبداہت غلط ہے یا پھر ماننا پڑے گا۔ کہ ہر زمانہ میں ہی نجومی شیطانوں سے باتیں پوچھ کر آگے لوگوں کو سناتے ہیں اور جو شخص ستاروں کا تھوڑا سا علم بھی جانتا ہو۔ وہ بتا سکتا ہے کہ یہ خلاف عقل بات ہے۔ علم نجوم و رمل وغیرہ گو لغو اور فضول ہیں۔ مگر حسابی اصول پر قائم ہیں۔ جنّات کا اس معاملہ میں کوئی بھی دخل نہیں۔ ہاں ایک گروہ ہے۔ جو ارواح سے اپنا تعلق ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو روحانی کہتے ہیں انگریزی میں یہ لوگ سپرچولسٹ کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے۔ کہ وہ ارواح سے ملتے اور باتیں کرتے ہیں۔ ان کا ذکر بھی آیات مذکورہ میں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کے متعلق بھی ہم نہیں دیکھتے کہ اِدھر وہ حاضرات کا عمل کریں اور اُدھر شہب گرنے لگیں۔ اس نام نہاد علم کی طرف منسوب ہونے والے لوگ یا تو ٹھگی اور فریب کے مرتکب ہوتے ہیں اور انکی بھی کافی تعداد ہے یا پھر وہ دھوکہ خوردہ لوگ ہیں جو انسانی دماغ کی باریکیوں کو نہ سمجھتے ہوئے بعض باریک روحانی قویٰ کو عالم اُخروی کی ارواح کا عمل اور تاثیر قرار دے لیتے ہیں۔ بہرحال نہ اُنکی مزعومہ ارواح آسمان سے سُنتی ہیں اور نہ اُن پر شہاب گرتے ہیں۔

شیطانوں کو کلام کے غلط معنے پھیلانے کی اجازت، اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت کی بنا پر دے رکھی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان آیات میں کلام الٰہی کی حفاظت کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نبی پر کلام کے نازل ہونے تک کوئی اسے معلوم نہیں کر سکتا۔ جب وہ نازل ہو جاتا ہے تو پھر شیاطین الانس والجن اسے مختلف ذرائع سے اچک کر اس میں جھوٹ ملا کر لوگوں میں پھیلاتے ہیں۔ اور نبی کے خلاف انہیں اُکساتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے ہی موقعہ پر جھوٹ ملانے کا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ جنّ آسمان سے غیب سُنیں تو وہ پاگل ہیں کہ اس میں جھوٹ ملا کر اپنی عزّت کھوئیں۔ ہاں نبی کے کلام میں ان کے دشمن جھوٹ ملاتے ہیں تاکہ لوگوں کو جوش دلائیں اور ان کے خلاف اُکسائیں۔ کوئی صحیح حوالہ لیا۔ اس کے غلط معنے کئے یا ایک ٹکڑہ لیا۔ اور سیاق و سباق سے الگ کر کے اس کے مضمون سے لوگوں کو جوش دلایا۔ یہ نبیوں کے دشمنوں کا روزمرّہ کا مشغلہ ہے۔ اور یہی وہ اچکنا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ کی مشیت نے جائز رکھا ہے۔ اور اس سے نبی کے مشن کی حفاظت نہیں کی۔ بلکہ فرماتا ہے کہ ہم دشمنوں کو اس کا خود موقعہ دیتے ہیں جیسے خود فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۝ (انعام ع ۱۴) اور فرماتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا (انعام ع ۱۵) اور اسی طرح ہم نے ہر (نبی کی) بستی میں اس کے بڑے مجرموں کو ایسا ہی بنا دیا ہے۔ (اس کا ذکر پہلی آیت میں آیا ہے۔ کہ شیطان اپنے دوستوں کو الہام کرتے اور نبی کے خلاف جھگڑنے کے لئے اُکساتے ہیں) اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نبی کے خلاف خوب تدبیریں کرتے ہیں۔ غرض جہاں کلام الٰہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حفاظت حاصل ہے۔ کہ اس میں کوئی ظاہری یا باطنی دشمن تبدیلی نہیں کر سکتا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے شیطانی لوگوں کو اپنی مصلحت سے اس امر کی اجازت دے رکھی ہے کہ اس کلام کے غلط معنے لوگوں میں پھیلائیں۔ یا نبی کی وحی

کے متعلق جھوٹ بول بول کر لوگوں کو جوش دلائیں۔ لیکن جب وہ ایسا کر چکتے ہیں۔ تو پھر ان پر آسمان سے شہاب گرتا ہے۔ اور نبی کے ذریعہ سے ان کے فریب کا پردہ چاک کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ استثناء ہے کہ اس سے نہ خدا تعالیٰ کی طاقت پر حرف آتا ہے۔ نہ دین مخدوش ہوتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی شرارت کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی مستثنیٰ کر دیا ہوا ہے۔ نیز اس قسم کی شرارت سے دین میں کچھ حرج نہیں آتا۔ وہ اپنی جگہ محفوظ رہتا ہے۔ یہ جھوٹی باتیں صرف دشمنوں میں پھیلائی جاتی ہیں اور دشمن کی چند روزہ خوشی کا موجب ہوتی ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلام الٰہی کے خلاف اس قسم کی شرارتیں کرنے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک اندرونی دشمن یعنی منافق۔ اور ایک بیرونی دشمن۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ سورۂ حجر اور سورۂ مُلک میں تو شیطانِ رجیم کی طرف اس فعل کو منسوب کیا گیا ہے۔ اور سورۂ صافات میں شَيْطَانٍ مَارِدٍ کی طرف۔ اور لغت میں جہاں رجیم کے معنے دھتکارے ہوئے دُور رکھے گئے کے ہیں مارد کے معنی باغی کے ہیں۔ پس سورۂ حجر اور سورۂ مُلک میں ان دشمنانِ دین کا ذکر ہے جو کفار میں سے ہوں۔ یعنی جن کو ظاہر میں بھی اسلام کے قریب آنے کی توفیق نہ ملی ہو۔ بلکہ وہ اس سے دُور رکھے گئے ہوں اور بتایا ہے کہ ان کے حملوں سے اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی حفاظت کرے گا اور سورۂ صافات میں یہ بتایا ہے کہ بعض لوگ مسلمان کہلاتے ہوئے بھی نادانستہ یا شرارتاً قرآنی مطالب کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کرینگے وہ شیطانِ مارد ہونگے۔ یعنے ظاہر میں تو مسلمان کہلوئینگے لیکن درحقیقت اسلام کے دانستہ یا نادانستہ باغی ہونگے ان کے فساد کو بھی اللہ تعالیٰ دور کرے گا۔ یہ آیندہ کے لئے پیشگوئی ہے اور بتایا ہے کہ جب کبھی مسلمان قرآنی مطالب کے سمجھنے سے قاصر ہو جائینگے اور اس کے مطالب کو بگاڑ دینگے۔ اللہ تعالیٰ ماموز مبعوث کرکے انکے شر اور فتنہ سے قرآن کریم کو محفوظ کریگا فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

ایک بات اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ نجومیوں اور نام نہاد روحانیین کے بارہ میں ہے۔ اخبار کا وجود ان کے خیالات کا قلع قمع بھی کرتا رہتا ہے۔ پس ضمنی طور پر ان کے متعلق بھی یہ آیت چسپاں ہو سکتی ہے مگر خود علم نجوم یا تاثیرات نجوم کا تعلق جہاں تک حقائق سے ہے یہ ہرگز اسلام کے خلاف نہیں۔ قرآن کریم ہمیں قوانین نیچر کے سیکھنے کا خود حکم دیتا ہے پس یہ ناممکن ہے کہ ایک طرف تو وہ علم ہیئت میں حکمتیں رکھے۔ ان کے سیکھنے کا حکم دے۔ اور پھر جو ان حکمتوں کو سیکھنا چاہے۔ اس پر شہب مارے جائیں۔ اسلام وہم اور شرک سے روکتا ہے پس جہاں تک ان علوم کا تعلق تخمین اور وہم سے ہے وہ ناجائز ہیں اور جب ان کو مذہب کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ وہ شرک بن جاتے ہیں ستاروں کی حرکات میں تاثیرات یقیناً ہیں لیکن وہ قانون قدرت کا ایک جزو ہیں۔ ہزاروں امور ایک وقت میں تاثیر ڈال رہے ہوتے ہیں اپنی ذات میں کامل تاثیر جو دوسرے کی محتاج نہیں صرف خدا تعالیٰ کی ہے پس ستارے کیا کسی اور مادی سبب کے متعلق بھی اگر کوئی شخص خیال کرے کہ وہ قطعی اور یقینی تاثیر رکھتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا فَهُوَ كَافِرٌ بِيْ وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ جو کہے فلاں فلاں ستارہ کی تاثیر کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی وہ کافر ہے (بخاری جلد اوّل باب الذکر بعد الصلوٰۃ) ستاروں کی تاثیرات میں اوّل تو سینکڑوں وہمی باتیں شامل کر دی گئی ہیں لیکن جو علمی طور پر ثابت ہیں وہ بھی ہزاروں اسباب میں سے ایک سبب ہے مسبب الاسباب خدا ان کا نگران اور موکل ہے پس اسی پر توکل چاہیئے۔

کلام الٰہی کے خلاف شرارتیں کرنے والے دو قسم کے لوگ۔

ستاروں کی قطعی تاثیر کا خیال رکھنے والا مشرک ہے

نجومیوں وغیرہ کے لحاظ سے اس رجم شیاطین کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جس زمانہ میں نبی نہیں ہوتے یہ لوگ خوب دعویٰ کرتے رہتے ہیں لیکن جب نبی ظاہر ہوتے ہیں تو انکو خوب مار پڑتی ہے یعنی فریب کھل جاتا ہے۔ اور لوگ مصفّٰی علم غیب اور رنگ بندی میں فرق

نجومیوں کے لحاظ سے رجم شیاطین کے معنے۔

الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا

اور (دیکھو) ہم نے زمین کو پھیلایا ہے۔ اور اس میں ہم نے محکم پہاڑ قائم کئے ہیں اور (نیز) ہم نے اس میں

فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ○ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا

ہر قسم کی موزون (ومناسب) چیزوں کو (پیدا کیا اور) بڑھایا ہے ۱۸ؑ اور اس میں ہم نے تمہارے لئے اور

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا

۱۸ؑ حل لغات - وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا زمین میں ہم نے کھاد ڈالی ہے۔ یا ہم نے اس کو پھیلایا ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورہ رعد ۳ؑ

مَوْزُوْن

مَوْزُوْنٌ وَزَنَ سے اسم فاعل ہے۔ اور وَزَنَهٗ وَزْنًا کے معنے ہیں رَازَ ثِقْلَهٗ وَخِفَّتَهٗ وَامْتَحَنَهٗ بِمَا يُعَادِلُهٗ. کہ کسی چیز کے بھاری اور ہلکے ہونے کا اندازہ کیا۔ اور اس کے بالمقابل وزن کی چیز سے اس کے وزن کا اندازہ معلوم کیا (جیسے بٹوں سے تولتے ہیں) وَفِی الاساس "وَزَنْتُ الشَّیْءَ وَرَزَنْتُه وثقلته اذا اکرته بيدك لتعرف وزنه" اور اساس میں یُوں لکھا ہے۔ کہ وَزَنَ، رَزَنَ اور ثَقَلَ ہم معنے ہیں۔ اور ان کے معنے ہیں کہ کسی چیز کو ہاتھ میں لے کر اس کے وزن کا اندازہ کیا جائے۔ اور وَزَنَ تمرًا لنخلةِ وَزْنًا کے معنے ہیں خرصهٗ وحزرهٗ۔ کھجور کے پھل کی مقدار کا اندازہ کیا (اقرب)

اَنْۢبَتَ کے معنے

پس موزون کے معنے ہونگے اندازہ کی ہوئی چیز، وزن کی ہوئی چیز یا متناسب۔

اس آیت میں اَنْۢبَتَ کے دونوں معنی چسپاں ہوتے ہیں۔

تفسیر - زمین کو ہم نے پھیلایا ہے یا اس میں کھاد ڈالی ہے۔ دونوں معنے ہی اس آیت میں چسپاں ہوتے ہیں

زمین کو پھیلانے اور اس میں کھاد ڈالنے کا مطلب

زمین کو اللہ تعالیٰ نے انسانی ضرورت کے مطابق پھیلایا بھی ہے۔ یعنی اس قدر وسیع بنایا ہے کہ باوجود گول ہونے کے وہ انسان کے لئے تکلیف دہ نہیں۔ بلکہ اس کی گولائی کو وہ محسوس بھی نہیں کرتا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس میں کھاد ڈالی ہے کیونکہ زمین نئی نئی طاقتیں دوسرے ستاروں سے حاصل کرتی رہتی ہے۔ بلکہ علمِ ہیئت سے ثابت ہے کہ دوسرے ستاروں سے ذرات زمین پر گرتے رہتے ہیں اور اس کا حجم بڑا ہو رہا ہے۔ وہ بیرونی کھاد اس کی طاقت کو بہت بڑھاتی رہتی ہے کھاد کے بعد پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو اس کے متعلق فرمایا۔ کہ ہم نے اس میں پہاڑ بنائے ہیں۔ جو برفوں کو سمیٹ کر رکھتے ہیں اور پانیوں کا ذخیرہ ان کے ذریعہ موجود رہتا ہے اور دریاؤں کی مدد سے سب دُنیا میں پھیل کر اسے سیراب کرتا ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔ ہم نے ہر مناسب شے مناسب مقدار میں اُگائی یا بڑھائی ہے۔ اَنْۢبَتَ نباتًا کے معنے اُگانا زمین سے کسی چیز کو بطریقہ نشوونما نکالنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن محاورہ میں اس کے معنی بڑھانے کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے متعلق آتا ہے وَاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (آل عمران ع ۴ پ ۳) اس جگہ لفظ بڑھانے اور ترقی دینے کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ آیت زیر بحث میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہُوا ہے اور اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ کے معنے ہیں ہم نے زمین میں ہر مناسب چیز پیدا کر رکھی ہے یا اسے ترقی دے رہے ہیں۔ یا ہر چیز جس کا ایک اندازہ لگایا گیا ہے اُسے اُگایا۔ یا اُسے ترقی دی ہے۔

یعنی ہر چیز۔ جو اہل دنیا کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی تھی وہ ہم نے اس میں رکھ دی اور وزن کے معنے اندازہ کے بھی ہیں۔ تو اس لحاظ سے یہ معنے ہونگے کہ ہر چیز اندازے کے مطابق اس میں رکھ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ جانتا ہے کہ کس چیز کی اس میں ضرورت ہے اور کتنی ضرورت ہے۔ اس نے کمیت اور کیفیت دونوں کو ملحوظ

مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ○ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ

(ہر) اس (مخلوق) کے لئے (بھی) جسے تم رزق نہیں دیتے معیشت کے سامان پیدا کئے ہیں ١٩ اور کوئی چیز ایسی نہیں

رکھا ہے۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیتوں سے یہ ہے کہ ان میں قرآن کریم کے نزول اور اس کی حفاظت کے غیر معمولی سامانوں کا ذکر تھا۔ جو ایک آسمانی مثال سے ثابت کیا گیا تھا۔ اب زمین کی مثال دی کہ زمین میں بھی ہم نے اس کے نشوونما پانے اور اس کے کمزوری سے بچانے کے لئے غیر معمولی سامان پیدا کر رکھے ہیں۔ کچھ بیرونی ہوتے ہیں کچھ اندرونی۔ (١) آسمان سے گرنے والا مادہ (٢) پہاڑ۔ (٣) اس کی اندرونی طاقتیں۔ یہی حال الٰہی کتاب کا ہوتا ہے۔ وہ آسمان سے مدد پاتی رہتی ہے اس کی تائید میں آئمہ لگے رہتے ہیں اور وہ اپنے اندر ذاتی خوبیاں رکھتی ہے۔ جن کی وجہ سے اس کے مطالب ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے جاذب رہتے ہیں۔

١٩ حل لغات ۔ مَعَايِش۔ مَعِيْشَةٌ کی جمع ہے۔ اور معیشة کے معنے ہیں۔ اَلَّتِی تعیش بِهَا مِنَ الْمَطْعَمِ وَالْمَشْرَبِ۔ وہ کھانا اور پینا جس سے انسان زندہ رہتا ہے۔ وما تکونُ به الحیاةُ جس پر زندگی کا دارو مدار ہو۔ وَمَا يُعَاشُ بِهٖ مِنْ طعامٍ ونحوہ مِمَّا يُكْسَب۔ کھانا اور اس جیسی اور ضروریات جن کو انسان کما کر حاصل کرتا ہے۔ اس پر بھی معیشت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور یعاش فیہ من مکان وزمانٍ وہ وقت یا جگہ جس میں زندگی بسر کی جائے۔ (اقرب)

تفسیر ۔ زمین میں تمہارے لئے ہر قسم کے سامان پیدا کئے گئے ہیں۔ اور ان کا رزق بھی پیدا کیا گیا ہے۔ جن کو تم رزق نہیں دے سکتے۔ انسان دوسرے حیوانوں پر برتری کا دعویدار ہے۔ لیکن رزق جمع کرنے میں کس قدر تکلیف اُٹھاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہزاروں ہزار کیڑوں مکوڑوں کا رزق کس طرح مہیا کر رکھا ہے! انسان تو ان کو رزق نہیں دیتا۔ مگر پھر بھی سب کو رزق مل رہا ہے۔ یہ ایک بالا ہستی کا ثبوت ہے۔ جس کی نظر سے اس کی کوئی مخلوق پوشیدہ نہیں۔ اوپر کی آیات سے اس آیت کا یہ بھی تعلق ہے کہ روحانی غذاؤں کا بھی انسان ہر زمانہ میں محتاج ہوتا ہے۔ ایک زمانہ کے لوگ دوسرے زمانہ کے لوگوں کے لئے صحیح روحانی غذا مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لئے انسانی علوم بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ ایسے وسیع مطالب والے الہامی کلام کی جو آسمان سے نازل ہو اور اسے محفوظ رکھا جائے۔ ایک یہ بھی ضرورت ہے۔ کہ اگر انسانوں پر معاملہ چھوڑ دیا جائے۔ تو آیندہ نسلوں کا وہ کبھی خیال نہ رکھیں۔ اپنے زمانہ کے حالات اور علوم کے مطابق کلام الٰہی کو ڈھال لیں اور اگلے لوگ حیران و پریشان رہ جائیں۔ گذشتہ علوم انکی تسلی کا موجب نہ ہوں اور نئی ضرورتوں کو کلام الٰہی پورا نہ کرتا ہو۔ پھر وہ کیا کریں۔ اس لئے فرمایا۔ کہ جس طرح ان جانداروں کا رزق ہم نے مہیا کیا ہے۔ جن کو تم رزق نہیں دے سکتے یا نہیں دیتے اسی طرح ان انسانوں کے لئے ہم نے اس کلام میں ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔ جو بعد میں آنے والے ہیں اور پہلے زمانہ کے لوگ انکی روحانی غذا کا انتظام نہیں کر سکتے جب وہ وقت آئیگا۔ اللہ تعالیٰ ان خزانوں کو ان کے لئے کھول دیگا اور وہ روحانی غذا حاصل کرینگے۔ اللہ تعالیٰ کا کیسا احسان ہے اگر قرآن کریم کے علوم گذشتہ زمانہ تک محدود رہتے۔ تو آج روحانی غذا کے طالبوں کے لئے سخت مشکلات ہوتیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو ویسا ہی وسیع بنایا ہے جیسا کہ مادی جیسے مادی دنیا کو

اس آیت کا پہلی آیتوں سے تعلق

زمین کے نشوونما پانے اور اس کو کمزوری سے بچانے کے لئے تین سامان۔

معایش

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ویسا ہی وسیع بنایا ہے

اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ؗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ

جس کے (غیر محدود) خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور اسے ہم ایک معیّن اندازے سے ہی

مَّعْلُوْمٍ ۝ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا

اُتارتے ہیں۔ ۲۲ اور ہم نے (بخارات کو) اُٹھانے والی ہوائیں (بھی تمہارے لئے) چھوڑ رکھی ہیں۔ اور (انکے

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ

ذریعے) ہم نے بادلوں سے پانی اُتارا ہے۔ پھر وہ تمہیں پینے کو دیا ہے۔ اور تم (خود) اسے

دُنیا کو بلکہ اس سے زیادہ اور ہر زمانہ کے مطابق اس میں سے علوم نکلتے رہتے ہیں۔

نُنَزِّل

۲۲ حل لغات۔ نُنَزِّلُ نَزَّلَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے اور نَزَّلَہٗ کے معنے ہیں۔ صَیَّرَہٗ نَازِلًا اس کو اترنے والا کر دیا۔ یعنی ایسی حالت میں کر دیا کہ اُترے القومَ۔ اَنْزَلَھُمُ المنازلَ۔ لوگوں کو انکی جگہوں پر اُتارا۔ الشیءَ۔ رَتَّبَہٗ کسی چیز کو مرتب کیا۔ عِیْرَۃٗ۔ قَدَّرَ لَھَا المنازلَ۔ قافلہ کے امام نے قافلہ کے لوگوں کے لئے جگہیں مقرر کر دیں (اقرب) تنزیل اصل میں آہستہ آہستہ اُتارنے کو کہتے ہیں۔

القدر

اَلْقَدَرُ۔ مَا یُقَدِّرُہُ اللّٰہُ مِنَ الْقَضَاءِ۔ وہ قضا جس کا اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے۔ وعَرَّفَہٗ بعضُھم بانہ تعلق الارادۃ بالاشیاء فی اوقاتھا۔ اور بعض نے قدر کی یہ تعریف کی ہے کہ اشیاء کا اپنے اوقات پر وقوع پذیر ہونا قدر کہلاتا ہے۔ مبلغ الشیءِ کسی چیز کی حد اور انتہاء الطاقۃ۔ طاقت (اقرب)

تمام اشیاء کے خزانے خدا کے پاس ہیں جن کو وہ حسب ضرورت نازل کرتا ہے

تفسیر۔ اس آیت میں ایک بہت بڑی صداقت بیان کی گئی ہے۔ اور پہلی آیت کی مزید تفصیل کی گئی ہے۔

ان آیات میں مسلمانوں کو خطاب

ہر چیز کے خزانے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھے ہیں اور ضرورت کے مطابق وہ انسانی ذہن کو ادھر منتقل کر دیتا ہے۔ اور لوگ ان خزانوں سے فائدہ اُٹھانے لگتے ہیں۔ زمین میں سبھی کچھ تھا۔ مگر ایک وقت تک انسان نے لوہے کا علم حاصل نہ کیا تھا۔ پھر لوہا نکلا۔ اور اسے لوگوں نے خوب استعمال کیا۔ مگر لوہا بے جان تھا جب انسان کی ضرورت بڑھی اور اس نے دنیا میں کثرت سے پھرنا چاہا۔ تو پتھر کے کوئلے اور بھاپ کی دریافت ہوئی اور بے جان لوہا جانداروں کی طرح کام کرنے لگا۔ ضرورت نے ترقی کی۔ تو تار کی بجلی کی ایجاد ہوئی۔ اس کے بعد بے تار کی بجلی کی۔ غرض ہر زمانہ کے مطابق زمین خزانے اُگلتی چلی جاتی ہے اسی طرح فرماتا ہے۔ الٰہی کلام کی بھی حفاظت کی جاتی ہے اس کے خزانے محفوظ رکھے جاتے ہیں اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق نازل کئے جاتے ہیں۔ پس کلام الٰہی کو صرف ایک کتاب نہیں سمجھنا چاہیئے کہ نازل ہو گئی اور پھر خدا تعالیٰ نے اس سے تعلق چھوڑ دیا۔ بلکہ کلام الٰہی ایک دُنیا ہے جو ہزاروں خزانوں پر مشتمل ہے جو مختلف زمانہ کے لوگوں کے لئے ہیں جب تک وہ خزانہ سب کا سب مستحقین میں تقسیم نہ ہو جائے اس کلام کو بے حفاظت کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہاں جس کلام کا خزانہ خالی ہو جائے چونکہ اس میں کوئی چیز پہنچانے والی نہیں رہتی اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ پچھلی آیات میں گو مضمون وہی حفاظت قرآن کا، لیکن ان میں مسلمانوں کو بھی خطاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور حفاظت قرآن کے عقیدہ کے متعلق مسلمان جن غلطیوں میں پڑ سکتے تھے۔ ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔

لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ

محفوظ نہیں رکھ سکتے ۲۱ہ اور یقیناً ہم ہی (ہر ایک کو) جلاتے اور مارتے ہیں اور

نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ

ہم ہی (سب کے) وارث ہیں ۲۲ہ اور ہم تم میں سے آگے نکل جانے والوں کو (بھی) یقیناً جانتے ہیں

۲۱ہ حل لغات - لَوَاقِح:- يُقَال لَقِحَتِ النَّاقَةُ لَقَاحًا وكذالك الشَّجَرَةُ. اونٹنی حاملہ ہوگئی اور درخت ثمردار ہوگیا۔ وَاَلْقَحَ فُلَانٌ النَّخْلَ کھجور کے نر و مادہ کو ملایا۔ وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ اَىْ ذَوَاتِ لَقَاحٍ۔ یعنی لَوَاقِح کے معنے ہیں۔ وہ ہوائیں جو درختوں سے نر کا مادہ لے کر درختوں تک پہنچاتی ہیں (مفردات) اللَّوَاقِحُ مِنَ الرِّيَاحِ الَّتِى تَحْمِلُ النَّدٰى ثُمَّ تَمُجُّهُ فِى السَّحَابِ فَاِذَا اجْتَمَعَ فِى السَّحَابِ صَارَ مَطَرًا۔ لَوَاقِح ان ہواؤں کو کہتے ہیں۔ جو زمین پر سے اُٹھنے والے بخارات کو لیکر چلتی ہیں۔ پھر بادلوں میں ان کو ملا دیتی ہیں (اقرب)

تفسیر۔ لَوَاقِح ان ہواؤں کو کہتے ہیں جو درختوں میں سے نر کا مادہ لے کر درخت تک پہنچاتی ہیں۔ اور اس طرح درختوں کو پھل آتا ہے۔ اسی طرح ان ہواؤں کو بھی لَوَاقِح کہتے ہیں جو زمین پر سے اُٹھنے والی رطوبت کو لے کر اُڑتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بادلوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں لَوَاقِح سے مراد پانیوں کو جمع کرکے بادل بنانے والی ہوائیں ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ دونوں ہی معنے اس جگہ مراد ہوں یعنے ہم وہ ہوائیں بھی چلاتے ہیں جو نر درختوں کا مادہ مادہ درختوں پر ڈال کر انہیں پھل لانے کے قابل بناتی ہیں اور وہ ہوائیں بھی چلاتی ہیں جو زمینی رطوبتوں کو جمع کرکے بادل کی صورت میں تبدیل کر دیتی ہیں اور زمین پر بادلوں کو برسا کر ان درختوں کو جو پہلی قسم کی ہواؤں کے ذریعہ سے نر و مادہ کا میل کر چکے ہیں کثرت سے پھلدار بناتی ہیں

لَوَاقِح

آخر میں یہ بتایا کہ پانی کیسی ضروری شے ہے اور کیسی عام مگر انسان اسے بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا پھر روحانی امور میں وہ کیونکر اپنے آپ کو محافظ کے مقام پر کھڑا کرنا چاہتا ہے

کفار کے اس شبہ کا جواب کہ پہلی کتب کی موجودگی میں قرآن کریم کی کیا ضرورت ہے۔

اس آیت میں حفاظت کلام الہٰی کے بارہ میں کفار اور مسلمانوں دونوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ کفار کے اس شبہ کا جواب دیا گیا ہے کہ پہلی کتب کی موجودگی میں قرآن کریم کی کیا ضرورت ہے اور بتایا ہے کہ پانی کی موجودگی میں بادلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر آسمانی بارش کے زمینی پانی کام کا نہیں رہتا اور مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ قرآن کریم کی موجودگی سے مغرور نہ ہونا۔ آسمانی پانی آسمان ہی سے صاف ہو کر ملتا ہے۔ جب کبھی تم لوگ اپنے خیالات کو ملا کر کلام الہٰی کے مطالب کو گندا کر دوگے اللہ تعالےٰ آسمان سے ایسے سامان کرے گا کہ پھر قرآنی مطالب صاف ہو کر دُنیا کو پہنچا دیئے جائیں گے۔

اس آیت سے مسلمانوں کو نصیحت۔

الوارث

۲۲ہ حل لغات - اَلْوَارِثُ۔ وَرِثَ سے اسم فاعل ہے نیز الوارث کے معنی ہیں۔ اَلْبَاقِى بعد فَنَاءِ الْخَلْقِ یعنی وارث کا لفظ خدا تعالیٰ پر اس لحاظ سے بولتے ہیں کہ وہ مخلوق کے فنا ہونے کے بعد باقی رہے گا۔ وَفِى الدُّعَاءِ "اَللّٰهُمَّ اَمْتِعْنِى بِسَمْعِى وَبَصَرِى وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنِّى" اى اَبْقِهِمَا مَعِى صَحِيحَيْنِ حَتّٰى اَمُوْتَ۔ اور حدیث میں ایک دعا ہے جس میں کان اور آنکھ کے لئے وارث کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنے ہیں کہ موت تک وہ صحیح سلامت رہیں (اقرب)

لَوَاقِح سے مراد

مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِيْنَ ○ وَإِنَّ رَبَّكَ

اور (اسی طرح) ہم (تم میں سے) پیچھے رہ جانے والوں کو (بھی) یقیناً جانتے ہیں ؁۲۳ اور یقیناً تیرا رب ہی

هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ إِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ وَلَقَدْ خَلَقْنَا

ع ۲ / ۲

انہیں جمع کرے گا وہ یقیناً حکمت والا (اور) بہت جاننے والا ہے ؁۲۴ اور انسان کو ہم نے یقیناً

تفسیر۔ فرمایا ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ تم جو فانی ہو بھلا کلام الٰہی کی کیسے حفاظت کرسکتے ہو۔ اس لئے ہم اپنا کلام بندوں کے سپرد نہیں کرسکتے۔

ہر نبی کے زمانہ میں حشر ہوا

؁۲۳ تفسیر۔ یعنی یہ خیال نہ کرو کہ آخر مومن بندے دُنیا میں موجود ہیں وہ کیوں حفاظت کا کام نہیں کرسکتے فرماتا ہے ایمان کا دل سے تعلق ہے۔ اور دل کے حالات اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت محض ظاہری علوم پر مبنی نہیں بلکہ قلبی طہارت سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے کہ کون نیکی میں بڑھا ہوا ہے اور کون نہیں۔ پس یہ کام اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے جسے وہ مستقدم دیکھے گا اس کے سپرد یہ کام کریگا اور جو قلبی طہارت میں متاخر ہوں گے خواہ ظاہری علوم میں کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں وہ اس کام کے اہل نہ سمجھے جائیں گے۔

قرآن کریم کی حفاظت صرف ظاہری علوم پر مبنی نہیں بلکہ قلبی طہارت سے تعلق رکھتی ہے۔

یحشر

؁۲۴ حل لغات۔ یَحْشُرُ حَشَرَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور حَشَرَ النَّاسَ کے معنے ہیں۔ جَمَعَهُمْ لوگوں کو جمع کیا۔ وَيَوْمُ الْحَشْرِ۔ يَوْمُ الْبَعْثِ وَالْمَعَادِ وَهُوَ مَأْخُوْذٌ مِنْ حَشَرَ الْقَوْمَ إِذَا جَمَعَهُمْ۔ اور یوم البعث کو یوم حشر انہی معنوں کی رو سے کہتے ہیں کہ اس دن اگلے پچھلے لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ وَالْحَاشِرُ اسْمٌ مِنْ أَسْمَاءِ نَبِيِّ الْمُسْلِمِيْنَ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک نام حاشر بھی ہے (اقرب)

آنحضرتؐ کے زمانہ میں حشر

حشر کے معنے

تفسیر۔ حشر کے معنے جمع کرنے کے ہیں اور حشر انہی معنوں کے رو سے بعث ما بعد الموت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس دن اگلے پچھلے سب انسانوں کو جمع کیا جائے گا۔ حشر کا لفظ اس اجتماع کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو نبیوں کے ذریعہ سے اس دُنیا میں ہوتا ہے یعنی ساری قوم کو اختلاف اور جھگڑے سے نکال کر وحدت کی رسی میں پرو دیا جاتا ہے کوئی نبی نہیں آیا جس کے ذریعہ سے حشر نہ ہوا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں دیکھو کیسا حشر ہوا کہ مختلف الخیال لوگوں کو ایک کلمہ پر جمع کر دیا گیا اور پھر ساری دُنیا میں پھیلا دیا گیا۔ اس آیت میں دونوں حشر کی طرف اشارہ ہے۔ دنیوی حشر کی طرف اس طرح کہ گو آج تیری قوم تیرے خلاف ہے لیکن ایک دن سب کو تیرے ہاتھ پر جمع کر دیا جائے گا۔ حکیم و علیم کی صفات سے یہ بتایا ہے کہ فوری طور پر اس لئے جمع نہیں کیا گیا کہ یہ حکمت کے خلاف ہے فوراً لوگ اسی طرح جمع ہوسکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر تصرف کرکے انہیں جبر کے ذریعہ سے مسلمان بنا دیتا مگر اس کا کیا فائدہ تھا وہ لوگ جو اس طرح مسلمان ہوتے کسی انعام کے مستحق نہ ہوتے۔ دوسرے ان لوگوں میں جو خاص روحانی طاقتیں رکھتے ہیں اور نبی کو اس کے شروع زمانہ میں پہچان لیتے ہیں ان میں اور کمزوروں میں کوئی امتیاز نہ رہتا اگر ایسا ہوتا تو ابوبکرؓ اور ابوجہل میں کیا فرق رہ جاتا سب ہی ایک دم مسلمان ہو جاتے اور دُنیا ابوبکرؓ کی قابلیتوں اور ابوجہل کی نالائقیوں کو جان نہ سکتی پس ایسا کرنا حکمت کے خلاف تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے جبر سے کام نہیں لیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قابل جوہروں اور ناقص لوگوں اور بالکل ناقابل لوگوں کے حالات دُنیا کو معلوم ہوگئے اور اس کے

الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝

آواز دینے والی مٹی سے یعنی سیاہ گارے سے جس کی ہیئت تبدیل ہو گئی تھی پیدا کیا ہے ۲۵ؐ

نتیجہ میں دُنیا نے ابوبکر عمر اور عثمان اور علی رضوان اللہ علیہم سے اپنے اپنے وقت میں فائدہ اٹھایا۔ اگر سب ہی پہلے دن مسلمان ہو جاتے تو ممکن ہے پہلی سیادت کی وجہ سے لوگ ابوبکرؓ کی جگہ ابوجہل یا ویسے ہی کسی آدمی کو اپنا سردار بناتے اور ان فوائد سے محروم رہ جاتے جو ابوبکر وغیرہ سابق الایمان صحابہؓ سے ان کو پہنچے۔ علیم کہہ کر یہ بتایا کہ گو اس حکمت کی وجہ سے دیر ہوئی ہے مگر اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے خدا جو علیم ہے تم کو بتاتا ہے کہ آگے چلکر سب عرب اس دین کے اصول پر جمع ہو جائے گا۔ اُخروی زندگی کے لحاظ سے یہ بتایا کہ ایک دن سب اگلے پچھلے لوگ اللہ تعالےٰ کے حضور جمع کئے جائینگے اور اپنے اپنے اعمال کی جزا پائینگے پس وہ ابتدائی تکالیف جو مسلمانوں کو پہنچ رہی ہیں ان کا خیال نہ کرنا چاہیئے نہ ان لوگوں کو ناکام سمجھنا چاہیئے جو اس شیطانی گروہ کا جنگ میں فتح سے پہلے مارے جائینگے کیونکہ اصل روزِ جزاء تو مرنے کے بعد آنے والا ہے اور اللہ تعالےٰ کی حکمت اور علم نے اس دنیا کو اصل روزِ جزاء نہیں بنایا۔

۲۵ؐ حل لغات صَلْصَال: صَلْصَال اسم ہے اس سے فعل ماضی صَلْصَلَ ہے۔ اور صَلْصَلَ الشَّیْئُ کے معنے ہیں صَوَّتَ۔ اس چیز نے آواز دی۔ صَلْصَلَ الْجَرَسُ: رَجَّعَ صَوْتَہٗ۔ اور اگر صلصل الجرس کہیں تو یہ معنی ہوں گے کہ گھنٹی میں سے سُروار (یعنی وہ جو ٹن کر کے لمبی آواز نکلتی ہے) آواز نکلی۔ صلصل فلانًا: اَوْعَدَہٗ وَھَدَّدَہٗ۔ صَلْصَلَ فلانًا کے معنے ہیں کہ اس کو ڈرایا اور دھمکایا جب صَلْصَلَ زَیْدٌ کہیں۔ تو اس کے معنے ہونگے۔ قَتَلَ رَئِیْسَ العسکر زید نے لشکر کے سردار کو قتل کیا (کیونکہ سردار کے قتل کرنے سے ایک شور پڑ جاتا ہے) صَلْصَلَ الرَّعدُ۔ صفا صوتہٗ بجلی کی آواز میں سریلی گونج پیدا ہوئی

اور صَلْصَال کے معنے ہیں اَلطِّیْنُ الحُرُّ خُلِطَ بِالرَّمل وَقِیْلَ الطِّیْنُ مالم یُجعَلْ خزفًا وہ مٹی جو خالص ہو اور اس کے ساتھ ریت ملی ہوئی ہو اور بعض کہتے ہیں کہ وہ مٹی جو پکائی نہ گئی ہو۔ اور تاج العروس میں اس کے یہ معنے کئے گئے ہیں کہ صَلْصَلَ اللِّجامُ وکذٰلک کُلُّ یابسٍ یُصَلْصِلُ امتدَّ صَوْتُہٗ کہ لگام سے سُروار آواز نکلی اور ایسے ہی ہر خشک چیز سے جو سُروار آواز پیدا ہو اسے صلصال کہتے ہیں۔ وفی روایۃٍ اَحْیَانًا یاتِینی مثل صَلْصَلَۃِ الجرس۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبھی وحی مجھ پر اس طرح نازل ہوتی ہے جیسے گھنٹی کی لمبی آواز۔ والصلصال: الطّین الحُرّ خُلِطَ بالرّمل فصار یَتَصَلْصَلُ اذا جفّ اور خالص مٹی جس میں ریت ملا دی گئی ہو اسے صَلْصَال کہتے ہیں فاذا طُبِخَ فی النّارِ فھو الفخّارُ۔ مگر اسے جب آگ میں پکایا جاوے تو اسے فخار کہتے ہیں۔ وقال مجاہدٌ الصلصال حَمَأٌ مَسْنُوْنٌ۔ اور مجاہد نے کہا ہے کہ صلصال کے معنے سڑی ہوئی مٹی کے ہیں۔ وصَلْصَلَ الرجلُ: اَوْعَدَ وَتَھَدَّدَ اور صلصل کا فعل جب کسی انسان کی طرف منسوب کریں تو معنے یہ ہونگے کہ اس نے دھمکی دی۔ اور ڈرایا۔ وایضًا اذ اقتل سَیِّدَ العسکرِ۔ یا یہ کہ اس نے سردار لشکر کو قتل کر دیا۔ وتَصَلْصَلَ الغدیرُ اذا جفّت حَمْأَتُہٗ۔ تصلصل الغدیر اس وقت کہتے ہیں کہ جب جوہڑ کا گارا خشک ہو جائے۔ وفرسٌ صلصالٌ۔ حاد الصّوت دقیقہ اور گھوڑے کو صلصال کہتے ہیں جب اس کی آواز تیز اور باریک ہو۔ وقال ابو احمد العسکری یقال للحمار الوحشی الحاد الصّوت صالٌّ وصلصالٌ۔ اور ابو احمد عسکری

صلصال کے معنے تاج العروس میں

قوعیشہ ھُمَر بر علیم کہنے کی وجہ

صَلْصَال

نے کہا ہے کہ وہ گورخر جسکی آواز تیز ہو اسے بھی صالٌ اور صَلْصَال کہتے ہیں وبہ فُسِّرَ الحدیثُ اتحبُّوْنَ ان تکونوا مثل حمیرِ الصَّالَۃِ کَاَنَّہٗ یرید صحیحۃ الاجسادِ شدیدۃَ الاصْوَاتِ لقوّتہا ونشاَتِہا اور انہی معنوں کی رو سے اس حدیث کی تفسیر کی جاتی ہے۔ جس میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ صالّہ گورخروں کی طرح ہو جاؤ یعنی وہ جو اپنی مضبوطی اور قوت کی وجہ سے صحیح جسموں والے تیز آواز والے ہوتے ہیں ویسے تم بھی ہو جاؤ یہ روایت مجمع البحار میں بھی آئی ہے اور مجمع البحار میں یہ بھی لکھا ہے کہ عن ابن عباس الصلصالُ ھو الماءُ یقعُ علی الارضِ فَتَنْشَقُّ فیجفّ ویصیرُ لہُ الصَّوتُ

مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْن میں مِن کے متعلق اختلاف۔

یعنی ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ صَلْصَال اس پانی کو کہتے ہیں جو زمین پر گر کر خشک ہو جائے اور وہ مٹی جس پر وہ گرے خشک ہو کر آواز دینے لگے (خشک زمین کی پپڑیاں) والصلصالُ۔ الطّینُ الیابسُ یصلّ ای یصوّت عند النقر او المنتنُ۔ صلصال اس خشک مٹی کو کہتے ہیں جو ٹھکرانے پر آواز دیوے اسی طرح سڑی ہوئی مٹی کو بھی کہتے ہیں۔

حَمَاٌ

حَمَاٌ: حَمَاَ یحمَاُ البئرَ۔ نزع حمَاَتَہا حمَا البئر کے معنے ہیں کنوئیں میں سے گارا نکالا الحماُ کُلّ ماکان من قِبَلِ الزوج مثل الاخ والاب اور حماُ خاوند کی طرف سے رشتہ داروں کو بھی کہتے ہیں جیسے خاوند کا بھائی یا باپ وغیرہما۔ اَلْحَمَاُ: الطِّیْنُ الاسوَدُ اور حماُ کالی مٹی کو بھی کہتے ہیں (اقرب)

مَسْنُوْن

مَسْنُوْن: سَنَّ یَسُنُّ سنًّا سے اسم مفعول ہے اور سَنَّ السِّکِّیْنَ کے معنے ہیں اَحَدَّہٗ چھری کو تیز کیا۔ وھٰذا ممّا یَسنُّکَ علی الطّعامِ اے یشحذک علی اکلِہِ ویُشَہِّیہ الیکَ یعنی یہ چیز ان چیزوں میں سے ہے جو تجھے کھانے کے لئے تیار کر دیگی اور اسکی تجھے رغبت دلائے گی۔ سَنَّ الطِّیْنَ۔ عَمِلَہٗ فخّاراً اور سَنَّ الطِّیْنَ کے معنے ہیں۔ کہ مٹی کو پکا کر سخت کر دیا۔ سَنَّ الشیْءَ: سَھّلَہٗ کسی چیز کو آسان کر دیا۔ صَوّرہٗ یا اسکی شکل بنادی سَنَّ عَلَی القومِ سُنَّۃً۔ وَضَعَہَا کوئی طریق مقرر کیا (اسی سے لفظ مسنون نکلا ہے کہ جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے یہ طریق مقرر کیا ہے) اور مَسْنُون کے معنے ہیں۔ المُنْتِنُ یعنی بدبودار چیز المسنونۃُ الارض الّتی اُکِلَ نباتُہا اور ایسی زمین کو بھی جس کا گھاس ختم ہو چکا ہو۔ مسنون کہتے ہیں۔

تفسیر اس آیت میں یہ جو فرمایا ہے مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْن۔ اس کے بارہ میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْن میں مِنْ کے کیا معنے ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ اپنے مجرور کے ساتھ مل کر صفت ہے۔ صَلْصَال یعنی وہ صلصال جو حَمَاٍ سے بنا ہے (ابوالبقاء۔ کشاف) بعض نے کہا ہے کہ حَمَاٍ مَّسْنُوْن بدل ہے مِنْ صَلْصَالٍ کا (النحو فی بحرالمحیط اور ابوالبقاء) اس صورت میں اس کے یہ معنی ہونگے کہ صلصال سے ہماری مراد حَمَاٍ مَّسْنُوْن ہے گویا پہلی ترکیب کے لحاظ سے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ انسان کی پہلی حالت حَمَاٍ مَّسْنُوْن کی تھی پھر اس سے صَلْصَال بنا۔ اور دوسری ترکیب کے لحاظ سے یہ معنے ہونگے کہ صَلْصَال اور حَمَاٍ مَّسْنُوْن سے ایک ہی حالت کی طرف اشارہ کرنا مطلوب ہے۔ صرف مضمون کی وضاحت کے لئے دو ہم معنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ بدل کے معنوں کی صورت میں مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْن کو عطف بیان قرار دینا زیادہ صحیح ہے کیونکہ بدل میں مقصود دوسرا اسم ہوتا ہے اور پہلا اسم اس کے مفہوم کو قریب کرنے کے لئے لایا جاتا ہے۔ اور عطف بیان میں مقصود اسم اوّل

ہوتا ہے اور دوسرا اسم اس کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے لایا جاتا ہے اور اس آیت میں میرے نزدیک پہلا جملہ یعنی مِنْ صَلْصَالٍ اصل مقصود ہے اور مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُونٍ اس کے بیان کے طور پر استعمال ہوا ہے اس ترکیب کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے بنیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر بنانے والا ہوں جو آواز دینے والی مٹی سے پیدا ہوگا یعنی ایسے کیچڑ سے جو ایک خاص صورت میں ڈھالا گیا ہو یعنی انسانی پیدایش ایسی پانی ملی ہوئی مٹی سے ہے جسے ایک خاص شکل دی گئی ہے۔ اور وہ کھوکھلی ہے جسے ٹھکورنے سے وہ آواز دیتی ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اول انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے۔ دوم اسے خاص ترکیب دیکر ایسی طرح تیار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر خلاء رکھتا ہے۔ سوم جب اسے ٹھکورا جاتا ہے تو وہ آواز دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہنے کی طاقت ہے جس طرح خلادار چیز کو ٹھکوریں تو وہ بولتی ہے۔ اسی طرح انسان کو جب اللہ تعالیٰ ٹھکورتا ہے یعنے اس کا امتحان لیتا ہے تو جو انسان سلامت اور اچھا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ٹھکورنے پر جواب دیتا ہے اور اس میں سے جواباً آواز آتی ہے اور یہی خصوصیت انسان کی ایسی ہے جو اسے دوسری اشیاء سے ممتاز کرتی ہے یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کے امتحان کو قبول کرنے کی اور پھر اس کا جواب دینے کی قابلیت ہے۔

یہ کہ وہ صورت جس میں انسان پہلے بنایا گیا اور جس پر حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کیا تھی اس کا قرآن کریم نے ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے وہ بالکل غیر مرئی ہو اور خوردبینی ہو۔ بہر حال جو صورت مٹی سے انسان کو ابتداً ملی۔ وہ اسی وقت سے صلصال تھی یعنے یہ قابلیت رکھتی تھی کہ خدا تعالیٰ اس کا امتحان لے اور وہ اس کا جواب دے اس مضمون سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم انسانی پیدایش میں ایک ارتقاء کا تو قائل ہے۔ مگر ایسے ارتقاء کا نہیں جو اتفاقاً ہو گیا بلکہ وہ انسانی پیدایش کو درجہ بدرجہ ہوتا ہے لیکن یہ نہیں تسلیم کرتا کہ انسان بننے والا ذرہ کسی وقت بھی انسان کے سوا کچھ اور تھا بلکہ اس کے نزدیک وہ جب بھی اور جس صورت میں بنا تھا اس میں انسان بننے اور الہام کو قبول کرنے کی قابلیت موجود تھی۔ اپنے تمام دوروں میں ایک خاص مقصد کی طرف وہ قدم بڑھا رہا تھا اور ڈاروِن کی تھیوری کے مطابق یہ نہ تھا کہ اس کے بعض حصے نامکمل صورت میں الگ شاخوں میں تقسیم ہوتے گئے ہوں اور کچھ اچھے حصے الگ ہو کر آگے بڑھتے گئے ہوں۔

قرآن کریم انسانی پیدائش میں ارتقاء کا قائل ہے

یعنے مسنون کے معنے صورت والی شے کے کئے ہیں گو عام طور پر مفسرین اس کے معنے سڑی ہوئی شے کے کرتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ علامہ ابوحیان نے لکھا ہے (آیت بالا جلد ۵) سڑنے کے معنے اَسِنَ سے پیدا ہوتے ہیں جو رباعی مزید کا صیغہ ہے اور اس سے اسم مفعول کا صیغہ مسنون نہیں بلکہ مُسَنٌّ بنتا ہے سَنَّ کے معنے ایک طریق کو جاری کرنے یا صورت دینے یا تیز کرنے یا مٹی کو پکا کر اسے ایسا بنا دینے کے ہوتے ہیں کہ وہ آواز دینے لگے پس سڑی ہوئی مٹی کے معنے ایک مجازی معنے ہیں حقیقی معنے ایک خاص شکل پر بنائی ہوئی شے یا آواز دینے کے قابل بنی ہوئی شے کے ہیں

مسنون کے معنے صورت والی شے کے۔

مسنون کے معنے سڑی ہوئی مٹی کے مجازی ہیں

اس آیت میں ان لوگوں کا جواب دیا ہے جو الہام الٰہی کو عجیب سمجھتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں کہ انسان کو الہام ہو کس طرح سکتا ہے اور فرمایا کہ تعجب کے قابل یہ بات نہیں کہ الہام کیونکر ہوتا ہے تعجب اس بات پر ہونا چاہیئے کہ کسی کو الہام کیوں نہ ہو کیونکہ انسانی پیدایش کی ابتدا سے الہام کی قابلیت انسان میں رکھی گئی ہے اور اسکی پیدایش کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ کامل ہو کر الہام الٰہی کو حاصل کرے پس اس پر تعجب نہ کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام کیونکر ہو گیا۔ یا اس الہام کی حفاظت کے لئے آئندہ

الہام الٰہی کو عجیب سمجھنے والوں کو جواب

اس کے اَتباع کو کس طرح الہام ہوگا۔ تعجب اپنی حالت پر کرو کہ مِنْ صَلْصَالٍ ہوتے ہوئے تم کو کیوں الہام نہیں ہوتا۔ اور اپنی حالت کے بدلنے کی طرف توجہ کرو۔

اس آیت سے پہلی آیت یہ ہے وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ۔ اس کے بعد اس آیت میں خلق آدم کا ذکر شروع کیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی خلق آدم کا ذکر ہے اس سے پہلے حشر کا ذکر یا بعث بعد الموت کے واقعات میں سے کسی حصہ کا ذکر ضرور موجود ہے چنانچہ

قرآن کریم میں جہاں خلق آدم کا ذکر ہے اس سے پہلے حشر کا ذکر یا بعث بعد الموت کا ذکر

(۱) بقرہ میں آدم کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پہلے فرمایا ہے۔ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ تم اللہ تعالیٰ (کی طاقتوں) کا کس طرح انکار کرتے ہو۔ حالانکہ تم پہلے بے جان تھے۔ اس نے تم کو جان دی پھر وہ تم کو مارے گا اور پھر زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ یہاں بھی موت حیات اور پھر اس کی طرف جانے یعنی حشر کا ذکر ہے (۲) سورۂ اعراف میں آدم کا ذکر ہے وہاں بھی اس سے پہلے حشر کا ذکر کیا ہے یعنی رکوع اوّل میں تو حشر کا ذکر ہے اور رکوع دوم میں آدمؑ کی خلق کا (۳) الحجر کی زیر تفسیر آیت میں بھی ایسا ہی ہے۔ کہ پہلے حشر کا ذکر ہے اور بعد میں ساتھ ہی خلق آدم کا (۴) سورۂ کہف میں بھی خلق آدم کا ذکر ہے۔ وہاں بھی پہلے جزا و سزا اور مر کر اُٹھنے کا ذکر ہے پھر خلق آدمؑ کا۔ فرمایا وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا۔ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا (رکوع ۶) اور پھر فرمایا وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ الآیۃ (۵) طٰہٰ میں جہاں آدمؑ کا ذکر ہے وہاں پر بھی رکوع ۵ میں حشر کا ذکر ہے فرماتا ہے يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا اور اس کے آگے تفصیلات بھی حشر کی بیان ہوئی ہیں۔ پھر رکوع چھ کے آخر میں اور رکوع سات میں آدم کی پیدائش کا ذکر شروع ہوگیا ہے۔ فرماتا ہے وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ الآیۃ (۶) سورۂ ص میں بھی دوزخ و جنت کا ذکر کرکے حضرت آدمؑ کا ذکر کیا ہے (رکوع ۴ و ۵) غرض ان ساری آیات پر غور کرنے سے ایک معاند قرآن بھی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم کے نازل کرنے والے کے ذہن میں کوئی ترتیب ضرور ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ قرآن میں کوئی ترتیب نہیں وہ غلطی پر ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ موسیٰ اور دیگر انبیا کا ذکر تو بغیر حشر کے ذکر کے آجاتے مگر جہاں بھی حضرت آدم کی پیدائش کا ذکر آئے اُس سے پہلے حشر کا ذکر ضرور ہو۔ خواہ وہ منکر اس ترتیب کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ بہر حال اس پر اس قدر تو ضرور ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم کے نازل کرنے والے کے ذہن میں ضرور کوئی خاص ترتیب تھی جس کی وجہ سے آدم کا ذکر ہمیشہ حشر کے ذکر کے ساتھ آتا ہے۔

بقرہ اور اعراف میں آدم کی پیدائش کا ذکر

قرآن کریم میں اسلام کی آیندہ ترقی کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر

قصہ بقرہ کی کنجی

قرآن کریم میں ایسی کئی مثالیں ہیں کہ کئی جگہ پر ایک ہی طرز کا ذکر بار بار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک بات کو بیان کرتا ہوں کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں اسلام کی آیندہ ترقی اور عالمگیر تبلیغ کا ذکر آتا ہے وہاں پر ضرور حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ تمام قرآن کریم میں تین جگہ یہ ذکر ہے اور تینوں جگہ مسیح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ میرے نزدیک قرآن کریم کے مضامین کی ایک نہ ایک کنجی ضرور ہوتی ہے بعض وقت اس کنجی کا علم الہام کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے اور بعض وقت انسان خود غور و فکر کرکے اپنی عقل سے مدد لیکر اس کو پالیتا ہے۔ مجھے ایک دفعہ بطور القاء بتایا گیا تھا کہ سورہ بقرہ کی کنجی يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ والی آیت ہے چنانچہ میں نے اس کنجی کی مدد سے تمام بقرہ کو حل کر لیا تھا ایسا ہی ایک دفعہ خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ بِسْمِ اللّٰهِ

ہر ایک سورۃ کی کُنجی ہے تبھی ہر سورۃ کے ساتھ نازل ہوئی ہے (سورہ توبہ علیحدہ کوئی سورۃ نہیں بلکہ انفال کا حصّہ ہے) یہ تو ایک ضمنی بات بیان ہوگئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہر جگہ پر حشر کے ساتھ آدمؑ کا مذکور ہونا بتلاتا ہے کہ ان دونوں امور میں گہرا تعلق ہے۔ سو وہ تعلق کیا ہے؟

اوّل تو یہ تعلق ہے کہ حشر اجساد کا مسئلہ کلّی طور پر آدمؑ کی پیدایش کے ساتھ وابستہ ہے کیونکہ اگر ایک عاقل و قادر وجود نہ ہو تو حشر اجساد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیوانات کسی شریعت پر حامل نہیں کیونکہ وہ معذور ہیں۔ اس لئے کسی سزا جزا کے مستحق نہیں اور کسی حقیقی حشر کے محتاج نہیں۔ فرشتے بھی کسی جزاء سزا کے مستحق نہیں کیونکہ گو وہ نیک ہیں لیکن بہرحال مجبور ہیں اور يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (نحل ع۶) کے مقام والا کسی حشر کا محتاج یا مزید جزاء کا مستحق نہیں ہوتا۔ شیطان کی پیدایش انسان کے تابع ہے مگر بہرحال انسان کے سوا جو بھی شیطان ہے وہ کسی سزا کا مستحق نہیں کیونکہ اپنا فرض پُورا کر رہا ہے جس طرح اس دُنیا کی گندی اخبار سزا کی مستحق نہیں کہ وہ کیوں گندی ہیں۔ اسی طرح انسان کے سوا جو شیطان ہیں۔ وہ بھی سزا کے مستحق نہیں ہاں جو انسانوں میں سے شیطان ہیں وہ ضرور سزا کے مستحق ہیں اور حشر انہی بد انسانوں اور نیز نیک انسانوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ پس پیدایش انسانی ہی حشر کا موجب ہے۔ اور اس وجہ سے ہر جگہ جہاں آدم کی پیدایش کا ذکر ہے اس سے پہلے حشر کا ذکر کیا گیا ہے تا بتایا جائے کہ انسانی پیدایش کا تقاضا ہے کہ کوئی حشر ہو اور حشر کا تقاضا ہے کہ کوئی شریعت ہو ورنہ بغیر حجت کے سزا جزا بے معنی ہو جاتی ہے۔

دوسرا تعلق ان دونوں مضامین کا یہ ہے کہ خلق انسانی حشر کی دلیل ہے۔ میں بعض دلائل اس دعویٰ کی تائید میں ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

(۱) انسانی پیدائش کائنات کی ادنیٰ ترین حالتوں سے ترقی کرکے مکمل ہوتی ہے پس یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی دارالجزاء بھی ہے۔ اگر انسان پہلے سے ہی ایک خلقت میں پیدا ہوتا۔ تو کہا جاسکتا تھا کہ یہ اتفاقی واقعہ ہے دوسری چیزیں بھی طبعی تغیرات کے نتیجہ میں بن گئی تھیں یہ بھی بن گیا لیکن ادنیٰ حالتوں سے مختلف تغیرات کے بعد انسان کا بننا اور انسان کے بن جانے کے بعد نئی مخلوق کے لحاظ سے ترقی کا رُک جانا یہ بتاتا ہے کہ انسانی پیدایش ایک ارادے کے ماتحت تھی اور تخلیق کا مقصود تھی۔

(۲) دُنیا میں دو طاقتوں کا وجود پایا جاتا ہے ایک طاقت خیر کی ہے اور دوسری شر کی ہے۔ انسان کے اندر ان دونوں طاقتوں کا پایا جانا اور پھر اس میں دونوں پر قبضہ پانے کی قابلیت کا ہونا بتاتا ہے کہ انسان کو دُنیا پر حکومت کرنے کے لئے بنایا گیا تھا پس اسکی زندگی کا نتیجہ اس کے عمل سے کچھ زیادہ ہونا چاہیئے اور اس کا تقاضا حشر ہے۔

(۳) اس دنیا کی ترقیات طبعی قوانین سے وابستہ ہیں نہ کہ اخلاقی اور روحانی امور سے اور انسانی پیدائش صاف طور پر ظاہر کر رہی ہے کہ اس کے وجود کا بڑا جزو اخلاقی اور روحانی حالات ہیں۔ پس اس دنیا کی ترقیات اس کے لئے منزل مقصود نہیں ہوسکتیں اور اخلاقی اور رُوحانی قربانیوں کے لئے کوئی اور مقام جزاء ہونا چاہیئے۔

یہ جو فرمایا ہے مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ اس سے یہ بتلایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش پانی اور مٹی سے ہے کیونکہ حَمَاٍ مٹی اور پانی کی ملی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہوں پر خدا تعالیٰ نے علیحدہ علیحدہ ان دونوں چیزوں سے پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً پانی کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (انبیاء ع ۳) دوسری جگہ مٹی سے پیدائش کو یُوں ظاہر فرمایا ہے کہ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران ع ۶) ان دونوں آیتوں میں تو پیدایش کا ذکر علیحدہ علیحدہ طور پر پانی اور مٹی سے کئے

ہر سورۃ کی کنجی

حشر اور آدم کے واقعات میں گہرا تعلق

خلق انسان حشر کی دلیل ہے۔

حشر و آدم کے واقعات کا پہلا تعلق۔

دُوسرا تعلق

جانے کا کیا ہے۔ مگر یہاں سورۃ الحجر میں دونوں کو جمع کر دیا ہے کہ حَمَاٍ مَّسْنُوْن سے انسان پیدا ہوا ہے یعنی اس مٹی سے جس میں پانی ملایا گیا اور پھر ایک خاص صورت دیکر اسے بولنے کے قابل بنایا گیا چنانچہ مِنْ صَلْصَالٍ کہہ کر قوتِ ناطقہ کی طرف واضح طور پر اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ایک حد تک سب ہی حیوانوں کی پیدائش حَمَاٍ مَّسْنُوْن سے ہوئی ہے۔ لیکن انسانی پیدائش میں حَمَاٍ مَّسْنُوْن کی صفت صلصالیت کا ظہور نمایاں ہے۔ اسی لحاظ سے انسان کو حدیث میں صالّۃ بھی کہا گیا ہے اور وہ بھی صلصال کی طرح کا لفظ ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ صال کا لفظ تو انسان کے لئے بولا جاوے مگر صلصال کا لفظ نہ بولا جائے اس لفظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کا بولنا خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ کیونکہ صلّ یا صلصل ایسی آواز پر دلالت کرتا ہے جو ٹھکورنے سے پیدا ہوتی ہے اور یہی حقیقت انسان کی ہے کہ وہ کلام جس کی خاطر اس کو پیدا کیا گیا ہے وہ اس میں سے تبھی پیدا ہوتا ہے جب اس کو خدا تعالےٰ کی طرف سے ٹھکورا جاتا ہے یعنی الہام الٰہی نازل ہوتا ہے اور اس کو مشکلات اور مشقتوں سے گذارا جاتا ہے اور یہ جو فرمایا کہ انسان حَمَاٍ مَّسْنُوْن سے بنایا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے جان مٹی سے بن گیا ہے بلکہ (۱) چونکہ حیوانی ... بغیر جسم کے ترقی نہیں کر سکتا اور جسم مٹی سے بنتا ہے اس لئے اسکی طرف اشارہ کیا ہے کہ تا انسان کو معلوم ہو کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی ہے۔

مٹی سے یکدم انسان نہیں بنا

انسان کے حماٍ مسنون سے بنائے جانے کا مطلب۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سائنس کا یہ دعویٰ کہ حیوانی مادہ بےجان سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ خود قابل تحقیق ہے کیونکہ اسکی دلیل صرف ہمارا موجودہ مشاہدہ ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ جس وقت یہ حیوانی مادہ پیدا ہوا اُس وقت کے حالات اور موجودہ حالات میں بڑا فرق ہے۔ سائنس بھی اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ یہی حیوانی مادہ کسی وقت میں ترقی کر کے انسان بن گیا تھا لیکن اب ویسا نہیں ہوتا پس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش کے حالات میں اور اس وقت کے حالات میں بہت بڑا تغیر ہے۔ اس وقت زندگی پیدا کرنے کی رَو نہایت ہی تیز تھی اور اب اتنی نہیں پس ہو سکتا ہے کہ ان حالات کے ماتحت بے جان ذرّات ہی بعض تغیرات کے ماتحت زندہ ذرّات میں تبدیل ہو جاتے ہوں اور بعد میں زمین کے کامل ہو جانے پر وہ حالات نہ رہے ہوں۔ پس متفرق حالات کا ایک دوسرے پر قیاس کرنا سائنس نہیں کہلا سکتا۔

آیت من حماٍ مسنون سے انسان کی ابتداء کی طرف اشارہ نہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ مٹی سے یکدم انسان بن گیا کیونکہ قرآن کریم خلق عالم کی تدریجی پیدائش پر بار بار زور دیتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ تناسل والی خلق میں بھی (قرآن میں اَللّٰہُ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ فرما کر دو خلقوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے) تدریج پائی جاتی ہے (یہ نہیں ہوتا کہ ادھر میاں بیوی ملیں تو ادھر بچہ پیدا ہو جائے) تو کیوں پہلی خلقت میں تدریج نہ ہو گی پس اس آیت میں صرف اس ابتداء کی طرف اشارہ ہے جس وقت حیوانی قابلیتوں سے ترقی کر کے انسان میں اسکی امتیازی قابلیت پیدا ہوئی اور وہ حَمَاٍ مَّسْنُوْن کی صلصال والی حالت ہی تھی یعنی جس میں قبولیت الہام کا مادہ پیدا ہوا یا یہ سمجھیں کہ صرف اسکی اس ابتدا کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں سے اسکی حیاتِ محض شروع ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ اس سے انسانی یا حیوانی پیدائش کی ابتداء کی طرف اشارہ ہے اور کیوں نہ سمجھا جائے کہ قرآن کریم کے نزدیک انسان کی پیدائش کی ابتداء ہوئی ہی اسی طرح تھی کہ مٹی کا پتلا بنایا اور اس میں جان ڈال دی تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اس آیت میں ابتدا کا ذکر نہیں چنانچہ سورۃ روم ع ۳ میں آتا ہے اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ کہ اللہ تعالےٰ نے تم کو خشک مٹی سے پیدا کیا ہے پھر تم بشر بن گئے اور دُنیا بھر میں پھیل گئے۔ اب یہ امر آیت زیر تفسیر

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ وَ

اور (اس سے) پہلے جنوں کو یقیناً ہم نے سخت گرم ہوا کی (قسم کی) آگ سے پیدا کیا تھا ۲۶ اور

کے خلاف ہے کیونکہ اس میں حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے پیدائش انسانی لکھی ہے اور اس آیت میں تراب یعنی خشک مٹی سے لکھی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خشک مٹی ابتدائی کڑی ہے مگر سورہ حجر میں اس ابتدائی ذکر کو چھوڑ کر اس کے بعد کی حالت کو بیان کر دیا گیا ہے۔ سورۃ فاطر ع۲ میں اور بھی فرق کر دیا گیا ہے وہاں فرماتا ہے وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو خشک مٹی سے پیدا کیا ہے پھر اس کے بعد نطفہ سے۔ اس آیت میں اوّل تو حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کو ترک کر دیا ہے دوسرے تراب کے بعد پیدائش کی ایک اور کڑی بیان کی ہے جو نطفہ ہے سورہ مومن میں اس سے بھی مختلف پیرایہ میں پیدائش کا طریق بتایا ہے۔ فرماتا ہے هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (مومن ع) کہ نطفہ کے بعد بھی یکدم انسان نہیں بنا۔ بلکہ اس کے بعد ایک اور تغیر ہوا ہے اور وہ یہ کہ نطفہ علقہ بنا اور پھر اس سے انسان بنا۔ مگر سورہ حج میں اس میں بھی زیادتی کر دی گئی ہے اور فرمایا ہے فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (الحج ع) کہ علقہ کے بعد بھی یکدم انسان نہیں بنا بلکہ اس کے بعد ایک اور درجہ ہے یعنی علقہ سے مضغہ بنتا ہے اور وہ مضغہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے کامل اور غیر کامل پھر اس سے انسان بنا۔ مگر اس پر بھی بس نہیں۔ سورۂ مومنون میں ان کڑیوں پر اور زیادتی کی گئی ہے فرماتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (مومنون ع۱) یہاں پر تین کڑیاں زائد بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ مضغہ کے بعد بھی یکدم انسان نہیں بنا بلکہ پہلے عظام بنتی ہیں پھر عظام پر گوشت چڑھایا جاتا ہے پھر ایک اور پیدائش ہوتی ہے کہ اس بظاہر بے جان مادہ سے ایک جاندار شے پیدا ہو جاتی ہے۔ ان آیات پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم بعض دفعہ درمیانی وسائط کو چھوڑ دیتا ہے پس حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک مٹی کا ایک بُت بنا کر اس میں رُوح ڈال دی گئی تھی اور وہ چلتا پھرتا انسان بن گیا تھا بلکہ قرآن کریم کی تعلیم سے ظاہر ہے کہ انسانی پیدائش مختلف حالات سے گذر کر ہوئی اور مٹی کے الفاظ دیکھ کر یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہیئے کہ انسان فوراً مٹی سے گھڑ کر بنا دیا گیا تھا (جیسے کہ عوام کا خیال ہے) بلکہ صرف اتنا مطلب ہے کہ مٹی سے ابتدا ہوئی اور یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے کیونکہ انسان اب بھی اپنی غذا مٹی سے ہی حاصل کرتا ہے اور کسی چیز کی غذا اسی سے لی جاتی ہے جس سے وہ چیز بنی ہو ورنہ غذا غذا ہی نہیں بن سکتی۔ مثلاً لوہا اگر گھس جائے تو اس کی جگہ لوہا ہی لگایا جائے گا دوسری چیز اس کا کام نہیں دے سکتی۔ پس ہماری غذا چونکہ مٹی کے اجزاء سے بنتی ہے بہ ظاہر ہے کہ ہماری پیدائش بھی اسی قسم کے اجزاء سے ہے جو مٹی کے تیار کرنے میں خرچ ہوئے ہیں اور انسان پیدائش عالم کی آخری ارتقائی کڑی ہے کوئی باہر سے آئی ہوئی شے نہیں ہے۔ میں اس جگہ انسانی پیدائش پر تفصیلی بحث نہیں کرتا اس کا مناسب مقام سورۂ بقرہ یا سورۂ اعراف کی آیات ہیں۔

انسانی پیدائش کی مختلف کڑیوں کا ذکر۔

انسانی پیدائش مختلف حالات سے گزر کر ہوئی

۲۶ حل لغات۔ اَلْجَآنّ۔ جَنَّ يَجُنُّ اَلْجَانَّ جَنًّا وَّجُنُوْنًا کے معنے ہیں سَتَرَهٗ وَاَظْلَمَ عَلَيْهِ پردہ ڈال دیا اور اندھیرا کر دیا۔ جَنَّ اللَّيْلُ: اَظْلَمَ

وَاخْتَلَطَتْ ظُلْمَتُہٗ۔ رات کی تاریکی چھاگئی۔ وَجَنَّ الْجَنِيْنُ فِی الرَّحِمِ اِسْتَتَرَ جنین رحم میں پوشیدہ ہوگیا وَالْجَانُّ اسْمُ فَاعِلٍ اور جانّ اسم فاعل ہے یعنی اندھیرا کردینے والا۔ یا پوشیدہ ہوجانے والا۔ اسْمُ جَمْعٍ لِلْجِنِّ۔ اور یہ جن کی اسم جمع بھی ہے۔ حَيَّةٌ بَيْضَاءُ كَحْلَاءُ الْعَيْنِ

جنوں کے متعلق عام لوگوں کا خیال

لَا تُؤْذِیْ۔ اور اس سفید سانپ کو بھی جو سرگین آنکھوں والا ہو جانّ کہتے ہیں۔ ایسے سانپ میں زہر نہیں ہوتا اور وہ کاٹتا نہیں (اقرب) وَالْجَانُّ اَبُو الْجِنِّ اور جنوں کے مورث اعلیٰ کو بھی جانّ کہتے ہیں۔ (تاج)

السَّمُوم

السَّمُوْمُ: سَمَّ يَسُمُّ سَمًّا سے اسم ہے سَمَّ الطَّعَامَ کے معنے ہیں جَعَلَ فِيْهِ السَّمَّ کھانے میں زہر ڈال دیا۔ سَمَّ الْاَمْرَ کے معنے ہیں سَبَرَهٗ وَنَظَرَ غَوْرَهٗ کہ معاملہ کی تحقیقات کی اور اسکی حقیقت معلوم کی۔ سَمَّتِ الرِّيْحُ سُمُوْمًا۔ اَحْرَقَتْ گرم ہوا نے چیزوں کو جھلس دیا

جنوں کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ

وَالسَّمُوْمُ: اَلرِّيْحُ الْحَارَّةُ۔ سموم گرم ہوا کو بھی کہتے ہیں۔ اسکی جمع سمائم ہے وَقَالَ اَبُوْ عُبَيْدَةَ اَلسَّمُوْمُ بِالنَّهَارِ وَقَدْ تَكُوْنُ بِاللَّيْلِ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ سموم دن کو ہوتی ہے اور کبھی کبھی رات کو بھی۔ اَلْحَرُّ الشَّدِيْدُ النَّافِذُ فِی الْمَسَامِّ اور سموم اس شدت گرمی کو بھی کہتے ہیں جو مسامات میں گھس جانے والی ہو (اقرب) محیط میں لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا ہے سموم اس شعلہ والی آگ کو

جنوں کے متعلق زردشتیوں کا عقیدہ

کہتے ہیں جس میں دھواں نہ ہو یعنی شعلہ والی آگ یا انگارہ والی۔ ان سارے معنوں کو مدنظر رکھیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ السَّمُوْم اس چیز کو کہتے ہیں جو باریک طور پر اندر گھس جائے اور پھر اثر کرے۔ سمّ (زہر) کو بھی سَمّ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی عروق کے ذریعے جلد انسان کے جسم میں سرایت کرجاتا ہے اور فوراً انسانی زندگی کا خاتمہ کردیتا ہے چنانچہ بعض ایسے زہر بھی ہیں جو صرف سونگھنے سے یا صرف جسم پر ملنے سے اثر کرجاتے ہیں۔

تفسیر۔ جانّ جیسا کہ لغت سے ظاہر ہے جنّ کا اسم جنس بھی ہے اور اس کے معنے پردہ ڈالنے والے یا اندھیرا کردینے والے کے بھی ہیں۔ اور تاریک ہوجانے اور پوشیدہ ہونے کے بھی۔ پس وضع لغت کے لحاظ سے ہر وہ شے جو دوسری شے کو پوشیدہ کردے۔ اس پر پردہ ڈال دے یا تاریک کردے وہ جنّ ہے۔ یا ہر وہ شے جو خود تاریکی میں ڈھ جائے یا نظروں سے پوشیدہ ہو یا پوشیدہ ہوجائے جنّ ہے۔ عام خیال کے مطابق جنّ ایک ایسی مخلوق ہے جو انسانوں کو نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ وہ خود اپنے آپ کو ظاہر کرے۔ اس قسم کی مخلوق کے متعلق دُنیا میں عام خیال پایا جاتا ہے بعض قومیں یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ فرشتے ہی اچھے اور بُرے ہوجاتے ہیں اور اس طرح وہ فرشتوں اور شیطانوں یا جنوں کو فرشتوں کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں۔ ہندوؤں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ گندھروا اور اپسرا دو قسم کی ارواح ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ گندھروا خشکی کی روحیں ہیں اور اپسرا سمندری روحیں ہیں۔ دونوں کے ملنے سے نسل انسانی چلی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک گندھروا اور اپسرا سے یاما اور اسکی توام بہن یامی پیدا ہوئی اور یہ پہلا انسانی جوڑا تھا گندھروا کے متعلق ان کا خیال ہے کہ انکی الگ زمین ہے اور الگ گھوڑے ہیں اور دریائے سندھ کے اس پار رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک ٹکسلا کا شہر بھی گندھروا دیسا میں ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۱ زیر لفظ گندھروا اور جلد دوم زیر لفظ اپسرا)

زردشتیوں میں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے مگر کسی قدر اختلاف کے ساتھ۔ ان کے نزدیک خدا دو ہیں ایک نیکی کا خدا اور اس کا نام اہرمزد ہے اور ایک بدی کا خدا اس کا نام اہرمن ہے نیکی کے خدا کا بھی ایک لشکر ہے جن کو فرشتے کہنا چاہیئے۔ اسی طرح اہرمن کا بھی ایک لشکر ہے جسے ہماری اصطلاح میں شیطانوں کی جماعت کہنا چاہیئے۔

یونانیوں میں بھی بعض اچھی اور بُری ارواح کا خیال پایا جاتا تھا۔ چنانچہ فیثاغورس اور افلاطون کے تابعین میں

یہ خیال پایا جاتا تھا کہ انسانوں کے علاوہ بعض نظر نہ آنے والی ارواح ہیں جن میں سے کچھ بد اور کچھ نیک ہیں۔
(انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد اول زیر لفظ ڈیمن)

یہود میں فرشتوں اور شیطانوں کی صورت میں نہ نظر آنے والی ہستیوں کے وجود کا اقرار پایا جاتا ہے چنانچہ صحف موسیٰ میں فرشتوں کا ذکر بھی موجود ہے اور شیطانوں کا بھی اور گندی ارواح کا بھی۔ چنانچہ فرشتوں کا ذکر حضرت یعقوب کی خواب میں ہے "اور خواب دیکھا اور کیا دیکھتا ہے کہ ایک سیڑھی زمین پر دھری ہے اور اس کا سرا آسمان کو پہنچا ہے۔ اور دیکھو خدا کے فرشتے اس پر سے چڑھتے اترتے ہیں" (پیدائش باب ۲۸ آیت ۱۲) شیطان کا ذکر حضرت آدم کے قصہ میں آتا ہے جب شیطان نے حضرت حوا کو ورغلا کر ممنوع درخت کا پھل کھلایا ۔ اس جگہ اس کا نام سانپ رکھا ہے لیکن مراد شیطان ہی ہے اور سانپ سے جن یا بدروحوں کو مراد لینا قدیم محاورہ ہے۔ عربی زبان میں بھی سانپ کا ایک نام جان ہے اور ہندوؤں یونانیوں وغیرہ میں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے کہ بعض سانپ جنات کی قسم سے ہیں۔

بدارواح کا ذکر بائبل میں

بدارواح کا ذکر استثناء باب ۳۲ آیت ۱۷ میں یوں آتا ہے "انہوں نے شیطانوں کے لئے قربانیاں گذرانیں نہ خدا کے لئے بلکہ ایسے معبودوں کے لئے جن کو آگے وے نہ پہچانتے تھے جو نئے تھے اور حال میں معلوم ہوئے اور ان سے تیرے باپ دادے نہ ڈرتے تھے" اس جگہ شیطانوں سے مراد بدارواح ہیں کیونکہ لکھا ہے کہ بنی اسرائیل انہیں پہلے نہ جانتے تھے۔ ورنہ شیطانوں کو تو وہ جانتے تھے

یہود کے لٹریچر میں جنات کا ذکر

بائبل کے علاوہ یہود کے لٹریچر میں جنات پر خاص زور ہے شرکی ربی ایلیعذر نے لکھا ہے کہ جن شمالی علاقوں میں بستے ہیں اور میگاتی میں لکھا ہے وہ فرشتوں کی طرح اڑتے ہیں شبات طالمود میں لکھا ہے۔ انسان ان سے تعلق رکھ سکتے ہیں اور وہ آسمان کی خبریں سن لیتے ہیں (جیوئش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ ڈیمن)

اناجیل میں جنوں کا ذکر

مسیحیوں میں بدارواح کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اناجیل میں بدروحوں کے نکالنے کو یسوع کا خاص کام بتایا ہے بلکہ ان کے بعد ان کے حواری بھی بدروحوں کو نکالتے رہے۔ اناجیل کے بیان کے مطابق تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جنات دیوانے ہو رہے تھے ہر شہر اور ہر قصبہ میں لوگوں پر آکر قبضہ کر لیتے تھے اور بعض دفعہ تو سینکڑوں آدمیوں پر یکدم قبضہ کر لیتے تھے (دیکھو متی باب ۷ و ۲۸ مرقس باب ۳۲ و ۳۴)

مسلمانوں کے نزدیک نظر نہ آنے والی ارواح کی تین اقسام

مسلمانوں کا عام عقیدہ یہ ہے کہ نظر نہ آنے والی ارواح تین قسم کی ہیں (۱) فرشتے جو سب نیک ہیں بعض کے خیال میں ان میں سے بعض بد بھی ہو جاتے ہیں جیسے کہ شیطان کہ وہ پہلے فرشتہ تھا یا ہاروت ماروت (۲) شیطان کہ وہ سب برے ہوتے ہیں (۳) جن کہ وہ نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی جو جن بد ہوتے ہیں وہ لوگوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور بعض تدابیر سے جنوں پر قبضہ بھی کیا جا سکتا ہے اور ان سے کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں جنوں کا ذکر

قرآن کریم میں جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے فرشتوں شیطانوں اور جنوں تینوں کا ذکر ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی جیسا کہ سورۂ جن میں آتا ہے مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ (جن ع ۲) یعنی جنوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہم میں سے نیک بھی ہیں اور برے بھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن انسانوں کے تابع بھی ہو جاتے ہیں اور ان کے کام کرتے ہیں جیسے حضرت سلیمانؑ کے بارہ میں آتا ہے وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (سبا ع ۲) یعنی جنوں میں سے بھی کچھ افراد حضرت سلیمانؑ کے حکم کے ماتحت اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ان کے کام کیا کرتے تھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرت موسیٰ پر بھی ایمان لائے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

پر بھی ایمان لائے (سورہ جن ع ۱)

احادیث میں جنوں کا ذکر

احادیث میں بھی جنوں کا ذکر ہے لکھا ہے کہ جنوں کا ایک قافلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آیا (مسلم جلد اوّل باب الجہر بالقراۃ فی الصبح) اور یہ بھی آتا ہے کہ ہڈی گوبر وغیرہ جنوں کی غذا ہیں اس لئے ان سے استنجا نہیں کرنا چاہیئے۔ (ترمذی جلد اوّل ابواب الطہارت ابوداؤد کتاب الطہارت)

علامہ سندھی مصنف مجمع البحار لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب تھا کہ نیک جنات صرف عذاب سے نجات پائینگے جنت میں نہیں جائینگے۔ لیکن امام مالکؒ اور امام بخاریؒ کا یہ مذہب تھا کہ وہ جنت میں بھی جائینگے اور انہیں ثواب ملیگا۔ مجمع البحار میں ہی ابن عربی کا قول نقل کیا ہے کہ سب مسلمانوں کا یہ مسلّمہ مسئلہ ہے کہ جن کھاتے پیتے اور نکاح کرتے ہیں۔ (جلد اوّل زیر لفظ جن)

جن کے لفظ کا قرآن کریم اور احادیث میں کئی معنوں میں استعمال

میرے نزدیک جن کا لفظ قرآن کریم اور احادیث میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور یہ مختلف استعمال جن کے مختلف معنوں پر مبنی ہیں یعنی "مخفی ہونے والا" یا "مخفی کرنے والا" ان معنوں کے رو سے مختلف اشیاء یا ارواح یا انسان جو عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ یا وہ اشیاء یا ارواح یا انسان جو دوسری اشیاء پر پردہ ڈالتے ہیں جن کہلاتے ہیں۔ اور چونکہ یہ فعل مختلف وجودوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے مختلف چیزوں یا ہستیوں کا نام اسلامی اصطلاح میں جن رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم میں

قرآن کریم میں مختلف مقاموں میں جنات کا ذکر

جنات کا ذکر مندرجہ ذیل مقامات میں آتا ہے (۱) سورۃ حجر کی زیر تفسیر آیت کہ اس میں جنات کی پیدائش کا ذکر ہے کہ وہ نار سموم سے پیدا ہوئے (۲) سورۃ رحمٰن ع ۱ میں فرماتا ہے وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ جنوں کو ہم نے ایک لپٹیں مارنے والے آگ کے شعلے سے پیدا کیا ہے (۳) ابلیس کی نسبت بھی آتا ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (اعراف ع ۲ و ص ع ۵) تو نے مجھے تو آگ سے پیدا کیا ہے۔ اور آدم کو پانی ملی ہوئی مٹی سے (۴) پھر ابلیس کی نسبت یہ بھی آتا ہے کہ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (کہف ع ۷) وہ جنوں میں سے تھا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل گیا۔ معلوم ہوا کہ ابلیس کی ناری طینت اس کے جنوں میں سے ہونے کے سبب سے تھی (۵) جن شہوانی قوتیں بھی رکھتے ہیں چنانچہ سورۂ رحمٰن میں جنت کی عورتوں کی نسبت فرماتا ہے کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (ع ۳) انکو نہ انسانوں نہ جنوں نے اس سے پہلے کبھی چھوا ہوگا (یہ ذکر اس رکوع میں دو دفعہ آیا ہے) (۶) سورۃ رحمٰن میں ایک یوم حساب کا ذکر ہے۔ اس کے ذکر میں فرماتا ہے۔ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (ع ۳) اس دن انسانوں یا جنوں سے انکے گناہوں کے بارہ میں پوچھا نہ جائے گا بلکہ انکے گناہوں کی وجہ سے ایک عام تباہی ان پر لائی جائیگی (۷) جن اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات ع ۳) (۸) مشرک لوگ اللہ تعالیٰ اور جنات کے درمیان رشتہ داری بناتے ہیں۔ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صافات ع ۵) (۹) مشرک لوگ جنوں کو خدا تعالیٰ کا شریک بتلاتے ہیں وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام ع ۱۳) انہوں نے جنوں میں سے اللہ تعالیٰ کے شریک تجویز کئے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اور بغیر کسی علم کے انہوں نے اللہ کے لئے لڑکے اور لڑکیاں اپنے خیالوں میں بنا رکھی ہیں۔ اسی طرح آتا ہے بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ (سبا ع ۵) قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا مشرک انسان تم کو پوجتے تھے تو وہ کہیں گے کہ نہیں بلکہ یہ جنوں کو پوجتے تھے (۱۰) جنوں میں سے ایک گروہ لوگوں کو گمراہ بھی کرتا ہے اَلَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ

صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ (سورۃ الناس)
نیز وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا
مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا
مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ (حٰم سجدہ ع ۴/۱۸) اور کفار کہیں گے کہ اے
ہمارے رب ہمیں ذرا وہ جن اور انسان جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا
تھا دکھا تو سہی۔ کہ ہم انہیں اپنے قدموں تلے روندیں تاکہ وہ
ذلیل ترین وجود ہو جائیں۔ نیز فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ
نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ
بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (انعام
ع ۱۴/۱) اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے ہیں جن
شیطان بھی۔ اور انسان شیطان بھی۔ وہ ایک دوسرے کو
دھوکہ دینے کے لئے جھوٹی باتیں سناتے رہتے ہیں۔ نیز فرمایا
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ
(انعام ع ۱۵/۴) اے جنوں کی جماعت تم نے بہت سے انسانوں
کو خراب کیا ہے (۱۱) جن دوزخ میں بھی جائیں گے فرماتا ہے
قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ
الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ (اعراف ع ۴/۱۱) یعنی جب فرشتے
کفار کی جان نکالتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ تم سے پہلے جو جن
اور انسان فوت ہو چکے ہیں انکے ساتھ تم بھی دوزخ میں
داخل ہو جاؤ نیز فرمایا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ
الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ (احقاف ع ۲/۲)
یعنی یہ کفار بھی ان گروہوں میں جا شامل ہونگے جو جنوں
اور انسانوں میں سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور جن پر اللہ تعالےٰ
کی حجت پوری ہو چکی ہے اور وہ عذاب کے مستحق قرار پا چکے ہیں
یہ سب لوگ گھاٹا پانے والے ہو گئے۔ یہی الفاظ حق سے لے کر
خاسرین تک سورۂ حم سجدہ ع ۳/۱ میں بھی مذکور ہیں۔
نیز فرماتا ہے وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ
الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا
وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ
لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (اعراف ع ۲۲/۱۲) اور ہم نے بہت سے
جنوں اور انسانوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ
وہ ہیں کہ جن کو دل دیئے گئے مگر انہوں نے ان سے سمجھنے میں
کام نہ لیا۔ انھیں آنکھیں دی گئیں مگر انہوں نے ان سے
دیکھا نہیں۔ انھیں کان تو دیئے گئے لیکن انہوں نے ان سے
سنا نہیں (۱۲) بعض انسان بعض جنات کی پناہ میں رہتے
ہیں۔ اور اس وجہ سے جن مغرور ہو جاتے ہیں وَ اَنَّهٗ كَانَ
رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ
فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (جن ع ۱/۱۱) یعنے حقیقت یہ ہے
کہ کچھ مرد انسانوں میں سے جنوں کے مردوں کی پناہ لیتے
تھے اس طرح انہوں نے جنوں کو اور بھی ظلم اور گناہ میں بڑھا
دیا۔ (۱۳) جن انسانوں کا کام بھی کرتے ہیں چنانچہ حضرت
سلیمان کے ماتحت وہ کام کرتے تھے فرماتا ہے وَحُشِرَ
لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (نمل ع ۲/۱)
سلیمان کے حکم کو پورا کرنے کے لئے جنوں اور انسانوں کے لشکر جمع
کئے گئے نیز فرماتا ہے وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ
بِاِذْنِ رَبِّهٖ (سبا ع ۲/۱) اور جنوں میں سے بھی ایک جماعت
انکی نگرانی میں اللہ تعالےٰ کے حکم سے کام میں لگی ہوئی تھی۔ نیز
فرمایا قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ
اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ (نمل ع ۳/۱۸) اور جنوں میں سے
ایک نہایت سمجھ دار کارگذار جن نے کہا کہ میں آپ کی مطلوبہ
شے (ملکہ سبا کا ساخت) آپ کے اس مقام سے کوچ کرنے
سے پہلے حاضر کر سکتا ہوں (۱۴) جن قرآن کی مثال نہیں بنا
سکتے۔ فرماتا ہے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ
وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا
يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ
ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل ع ۱۰/۱) تو کہدے کہ اگر انسان
اور جن مل کر بھی اس قرآن کی مثل بنانا چاہیں تو نہیں بنا
سکتے خواہ وہ دونوں ملکر ایک دوسرے کی مدد ہی کیوں نہ
کریں (۱۵) جن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے

اور قرآن سُنا۔ فرماتا ہے وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (احقاف ع ۴) اور جب ہم جنوں کی ایک جماعت کو تحریک کر کے تیرے پاس لائے تاکہ وہ قرآن سُنیں پھر جب وہ قرآن سُنانے کی مجلس میں حاضر ہوئے تو اُنہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ خاموش (ہوکر قرآن سُنو) پھر جب قرآن کی تلاوت ختم ہوئی تو وہ اپنی قوم کی طرف چلے گئے تاکہ وہ انہیں ہوشیار کریں۔ سورۂ جن میں بھی بیان فرمایا ہے اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (جن ع ۱) میری طرف وحی کی گئی ہے کہ کچھ جنوں نے قرآن سُنا تو اپنی قوم کو جاکر کہا کہ ہم نے ایک عجیب (پُرلطف) تلاوت سُنی ہے (۱۶) جنات آپؐ پر ایمان لائے۔ چنانچہ اُوپر کی آیت کے بعد ہی ان جنوں کا قول بیان کیا ہے کہ فَاٰمَنَّا بِهٖ ہم اس کلام پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جو جنات کے متعلق آتے ہیں۔ میرے نزدیک ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن

جنوں کا آنحضرتؐ کی مجلس میں حاضر ہونا

جن قسم کے جن لوگ مانتے ہیں ان کا وجود خیالی ہے۔

قرآن کریم میں کئی چیزوں کا نام رکھا گیا ہے۔ اوّل جن بعض ارواح خبیثہ کا نام رکھا گیا ہے۔ جو شیطانی خیالات کے لئے اسی طرح محرّک ہوتی ہیں۔ جس طرح کہ ملائکہ نیک تحریکوں کے محرّک ہوتے ہیں۔ گویا وہ شیطان جو بدی کا محرّک ہے وہ اس کے اضلال اور مددگار ہیں۔ یہ مضمون سورۃ الناس کی آیت سے نکلتا ہے جیسا کہ فرمایا اَلَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ دُوم ان خیالی وجودوں کا نام جن رکھا گیا ہے جنکی کفر لوگ پُوجا کرتے تھے ان وجودوں کی تصدیق نہیں کی بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ کفار بعض ایسے وجود فرض کرتے ہیں اور انکی پُوجا کرتے ہیں اور انکی یہ غلطی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس عقیدہ کی کہ واقعہ میں ایسے جن ہوتے ہیں تصدیق کرتا ہے بلکہ صرف ان کا عقیدہ بیان کرتا ہے کہ وہ ایسے وجود مانتے ہیں اور انکی پُوجا کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت سورۂ انعام کی آیت وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ[۱] یعنے مشرک لوگ جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہیں حالانکہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور بیٹیاں بغیر علم کے تجویز کرتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ وَخَلَقَهُمْ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے جنوں کا وجود ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وَخَلَقَهُمْ حال جَعَلُوْا کی ضمیر کا ہے نہ کہ جنوں کا اور مراد یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو پیدا کیا ہے یہ کہتے ہیں کہ جن اللہ تعالیٰ کے شریک کار ہیں۔

قرآن کریم میں جن کا لفظ ارواح خبیثہ پر اور ان وجودوں پر جن کی کفار پوجا کرتے تھے بولا گیا ہے

اس کا ثبوت کہ لوگ جس قسم کے جن مانتے ہیں ان کا وجود خیالی ہے۔ سورہ سبا کی آیت سے وضاحت سے ملتا ہے۔ فرماتا ہے۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (ع ۵) یعنے یاد کرو جب اللہ تعالیٰ سب انسانوں کو جمع کرے گا پھر ملائکہ سے کہے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ تُو پاک ہے اور تُو ہی ہمارا دوست ہے ان سے ہمارا کوئی بھی تعلق نہیں یہ بات غلط ہے کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنوں کی پرستش کرتے تھے اور ان میں سے اکثر ان پر ایمان لاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ملائکہ کے معبود بنائے جانے کے متعلق ملائکہ سے سوال۔

سوال یہ ہے کہ اگر انسان جنوں کی پرستش نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے پُوچھا کیوں؟ اللہ تعالیٰ کی ہستی تو عالم الغیب ہے یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی مشرک بھی فرشتوں کی عبادت نہ کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پُوچھے کہ کیا یہ تمہاری پُوجا کرتے تھے نیز اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ کسی جہت سے بھی نہیں کہا جا سکتا کہ لوگ فرشتوں کو اُلوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے جواب طلب کرنا

ظلم بن جاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود قرآن کریم فرماتا ہے فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ (صافات ع ۵/۴) یعنے ان سے پُوچھ کہ تمہارے تو بیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ کیا اللہ تعالےٰ نے جب فرشتوں کو مؤنث بنا کر پیدا کیا تھا تو یہ لوگ اس وقت موجود تھے اس آیت سے ظاہر ہے کہ فرشتوں کو مشرک اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بیٹی بھی خدا ہی قرار پائے گی اور قابل پرستش سمجھی جائے گی جیسے حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالےٰ کا بیٹا کہا جاتا ہے اور قابلِ پرستش سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل ع ۷/۱۲ میں اللہ تعالےٰ نے مشرکوں کے شرک کے ذکر میں بیان فرمایا ہے وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ اور یہ لوگ اس طرح بھی شرک کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ایسے نقص سے پاک ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر مشرک ملائکہ کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اگر کسی کو خدا تعالیٰ کی بیٹی یا بیٹا قرار دینا شرک ہے تو پھر ملائکہ کس طرح کہتے ہیں کہ الٰہی یہ لوگ ہماری پوجا نہیں کرتے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ پر سے اعتراض اُٹھ کر فرشتوں پر اعتراض پڑ جاتا ہے۔ مگر غور کیا جائے تو ان پر بھی اعتراض نہیں پڑتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا سوال ظاہر پر تھا اور ملائکہ کا جواب باطن کو مدنظر رکھ کر ہے۔ مشرک ظاہر میں تو یہی کہتے ہیں کہ ملائکہ خدا تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور انکو خوش کرنا بھی ان کے لئے ضروری ہے لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ نہ وہ ملائکہ کو جانیں نہ انکی طاقتوں کو یونہی ملائکہ کا ذکر بڑوں سے سُنکر ایک خیالی وجود انہوں نے اپنے ذہن میں بنا لئے اور خیال کیا کہ یہ ملائکہ ہیں اور اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ وہ وجود محض ذہنی تھے۔ نہ ملائکہ والے صفات ان میں تھے نہ کام تھے پس درحقیقت انکی عبادت ملائکہ کے لئے نہ تھی بلکہ چند خیالی اور نظر نہ آنے والے وجودوں کے لئے تھی جنہیں عربی زبان میں جنّ کہہ سکتے ہیں پس ملائکہ نے جو جواب دیا ہے وہ بھی درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ الٰہی ہماری انہوں نے کیا پُوجا کرنی تھی ہم تو تیرے بندے اور تیری حفاظت میں ہیں۔ یہ تو چند ایسے وجودوں کی پرستش کرتے تھے جو محض خیالی اور غیر مرئی ہیں۔ اگر اس قسم کے جنّوں کا وجود ہوتا جس قسم کا عوام کہتے ہیں تو پھر فرشتوں کا یہ قول کہ وہ جنّوں کی پرستش کرتے تھے جھوٹ ہو جاتا ہے کیونکہ مشرک یقیناً ملائکہ کو بنات اللہ قرار دے کر انکی پرستش کرتے تھے اور اسی صورت میں اس پرستش کو جنّوں کی پرستش کہا جا سکتا ہے کہ جبکہ جنّ کے معنے خیالی اور بناوٹی وجود کے لئے جائیں۔ اگر کہا جائے کہ وہ جنّوں کی بھی پرستش کرتے تھے تو گو یہ درست ہے کہ بعض وجودوں کی پرستش مشرک جنّ کے نام سے بھی کرتے تھے مگر یہاں وہ مُراد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جنّوں کی پرستش سے ملائکہ کی پرستش کی نفی تو نہیں ہو جاتی۔ مشرک تو ہزاروں قسم کے بُت بناتا ہے انسانوں کو بھی خدا کہتا ہے۔ سُورج چاند کو بھی۔ دریاؤں کو بھی۔ ملائکہ کو بھی اپنے مزعومہ جنّوں کو بھی پس جنّوں کی پرستش کرنے کی وجہ سے ملائکہ کو یہ حق پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی پرستش کا انکار کریں۔ یہ حق انہیں تبھی پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ پرستش جو اِن کے نام سے کی جاتی تھی کسی دلیل کی بناء پر کسی خیالی وجود کی طرف منسوب کی جا سکے اور یہی انہوں نے کہا ہے۔ پس جنّ سے مُراد اس آیت میں خیالی اور ذہنی وجود کے ہیں جن کا نام کفار نے ملائکہ رکھ لیا تھا مگر فی الواقعہ وہ ملائکہ نہ تھے۔

ملائکہ کا جواب یہ کہنا کہ لوگ جنّوں کی پُوجا کرتے ہیں۔

کفار ملائکہ کی پرستش نہ کرتے تھے بلکہ انہوں نے جنّوں یعنی خیالی وجودوں کا نام ملائکہ رکھ لیا

جنّ چونکہ مخفی وجود کو کہتے ہیں اس لئے جنّ کا لفظ قرآن کریم میں عربوں اور دوسری اقوام کے محاورہ کے مطابق ان اقوام کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو شمالی علاقوں میں اور سرد ممالک میں رہتی تھیں چونکہ لوگ بوجہ شدت سردی کے انکے ممالک کی طرف سفر نہیں کرتے تھے اور وہ گرمی کی وجہ سے ادھر نہ آتے تھے۔ نیز چونکہ سرد علاقوں میں رہنے کے سبب سے وہ زیادہ سفید رنگ والے اور شراب کے استعمال کی وجہ سے

جنّ کا لفظ ان اقوام کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو شمالی سرد علاقوں میں رہتی ہیں۔

زیادہ سُرخ ہوتے تھے ایشیا کے لوگ اُنہیں کوئی الگ قسم کی مخلوق سمجھتے تھے اور اُنہیں جنّ اور پریاں کہتے تھے یہاں کا عام نام تھا۔ چنانچہ جیسا کہ میں اُوپر لکھ آیا ہوں یہود کا

یہود کا خیال کہ جن شمالی علاقہ میں رہتے ہیں۔

یہ عقیدہ تھا کہ جن شمالی علاقہ میں رہتے ہیں۔ چنانچہ شرکی بنِ الیعذر نے اپنی کتاب میں یہی لکھا ہے کہ جنّ زیادہ تر دُنیا کے شمالی علاقوں میں رہتے ہیں۔ ہندو قوم نے بھی اپنے شمال میں ہی جنّوں کا مقام تجویز کیا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ حوالہ گذر چکا ہے ہندوؤں کے نزدیک گندھروا لوگوں کا علاقہ ہندوستان

ہندوؤں نے بھی جنّوں کا مقام شمال میں تجویز کیا ہے

کے شمال مغرب میں تھا۔ اور ٹکسلا شہر جو علاقہ ہزارہ میں تھا اسے وہ گندھروا کے علاقہ کا شہر کہتے تھے اور دریائے سندھ کے شمال کے علاقہ کو ان کا مسکن قرار دیتے تھے یعنی ہزارہ افغانستان وغیرہ کو۔ مسلمانوں میں جو قصے کہانیاں مشہور ہیں ان میں بھی جنّات کا مسکن کوہ قاف اور اسکے پار کا علاقہ سمجھا جاتا ہے پس یہ بات ظاہر ہے کہ شمالی علاقوں کے سُرخ

شمالی علاقہ کے لوگوں کو جن کہے جانے کی وجہ۔

و سفید لوگ جو تمدنی حالات کے ماتحت قریبًا ایشیا سے بالکل الگ ہو گئے تھے اور بہت کم ادھر آتے تھے اور مذہب اور طور طریق کے لحاظ سے بھی الگ تھے۔ ایشیا کے رہنے والوں کے نزدیک جو اس وقت تمدن کے حامل تھے جنّ تھے

جنّ تام الناس سے مراد ڈیماکریسی اور ڈکٹیٹرشپ۔

کیا بلحاظ اپنی شکلوں کے اور کیا بلحاظ ایشیا سے دور رہنے کے (شائد ہندوؤں نے نہ صرف شمال مغربی علاقہ کے ساکنوں کی ظاہری شکل کی وجہ سے بلکہ اُنکی قوت اور طاقت کی وجہ سے کہ وہ ہمیشہ ہندوستان پر حملہ کرتے رہتے تھے اُنکو جنّ قرار دیا) اسی محاورہ کے مطابق قرآن کریم میں بھی سُورۂ رحمٰن

سورہ رحمٰن میں شمالی لوگوں کو جن کہا گیا ہے۔

میں ان شمالی لوگوں کو یعنی یورپ کے باشندوں کو جنّ کہا ہے۔ اس سورۃ میں آخری زمانہ کے تغیرات کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس وقت دو مشرق اور دو مغرب ہو جائیں گے یعنی امریکہ کی دریافت سے دو علاقے مشرق اور دو مغرب کہلانے لگیں گے۔ اسی طرح نہر سویز کے ذریعہ دو سمندروں کے ملنے اور بڑے بڑے جہازوں کے چلنے کی خبر دی گئی ہے اسی طرح بتایا ہے کہ اُس وقت سائنس کی ترقی کے ساتھ لوگ آسمانی بادشاہت کو فتح کرنے کے خیال میں مشغول ہونگے اور سمجھیں گے کہ وہ جلد کائنات کا راز دریافت کرنے والے ہیں۔ اس وقت آسمان سے آگ گریگی۔ اور بم گرینگے اور سرخ روشنیاں آسمان پر چھوڑی جائینگی اور آخر کفر اور شرک کو تباہ کر کے اسلام کو غلبہ دیا جائے گا۔ اس مضمون کے سلسلہ میں جنّ و انس کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور جنّ سے مُراد وہی شمالی علاقوں کے لوگ یعنی یورپین مُراد ہیں اور بتایا ہے کہ اس زمانہ میں یُورپ اور ایشیا کے لوگ باہم مل جائینگے اور سائنس کی بڑی ترقّی ہوگی مگر بے دینی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عذاب نازل کریگا اور پھر اسلام کو قائم کرے گا۔ ثقلان اور جنّ اور الناس سے مُراد ڈیماکریسی اور ڈکٹیٹروں کی حکومت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ جنّ کے معنے عربی لغت میں اکثریت کے بھی ہیں اور الناس کے معنے خاص آدمیوں کے بھی ہو سکتے ہیں۔ پس جنّ سے مُراد ڈیماکریسی ہے۔ اور النّاس سے مُراد وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو خاص قرار دیکر حکومت کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں ثِقل کے معنے اعلیٰ اور محفوظ شے کے ہوتے ہیں جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم اور اپنی اولاد کو ثقلان قرار دیا ہے پس الثقلان سے مراد یہ دونوں گروہ ہیں جو اس وقت ساری دنیا پر غالب ہونگے بعض ڈیماکریسی کے نام پر دنیا کو مغلوب کریں گے اور بعض فاشزم اور نازیزم کے نام پر دُنیا کو سمیٹنا چاہیں گے اور اپنے آپ کو سب دُنیا سے بہتر قرار دیں گے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم میں غیر قوموں اور غیر مذاہب کے لوگوں کے لئے بھی جنّ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں مثلاً حضرت سلیمان کے ذکر میں جہاں جنّوں کا ذکر ہے اس سے مُراد غیر قوموں کے لوگ ہی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ ان جنّوں کی نسبت فرماتا ہے کہ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (سبا ع ۲) وہ جنّ حضرت سلیمان کے لئے دربار کا کمرہ مسجد کا محراب اور محل بناتے تھے اور مجسمے اور بڑے بڑے حوض جو کنوؤں کی طرح تھے اور بہت بڑی بڑی دیگیں تیار کرتے تھے۔ اب ہم باتیں

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کام حضرت سلیمان کے لئے کس نے کئے ہیں تو ہمیں ۲ تواریخ باب ۲ میں لکھا ملتا ہے کہ جب حضرت سلیمان نے بڑی عبادت گاہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے صور کے بادشاہ کو خط لکھا کہ اپنے انجینئروں میں سے میرے پاس ایک انجینئر بھجواؤ "جو سونے اور روپے اور پیتل اور لوہے اور ارغوانی اور قرمزی اور آسمانی رنگوں کے کاموں میں ہوشیار اور نقاشی میں دانشمند ہو۔" اسی طرح لکھا کہ وہاں کی لکڑی بھجواؤ اور میں لکڑی کاٹنے والوں کو اس اس قدر مزدوری دوں گا۔ آیت ۱۰۔ پھر آیت ۱۴ میں صور کے بادشاہ کا جواب ہے کہ اس نے حضرت سلیمان کے کہنے پر ایک انجینئر حورام ابی نامی بھجوایا اور کہا کہ یہ سب فنون کا ماہر ہے۔ اور لکھا کہ لکڑی کاٹنے پر میں نے آدمی لگا دیئے ہیں۔ انکی مزدوری بھجوا دیں۔ آیت ۱۵۔ یہ تو غیر ملکی انجینئر کا ذکر ہے جو مزدور لگائے گئے ان کا یوں ذکر آتا ہے "اور سلیمان نے اسرائیل کے ملک میں سارے پردیسیوں کو گنوایا بعد اس گنتی کے جو اس کے باپ داؤد نے گنوایا تھا اور وے ایک لاکھ ترپن ہزار چھ سو ٹھہرے اور اس نے ان میں سے ستر ہزار کو بار برداری پر اور اسی ہزار کو پہاڑ کے توڑنے پر مقرر کیا اور ان پر تین ہزار اور چھ سو مقرر کئے۔ کہ ان لوگوں سے کام لیویں"۔ آیت ۱۷ و ۱۸۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ مزدوری پر بھی غیر قوموں کے لوگ مقرر کئے گئے تھے۔

اب جو کام اس صور کے انجینئر نے کیا۔ وہ بائبل میں یہ لکھا ہے کہ اس نے ایک بہت بڑا ہال عبادت کے لئے بنایا (محاریب) اور بڑے ہال کے اندر فرشتوں کے مجسمے دیواروں کے اندر کھود کر بنائے اور اسی طرح بڑے ہال میں بھی دو فرشتوں کے مجسمے تراش کر بنائے۔ (تماثیل) (۲ تواریخ باب ۳ آیت ۱۰ تا ۱۳) اور پھر باب ۴ آیت ۲ و ۶ میں بتایا ہے کہ ایک بڑا حوض بنایا۔ جو دھاتوں سے ڈھالا ہوا تھا۔ اور اس کے علاوہ دس چھوٹے حوض بنائے (جفانٍ کالجواب) پھر اسی باب ۴ کی آیت ۱۶ میں لکھا ہے کہ حورام انجینئر نے جو باہر سے آیا تھا "اور ایک بحر (لفظی معنی سمندر مراد بڑا حوض) اور اس کے نیچے بارہ بیل اور دیگیں اور بیلچے اور کانٹے اور سب ظروف جو حورام ابی نے سلیمان بادشاہ کی خاطر خداوند کے گھر کے لئے بنائے صاف پھول دھات کے تھے۔" اس ایک آیت میں دیگوں (قدور راسیٰت) حوضوں اور مجسموں کا ذکر اکٹھا آ گیا ہے۔

غرض وہ سب اشیاء جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے حضرت سلیمان نے حورام ابی سے جو ایک غیر ملکی انجینئر تھا۔ اور غیر ملکی مزدوروں سے بنوائی تھیں۔ پس جن سے مراد محض غیر ملکی اور غیر قوم کے لوگ ہیں جن کو حضرت سلیمان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صرف رعب خداداد کی وجہ سے وہ آپ کے تصرف کے نیچے آئے ہوئے تھے اور آپ کا کام کرتے تھے جب آپ فوت ہو گئے۔ تو کچھ مدت تک تو آپ کی حکومت کا رعب ان لوگوں کے دلوں پر رہا۔ جب آپ کے لڑکے نے بعض نالائقیوں کی وجہ سے اس رعب کو ضائع کر دیا۔ تو وہ لوگ پچھتائے کہ خواہ مخواہ ان کے لئے لکڑیاں ڈھونے اور دوسرے ذلیل کاموں میں ہم کیوں لگے رہے۔ اور یہ ذلت برداشت کی اگر یہ حکومت اتنی جلدی فنا ہو جانی تھی۔ تو ہم مقابلہ جاری رکھتے۔

چوتھا استعمال جن کے لفظ کا قرآن کریم میں ان لوگوں کے متعلق ہے۔ جو حضرت آدم کے زمانہ میں دنیا پر بستے تھے اور جن میں سے نکل کر حضرت آدم نے ایک نیا نظام قائم کیا تھا۔ چونکہ آدم نظام کا قائم کرنے والا پہلا شخص تھا۔ اس سے پہلے لوگ نظام کی قدر کو نہ جانتے تھے۔ اور جانوروں کی طرح الگ الگ درختوں کی جڑوں میں یا غاروں میں رہتے تھے اور جنگلی درندوں کی وجہ سے سطح زمین پر آسانی سے چل پھر نہیں سکتے تھے۔ ان کا نام انکی حالت کے مطابق جن رکھا گیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو آجکل کے مؤرخ CAVE MAN کہتے ہیں یعنی کھوہوں اور غاروں میں رہنے والے لوگ جو سطح زمین پر بود و باش نہ کرتے تھے۔ جب انسانی دماغ نے ترقی

قرآن مجید میں غیر قوموں اور غیر مذہب کے لوگوں کے لئے جن کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

حضرت سلیمان کی خدمت کرنے والے غیر ملکی اور غیر قوم کے لوگ تھے جنکو جن کہا گیا ہے

حضرت آدم کے زمانے کے لوگوں کا نام قرآن کریم میں جن رکھا گیا ہے۔

آنحضرتؐ پر ایمان لانے والے جن نصیبین کے رہنے والے تھے۔ اور رات کو آپؐ سے ملتے تھے۔

کی اور انسان الہام کی نعمت کے قبول کرنے کے قابل ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو جسے اس نے آدم کا خطاب دیا۔ کیونکہ وہ سطح زمین پر رہنے کے قابل ہو گیا تھا اور انسان کا خطاب دیا۔ کیونکہ وہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی محبت کے قابل ہو گیا تھا۔ تو دوسری طرف بنی نوع کے ساتھ ہمدردی کرنے اور ان کے لئے قربانی کرنے کے قابل تھا۔ اپنے الہام کے لئے چُنا۔ (دیکھو تفصیلی دلائل کے لئے میری کتاب سیر روحانی جلد اوّل) جنہوں نے اس کے نظام کو قبول کیا۔ اور اس کے ساتھ مل گئے۔ اور باہر نکل کر مکان وغیرہ بنانے لگے۔ اور تمدنی قوانین کی پابندی کو منظور کر لیا وہ آدمی کہلائے لیکن جنہوں نے وحشت کی زندگی کو ترک کرنے سے انکار کر دیا۔

مومن جنوں کے انسان ہونے کے سات ثبوت

اور غاروں کی زندگی کو حریت قرار دیا۔ ان کا نام ان کے طرز رہائش کی وجہ سے جن قرار پایا۔ پس جن بشری ترقی کے دَور کے اس حصہ کے افراد کا نام ہے۔ جو تمدن سے عاری تھے اور نظام کو قبول کرنے کے ناقابل تھے۔ اور آدمی بشری ترقی کے دَور کے اس حصہ کا نام ہے جس میں ایک جماعت نے مل کر رہنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے اور ایک نظام کی پابندی کا اقرار کیا۔ آئندہ کے لئے یہ دو نام ان دو صفات کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اور جو لوگ نظام کے باغی ہوں۔ ان کا نام جنوں کی ذریت رکھا گیا۔ اور جو نظام کے تابع ہوں۔ ان کا نام آدم کی ذریت رکھا گیا اب یہ دونوں نام صفاتی ہیں جس کی وجہ سے کبھی جنوں کی اولاد اصلاح کر کے آدمی ہو جاتی ہے۔ اور کبھی آدمیوں جیسے پابند نظام لوگوں کی اولاد گندی اور نظام شکن ہو کر جن بن جاتی ہے۔

رسول کریمؐ کے زمانہ میں ایمان لانے والے در اصل یہودی تھے۔

اب رہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا سوال کہ اس وقت جو جن ایمان لائے تھے وہ کیسی مخلوق تھی۔ سو اس کے متعلق قرآن کریم سے ثابت ہے کہ وہ یہودی تھے کیونکہ وہ موسیٰ کی کتاب کا اور اس پر ایمان لانے کا ذکر کرتے ہیں پس معلوم ہوا کہ وہ یہودی لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جن اس لئے کہا ہے کہ وہ باہر کے لوگ تھے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی ملے تھے بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصیبین کے رہنے والے تھے اور رات کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تھے (بخاری کتاب مناقب الانصار و مسلم جزاوّل) واپس جا کر جو واقعہ ان کے اور ان کی قوم کے درمیان گذرا اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے عرب لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے انہوں نے چھپ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ اور آپؐ سے قرآن سنا۔ جب واپس ہوئے۔ تو دلوں نے گواہی دی کہ آپ سچے ہیں۔ اور اپنی قوم میں تبلیغ شروع کر دی۔

اس امر کا ثبوت کہ یہ جن انسان تھے مندرجہ ذیل ہے اوّل یہ کہ وہ پوشیدہ ملے۔ اگر وہ جن تھے۔ تو ان کو پوشیدہ اور رات کو ملنے کی کیا ضرورت تھی علی الاعلان ملتے۔ تو کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اور جنوں کی جو شان بیان کی جاتی ہے۔ اس کے لحاظ سے انہیں دیکھ بھی کون سکتا تھا۔

دوسرا ثبوت

اگر جن کوئی مخفی مخلوق تھے تو انہوں نے آنحضرتؐ کی مدد کیوں نہ کی۔

دوم قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (فتح ع ۱ پ ۲۶) یعنی مومنو! ہم نے یہ رسول اس لئے بھیجا ہے کہ تم اسکی مدد اور نصرت کرو۔ اور اسکی عزت دنیا میں قائم کرو۔ اگر جنات ایمان لائے تھے۔ تو وہ کس رنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے سروں پر چڑھ جاتے ہیں۔ اور قسم قسم کے پھل لا کر دیتے ہیں یہ کیسے مومن تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم پر ظلم ٹوٹا لیکن کافر جنوں نے تو حضرت سلیمان کے لئے قلعے تیار کئے اور ہر ذلیل سے ذلیل کام انکی خاطر کیا یہ مومن ایسے طوطا چشم تھے کہ ابوجہل وغیرہ کسی کو انہوں نے سزا نہ دی۔ اور پھر یہ جن لوگوں کو تو بے موسم کے پھل لا کر دے دیتے ہیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر انہیں یہ توفیق بھی نہ ملی۔ کہ جب غزوہ خندق کے موقعہ پر آپ پر اور دوسرے مسلمانوں

پر فاقے پر فاقے آرہے تھے اور آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ گویا پیٹوں پر پتھر باندھے پھر رہے تھے۔ یہ لوگ آپؐ کے لئے اور آپ کے صحابہؓ کے لئے جَو کی روٹیاں ہی لا دیتے۔ یہ تو ایمان کی علامت نہیں بلکہ اوّل درجہ کی شقاوت کی علامت ہے لیکن قرآن کریم تو فرماتا ہے کہ وہ ایماندار مخلص تھے۔ پس ظاہر ہے کہ نہ ان جنّوں کو جن کا ذکر سورۃ جنّ میں ہے طاقت ہے کہ کسی کے سر پر چڑھیں اور انسانوں پر قبضہ کر سکیں یا انہیں ستا سکیں اور نہ ان میں کسی کو کچھ لا کر دینے کی طاقت ہے۔ ایسے جنّ صرف وہمی لوگوں کے دماغ میں ہیں قرآن کریم ایسے جنّوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے تو جو جنّ پیش کئے ہیں انہی اقسام کے ہیں جو مَیں نے بیان کئے۔ اور ان اقسام میں سے جو جنّ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وہ یہودی تھے جنہوں نے کلام سُنا اپنے گھروں کو چلے گئے اور آخر ایمان لانے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنی قوم کو پیغام پہنچا دیا۔ عرب سے ہزاروں میل دُور کے بسنے والے تھے۔ بعد میں نہیں کہا جا سکتا۔ کہ انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی خبر ملی بھی یا نہیں ملی۔ اس وجہ سے وہ اسلامی جنگوں میں عملاً کوئی حصہ نہ لے سکے۔

تیسرا ثبوت اس امر کا کہ یہ جنّ انسان تھے یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ مِنْ اَنْفُسِہِمْ اور مِنْہُمْ ہوتے ہیں۔ یعنی جنکی طرف آتے ہیں انہی کی قوم کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیْدًا عَلَیْہِمْ مِّنْ اَنْفُسِہِمْ وَجِئْنَا بِکَ شَہِیْدًا عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ (النحل ع ۱۲) یعنی قیامت کے دن ہر امت کا رسول جو انہی میں سے ہوگا بطور گواہ لایا جائے گا۔ اور محمدؐ رسول اللہ کو امت محمدیہ اور اس زمانہ کے لوگوں پر بطور گواہ بھیجا جائے گا۔ اگر جنّ بھی کوئی ایسی قوم ہے جو ایمان لاتی ہے۔ تو اس پر گواہی کون دے گا۔ موسیٰؑ تو جنّ نہیں کہ ان جنّوں کے متعلق ان سے پوچھا جائے گا جو ان پر ایمان لائے تھے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے۔ وہ جنّوں سے مِنْ اَنْفُسِہِمْ کی نسبت نہیں رکھتے۔ پس آپ جنّوں کے متعلق شہید نہیں ہو سکتے۔ مِنْ اَنْفُسِہِمْ سے مُراد پہلے انبیاء کی نسبت سے انکی اقوام ہیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے آپ کے زمانہ کے بعد کے سب انسان۔ پس جنّ اگر کوئی انسانوں جیسی مکلّف مخلوق ہے تو وہ یونہی رہ جاتے ہیں۔ نہ ثواب کے مستحق نہ عذاب کے۔

تیسرا ثبوت

چوتھا ثبوت اس دعویٰ کی تائید میں یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا (انعام ع ۱۶) یعنے لے جنّوں اور انسانوں کی جماعتو! کیا تمہارے پاس تمہاری قوموں میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم کو میرے نشانات پڑھ کر سناتے تھے۔ اور آج کے دن کے دیکھنے سے تم کو ہوشیار کرتے تھے۔ اس آیت میں صاف لکھا ہے کہ جنّوں کی طرف انکی قوم کے نبی آئے اور انسانوں کی طرف انسان نبی۔ اب اگر جنّ کوئی دوسری مخلوق ہے تو اس آیت کے ماتحت نہ تو موسیٰؑ ان کے نبی ہو سکتے ہیں۔ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ کیونکہ جنّوں کی طرف اس آیت کے ماتحت جنّ نبی ہی آنے تھے۔ ہاں اگر جنّوں سے انسانوں کا کوئی گروہ مراد ہو۔ تو پھر بے شک وہ موسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مومن ہو سکتے ہیں۔

چوتھا ثبوت

مومن جنوں کے انسان ہونے کا تیسرا ثبوت

پانچواں ثبوت اس امر کا کہ عوام میں جو جن مشہور ہیں ان کا کوئی وجود نہیں۔ اور یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو جنّ ایمان لائے تھے وہ انسان ہی تھے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنّم کی نسبت فرماتا ہے فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (بقرہ ع ۳) دوزخ میں یا تو انسان ہونگے یا پھر پتھر وغیرہ آگ کو بھڑکانے والے سامان ہونگے۔ اگر جنّ کوئی مکلّف مخلوق ہے تو یوں چاہیئے تھا وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْجِنُّ وَالْحِجَارَۃُ۔ پس جہاں قرآن کریم نے جنّ قوم کو دوزخی کہا بھی ہے وہاں انسان جنّ مراد ہیں نہ کوئی غیر مخلوق۔

پانچواں ثبوت

چھٹا ثبوت ان مومن جنّوں کے انسان ہونے کا یہ ہے کہ مسند احمد بن حنبل میں آتا ہے کہ قال (رسول اللہ صلعم) لم لقد اعطیتُ اللّیلۃَ خمسًا ما اعطیھن احدٌ قبلی امّا انا فارسلتُ إلی الناسِ کلھم عامۃً و کان مَن قبلی انّما یُرسل الٰی قومہٖ (جلد دوم ص۲۲۲) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تہجد پڑھ کر جو پہرہ دار آپ کے پیچھے نماز میں شامل ہوگئے تھے ان سے فرمایا۔ کہ آج پانچ خصوصیتیں مجھے ایسی عطا کی گئی ہیں کہ اس سے پہلے کسی کو یہ خصوصیتیں نہیں ملیں۔ ایک تو یہ کہ میں سب اقوام کی طرف بلا استثنا مبعوث کیا گیا ہوں۔ اور جو مجھ سے پہلے نبی گذرے ہیں وہ صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے (آگے بقیہ چار خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس رات کو پانچ خصوصیتیں جمع کرکے آپ کو بتائی گئی تھیں۔ ورنہ بعض خصوصیات مثلاً یہی جو اوپر بیان ہوئی ہے شروع زمانۂ اسلام سے ہی آپ کو مل چکی تھیں) اس حدیث کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جن جو آنحضرت صلعم پر ایمان لائے کوئی اور مخلوق تھی کیونکہ قرآن کریم صاف بتاتا ہے کہ وہ حضرت موسٰی علیہ السلام کے مومنوں میں سے تھے۔ اگر وہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے تو ان کا موسٰی پر ایمان لانا جائز ہی کس طرح ہو سکتا ہے۔ اگر اعتراض ہو کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل ع۱) موسٰی فرعون کی طرف بھی مبعوث تھے حالانکہ فرعون بنی اسرائیل میں سے نہ تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قوم سے مراد کبھی نسلی قوم ہوتی ہے اور کبھی ملکی۔ جیسے ہندوستان میں مختلف اقوام بستی تھیں۔ ان میں جو نبی آتا تھا وہ ہندوستانی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا نہ کہ برہمن یا راجپوت کی طرف کیونکہ ایک جگہ رہنے والی اقوام کو سہولت کے لئے ایک قوم شمار کر لیا جاتا [illegible] س فرعون کے ساتھ اور اس کی قوم کے ساتھ چونکہ حضرت موسٰی حکومت اور سیاست اور قانون اور تمدن کے ذریعہ سے بندھے ہوئے تھے ان کو تو ایک قوم سمجھ لیا گیا مگر جنّوں کو حضرت موسٰی علیہ السلام سے کیا نسبت تھی حکومت کے لحاظ سے یا سیاست کے لحاظ سے یا قانون کے لحاظ سے یا تمدن کے لحاظ سے کہ ان کو بھی موسٰی علیہ السلام پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔ اگر کہو کہ حضرت موسٰیؑ مبعوث تو بنی اسرائیل یا ان کے ساتھ رہنے والی قوم کی طرف ہی ہوئے تھے مگر جن اپنے طور پر ان پر ایمان لے آئے تھے تو یہ بھی درست نہیں ہے حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک واقعہ انجیل میں بیان ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دوسری اقوام کو اپنی جماعت میں شامل ہونے کی اجازت تک نہ دی بلکہ جب ان سے ایک غیر قوم کے آدمی نے تبلیغ کرنے کے لئے کہا۔ تو آپ نے فرمایا "کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینی اچھی نہیں" (متی باب ۱۵ آیت ۲۶) پس یہ بھی درست نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے ایمان لے آئے تھے کیونکہ اگر جن کوئی مکلّف قوم ہے۔ تو اس کیلئے صرف اس نبی پر ایمان لانا فرض ہے جو مِنْ اَنْفُسِہِمْ ہو۔ موسٰیؑ علیہ السلام پر ایمان لانا انکے لئے جائز نہ تھا غرض قرآن کریم کی آیات اور مذکورہ حدیث کے رُو سے کم سے کم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جنّوں کے لئے الگ نبی مبعوث ہونے ضروری تھے۔ جو خود ان میں سے ہوتے۔ نیز جنوں کی مختلف قوموں کی طرف الگ الگ نبی مبعوث ہونے ضروری تھے۔

ساتواں ثبوت ان جنّات کے انسان ہونے کا یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں یہ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (اعراف ع۲۰) اس جگہ جنّوں کو رسالت میں شامل نہیں کیا۔ اگر جن بھی کوئی علیحدہ قوم ہے۔ اور اسکے لئے بھی آپ پر ایمان لانا ضروری تھا یا جائز ہی تھا۔ تو یوں فرمانا چاہیئے تھا کہ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ وَالْجِنُّ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ مگر یہ تو قرآن کریم میں کہیں بھی نہیں آیا پس جو جن آپ پر ایمان لائے وہ قرآنی تشریح کے ماتحت انسانوں ہی میں سے تھے۔ اور اسی وجہ سے آپ پر ایمان لانیکے مکلف تھے۔

مومن جنّوں کے انسان ہونے کا چھٹی دلیل

جن اگر انسان نہ تھے۔ تو وہ حضرت موسٰی پر ایمان نہ لا سکتے تھے

آنحضرت پر ایمان لانے والے جن موسٰی علیہ السلام کے مومنوں میں سے تھے

مومن جنات کے انسان ہونے کی ساتویں دلیل

آنحضرتؐ کا دعویٰ صرف انسانوں ہی کی طرف مبعوث ہونے کا تھا۔

ایک اور آیت اس مضمون کے بارہ میں اس سے بھی واضح ہے۔ اور وہ سورۂ سباء کی آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ہے (ع ۳) کافّۃ کفّ سے نکلا ہے جس کے اصل معنے جمع کرنے اور روکنے کے ہیں۔ پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھے صرف اس لئے مبعوث کیا ہے کہ تو انسانوں کو جمع کرے اور کسی انسان کو اپنی تبلیغ سے باہر نہ رہنے دے۔ اب دیکھو اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ تجھے صرف انسانوں کو جمع کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ انسانوں کے سوا کوئی اور مخلوق بھی ہے اور وہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی مکلّف ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انسانوں میں سے کوئی آپؐ کی دعوت سے باہر نہیں انسانوں کے سوا کوئی مخلوق آپ پر ایمان لانے کے لئے مکلّف بھی نہیں۔ اس وجہ سے جن مومن جنوں کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔ وہ انسان ہی تھے کوئی اور مخلوق نہ تھے۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم میں جنّ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے (۱) جن وہ تمام مخفی مخلوق جو غیر مرئی شیطان کی قسم سے ہے یہ مخلوق اسی طرح بدی کی تحریک کرتی ہے جس طرح ملائکہ نیک تحریکات کرتے ہیں۔ ہاں یہ فرق ہے کہ ملائکہ کی تحریک وسیع ہوتی ہے۔ اور انکی تحریک محدود ہوتی ہے یعنی انکو زور انہی پر حاصل ہوتا ہے۔ جو خود اپنی مرضی سے بدخیالات کی طرف جُھک جائیں۔ انہیں شیاطین بھی کہتے ہیں۔ (۲) جنّ سے مراد قرآن کریم میں Cave men بھی ہے یعنے انسان کے قابل الہام ہونے سے پہلے جو بشر زیر زمین رہا کرتے تھے۔ اور کسی نظام کے پابند نہ تھے۔ ہاں آیندہ کے لئے قرآن کریم نے یہ اصطلاح قرار دے لی۔ کہ جو لوگ اطاعت کا مادہ رکھتے ہیں۔ ان کا نام انسان رکھا۔ اور جو لوگ ناری طبیعت کے ہیں اور اطاعت سے گریز کرتے ہیں ان کا نام جنّ رکھا (۳) شمالی علاقوں کے وہ لوگ یعنے یورپ وغیرہ کے جو ایشیاء کے لوگوں سے میل ملاپ نہ رکھتے تھے۔ اور جن کے لئے آخر زمانہ میں حیرت انگیز دنیوی ترقی اور مذہب سے بغاوت مقدر تھی۔ ان کا ذکر سورۂ رحمٰن میں کیا ہے (۴) غیر مذاہب کے لوگوں کو اور اجنبیوں کو جنہیں بعض اقوام جیسے ہندو اور یہود کوئی نئی مخلوق سمجھتے تھے۔ ان کو عام محاورہ کے مطابق جنّ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جیسے حضرت سلیمانؑ کے جنّ یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے لوگ۔

جن سے مراد شمالی علاقہ کے لوگ۔

غیر مذاہب کے لوگوں اور اجنبیوں کے لئے لفظ جن کا استعمال۔

میرے نزدیک دوزخ میں جانے والے جن جنّات کا ذکر آتا ہے ان سے مُراد یا تو وہی ناری طبیعت والے لوگ ہیں جو اطاعت سے باہر رہتے ہیں۔ اور کسی مذہب یا تعلیم کو قبول نہیں کرتے۔ اور انسان دوزخیوں سے مُراد وہ کفار ہیں جو کسی نہ کسی مذہب سے اپنے آپ کو وابستہ کرتے ہیں۔ یا پھر اقوام شمال مغرب کو جنّ قرار دیا ہے۔ اور جنوبی دُنیا اور مشرق کے لوگوں کو اِنس قرار دیا ہے جیسا کہ عرف عام میں یہ لوگ ان ناموں سے مشہور تھے۔

قرآن کریم میں جن کا استعمال

یہ جو فرمایا کہ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جن کو ہم جنّ کہتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ناری مادہ تھا یعنے جلد اشتعال میں آجاتے تھے اور اطاعت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت آدمؑ سے پہلے بشر کی حالت یہی تھی۔ حضرت آدمؑ پہلے انسان تھے جنہوں نے اخلاقی اور تمدنی کمال حاصل کیا۔ اس وجہ سے الہام جس کا تعلق تمدن اور اخلاق سے ہے سب سے پہلے آپ ہی پر نازل ہوا۔ پس جو لوگ اس تمدن اور نظام میں شامل ہوئے انہوں نے گویا اپنے نفسوں کو مار دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا نقش اپنے دلوں پر کندہ کروا لیا۔ پس وہ طینی کہلائے کیونکہ طین نقش قبول کرتی ہے۔ اور جن لوگوں نے نظام میں آنے کی نسبت انفرادی آزادی کو مقدّم رکھا۔ اور کسی کی اطاعت کا جُوا گردن پر رکھنے سے انکار کیا وہ ناری کہلائے۔ یعنی جس طرح آگ کا شعلہ قابو میں نہیں آتا۔ اسی طرح وہ بے قابو ہو گئے۔ اور بوجہ زمین کے اندر رہنے کے وہ جنّ بھی کہلائے۔

جن کے لفظ کا استعمال مخفی اور غیر مرئی مخلوق کے لئے

جن سے مراد زیر زمین رہنے والے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ

اور (اے مخاطب اسوقت کو یاد کر) جب تیرے رب نے فرشتوں کو فرمایا تھا (کہ) میں یقیناً آواز دینے والی مٹی یعنی سیاہ گارے سے جسکی ہیئت تبدیل ہو چکی ہو ایک بشر

اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ۔ جنوں کو آگ سے بنایا۔ پھر تم کس طرح کہتے ہو کہ اس سے مُراد ناری طبیعت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انبیاء ع ۳) جس کے لفظی معنے ہیں انسان کو (اللہ تعالیٰ نے) جلدی سے پیدا کیا۔ محقق مفسرین لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں عجلت اور جلد بازی ہے یہ نہیں کہ جلدی نام کسی مادہ کا ہے جس سے انسان کو بنایا گیا ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں کہ یہ عربی کا عام محاورہ ہے کہ جو شے کسی کی طبیعت میں داخل ہو۔ اس کے بارہ میں کہتے ہیں کہ وہ اس سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (روم ع ۶) یعنے خدا تعالیٰ وہ ہے جس نے تم کو اس حالت میں پیدا کیا ہے کہ تمہاری طبیعت میں کمزوری ہوتی ہے یعنی پیدائش کے وقت بچہ کمزور ہوتا ہے اور دوسرے کی امداد کا محتاج ہوتا ہے۔ اس آیت کے بھی یہ معنی نہیں کہ ضعف کوئی مٹی یا لکڑی کی قسم کی شے ہے جس سے خدا تعالیٰ نے انسان کو بنایا ہے۔

جنوں کے آگ سے پیدا ہونے سے مراد ناری طبیعت

یہ تعلیق ختم کرنے سے پہلے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ کئی پُرانے بزرگ کم سے کم اس خیال میں میرے ساتھ شریک ہیں کہ وہ جن کوئی نہیں ہوتے جو انسانوں سے آکر ملیں اور اس پر سوار ہو جائیں اور ان سے مختلف کام لیں۔ چنانچہ علامہ ابن حیان اپنی تفسیر بحر محیط کی جلد پانچ ص ۴۵۲ پر لکھتے ہیں۔ کہ جبائی کا قول ہے کہ یہ آیت (اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ جو آیت زیر تفسیر کے چند آیات بعد ہی ہے) ان لوگوں کے دعوں کو رد کر دیتی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ شیطان اور جنوں کے لئے ممکن ہے کہ انسانوں پر غلبہ پا لیں۔ اور انکی عقلوں کو خراب کر دیں جیسا کہ عام لوگوں کا عقیدہ ہے۔ اور بعض دفعہ عوام ان امور کو جادوگروں کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں۔ اور یہ سب دعوے اللہ تعالیٰ کی نص صریح کے خلاف ہیں۔

جنات کا انسانوں پر غلبہ پانا غلط ہے۔

اگر کہا جائے کہ بعض بزرگوں نے جنات کا ذکر کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روحانی نظارے ہیں۔ اور عالم مثال میں ایسی باتیں نظر آجاتی ہیں۔ انہوں نے کشف سے بعض امور دیکھے۔ اور چونکہ عوام میں جنات کا عقیدہ تھا۔ اور قرآن کریم میں بھی لفظ جن کا استعمال ہوا ہے انہوں نے ان مثالی وجودوں کو اصلی وجود سمجھ لیا۔

میرا اپنا ذاتی تجربہ اس بارہ میں یہ ہے کہ کئی مختلف وقتوں میں لوگوں نے مجھے ایسے خطوط لکھے ہیں کہ جنات ان کے گھر میں آنے اور فساد کرتے ہیں میں نے ہمیشہ اپنے خرچ پر اس مکان کا تجربہ کرنا چاہا لیکن ہمیشہ ہی یا تو یہ جواب ملا کہ اب انکی آمد بند ہو گئی ہے۔ یا یہ کہ آپ کے خط آنے یا آپ کا آدمی آنے کی برکت سے وہ بھاگ گئے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جو کچھ ان لوگوں نے دیکھا ایک اعصابی کرشمہ تھا۔ میرے خط یا پیغام سے چونکہ انہیں تسلی ہوئی وہ حالت بدل گئی۔

جنات کے متعلق میرا ذاتی تجربہ

اگر اس تفسیر کے پڑھنے والوں میں سے کسی صاحب کو اس مخلوق کا تجربہ ہو۔ اور وہ مجھے لکھیں۔ تو میں اپنے خرچ پر اب بھی تجربہ کرانے کو تیار ہوں۔ ورنہ جو کچھ میں متعدد قرآنی دلائل سے سمجھا ہوں یہی ہے کہ عوام الناس میں جو جن مشہور ہیں اور جنکی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ انسانوں سے تعلق رکھتے اور ان کو چیزیں لا کر دیتے ہیں۔ یہ محض خیال اور وہم ہے۔ یا مداریوں کے تماشے ہیں۔ جن کے اندرونی بھید کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں نے انکو جنات کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اس علم کا بھی میں نے مطالعہ کیا ہے۔ اور بہت سی باتیں ان ہتھکنڈے کرنے والوں کی جانتا ہوں۔ ہاں یہ میں مانتا ہوں۔ کہ ممکن ہے پہلے

صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ

پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں اسے مکمل کر دوں اور اس (کے دل) میں اپنا کچھ کلام ڈال دوں۔

وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○

تو تم سب اس کے ساتھ سجدہ کرتے ہوئے (اللہ کے حضور) گر جانا ۲۷ع

انسان ناری وجود ہو۔ اور زمانہ کے تغیرات سے بدلتے بدلتے ارتقاء کے ماتحت طینی وجود ہو گیا ہو یعنی اسکی بناوٹ کی بنیاد زمینی پیداوار پر آ گئی ہو۔ اور ایسے وجود جو سب سے پہلے تیار ہوئے۔ ان کا سردار آدم ہو یہ کوئی بعیدیات نہیں علم جیالوجی سے یہ امر ثابت ہے کہ دُنیا میں مٹی کا چھلکا بعد میں بنا ہے پہلے دُنیا ایک گرم آگ کا کرہ تھی بس ارتقاء کے لحاظ سے اگر طینی ابتداء سے پہلے انسان کی ابتداء ناری وجود سے تسلیم کی جائے تو مستبعد نہیں مگر یہ امور تخمینی ہیں۔ ان کو یقین سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے میں نے اسکے متعلق زیادہ نہیں لکھا۔ اس مضمون کا کچھ حصہ قصہ آدم اور شیطان سے بھی حل ہوگا۔ اس کے لئے سورہ بقرہ میں قصہ آدم کا موقعہ دیکھنا چاہئے

۲۷ع حل لغات۔ سَوَّيْتُهٗ۔ سَوّٰی سے متکلم کا صیغہ ہے۔ اور سَوَّى الشَّيْءَ کے معنی ہیں۔ جَعَلَهٗ سَوِيًّا اس کو سوی یعنی بے عیب و بے نقص بنا دیا غُلَامٌ سَوِيٌّ۔ اَیْ لَا دَاءَ بِهٖ وَلَا عَيْبَ۔ جب یہ لفظ انسان کے لئے بولا جائے۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ جسمانی طور پر بھی اس میں کوئی نقص نہیں ہے اور اخلاقی لحاظ سے بھی اس میں نقص نہیں ہے۔ چنانچہ غُلَامٌ سَوِيٌّ ایسے لڑکے پر بولتے ہیں جس میں اخلاقی اور جسمانی کوئی نقص اور عیب نہ ہو۔ وَ مِنْهُ رَزَقَكَ اللّٰهُ وَلَدًا سَوِيًّا۔ اور انہی معنوں میں یہ فقرہ بطور دُعا کے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہیں اللہ تعالےٰ بے عیب لڑکا عطا فرمائے (اقرب)

نَفَخْتُ۔ نَفَخَ سے متکلم کا صیغہ ہے۔ اور نَفَخَ (يَنْفُخُ نَفْخًا وَ نَفِيْخًا) بِفِيْهِ کے معنے ہیں اَخْرَجَ مِنْهُ الرِّيْحَ یعنے مُنہ سے ہوا نکالی۔ وَ نَفَخَ فِي النَّارِ وَ نَفَخَهَا آگ میں پھونک ماری یعنی لفظ نفخ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ نَفَخَ شَدَقَيْهِ تَكَبَّرَ۔ تکبر کیا (ہمارے ہاں بھی اُردو میں کہتے ہیں کہ مُنہ پھلا لیا۔) اور جب نَفَخَ الشَّيْطَانُ فِي اَنْفِهٖ بولا جائے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ تَطَاوَلَ اِلٰى مَا لَيْسَ لَهٗ کہ وہ ایسی امید لگا بیٹھا جو پوری نہ ہو گی یعنی ان چیزوں کے پیچھے پڑ گیا جو اس کو نہیں مل سکتیں۔ (اقرب)

اَلرُّوْحُ۔ مَا بِهٖ حَيَاةُ الْاَنْفُسِ۔ وہ چیز جس کے ذریعہ نفوس زندہ رہتے ہیں یعنی جس کو زندگی کہتے ہیں۔ اَلْوَحْیُ الْهَامُ۔ جِبْرِيْلُ۔ جبرائیل۔ اَلنَّفْخُ پھونک۔ اَمْرُ النُّبُوَّةِ امر نبوت۔ وَحُكْمُ اللّٰهِ وَ اَمْرُهٗ۔ خدا تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کا حکم۔ تَتَعَلَّقُ الْاَرْوَاحُ عَلٰى مَا يُقَابِلُ الْاَجْسَادَ جسم کے مقابل چیز کو بھی رُوح کہتے ہیں (جو انسان میں جسم کے علاوہ موجود ہے) وَعِنْدَ اَصْحَابِ الْكِيْمِيَا عَلَى الْمِيَاهِ الْمُتَقَطِّرَةِ مِنَ الْاَدْوِيَةِ۔ کیمیا والوں کے نزدیک دوائیوں کے عرق کو بھی رُوح کہتے ہیں (لیکن یہ فن کی ناواقفی کی وجہ سے لکھا ہے کیمسٹری والے عرق کو رُوح نہیں کہتے۔ بلکہ یا تو تیل والی ادویہ کا وہ حصہ جو عرق پر آ جاتا ہے اسے رُوح کہتے جیسے رُوح گلاب یا پھر عرق کو بار بار کشید کر کے اسکی تیز خوشبو کو عرق سے الگ کر لینے پر اسے رُوح کہتے ہیں جیسے رُوح کیوڑہ) (اقرب) جبرائیل کو جو صاحب اقرب الموارد نے رُوح لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جبرائیل کو رُوح کہا گیا ہے اس لئے انہوں نے رُوح کے معنے جبرائیل قرار دے دیئے۔

اَلرُّوْحُ

سَوَّيْتُهٗ

نَفَخْتُ

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط

جس پر سب کے سب فرشتوں نے (اس کی) کامل فرمانبرداری اختیار کر لی۔ سوائے ابلیس کے (کہ) اس نے

اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ

(اس کی) کامل فرمانبرداری اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے انکار کر دیا ۝۳۱ (اس پر خدا تعالیٰ نے) فرمایا (کہ) اے ابلیس

جبرائیل کو روح کے نام سے پکارے جانے کی وجہ۔

حالانکہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ بعض دفعہ مسبب کا نام سبب کو دے دیا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے جبرائیل کو روح کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ رُوح یعنی کلام الٰہی کو لاتا ہے۔ غرض روح کے معنے جبریل نہیں۔ بلکہ استعارۃً وحی لانے والے فرشتے کو کہتے ہیں۔ اصل میں رُوح وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کسی کو حیات ممتاز ملے۔ پس وہ رُوح جو حیوان کو باقی چیزوں سے ممتاز کر رہی ہے۔ اور وہ رُوح جس کے ساتھ انسان باقی حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے ان دونوں پر لفظ رُوح کا اطلاق ہوتا ہے۔ یا وہ رُوح جو انسان کو باخدا بنا دیتی ہے۔ پس کلام الٰہی بھی ایک رُوح ہے جو انسان کو نئی زندگی بخشتا ہے۔

فرشتوں کو آدم کی فرمانبرداری کے حکم سے مراد سب مخلوق کی فرمانبرداری ہے۔

سٰجِدِیْن — سٰجِدِیْنَ:- السجودُ۔ التذلّل۔ سجود کے معنی تذلل اور ماتحتی کے ہیں (مفردات) وَقولہ اسجدوا لِاٰدَمَ قِیْلَ اُمِرُوْا بالتذلّلِ لہ والقیامِ بمصالِحِہ ومصالح اولادہٖ۔ آیت اُسجدوا لِاٰدَمَ میں

اِبْلیس — فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ آدم کے ماتحت چلیں۔ اور اس کی مدد کریں۔ اور اسکی اولاد کے لئے ممد و معاون بنیں۔ وقولہ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ای متذلّلین مُنْقَادِیْن۔ اور قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ تم اس دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔ اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ تم فرمانبرداری کرتے ہوئے جاؤ (مفردات)

اس آیت میں ابتدا نسل انسانی میں مکمل وجود کو طور مثال پیش کیا گیا ہے۔

تفسیر اس آیت میں ابتدا نسل انسانی میں جو مکمل وجود پیدا ہوا تھا۔ اس کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ دیکھو اسے بھی الہام ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے فرشتوں کو لگا دیا۔ پس یہ سلسلہ الہام اور اسکی حفاظت کا ابتداءِ عالم سے چل رہا ہے۔

اس آیت میں ملائکہ کو سجدہ یعنی آدم کی فرمانبرداری کا جو حکم دیا گیا ہے۔ اس سے مُراد سب مخلوق ہے۔ کیونکہ تمام اسباب کی علّت اولیٰ ملائکہ ہی ہیں۔ انکے حکم میں سب کو حکم مل گیا۔ اس حکم کا یہ بھی مطلب ہے کہ اس دُنیا میں آدم کو قدرت دی گئی ہے۔ اور سب مخلوق اس کے تابع کی گئی ہے۔ پس فرشتوں کو جو علّتِ اولیٰ ہیں۔ چاہیئے کہ انسان جو کام کرے اس کے مطابق نتائج نکالتے جائیں۔ گویا قانونِ قدرت کے ماتحت ہر انسانی فعل کا خواہ وہ بُرا ہی ہو۔ نتیجہ نکالنے کا فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے۔ اور اس حصہ میں سب انسانوں کے انہیں تابع کیا گیا ہے۔ یہ تو عام قانون ہے۔ لیکن جب انبیاء کے زمانہ میں تقدیر خاص جاری ہوتی ہے تو فرشتوں کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے آدم یعنی نبی وقت کی تائید کریں۔ اور اسکے دشمنوں کو ناکام بنائیں۔

۳۸ حل لغات — اِبْلِیْس۔ اَبْلَسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰہِ کے معنے ہیں۔ یَئِسَ۔ ناامید ہو گیا۔ اور ابلس فِی الامر کے معنی ہیں۔ تَحَیَّرَ حیران ہو گیا۔ وَقِیْلَ اِبْلِیْسُ مِنْ اَبْلَسَ بمعنی یَئِسَ وَتَحَیَّرَ یعنی ابلس کے معنی ناامید اور حیران ہونے کے ہیں۔ اور ابلیس اسی سے بنا ہے۔ یعنی ناامید اور حیران۔ اس نام سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو گیا ہے اور حیران رہ گیا ہے۔ جمعہ اباليس و اَبَالِسَة۔ اسکی جمع اَبَالِیس اور اَبَالِسَة آتی ہے (اقرب)

تفسیر یہاں سوال ہوتا ہے کہ فرمانبرداری کا حکم

اگر صرف فرشتوں کو ہی تھا۔ تو ابلیس سے سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے کیوں بازپرس کی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ جب کسی بڑے افسر کو حکم ملا کرتا ہے تو اس کا ماتحت بھی اس میں شامل ہوتا ہے یہاں پر فرشتوں کو طبعی نتائج نکالنے کا حکم دیا گیا ہے یا آدم کے مشن کو کامیاب کرنے کا۔ اس لئے جو ان سے ادنیٰ مخلوق ہے وہ خود بخود اس حکم میں آجاتی ہے جیسے بادشاہ ایک جرنیل کو حکم دیتا ہے۔ کہ فلاں جگہ جاؤ۔ تو سپاہی بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ سپاہی یہ کہہ کر انکار نہیں کر سکتے کہ ہمیں حکم نہیں دیا گیا پھر دوسری جگہ صاف فرما دیا ہے کہ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (اعراف ع ۱/۹) تجھے باوجود میرے حکم کے آدم کو سجدہ کرنے سے کس بات نے روکا ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ فرشتوں کے حکم میں ابلیس کا حکم بھی شامل تھا کیونکہ وہ بھی دوسری مخلوق کی طرح فرشتوں کے تابع ہے۔

اگر ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم تھا تو ابلیس سے کیوں بازپرس کی گئی۔

فرشتوں کے حکم میں ابلیس کا حکم بھی شامل تھا۔

آدم اور ابلیس کے واقعہ کا اصل مقام تو سورۂ بقرہ ہے اسے دیکھنا چاہیئے۔ مگر میں مختصراً ایک بات یہاں بھی بیان کردیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہ گفتگو جو اس جگہ بیان کی گئی ہے ضروری نہیں کہ اسی طرح ہوئی ہو۔ مذہبی محاورہ میں خصوصاً اور عربی زبان میں عموماً یہ طریق استعمال کیا جاتا ہے کہ کسی واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے اسے مکالمہ کا رنگ دے دیا جاتا ہے حالانکہ مکالمہ فی الحقیقت کوئی نہیں ہوا ہوتا چنانچہ عربی زبان میں قَالَ کا لفظ عام طور پر اس طرح استعمال ہوتا ہے مثلاً عرب کہتے ہیں اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ فَقَالَ قَطْنِيْ کہ حوض جب پانی سے بھر گیا۔ تو اس نے کہا۔ کہ بس بس اب زیادہ پانی نہ ڈالو اس کا یہ مطلب نہیں کہ حوض زبان سے بولا۔ بلکہ یہ کہ حوض نے زبانِ حال سے بتایا کہ میں بھر گیا ہوں۔ قال کے سوا اور لفظ بھی عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جن میں بظاہر ایک ارادی فعل کا اشارہ ہوتا ہے۔ مگر مراد صرف صورت حال کا بیان کرنا ہوتا ہے مثلاً سورۂ کہف میں آتا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی ایک گاؤں میں گئے فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ (کہف ع ۱۰/۱) انہوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ اب یہ امر ظاہر ہے کہ دیوار میں دماغ نہیں کہ وہ ارادہ کرے۔ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ دیوار کی حالت بتاتی تھی کہ وہ گر جائے۔ امام ابو منصور ثعالبی جو لغت عرب کے امام ہیں۔ اپنی کتاب فقہ اللغۃ میں لکھتے ہیں کہ ابو فراس مشہور ادیب دل سے اسلام کا منکر تھا۔ اور اس کا مشغلہ یہی تھا کہ قرآن کریم پر اعتراض کرتا رہے۔ ایک دفعہ ابو العباس احمد بن حسین (جو خاندان عباسیہ کا ایک وزیر تھا) کے دربار میں ہم بیٹھے تھے اور وزیر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی دوران میں ابو فراس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا کسی عرب نے کسی عقل نہ رکھنے والی چیز کے بارہ میں کبھی کہا ہے۔ کہ اس نے ارادہ کیا۔ یعنے کہا۔ عرب بعض دفعہ غیر ذی روح کے متعلق کہتے ہیں۔ انہوں نے یوں کہا جیسے مثال ہے۔ اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ فَقَالَ قَطْنِيْ۔ حالانکہ حوض تو بولتا ہی نہیں۔ اس نے کہا۔ میں قول کا ذکر نہیں کرتا وہ تو تو بے شک درست ہے۔ مگر یہ بتاؤ عقل نہ رکھنے والی اشیاء کی نسبت کبھی ارادہ کا لفظ آتا ہے۔ اسکی غرض یہ تھی کہ آیت يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ غلط ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت میری مدد کی اور عرب کے شاعر الراعی کا شعر میرے ذہن میں آگیا۔ جو یعنے اس کے سامنے پڑھا اور وہ شعر یہ ہے۔

آدم اور ابلیس کے واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے مکالمہ کا رنگ دیا گیا ہے۔

في مَهْمَهٍ قَلِقَتْ بِهِ هَامَاتُهَا
قَلَقَ الْفُئُوسِ اِذَا اَرَدْنَ نُصُوْلًا

یعنے ایک جنگل میں جہاں اس قوم کی کھوپریاں توڑی گئیں جس طرح کلہاڑا جب چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو (لکڑیوں کو) کاٹتا جاتا ہے۔ یعنے کہا۔ اس جگہ کلہاڑے کی طرف چلنے کے ارادہ کو منسوب کیا گیا ہے۔ کیا اس میں ارادہ ہوتا ہے۔ یہ شعر پڑھا تھا کہ ابی فراس کے منہ کو تالے لگ گئے اور خدا تعالیٰ نے اسے ذلیل کیا۔ اسی طرح وہ ابو محمد یزیدی کا واقعہ لکھتے ہیں کہ میں اور مشہور نحوی کسائی عباس بن حسن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ان کا ایک نوکر آیا اور کہنے لگا کہ حضور فلاں شخص کے پاس سے آیا ہوں۔ هُوَ يُرِيْدُ اَنْ يَّمُوْتَ۔ وہ مرنے کا ارادہ کر رہا ہے اس پر ہم سب ہنس پڑے۔ عباس بن حسن نے

قال کے استعمال کی وسعت۔

تورات اور ہندو لٹریچر میں خیر و شر کی قوتوں کا ذکر مکالمہ کے رنگ۔

کہا کس بات پر ہنستے ہو۔ ہم نے کہا کبھی کوئی انسان اپنی موت کا آپ بھی ارادہ کیا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ۔ اس پر ہم سب شرمندہ ہوئے اور سمجھ گئے کہ اس غلام کی بات درست تھی۔

کسی امر کے انداز سے ظاہر ہونے کے لئے بھی قول کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

غرض کسی امر کا انداز سے ظاہر ہونا بھی قول اور ارادہ کہلاتا ہے۔ اور واقعہ آدم اور ابلیس بھی اسی قسم کا ہے۔ انکی عملی حالتوں کو مکالمہ کی شکل میں پیش کیا ہے اور ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ پُرانے زمانہ کا ہے۔ اور پُرانے زمانہ میں مجاز و تشبیہ کو کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور تمثیل میں بات کرنا سمجھانے کے لئے زیادہ مؤثر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ آدم کا واقعہ مختلف کتب سابقہ میں اسی رنگ میں بیان ہوا ہے۔ پس ان کو سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے بھی عربی محاورہ کے مطابق اسی رنگ میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے تاکہ انہیں سمجھنے میں آسانی ہو۔ تمثیلی کلام پہلی کتب میں اس قدر استعمال ہوتا ہے کہ صفات الٰہیہ کو بھی تمثیلی رنگ میں ہی بیان کیا جاتا تھا۔ مثلاً کہا جاتا تھا خدا تعالیٰ بڑا تیر انداز ہے۔ وہ تیز رتھ میں بیٹھ کر ہر جگہ جا پہنچتا ہے۔ وہ لوگوں کو سزا دیکر بڑا پچھتاتا ہے۔ اس کے ہاتھ بھی ہیں اور پاؤں بھی۔ یہ تمثیلات خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے تھیں۔ مگر حقیقت کا اظہار ان سے مقصود نہ تھا۔ بلکہ انسان چونکہ ابتدائی حالت میں تھا۔ ان مثالوں سے حقیقت کو اس کے قریب کیا جاتا تھا۔ قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں اس طریق کو بدلا گیا ہے۔ اس میں بھی مجاز اور استعارہ اور تمثیل ہے لیکن کہیں کہیں صرف ایک ذوق پیدا کرنے کے لئے۔ ورنہ اہم امور کو صاف اور واضح زبان میں بیان کیا جاتا ہے اور اگر کوئی تمثیل ہے تو اس کے مضمون کو دوسری جگہ صاف عبارت میں بیان کر دیا جاتا ہے تا لوگ دھوکہ نہ کھائیں۔

قرآن مجید نے باوجود تصویری زبان کے استعمال کرنے کے بہت سی غلط فہمیاں دور کر دی ہیں

غرض آدم کے واقعہ میں جو مکالمہ ہے وہ زبانِ حال میں بیان ہوا ہے۔ نہ کہ فی الحقیقت کوئی گفتگو اللہ تعالیٰ اور ابلیس میں ہوئی۔

آدم کے واقعہ میں مکالمہ زبان حال میں بیان ہوا ہے نہ کہ فی الحقیقت

تورات اور ہندو لٹریچر میں بھی خیر اور شر کی قوتوں کا ذکر مکالمہ کی صورت میں کیا گیا ہے۔ ہندوؤں میں ہریشچندر کا مشہور قصہ ہے۔ اس میں بھی مکالمہ کی صورت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔ تورات میں بھی خیر اور شر کی قوتوں کا مقابلہ مکالمہ کی صورت میں ایوبؑ کی کتاب میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں فرشتے اور شیطان حاضر ہوئے اور ایوبؑ کی نیکی کا ذکر چل پڑا۔ شیطان نے کہا کہ ایوبؑ اس لئے نیک ہے کہ اسے سب کچھ ملا ہوا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ایوبؑ کی آزمائش کرنے کی اسے اجازت دی۔ وغیرہ وغیرہ (ایوب باب ۱ آیت ۶ تا ۱۲)۔ یہی وجہ ہے کہ تورات والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔ کیونکہ آپؐ کے کلام میں تمثیلیں کم تھیں۔ اور واضح عبارتوں میں مضمون بیان ہوئے تھے وہ غلطی سے اپنی کتب میں بیان شدہ مضامین کو حقیقت سمجھ رہے تھے۔ جب اسلام نے اللہ تعالیٰ کی صفات اور ملائکہ کے وجود اور وحی اور نبوت کو صاف اور واضح عبارت میں بیان کیا۔ تو وہ حیران ہو گئے اور سمجھے کہ یہ باتیں تورات کے خلاف ہیں اور سچائی سے دُور ہیں۔

مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ باوجود اس کے کہ قرآن کریم نے اس موقعہ پر تصویری زبان کو استعمال کیا ہے۔ پھر بھی اس نے بہت سی غلط فہمیاں جو پہلی کتب سے پیدا ہوتی تھیں مٹا دی ہیں۔ اور جو دھوکہ تصویری زبان سے لگ سکتا تھا اس کا ازالہ کر دیا ہے۔ مثلاً بائیبل میں تو یہ کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اصلی جنّت میں رکھا اور اصل جنّت کی علامت یہ ہے۔ کہ اس میں گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا لیکن باوجود اسکے بائیبل کہتی ہے آدم نے گناہ کیا۔ لیکن قرآن کریم نے گو آدم کے مقام کا نام بعض جگہ جنت رکھا ہے۔ مگر دوسری جگہ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (بقرہ ع ۴) کہہ کر اس مجاز کی حقیقت بھی بیان کر دی ہے۔ اسی طرح اور بہت سے مسائل آدم کے متعلق جو قصۂ آدم میں بیان ہوئے ہیں وہ دوسری آیات کے ذریعہ سے یا انہی آیات کے بعض حصّوں سے حل کر دیئے گئے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب انسان کو خیر اور شر کی طاقت

دی گئی۔ تو دونوں قسم کے محرکات اس کے لئے ضروری تھے۔ اس
لئے انسان کے پیدا ہونے سے پہلے یہ دونوں پیدا کئے گئے۔
اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے ملائکہ کو حکم دیا کہ جس
قسم کے یہ کام کرے۔ اس کے نتائج پیدا ہوتے چلے جائیں لیکن
آدم اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ بھی دُنیا میں مخلوق تھی جو
آدم کے نظام کے تابع نہ ہوئی تھی۔ ان کے سردار کو اللہ تعالیٰ
نے حقیقی شیطان کا ظل ہونے کی وجہ سے شیطان اور ابلیس
کے ناموں سے پکارا ہے۔ اور جو کچھ آدم اور اس کے درمیان
ایک لمبے عرصہ میں گذرا اسے ایک مختصر مکالمہ کی صورت میں
بیان کر دیا ہے۔

یاد رہے کہ وہ شیطان جو بطور محرک بدی کے پیدا کیا
گیا ہے اور ایک غیر مرئی وجود ہے جس طرح ملائکہ ہیں وہ خود
آکر لوگوں سے باتیں نہیں کیا کرتا۔ نہ مجسم ہو کر انسانوں کو تکلیف
دیتا ہے۔ جو لوگ شامت اعمال سے نیکی کا مقام کھو بیٹھتے ہیں
وہ اس کے ظل ہو جاتے ہیں اور انہی کے کاموں کو شیطان
کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ جو دوسرے محرکات
بدی کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی شیطان کہلاتے ہیں۔ جیسے نبی کریم صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا شیطان مسلمان ہو چکا ہے (مسند
احمد جلد اول روایت ابن عباس ص۲۵) اس لئے وہ مجھے ہمیشہ
نیکی کا حکم دیتا ہے۔ اس ارشاد سے مراد آپ کی یہی ہے کہ جو
اسباب لوگوں کو بدی کی تحریک کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ
میرے کامل تقویٰ کی وجہ سے میرے لئے نیکی میں ترقی کرنے
کا موجب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ یہ مراد نہیں کہ ہر آدمی کے لئے الگ
الگ شیطان ہوتا ہے۔ اور آپ کا شیطان مسلمان ہو گیا تھا
اگر ایسا تھا تو پھر آپ استعاذہ وغیرہ کیوں کرتے تھے۔ وہ اصلی
شیطان تو اسی پہلی حالت میں موجود تھا۔ مگر خیالات اور جذبات
میں جو حالات اسکی نیابت کرتے ہیں وہ آپ کے لئے مسلمان ہو
گئے تھے۔ مگر انسانوں میں سے جو اسکی نیابت کرتے تھے وہ اپنی
شیطنت پر قائم تھے اور مسلمان نہ ہوئے تھے جیسے ابوجہل
وغیرہ۔

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ۔ لَهٗ میں ہٗ کی ضمیر تمام انسانوں
کی طرف جاتی ہے کیونکہ نفخِ رُوح ہر انسان میں ہوتی ہے اور
ملائکہ بھی ہر ایک کی مدد کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ صرف مدارج
کے لحاظ سے نفخِ رُوح کی قسم مختلف انسانوں کے لئے بدل جاتی
ہے۔ پس مجملاً یہ حکم سب انسانوں کے لئے ہے۔ اور خصوصاً
اور تفصیلاً انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں۔ چنانچہ اس کا ثبوت
کہ یہ حکم سب انسانوں کے لئے ہے یہ ہے۔ کہ سورہ جاثیہ ع۲
میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ
مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ کہ اے انسانو تمام چیزیں اللہ تعالیٰ
نے تمہاری خدمت میں لگا دی ہیں۔ قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے
کہ ہر شے کے لئے ملائکہ سبب اول ہیں۔ پس جب فرمایا کہ تمام
چیزیں انسانوں کے فائدہ کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔ تو اس
سے یہ نتیجہ نکلا کہ فرشتے تمام بنی نوع انسان کی خدمت میں لگے
ہوئے ہیں۔ ہاں بعض اشیاء انسان کی غلطی سے اس کے قبضہ سے
نکل کر اس کو نقصان پہنچانے لگ جاتی ہیں۔ اور وہ گویا شیطان
کی اظلال ہوتی ہیں اور فرشتوں کے حکم سے باہر ہو جاتی ہیں۔

یہ خیال کہ اس غیر مرئی شیطان نے ظاہر ہو کر آدم کا مقابلہ
کیا بالبداہت غلط ہے اور تجربہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن کریم
سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدم اور اسکی بیوی کے پاس آیا۔ اور ان
سے اس نے باتیں کیں۔ اب اگر یہ وہی شیطان تھا۔ جو محرک
بدی ہے۔ تو جن آنکھوں سے آدم نے دیکھا تھا۔ اور جس زبان
سے آدم نے اس سے باتیں کی تھیں۔ انہی آنکھوں اور اسی
زبان سے اب آدم کی اولاد کیوں اسے نہیں دیکھتی۔ اور کیوں
اس سے باتیں نہیں کر سکتی۔ اور کیوں وہ اب بھی لوگوں کے
پاس آکر انہیں ورغلاتا نہیں۔ قرآن کریم سے ہرگز ثابت نہیں
کہ آدم کا جسم اور قسم کا تھا۔ اور اسکی اولاد کا اور قسم کا ہے۔
کہ یہ سمجھا جائے کہ آدم تو اسے دیکھ سکتا تھا۔ اور باتیں کر سکتا
تھا۔ مگر اسکی اولاد ایسا نہیں کر سکتی۔ اور جب ابناء آدم ویسی
ہی طاقتیں رکھتے ہیں جس قسم کی آدم رکھتے تھے۔ اور شیطان
بھی وہی ہے بدلا نہیں۔ تو یقیناً آج بھی ہزاروں آدمیوں کو

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ میں ہٗ کی ضمیر تمام انسانوں کی طرف جاتی ہے

شیطان مجسم ہو کر لوگوں سے باتیں نہیں کرتا

محرکات بدی شیطان کہلاتے ہیں

آنحضرتؐ کے شیطان کے مسلمان ہونے کا مطلب۔

مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ○ قَالَ لَمْ اَكُنْ

تجھے کیا ہُوا ہے کہ تو (اس کی) کامل فرمانبرداری اختیار کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس نے کہا (کہ) میں ایسا نہیں کہ

لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ

ایک ایسے بشر کی کامل فرمانبرداری اختیار کروں جسے تُو نے آواز دینے والی مٹی سے یعنی ایسے سیاہ گارے سے جسکی ہیئت

مَّسْنُوْنٍ ○ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ○

تبدیل ہو چکی تھی پیدا کیا ہے ۲۹ فرمایا (اگر تیرا یہ خیال ہے) تو تُو اس (مقام) سے نکل جا۔ کیونکہ تو یقیناً دھتکارا ہُوا ہے ۳۰

اگر شیطان کوئی مرئی وجود تھا تو اب کیوں نظر نہیں آتا۔

رَجِیْم

فَاخْرُجْ مِنْهَا میں منہا سے مراد جنت نہیں۔

منہا سے مُراد رضاءِ الٰہی کا مقام ہے۔

لَمْ اَکُنْ لِاَسْجُد بھی تمثیلی زبان میں کلام ہے۔

وہ نظر آنا چاہیئے تھا۔ اور ہر اک نیک آدمی کو اسے ظاہری جسم کے ساتھ ملنا چاہیئے تھا تاکہ آدم کی طرح اسے بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرے۔ مگر لاکھوں چھوڑ ہزاروں بھی آدمی نہیں ملتے جو اس امر کی گواہی دیں۔ بلکہ سینکڑوں بھی نہیں۔ بلکہ دسوں بھی نہیں بلکہ ایک بھی نہیں جو یہ کہتا ہو کہ کشف یا خواب کے سوا اس نے شیطان سے ملکر باتیں کی ہوں۔ سوائے قِصّوں اور کہانیوں کے جو بے ثبوت ہیں۔

لیکن وہ شیطان جس کا اُپنے ذکر کیا ہے اسی طرح ہر نبی کے راستہ میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔ جس طرح اس نے آدم کے وقت میں کیا تھا۔ اور اسی طرح ابا اور استکبار کرتا ہے جس طرح آدم کے وقت میں اباء و استکبار کیا تھا۔ بلکہ ہر راستباز سے اس کا ویسا ہی سلوک ہوتا ہے۔

۲۹ تفسیر۔ مخالفین آدم کے سردار نے کہا کہ یہ تو ذلیل وجود ہے کہ اطاعت کو اچھا قرار دیتا ہے۔ یہ اور اس کے اتباع تو نقال ہیں اور دوسروں کے پیچھے چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن میری طبیعت میں تُو نے آزادی اور حریت رکھی ہے میں اس کی بات کس طرح مان سکتا ہوں۔ یہ بھی تمثیلی زبان میں کلام ہے۔ مطلب یہ کہ آدم کے نظام کو اس کے بڑے دشمن اور اس کے اتباع نے حریتِ ضمیر کے خلاف سمجھا۔ اور اپنی ہتک قرار دیا۔ اور اس کے ماننے سے انکار کیا۔ اور اپنے رویہ کو آدم کے طریق سے بہتر قرار دیا۔ اسی مضمون کو طینی اور ناری طبیعت کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

۳۰ حل لغات۔ رَجِیْم کے لئے دیکھو سورۂ حجر ۱۶۔

تفسیر۔ مِنْهَا سے مراد مفسّرین جنت لیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ جنت اس سے مراد ہے جو مرنے کے بعد ملتی ہے تو وہ ایسا مقام ہے کہ یہ اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور جو اس میں داخل ہو۔ اس سے نکالا نہیں جاتا۔ پھر شیطان کو کیونکر اس میں داخل ہونے دیا گیا۔ اور آدم کو اس سے کیونکر نکالا گیا۔ اور اگر وہ جنت مراد نہیں۔ بلکہ کوئی ارضی جنت مراد ہے تو پھر بھی یہ سوال ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اسے وہاں سے نکال دیا تھا۔ تو وہ پھر واپس آدم کو ورغلانے کے لئے وہاں کس طرح آسکا۔ پس میرے نزدیک نہ صرف اُخروی جنت بلکہ کوئی دنیوی مقام بھی جو جنت کہلاسکے یہاں مُراد نہیں۔ بلکہ جنت سے مُراد وہ رضائے الٰہی کا مقام ہے جو نبی کی بعثت سے پہلے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ گو وہ غلطی پر ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ ان پر نبی کے ذریعہ سے حجت نہیں ہوئی ہوتی۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے وہ محروم نہیں ہوتے مگر جب نبی مبعوث ہو جاتا ہے اور اس کا وہ انکار کر دیتے ہیں تو پھر افضالِ الٰہی کی جنت سے وہ محروم ہو جاتے ہیں۔

اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ سورۂ بقرہ اور بعض دوسرے

وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ○ قَالَ

اور جزا (و سزا) کے دن تک یقیناً تجھ پر (میری) لعنت رہے گی ۵۳۱ اس نے کہا

رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ قَالَ فَاِنَّكَ

(کہ) اے میرے رب (پھر) تو مجھے انکے (دوبارہ) اٹھائے جانے کے دن تک مہلت دے ۵۳۲ فرمایا تو

مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کو دھوکا دینے کے بعد ابلیس اور اسکی ذریت کو آدم اور اسکی ذریت کے ساتھ ہی جنت سے نکالا گیا۔ پس معلوم ہوا۔ کہ سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے شیطان کا جنت سے نکالا جانا کچھ اور معنے رکھتا ہے۔

۵۳۱ حل لغات۔ اللعنة کے لئے دیکھو سورۂ رعد ۱۶۲۵ یوم کے لئے دیکھو سورہ یونس ۵ الدّین کے لئے دیکھو سورہ یونس ۲۳

تفسیر۔ لعنت کے معنی دُوری کے ہوتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ کے انبیاء کے مخالفوں کے سردار ہوتے ہیں۔ ان کے نام کو مٹا دیا جاتا ہے۔ اور انبیاء کے ذکر کو اجمالاً یا تفصیلاً قائم رکھا جاتا ہے۔ اور چونکہ نبوت ایک زنجیر ہے ہر اگلا نبی اور اسکی جماعت پہلے نبی اور اسکی جماعت کے ساتھ ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ ہی انبیاء کے مخالفین کا ذکر بُرے طور پر ہوتا رہتا ہے اور گو نام لیکر ان پر لعنت نہ بھیجیں۔ مگر دل ان کے افعال سے اظہار نفرت کرتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ نبوت کا سلسلہ قیامت تک چلے گا۔ اس لئے فرمایا کہ یوم الدین تک تم پر لعنت ہوگی۔ ورنہ عذاب الہٰی کا اس آیت میں ذکر نہیں۔ کیونکہ وہ تو پوری شدت سے یوم الدین کے بعد شروع ہوگا۔

۵۳۲ حل لغات۔ اَنْظِرْنِیْ۔ انظر سے ہے اور انظرہ الدَّیْنَ کے معنے ہیں۔ اَخَّرَہٗ۔ قرضدار کو قرضہ ادا کرنے میں مہلت دی (اقرب) پس انظرنی کے معنے ہونگے۔ مجھے مہلت دیجئے۔

يُبْعَثُوْن۔ بَعَثَ سے جمع مذکر غائب مجہول کا صیغہ ہے۔ اور بَعَثَهٗ (يَبْعَثُ بَعْثًا) کے معنے ہیں اَرْسَلَهٗ اس کو بھیجا۔ بَعَثَهٗ بَعْثَهٗ اَثَارَهٗ وَهَيَّجَهٗ۔ اس کو اٹھایا۔ اور جوش دلایا۔ بعث اللّٰهُ الموْتٰی: اَحْيَاهُمْ اللہ نے مردوں کو زندہ کیا۔ بعثهٗ علی الشَّیْءِ حَمَلَهٗ عَلٰی فِعْلِهٖ۔ اس کو کسی کام کے کرنے پر اکسایا۔ البعثُ النَّشر اُٹھانا (اقرب)

تفسیر۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ان آیات میں آدم اور دوسرے انبیاء کا ذکر خصوصًا اور ابناء آدم کا عمومًا ہے۔ اور آدم اور دوسرے انبیاء کے نفخ رُوح سے مراد نزول الہام ہے۔ اور بنو آدم کے نفخ رُوح سے مُراد نفس ناطقہ کی تکمیل ہے۔ پس اس آیت میں جو يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ آیا ہے اس کے معنے بھی دونوں گروہوں کو مدنظر رکھ کر مختلف ہیں۔ بنو آدم کو مدنظر رکھ کر تو اس کے معنے یہ ہیں کہ جب تک انکی بعثت روحانی نہ ہو۔ اس وقت تک مجھے مہلت دے۔ یعنے جب تک انسان اللہ تعالےٰ کے مخلص بندوں میں شامل ہو کر شیطانی حملوں سے محفوظ نہ ہو جائے اس وقت تک شیطان اور اسکی ذریت کو ان کے ورغلانے کا موقعہ ملتا رہے۔ یہ کلام بھی زبان حال کی قبیل سے ہے۔ یہ نہیں کہ شیطان نے یا اس کے اظلال نے واقعہ میں اللہ تعالےٰ سے لفظوں میں اس طرح کی مہلت طلب کی ہو۔

اس امر کا ثبوت کہ یوم بعث سے مُراد رُوحانی بعث ہے نہ کہ حشر اجسادیہ یہ ہے کہ اس جگہ موت تک نہیں فرمایا۔ بلکہ یوم بعث تک فرمایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حقیقی یوم البعث

يُبْعَثُوْن
اَللعنة
يَوم
الدّين
لعنت سے مراد
آدم میں نفخ رُوح سے مراد نزول الہام ہے
آیت اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَة میں عذاب الٰہی کا ذکر نہیں۔
اَنْظِرْنِی

مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝

مہلت پانے والوں میں سے ہے (ہی) معیّن وقت (کے آنے) کے دن تک ۳۳ اس نے کہا کہ اے میرے رب

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ

چونکہ تونے مجھے گمراہی والا ٹھہرایا ہے میں ضرور ہی ان کے لئے (تیری) ساری زمین میں (گمراہی کو) خوبصورت کرکے دکھاؤنگا

یوم بعث سے مراد روحانی بعث ہے

تک موقعہ ملنے کے کوئی معنے ہی نہیں۔ کیونکہ مرنے کے بعد تو عالم امتحان ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تو کسی مذہب کا بھی عقیدہ نہیں کہ مرنے کے بعد بھی شیطان اور ملائکہ لوگوں کو نیکی کی طرف لانے یا بدی کی تحریک کرتے ہیں۔ پس اگر یوم بعث سے یہاں حشر اجساد مراد لیا جائے تو یہ آیت قرآنی تعلیم اور عقل سلیم کے مخالف ہو جاتی ہے۔ پس ہر عقلمند یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہاں یوم بعث سے مر[illegible]ن بعث ہے اور مطلب یہ ہے کہ اسی وقت تک شیطان یا شیطانی لوگ کسی کو گمراہی کا سبق دے سکتے ہیں جب تک اس کا روحانی بعث نہ ہو یا دوسرے لفظوں میں نفس مطمئنہ نہ ملا ہو جب نفس مطمئنہ مل جائے تو پھر شیطان اور اسکی ذریت اس بندے سے مایوس ہو جاتی ہے اور ورغلانے کے طریقہ کو چھوڑ کر اسے جسمانی دُکھ دینا شروع کر دیتی ہے۔

روحانی بعث کے بعد شیطان مایوس ہو جاتا ہے۔

دوسرے معنوں کے رُو سے یعنے آدم اور ان کے حقیقی جانشین یعنے انبیاء کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ شیطان اور اس کے اتباع کو اس وقت تک ان کے کاموں پر نکتہ چینی کا موقعہ ملتا ہے اور ان کے کاموں میں روک پیدا کرنے کی طاقت ہوتی ہے جب تک ان کا یوم بعث نہیں آتا۔ یعنی انکی کامیابی کے لئے جو زمانہ مقدر ہے وہ نہیں آجاتا۔ کامیابی کے زمانہ کے آنے تک شیطانی لوگ خوب ان پر حملے کرتے ہیں اور انہیں دُکھ دیتے ہیں اور ان کے خلاف جھوٹے الزامات لگاتے ہیں یعنے استراق سمع اور مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ کی بنائی ہوئی ڈھیل کے ماتحت ان کی تعلیم پر اعتراض کرتے اور

یوم بعث سے مُراد انبیاء کی کامیابی کا زمانہ

جھوٹ بولتے ہیں لیکن جب ان کا یوم بعث آتا ہے یعنی انہیں غلبہ اور اقتدار ملنا شروع ہو جاتا ہے تو پھر شیطان جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ آدمؑ کے زمانہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے اور اللہ تعالےٰ کی حکمت شیاطین کو خوب شور مچانے اور طرح طرح کے مکر اور حیلے کرنے کی مہلت دیتی رہی ہے لیکن جب بھی یوم بعث آیا اور خدا تعالیٰ کی آواز نے اپنے نبیوں اور انکی جماعت کو آواز دی۔ کہ اب تمہارا امتحان ختم ہوا اب اُٹھو اور دُنیا پر چھا جاؤ۔ اس وقت ان کے مخالف زبد یعنے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ بلکہ اُن میں سے بہت ایمان لا کر ان کے حلقہ بگوش ہو گئے ان معنوں کے رو سے بھی شیطان کا مکالمہ مہلت کے متعلق ایک تصویری نقشہ ہے اور اس کے یہ معنے نہیں کہ نبیوں کے زمانے میں شیطان مہلت مانگتے ہیں اور انکو خدا تعالےٰ مہلت دیتا ہے۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ شیطان دل سے خواہش کرتے ہیں کہ نبیوں پر حملہ کریں اور انہیں کُچل دیں اور اللہ تعالیٰ ان کی اس خواہش کو پورا ہونے دیتا ہے۔ مگر یہ مہلت یوم بعث تک ملتی ہے۔ جب یوم بعث آتا ہے تو مہلت ختم ہو جاتی ہے اور سب اوندھے مُنہ گر جاتے ہیں۔ اور اپنی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

۳۳ تفسیر یعنی بے شک تم کو مہلت ملے گی۔ مگر وقتِ معلوم تک۔ یعنی اس وقت تک کہ خدا تعالےٰ کی تقدیر نے نبیوں کی ترقی کو رُوکا ہوا ہوگا۔ جب انکی ترقی کا زمانہ آئے گا تو یہ مہلت ختم ہو جائے گی اور اے شیطانو! (یعنی نبی کے بڑے دشمنو) خدا تعالیٰ کے قہری نشان تم کو بھسم کر دینگے۔ یہ يَوْمُ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ

وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ

اور ضرور ہی ان سب کو گمراہ کردوں گا ۴۳ سوائے ان میں سے تیرے

وہی ہے جسکی نسبت اس سورۃ کے شروع میں آچکا ہے وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (ع ۱) یعنی ہر بستی جس نے نبیوں کا مقابلہ کیا اور ہم نے اسے ہلاک کیا اسے پہلے ہی دن ہلاک نہیں بلکہ ہر نبی کے کام کے مطابق اسکی قوم کو ایک وقت تک مہلت دی۔ کسی کو تھوڑی کسی کو لمبی۔ کسی کو اس نبی کی عین حیات میں تباہ کیا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور موسٰی علیہ السلام سے ہوا۔ اور کسی دشمن قوم کو نبی کی وفات کے بعد ہلاک کیا۔ جیسے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے وقت میں ہوا۔

۴۳ حل لغات

اَغْوَيْتَنِيْ:۔ اَغْوٰى سے مخاطب کا صیغہ ہے۔ اغواءُ کے معنے ہیں اضلّہ اُسے گمراہ قرار دیا یا گمراہ کیا۔ وَغَوٰى وَغَوِىَ الرَّجُلُ ضَلَّ گمراہ ہوگیا۔ (اقرب) پس اَغْوَيْتَنِيْ کے معنے ہوں گے تُو نے مجھے گمراہ قرار دیا۔

تفسیر۔ یہ بھی زبانِ حال کا کلام ہے یعنی وہ لوگ جو ابتداء میں ایمان نہیں لاتے بعد میں اس غصہ سے کہ ہمیں شروع میں ایمان لانے کا موقع نہیں ملا۔ انبیاء کی جماعتوں کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور انہیں تکالیف دے کر مرتد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے کہ دوسری جگہ فرماتا ہے تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (اعراف ع ۱۳) یعنے اے محمدؐ یہ وہ بستیاں ہیں۔ جن کا حال ہم نے تجھے سُنایا ہے۔ ان کے پاس ہمارے رسول دلائل لے کر آئے۔ مگر وہ ایمان لانے سے محروم رہے۔ صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے شروع میں انکے دعوٰی کا انکار کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ان لوگوں کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے جو انبیاء کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس آیت میں بتایا ہے ائمۃ الکفر اس وجہ سے ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں کہ شروع میں انکار کر بیٹھتے ہیں پھر ایمان لانے میں اپنی ذلت محسوس کرتے ہیں اور مخالفت میں بڑھ جاتے ہیں اور اپنا غصہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر کے نکالتے ہیں اسی مضمون کی طرف اس سورۃ کے شروع میں بھی اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے۔ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ یعنے بہت دفعہ کفار کے دل میں حسرت پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہم شروع میں ایمان لے آتے۔ اور ہماری عزت قائم رہتی۔ مگر چونکہ انکار کر کے عزت کے مقام کو کھو چکے ہوتے ہیں۔ باوجود اس حسرت کے ایمان لانے سے گریز کرتے ہیں اور ضد میں بڑھتے جاتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا لَاُغْوِيَنَّهُمْ میں ضرور انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ وہی کوشش ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں حضرت شعیبؑ کے ذکر میں آیا ہے کہ اُن کے دشمنوں نے کہا کہ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (اعراف ع ۱۱) یعنی اے شعیب ہم تجھے بھی اور تیرے ساتھ ایمان لانے والوں کو بھی اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ یا تم کو واپس ہمارے دین میں آنا پڑیگا اور سورۂ ابراہیم میں فرمایا۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (ابراہیم ع ۳) گویا ہر ایک رسول کے دشمن یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ ہم کو ایمان نہیں ملا تو مومنوں کو بھی گمراہ کر کے چھوڑیں گے اور یہی وہ حالت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی تھی جسکی نسبت فرماتا ہے وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ (نساء ع ۷) یعنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن یہود چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی مرتد کر دیں۔ اسی طرح کفار کی نسبت آتا ہے وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (بقرہ ع ۲۷)

بڑے بڑے الکفر کے ایمان نہ لانے کی وجہ۔

اغویتنی

لاغوینهم سے بھی کوشش مراد ہے جو انبیاء کے دشمن کرتے چلے آئے ہیں۔

قرآن مجید انبیاء کے دشمنوں کی کوششوں کی طرف اشارہ

الْمُخْلَصِيْنَ ○ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ○

برگزیدہ بندوں کے (جو میرے فریب میں نہیں آسکتے) فرمایا (کہ) یہ (حفاظت الٰہی) میری طرف (آنے کی) سیدھی راہ ہے ۵۳۵

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ

جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا ہرگز کوئی تسلط نہیں ہوگا۔ سوائے ایسے افراد کے جو

اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ

تیرے پیچھے چلیں یعنی گمراہ ہوں ۵۳۶ اور یقیناً جہنم اُن سب کے (لئے) وعدہ کی

یعنے کفار کا اگر بس چلے۔ تو یہ اُس وقت تک تم سے لڑتے رہیں گے کہ تم کو مرتد کریں۔ یعنے یہ تو تم کو اپنے جیسا بنانے کے لئے پورا زور لگائیں گے مگر ایک دن اللہ تعالیٰ ہی اُن کے زور کو توڑ دے گا۔ اور یہ مغلوب ہو جائیں گے۔ یہی نظارہ آج کل احمدیوں کو دیکھنا پڑ رہا ہے۔ سب دُنیا انہیں مرتد کرنا چاہتی ہے مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ کفر بھی کیسا اندھا ہوتا ہے۔ بجائے اپنے پر ناراض ہونے کے کہ دین الٰہی کو کیوں چھوڑا۔ کافر خدا تعالیٰ پر ناراض ہوتا ہے کہ اس نے مجھے کیوں ایمان نہ بخشا۔ اس لئے میں اس کے مومن بندوں کو بھی مرتد کر کے چھوڑوں گا۔ العیاذ باللہ۔

لَاُغْوِيَنَّهُمْ کے ماتحت احمدیوں کی مخالفت

۵۳۵ تفسیر۔ پہلے کہا تھا کہ جو بندے چنے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ [illegible]نی تصرف سے بچ جاتے ہیں۔ اب اسکی تشریح کی کہ مخلص بندے کس طرح بنتے ہیں۔ اور اس کا طریق یہ بتایا کہ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ یعنے اس راستہ کا بتانا میرے ذمہ ہے۔ میں الہام سے انہیں اپنا راستہ بتاؤں گا اور جب الہام سے میں انہیں اپنا راستہ بتاؤں گا اور وہ سیدھے میری طرف آئیں گے تو شیطان کی طرف جو خدا تعالیٰ سے دور پھینکا ہوا ہے وہ جا ہی نہیں سکتے۔ ان معنوں کے رُو سے صِرَاطٌ عَلَيَّ کے معنے ہوتے ہیں صِرَاطٌ بیانُہٗ عَلَيَّ یہ وہ راستہ ہے جس کا بیان کرنا میرا کام ہے یعنے مخلص بندے وہ نہیں جو اپنی عقلوں سے خدا کا رستہ دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ جو عقل پر انحصار کرتا ہے شیطان کے قبضہ میں جا تا ہے لیکن جسے میں خود راستہ بتاؤں وہ کسی صورت میں شیطان کے اثر کے نیچے نہیں آسکتا۔ کیونکہ اس کا محافظ اور نگران میں ہوتا ہوں اور وہ سیدھا بغیر اِدھر اُدھر بھٹکنے کے میری طرف آجاتا ہے۔

آیت هٰذا صراط علی کے دو معنے

هٰذا صراط علی سے مراد الہام سے راستہ بتانا ہے۔

سُلطان [2]

دوسرے معنے اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو مخلص ہوں یعنے چنے ہوئے ہوں وہ تو فوراً ہی مجھ کو پالیتے ہیں اور انکی بعد کی زندگی میری تلاش میں نہیں گذرتی اور وہ اس راستہ پر نہیں چل رہے ہوتے جو میری طرف آتا ہے کہ گمراہی کا خطرہ ہو۔ اور شیطان انہیں میرے تک پہنچنے سے پہلے ہی اچک لے جب وہ میرے الہام سے مجھ کو پالیتے ہیں تو انکی بعد کی زندگی اس راستہ پر چلنے پر گذرتی ہے جو میرے اوپر سے گذرتا ہے یعنے میرا وصل تو وہ پہلے ہی پالیتے ہیں انکی بقیہ زندگی ایک کے بعد دوسری صفات الٰہی کو حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسے اشخاص کے متعلق شیطان کی کیا مجال کہ ان کے قریب بھی آسکے۔ اس میں یہ نکتہ بتایا کہ گمراہی کا خطرہ اسے ہوتا ہے۔ جو ابھی تلاش میں ہو جسے خدا مل گیا اور جو خدا کے ملنے کے بعد صرف زائد قُرب کی تلاش میں لگا ہوا ہوتا ہے اسے گمراہ کرنا کسی شیطان کی طاقت میں نہیں آنکھوں دیکھی بات اور تجربہ کردہ طریق کے بعد کوئی شخص منکر ہو ہی کس طرح سکتا ہے۔

۵۳۶ حل لغات۔ سُلْطٰن کے معنی ہیں دلیل قبضہ

اَجْمَعِيْنَ ۝ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ

جگہ ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں (اور اسکے) ہر دروازہ کے لئے

مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ

ان میں سے ایک مقرر حصہ ہوگا ۴۵ متقی (لوگ) یقیناً باغوں

ع ۳ / ۳

طاقت۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۂ ابراہیم ۴۳

تفسیر اس آیت میں دوسرے محفوظ گروہ کا ذکر کیا ہے جو نبوت کے مقام پر تو نہیں ہوتا۔ یا براہ راست ایمان تو حاصل نہیں کرتا لیکن نبیوں کے طفیل یا دوسرے خدا رسیدوں کے طفیل صداقت کو پالیتا ہے ان کے متعلق فرمایا کہ انکو بھی اس قدر حفاظت حاصل ہوتی ہے کہ شیطان کو ان پر تسلط حاصل نہیں ہوتا۔ بیشک شیطان ان پر حملہ کرتا ہے لیکن اس کا حملہ بہت کمزور ہوتا ہے اور ان کو اس کے مقابلہ کی طاقت ہوتی ہے اس لئے وہ بھی بالعموم بچ جاتے ہیں۔ ہاں ان میں سے بعض جو ایمان کو پوری طرح حاصل نہیں کرتے اور ان کے ایمان کی بنیاد کامل یقین پر نہیں ہوتی بلکہ ابھی کمزوری ان میں باقی ہوتی ہے اور وہ کبھی کبھی شیطان کی پیروی کر لیتے ہیں یعنی گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے خطرہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے حملہ کا شکار ہو جائیں اور شیطان کو ان پر تسلط حاصل ہو جائے مگر یہ تسلط بھی ان کی اپنی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے اور گناہوں کے ارتکاب کے بعد ہوتا ہے۔ ورنہ شروع میں وہ بھی حفاظت الٰہی میں ہوتے ہیں۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسانی فطرت پاک ہے اور وہی گمراہ ہوتا ہے۔ جو خود اس فطرت کو خراب کر کے شیطان کے پیچھے چل پڑے اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں کہ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس) وہی ہلاک ہوتا ہے جو اپنے نفس کو خراب کر دیتا ہے اور گناہ کی مٹی میں دفن کر دیتا ہے۔

۴۴ حل لغات۔ جَهَنَّمَ کے لئے دیکھو جَهَنَّمَ سورہ رعد ۱۹۔ مَوْعِدٌ: کے معنی ہیں وعدہ۔ اقرار وعدہ کی جگہ (اقرب)

تفسیر قرآن کریم میں دوزخ کے نگرانوں کی تعداد انیس ۱۹ بیان فرمائی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ انسان کے نو حواس ہیں گو عام طور پر پانچ مشہور ہیں لیکن درحقیقت سردی گرمی اور وقت اور وزن کا اندازہ کرنے والے حواس کو ملایا جائے تو نو حواس ہوتے ہیں۔ پس یہ تعداد ان حواس کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہے یعنی نو ظاہری حواس اور نو باطنی حواس اور ایک ان پر داروغہ۔ یہ کل انیس ۱۹ ہوئے۔ جب انسان ان اٹھارہ حواس اور انکی نگران قوت ارادی سے کام نہیں لیتا تو وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ پس اس نسبت سے اس پر دوزخ میں انیس پہرہ دار مقرر کئے جائیں گے یہ بتانے کے لئے کہ تو نے انہیں طاقتوں کو غلط استعمال کیا۔

دوزخ کے نگرانوں کی تعداد انیس بیان کرنے کا مطلب۔

اور یہ جو سات دروازے بتائے ہیں۔ ان سے مراد یہ ضروری نہیں کہ سات ہی دروازے ہوں۔ کیونکہ سات اور ستر کا ہندسہ عربی میں تکمیل یا کثرت کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس محاورہ کے رو سے دوزخ کے سات دروازے ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کے کثرت سے دروازے ہوں گے اور تمام گناہوں کا خیال رکھا جائے گا۔

دوزخ کے سات دروازے کہنے سے مراد

اور لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ جو فرمایا تو اس کے یہ معنے ہیں کہ جس قسم کے گناہ ہونگے ویسے ہی دروازے سے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ جنت کے متعلق بھی احادیث میں آتا ہے کہ مختلف نیکیوں کے الگ الگ دروازے ہونگے اور ہر شخص اپنی مناسب حال نیکی کے راستہ سے

جہنم کے مختلف دروازے مختلف رنگوں کے لحاظ سے ہیں

وَّعُيُوْنٍ ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝ وَنَزَعْنَا

اور چشموں (والے مقام) میں ہونگے ۳۸؎ (انہیں کہا جائیگا کہ) تم سلامتی کے ساتھ بے خوف (وخطر) ان میں داخل ہو جاؤ ۳۹؎

مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ

اور ان کے سینوں میں جو کینہ (وغیرہ) بھی ہوگا اسے ہم نکال دینگے (وہ) بھائی بھائی بنکر (جنت میں رہیں گے اور) تختوں پر

جنت میں داخل ہوگا۔

[حاشیہ: آیت لکل باب منہم جزء سے سورۃ بقرہ کی ایک آیت کا حل۔]

اس جگہ جُزْءٌ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کے معنے انسانی جسم کے ٹکڑے کے نہیں بلکہ دوزخیوں کی جماعت کے مختلف گروہ مُراد ہیں۔ اس آیت سے سورۂ بقرہ کی اس آیت کا حل ہو جاتا ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ چار پرندے لے لے اور پھر فرمایا کہ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا (بقرہ ع ۳۵) پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک جزو کو رکھ دے اس جگہ مفسرین نے غلطی سے یہ معنے کئے ہیں کہ ان کو ٹکڑے کرکے ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دے۔ حالانکہ چار پرندوں کے اجزاء سے وہی مُراد ہے جو اس جگہ مُراد ہے یعنے اُن میں سے ایک ایک پرندہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔

[حاشیہ: اَلْجَنَّۃ]

۳۸؎ حل لغات۔ الجنّۃ کے لئے دیکھو سورۂ رعد ۲۴؎

[حاشیہ: جنتوں کے جنات اور عیون میں ہونے کا مطلب]

تفسیر۔ عَیْن کے معنے چشمہ کے ہیں اور عُیُوْن میں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چشموں کے اندر پڑے ہونگے بلکہ جنت اور عیون کے اکٹھے ذکر سے یہ بتایا ہے کہ متقی ایسی جنت میں ہونگے۔ جو چشموں والی ہوگی۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ جہاں شیاطین کو کفر کرنے کی وجہ سے جہنم نصیب ہوگی۔ اس دُنیا میں جلن حسرت اور پھر عذاب کی صورت میں اور آخرت میں عذاب النار کی صورت میں وہاں مومن خدا تعالےٰ کے سایہ کے نیچے ہونگے۔ اور علوم کے چشمے ان کے دلوں سے پھوٹ رہے ہونگے جنکی وجہ سے فضل کا سلسلہ اور بڑھے گا۔ جس طرح درخت کو پانی ملتا رہے تو وہ بڑھتا رہتا ہے۔ اور آخرت میں وہ جنات وعیون نصیب ہونگے جن کا وعدہ قرآن کی متعدد آیات میں دیا گیا ہے۔

[حاشیہ: اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ملائکہ کا قول معلوم ہوتا ہے]

۳۹؎ حل لغات۔ بِسَلٰمٍ کے لئے دیکھو سورۂ یونس ۲۶؎

تفسیر۔ یہ ملائکہ کا قول معلوم ہوتا ہے یعنے ملائکہ ان سے اس دُنیا میں بھی کہتے ہیں۔ اور اگلے جہاں میں بھی کہیں گے کہ سلامتی اور امن سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ چونکہ یہ لوگ ملائکہ کی نیکی کی تحریکات کو قبول کرتے ہیں اس لئے ملائکہ کو ان سے محبت اور اُنس ہو جاتا ہے۔ اور وہ الٰہی فیصلوں کو جو مومنوں کے بارہ میں ہوتے ہیں۔ دوڑ دوڑ کر انہیں سُناتے ہیں اور یہ جو فرمایا سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ اس میں دو سلامتیوں کا ذکر ہے اندرونی اور بیرونی کشمکش اور اضطراب سے نجات کی طرف سلام سے اشارہ کیا گیا ہے اور بیرونی تکالیف اور عذابوں سے نجات کی طرف آمنین سے اشارہ کیا گیا ہے۔

[حاشیہ: سلام کے لفظ سے اللہ کے ایک وعدے کی طرف اشارہ]

نیز سلام کے لفظ سے اللہ تعالےٰ کے ایک وعدہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جو ان الفاظ میں ہے۔ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (یٰس ع ۴) یعنے خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے خاص سلام مقدر ہے۔ اسکی ہم تم کو خبر دیتے ہیں یہ فرشتوں کا کہنا ان کے مومنوں سے شدید تعلق پر دلالت کرتا ہے۔ گویا وہ الٰہی فیصلوں کو ان تک جلد سے جلد پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب تک اللہ تعالےٰ کی طرف سے سلامتی کا حکم نازل نہ ہو۔ انسان کو امن

مُّتَقٰبِلِيْنَ ○ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ

ایک دوسرے کے سامنے (بیٹھے) ہوں گے ۔ ۴۹ نہ انہیں ان میں کوئی تکان ہوگی اور نہ انہیں

مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ○ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ

ان سے کبھی نکالا جائے گا ۔ ۵۰ (اے پیغمبر) میرے بندوں کو آگاہ کردے کہ میں بہت ہی بخشنے والا

نصیب نہیں ہوتا۔ اور اس شیطانی قول کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہم مومنوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ سو فرمایا باوجود ان کی کوششوں کے تم میرے برکتوں والے گھر میں آ ہی پہنچے۔

۴۸ حل لغات۔ غِلٌّ: غَلَّ کا مصدر ہے۔ اور غَلَّ صَدْرُہٗ غِلًّا کے معنے ہیں۔ کَانَ ذَا غِشٍّ اَوْ حِقْدٍ وَضِغْنٍ۔ سینہ میں کینہ حقد اور غصہ بھر گیا۔ اور اَلْغِلُّ کے معنے ہیں۔ الغِشُّ والحِقْدُ۔ کینہ اور حقد (اقرب) پس نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ کے معنے ہونگے کہ ہم ان کے دلوں سے کینہ وغیرہ کو نکال دیں گے۔

سُرُرٌ: سَرِیْرٌ کی جمع ہے۔ اور السَّرِیْرُ کے معنی ہیں التَّخْتُ۔ تخت۔ ویغلب عَلٰی تَخْتِ الْمَلِکِ اور اکثر بادشاہ کے تخت پر بولا جاتا ہے۔ یُقَالُ زَالَ عَنْ سَرِیْرِہٖ اَیْ ذَھَبَ عِزُّہٗ وَنِعْمَتُہٗ " اور جب زال عن سریرہ کا محاورہ بولیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اسکی عزت جاتی رہی۔ اَلْمُلْکُ بادشاہت۔ اَلنِّعْمَۃُ۔ نعمت خَفْضُ العیشِ۔ خوب مزے کی زندگی (اقرب)

تفسیر۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن ع ۳) کہ مومن کو دو جنتیں ملتی ہیں۔ ایک اسی دُنیا میں اور دوسری اگلے جہان میں۔ اس جگہ پر جنت کی شرط یہ بتائی کہ وہاں دلوں میں غل نہ ہوگا۔ پس اس دُنیا میں جو مومن بھائی کا بغض دل سے نکال دے وہی جنتی بن سکتا ہے۔ اس سے ہماری جماعت اور تمام مسلمانوں کو فائدہ اُٹھانا چاہیئے کہ کسی کا کینہ دل میں نہ رکھیں۔

احمدیہ جماعت اور تمام مسلمانوں کو نصیحت۔

عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ۔ مُتَقَابِلِیْنَ کہہ کر بھی انکی باہمی محبت کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ جب محبت ہوتی ہے تبھی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف منہ کرکے بیٹھتے ہیں

غِلٌّ

سُرُرٌ پر قرآن مجید نے بہت زور دیا ہے۔ اور مختلف مواقع پر مختلف الفاظ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر شخص ہی وہاں بادشاہ ہوگا۔ دوسروں کی محکومی سے نجات مل جائے گی۔ اور صرف خدا تعالےٰ کی بادشاہت ہوگی جس کا حکم بوجھ نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکی اطاعت قوت و شان کو بڑھانے والی اور حقیقی آزادی دینے والی ہوتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ (نحل ع ۴) جنت میں انکی ہر ایک خواہش پوری کی جائیگی گویا اپنے اپنے دائرہ میں ہر اک کا قانون نافذ ہوگا۔ اور یہی مفہوم بادشاہت کا ہے۔

عَلٰی سُرُرٍ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر شخص ہی وہاں بادشاہ ہوگا۔

سُرُرٌ

۴۹ حل لغات۔ نَصَبٌ۔ نَصِبَ (یَنْصَبُ) نَصَبٌ کا مصدر ہے۔ اور نصب الرجلُ کے معنے ہیں۔ اَعْیَا۔ تھک گیا (لازم) نصب فی الامر۔ جدّ و جتہد۔ کسی کام میں کوشش اور محنت کی (اقرب) پس النَّصَبُ کے معنے ہونگے۔ تکان۔

نَصَبٌ

تفسیر۔ فرمایا ان کو جنت میں نہ کسی قسم کی تکان پہنچے گی۔ اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں بھی انسان کام کریں گے

دُنیا میں جو مومن بھائی کا بغض دل سے نکال دے وہی جنتی بن سکتا ہے۔

الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَالْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝

(اور) بار بار رحم کرنے والا ہوں[۵۴۲] اور (یہ) کہ میرا عذاب ہی (حقیقۃً) دردناک عذاب (ہوتا) ہے [۵۴۳]

لیکن فرق یہ ہوگا کہ وہاں فناء نہ ہوگی۔ کیوں کہ تکان فنا کی علامت ہوتی ہے۔ تکان کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ انسان کے جسم سے کچھ ذرات چربی یا اور کسی مفید جزو کے نکل گئے ہیں اور تکان کام چھوڑنے اور آرام کرنے کے لئے طبیعت کا اعلام ہوتا ہے۔ یا غذا کھانے کے لئے۔ مَیں نے ایک طب کی کتاب میں پڑھا ہے کہ ہاتھ کی ایک حرکت میں انسانی جسم کے کئی ملین سیل ضائع ہو جاتے ہیں۔ پس کچھ مدت کام کرنے کے بعد جب تھکان محسوس ہوتی ہے وہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ جسم سے کافی طاقت ضائع ہو چکی ہے۔ اب اس نقصان کا ازالہ کرو۔ پس تکان فناء کی علامت ہے۔ اور یہ کہہ کر کہ وہاں تکان نہ ہوگی یہ بتایا ہے کہ وہاں تحلیل جسم نہ ہوگی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غذا جو بدل ما یتحلل کے طور پر ہوتی ہے۔ وہاں اس کا کام یہ نہ ہوگا کہ فناء شدہ کو پھر قائم کرے بلکہ مزید طاقت دینا کام ہوگا گویا اس زندگی میں قدم پیچھے کسی طرح نہ ہٹے گا صرف آگے ہی بڑھنا ہوگا۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ سے یہ بتایا ہے کہ جنت میں بھی انسان کام کریں گے

تکان تحلیل جسم کا نتیجہ ہے جنت میں تحلیل جسم نہ ہوگی۔

جنت کام کرنے کی جگہ ہے نہ کہ بیٹھنے کا مقام۔

چونکہ اس عارضی فناء کے نتیجہ میں جو تکان کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ انسان کو موت آتی ہے۔ کیونکہ آہستہ آہستہ جسم کی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں اور جنت میں اس قسم کے نقصان کی نفی فرمائی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ وہ وہاں سے نکالے نہ جائیں گے یعنی اب انکے لئے کوئی موت نہیں

یاد رہے کہ جنت ایک روحانی مقام ہے۔ اور گو تمثیلی زبان میں اسکی نعماء کو دنیا کی نعماء سے مشابہت دی گئی ہے لیکن درحقیقت اسکی نعمتیں ایسی ہیں کہ انسانی دماغ انہیں سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اس آیت میں درحقیقت اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں تو انہیں شیطانوں سے جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ وہاں وہ اس جدوجہد سے بالکل بچ جائیں گے اور ان کے دل ہر کوفت سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اور نہ عارضی طور پر شیطان ان کو نقصان پہنچا سکے گا۔ نہ مستقل طور پر۔

جنت کی نعماء انسانی دماغ نہیں سمجھ سکتی

غفور کے بعد صفت رحیم لانے کی وجہ

الْعَذَاب

اس آیت سے یہ بھی استدلال ہوتا ہے کہ جنت سُست الوجودوں کی سرائے نہیں بلکہ اس میں رہنے والے بھی کام کریں گے کیونکہ اگر کام نہ کرنا ہوتا تو تکان کی نفی کی کیا ضرورت تھی۔ پس جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جنت ایک کھانے پینے اور عیش کرنے کا مقام ہے وہ غلطی کرتے ہیں جنت تو عبودیت کا اصل مقام ہے جیسے فرمایا فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (سورۃ الفجر) یعنی کامل عبودیت کا مقام جنت میں داخلے کے وقت حاصل ہوگا۔ اور عبد کام کیا کرتا ہے نہ کہ سست بیٹھتا ہے۔ پس اصل کام کا مقام تو جنت ہی ہے۔ جہاں انسان کامل عبد ہو جائے گا جنت کا سارا مزا اس میں ہے کہ جذبات کی کشمکش سے آزاد ہو کر انسان اپنی عبادات میں لذت ہی لذت محسوس کریگا اور جس کام میں لذت حاصل ہو اس میں تکان محسوس نہیں ہوتی۔ عام طور پر مسلمان جنت کا نقشہ پُور ہوس (مسکینوں کے رکھنے کی جگہ) کا سمجھتے ہیں کہ کام کچھ نہ کرینگے کھانا مفت ملتا رہے گا اور کوئی وہاں سے باہر بھی نہ نکالے گا۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

۵۴۲ تفسیر - اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ - اس جگہ عِبَادِیْ کا لفظ عام معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور نیک اور بد سب بندے اس میں شامل ہیں۔ فرمایا ہے کہ میرے بندے نیک ہوں یا بد ان سب کو اطلاع دے دو کہ مَیں غفور ہوں۔ اور رحیم ہوں یعنی گناہ گاروں کو تسلی دو۔ گھبرائیں نہیں۔ اور اس خیال سے مایوس نہ ہوں کہ بہت گناہ ہوئے اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں غفور ہوں انکے سب گناہ بخش سکتا ہوں۔ اور مومنوں سے کہدو کہ وہ نیکی کر کے بس نہ کر دیں۔ اور یہ خیال نہ کریں کہ جو کمال ہم نے حاصل کرنا تھا کر لیا۔ کیونکہ میں رحیم ہوں میں بار بار رحم کرنے والا ہوں۔ وہ جس قدر بھی نیکی میں ترقی کرتے جائیں گے میرا رحم اور بڑھتا جائے گا پس انہیں نیکیوں میں ترقی کرتے رہنا چاہیئے۔

۵۴۳ حل لغات - اَلْعَذَابُ - کُلُّ مَا شَقَّ

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ وقف لازم

اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کے متعلق (بھی) آگاہ کر ۴۴؎ جب وہ اس کے پاس آئے

فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ۝ قَالُوْا

اور کہا (کہ ہم تمہارے لئے) سلامتی (کا پیغام لائے ہیں) اس نے کہا (کہ) ہم (تو) یقیناً تم سے ڈر رہے ہیں ۴۵؎ انہوں نے

عَلَى الْاِنْسَانِ وَمَنَعَهُ عَنْ مُرَادِهِ۔ عذاب کے معنی ہیں جو انسان پر شاق گذرے اور حصول مراد سے اسے روک دے وفی الکلیات کُلُّ عَذَابٍ فِی الْقُرْاٰنِ فَهُوَ التَّعْذِيْبُ اِلَّا وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ فَاِنَّ الْمُرَادَ الضَّرْبُ۔ اور کلیات میں لکھا ہے کہ عذاب سے مُراد قرآن مجید میں عذاب دینا ہوتا ہے سوائے آیت ولیشهد عذابهما کے۔ وہاں سزا مراد ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرمایا میرے عذاب کے مقابلہ میں کسی دوسرے کا عذاب۔ عذاب کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ کیونکہ اوّل تو وہ عارضی ہوتا ہے دوسرے اس سے بچنے کا ایک ذریعہ یعنے اللہ تعالیٰ کی ذات موجود ہے۔ لیکن جب عذاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے تو پھر کوئی پناہ باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں تو لَا مَلْجَاءَ وَلَا مَنْجَاءَ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ ہی کہنا پڑتا ہے۔

۴۴؎ تفسیر۔ اس جگہ دراصل حضرت لوطؑ کا ذکر شروع کرنا تھا مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ہمیشہ حضرت ابراہیمؑ کے ذکر سے ہی حضرت لوطؑ کا ذکر شروع کیا جاتا ہے اتفاقی طور سے نہیں بلکہ یہ ذکر عمداً کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں تفصیلی طور پر حضرت لوطؑ کا واقعہ آیا ہے وہاں حضرت ابراہیمؑ کے ذکر سے ہی ان کا ذکر شروع کیا گیا ہے۔ اور اس سے یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے ماتحت رسول تھے۔ اس واقعہ کو آدم علیہ السلام کے واقعہ کے بعد اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ اہل مکہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے سمجھتے تھے اور حضرت لوطؑ ان کے رشتہ دار تھے پس ایک طرف تو یہ بتایا کہ الہام الٰہی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ پر بھی نازل ہوا تھا اور تم ان کے حالات سے واقف ہو۔ پھر آج الہام کے متعلق شبہات کیوں پیدا کرتے ہو۔ دوسرے انہیں اپنے باپ دادوں کے واقعات سے یہ بتایا گیا کہ وحی الٰہی کا انکار انسان کو سزا کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اس طرز بیان سے اُن لوگوں کا بھی ردّ ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی ترتیب نہیں۔

حضرت لوطؑ اور ابراہیمؑ کے واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد۔

۴۵؎ حل لغات۔ وَجِلُوْنَ:۔ وَجِلَ (يَوْجَلُ وَجَلًا) کے معنی ہیں۔ خاف۔ ڈر گیا۔ وفی مفردات الراغب اِسْتَشْعَرَ الْخَوْفَ اور مفردات میں وَجَل کے معنے یہ کئے گئے ہیں کہ خوف کو محسوس کیا۔ اس سے صفت مشبہ الوَجِلُ ہے جس کے معنے ہیں الخَائِفُ. ڈرنے والا (اقرب) وَجِلُوْن اسکی جمع ہے۔

وَجِلُون

تفسیر۔ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے چہروں پر رنج اور غم کے آثار تھے۔ کیونکہ وہ ایک عذاب کی خبر لے کر آئے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذہانت سے ان کے قلب کی حالت کو تاڑ لیا۔ یا یہ کہ جیسا سورۂ ہود میں ذکر آچکا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے لئے کھانا لائے۔ انہوں نے کھانے سے انکار کیا۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اندازہ کیا کہ یہ لوگ کسی تکلیف دہ بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ اور شائد سمجھا کہ جو یہ خبر لائے ہیں وہ ان کے (یعنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے) لئے بھی تکلیف دہ ہوگی۔ اس وجہ سے انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں کا کھانا نہ کھانا تو دل میں ڈر پیدا کرتا ہے کہ آپ لوگوں کا سفر کوئی خیر کا سفر نہیں۔ اس سورۃ میں کھانا لانے اور ان کے انکار کرنے کے حصہ کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

حضرت لوطؑ کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کے ذکر سے شروع کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں کے چہروں پر رنج و غم کے آثار کی وجہ۔

لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ قَالَ

کہا (کہ) تو خوف نہ کر ہم تجھے یقیناً ایک بہت علم (پانے) والے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں ۵۴۶ اس نے

مہمانوں کے کھانا نہ کھانے سے حضرت ابراہیم کو ڈر محسوس ہوا۔

یہ بھی معنے ہوسکتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے کھانا نہ کھایا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال ہوا کہ شائد مہمانی میں کوتاہی ہوئی ہے۔ اور فرمایا کہ میں تو آپ لوگوں سے ڈرتا ہوں کہ مجھ سے خفا ہوگئے ہیں۔

۵۴۶ تفسیر۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فکر انہوں نے دیکھی تو ایک خبر جو وہ حضرت ابراہیمؑ کے بارہ میں لائے تھے انہیں سُنائی۔ اور کہا کہ ہمارے سفر کا تکلیف دہ حصہ آپ کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ آپ کے لئے تو ہمیں ایک بشارت معلوم ہوئی ہے کہ آپ کے ہاں اولاد ہوگی اور ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ جو بہت علم والا ہوگا۔ یہ امر قابلِ تعجب نہیں کہ حضرت لوطؑ اور حضرت ابراہیم کی نسبت ان لوگوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو الہام ہُوا ہو کیونکہ کبھی مومن کے لئے دوسرے کو خبر دی جاتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ يَرَاهَا الْمُومِنُ اَوْ تُرَى لَهُ (ترمذی جلد ثانی ابواب الرؤیا) مومن کبھی خود بشارت پاتا ہے کبھی اس کے لئے دوسرے کو الہاماً خبر بتادی جاتی ہے۔ میرے نزدیک چونکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ ان علاقوں میں مہاجر تھے۔ اور عراق کے علاقہ سے ہجرت کرکے آئے تھے چنانچہ بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اُور کے جو کسدی قوم کے علاقہ میں تھا باشندے تھے (پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۷ و ۲۸ نیز باب ۱۲ آیت ۴) اور جیسا کہ قرآن کریم میں بھی لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کو انکی قوم نے دُکھ دیا۔ تو انہوں نے کہا۔ اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ (عنکبوت ع ۳/۱۵) میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر جاؤں گا۔ چنانچہ وہ وہاں سے ہجرت کرکے کنعان کے ملک میں آبسے تھے۔ جیسا کہ سورۂ انبیاء میں ہے کہ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ (ع ۵/۵) یعنی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مخالفت ترقی کر گئی۔ اور آگ تک میں انکو ڈالا گیا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے ٹھنڈا کر دیا۔ تو ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور لوطؑ کو اس ملک سے نجات دیکر اس زمین میں پہنچا دیا جو برکت والی ہے اور قوموں کو اس جگہ برکت ملتی رہی ہے یعنے کنعان کا علاقہ جسے اب فلسطین کہتے ہیں۔ اور جس میں یوروشلم وغیرہ یہود کے مقدس مقامات ہیں (نیز دیکھو پیدائش باب ۱۲ آیت ۵) غرض حضرت لوطؑ چونکہ اس علاقہ میں نئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھ کر کہ حضرت لوطؑ کو اپنا گاؤں چھوڑنے پر تکلیف ہوگی۔ ان لوگوں کو جو معلوم ہوتا ہے اسی ملک کے تھے۔ الہام کرکے روانہ کیا۔ تا وہ آیندہ قیام کے متعلق انہیں مشورہ دیں اور تسلی دیں۔

حضرت ابراہیم کو غلام علیم کی بشارت

حضرت ابراہیمؑ بھی اس ملک کے تھے۔ جہاں انہوں نے ہجرت کی تھی

حضرت لوطؑ کی قوم کی تباہی کے ساتھ حضرت ابراہیم کو لڑکے کی بشارت دیئے جانے کی حکمت

یہ جو فرمایا۔ کہ آپ کو غُلَامٌ عَلِيْمٌ کی بشارت دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تسلی کے لئے خبر دی۔ کیونکہ وہ بہت نرم دل تھے فرماتا ہے اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (توبہ ع ۱۴) یعنے حضرت ابراہیم دوسروں کے دُکھ کو بہت محسوس کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے نازک دل کی تسلی کے لئے ان لوگوں کو حکم دیا۔ کہ ابراہیم کو ساتھ ہی لڑکے کی بشارت دیتے جانا۔ جو عَلِيْمٌ ہوگا۔ تا اس کے دل کو تسلی ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ ایک قوم کو تباہ کر رہا ہے۔ تو ایک اور نیک قوم کی بنیاد بھی رکھ رہا ہے۔ چونکہ سچا علم نبوت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے عليم میں حضرت اسحاق کی نبوت کی بشارت بھی مُراد ہوسکتی ہے اِنَّا نُبَشِّرُكَ کے الفاظ اس قدر رز وردار ہیں۔ کہ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہدایت ملی تھی۔ کہ چونکہ اس ہلاکت وتباہی کی خبر سے حضرت ابراہیم کو صدمہ ہوگا اس لئے تم اس کے ساتھ ہی اس کو یہ بشارت بھی دینا۔

اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ○

(اس نے کہا (کہ) کیا تم نے مجھے (اب فی الواقع) بشارت دی ہے۔ باوجود اسکے کہ مجھ پر بڑھاپا آچکا ہے پس بتاؤ کہ کس بنا پر تم مجھے (یہ) بشارت دیتے ہو ۴۷

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ○

انہوں نے کہا (کہ) ہم نے تجھے سچی بشارت دی ہے۔ پس تو ناامید مت ہو ۴۸

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ○

اس نے کہا (کہ میں کیونکر ناامید ہو سکتا ہوں) اور گمراہوں کے سوا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے ۴۹

۴۷ تفسیر ۔حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں تو اب بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ پس یہ تمہاری خبر ضرور الہامی ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بھی بتاؤ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ کے اس جگہ یہ معنی نہیں کہ تم مجھے کس امر کی بشارت دیتے ہو۔ بلکہ یہ ہیں کہ تم کس حق کی بناء پر یہ بشارت دیتے ہو۔ تمہاری اس خبر کی بنیاد کیا ہے۔

۴۸ حل لغات ۔قَنَطَ: (يَقْنَطُ قُنُوْطًا) کے معنے ہیں يَئِسَ ناامید ہو گیا اس سے اسم فاعل قَانِطٌ آتا ہے یعنی ناامید ہونے والا (اقرب)

تفسیر ۔انہوں نے کہا ہم نے بلا وجہ بشارت نہیں دی۔ ہم انسان ہیں۔ انسان ہونے کے لحاظ سے ہمارا کوئی حق نہیں کہ کوئی بشارت دے سکیں۔ مگر یہ بشارت خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہم اس کے دیئے ہوئے حق یا اسی کے مناسب موقع ارشاد کے ماتحت بشارت دیتے ہیں۔ پس تو ناامید نہ ہو۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ بشر تھے۔ اگر فرشتے ہوتے تو وہ حضرت ابراہیمؑ کو ان الفاظ میں خطاب نہ کرتے کیونکہ فرشتے تو حضرت ابراہیمؑ کے مقام کو خوب جانتے تھے۔ ہاں بشر کے لئے ممکن ہے کہ وہ ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کہہ دے۔

۴۹ تفسیر ۔حضرت ابراہیمؑ نے ان کا یہ فقرہ سُن کر کہ تو ناامید مت ہو۔ نہایت زور دار الفاظ میں کہا کہ کیا تم مجھے ایسا کمزور ایمان والا سمجھتے ہو۔ خدا کی رحمت سے سوائے گمراہوں کے اور کون ناامید ہو سکتا ہے۔ مگر میں تو اللہ تعالیٰ پر ایمان کامل رکھتا ہوں۔ میرے سوال کی غرض تو یہ تھی کہ تمہارا مجھے یہ بشارت دینا صرف ایک انسانی ڈھکوسلا ہے (جیسے بعض نجومی وغیرہ کہدیتے ہیں) یا خدا تعالیٰ کی طرف سے تم کو خبر ملی ہے جب تم نے یہ بتا دیا کہ تم خدا تعالیٰ کی طرف سے خبر پا کر ایسا کہہ رہے ہو تو مجھے تمہاری بشارت میں کوئی شک نہیں رہا۔

فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ میں خبر کی بنا کے متعلق سوال ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی غیرت ایمانی کو دیکھو کہ مایوسی کا لفظ سُن کر فوراً جواب دینے کو تیار ہو گئے اور برداشت نہ کر سکے۔ ایک طرف انکی مہمان نوازی اور مہمانوں کی خاطر داری کو دیکھو کہ فوراً گائے ذبح کر کے ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور جب وہ نہیں کھاتے تو انکے دل میں گھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ مبادا وہ ناراض ہی نہ ہو گئے ہوں۔ اور مجھ سے کوئی کوتاہی انکی خدمت میں نہ ہو گئی ہو لیکن دوسری طرف جب وہی معزز مہمان فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ کہتے ہیں۔ تو نہایت جوش اور غیرت سے بول اُٹھتے ہیں کہ مومن کبھی خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ یہ انبیاء کی غیرت ایمانی کا مقام ہے ہر مومن کو دین کے معاملہ میں ایسی ہی غیرت اپنے دل میں پیدا کرنی چاہیئے۔ حضرت ابراہیمؑ کی جگہ اگر کوئی

لَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ [illegible]

کے جواب میں حضرت ابراہیم کی غیرت ایمانی۔

آیت فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے مہمان بشر تھے نہ کہ فرشتے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ○ قَالُوْٓا

(پھر) کہا (کہ اچھا) تو اے (خدا کے) فرستادو! (وہ) تمہارا اہم کام کیا ہے (جو تمہارا اصل مقصد ہے)۵۵۰ انہوں

اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ○ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا

نے کہا (کہ) ہمیں یقیناً ایک مجرم قوم کی طرف (انکی ہلاکت کے لئے) بھیجا گیا ہے ۵۵۱ سوائے لوط کے پیرؤوں کے (کہ)

لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ

ان سب کو ہم یقیناً بچا لیں گے ۵۵۲ اس کی بیوی کے سوا (کہ) ہمارا اندازہ ہے

دوسرا ہوتا۔ تو کہتا کہ کیا کروں بوڑھا ہوں۔ میرے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں اس لئے یقین نہیں آتا۔ مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ جب تک بندوں کی طرف سے خبر ہو میں اسے قابل تحقیق سمجھتا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہو تو باوجود مضمحل قویٰ کے میں اس پر پورا یقین رکھتا ہوں۔

مہمانوں کا کھانا نہ کھانا حضرت لوط کی قوم کی تباہی کی خبر کے دل پر بوجھ کی وجہ سے تھا۔

۵۵۰ حل لغات۔ الخطب: اَلْخَطْبُ: اَلشَّانُ شان وَالْاَمْرُ صَغُرَ اَوْ عَظُمَ۔ اہم امر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا و مِنْهُ هٰذَا خَطْبٌ يَسِيْرٌ وَخَطْبٌ جَلِيْلٌ اور خطبٌ یسیرٌ اور خطبٌ جلیلٌ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ اصل کام چھوٹا ہے اور یہ بڑا۔ سَبَبُ الْاَمْرِ کسی امر کا سبب وَقِيْلَ الْخَطْبُ اِسْمٌ لِلْاَمْرِ الْمَكْرُوْهِ دُوْنَ الْمَحْبُوْبِ اور بعض محققین لغت کہتے ہیں کہ ناپسندیدہ امر کے لئے بطور اسم بولا جاتا ہے وَقِيْلَ هُوَ الْمَكْرُوْهُ وَالْمَحْبُوْبُ جَمِيْعًا اور بعض کہتے ہیں کہ ناپسندیدہ امر اور پسندیدہ دونوں کے لئے بولا جاتا ہے (اقرب)

حضرت ابراہیم کا مہمانوں کے کھانا نہ کھانے سے استدلال۔

تفسیر۔ جب یہ معاملہ صاف ہو گیا کہ انہیں نہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمانی میں کوئی کمی نظر آئی تھی۔ اور نہ کوئی بُری خبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے لائے تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً سمجھ لیا۔ کہ ان کے آنے کی اصل غرض کچھ اور ہے کیونکہ مجھے بیٹے کی بشارت دینے کے لئے آتے۔ تو ایسے غمزدہ کیوں ہوتے پس معلوم ہوتا ہے ان کا پیغام کسی اور شخص کے لئے بھی ہے۔ اور وہی اصل پیغام ہے۔ اور ہے بھی غم کا۔ تبھی یہ کھانا نہیں کھا سکے پس وہ ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا خطب کیا ہے یعنی وہ امر مہم کیا ہے (خطب بڑے اہم امر کو بھی کہتے ہیں اور جو اصلی کام ہو بڑا ہو یا چھوٹا اسے بھی۔ اس جگہ اصل اور اہم کام مراد ہے) جس کے لئے تم آئے ہو۔ تمہارے دل پر جو بوجھ ہے اس سے ظاہر ہے کہ اصل کام مجھے بیٹے کی بشارت دینا نہیں۔ اصل کام کوئی اور ہے جو غم پیدا کرنے والا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ استدلال صاف بتاتا ہے کہ وہ انہیں انسان سمجھتے تھے تبھی تو باوجود ان کے بشارت دے دینے کے انہوں نے ان کے کھانا نہ کھانے کے فعل کو بلا وجہ قرار نہیں دیا اور استدلال کیا کہ یہ ضرور کسی اور تکلیف دہ امر کے لئے سفر کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس بشارت کی وجہ سے ان کو فرشتہ خیال کر لیتے تو کھانا نہ کھانے کا سوال بھی ان کے لئے حل ہو جاتا۔ اگلا سوال ان سے کیونکر کر سکتے تھے۔ کہ پھر تمہارا اصل مشن کیا ہے۔ یہ امر ان کا کوئی اور مشن بھی ہے۔ صرف کھانا نہ کھانے سے ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ اور اسی وقت سمجھا جا سکتا تھا جبکہ انہیں انسان سمجھا جاتا۔ ابراہیم نے کہا۔ کہ تمہارے دل پر کسی امر کا بوجھ ہے جس کی وجہ سے تم کھانا وغیرہ نہیں کھا سکتے۔

۵۵۱ تفسیر۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ انکے عذاب کی خبر دیں۔ اس لئے ہمارے دل پر بوجھ ہے۔

۵۵۲ تفسیر۔ ہاں لوط کا خاندان مستثنیٰ ہے۔ اس فقرہ سے

إِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ

کہ وہ یقیناً پیچھے رہنے (اور ہلاک ہونے) والوں میں سے ہوگی ۵۵۳ پھر جب وہ (ہمارے) بھیجے ہوئے (لوگ) لوط (اور اس)

انہوں نے قوم بھی ظاہر کر دی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھر تسلی دے دی تا حضرت لوط کی وجہ سے غمگین نہ ہوں۔ اور یہ جو فرمایا ہم ان سب کو نجات دینگے یہ میرے نزدیک اس سبب سے ہے۔ کہ اللہ تعالٰے نے انہیں حضرت لوطؑ کی آیندہ رہائش کے انتظام کے لئے بھیجا تھا۔

لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت لُوط کے ساتھ نجات پانے والے لوگ قرآن مجید کے نزدیک ایک جماعت تھے۔ بائیبل نے صرف انکی دو لڑکیوں کے بچنے کا ذکر کیا ہے حالانکہ آل لُوط اگر دو لڑکیوں پر مشتمل تھے تو اجمعین کا لفظ ان کے لئے نہیں بولا جا سکتا۔

۵۵۳ حل لغات۔

قَدَّرْنَا۔ قدر کا لفظ جب اللہ تعالٰی کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور جب کسی انسان کے لئے استعمال ہو۔ تو اس کے معنی اندازہ اور قیاس کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ مفردات میں لکھا ہے۔ اَلتَّقْدِيْرُ تَبْيِيْنُ كَمِّيَّةِ الشَّيْءِ۔ تقدیر کے معنی ہیں کسی چیز کی کمیت کو واضح کرنا۔ اور جب اللہ تعالٰی کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہونگے۔ تَقْدِيْرُ اللّٰهِ بِالْحِكْمَةِ اَنْ يَكُوْنَ كَذَا اَوْ لَا يَكُوْنَ كَذَا۔ کہ اللہ تعالٰی کا کسی معاملہ کے متعلق فیصلہ کرنا کہ وہ اس طرح ہو یا اس طرح نہ ہو۔ اور جب کسی انسان کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو معنے ہونگے۔ اَلتَّفَكُّرُ فِى الْاَمْرِ بِحَسَبِ نَظَرِ الْعَقْلِ وَبِنَاءِ الْاَمْرِ عَلَيْهِ کہ کسی معاملہ میں عقل کے ساتھ غور و فکر کر کے اس کا اندازہ لگایا جائے اور اس پر کسی کام کی بنا رکھی جاوے (مفردات)

اَلْغَابِرُ۔ اَلْبَاقِيْ۔ غابر کے معنی ہیں باقی رہنے والا۔ اسکی جمع غُبَّرٌ اور غَابِرُوْنَ آتی ہے ومنہ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ۔ ای من الذین بقوا فی دیارھم فھلکوا اور آیت امرأتہ كانت من الغٰبرين میں لفظ غابر باقی رہنے والے کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے یعنی انکی بیوی ان لوگوں میں سے تھی۔ جو شہر میں پیچھے رہ گئے تھے۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنے آل لوط میں سے انکی بیوی چونکہ خود پیچھے رہ جانے گی۔ اس لئے وہ نہ بچائی جائے گی۔ یہ لوگ قدّرنا کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جس کے معنے مقرر کرنے کے بھی ہوتے ہیں اس لئے بعض لوگوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ وہ فرشتے تھے ورنہ قدّرنا کیونکر کہتے لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اگر وہ فرشتے بھی ہوتے تو بھی قدّرنا کیونکر کہہ سکتے تھے۔ تقدیر تو اللہ تعالٰی کے اختیار میں ہے نہ کہ فرشتوں کے۔ پس قدّرنا کے اس جگہ یہ معنے نہیں کہ ہم نے ایسا فیصلہ کیا ہے بلکہ اس کے معنی اس جگہ اندازہ لگانے کے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یا ان میں سے کسی ایک کو خواب یا الہام میں جو خبر دی گئی تھی۔ اس میں بیوی کے متعلق گو وضاحت نہ تھی مگر استدلال یہی ہوتا تھا کہ وہ نہ بچے گی پس انہوں نے اللہ تعالٰے کے الہام کا ادب کرتے ہوئے اس پر زیادہ زور نہ دیا اور اسی قدر کہا۔ کہ ہمارا اندازہ الہام الٰہی سے یہی ہے کہ وہ نہ بچے گی یا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تسلی کے لئے اس مضمون پر زیادہ زور نہ دیا اور یہ جھوٹ نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالٰے اپنے مقرر کردہ عذابوں کو بدل بھی دیتا ہے ممکن ہے ان کے دل میں خیال ہو کہ شائد حضرت لوط کی دُعا سے بیوی کا یہ عذاب ٹل جائے۔ پس انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی الفاظ میں خبر دینی مناسب سمجھی کہ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ حضرت لوط کے ساتھ نہ جائے گی۔ دوسری جگہ اللہ تعالٰی نے اس فعل کو اپنی طرف بھی منسوب فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے قدّرنٰها من الغٰبرين (نمل ع ۴) اب یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ادھر خدا تعالٰی کہے کہ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ اور اس کے رسول یا فرشتے جو کچھ بھی چاہو انہیں کہہ لو۔ وہ کہیں کہ ہم نے

بائبل اور قرآن مجید میں اختلاف۔

لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط کے ساتھ نجات پانے والے ایک جماعت تھی

قدّرنا

قدّرنا کے الفاظ کہنے سے مراد "اندازہ" کرنا ہے۔

الغابر

نِ الْمُرْسَلُوْنَ ○ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ○

کے اتباع کے پاس آئے تو اس نے (انہیں) کہا (کہ) آپ (اس علاقہ میں) اجنبی (معلوم ہوتے) ہیں ۵۴

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ○

انہوں نے کہا (کہ ایسا) نہیں بلکہ ہم (تو) تمہارے پاس (ہی) آئے ہیں (اور) وہ چیز لے کر (آئے ہیں) جسکے متعلق یہ (لوگ) شک کرتے رہے ہیں ۵۵

اللہ تعالیٰ اور انسان کے لئے قدر کے لفظ کے استعمال میں فرق

فیصلہ کیا ہے پس حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ لغت میں ہے۔ جب خدا تعالیٰ کی نسبت یہ لفظ آتا ہے وہاں فیصلہ کرنے کے معنے ہوتے ہیں اور جب انسانوں کی نسبت آتا ہے۔ وہاں اندازہ یا قیاس کرنے کے معنے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے قول

منکرون

میں اس کے معنے اندازہ یا تخمین سے بات کرنے کے ہیں۔

بائبل کے بیان اور قرآن کریم کے بیان میں یہاں بھی اختلاف ہے۔ بائبل میں لکھا ہے "جب صبح ہوئی فرشتوں نے لوط سے تاکید کر کے کہا کہ اٹھ اپنی جورو اور اپنی دو بیٹیاں جو یہاں موجود ہیں لے" (پیدائش باب ۱۹ آیت ۱۵) اور پھر

حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کو کلنے کے متعلق قرآن مجید اور بائبل کا اختلاف

آیت ۱۶ میں بیان ہے کہ حضرت لوط نے کچھ دیر کی۔ تو انہوں نے "اس کا اور اسکی جورو کا اور اس کی دونوں بیٹیوں کا ہاتھ پکڑا۔ کیونکہ خداوند کی مہربانی اس پر ہوئی۔ اور اسے نکال کر شہر سے باہر پہنچا دیا۔" لیکن قرآن کریم فرماتا ہے کہ حضرت لوط کو پہلے ہی خبر دے دی گئی تھی کہ وہ ساتھ نہ جائے گی بلکہ پیچھے

مُرْسَلُوْن کے لفظ سے بھیجے ہوؤں کا انسان ہونا ثابت ہوتا ہے

رہ جائیگی چنانچہ فرماتا ہے۔ جب رسول حضرت لوط کے پاس آئے تو انہوں نے حضرت لوط سے کہا اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (عنکبوت ع ۴/۱۶) یعنے ہم تجھے اور تیرے اہل کو تو یہاں سے بچا کر لے جائینگے مگر تیری بیوی کو نہیں۔ وہ پیچھے رہنے والے گروہ میں ہوگی۔

قرآن مجید میں حضرت لوط کی بیوی کے پیچھے رہنے کا ذکر

اب ہر عقلمند خود سمجھ سکتا ہے کہ کونسا بیان عقل کے مطابق ہے کیا قرآن کریم کا جو کہتا ہے کہ وہ پیچھے ہی رہ گئی تھی یا بائبل کا جو کہتی ہے کہ فرشتوں نے پکڑ کر اسکی بیوی کو شہر سے باہر نکالا سوال یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس عورت نے تباہ ہونا ہے تو اسے پکڑ کر باہر نکالنے کے معنے کیا تھے جس کے متعلق تباہی کا فیصلہ تھا اسے فرشتوں نے نکالا کیوں کوئی آدمی باہر نکالتا تو کہہ سکتے تھے کہ اسے علم نہ تھا لیکن فرشتے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے خبر لے کر آئے تھے باوجود اس علم کے کہ اس عورت نے تباہ ہونا ہے اسے کیوں باہر نکالنے لگے۔

۵۴ حل لغات ۔ مُنْكَرُوْن ۔ انکر سے اسم مفعول مُنْكَرٌ بنتا ہے اور مُنْكَرُوْن اسکی جمع ہے انکرہٗ کے معنی ہیں جَهِلَهٗ اس کو نہ پہچانا ۔ اَنْكَرَ حَقَّهٗ کے معنی ہیں جَحَدَهٗ اس کے حق کا جان بوجھ کر انکار کر دیا ۔ اَنْكَرَ عَلَيْهِ فِعْلَهٗ عَابَهٗ وَنَهَاهُ اس کے فعل کو معیوب قرار دیا اور اس سے روکا۔ اَلْمُنْكَرُ کے معنی ہیں مَا لَيْسَ فِيْهِ رِضَى اللّٰهِ مِنْ قَوْلٍ اَوْ فِعْلٍ وَالْمَعْرُوْفُ ضِدُّهٗ منکر وہ فعل یا قول ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو اور لفظ معروف (پسندیدہ) اس کے مخالف معنے ادا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے (اقرب) پس اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ کے ایک معنی ہونے کہ آپ اس علاقہ میں انجان یا اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

تفسیر ۔ قرآن کریم انہیں پھر مُرْسَلُوْن کہہ کر ان کے انسان ہونے کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ بائبل کا عجیب حال ہے کہ کبھی انہیں مرد کہا ہے (پیدائش باب ۱۸ آیت ۲ و ۱۶) اور کبھی فرشتے (پیدائش باب ۱۹ آیت ۱) اور باوجود فرشتے کہنے کے لکھا ہے کہ حضرت لوط نے انکے لئے فطیری روٹی پکائی اور انہوں نے کھائی (پیدائش باب ۱۹ آیت ۳) فرشتوں کا فطیری روٹی کھانا ایک عجوبہ ہے اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ تورات میں بعد میں بہت کچھ رطب و یابس شامل کر دیا گیا ہے۔

۵۵ حل لغات ۔ يَمْتَرُوْن ۔ اِمْتَرٰى سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے اور اِمْتَرٰى فِي الشَّيْءِ کے

وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○ فَاَسْرِ

اور ہم تمہارے پاس یقینی خبر لائے ہیں۔ اور ہم یقیناً سچے ہیں ۵۶ سو تم رات کے آخری

بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ

حصہ میں (کسی وقت) اپنے گھر والوں کو لے کر (یہاں سے) چلے جاؤ۔ اور (خود) ان کے پیچھے (پیچھے) رہو

وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ

اور تم میں سے کوئی (ان کی طرف) التفات ظاہر نہ کرے اور جہاں (جانے) کا حکم تمہیں دیا جاتا ہے (سب وہاں)

تُؤْمَرُوْنَ ○ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ

چلے جاؤ ۵۷ اور یہ بات ہم نے اسے یقینی طور پر بتا دی ہے کہ ان

معنے ہیں شَكَّ فِيْهِ: کسی چیز میں شک کیا (اقرب) پس بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ کے معنے ہونگے کہ ہم تمہارے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس کے متعلق یہ لوگ شک کرتے رہے ہیں۔

تفسیر۔ حضرت لوطؑ نے جب کہا کہ آپ تو مسافر اور راہگیر معلوم ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا ہم راہگیر نہیں ہیں بلکہ ایک غرض کے لئے تیرے پاس آئے ہیں۔ اور اس چیز کی خبر لیکر آئے ہیں جس کے بارے میں یہ لوگ شک کرتے رہے ہیں یعنی عذاب کی خبر لے کر آئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کی خبر لوط کی قوم کو حضرت لوط کے ذریعہ سے ل چکی ہوئی تھی کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہ بتانے کے لئے آئے ہیں کہ اب عنقریب ان پر وہ عذاب آنے والا ہے جس میں یہ لوگ شک کرتے رہے ہیں۔ گویا عذاب کی خبر تو پہلے ہی اس قوم کو دی جا چکی تھی۔ اب یہ لوگ حضرت لوط کو صرف یہ بتلانے کے لئے آئے تھے کہ اب اس موعود عذاب کا وقت آگیا ہے۔ آپ یہاں سے ہمارے ساتھ چل پڑیں۔

۵۶ حل لغات بِالْحَقِّ۔ الحقّ کے معنی ہیں یقینی خبر۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورہ رعد ۱۵

امتری

تفسیر۔ چونکہ حضرت ابراہیم نے سوال کیا تھا۔ کہ تم مجھے کس بناء پر بشارت دیتے ہو وہ خود ہی اندازہ لگاتے ہیں کہ حضرت لوط کو بھی شک ہوگا۔ کہ یہ لوگ کون ہیں۔ اور کیوں آئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے آپ ہی بتا دیا۔ کہ ہم الحقّ کے ساتھ آئے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی وحی کے ساتھ اور پھر اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ کہہ کر زور دیا کہ ہم پر بدگمانی نہ کریں۔ ہم اس دعویٰ میں سچے ہیں۔

مرسلوں کا الحقّ کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ۔

۵۷ حل لغات۔ اَسْرِ بِاَهْلِكَ۔ اَسْرِ سَرَى سے باب افعال کا صیغہ امر ہے اور سَرَى الرَّجُلُ کے معنی ہیں سَرَى عَامَّةَ اللَّيْلِ رات کا اکثر حصہ چلا۔ اَسْرَى الرَّجُلُ اِسْرَاءً اِمِثْلُ سَرَى۔ اور اَسْرَى (باب افعال ثلاثی مزید) کے معنے سَرَى (ثلاثی مجرد) کے ہی ہیں۔ و قِيْلَ اَسْرَى لِاَوَّلِ اللَّيْلِ وَسَرَى لِاٰخِرِ اللَّيْلِ۔ اور بعض محققین لغت کہتے ہیں کہ اَسْرَى کا فعل رات کے ابتدائی حصہ میں چلنے کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور سَرَى کا فعل رات کے آخری حصہ میں چلنے پر۔ اَسْرَاهُ و اَسْرَى بِهٖ (متعدی) کے معنی ہیں۔ سَيَّرَهٗ بِاللَّيْلِ اَیْ سَيَّرَهٗ لَيْلًا یعنی اسے رات کو روانہ کیا۔ (اقرب)

اسر باهلك

حضرت لوط کی قوم کو عذاب کی خبر مرسلوں کے آنے سے پہلے مل چکی تھی

بالحق

قطع

قِطْعٌ مِّنَ الَّیْلِ :- قِطْعٌ کے معنی ہیں ظُلْمَۃُ آخِرِ اللَّیْلِ رات کے آخری حصہ کی تاریکی۔ وَقِیْلَ من اوّلِہٖ الیٰ ثُلُثِہٖ اور بعض کے نزدیک رات کے ابتدا سے لے کر رات کے تیسرے پہر کی تاریکی کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے (اقرب) اس اختلاف کے لحاظ سے اَسْرِ بِاَھْلِكَ کے معنے ہونگے کہ رات کے کسی حصہ میں یا ابتدائی یا آخری حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر چلو لیکن رات کے آخری حصہ میں جانا زیادہ قرینِ قیاس ہے کیونکہ اگلی آیت میں مُصْبِحِیْنَ کا لفظ استعمال ہُوا ہے۔ اس لحاظ سے معنے یہ ہونگے کہ رات کے آخری حصہ میں کسی وقت اپنے گھر والوں کو لے کر چلو۔ اگر اَسْرِ سے رات کے آخری حصہ میں چلنا مراد لیں۔ تو بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ اسکی تشریح ہوگی۔

حضرت لوطؑ کے ساتھ نکلنے والوں کے متعلق بائبل اور قرآن مجید میں اختلاف

بائبل میں حضرت لوطؑ کے ساتھ نکلنے والی صرف ان کی دو لڑکیاں بتائی گئی ہیں۔

تفسیر ان مرسلوں نے حضرت لوطؑ کو ان کے نکلنے کے متعلق تفصیلات سے اطلاع دی۔ اور بتایا کہ رات کے آخری حصہ میں یہاں سے نکلیں گو وضعِ لغت کے لحاظ سے اِسْرَاء رات کے کسی حصہ میں جانے کے متعلق بولا جاتا ہے لیکن بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ کو رات کے آخری حصہ میں نکلنے کو کہا گیا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں جب رات کا ایک حصہ باقی رہ گیا ہو تب نکلو۔ اس احتیاط میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ تا دشمن پیچھا نہ کر سکیں۔ کیونکہ جس وقت انہیں نکلنے کو کہا گیا ہے۔ اس کے معًا بعد عذاب آنے والا تھا۔ پس اگر ان لوگوں کو حضرت لوطؑ کے نکلنے کے کچھ دیر بعد پتہ بھی لگ جاتا۔ تو وہ پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔

اَدْبَارَھُمْ میں ھُمْ کی ضمیر بتاتی ہے کہ حضرت لوطؑ کے ساتھ ایک جماعت تھی۔

حضرت لوطؑ کو قافلہ کے پیچھے رہنے کے حکم کا مطلب

یہ جو کہا کہ تو ان سب کے پیچھے رہیو۔ اس میں رحم کا پہلو ہے کیونکہ عذاب سے اصلی حفاظت نبی کو حاصل ہوتی ہے جب تک حضرت لوطؑ عذاب سے محفوظ نہ ہوتے عذاب نہیں آسکتا تھا۔ پس انہوں نے ہدایت کی کہ قافلہ کی کامل حفاظت اسی میں ہے کہ آپ سب کے پیچھے رہیں۔ تا سارا قافلہ عذاب سے کلّی طور پر محفوظ ہو جائے۔

حضرت لوطؑ پر ایمان لانے والی ایک جماعت تھی۔

اس آیت سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ پر کچھ لوگ ایمان ضرور لائے تھے گو بائبل صرف یہ کہتی ہے کہ انکی دو لڑکیاں ان کے ساتھ نکلی تھیں اور کوئی نہیں (پیدائش باب ۱۹) مگر قرآن کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں فرماتا ہے وَاتَّبِعْ اَدْبَارَھُمْ نکلنے والے قافلہ کے پیچھے رہو۔ اور ھُمْ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو تین یا تین سے زیادہ مردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یا مردوں اور عورتوں کی مخلوط جماعت کے لئے استعمال ہو سکتا ہے کیونکہ جب مرد اور عورت اکٹھے ہوں۔ تو مذکر کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے لیکن اگر مرد تھے ہی نہیں جیسا کہ بائبل کہتی ہے تو وَاتَّبِعْ اَدْبَارَھُمَا چاہیئے تھا۔ یا اگر دو سے زیادہ عورتیں تھیں تو اَدْبَارَھُنَّ کہنا چاہیئے تھا لیکن صرف دو لڑکیوں کے لئے اَدْبَارَھُمْ کسی صورت میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ پس اس آیت سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت لوطؑ کے ساتھ نکلنے والے کچھ اور مرد تھے۔ اس وجہ سے عورتوں اور مردوں کے مخلوط قافلہ کو ھُمْ کی ضمیر سے یاد کیا گیا۔ گو بائبل میں نکلنے کا واقعہ جہاں بیان ہوا ہے وہاں صرف دو لڑکیوں کا ذکر ہے لیکن ایک اور جگہ سے بائبل سے بھی استدلال ہوتا ہے کہ بائبل کا یہ بیان غلط ہے۔ اور وہ اس طرح کہ بائبل میں جہاں ان مرسلوں کے آنے کا ذکر ہے وہاں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ان کے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ کیا اگر پچاس راستباز وہاں ہوں تو اس قوم کو انکی خاطر نہ بچائے گا اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ کہ اگر پچاس صادق ہوں تو میں انکی خاطر سارے شہر کو چھوڑ دوں گا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام تعداد کم کرتے گئے حتیٰ کہ آخر میں دس صادقوں کے ہونے پر بھی شہر کو بچا لینے کی درخواست کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اگر دس صادق بھی ہوں۔ تب بھی میں شہر کو بچا لُوں گا تب حضرت ابراہیم خاموش ہو گئے اور سمجھ لیا کہ دس صادق بھی اس شہر میں نہیں ہیں (پیدائش باب ۱۸ ۲۲ تا ۳۲) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو یہ معلوم تھا کہ کچھ لوگ حضرت لوطؑ پر ایمان لائے ہیں۔ ورنہ وہ یہ دُعا کیوں کرتے حضرت لوطؑ تھوڑے ہی فاصلہ پر رہتے تھے۔ اور یقیناً انکی

دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ○ وَجَآءَ

لوگوں کی جڑ صبح ہوتے (ہی) کاٹ دی جائے گی ۵۸ اور (ادھر)

خبریں حضرت ابراہیمؑ کو ملتی رہتی ہونگی۔ پس کیونکر ہو سکتا تھا کہ اگر ان کے علم میں کوئی بھی مومن نہ تھا تو وہ ایسی دعا کرتے ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اتنا معلوم تھا کہ مومنوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اسی لئے انہوں نے پچاس کے عدد سے دعا شروع کی۔ اور دس پر آکر چھوڑ دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سے کم مومن تھے۔ اور چونکہ تین یا تین سے زیادہ پر ھُمْ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے تین یا دو چار زیادہ مومن ہوں۔

اور یہ جو فرمایا کہ لَا يَلْتَفِتْ اَحَدٌ مِّنْكُمْ اس سے مراد پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ کفار کی طرف توجہ نہ کرو۔ اور انہیں ہلاک ہونے دو۔ ورنہ پیچھے مڑ کر دیکھنے میں کوئی خاص بات نہ تھی۔

بائبل میں لکھا ہے کہ انکی بیوی نے مڑ کر دیکھا اور وہ نمک کا کھمبا بن گئی۔ یہ کہ وہ نمک کا کھمبا بن گئی اسے تو میں یہود اور مسیحیوں کی عقل پر چھوڑتا ہوں۔ مگر یہ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کے رُو سے انکی بیوی ساتھ آئی ہی نہ تھی کیونکہ فرماتا ہے كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ وہ پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ پس قرآن کریم کے بیان کے رُو سے اس کے نمک کا کھمبا بن جانے یا کچھ اور بن جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس قسم کی لغویت سے قرآنی بیان کا پاک ہونا ثابت کرتا ہے کہ وہ خدائی کلام ہے۔ ورنہ کیا یہ عجیب بات نہیں۔ کہ تورات جو قریب کے زمانہ میں لکھی گئی وہ تو ایسے لغو قصہ کو بیان کرتی ہے مگر قرآن کریم اسے چھوڑ دیتا ہے۔

وَامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ سے میرے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت لوطؑ کو وہ لوگ یہ بتانے کے لئے آئے تھے کہ وہاں سے نکل کر وہ کہاں جائیں۔ اور اس کام میں مدد دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں الہام کرکے بھیجا تھا انکو سب نشان پتہ بتا کر معلوم ہوتا ہے وہ لوگ چلے گئے اور کہہ گئے کہ ہماری بتائی ہوئی جگہ پر آجانا۔ کیونکہ وہیں آپ کا آنا اللہ تعالےٰ نے آپ کے لئے مقدر کیا ہے۔

۵۸ حل لغات ۔ قَضَيْنَآ ۔ قضی سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور قَضٰى بَيْنَ الْخَصْمَيْنِ کے معنی ہیں حَكَمَ وَفَصَلَ۔ مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان جھگڑے کا فیصلہ کر دیا۔ قَضَى الشَّيْءَ قَضَآءً۔ صَنَعَهٗ بِاِحْكَامٍ وَقَدَّرَهٗ۔ کسی چیز کو عمدہ طور پر بنایا۔ اور اس کا صحیح اندازہ لگایا۔ قَضَى الْاَمْرَ عَلَيْهِ: خَتَمَهٗ وَاَوْجَبَهٗ وَاَلْزَمَهٗ بِهٖ۔ اس کے خلاف بات کو ختم کر دیا اور اس پر اس کو واجب کر دیا اور اس کا پورا کرنا اس کا فرض قرار دیا۔ الشَّيْءَ: اَعْلَمَهٗ وَبَيَّنَهٗ کسی معاملہ کا اعلان کیا اور اس کو کھول کر بیان کیا۔ قضی لَكَ الْاَمْرَ اَيْ حَكَمَ لَكَ کسی معاملہ کا تیرے حق میں فیصلہ کر دیا (اقرب) پس قَضَيْنَآ اِلَيْهِ کے معنے ہونگے کہ ہم نے یہ بات کھلے طور پر بتا دی۔

الدَّابِرُ ۔ کے معنی ہیں التَّابِعُ تابع۔ آخِرُ كُلِّ شَيْءٍ ہر چیز کا آخری حصہ۔ یقال قَطَعَ اللّٰهُ دَابِرَهُمْ اَيْ آخِرَ مَنْ تَبَقّٰى اور قَطَعَ اللّٰهُ دَابِرَهُمْ میں دابر آخر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی اللہ نے ان میں سے سب سے پیچھے رہنے والے کو بھی تباہ کر دیا۔ الْاَصْلُ جڑھ (اقرب) الغرض دابر سے مراد کبھی جڑھ ہوتی ہے یعنی بڑے لوگ کیونکہ وہ بطور جڑھ کے ہوتے ہیں اور باقی لوگ بطور فرع کے۔ اور کبھی دابر سے مراد ساری قوم ہوتی ہے اور یہاں پر سب قوم ہی مراد ہے کیونکہ صرف آل لوط کے بچائے جانے کی خبر ہے۔

تفسیر ۔ یہ آیت خدا تعالیٰ کا کلام معلوم ہوتی ہے ان مرسلوں کا قول نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گذشتہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کا کلام ہو۔ مگر یہ آیت ضرور اللہ تعالیٰ کا کلام ہے

قضینا ۱

الدابر ۲

لا یلتفت کہنے سے مراد کفار کی طرف توجہ نہ کرنا ہے ۳

حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق بائبل کا ایک عجیب بیان۔ ۴

اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ

اس شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے (اس کے پاس) آئے ۵۹ (جس پر) اس نے (ان سے) کہا (کہ) یہ لوگ

ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ○ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ○

یقیناً میرے مہمان ہیں۔ اس لئے تم (انہیں تکلیف دے کر) مجھے رسوا نہ کرو ۶۰ اور اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو اور مجھے ذلیل نہ کرو ۶۱

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ قَالَ

انہوں نے کہا اور کیا ہم نے تمہیں (بیرونی) لوگوں (کو اپنے پاس ٹھہرانے) سے روکا نہ تھا ۶۲ اس نے کہا (کہ)

جو معلوم ہوتا ہے۔ ان مرسلوں کی صداقت پر گواہی دینے کے لئے حضرت لوط پر نازل ہوا۔ اور انہیں بتایا گیا کہ ان لوگوں نے جو تم کو بتایا ہے کہ آج رات کے آخر پر عذاب آئے گا یہ درست ہے ہماری ہی بتائی ہوئی یہ خبر ہے۔ اور صبح کے وقت فور یہ قوم تباہ ہو جائے گی۔

دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ سے یہ مراد ہے ان کا آگا پیچھا کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

المدینہ[1]

۵۹ حل لغات۔ المدینۃ۔ مَدَنَ سے اسم ہے اور مَدَنَ بالمکانِ کے معنی ہیں اَقَامَ بِہٖ کسی جگہ ٹھہرا۔ اور المدینۃ کے معنی ہیں المصر الجامع بڑا شہر وقیل الحِصْنُ یُبْنٰی فِیْ اُصْطُمَّۃِ الْاَرْضِ۔ وہ قلعہ جو کھلی فراخ زمین میں بنایا جاوے۔ (گویا ارد گرد کے لئے مرکز کا کام دے) (اقرب)

تفسیر۔ اس بستی کو مدینہ کہہ کر پکارا گیا ہے معلوم ہوتا ہے اہم بستی تھی چنانچہ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر چند بستیوں کا مرکز تھا۔ یَسْتَبْشِرُوْنَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ وہ لوگ خوش ہوئے کہ اب حضرت لوط کو ملزم بنا سکیں گے اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ان مردوں سے بدکاری کرنے کی خواہش کی وجہ سے وہ خوش تھے۔ جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے کیا اس بستی میں مرد نہ ہوتے تھے کہ باہر سے آنے والوں کی خبر سنکر وہ خوش ہو گئے۔

تخزون[2]

حضرت لوط کی بستی کو مدینہ کہے جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہم بستی تھی

تفضحون[1]

۶۰ حل لغات۔ تَفْضَحُوْنِ:۔ فَضَحَ سے جمع مخاطب کے مضارع کا صیغہ ہے اور فَضَحَ کے معنے ہیں کَشَفَ مَسَاوِئَہٗ۔ اس کے عیوب کو ظاہر کیا۔ وَفِی الدُّعَاءِ لَا تَفْضَحْنَا بَیْنَ خَلْقِکَ اَیْ اُسْتُرْ عُیُوْبَنَا وَلَا تَکْشِفْھَا۔ اور دعائے مسنونہ میں جو فَضَحَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے معنی ہیں کہ اے خدا ہمارے عیوب پر پردہ پوشی کر اور ان کو ظاہر نہ کر (اقرب) پس فَلَا تَفْضَحُوْنِ کے معنے ہونگے تم میری کمزوریوں کو ظاہر کر کے مجھے رسوا نہ کرو۔

تفسیر۔ جب شہر کے لوگ حضرت لوط کے پاس پہنچے۔ تو حضرت لوط جن کو وہ لوگ باہر کے آدمی لا کر مہمان رکھنے سے منع کیا کرتے تھے سمجھ گئے کہ اب یہ قوم مجھے ملزم قرار دیگی۔ اور انہوں نے الگ ہو کر ان سے کہا۔ کہ اب تک میں مہمان لے آیا ہوں۔ اب تم مجھے مہمانوں کے سامنے ان کی ضیافت پر زجر کر کے نادم نہ کرو۔

۶۱ حل لغات۔ تُخْزُوْنِ:۔ اَخْزٰی سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَخْزَاہُ اِخْزَاءً کے معنے ہیں اَوْقَعَہٗ فِی الْخِزْیِ اَوِ الْخَزَایَۃِ وَاَھَانَہٗ۔ کہ اس کو ایسے معاملہ میں پھنسایا جس سے اُسے ندامت ہو اور اُسے رسوا و ذلیل کیا۔ (اقرب) فَلَا تُخْزُوْنِ کے معنے ہونگے کہ تم مجھے ذلیل نہ کرو۔

تفسیر۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یعنے مہمان نوازی ایک نیک فعل ہے اس پر اعتراض نہ کرو۔ اور مہمانوں کے سامنے مجھے ذلیل نہ کرو۔

۶۲ تفسیر۔ اس زمانہ میں ان بستیوں اور دوسری

هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ لَعَمْرُكَ

اگر تم نے (میرے خلاف) کچھ کرنا (ہی) ہو۔ تو یہ میری بیٹیاں (تم میں موجود ہی) ہیں ٦٣

حضرت لوطؑ کی قوم کا ان کو کسی مہمان کے پاس لانے سے روکنے کی وجہ

بستیوں میں کچھ جھگڑے تھے۔ اور وہ ڈرتے تھے کہ باہر کے آدمی آکر شہر پر حملہ نہ کروا دیں۔ اس لئے وہ لوگ حضرت لوط کو اجنبی مہمان لانے سے روکتے رہتے تھے مگر چونکہ علاقہ خطرناک تھا حضرت لوط کو جب اجنبی ملتے وہ انہیں اپنے گھر لے آتے تا رات کو وہ راستہ پر لُٹ نہ جائیں۔ اس دفعہ جو وہ مہمان لائے اس شہر والوں نے فیصلہ کیا کہ اب کے ضرور لوط (علیہ السلام) کی اچھی طرح خبر لینی چاہیئے اور چونکہ حضرت لوط کو کسی بہانہ سے بستی سے نکالنا چاہتے تھے وہ خوش بھی ہوئے کہ اب یہ قابو آگئے ہیں اب ہم ان کو یہاں سے چلے جانے پر مجبور کرسکیں گے ان کا یہ تردّد اس لئے تھا کہ حضرت لوط کی بیٹیاں وہاں بیاہی ہوئی تھیں اور اس وجہ سے وہ شہر کے ساکن تھے اور انہیں بلاوجہ نہیں نکالا جاسکتا تھا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ ان مردوں سے بدکاری کرنے کی نیت سے نہیں آئے تھے۔ اگر وہ اجنبیوں سے ایسے فعل کیا کرتے تھے۔ تو وہ یہ کہتے کہ جب ہم نے منع کیا ہوا ہے کہ اجنبی آدمی نہ لایا کرو۔ پھر تو کیوں اجنبیوں کو لایا۔ تب تو انہیں حضرت لُوط کے مہمان بُلانے پر خوش ہونا چاہیئے تھا۔ نیز یہ کیسی عقل کے خلاف بات ہے کہ پہلے تو کبھی انہوں نے مہمانوں سے ایسا فعل نہ کیا بلکہ صرف مہمان لانے سے روکتے رہے لیکن اس دن بدکاری پر تیار ہوگئے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ خیال بالکل خلافِ عقل ہے کہ وہ بدکاری کرنا چاہتے تھے۔ اور بائبل سے لیکر بعض مفسّرین نے نقل کردیا ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ شہر کے لوگ ان فرشتوں سے بدکاری کرنا چاہتے تھے (پیدائش باب ۱۹ آیت ۵) حالانکہ بائبل میں ایسی رطب و یابس باتیں بہت سی درج ہیں۔ اور اس کے بہت سے مضامین متضاد ہیں اس کے بیان کی جب تک قرآن کریم یا صحیح تاریخ یا عقل سے تائید نہ ہوتی ہو اعتبار کرنا سخت خطرناک ہے۔

٦٣ تفسیر۔ اس آیت کو اُوپر کے لغو خیال کی تائید میں دلیل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ دلیل دعویٰ سے بھی لچر ہے ایک طرف تو ان لوگوں کو مردوں سے بدکاری کا شائق قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ان مردوں سے بدکاری کرنے کے شوق میں آئے تھے۔ اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت لوط نے کہا کہ اگر بدکاری کا شوق ہے تو میری بیٹیاں حاضر ہیں اگر ان لوگوں کو عورتوں سے مباشرت کا شوق ہوتا۔ تو کیا ان کے گھر میں بیویاں نہ تھیں وہ اس طرح انکے پاس کیوں دوڑے آتے اور اگر وہ مردوں سے بدکاری کی نیت سے آئے تھے تو پھر حضرت لوط کے اس قول کے کیا معنے ہوئے کہ کچھ کرنا ہی ہے تو لڑکیوں سے بدکاری کرلو۔ کیا ایسے موقعہ پر کوئی معقول آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ حضرت لوط کا نبی کا مقام نظرانداز کردو۔ مگر ایک معقول آدمی کے مقام سے تو ایک کافر بھی انہیں نہیں گرائے گا۔

پھر یہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ حضرت لوط جو خدا کے نبی تھے۔ خود ان لوگوں کو ایک اور بدکاری کی جو پہلی سے کم نہیں تعلیم دیتے ہیں کیا کوئی عقلمند آدمی بھی اس بات کو باور کرسکتا ہے کہ عین اس وقت جبکہ بدکاریوں کی وجہ سے اس قوم پر عذاب آنے لگا تھا حضرت لوط ان کو ایک اور بدکاری کا مشورہ دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسے ہی کاموں کی وجہ سے عذاب آرہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کے فقط یہ معنے ہیں۔ کہ میری بیٹیاں تم میں بیاہی ہوئی ہیں اگر تم سمجھتے ہو کہ میں باہر سے آدمی تم کو نقصان پہنچانے کے لئے لایا ہوں تو تم میں میری بیٹیاں موجود ہیں۔ اگر میں کوئی شرارت کروں اور تم کو نقصان پہنچا کر یہاں سے بھاگ جاؤں تو تم انہیں دُکھ دے سکتے ہو آخر میں باپ ہوں۔ اس صورت کے ہوتے ہوئے میں تمہارے خلاف کس طرح کوئی قدم اُٹھا سکتا ہوں (دیکھو اس آیت کی

اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ فَاَخَذَتْهُمُ

(اے ہمارے نبی!) تیری زندگی کی قسم (کہ) یہ (تیرے مخالفین بھی) یقیناً (انہی کی طرح) اپنی بدمستی میں بہک رہے ہیں ۷۴؎ اسپر اُن

مزید تشریح کے لئے سورۃ ہود ع ۷ زیر ۷۹؎) بعض کہتے ہیں کہ بَنَاتِیْ سے مُراد حضرت لوط کے قول میں ان لوگوں کی بیویاں تھیں بوجہ نبی ہونے کے اور بڑی عمر والا ہونے کے وہ انکی بیویوں کو بیٹیاں کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اگر کچھ کرنا ہے تو اپنی بیویوں سے جو چاہو کرو۔ یہ معنے اس غلط خیال سے اچھے ہیں۔ مگر ان معنوں سے اس طرف ضرور اشارہ نکلتا ہے کہ وہ لوگ ان مردوں سے بدکاری کرنا چاہتے تھے۔ اور میں جیسا کہ ثابت کر چکا ہوں یہ قرآن کریم سے اور عقل سے ہرگز ثابت نہیں۔ پس یہ معنے گو نسبتاً اچھے ہیں لیکن قرآن کریم کے کامل مفہوم کو ظاہر نہیں کرتے۔ اس جگہ ایک لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے جو یہ ہے کہ اُردو دان لوگ اس آیت سے بہت دھوکا کھاتے ہیں کیونکہ اوباشوں کی زبان میں فاعل کا لفظ مباشرت کرنیوالے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور فاعلین کے لفظ سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مطلب تو واضح ہے۔ حالانکہ قرآن کریم عربی میں ہے نہ کہ اُردو میں۔ عربی میں ایسا کوئی محاورہ نہیں۔ دوسرے حضرت لوط تو نبی تھے۔ وہ اوباشوں کی زبان کیوں بولنے لگے یہ مضمون کسی قدر رکیک ہے۔ مگر چونکہ مجھے اردو دان طبقہ کو اس آیت کا مضمون سمجھانے میں مشکلات پیش آئی ہیں۔ اور اس محاورہ کو انہیں پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس لئے میں نے باوجود حیا کے اس کا بھی رد کر دیا ہے۔

آیت هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ کے متعلق عام لوگوں کا خیال کا رد۔

آیت هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ کا مطلب

غرض اس آیت کے معنے صرف اتنے ہیں کہ حضرت لوط نے اپنی بیاہی ہوئی بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ یہ تمہارے قبضہ میں ہیں پھر تم کو کیوں شک ہے کہ میں تم سے غداری کروں گا۔ پس اگر تم آج ضرور میرے خلاف کسی اقدام پر تلے ہوئے ہو تو میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں جو تمہاری تجویز سے (یعنے حضرت لوط کے مہمانوں کو ذلیل کر کے وہاں سے نکال دینے سے) بہت بہتر ہے۔ اور اس میں مہمانوں کی تذلیل کا گناہ بھی نہیں ہوتا۔ اور وہ یہ کہ میری بیٹیوں کی نگرانی رکھو۔ اور اگر میں تم کو نقصان پہنچاؤں تو ان کو تکلیف دے کر تم مجھے دُکھ دے سکتے ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ لڑکیوں کو دُکھ دینے کی تجویز ایک نبی کس طرح کر سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ان لوگوں کی تسلی کے لئے تھا۔ ورنہ حضرت لوط جانتے تھے کہ نہ میں ان سے غداری کروں گا۔ اور نہ لڑکیوں کو دُکھ دینے کا سوال پیدا ہو گا۔

لَعَمْرُكَ

۷۴؎ حل لغات۔ لَعَمْرُكَ۔ اَلْعَمْرُ کے معنے ہیں الحیاۃ۔ زندگی وقیل العَمْرُ دُوْنَ البقاءِ لِاَنَّهٗ اِسْمٌ لِمُدَّةِ عِمَارَةِ البدنِ بالحیاۃِ والبقاءُ ضِدُّ الفناءِ ولهذا يُوْصَفُ البَارِی بالبقاءِ وقلّما يُوْصَفُ بالعمرِ۔ بعض نے کہا ہے کہ عَمْرٌ کا لفظ بقاء کی نسبت کم زمانے کے لئے بولا جاتا ہے کیونکہ عَمْرٌ اس عرصے کو کہتے ہیں جب تک کہ انسانی جسم میں زندگی رہے اور بَقَاء کا لفظ فَنَاء کے مقابل پر استعمال ہوتا ہے اسی اختلاف کی بناء پر خدا تعالےٰ کے لئے لفظ بَقَاء تو استعمال کیا جاتا ہے لیکن عَمْرٌ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے شاذ ہی ہوتا ہے اَلْعَمْرُ ایضًا الدِّیْنُ۔ دین وَمِنْهُ لَعَمْرِیْ فِی القسمِ ای لَدِیْنِیْ اور لَعَمْرِیْ کا لفظ جو قسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے وہ انہی معنوں میں ہے یعنی مجھے اپنے دین کی قسم (اقرب) پس لَعَمْرُكَ کے معنی ہونگے (۱) تیری زندگی کی قسم (۲) تیرے دین کی قسم۔

تفسیر۔ بعض نے کہا ہے کہ زندگی کی قسم کھانا درست نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں کیوں قسم کھائی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بھی قسم کھانا درست نہیں۔ لیکن یہ تو اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور اللہ تعالےٰ نے تو دن کی اور رات کی اور صبح کی اور دوپہر کی

اور ہواؤں کی بھی قسم قرآن میں کھائی ہے۔ پھر زندگی کی قسم اسکے لئے کس طرح معیوب ہو گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ بندہ جسکی قسم کھاتا ہے اسکی عظمت کا اظہار کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جہاں قسم کھاتا ہے اس سے اس وجود کو جس کی قسم کھائی ہو بطور شہادت پیش کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے لئے کسی شے کی قسم کھانا معیوب نہیں۔ اس قسم کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں اس شے کو بطور دلیل پیش کرتا ہوں اور یہ قسم شہادت کی قسم ہوتی ہے۔ جو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے کیونکہ اسی کو طاقت حاصل ہے کہ کائنات میں سے کسی جزو کو بطور شہادت کے پیش کر سکے کہ یہ شہ اسکے اختیار میں ہے۔ انسان میں کہاں طاقت ہے کہ وہ ایسا دعویٰ کر سکے۔

دوسرا سوال اس آیت کے بارہ میں یہ ہے کہ یہ قسم کس کی عمر کی کھائی گئی ہے۔ آیا حضرت لوط کی عمر کی یا رسول کریم صلعم کی عمر کی۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت لوط کی عمر کی قسم کھائی گئی ہے اور ملائکہ نے کھائی ہے (کشاف جلد اول) اور حضرت ابن عباسؓ کا قول ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ یہ قسم رسول کریم صلعم کی عمر کی کھائی گئی ہے اور یہ فضیلت سوائے رسول کریم صلعم کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ (ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۳۲۹)

لعمرک میں آنحضرت کی عمر کی قسم کھائی گئی ہے۔

اسی آیت کی تفسیر کے نیچے ابن کثیر نزدیک قرآن کریم کی عبارت سے حضرت ابن عباس کے معنے زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں کیونکہ کشاف کے معنوں کے رو سے ایک قَالُوْا محذوف ماننا پڑتا ہے۔ اور محذوف اسی جگہ نکالا جاتا ہے جہاں سیاق و سباق دلالت کرتے ہوں اور دوسرے معنے نہ ہو سکتے ہوں لیکن نہ تو یہاں سیاق و سباق مجبور کرتے ہیں کہ اس قسم کو حضرت لوط کی نسبت مانا جائے اور نہ یہی درست ہے کہ اس جگہ دوسرے معنے نہیں ہو سکتے آنحضرت صلعم کو خطاب واضح ہے۔ اور اس پر کوئی اعتراض معناً یا لفظاً نہیں ہو سکتا۔ پس یہی درست ہے کہ اس جگہ رسول کریم صلعم کی عمر کی قسم کھائی گئی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپ کی عمر کے واقعات کو اوپر کے واقعہ کے لئے بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا مختلف اشیاء کی قسم کھانے کا مطلب۔

اصل بات یہ ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کا یہ قول بیان کیا گیا کہ دیکھو یہ میری لڑکیاں تم میں موجود ہیں۔ اگر میں تم سے کوئی دھوکہ کروں۔ تو تم ان کے ذریعہ سے مجھے سزا دے سکتے ہو۔ تو اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے ایک مشابہت بیان کی گئی تھی۔ اور وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تین بیٹیاں کفار میں بیاہی ہوئی تھیں۔ آپ کے دعویٰ کی وجہ سے انہیں تکلیف دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مشابہت کی طرف اس واقعہ کو بیان کر کے اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح حضرت لوط کی دو بیٹیاں کفار میں بیاہی ہوئی تھیں وہی حال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور چونکہ اس مشابہت کے ذکر سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو صدمہ پہنچنا لازمی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس بے انتہا محبت کی وجہ سے جو اسے اپنے رسول سے تھی آپ کے دل کو تسلی دی۔ اور آپ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور فرمایا کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اس واقعہ کو معلوم کر کے جو تیرے دل کو صدمہ پہنچا ہے اسے ہم جانتے ہیں اور اس میں تجھ سے ہمدردی رکھتے ہیں خصوصاً اس لئے کہ لوطؑ کے مخالف باوجود اس قدر گندہ ہونے کے انکی بیٹیوں کے ذریعہ سے انہیں دکھ نہ دیتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے کہ جب حضرت لوطؑ نے کہا کہ میری بیٹیاں تم میں موجود ہیں اگر میں غداری کروں تو تم ان کے ذریعے سے مجھے دکھ دے سکتے ہو۔ اور چونکہ کوئی باپ اپنی بیٹیوں کا دکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے سمجھ لو کہ کم سے کم ان کے خیال سے ہی میں تم کو دھوکہ نہ دوں گا۔ تو اس پر ان لوگوں نے یہ جواب دیا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ (ہود ع ۷) تجھ کو معلوم ہے کہ تیری لڑکیوں کو دکھ دینے کا ہمیں حق حاصل نہیں۔ ہمارے لئے خطرہ تو پیدا کرے اور دکھ ہم تیری لڑکیوں کو دیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جہاں لوط کے دشمنوں کا یہ حال تھا تیرے دشمن اپنی شرارت کے جوش میں اس قدر

حضرت لوطؑ کے ذکر کے بعد آنحضرت کی عمر کی قسم کھانے کا مطلب۔

آنحضرت کی صاحبزادیوں کو حضرت لوطؑ کی بیٹیوں سے مشابہت۔

الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ○ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا

(موعود) عذاب نے دن چڑھتے (ہی) انہیں پکڑ لیا ۷۵ جس پر ہم نے اس (بستی) کی اوپر والی سطح کو اس کی نچلی سطح

بڑھے ہوئے ہیں کہ تجھ کو تیری لڑکیوں کے ذریعہ سے دکھ دیتے ہیں۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم ابولہب کے کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں (اصابہ و اسد الغابہ) جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ تو اس ظالم نے اپنے لڑکوں کو عاق کرنے کی دھمکی دے کر انہیں طلاق دلوا دی۔ اس طرح آپ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ ابوالعاص سے بیاہی ہوئی تھیں جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ جانے لگیں۔ تو ظالموں نے انکی سواری کو پیٹا اور انہیں سواری سے گرا دیا۔ جس کے نتیجہ میں ان کا حمل ضائع ہو گیا۔ اور دیر تک بیمار رہیں (استیعاب جلد ۲ صفحہ ۵۳، مطبوعہ مطبع نظامیہ حیدرآباد دکن) سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ تجھے تیری لڑکیوں کے ذریعہ سے دکھ دے چکے ہیں اور پھر بھی دیں گے (حضرت زینبؓ کا واقعہ بعد میں ہوا) ان لوگوں نے لوط کے دشمنوں جتنی بھی شرافت نہیں دکھائی مگر ہمیں تیری جان ہی کی قسم یہ اپنی شرارت میں اندھے ہو رہے ہیں۔ اور اس دعویٰ کی تائید میں ہم تیری زندگی کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں یعنے تُو نے ان کو کوئی دکھ نہیں دیا۔ بلکہ ہمیشہ انکی خیر خواہی کی۔ مگر یہ بلاوجہ اور بغیر قصور کے تجھے دکھ دیتے ہیں پس یہی ثبوت ہے کہ یہ جوش مخالفت سے اندھے ہو رہے ہیں۔ اور ہرگز خدا تعالیٰ کا تقویٰ ان کو حاصل نہیں۔ پس جب انکی یہ حالت ہے کہ تجھ پر بلاوجہ اس قدر ظلم کر رہے ہیں۔ تو ہم نے لوط کے دشمنوں کو جب اس سے کم جرم پر تباہ کیا۔ تو کیا اس سے بڑے ظلم پر انہیں سزا نہ دیں گے۔ اس آیت کا تعلق سورۃ کے اصل مضمون سے یہ ہے۔ کہ یہ لوگ تجھ پر نازل ہونے والے کلام کو مشتبہ کرنے کے لئے ایسی گندی حرکات کرتے ہیں۔ گویا اپنے خیال میں یہ سمجھتے ہیں۔ کہ تیری لڑکیوں کو دکھ دیا تو تیرا جھوٹا

الصیحۃ

مشرقین

آنحضرت کی صاحبزادی حضرت زینب کو تکلیف دئے جانے کا واقعہ۔

پہلے مصبحین فرمایا اور یہاں مشرقین

ہونا ثابت ہو گیا۔ حالانکہ اصل میں انجام دیکھا جاتا ہے۔ ہم اپنے کلام کی عظمت دکھانے کے لئے اور اسے اعتراضوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک دن ان کو تباہ و برباد کر دیں گے اور تیرا بدلہ لے کر تیری عزت کو قائم کر دیں گے۔ اللّٰھم صلِّ علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ وبارك وسلّم انّك حمیدٌ مجید۔ فدت نفسی وروحی علیك یا محمد فقد اُوذیتَ کثیرًا فی اعلاء کلمۃ اللّٰہ رفعَ اللّٰہ شانكَ واَحیا ذکرَكَ اِلی اَبدالآباد۔

۷۵ حل لغات الصَّیْحَۃُ: اَلْعَذَابُ صیحہ کے معنی عذاب کے ہیں الغارۃُ اِذَا فُوْجِیَٔ الحیُّ بِھَا۔ ایسی غارت جو قبیلہ پر اچانک آ جائے۔

مُشْرِقِیْن: اَشْرَقَ سے اسم فاعل کا صیغہ مُشْرِقٌ آتا ہے اور مُشْرِقُوْن اس کی جمع ہے اور اَشْرَقَتِ الشَّمْسُ کے معنے ہیں طَلَعَتْ سورج نکل آیا۔ اَضَاءَتْ سورج کی روشنی پھیل گئی۔ وَقِیْلَ شَرَقَتِ الشَّمْسُ طَلَعَتْ وَاَشْرَقَتِ الشَّمْسُ اَضَاءَتْ وصَفَا شعاعُھَا۔ اور جب سورج کے لئے شَرَقَتْ (ثلاثی مجرد) کہیں۔ تو اس کے معنے ہونگے کہ سورج نکل آیا۔ اور جب اشرقت (ثلاثی مزید) استعمال کریں۔ تو اس کے معنی ہونگے کہ سورج کی روشنی خوب پھیل گئی۔ اَشْرَقَتِ الاَرْضُ: اَنَارَتْ بِاِشْرَاقِ الشَّمْسِ۔ سورج کے طلوع ہونے سے زمین پر روشنی پھیل گئی۔ اَشْرَقَ الرَّجُلُ۔ دَخَلَ فِیْ شُرُوْقِ الشَّمْسِ۔ اس پر طلوع آفتاب کا وقت آ گیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلے مُصْبِحِیْن فرمایا تھا۔ اب یہاں مُشْرِقِیْن فرمایا ہے۔ بظاہر یہ اختلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ مُشْرِق کے معنے ہیں جس پر سورج نکل آئے۔ اور مُصبح

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ اِنَّ فِيْ

کر دیا۔ اور ان پر سنگریزوں سے بنے ہوئے پتھروں کی بارش برسائی۔ ۵۶۶ اس (ذکر) میں

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ۝ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ

فراست سے کام لینے والوں کے لئے یقیناً کئی نشان (موجود) ہیں۔ ۵۶۷ اور وہ (کوئی گمنام جگہ نہیں بلکہ) ایک بڑے

کے معنے بظاہر طلوعِ آفتاب کے وقت میں داخل ہونے والے کے ہیں لیکن حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں کیونکہ صبح پو پھٹنے سے لے کر طلوعِ آفتاب تک کو بھی کہتے ہیں۔ اور اوّل النہار یعنے دن کے پہلے حصّہ کو بھی کہتے ہیں۔ پس دونوں لفظ درست ہیں۔ چونکہ سورج نکلتے وقت یہ واقعہ ہوا تھا (پیدائش باب ۱۹ ۲۳) اس لئے مصبحین کہنا بھی درست ہے اور مشرقین کہنا بھی۔

۵۶۶ حل لغات۔ اَمْطَرَ۔ مَطَرَ سے ثلاثی مزید ہے۔ اور اَمْطَرَتِ السماءُ کے معنے ہیں۔ مَطَرَتْ ای اصابتھم بالمطرِ یعنے برسا۔ وقیل مَطَرَ فی الخیرِ وَالرحمۃِ وَاَمْطَرَ فِی الشرِ والعذابِ اور بعض کہتے ہیں کہ مَطَرَ (ثلاثی مجرّد) خیر اور رحمت میں استعمال ہوتا ہے اور اَمْطَرَ (ثلاثی مزید) شر اور عذاب میں۔ (اقرب)

سِجِّيْل:۔ سجل سے ہے۔ اور سَجَلَ بِہٖ سجلاً کے معنے ہیں رمٰی بہ مِنْ فَوْق۔ اس کو اوپر سے پھینکا۔ سَجَلَ الْمَاءَ: صَبَّہٗ پانی کو گرایا۔ اور السجیل کے معنی ہیں حجارۃ کالمدر سنگریزے۔ وقیل معرّبۃٌ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ معرّب ہے (اقرب) (یعنی غیر زبان کا ہے۔ لیکن جیسا کہ رعد حل لغات ۱۹ زیر لفظ جہنم اور ابراہیم ۵۳۴ زیر لفظ صنم بتایا گیا ہے کہ جن الفاظ کا مادہ عربی میں استعمال ہوتا ہے ان کو معرّب کہنا درست نہیں۔ پس یہ بھی معرّب نہیں)

تفسیر۔ لوط کی قوم نے چونکہ اعلےٰ اخلاق چھوڑ کر ادنیٰ اخلاق اختیار کئے تھے۔ اس لئے خدا تعالےٰ نے بھی ان کے شہر کے اوپر کے حصّہ کو نیچے کر دیا اور کہا کہ جاؤ پھر نیچے ہی رہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ پتھر کیونکر گرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شدید زلزلہ سے بعض دفعہ زمین کا ٹکڑا اوپر اُٹھ کر پھر نیچے گرتا ہے۔ ایسا ہی اس وقت ہُوا۔ زمین جو پتھریلی تھی۔ اوپر اُٹھی اور پھر دھنس گئی اور اس طرح وہ پتھروں کے نیچے آگئے۔ یہ بھی مُراد ہو سکتی ہے۔ کہ اُن کے گھروں کی دیواریں اُن پر آ پڑیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ لوگ پتھروں سے مکان بنایا کرتے تھے۔ سجیل کہتے بھی ہیں اس پتھر کو جو گارہ سے ملا ہُوا ہو پس یہ ایسی دیواروں پر خوب چسپاں ہوتا ہے۔ جن میں پتھر گارہ سے لگائے گئے ہوں۔

مصبحین اور مشرقین میں کوئی اختلاف نہیں۔

لوط کی قوم پر سخت عذاب آنے کی وجہ

اَمطَر

۵۶۷ حل لغات۔ متوسمین:۔ تَوَسَّمَ سے اسم فاعل کا صیغہ مُتَوَسِّمٌ آتا ہے اور متوسمون اسکی جمع ہے اور توسم الشیءَ کے معنے ہیں تَخَيَّلَہٗ و تَفَرَّسَہٗ۔ اس پر غور کیا۔ سوچ کر اسکی حقیقت کو معلوم کیا طَلَبَ وسمہ:۔ ای علامتہٗ کسی چیز کی علامت دریافت کی۔ تَعَرَّفَہٗ۔ کسی چیز کو پہچاننے کی کوشش کی یقال تَوَسَّمْتُ فیہ الخیرَ:۔ ای تَبَيَّنْتُ فِیہ اثرہٗ۔ جب تَوَسَّمْتُ فِیہ الخیرَ کا محاورہ استعمال کریں تو معنے یہ ہونگے کہ میں نے خیر کے نشان اس میں پائے (اقرب) پس اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ کے معنے ہونگے کہ اس میں غور کرنے والوں کے لئے کئی نشان ہیں۔

متوسمین

تجسیل

تفسیر۔ یعنی جو لوگ فراست سے کام لیتے ہیں۔ اُنکے لئے اس واقعہ میں نشانات ہیں یعنے وہ دیکھ سکتے ہیں کہ

مُّقِيْمٍ ○ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَاِنْ

مستقل راستے پر (واقع) ہے ۵۶۸ اس (واقعہ) میں مومنوں (کے فائدہ) کے لئے یقیناً ایک نشان (موجود) ہے ۵۶۹ اور

كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ○ فَانْتَقَمْنَا

اَیکہ والے (بھی) یقیناً ظالم تھے ۵۷۰ اس لئے ہم نے انہیں (بھی) اسی طرح سخت

حضرت لوطؑ کے واقعہ سے آنحضرتؐ کے منکرین کو انتباہ

لوطؑ کے واقعہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے مشابہت ہے۔ پس آپ کے دشمنوں کو بھی اسی طرح تباہ کیا جائے گا۔ جس طرح حضرت لوطؑ کے دشمنوں کو تباہ کیا گیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو زلزلہ کا نشانہ تو نہ بننا پڑا۔ مگر بدر کی جنگ میں ان پر پتھر پڑے یعنی آندھی چلی اور کنکر اُڑ اُڑ کر کفار کی آنکھوں میں گھس گئے جنکی وجہ سے وہ نشانہ درست نہ لگا سکتے تھے۔

آنحضرتؐ کے زمانہ کے غدار کو لوطؑ کے زمانہ کے غدار سے مشابہت

نیز معنوی طور پر بھی یہ سلوک ان سے ہوا۔ کہ بڑے چھوٹے کردیئے گئے اور چھوٹے بڑے۔ گویا اوپر کا طبقہ نیچے آگیا اور نیچے کا اوپر۔ چنانچہ ابوجہل۔ عتبہ۔ شیبہ وغیرہ اور ان کے خاندان تباہ ہوگئے۔ اور ابوبکرؓ عمرؓ وغیرہ جو ان سے چھوٹے سمجھے جاتے تھے بادشاہ بن گئے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں اس قسم کا عجیب نظارہ نظر آتا ہے۔ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ تو عمائدین مکہ ملنے آئے۔ آپؓ نے غلام صحابہؓ کو صدر کے قریب جگہ دی اور ان کو پیچھے بٹھایا۔ انہوں نے باہر نکل کر شکایت کی کہ آج ہمیں ذلیل کیا گیا ہے۔ تو خود ان میں سے بعض نے کہا کہ یہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ جب ہمارے باپ دادے محمد رسول اللہ کی مخالفت کر رہے تھے تو یہ لوگ آپؐ پر ایمان لاکر قربانیاں کر رہے تھے۔ اب تو یہی عزت کے مستحق ہیں۔ (سیرت عمر۔ مصنفہ عبدالرحمٰن)

الایکہ

سبیل مقیم

۵۶۸ حل لغات۔ سبیل مقیم۔ سبیل مقیم ای واضحٌ بیّنٌ (تاج) یعنی واضح بیّن رستہ۔

اصحٰب الایکہ حضرت شعیبؑ کی قوم کا نام ہے۔

تفسیر۔ یعنی انکی بستیاں ایک ایسے راستہ پر واقع ہیں جو اب تک چلتا ہے مٹا نہیں۔ اس وجہ سے اے کفار تمہارے قافلے شام کو آتے جاتے عین اس کے پاس سے گذرتے ہیں۔ پھر تم عبرت نہیں حاصل کرتے۔ حضرت لوطؑ کی بستیاں عین اس راستہ پر واقعہ ہیں جو عرب سے شام کو جاتا ہے

۵۶۹ تفسیر۔ اس آیت میں مومنوں کے لئے اسے نشان قرار دیا ہے۔ جب کہ پہلی آیت کو متوسّمین کیلئے نشان قرار دیا تھا۔ یہ فرق اس لئے ہے کہ پہلی آیت میں یہ ذکر تھا۔ کہ اس واقعہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ سے مشابہت ہے چونکہ اس مشابہت کو ہر شخص نہیں معلوم کرسکتا۔ بلکہ خاص فراست والے معلوم کرسکتے ہیں کیونکہ باریک مضمون ہے اس لئے متوسّمین کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ وہ بستیاں ایک چلتے ہوئے راستہ پر ہیں۔ اور ایک تباہ شدہ بستی سے عبرت حاصل کرنا کوئی باریک مضمون نہیں بلکہ صرف دل کی خشیت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے فرمایا کہ اس سے مومن فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۵۷۰ حل لغات۔ اَلْاَيْكَةُ:۔ الایکۃ الشجر الکثیر الملتف وقیل الغیضۃ تُنْبِتُ السِّدْرَ والاَرَاكَ ونحوھما۔ الواحدُ ایکۃٌ۔ ایکہ آیک کی مفرد ہے اور اس کے معنے گھنے درخت کے ہوتے ہیں اور نیز ایسے جنگل کے جس میں بیری اور پیلو کے درخت بکثرت ہوں۔ (اقرب)

تفسیر۔ اصحاب الایکہ حضرت شعیبؑ کی قوم کا دوسرا نام ہے۔ ایکہ گھنے درخت کو بھی کہتے ہیں اور ایسے جنگل کو بھی جس میں بیری اور پیلو کے درخت بکثرت ہوں معلوم ہوتا ہے کہ مدین کے پاس کوئی گھنا جنگل تھا جس میں

ان دونوں قسموں کے درخت بکثرت پائے جاتے تھے۔ اس وجہ سے مدین کے باشندے اصحاب الایکہ بھی کہلاتے تھے اور غالباً یہ نام عربوں نے رکھا تھا۔ جن کے قافلے مصر اور شام کو جاتے ہوئے مدین کے پاس سے گذرتے تھے اور اسی جنگل میں سے اُن کا راستہ گذرتا تھا۔ اس لئے عربوں پر اتمام حجت کے لئے اسی نام کو جو ان میں زیادہ معروف تھا استعمال کیا۔

قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اصحاب ایکہ حضرت شعیب کی قوم تھی۔ چنانچہ سورۂ شعراء میں فرماتا ہے کَذَّبَ اَصْحَابُ الْاَیْکَۃِ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ قَالَ لَھُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (شعراء ع ۱۰/۱۴) یعنے اصحاب ایکہ نے بھی رسولوں کا انکار کیا۔ جبکہ ان سے شعیب نے کہا کہ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے۔ میں تمہاری طرف رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب الایکہ حضرت شعیب کی قوم تھی لیکن دوسری جگہ حضرت شعیب کو مدین کی طرف رسول بتایا گیا ہے جیسا کہ فرمایا وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (ہود ع ۸/۹ نیز اعراف ۱۱ و عنکبوت ۴) ہم نے مدین قوم کی طرف ان کے بھائی شعیب کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا شعیب نام کے دو نبی تھے یا حضرت شعیب دو قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ مدین والوں کی طرف بھی اور اصحاب ایکہ کی طرف بھی۔ میری تحقیق یہ ہے کہ ایک ہی نسل کے دو حصے تھے کچھ لوگوں کا گذارہ شہری تجارت پر تھا اور کچھ لوگوں کا دودھ گھی اُون فروخت کرنے پر گذارہ تھا۔ اور ایسے شہروں میں جو جنگل کے سروں پر ہوتے ہیں یہ بات کثرت سے دیکھی جاتی ہے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا واقع میں مدین کے پاس کوئی ایسا جنگل تھا جس میں بیری اور پیلو کے درخت پائے جاتے تھے کیونکہ ایسی بات قیاس سے نہیں بتائی جا سکتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں جغرافیوں سے اس کا پتہ ملتا ہے۔ چنانچہ مولوی سلیمان صاحب ندوی اپنی کتاب ارض القرآن میں برٹن کی کتاب گولڈ مائنز آف مدین کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ایک یونانی جغرافیہ نویس لکھتا ہے "خلیج عیلانہ (عقبہ) کے پیچھے جس کے چاروں طرف نبطی عرب رہتے ہیں (ارض مدین یہی ہے) بوتیانوس (بنو تیمن) کا ملک ہے جو وسیع، ورسطح ہے اور سیراب اور عمیق ہے۔ وہاں نباتات اور اشجار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جو تا بقد آدم ہوتے ہیں۔ اور جنکی وجہ سے جنگلی اونٹ، ہرنوں کے گلے اور بارہ سینگے رہتے ہیں۔ اور نیز مویشی اور بھیڑ کے گلے۔ مگر ان مواہب قسمت کے ساتھ شیر اور بھیڑیوں کا وجود بھی ہے۔ جن سے یہاں کے باشندوں کی خوش قسمتی مبدل بہ بدقسمتی ہے۔" اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مدین کے پاس (مدین خلیج عقبہ کے سرے پر واقعہ ہے) ایک جنگل تھا۔ جس میں (۱) قد آدم درخت تھے اور پیلو اور جنگلی بیر قد آدم ہی ہوتے ہیں (۲) وہاں جنگلی اونٹ رہتے تھے۔ یہ بھی پیلو اور بیر کے درختوں کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ اونٹ اسی قسم کے درختوں پر گذران کرتے ہیں (۳) اس میں مواشی اور بھیڑوں کے گلے رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین کی قوم جانور بھی پالتی تھی۔ اور اسی جنگل میں انہیں چرایا کرتے تھے۔

مدین نام اس شہر کا جو ایکہ کے سر پر تھا مدین قوم کی وجہ سے پڑا تھا۔ پس شہر کا نام بھی مدین تھا اور قوم کا نام بھی مدین تھا۔ چنانچہ قرآن کریم نے دونوں معنوں میں اس لفظ کو استعمال فرمایا ہے۔ قوم کے معنے میں سورۂ ہود میں ہے۔ وہاں فرماتا ہے وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (ہود ع ۸/۹ نیز اعراف ع ۱۱ و عنکبوت ع ۴) اور شہر کے معنوں میں توبہ میں فرماتا ہے وَاَصْحَابِ مَدْیَنَ وَالْمُؤْتَفِکَاتِ (توبہ ع ۹/۵) یعنی کیا انکو مدین شہر کے رہنے والوں اور اُن بستیوں کی خبر نہیں پہنچی جن کو اُلٹا دیا گیا تھا (یعنی قوم لوط کی بستیاں)

یہ مدین قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھی بائبل میں لکھا ہے۔ "اور ابراہیم نے ایک اور جورو کی جس کا

مدین کے باشندوں کو اصحاب الایکہ کہے جانے کی وجہ

حضرت شعیب کی قوم کے اصحاب الایکہ ہونے کا قرآن مجید سے ثبوت

مدین کے پاس جنگل کے ہونے کا ثبوت جغرافیہ سے

مدین والے اور اصحاب الایکہ ایک ہی نسل کے دو حصے تھے

مدین قوم کا نام بھی تھا اور شہر کا بھی

۱ مدین قوم حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھی۔

نام قتورہ تھا۔ اور اس سے زمران اور یقسان اور مدان اور مدیان اور اسباق اور سوخ پیدا ہوئے۔ اور یقسان سے صبا اور دوان پیدا ہوئے۔ اور ددان کے فرزند اسوری اور لطوسی اور لومی تھے۔ اور مدیان کے فرزند عیفہ اور عفر اور حنوک اور ابیداع اور الدعا تھے۔ اور یہ سب بنو قتورہ تھے (پیدائش ۲۵ب ۱تا۴)

۲ مدین قوم کا زمانہ

اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اور انکی بیوی قتورہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے چونکہ اس جگہ صرف یقسان اور مدیان کی اولاد گنائی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لڑکوں کی اولاد نہیں ہوئی یا انکی اولاد زیادہ نہیں پھیلی اور بھائیوں کی اولاد کے ساتھ مل جل گئی۔ یقسان جو بڑے لڑکے تھے انکی نسل میں سے ان کے لڑکے ددان کی نسل بھی ایک قبیلہ کی صورت میں مشہور ہے۔ اور یہ لوگ مدین یعنی چچا کی اولاد کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ چنانچہ مصنف ارض القرآن کا خیال ہے۔ کہ اصحاب الایکہ ددان قوم ہی کے لوگ تھے جو مدین کے ساتھ ہی ایکہ میں رہتے تھے۔ اور گویا بمنزلہ ایک ہی قوم کے تھے۔ میرے نزدیک یہ رائے معقول ہے۔ بشرطیکہ یہ سمجھا جائے کہ دونوں قومیں ملکر رہتی تھیں۔ اور ان کا ایک ہی قسم کا تمدن تھا۔ تجارت پیشہ بھی تھے اور جانوروں کے گلّے بھی پالتے تھے۔ یہ نہیں کہ ایک حصہ تجارت پیشہ تھا۔ جو مدین تھے اور ایک حصہ جانور پالنے والا تھا۔ جو ددان تھے اور جنگل میں رہتے تھے۔ کیونکہ یہ قرآن کریم کے بیان کے خلاف ہے۔ بہرحال اصل قوم بنو قتورہ تھی۔ جو ایک ماں اور باپ سے تھے باقی تو اندرونی تقسیمیں تھیں۔

۳ اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ کے ایک ہونے کا ثبوت قرآن سے

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر یہ قوم بنو اسمٰعیل کے اندر جذب ہو گئی تھی۔ کیونکہ پیدائش باب ۳۷ میں پہلے تو لکھا ہے کہ حضرت یوسف کو مدیانیوں نے فوطیفار کے پاس مصر میں فروخت کر دیا۔ اور پھر باب ۳۹ میں لکھا ہے کہ فوطیفار مصری نے یوسف کو اسمٰعیلیوں کے ہاتھ سے خریدا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے یہ قوم بنو اسمٰعیل میں جذب ہو گئی تھی۔ اور وہی قوم کبھی مدیانی کہلاتی تھی اور کبھی اسماعیلی۔

باقی رہے یہ سوال کہ یہ قوم کب ہوئی۔ اور شعیب کون تھے سو ان سوالات کے جواب مفسرین اور مؤرخین نے مختلف دیئے ہیں ان کے لئے دیکھو سورہ اعراف ع ۱۱/۱۸

یہ امر کہ اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی جماعت یا قوم تھے۔ اس امر سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے ان دونوں کے عیوب ایک ہی قسم کے گنائے ہیں۔ سورہ اعراف میں مدین قوم کی نسبت آتا ہے فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (اعراف ع ۱۱/۱۸) ماپ اور تول پورے دیا کرو۔ اور لوگوں کو چیزیں تول کر دیتے وقت کمی نہ کیا کرو اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ یعینہٖ یہی الفاظ اصحاب ایکہ کی نسبت ہیں۔ جن کا ذکر سورۂ شعراء میں آتا ہے انہیں مخاطب کرکے بھی حضرت شعیب فرماتے ہیں اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (شعراء ع ۱۰/۱۴) یعنی وزن پورا دیا کرو اور لوگوں کو گھاٹا نہ دیا کرو۔ اور سیدھی ڈنڈی سے تولا کرو اور لوگوں کی چیزیں کم تول کر نہ دیا کرو۔ اور زمین میں فساد نہ کیا کرو۔ ان دونوں حوالوں سے ظاہر ہے کہ اصحاب مدین یا اصحاب ایکہ میں ایک ہی قسم کی بدیاں تھیں اور ان کا بڑا گذارہ تجارت پر تھا اور اس میں وہ دھوکے فریب سے بہت کام لیتے تھے۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ مدین شہر میں تو مدین قوم رہتی تھی۔ اور ددان جنگل میں رہتے تھے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مدین قوم کا گذارہ تو تجارت پر تھا۔ اور اصحاب ایکہ کا گلّہ پالنے پر۔ تو اس صورت میں قرآن کریم نے جو اصحاب ایکہ کے کام بھی تجارت میں دھوکہ دینا اور باٹوں اور

مِنْهُمْ ۚ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝ۭ وَلَقَدْ كَذَّبَ ع ۵ وقف لازم ۵

سزا دی تھی ۔ اور یہ دونو (بستیاں) ایک (صاف اور) واضح رستہ پر (واقع) ہیں[۱۷۱] حجر والوں نے (بھی) یقیناً (ہمارے)

اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ۙ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا

پیغمبروں کو جھٹلایا تھا[۱۷۲] اور انہیں (بھی) ہم نے اپنے (ہر قسم کے) نشان دیئے تھے۔

پیمانوں میں شرارت کرنا بتایا ہے وہ غلط ہو جاتا ہے پس اصل بات یہ ہے کہ دونوں نام ایک ہی قوم اور ایک ہی تمدن رکھنے والی قوم کے ہیں۔ صرف دو صفات کی وجہ سے دو ناموں سے بنو قتورہ کو پکارا گیا ہے۔

۱۷۱ حل لغات۔ لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ۔ الامامُ الطریقُ الواسعُ۔ امام کے معنے کھلے راستہ کے ہیں وَبِه فُسِّرَ قوله تعالیٰ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ای بطریقٍ یُؤُمُّ ای یُقْصَدُ :۔ یعنے آیت اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ میں امام کے معنے کھلے راستہ کے کئے جاتے ہیں یعنی ایسا راستہ جس کا قصد کیا جاتا ہے وَقَالَ الفَرَّاءُ ای فی طریقٍ لَهُمْ یمرُّون علیهما فی اَسْفَارِهِمْ فجعل الطریقَ اماماً لانّه یُتَّبَعُ اور فراء نے اِمَامٍ مُّبِيْنٍ کے معنے کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ راستہ جس پر وہ اکثر اپنے سفروں میں گذرتے ہیں اور راستے کو امام اس لئے کہا کہ اس کے پیچھے چلا جاتا ہے یعنی جدھر وہ جاتا ہے ادھر ہی جانا پڑتا ہے (تاج)

تفسیر۔ اصحاب ایکہ یا اصحاب مدین کا مقام ایسا تھا کہ شام اور مصر کو جانے والے قافلے انکے پاس سے گذرتے تھے۔ اور مبین اس لئے فرمایا۔ کہ وہ راستہ بہت چلتا تھا۔ اور جو راستے بہت چلتے ہوں ان کے نشان واضح ہوتے ہیں۔ اس قوم کے ذکر سے اس امر کی ایک اور مثال پیش کی ہے کہ استراقِ سمع کرنے والے لوگ آخر تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔

قوم لوط کے متعلق فرمایا تھا۔ وہ ایک سَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ پر واقع ہیں۔ اور اس جگہ فرمایا ہے اصحاب ایکہ کا مقام ایک امام مبین پر واقع ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ لوط کی بستیوں کے پاس سے گذرنے والا راستہ ہمیشہ قائم رہے گا لیکن ایکہ والے راستہ کے نشانات تو باقی رہیں گے لیکن اس راستہ پر قافلوں کا گذر بند ہو جائے گا۔ چنانچہ واقعات نے اس کی تصدیق کر دی۔ پہلا راستہ تو اب تک جاری ہے دوسرے پر قافلے جانے بند ہو چکے ہیں۔

قوم لوط کے متعلق سبیل مقیم اور اصحاب الایکہ کے متعلق امام مبین کہنے کا مطلب

امام

۱۷۲ حل لغات۔ الحِجْرُ۔ الحِصْنُ حجر کے معنے ہیں قلعہ۔ نیز دیار ثمود کو بھی حجر کہتے ہیں (اقرب) الحَجْرُ والتَّحْجِيرُ اَنْ يُجْعَلَ حولَ المكانِ حجارةٌ۔ حجر اور تحجیر کے معنے مکان کے اردگرد پتھروں کی دیوار بنانے کے ہیں۔ وسُمِّيَ ما اُحِيْطَ به الحجارةُ حِجْرًا۔ اور جس جگہ کے گرد پتھروں کی دیوار ہو اسے بھی حجر کہتے ہیں (مفردات)۔

الحجر

اصحاب الایکہ کے اصحاب مدین مقام کا محل وقوع

تفسیر۔ یہ رکوع اور اگلی سورۃ النحل کا پہلا رکوع بہت سے اہم مطالب اور پیشگوئیوں پر مشتمل ہیں۔

حجر سے مراد وہ احاطہ یا قلعہ یا شہر ہوتا ہے جس کے گرد پتھروں کی دیوار ہو۔ اصحاب الحجر سے مراد ثمود قوم صالح کا شہر ہے۔ اسے حجر اس لئے کہتے تھے کہ مضبوط فصیلوں کا شہر تھا۔ اور جیسا کہ اگلی آیات سے ظاہر ہے پتھروں سے اسکی تعمیر میں بہت کام لیا گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوہ تبوک کو جاتے ہوئے اس مقام کے پاس سے گذرے تھے۔ آپ نے صحابہ کو وہاں کا پانی استعمال کرنے سے منع فرمایا کہ یہ بستی الٰہی عذاب کا مقام

اصحاب الحجر سے مراد۔

آنحضرتؐ کا غزوۂ تبوک کو جاتے ہوئے حجر کے مقام سے گذرنا

فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ

جس کا نتیجہ (اُلٹا) یہ ہوا کہ وہ ان سے روگرداں ہوگئے تھے ۸۲؂ اور وہ پہاڑوں کے بعض حصوں کو کاٹ کر

ہے (بخاری کتاب الانبیاء باب قوله تعالیٰ کذّب اصحاب الحجر)

آیت زیرِ تفسیر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اصحاب الحجر نے بھی رسولوں کو جھٹلایا حالانکہ انہوں نے صرف حضرت صالح کا انکار کیا تھا۔ اس طرزِ کلام کو سورۂ شعراء میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں فرماتا ہے کہ نوحؑ کی قوم نے رسولوں کا انکار کیا (ع ۶/۱۰) قوم عاد نے رسولوں کا انکار کیا (ع ۷/۱۱) قوم ثمود نے رسولوں کا انکار کیا (ع ۸/۱۲) قوم لوط نے رسولوں کا انکار کیا (ع ۹/۱۳) حالانکہ ان سب مقامات پر صرف ایک رسول کے انکار کا ذکر ہے اور حضرت نوحؑ سے پہلے تو کوئی بہت سے رسول گزرے بھی نہ تھے کہ ان کے انکار کا ذکر ہوتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نوحؑ اوّل الرسل تھے۔ (بخاری الجزء الثانی باب قول اللہ تعالیٰ اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ الخ) اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک رسول کے انکار پر کیوں سب رسولوں کے انکار کا الزام لگایا گیا ہے۔ اس کے متعلق علامہ ابو حیان مصنف تفسیر بحر محیط نے نہایت لطیف بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ ایک رسول کے انکار کرنے والوں نے گویا سارے رسولوں کا انکار کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان وہی نفع دیتا ہے جو سمجھ کر لایا گیا ہو پس جو شخص کسی ایک رسول کو پہچان کر اور سمجھ کر مانے گا وہ سب کو مان لے گا (جیسے وہ شخص جس نے خربوزہ یا آم کھایا ہو وہ جب کبھی خربوزہ یا آم دیکھے گا فوراً پہچان لے گا کہ یہ خربوزہ یا آم ہے۔ ایسا ہی جس شخص نے ایک نبی کو سمجھ کر مان لیا وہ یقیناً دوسرے نبیوں کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہ کرے گا) مگر جس نے کسی ایک رسول کا بھی انکار کیا۔ اس کے متعلق ہم نتیجہ نکال لیں گے کہ وہ خواہ کسی رسول کے وقت میں ہوتا اس کا بھی انکار کرتا۔ کیونکہ سب نبیوں کے حالات ایک سے ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ نہایت لطیف ہے اور زبردست سچائی پر مشتمل ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ فلاں قوم نے اگر فلاں نبی کا انکار کیا ہے۔ تو کیا ہوا۔ وہ پہلے بہت سے رسولوں کو مان رہے ہیں۔ کیا ان پر ایمان لانا انہیں نفع نہ دے گا۔ وہ حقیقتِ ایمان سے نا واقف ہیں کیونکہ ایسے لوگوں کا پہلے نبیوں پر ایمان محض رسمی ہوتا ہے۔ اگر وہ سمجھ کر پہلے رسولوں کو مان رہے ہوں تو جو شخص انہی کے نقشِ قدم پر آیا ہو اور انہی کے حالات میں سے گزر رہا ہو اس کا انکار کیوں کریں۔ پس ان کا ماننا ایمان کی وجہ سے نہیں بلکہ رسماً اور عادتاً ہے اور ایسے ایمان کو ایمان کہنا ظلم صریح ہے۔

ایک رسول کے انکار سے سب رسولوں کا انکار۔

ایک رسول کے انکار پر سب رسولوں کے انکار کا الزام لگانے کی وجہ

۸۲؂ حل لغات۔ مُعْرِضِيْنَ:۔ اَعْرَضَ سے اسم فاعل مُعْرِضٌ بنتا ہے اور مُعْرِضُوْنَ اس کی جمع ہے۔ اَعْرَضَ کے معنے ایک طرف ہونے کے ہیں۔ کیونکہ اَعْرَضَ عَرَضَ سے نکلا ہے جس کے معنی پہلو کے ہیں پس اعراض کے معنے پہلو تہی کے ہوئے۔ یہ دستور ہے کہ جب اعراض مقصود ہو انسان اس سے مُنہ پھیر لیتا ہے اور یہ ناراضگی کی علامت ہوتی ہے پس مُعْرِضِيْنَ کے معنے ہوئے کہ انہوں نے اس سے انکار کیا۔ انہوں نے مُنہ پھیر لیا اور توجہ نہ کی۔

اعراض

تفسیر۔ یعنے انہیں آیات الٰہی دکھائی گئیں۔ مگر انہوں نے اعراض کیا۔ پس کیونکر مانا جائے۔ کہ ویسی ہی آیات دیکھ کر دوسرے نبیوں کو وہ مان رہے ہیں یا مان سکتے ہیں۔

گذشتہ تین آیات میں تین قوموں کا ذکر

گزشتہ آیات میں تین قوموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ قوم لوط۔ قوم شعیب۔ اور قوم صالح۔ ان میں سے قوم صالح

الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ○ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ

ان سے مکان بنانے تھے ۸۴؎ پھر (وعید کے مطابق) صبح ہوتے (ہی)

پہلے تھی۔ پھر قوم لوط۔ پھر قوم شعیب۔ اب سوال یہ ہے کہ زمانہ کی ترتیب کو کیوں بدلا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ مکہ والوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ پہلے انبیاء جن کو تم جانتے ہو۔ ان پر نازل ہونے والے کلام کے منکر بھی ایک حد تک شرارتیں کرنے کے بعد ہلاک کر دئے گئے تھے۔ محمد رسول اللہ کے کلام کے انکار پر تم خوش نہ ہو اور یہ نہ خیال کرو کہ ہم غالب ہیں۔ اور اب تک ہماری شرارتوں کی سزا نہیں ملی۔ اپنے وقت پر تم کو بھی سزا ملے گی۔ جس طرح ان کو ملی۔ اس حجت کو پیش کرنے کا ایک طریق یہ بھی ہو سکتا تھا کہ زمانہ کے لحاظ سے واقعات کو پیش کیا جاتا۔ لیکن دوسرا طریق یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس فاصلہ کے لحاظ سے ان کا ذکر کیا جاتا جس پر یہ قومیں عربوں سے دُور یا نزدیک واقع تھیں۔ اور اس موقعہ پر یہی طریق اختیار کیا گیا ہے اور پہلے زیادہ دُور فاصلہ والی قوم یعنی قوم لوط کا ذکر کیا گیا ہے پھر کہا گیا ہے کہ لو ان سے بھی قریب تر ایک قوم گزری ہے یعنی قوم شعیب۔ ان کا بھی حال سن لو۔ پھر اسکے بعد ثمود کی تباہی کا بیان کیا۔ کہ لو یہ قوم قوم شعیب سے بھی تمہارے قریب تر ہے۔ اور خود عرب کے علاقہ میں واقعہ ہے۔ ان کے حالات سے ہی عبرت حاصل کرو۔

اس سورۃ میں ان قوموں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں تحریر کا رواج کم تھا۔ اور جن کو عرب مانتے تھے۔ حضرت آدم تو سب کے سانجھے ہیں۔ حضرت لوط حضرت ابراہیم کے رشتہ دار تھے۔ اور اسطرح عربوں کے اجداد میں سے تھے۔ حضرت شعیب بھی بنی قحطان میں سے تھے بنو ابراہیم تھے۔ اور بنو اسمٰعیل سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ اور انہی میں جذب ہو گئے تھے تو خالص عرب تھے۔

۸۴؎ حل لغات۔ ینحتون:۔ نَحَتَ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے اور نَحَتَ الحجرَ کے معنے ہیں۔ سَوَّاهُ وا صلحہٗ۔ پتھر کو کاٹ کر درست کیا اور ٹھیک کیا۔ وفی القرآن تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا ای تتخذون۔ اور قرآن مجید میں جو آیت تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ آئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم پہاڑوں میں گھر بناتے ہو اور نَحَتَ الْجبل کے معنے ہیں حَفَرَہٗ اس کو کھودا۔ (اقرب)

البیوت:۔ اس کا مفرد البَیْت ہے جس کے معنے ہیں۔ المسکن سواء کان من شَعَرٍ او مَدَرٍ یعنی بیت مسکن کو کہتے ہیں خواہ وہ بالوں سے یعنی اون کا بنا ہوا ہو جیسے خیمے وغیرہ ہوتے ہیں۔ یا کچی مٹی گارے وغیرہ کا بنا ہوا ہو یعنی کچا و پکا مکان۔ الشرف اور بیت شرف یعنی بلندی اور عزت کو بھی کہتے ہیں۔ الشریف اور شریف یعنی سردار قوم کو بھی بیت کہتے ہیں کیونکہ قوم اسکے سایہ تلے رہتی ہے اور وہ قوم کے لئے بطور حفاظت کے ہوتا ہے (اقرب) اس محاورہ کے استعمال کے متعلق چند نہایت لطیف اشعار ایک مجذوب کے تاریخ میں پڑھے ہیں کہتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی فوت ہوئے تو ایک مجذوب جو بغداد کے شہر میں رہتا تھا۔ ان کے جنازہ کے موقعہ پر دیکھا گیا اس نے بلند آواز سے انکی نعش کی طرف اشارہ کر کے یہ شعر پڑھے:۔

وا اسفا علیٰ فراقِ قومٍ هم المصابیحُ والحصونُ
والمُدْنُ والمُزْنُ والرّواسی والخیرُ والامنُ والسکونُ
لم تتغیّرْ لنا اللیالی حتّی توفّتهم المنونُ
فکلّ جمرٍ لنا قلوبٌ وکلّ ماءٍ لنا عیونُ

یعنی ہائے افسوس ان لوگوں کی جدائی پر روشن چراغ تھے اور قلعے تھے اور شہر تھے اور بادل تھے اور پہاڑ تھے اور امن تھے اور سکون تھے ہمارے لئے۔ زمانہ

قوم لوط و شعیب صالح کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے ان کے زمانی ترتیب کو بدلنے کی وجہ

البیت

سردار قوم کو بیت کہہ جانے کے متعلق چند لطیف اشعار

ینحتون

مُصْبِحِيْنَ ۝ۙ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

اس (موعود) عذاب نے انہیں پکڑ لیا [۵۷۵] اور جو (مال) وہ جمع کیا کرتے تھے اس نے انہیں (اس وقت

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ

کچھ بھی) فائدہ نہ دیا [۵۷۶] اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو حق (و حکمت)

اصحاب الحجر کے پہاڑوں کو کھودنے سے مراد [۱]

اس وقت تک نہیں بدلا جب تک موت نے انکو وفات نہیں دی۔ مگر اب تو یہ حال ہے کہ دل انگارا ہے تو آنکھیں پانی بہا رہی ہیں۔ اس آگ کے سوا ہمارے پاس کوئی آگ نہیں۔ اور اس پانی کے سوا کوئی پانی نہیں۔ ان اشعار میں نہایت لطیف طور پر بتایا گیا ہے کہ روحانی سردار قلعوں، اور شہروں، اور بادلوں اور پہاڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور دنیا گویا ان میں بستی ہے اور ان کے ذریعہ سے ان کی حفاظت ہوتی ہے۔

مُصْبِحِيْن

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ پہاڑوں کو کھود کھود کر مکانات بنایا کرتے تھے اور بڑے طاقتور تھے کوئی ان پر حملہ کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم بڑی متمدن اور متمول تھی کہ کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی کیونکہ یہ قوم دونوں علاقوں خشکی اور پہاڑی علاقوں میں رہتی تھی۔ اٰمِنِیْنَ کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ قوم ایسی طاقتور تھی کہ کچھ حصہ سال کا پہاڑوں پر سیر و تفریح کے لئے گزارتی تھی۔ مگر باوجود اس کے کسی کو ان کے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی اور ان کے پیچھے ملک میں امن رہتا تھا یا یہ کہ وہ امن کی حالت میں پہاڑ پر جاتے تھے کسی گھبراہٹ اور ڈر کی وجہ سے اور دشمن سے پناہ لینے کی غرض سے نہیں۔

اصحاب الحجر متمدن اور متمول قوم تھی [۲]

اَغْنٰی

يَكْسِبُوْن [۲]

پہاڑ کھود کر مکان بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے سوا اور قسم کے ان کے مکان نہ ہوتے تھے بلکہ اس سے خاص عمارتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ان کے تمدن کی ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے فنِ تعمیر میں ان کو خاص مہارت تھی اور انہوں نے بعض اپنی قومی عمارات پہاڑ کھود کر بنائی تھیں جیسے الیفنٹا کیوز بمبئی میں ہیں وہ بھی پہاڑ کھود کر بنائی گئی ہیں اور ہندو فنِ تعمیر کی مشہور یادگار ہیں یا ہر سے آنے والے سیاح ان کو دیکھنے جاتے ہیں۔ اسی قسم کی بعض عمارتیں فنِ تعمیر کے اظہار کے لئے معلوم ہوتا ہے اس قوم نے بھی بنائی تھیں۔

۵۷۵ حل لغات۔ مُصْبِحِيْنَ۔

اَصْبَحَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں دَخَلَ فِی الصَّبَاحِ وہ صبح میں داخل ہوا یعنی اس پر صبح کا وقت آیا۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ اَیْ وَهُمْ دَاخِلُوْنَ فِی الصَّبَاحِ۔ یعنی ان کو زلزلے نے صبح ہوتے ہی آپکڑا (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے انہیں صبح کے وقت عذاب نے آدبایا۔ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب زلزلہ کا تھا جیسے کہ سورۂ اعراف میں بیان فرمایا ہے فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (اعراف ع ۱۰/۱۲) ان کے انکار کی وجہ سے انہیں زلزلہ نے آپکڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے گھروں میں زمین پر گرے کے گرے رہ گئے یعنی مکانوں کے ملبے کے نیچے دب گئے اور کوئی ایسا بھی نہ رہا جو انکی لاشوں کو اندر سے نکالتا۔

۵۷۶ حل لغات۔ اَغْنٰی عَنْہُ:

تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ ابراہیم ۲۲ع

يَكْسِبُوْنَ۔ كَسَبَ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے تفصیل کے لئے دیکھو سورہ رعد ۴۲ع

تفسیر۔ یعنی وہ تو بڑے بڑے مکان اپنی حفاظت

اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ

کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے اور وہ (موعودہ) گھڑی یقیناً آنے والی ہے۔ اس لئے تو (انکی زیادتیوں پر)

الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ

مناسب درگذر سے کام لے ۵۷۷ یقیناً تیرا رب ہی بہت پیدا کرنے والا اور خوب

کے لئے بناتے تھے مگر ان کی یہ صفت ان کے لئے اس وقت اُلٹی پڑی کیونکہ جتنے بڑے مکان ہوں اتنا ہی زیادہ وہ زلزلہ میں نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نیچے دب جانے والے انسان کی نجات کی کوئی امید نہیں رہتی۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اے اہل مکہ تم سامان سامان کا شور مچا رہے ہو۔ یاد رکھو کہ جب ہمارا عذاب آتا ہے تو معذب قوم کے سامان ان کو فائدہ نہیں پہنچاتے بلکہ انکی ہلاکت کو اور زیادہ خطرناک بنا دیتے ہیں۔

۵۷۷ حل لغات۔ بِالْحَقِّ۔ الحق کے لئے دیکھو سورہ رعد ۱۵ ۵

اصفح :۔ صَفَحَ سے امر کا صیغہ ہے اور صَفَحَ عَنْہُ صَفْحًا کے معنے ہیں اَعْرَضَ عَنْہُ وَ تَرَکَہٗ وحقیقتہٗ وَلَّاہُ صَفْحَۃَ وَجْہِہٖ۔ اس سے اعراض کیا اور اس کو چھوڑ دیا۔ اور صَفَحَ کے اصل معنے یہ ہیں۔ کہ اس سے اپنے مُنہ کو ایک طرف کر لیا۔ یعنی اسکی طرف توجہ نہ کی۔ صَدَّ عَنْہُ اس سے رک گیا۔ اَعْرَضَ عَنْ ذَنْبِہٖ اس کے گناہوں سے درگذر کیا اور اسے معاف کیا۔ صَفَحَ النَّاسَ۔ نَظَرَ فِی اَحْوَالِھِمْ۔ لوگوں کے حالات کو بغور دیکھا۔ صَفَحَ فِی الْاَمْرِ نَظَرَ فِیْہِ۔ کسی معاملہ میں غور و فکر کیا۔ الصَّفْحُ :۔ صَفَحَ کا مصدر ہے نیز اس کے معنے ہیں الجانبُ۔ طرف صَفْحٌ مِنَ الْاِنْسَانِ: جَنْبُہٗ انسان کا پہلو۔ (اقرب) پس فَاصْفَحِ الصَّفْحَ کے معنے یہ ہوئے کہ (۱) ان سے مُنہ پھیر لے۔ یعنی اب اتمام حجت ہو چکی ہے اس لئے اب منکروں سے بحث و مباحثہ بند کر دو (۲) ان لوگوں سے زیادہ تعلق نہ رکھو (۳) ان کے گناہوں سے اعراض کرو۔ یہ معنے یہاں مراد نہیں (۴) انکی حالت پر اچھی طرح غور کرو۔ اور حالات کا بغور مطالعہ کرو۔ اور دیکھو کہ کیا سے کیا ہو رہا ہے (۵) ان کے امور اور حالات کی طرف دیکھو کہ کس طرح گمراہی کی طرف جا رہے ہیں۔

الجمیل :۔ جَمُلَ سے صفت مشبہ ہے اور جَمُلَ الرَّجُلُ۔ یَجْمُلُ جَمَالًا کے معنے ہیں۔ حَسُنَ خَلْقًا وَخُلُقًا۔ کہ ظاہر و باطن کے لحاظ سے اچھا ہو گیا (اقرب) پس فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ کے معنے ہونگے کہ ایسا درگذر کرو جو ہر رنگ میں اچھا ہو۔

تفسیر۔ یعنے آسمان و زمین کی پیدائش پر غور تو کرو کیا وہ بلا مقصد نظر آتی ہے۔ اس کارخانہ پر نظر ڈالنے سے ہر اک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اس قدر بڑا نظام کس غرض سے ہے اور اس سے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ساعۃ ضرور آنے والی ہے۔ ساعۃ کا لفظ قیامت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس موعود گھڑی کے لئے بھی جو انبیاء کے دشمنوں کی تباہی اور ان کے ماننے والوں کی ترقی کے لئے مقرر ہوتی ہے۔ آیت کا پہلا حصہ دونوں ساعتوں کے لئے بطور دلیل ہے۔ زمین و آسمان کی پیدائش قیامت کی بھی دلیل ہے اور نبیوں کی کامیابی اور ان کے دشمنوں کی تباہی کی بھی۔

قیامت کی اس طرح کہ اگر انسان کی زندگی صرف اس دُنیا تک ختم ہو جاتی ہے۔ تو گویا اس قدر بڑی دُنیا اللہ تعالیٰ نے صرف اس لئے پیدا کی ہے کہ انسان اس میں پیدا ہو کچھ دن کھائے پیئے اور پھر مر جائے۔ اور یہ خیال بالکل خلافِ عقل

(حاشیہ)

۱ اصحاب الحجر کے اپنے بنائے ہوئے سامانوں سے تباہ کئے جانے کے ذکر کا مطلب

۲ الجمیل

۳ اصفح

۴ لفظ ساعۃ اور اس کا استعمال

پیدائش دنیا کی غرض

ہے۔ اس قدر بڑے نظام کا پیدا کرنا ایک بہت بڑی غرض کے لئے ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ غرض پوری ہوتی اس دُنیا میں نظر نہیں آتی۔ پس ضرور ہے کہ انسان کی زندگی اسی دنیوی حیات تک ختم نہ ہو۔ بلکہ اس نظام کی عظمت کے مطابق ایک بڑے زمانہ تک چلی جائے جس میں وہ ایک ایسے اعلیٰ مقام کو پالے جو اس نظام کی عظمت کے مطابق ہو۔

پیدائش دنیا قیامت کی دلیل ہے

اگر غور کیا جائے تو سارا نظام تو الگ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے چھوٹی سے چھوٹی چیز میں ہی ایسے اسرار رکھے ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ انسانی جسم کو ہی لے لو۔ اس کا نظام کیسا پیچیدہ ہے۔ ہزاروں لاکھوں اطباء اور علم تشریح کے ماہر اسکی حقیقت کے معلوم کرنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن اب تک ان امور کا احاطہ نہیں کر سکے جو جسم انسانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ قرآن کریم کے نزول کے زمانہ کے بعد تو یورپ نے سائنس میں بے انتہا کمال حاصل کیا ہے۔ مگر اب تک انسانی جسم کے متعلق پورا احاطہ نہیں کر سکا۔ پھر اس قدر وسیع قوانین پر جس وجود کی بنیاد رکھی گئی ہے اسکی پیدائش کے مقصد کو اس قدر حقیر بتانا جیسا کہ قیامت کے مُنکر بتاتے ہیں کس طرح معقول سمجھا جا سکتا ہے۔

٢ اس سورت کا مکی ہونا زیادہ درست ہے

٢ صفح الصفح الجمیل کا مطلب

اسی طرح یہ نظام انبیاء کی کامیابی اور ان کے دشمنوں کی تباہی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ زمین کو آسمان سے جُدا کر دو۔ پھر اسکی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ پس جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ روحانی آسمان سے قطع تعلق کر کے بچ رہیں گے کیسے اندھے ہیں۔ جس طرح اس نظامِ کامل کا جزو رہتے ہوئے ہی زمین محفوظ رہ سکتی ہے اسی طرح روحانی نظام کا جزو بننے سے ہی انسان ہلاکت سے بچ سکتا ہے ورنہ اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ اس نظام پر حملہ آور ہو۔ تو اسکی نجات قطعاً ناممکن ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنکروں کو بتایا گیا ہے کہ آسمانِ روحانی سے قطع تعلق کر لینے کی وجہ سے ان کے سامان کسی کام بھی نہ آئیں گے۔ بلکہ اب انکی تباہی اور

٢ صفح کے ساتھ جمیل کا لفظ لگانے کی وجہ

مسلمانوں کی ترقی کا وقت آن پہنچا ہے۔

اس آیت میں کس زور شور سے کفار کی تباہی کی خبر دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ اب وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے۔ اس کے بعد جس طرح جلد جلد حالات بدلے اور کفار مکہ کی تباہی کے سامان پیدا ہوئے۔ وہ ایک ایسا نشان ہے کہ کسی الٰہی سلسلہ میں بھی اس سے پہلے اسکی نظیر نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ تباہی آسمانِ روحانی کے سب سے بڑے ستارے بلکہ سورج کی مخالفت اور اس سے قطع تعلق کے نتیجہ میں ظاہر ہوئی۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سورۃ مکی زندگی کے آخر میں نازل ہوئی زیادہ درست ہے کم سے کم یہ آیات تو معلوم ہوتا ہے ضرور مکی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ ان میں مکہ والوں کی تباہی پر خاص زور ہے اور اسے بہت قریب بتایا گیا ہے۔ سورہ نحل کا پہلا رکوع بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ فرمایا ہے کہ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب انکی تباہی کا وقت قریب آگیا ہے اس لئے اب ان سے بحث مباحثہ بند کرو اور انکی طرف توجہ ہی نہ کرو۔ کیونکہ اب بحث مباحثہ کا وقت گذر گیا۔ اب انکی تباہی کا فیصلہ آسمان سے اُتر چکا ہے اب تو یہ عذاب کے بعد ہی مانیں گے تو مانیں گے۔

جمیل کے لفظ سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان سے اعراض کرنے کے یہ معنے نہیں۔ کہ جو کوئی توجہ کرے اسکی طرف بھی توجہ نہ کرو۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ اگر کوئی خود توجہ کرے تو بیشک اسے سمجھاؤ لیکن عام بحث مباحثہ اب بند کر دو کیونکہ حجت تمام ہو چکی اور انہوں نے آسمانی دلائل سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ بیشک صفح کے معنے معاف کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ مگر اس جگہ وہ معنے مراد نہیں۔ بلکہ صَفَحَ النَّاسَ نظر فی احوالہم والے معنے مُراد ہیں۔ یعنے اب ان کا حال دیکھنے

الْعَلِيْمُ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ

جاننے والا ہے ۸۷ اور ہم نے یقیناً تجھے دُھرائی جانے والی سات (آیات) اور (بہت بڑی) عظمت والا

جاؤ اور دیکھو کہ کچھ دن میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ نیز صَفح کے معنے رُک جانے کے بھی ہیں۔ یہ معنے بھی اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب وہی ہے جو میں اوپر بتا آیا ہوں کہ اب ان سے عام بحث مباحثہ ترک کر دو۔ یہ صورت ہر نبی کے وقت میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک وقت تک اُسے بحث مباحثہ کی اجازت ہوتی ہے۔ مگر حجت تمام ہو چکنے کے بعد اُسے بحث مباحثہ سے روک دیا جاتا ہے۔ اور آئمۃ الکفر کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا ارشاد ہو جاتا ہے۔

۸۷ حل لغات

الخَلّاق کے معنی ہیں بہت پیدا کرنے والا۔ یہ لفظ خالق کا مبالغہ ہے۔

العلیم۔ بہت جاننے والا۔

تفسیر۔ خلّاق کے لفظ سے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم کسی قوم کو تباہ کرتے وقت ڈرا نہیں کرتے کیونکہ ہم خلّاق ہیں یعنی بہت پیدا کرنے والے ہیں تباہ کرنے سے ڈر تو اس کو ہو جو پھر پیدا نہ کر سکے مگر ہم تو خلّاق ہیں ہر مفسد قوم کو ہلاک کر کے اسکی جگہ دوسری قوم کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور ہماری بادشاہت میں کوئی کمی نہیں آتی اس جگہ اس قسم کا مضمون بیان کیا گیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے متعلق سورۂ دخان میں بیان کیا گیا ہے وہاں فرعونوں کی تباہی بیان کر کے فرماتا ہے کہ کَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (دخان ع ۱/۲) یعنے اے موسیٰ دیکھ ہم نے کس طرح اس قوم کو تباہ کر دیا۔ اور انکی جگہ وہی عزت ایک اور قوم کو (یعنی خود موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو) دے دی اور انکی تباہی پر آسمان نہ رویا۔ اور نہ زمین روئی یعنے نہ خدا تعالیٰ کی بادشاہی میں کوئی کمی آئی کہ اہل آسمان کو اس پر رنج ہوتا۔ اور نہ اہل زمین کو انکی تباہی سے کوئی نقصان پہنچا۔ نہ انہوں نے انکی تباہی پر افسوس کیا کیونکہ انبیاء کے مخالف ہمیشہ ظالم ہوتے ہیں۔ انکی تباہی کے بعد باقی دُنیا افسوس نہیں کرتی بلکہ امن کا سانس لیتی ہے۔

اور علیم کا لفظ جو آخر میں رکھا ہے۔ اس میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی تباہی کے بعد دُنیا میں جو ایک نیا نظام قائم ہوگا اسے ہم جانتے ہیں۔ وہ ایسا اعلیٰ درجہ کا نظام ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے ان لوگوں کی تباہی اور دوسری قوم کے پیدا کرنے پر رنج نہیں خوشی ہونی چاہیئے۔

قرآن کریم کا کتنا کمال ہے۔ ایک مختصر لفظ سے کس قدر وسیع مطالب بیان کر دیئے ہیں۔ اور مسلمانوں کی حکومت کے اعلیٰ نظام کی طرف کس خوبی سے اشارہ کیا ہے قرآنی مطالب کی ترتیب بھی کیسی اعلیٰ ہے۔ شروع سورۃ میں فرمایا تھا ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (حجر ع ۱/۱) ان کو چھوڑ دے کہ کھائیں۔ دنیوی فائدے اُٹھائیں۔ اور لمبی لمبی امیدوں میں پڑے رہیں یہ عنقریب جان لیں گے کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اب اگر فرمایا تو اب وہ گھڑی آ ہی پہنچی۔ اور ان کے کھانے پینے اور بڑی بڑی امیدیں رکھنے کا زمانہ ختم ہو گیا یہ مضمون کا تنزل ایسا ہی ہے۔ جیسے کہ آبشار کا پانی جب گرنے کے مقام پر آتا ہے۔ تو یکدم اس میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ۔ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ترقی کے ظاہری سامان کہاں سے پیدا ہوں گے ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ خلّاق ہے۔ جب وہ وقت آ جائے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ان لوگوں کی تباہی اور مسلمانوں کی ترقی کا فیصلہ کرے گی۔ تو اللہ تعالیٰ جو خلّاق ہے۔ خود ہی سب سامان پیدا کر دے گا۔ چنانچہ اس پیشگوئی

[1] اس آیت میں صفح سے ترک مباحثات کیطرف اشارہ ہے

[1] الخلّاق

[1] لفظ خلّاق اور علیم سے کفار کی تباہی اور مسلمانوں کی حکومت کا ذکر

[2] ایک اعتراض کا جواب

الْعَظِيْمَ ○ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا

قرآن دیا ہے ۷۹ اور وہ جو ہم نے ان میں سے کئی گروہوں کو عارضی نفع کا سامان دیا ہے اسکی طرف آنکھیں

بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ

پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھ اور ان (کی تباہی) پر غم نہ کھا۔ اور مومنوں پر اپنا

کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے چند لوگوں کے دلوں میں ع کی رغبت پیدا کی۔ جب وہ حج کے لئے آئے تو انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سُنا اور آپؐ سے ملے پھر جا کر اپنی قوم کو سارا حال سُنایا۔ اور وہاں سے ایک وفد آگیا جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ مکہ چھوڑ کر ہمارے شہر میں چلے آئیں۔ اور آپؐ نے خدا تعالیٰ کے اذن سے ان کی اس درخواست کو قبول کر لیا۔ اور چند دن کے اندر اندر وہ جو مکہ میں کوئی سر چھپانے کی جگہ نہ پاتے تھے۔ ایک زبردست حکومت کے بانی ہو گئے اور وہ دنیوی سامان بھی پیدا ہو گئے۔ جن کے نہ ہونے کی وجہ سے اہل مکہ اپنی فتح یقینی سمجھتے تھے۔ اور وہ اس تغیر عظیم کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔

آنحضرتؐ کی ترقی کی ابتداء اور انتہا

المثانی

۷۹ حل لغات ۔ المثانی کے معنے ہیں آيَاتُ الْقُرْاٰنِ ۔ قرآن مجید کی آیات۔ مِنَ الْوَادِي مَعَاطِفُ یعنی مثانی الوادی۔ وادی کے موڑوں کو کہتے ہیں مَثْنَى الْاَيَادِي کے معنے ہیں۔ اِعَادَةُ الْمَعْرُوْفِ مَرَّتَيْنِ فَاَكْثَرَ یعنی بار بار احسان کرنے کو مَثْنَى الْاَيَادِي کہتے ہیں۔ اس میں دو کی شرط نہیں۔ بلکہ دو یا دو سے زیادہ مرتبہ احسان ہو۔ مَثَانِي الشَّيْءِ ۔ قُوَاهُ وَطَاقَاتُهُ ۔ مَثَانِي الشَّيْءِ سے مُراد اسکی قوتیں ہیں (اقرب)

سبع مثانی کے متعلق مختلف صحابہ اور علماء کا خیال

حضرت عمرؓ علیؓ ابن مسعودؓ۔ ابن عباسؓ اور علماء کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ سَبْعَ مَثَانِي سے مراد اس جگہ سورہ فاتحہ ہے۔ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهَا (اَيِ الْفَاتِحَةُ) اَلسَّبْعُ الْمَثَانِي وَاُمُّ الْقُرْاٰنِ وَفَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَسُمِّيَتْ بِذَالِكَ لِاَنَّهَا تُثَنّٰى فِي كُلِّ رَكْعَةٍ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ سبع مثانی ہے اور امّ القرآن اور فاتحۃ الکتاب بھی اسے اس لئے مثانی کہتے ہیں کہ یہ ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے قِيْلَ لِاَنَّهَا يُثْنٰى بِهَا عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى ۔ کہ اس کو مثانی اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے خدا کی ثنا کی جاتی ہے۔ ان معنوں کو زجاج نحوی نے جائز قرار دیا ہے لیکن ابن عطیہ نے قواعد صرف کے خلاف قرار دیا ہے۔ علامہ ابو حیان لکھتے ہیں کہ یہ اعتراض درست نہیں۔ کیونکہ مَثَانِي مَثْنٰى کی بھی جمع ہے جو اثنیٰ رباعی سے مُفْعَل کے وزن پر ہے اور اسکے معنے ثنا کے ہیں۔ یعنے جس میں اللہ تعالیٰ کی ثنا کا مضمون اچھی طرح بیان کیا گیا ہے۔ ان معنوں کے رو سے آیت کے معنے ہوئے ہم نے تجھ کو سات آیتوں والی وُہ سورۃ دی ہے کہ جو بار بار دُہرائی جاتی ہے یا جس میں سات آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی ثنا کامل طور پر بیان کی گئی ہے۔

تفسیر ۔ جب یہ فرمایا کہ یہ لوگ اب تباہ ہونے کو ہیں اور انکی جگہ مسلمانوں کو برتری ملنے والی ہے۔ تو ساتھ ہی فرمایا کہ انکی طرف سے توجہ ہٹا کر اب تم مسلمانوں میں قرآن کی ترویج اور تعلیم پر زیادہ زور دو تا کہ کامیابی کے دنوں کے آنے سے پہلے یہ اس کام کے لئے جو ان کے ذمہ لگنے والا ہے تیار ہو جائیں۔ چنانچہ فرمایا ہم نے تم کو سورہ فاتحہ جیسی نعمت دی ہے جو صرف سات آیات ہیں۔ اور مثانی ہیں

جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ

(شفقت کا) بازو جھکائے رکھ ۸۹ اور (لوگوں سے) کہہ (کہ) میں ہی کھول کھول کر ہوشیار کرنے والا ہوں

مثانی کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں کسی شے کی قوت اور طاقت کے بھی ہوتے ہیں۔ اور سورہ فاتحہ کو مثانی کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اس میں قرآن کریم کی قوتوں اور طاقتوں کا نچوڑ ہے یعنے ہیں تو سات مختصر آیات لیکن سارے قرآن کریم کے مطالب اجمالاً اس میں آگئے ہیں۔

قرآن عظیم سے مراد بقیہ قرآن بھی ہو سکتا ہے اور مراد یہ ہوگی کہ سورۂ فاتحہ بھی دی جو اجمالی قرآن ہے اور تفصیلی قرآن بھی دیا۔ اور اس سے مُراد خود سورہ فاتحہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں اس سے یہ مطلب ہوگا کہ سورۂ فاتحہ قرآن کریم کا ایک بڑا اہم حصہ ہے۔ اور قرآن سے سارا قرآن نہیں بلکہ حصہ قرآن مراد لیا جائے گا اور یہ عام محاورہ ہے کہ کبھی جزو کے لئے کُل کا لفظ بول دیا جاتا ہے جیسے عام طور پر لوگ کہتے ہیں۔ قرآن سُناؤ اور اس سے مراد سارا قرآن سُنانا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا کچھ حصہ سُنانا مطلوب ہوتا ہے۔ پس القرآن العظیم کا لفظ سورۂ فاتحہ کے متعلق اس اظہار کے لئے ہے کہ وہ قرآن عظیم کا حصہ ہے اس سے باہر نہیں۔ ان معنوں سے ان لوگوں کے خیالات کی تردید ہوتی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ قرآن کا حصہ نہیں۔ احادیث میں بھی سورۃ فاتحہ کا نام قرآن عظیم بتایا گیا ہے۔ چنانچہ مسند احمد حنبل میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا هِیَ اُمُّ الْقُرْاٰنِ وَهِیَ السَّبْعُ الْمَثَانِیْ وَهِیَ الْقُرْاٰنُ الْعَظِیْمُ (مسند احمد حنبل جلد ۲ صفحہ ۴۴۸) یعنی سورۃ فاتحہ اُمّ القرآن بھی ہے اور سبع المثانی بھی ہے اور قرآن عظیم بھی ہے۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن عظیم سارے قرآن کا نام نہیں۔ دونوں ہی معنے ایک وقت میں کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔ یہ بھی کہ سورۃ فاتحہ قرآن عظیم ہے۔ اور یہ بھی کہ سارا قرآن قرآن عظیم ہے۔ کیونکہ یہ دونوں معنے مختلف نقطۂ نگاہ کی وجہ سے ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ اگر قرآن عظیم کے معنے سارے قرآن کے کئے جائیں تو یہ مطلب ہوگا کہ ہم نے تم کو اجمالی قرآن یعنے سورۃ فاتحہ بھی دی ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک تفصیلی قرآن بھی دیا ہے۔ پس اس کی تعلیم کی طرف توجہ کرو۔ اور ان لوگوں سے بحث مباحثہ کا خیال جانے دو اب وقت آگیا ہے کہ مسلمانوں کو مطالب قرآن خوب زور سے سکھائے جائیں تاکہ وہ نئے نظام کے سنبھالنے کے اہل ہو جائیں۔

مثانی کے اصل معنے

قرآن عظیم سورہ فاتحہ کو کہا گیا ہے

قرآن عظیم سے مراد بقیہ قرآن بھی ہو سکتا ہے

۸۹ حل لغات۔ تَمُدَّنَّ۔ مَدَّ سے مضارع کا صیغہ ہے اور مَدَّ نَظَرَهٗ اِلَيْهِ کے معنے ہیں طمح ببصرہ الیہ کہ اسکی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا (اقرب) پس لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ کے معنے یہ ہونگے کہ تو انکی ترقیات کی طرف ٹکٹکی لگا کر نہ دیکھ۔

تَمُدَّنَّ

تفسیر۔ بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ بصریٰ اور اذرعات سے بنو قریظہ اور بنو نضیر کے سات قافلے آئے تھے وہ کپڑوں اور عطروں اور جواہرات پر مشتمل تھے انہیں دیکھ کر صحابہؓ نے کہا کہ کاش یہ مال ہمارے پاس ہوتا تو ہم کو اس سے طاقت حاصل ہوتی۔ اور ہم اسے خدا کی راہ میں خرچ کرتے۔ یہ معنے میرے نزدیک درست نہیں اور ان کے غلط ہونے کا یقینی ثبوت یہ ہے کہ سب مفسرین متفق ہیں کہ یہ سورۃ ساری کی ساری مکی ہے حتیٰ کہ عیسائی مستشرقین تک یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہ سورہ سب کی سب مکی ہے۔ پھر جب یہ سورہ مکی ہے تو بنو قریظہ اور بنو نضیر کے قافلوں کو دیکھ کر مسلمانوں کا ایسی خواہش کرنا کس طرح

آیت لَا تَمُدَّنَّ کے غلط معنوں کی تردید

حدیث میں سورہ فاتحہ کا نام سبع مثانی رکھا گیا ہے

درست ہو سکتا ہے بنو قریظہ اور بنو نضیر کی حالت تو مسلمانوں نے ہجرت کے بعد دیکھی تھی۔ مکہ میں نازل ہونے والی سورۃ میں اس کا ذکر کیونکر آ گیا۔ نیز سوچنا چاہیئے کہ اس آیت میں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں۔ صحابہ تو مخاطب نہیں۔ اور آپ کی طرف ایسی خواہش منسوب کرنا میرے نزدیک تو کسی صورت میں جائز نہیں بلکہ سوءِ ادب ہے۔ نیز جب کہ اس سورۃ میں زور ہی اس امر پر ہے کہ ہم مسلمانوں کی ترقی کے سامان خود پیدا کریں گے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں ایسا خیال پیدا ہی کس طرح ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ تو کہے کہ اس بارہ میں تو ہم پر توکل رکھ اور رسول لوگوں کے اموال کو دیکھ کر کہے کہ یہ مال ہمارے پاس ہوتا تو خوب ترقی کرتے۔ اسے کونسی عقل تسلیم کر سکتی ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ کے الفاظ کفار کی تباہی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرتؐ کے لئے بطور تسلی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ میں کفار کے نظام کے ٹوٹنے کا اشارہ تھا۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کو جو نہایت حساس تھا اور جس میں اپنی قوم کی خیر خواہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لازماً یہ صدمہ ہوتا تھا کہ اب میری قوم یا اس کے عمائد ایمان سے محروم رہ جائیں گے اور تباہ کر دیئے جائیں گے چنانچہ آپ ان صنادید کی حالت کو دیکھ کر جن پر مکہ کے نظام کا مدار تھا سخت افسوس کرتے ہونگے کہ کاش یہ لوگ تباہ نہ ہوتے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بڑا بنایا ہے اللہ تعالیٰ ان کو دین میں بھی بڑا بناتا تو اچھا ہوتا اور یہ خواہش نہایت پاکیزہ ہے۔ نبی کبھی کسی کی تباہی پر خوش نہیں ہوتا۔ بلکہ چاہتا ہے کہ سب ہی ایمان لے آئیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس خواہش میں اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ آپ کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شعراء ع ۱) اے محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو تو شائد اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کر لے گا۔ کہ یہ لوگ سب کے سب مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے پس آپ کے ان شریف جذبات کو اس خبر سے ضرور ٹھیس لگی ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لئے یہ الفاظ بیان فرمائے۔ اور کہا کہ تجھے اپنی قوم کے اکابر کی تباہی کی خبر سن کر افسوس ہوگا۔ کیونکہ تو انکی ہدایت کی زبردست خواہش رکھتا ہے مگر اب ہم انکی تباہی کا فیصلہ کر چکے ہیں پس اب ان لوگوں کے لئے افسوس کرنا چھوڑ دے۔ اور انکی ظاہری بڑائیوں کا خیال نہ کر۔ اب تو تیرے رب نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کو چھوٹا کر دے اور تباہ کر دے۔

لَا تَمُدَّنَّ کے معنے کفار کے اموال کو لالچ کی نگاہ سے دیکھنے کے نہیں

پس اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا کہ ان کے اموال کو لالچ کی نگاہ سے نہ دیکھ۔ بلکہ یہ فرماتا ہے کہ انکی ظاہری شان وشوکت کو دیکھ کر یہ افسوس نہ کر کہ اب عذاب الٰہی ان کو کنگال اور تباہ کر دے گا۔ اور ان کی حشمت جاتی رہے گی۔ چنانچہ آیت کا آخری حصہ بھی انہی معنوں کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ یعنے ان کی تباہی پر غم نہ کر۔ اس جملہ کے ہوتے ہوئے وہ معنے جو بعض لوگوں نے کئے ہیں کس قدر خلاف عقل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ معنے صحیح ہیں۔ تو آیت کا مضمون یہ بن جائیگا کہ اے محمد رسول اللہ تو ان کے مالوں کو دیکھ کر لالچ نہ کر اور یہ خواہش نہ کر کہ وہ اموال تجھ کو مل جائیں۔ اور تو انکی تباہی پر غم نہ کھا۔ یہ معنے کیسے لغو ہیں۔ اور کس طرح ان کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو رد کرتا ہے لیکن جو معنے میں نے کئے ہیں وہ ساری آیت کے مضمون کو ایک دوسرے کا مؤید بنا دیتے ہیں۔

آیت لَا تَمُدَّنَّ کا مطلب

جو شخص دوسرے کے مال کو لینا چاہتا ہے وہ اس کی تباہی پر غمگین کیونکر ہو سکتا ہے وہ تو اپنی خواہش سے عملاً اس کی تباہی کی دعا کرتا ہے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ بھی میرے کئے ہوئے معنوں کی تائید کرتے ہیں کیونکہ اگر وہ معنے مراد ہوں جن کو میں نے رد کیا ہے۔ تو اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ کفار کے متعلق یہ خواہش نہ کر کہ ان کا مال تجھ کو مل جائے اور انکی تباہی پر افسوس نہ کر۔ اور مومنوں کی تربیت کی طرف پوری توجہ کر۔ اگر یہ معنے ہوں تو آیت کے

الْمُبِيْنُ ۝ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۝

کامل نذیر ہوں [581] اس لئے کہ ہم نے باہم بانٹ لینے والوں کے متعلق (اپنا انذاری کلام) نازل کیا ہے [582]

سب ٹکڑے بے ربط ہو جاتے ہیں لیکن میرے کئے ہوئے معنوں کی صورت میں یہ الفاظ بھی آیت کے دوسرے حصوں سے کامل طور پر مربوط معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے کفار کی تباہی کا ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔ پس اب ان کی جاتی ہوئی شان کو دیکھ کر تو غم نہ کر بلکہ جو لوگ انکی جگہ لینے والے ہیں یعنے مومن۔ انکی تربیت کی طرف متوجہ ہو جا کہ اب دُنیا کی ترقی پُرانے سرداروں کے بچانے سے ممکن نہیں بلکہ اس کا مدار ان لوگوں کی صحیح تربیت پر ہے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ سے ایک باریک اشارہ ہجرت کی طرف بھی کیا گیا ہے۔ کیونکہ مومنوں کی کامل تربیت ایک نظام کو چاہتی ہے قرآن کریم کے وہ احکام جو نظام کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ ان کا عملی اجراء مکہ میں نہیں ہو سکتا تھا پس یہ کہہ کر کہ اب تو مومنوں کی ایسی تربیت کی طرف توجہ کر کہ آگے چل کر یہ دُنیا کا نظام سنبھال لیں۔ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب ہم تجھے اس جگہ لے جانے والے ہیں۔ جہاں تجھے اس تربیت کا موقعہ پوری طرح مل جائے گا۔

آیت واخفض سے ہجرت کی طرف اشارہ

خلاصہ یہ کہ آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے سے اس لئے منع نہیں کیا گیا۔ کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے مالوں کی لالچ تھی۔ بلکہ اس حسرت سے دیکھنے سے منع کیا گیا ہے کہ اب سرداران عرب کی حشمت جاتی رہے گی اور وہ ایمان سے محروم رہ جائینگے۔ اور ان کے اموال ان کو تقویٰ میں بڑھانے کی بجائے انکی ہلاکت کا موجب ہو جائینگے۔

[581] تفسیر۔ یعنے اب تو بانگ بلند سے ان کو یہ سُنا دے کہ مَیں ہاں میں ہی کھُلا کھُلا نذیر ہوں یعنی اس وقت خدا تعالیٰ نے انذار کا کام میرے ہی سپُرد کیا ہُوا ہے اس لئے میں الٰہی فیصلہ کے ماتحت اعلان کرتا ہوں کہ تمہاری تباہی کا وقت آگیا ہے۔

[582] حل لغات۔ المقتسمین۔ اِقْتَسَمَ سے اسم فاعل مُقْتَسِمٌ آتا ہے اور مُقْتَسِمُوْنَ اسکی جمع ہے۔ اِقْتَسَمُوا المَالَ بَيْنَهُمْ کے معنی ہیں۔ اَخَذَ كُلٌّ قِسْمَهٗ۔ انہوں نے مال کو تقسیم کر لیا اور ہر ایک نے اپنا اپنا حصہ لے لیا (اقرب) تقاسما المال۔ اقتسماه بينهما۔ انہوں نے آپس میں مال تقسیم کر لیا۔ فالاقتسام والتقاسم بمعنیً وَاحِدٍ۔ یعنی ان معنوں کے رُو سے اقتسام اور تقاسم ہم معنی ہیں (تاج) پس مقتسمون کے معنی ہوں گے تقسیم کرنے والے۔ مراد آنحضرت کی دشمنی کے فرائض باہم تقسیم کرنے والوں سے ہے۔

المقتسمین

تفسیر۔ عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں "جس طرح ہم نے مقتسمین پر نازل کیا ہے۔" مگر میرے نزدیک اس جگہ ك کے معنی تعلیل کے ہیں۔ اور کاف کا یہ استعمال لغت عربی سے ثابت ہے (اقرب) خود قرآن کریم میں بھی ان معنوں میں ك متعدد جگہ استعمال ہُوا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ (بقرہ ع ۲۵) اللہ تعالیٰ کو یاد کرو کیونکہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے۔ پس ك کے ان معنوں کے رو سے آیت کے معنے یہ ہونگے کیونکہ ہم نے (عذاب) مقتسمین پر اُتارا ہے اور یہ آیت پہلی آیت سے متعلق سمجھی جائے گی۔ اور دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ان لوگوں سے کہدے کہ میں نذیر عریان ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مقتسمین کے لئے یہ عذاب اُتارنے کا فیصلہ کر دیا ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ ان معنوں سے مفہوم بہت صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر ك کے معنے "جس طرح" کئے جائیں تو مطلب واضح نہیں رہتا کیونکہ اس صورت میں عبارت یہ بنتی ہے کہ ان سے کہدے میں نذیر عریان ہوں۔ جس طرح

کما انزلنا الخ میں ك کے معنی تعلیل کے

آیت کما انزلنا الخ پہلی آیت سے متعلق ہے۔

مفسرین کو اس آیت کے معنوں میں دقت

ہم نے مقتسمین پر اُتارا ہے۔ یہ معنے جیسا کہ ظاہر ہے کوئی صحیح مفہوم پیدا نہیں کرتے اسی وجہ سے مفسرین کو اس آیت کے معنے کرنے میں سخت دقت ہوئی ہے۔ اور لمبی لمبی توجیہیں کرکے انہیں کوئی معنے نکالنے پڑے ہیں۔

مقتسمین کے معنوں کے بارہ میں بھی مفسرین کو بڑی دقت پیش آئی ہے۔ انہوں نے اس آیت کے معنے یہ کئے ہیں۔ کہ جس طرح ہم نے ان پر عذاب اُتارا ہے۔ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُکھ دینے کی قسمیں کھائی ہوئی ہیں بخاری میں بھی یہ معنے بیان کئے گئے ہیں (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الحجر) مگر میرے نزدیک عربی زبان کے رو سے یہ معنے درست نہیں۔ کیونکہ اِقْتَسَمَ کے معنے قسمیں کھانے کے نہیں ہیں بلکہ تقسیم کرنے کے ہیں۔

مقتسمین سے مراد آنحضرتؐ کے خلاف تدابیر کرنے والے ہیں

چنانچہ اقرب میں ہے اِقْتَسَمُوا الْمَالَ بَيْنَهُمْ اَیْ اَخَذَ كُلٌّ قِسْمَهٗ یعنے جب اِقْتَسَمَ الْمَالَ کا لفظ بولیں تو اس سے مُراد یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے تقسیم کرلیا اور ہر ایک نے اپنا اپنا حصہ لے لیا۔ تاج العروس میں ہے تَقَاسَمَا الْمَالَ اِقْتَسَمَاهُ بينهما یعنے تقاسما المال کہیں تو اس کے معنے اِقْتَسَمَا کے یعنے آپس میں تقسیم کرلینے کے ہوتے ہیں۔ غرض اِقْتَسَمَ کے معنے تاج العروس میں تقسیم کرنے کے لکھے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر لوگوں کو یہ دھوکا کیونکر لگا کہ اس کے معنے باہم قسمیں کھانے کے ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ تَقَاسَمَا کے ایک معنے قسمیں کھانے کے ہیں اور دوسرے معنی تقسیم کرنے کے ہیں۔ ان معنوں کو بتانے کے لئے اہل لغت لکھتے ہیں کہ تَقَاسَمَا اور اِقْتَسَمَا ہم معنے الفاظ ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ تَقَاسَمَا۔ اقتسما کی طرح تقسیم کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ اقتسم بھی تَقَاسَمَا کی طرح قسمیں کھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اقتسم کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں

آیت کا اصل مطلب

مفسرین نے اس مشابہت سے دھوکا کھایا ہے حتیّٰ کہ زمخشری جیسے ادیب نے بھی دھوکا کھایا ہے میرے دعویٰ کی تصدیق تاج العروس کے ان الفاظ سے ہوتی ہے تَقَاسَمَا الْمَالَ اِقْتَسَمَاهُ بَيْنَهُمَا فَالْاِقْتِسَامُ وَالتَّقَاسُمُ بِمَعْنًى وَاحِدٍ۔ یعنے ”تَقَاسَمَا الْمَالَ کے معنے اقتسما المال کے ہیں یعنے آپس میں مال تقسیم کرلیا۔ پس اقتسام اور تقاسم ایک ہی معنے رکھتے ہیں“ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ تاج العروس والے کے نزدیک دونوں کا اشتراک تقسیم کرنے کے معنوں میں ہے نہ کہ قسموں کے کھانے کے متعلق۔ چنانچہ آگے تاج العروس والے نے اس آیت کو بطور شہادت پیش کیا ہے گو آگے ابن عرفہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ مقتسمین کے معنے تَقَاسَمُوْا کے ہیں۔ لیکن اوپر کی تشریح کے ماتحت صاف ظاہر ہے کہ تاج والا ان معنوں کو لغت کے معنی نہیں قرار دیتا بلکہ تفسیری معنے قرار دیتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں یہ بتاتا ہوں کہ مقتسمین سے کیا مراد ہے۔ میرے نزدیک تقسیم کرنے والوں سے محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی کے کام تقسیم کرنے والے مُراد ہیں اور مطلب یہ ہے۔ کہ جن لوگوں نے تیرے خلاف تدابیر کرنے کے کاموں کو تقسیم کرلیا ہے کسی نے یہ ڈیوٹی اپنے ذمہ لے لی ہے کہ مکہ کے باہر کھڑا ہو کر لوگوں کو ورغلائے کسی نے یہ ڈیوٹی لے لی ہے کہ یہ شور مچاتا پھرے کہ اگر سچا ہوتا تو ہم جو رشتہ دار ہیں کیوں نہ مانتے کسی نے مسلمانوں کو دُکھ دینے کی ڈیوٹی اپنے ذمہ لے رکھی ہے کسی نے دوسری اقوام میں پروپیگنڈا کرنے کی ڈیوٹی سوان سب لوگوں کے لئے ہم نے عذاب کا فیصلہ کرلیا ہے بعض لوگوں نے یہ معنے کئے ہیں کہ قرآن کو انہوں نے تقسیم کرلیا ہے کہ بعض حصہ کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں۔ مگر یہ معنے بھی درست نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ مقتسم کے معنے تو باہم تقسیم کرلینے کے ہیں۔ اور کسی حصہ پر ایمان لانا اور کسی کو رد کر دینا باہم تقسیم کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ پس کسی جزو پر ایمان لانا اور کسی پر نہ لانا گو بعض کفار کا شیوہ ہے اور قرآن کریم میں مذکور ہے مگر اس آیت میں اس مفہوم کی طرف اشارہ

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ○ فَوَرَبِّكَ

جنہوں نے قرآن کو جھوٹی باتوں کا مجموعہ قرار دیا ۸۳؎ سو تیرے رب کی قسم

لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

الربع

ہم ان سب سے باز پرس کریں گے ان کاموں کے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے ۸۴؎

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○

سو جس بات (کے پہنچانے) کا تجھے حکم دیا جاتا ہے وہ کھول کر (لوگوں کو) بتا دے اور ان مشرکوں (کی بات) سے اعراض کر ۸۵؎

نہیں ہے۔

۸۳؎ تفسیر - عِضِيْن اور عِضُوْنَ عِضَةٌ کی جمع ہیں اور عِضَةٌ کا لفظ عَضَى يَعْضُوْ عَضْوًا سے بھی نکلا ہے۔ جس کے معنے ٹکڑے کرنے کے ہوتے ہیں اور عَضَهَ يَعْضَهُ عَضْهًا سے بھی نکلا ہے جس کے معنے جھوٹ بولنے کے ہوتے ہیں۔ پس عِضَةٌ کے معنے جھوٹ کے بھی ہیں۔ اور ٹکڑے کے بھی اور عضین کے معنے بہت سے جھوٹوں کے بھی ہیں اور ٹکڑوں کے بھی۔ اگر عِضَةٌ عَضَى يَعْضُوْ کے مادہ سے مشتق سمجھا جائے تب بھی اہل لغت کے نزدیک اس کے معنے "ٹکڑہ" کے علاوہ 'جھوٹ' کے بھی ہوتے ہیں۔ (اقرب) غرض ایک مادہ کے رو سے عضین کے معنے 'ٹکڑوں' کے ہیں۔ اور دونوں مادوں کے رو سے اس کے معنے 'جھوٹوں' کے ہیں۔ اور میرے نزدیک دوسرے معنے اس آیت میں زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان معنوں کے سمجھنے کے لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جَعَلَ کے ایک معنی ظَنَّ کے بھی ہوتے ہیں یعنی ایسا سمجھا۔ چنانچہ عربی کا محاورہ ہے جَعَلَ الْحَقَّ بَاطِلًا یعنے سچ کو جھوٹ سمجھا (اقرب) اور عضین کے معنے جھوٹ کرنے کی صورت میں جَعَلَ اس آیت میں انہی معنوں میں مستعمل ماننا پڑے گا۔ اور ترجمہ یہ ہوگا۔ کہ "وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو جھوٹوں کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے" اور گزشتہ آیتوں سے مل کر مفہوم یہ بنے گا کہ اس موعود عذاب کی خبر ان کو دے دے جنہوں نے تیری مخالفت کی ڈیوٹیاں تقسیم کر رکھی ہیں۔ اور قرآن کریم کو جھوٹوں کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے اور بتا دے کہ اب ان لوگوں کی تباہی کا وقت آ پہنچا ہے یہ معنے ایسے واضح ہیں کہ ان سے تمام وہ مشکلات دُور ہو جاتی ہیں جو دوسرے مفسرین کو پیش آتی ہیں۔

عضین کے معنے جھوٹوں کا مجموعہ۔

اس آیت کا پہلی آیت سے تعلق

۸۴؎ تفسیر - فرماتا ہے کہ تیرے رب ہی کی قسم اب ایسے سب لوگ سزا پائیں گے۔ اور ہم ان سب سے پُوچھیں گے۔ پُوچھنے کا مطلب اس جگہ وہی ہے۔ جو پنجابی میں پُوچھوں گا کا ہوتا ہے۔ یعنی انکی شرارتوں کا اب حساب لیں گے اور ان کو سخت سزا دیں گے۔

لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ سے مراد محاسبہ اور سزا ہے۔

۸۵؎ حل لغات - اِصْدَعْ: - صَدَعَ سے امر کا صیغہ ہے اور صَدَعَهُ صَدْعًا کے معنے ہیں۔ شَقَّهُ کسی چیز کو پھاڑ دیا۔ وقیل شَقَّهُ بِنِصْفَيْنِ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ وقیل شَقَّهُ وَلَمْ يَفْتَرِقْ اور بعض کہتے ہیں کہ کسی چیز کو پھاڑ دیا لیکن وہ دو ٹکڑے نہ ہوئی۔ صَدَعَ الامرَ: - كَشَفَهُ وَبَيَّنَهُ: بات کو کھول دیا اور واضح کر دیا۔ صَدَعَ بالحقِّ والحجّةِ. تَكَلَّمَ بِهَا جِهَارًا۔

اصدع

إِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ

ہم یقیناً تجھے ان تمسخر کرنے والوں (کے شر) سے محفوظ رکھیں گے جو اللہ (تعالیٰ)

يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

کے ساتھ کوئی (نہ کوئی) اور معبود بنا رہے ہیں۔ سو وہ عنقریب (اس کا نتیجہ) معلوم کر لیں گے ۹۶

حق اور حجت کا علی الاعلان اظہار کیا۔ صَدَعَ بِالْاَمْرِ اصاب بِهٖ موضِعَهٗ وَجَاهَرَ بِهٖ مُصَرِّحًا کسی کام کو برمحل کیا۔ اور اس کی بآواز بلند تصریح کی صَدَعَ الْاَمْرَ بِالْحَقِّ۔ فصلہٗ کسی معاملہ کا درست فیصلہ کیا۔ (اقرب)

سوف یعلمون کی پیشگوئی کا قومی اور فردی ظہور۔

تفسیر ۔ صَدَعَ بِالْحَقِّ کے معنے حق کے ساتھ فیصلہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور صَدَعَ کے معنے کھولکر بیان کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ دونوں معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب خدائی فیصلہ انکی ہلاکت اور مسلمانوں کی ترقی کی نسبت جاری ہو چکا ہے۔ تو اس امر کو خوب کھول کھول کر انہیں سُنا دے اور مشرکوں سے بحث مباحثہ چھوڑ دے۔ اسی طرح اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے (اور یہی ان معنوں کے ساتھ زیادہ چسپاں ہوتا ہے جو میں اوپر کی آیات کے بیان کر چکا ہوں) کہ اب تو اللہ تعالےٰ کے حکم کے مطابق فیصلے کرنے شروع کر۔ یعنے تجھے اب ہم اس امر کا موقعہ دینے والے ہیں کہ شریعت کے تمام احکام کا اجراء عملاً شروع ہو جائے۔ پس تو اللہ تعالےٰ کے احکام کے مطابق فیصلوں کو جاری کر دے اور مشرکوں کی پرواہ نہ کر۔ اس آیت میں بھی گویا مدینہ کی ہجرت اور اسلامی حکومت کی خبر دی گئی ہے

فاصدع الخ میں اسلامی حکومت اور شریعت کے عملاً اجراء کی خبر دی گئی ہے۔

آنحضرت پر ہنسی اڑانے والوں کا انجام

اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ کا حکم دینے کی وجہ

تفسیر ۹۶ ۔ یعنی اب تجھے ان لوگوں کی طرف توجہ کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اب بحث مباحثہ والے جوابوں کی جگہ ہم ان کو آسمانی نشانوں کے ساتھ جواب دینا چاہتے ہیں اور تجھ پر ہنسی کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دینا چاہتے ہیں۔ ان کو سوچنا چاہیے تھا کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کے شریک بنا رہے ہیں، اور اس کی ہتک کر رہے ہیں تو وہ کب تک ان کی اس حرکت کو برداشت کرتا چلا جائے گا قومی طور پر تو یہ پیشگوئی بعد ہجرت کفار مکہ کی شکست اور ذلت سے پوری ہوئی۔ فردی طور پر بھی اس کا عجیب شاندار طور پر ظہور ہوا۔ عروہ بن زبیر کی روایت ابنِ اسحاق نے لکھی ہے (ابن کثیر جلد ۵) کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہنسی اُڑانے والے پانچ رؤسا تھے ولید بن مغیرہ۔ عاص بن وائل۔ اسود بن عبد یغوث اور اسود بن المطلب اور حرث بن طلاطلہ۔ ان کے بارہ میں حضرت جبریل کشف میں رسول کریم صلعم کو نظر آئے اور اسود بن عبد یغوث کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اسے استسقاء ہو گیا۔ اور وہ اس سے مر گیا۔ ولید بن مغیرہ کے پیر کی طرف اشارہ کیا اسے ایک پُرانا زخم تھا جو مندمل ہو چکا تھا اس کے بعد وہ زخم پھٹ گیا اور وہ اس سے مر گیا۔ اور عاص بن وائل کے پاؤں کے تلوں کی طرف اشارہ کیا وہ چند دن بعد گدھے پر سوار طائف کو جا رہا تھا کہ تلے میں کوئی چیز کُھب گئی اور وہ اس سے مر گیا۔ اور حرث بن طلاطلہ کے سر کی طرف اشارہ کیا وہ سر کے زخم سے ہلاک ہو گیا۔ اور اسود بن مطلب کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ اندھا ہو کر مر گیا۔ یہ روایت سعید بن جبیر اور عکرمہ سے بھی

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝

اور ہم یقیناً جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے تیرا دل تنگ پڑتا ہے ۵۷

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝

پس تو اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے (اسکی) تسبیح کر اور (اسکے) کامل فرمانبرداروں میں سے بن ۵۸

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝ ع ۶

اور اپنے رب کی عبادت کرتا رہ یہاں تک کہ تجھ پر موت (کی گھڑی) آجائے ۵۹

مروی ہے سعید حرث بن غیطلہ نام بتاتے ہیں اور عکرمہ حرث بن قیس۔ مگر یہ اختلاف نہیں کیونکہ زہری کے نزدیک غیطلہ اسکی ماں کا نام تھا اور قیس باپ کا نام تھا۔

۵۷ تفسیر۔ بیشک ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتوں کے باعث تیرا سینہ تنگ ہوتا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ لوگ جو تیرے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ ان سے تیرے دل میں انقباض پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کا اشارہ اوپر کی آیت وَيَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا کی طرف ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اے محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ہم جانتے ہیں کہ ان کے مشرکانہ دعاوی پر ہماری محبت کی وجہ سے تجھے سخت تکلیف ہوتی رہی ہے لیکن اب تو خوش ہو جا۔ کہ شرک مٹا دیا جائے گا اور توحید قائم کر دی جائے گی۔

۵۸ تفسیر۔ یعنے چونکہ ہم اب توحید کو پھر قائم کرنے لگے ہیں۔ جو تیری آمد کا اصلی مقصد ہے۔ تو اس خوشی میں اپنے رب کی تسبیح کر اور سجداتِ شکر بجالا۔ یا یہ کہ مومنوں کی تربیت کرکے اللہ تعالےٰ کی تسبیح کا عملی ثبوت دُنیا کے لئے مہیا کر۔ کیا ہی لطیف رنگ میں اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ کے دل پر سے اس غم کا بوجھ ہلکا کیا ہے جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔

۵۹ حل لغات۔ اَلْيَقِيْنُ: اِزَاحَۃُ الشَّكِّ وَتَحْقِيْقُ الْاَمْرِ۔ یقین کے معنی ہیں شک کو دُور کرنا۔ اور کسی معاملہ کی اصلیت تک پہنچنا۔ العِلْمُ الحاصل عن نظرٍ و استدلالٍ ولهذا لا يُسمّٰى علمُ اللّٰهِ يقيناً۔ وہ علم جو غور و فکر اور استدلال سے حاصل ہو۔ اسی وجہ سے خدا کے علم کو یقین نہیں کہتے۔ کیونکہ اس کا علم کسبی نہیں بلکہ ازلی ہے۔ الیقین۔ الموت۔ یقین موت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (اقرب) اس آیت میں بھی آخری معنے ہیں۔

تفسیر۔ یقین کے معنے اس جگہ پر موت کے ہیں۔ فرماتا ہے کہ اب تو موت تک ہماری عبادت میں لگا رہ۔ یعنے اسلام کو جو ترقی ملے گی۔ اس میں اب کوئی رخنہ نہیں پڑے گا۔ اور تو با فراغت اپنی موت تک کھلے بندوں اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکے گا اور یہ لوگ اس وقت جو تیری عبادات میں روکیں ڈالتے ہیں۔ ان کو خدا تعالےٰ اس طرح مٹا دے گا کہ تیری ساری زندگی عبادت کی آزادی کے لحاظ سے راحت میں گذرے گی۔

یقین کے معروف معنے بھی اس جگہ ہو سکتے ہیں اور اس صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ جس ساعت کا

[حاشیہ: ۲ الیقین]

[حاشیہ: ۱ بما یقولون میں کفار کے مشرکانہ دعاوی کی طرف اشارہ ہے]

[حاشیہ: ۱ تسبیح سے مراد مومنوں کی جماعت]

وعدہ ہے اس کے آنے تک خاص طور پر عبادت میں مشغول رہو گویا عذاب یا ساعۃ کے آثار ظاہر ہونے کا نام یقین رکھا۔ کیونکہ جب تک وعدہ پورا نہ ہو اس کی پوری حقیقت ظاہر نہیں ہوتی۔ پس فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہو تو خاص طور پر دُعا اور عبادت میں لگ جانا چاہیئے تاکہ وہ وعدہ ہر قسم کی خیر کے ساتھ پورا ہو۔

اس کے یہ معنے نہیں کہ دوسرے دنوں میں عبادت چھوڑ سکتا ہے۔ کیونکہ جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم عبادت کرتے تھے پس اس کے معنے معمول سے زیادہ عبادت اور توجہ کے ہیں۔

بعض نادان بدعتی اس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ جب تک یقین حاصل نہ ہو عبادت فرض ہے جب یقین حاصل ہو جائے تو پھر نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یقین کے حاصل ہونے تک عبادت کر" یہ نادان نہیں جانتے کہ اس طرح وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرتے ہیں۔ اور گویا یہ کہتے ہیں کہ اس سورۃ کے اُترنے تک آپؐ کو یقین کامل حاصل نہ ہوا تھا۔ اگر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبوت کے بعد یقین حاصل نہ ہوا تھا تو ان ذلیل لوگوں کو یقین کس طرح حاصل ہو سکتا ہے نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات

ایک دفعہ میرے پاس ایک ایسا ہی شخص آیا اور سوال کیا کہ کشتی کا سوار جب کنارہ پر پہنچے تو کشتی ہی میں بیٹھا رہے یا اُتر آئے۔ میں نے کہا کہ اگر دریا محدود ہے اور اس کا کنارہ ہے تو کنارہ پر اُتر آئے لیکن اگر دریا بے کنار ہے تو جس کو وہ کنارہ سمجھتا ہے وہ اس کی عقل کا دھوکا ہے اس لئے وہ جہاں اُترے گا۔ وہیں ڈوبے گا۔ اس پر وہ سخت شرمندہ ہوا۔

سُورَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ نحل [۱] یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَةٌ وَتِسْعٌ وَعِشْرُونَ آيَةً وَسِتَّةَ عَشَرَ رُكُوعًا

اور بسم اللہ سمیت اس کی ایک سو اُنتیس آیتیں ہیں اور سولہ رکوع ہیں -

[۱] اس سورۃ کے متعلق مفسرین کا قول ہے۔ هٰذِهِ السُّوْرَةُ مَكِّيَّةٌ كُلُّهَا قَالَهُ الحسنُ والعطاءُ وعكرمةُ وجابرٌ یعنی یہ سورۃ سب کی سب مکی ہے حسن عطاء اور عکرمہ اور جابر نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ قال ابنُ عبّاسٍ اِلَّا ثلاثَ اٰياتٍ منها وهي من قوله تعالىٰ - وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِلىٰ قوله وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ حضرت ابن عباس رض کا قول ہے۔ کہ یہ سورۃ سب مکی ہے سوائے تین آیتوں کے۔ جو لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ سے شروع ہو کر لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ پر ختم ہوتی ہیں۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ بے شک تین آیتیں غیر مکی ہیں۔ مگر وہ اس سورۃ کے آخر میں وَاِنْ عَاقَبْتُمْ سے لے کر وَالَّذِيْنَ هُمْ مُحْسِنُوْنَ تک ہیں بعض کہتے ہیں۔ کہ مندرجہ ذیل تین آیات مدنی ہیں (۱) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ والی آیت۔ " نَزَلَتْ فِي الْمَدِيْنَةِ فِيْ شَاْنِ التَّمْثِيْلِ بِحَمْزَةَ وَقَتْلٰى اُحُدٍ۔ یعنی یہ آیت حضرت حمزہ رض اور دیگر شہیدانِ اُحد کے مثلہ کرنے کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ (۲) وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ والی آیت (۳) ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا والی آیت۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سورۃ کے ابتداء سے پہلی تین آیات تَعَالىٰ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ تک مدنی ہیں اور باقی تمام سورۃ مکی ہے۔ قتادہ نے اس کے بالکل برعکس کہا ہے وہ کہتے ہیں۔ پہلی تین آیتیں مکی ہیں۔ اور باقی سورۃ مدنی ہے (البحر المحیط) یوریپین مصنفین میں سے ویری نے ساری سورۃ کو آخری زمانہ کی مکی سورتوں میں سے قرار دیا ہے۔ نولڈکی نے سوائے آیات ۴۲ و ۱۱۲ و ۱۲۰ و ۱۲۱ و ۱۲۶ کے باقی سب سورۃ کو مکی قرار دیا ہے (چونکہ اس نسخہ قرآن کریم میں بسم اللہ کو آیت شمار کیا گیا ہے - اس لئے ایک ایک عدد بڑھا دیا گیا ہے۔ نولڈکی نے ۴۳ و ۱۱۱ و ۱۱۹ و ۱۲۰ و ۱۲۵ لکھا ہے) سیل نے آخری تین آیات کو مدنی قرار دیا ہے اور باقی تمام سورۃ کو مکی - وائل WEIL) نے بڑے زور سے سیل کی بات کو رد کیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بھی مکی ہی ہیں (دہیریز کمنٹری آن قرآن)

یہ سورت مکی ہے

[۲] وجہ تسمیہ

اس سورۃ کا نام نحل رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں نحل کی وحی کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے۔ کہ تمام کارخانۂ عالم وحی پر چل رہا ہے - اور یہی مضمون اس سورۃ کا محوری نقطہ ہے -

دوسرے اس میں جہاد کا پہلی دفعہ ذکر ہے - چونکہ اس پر اعتراض ہوتا تھا۔ نحل کی مثال سے اشارہ کیا کہ اس میں شہد بھی ہے اور ڈنک بھی۔ مگر ڈنک کم اور شہد زیادہ - اسی اصول پر جہاد کا قیام ہے۔ جس کی غرض صرف روحانی شہد کی حفاظت ہے

[۳] سورۃ کے مضامین

میرے بتائے ہوئے قاعدہ کے مطابق کہ سورتوں کے مضامین حروف مقطعات کے تابع ہوتے ہیں - اور جن سورتوں کے شروع میں مقطعات نہیں ہوتے - وہ اپنے سے پہلی سورۃ کے جس کے پہلے مقطعات ہوں مضمون کے لحاظ سے تابع ہوتی ہیں اور اس میں اُسی سورۃ کے مضامین کا تسلسل ہوتا ہے یہ سورۃ سورۃ حجر کے

مضمون کے تسلسل میں ہے۔ اور اسی کے مضمون کو نئے
پیرایہ میں جاری رکھا گیا ہے۔ سورۃ حجر کے شروع میں
الٓر کے حروف ہیں جس کا مفہوم اَنَا اللّٰہُ اَرٰی ہے

یہ سورۃ سورۃ حجر کے مقطعات کے ماتحت ہے

یعنی میں اللہ دیکھ رہا ہوں۔ اس سورۃ میں الٰہی صفت کے
مضمون کو نئے پیرایہ میں اور نئے اسلوب سے بیان کیا گیا
ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کلام الٰہی کیا شان رکھتا ہے
اور اس کی ضرورت کیا ہے۔ اور اس کے اندر کیا قوتِ
جاذبہ ہوتی ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم جو تمام کتب
سے کامل کتاب ہے۔ اس کی قوتِ جذب اور قوتِ قدسی
کی تو حد ہی نہیں۔ پھر مسلمانوں کی کامیابی میں کیا شبہ
ہو سکتا ہے۔

پچھلی سورۃ کے ساتھ اس کا مزید جوڑ یہ بھی ہے۔
کہ پہلی سورۃ کے آخر میں اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ اور فَوَ
رَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ" کہہ کر کفار سے عذاب
کا وعدہ کیا تھا۔ اب اس سورۃ میں اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ کہہ کر
یہ بتایا ہے کہ وہ موعود وقت اب آ ہی گیا ہے۔ پہلی سورۃ
کے آخر میں تو اٰتِيَةٌ فرمایا تھا کہ عذاب کو آیا ہی سمجھو اور اس
سورۃ کو اَتٰى سے شروع کیا ہے کہ وہ آ ہی گیا ہے۔ یہ
قرآن کریم کا محاورہ ہے کہ وہ کسی امر کے قطعی ہونے پر ماضی
کے صیغہ سے دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح جلد ظاہر ہونے
والے امور کو بھی ماضی کے صیغہ سے ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ جو
بات ہو چکی ہو۔ اس کے متعلق کوئی شک باقی نہیں رہتا۔
اسی طرح ماضی کے لفظ سے اس امر پر بھی زور دیا جاتا
ہے کہ وہ اس قدر قریب ہے کہ اُسے ہو چکا ہوا ہی جانو۔
اُردو میں بھی کہتے ہیں کہ بس اُسے آیا ہوا ہی سمجھو یعنی اس
کی آمد نہایت قریب ہے۔ ان الفاظ سے بھی معلوم ہوتا
ہے کہ یہ سورۃ بالکل ہجرت کے قریب نازل ہوئی ہے۔

خلاصہ مضمون

اس سورۃ کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں
بتایا جا چکا ہے۔ اس کی سچائی کے ظاہر ہونے کا وقت بالکل
قریب آگیا ہے۔ یہ سوال کہ یہ کلام کس پر نازل ہوا ہے
بالکل بے حقیقت ہے۔ معترض اتنا تو دیکھے کہ انسان کی جسمانی
پیدائش کیسی حقیر ہے۔ پھر اُسے ترقی دے کر اللہ تعالیٰ
نے کس قدر انعامات کا وارث کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر
خدا تعالیٰ روحانی عالم میں کسی آدمی کو جو بظاہر بے حقیقت
نظر آتا ہو بڑھا دے اور ترقی دیدے۔ تو یہ کیوں خیال نہیں
کرتے کہ اس کے اندر بھی کوئی مخفی طاقتیں ہوں گی۔

جس خدا نے دنیا کے عارضی امور کی ضروریات بہم پہنچائی ہیں۔
وہ دائمی سفر کی ضروریات کو کیونکر نظر انداز کر دے گا۔ اللہ
کے سوا اس ضرورت کو نہ لوگ خود پورا کر سکتے ہیں اور نہ اُن
کے معبود۔ پس خدا تعالیٰ کو پانے کا صحیح اور قریب تر راستہ
اور اس راستہ پر چلنے کو سہل کر دینے والے اسباب
خدا تعالیٰ ہی بتا سکتا ہے۔ اور وہی بتاتا ہے۔ آگے انسان
اس میں دخل دے کر اگر اپنے لئے مشکلات پیدا کر لے۔
تو اس کی ذمہ واری اس پر ہے۔

پھر بتایا ہے کہ جو اس راستہ پر چلتے ہیں۔ اُن سے
کیا سلوک ہوتا ہے۔ اور جو اس پر نہیں چلتے۔ ان کا کیا
انجام ہوتا ہے۔ اور اس سوال پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ
انسان کی جزا اس کے انجام پر مترتب ہوتی ہے۔

اس لئے یہ کہنا کہ نبی کی بات کو سب لوگ فوراً نہیں
مان لیتے۔ پھر جو پہلے انکار کر کے بعد میں ایمان لاتے ہیں۔
ان کا کیا حال ہوگا۔ معقول اعتراض نہیں۔ ماننے والے
اور نہ ماننے والے اپنے انجام کے مطابق پوچھے جائیں گے
کیونکہ اگلے جہان کا راستہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں
وہ موت کے وقت ختم ہوتا ہے۔

پھر اس سوال کا جواب دیا۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی
طرف سے نبی آتے ہیں۔ تو اس کے پیغامبر کی بات کو کوئی
رد کس طرح کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ تو قادر ہے۔ پس جسے
اللہ تعالیٰ بھیجے گا اس کی بات سب سے منوالے گا اور
عقلی جواب کے علاوہ نقلی جواب بھی دیا کہ بعض نبیوں کو تم
بھی مانتے ہو۔ کیا اُن کی باتوں کو سب نے مان لیا تھا۔ یا

پہلے دن سے مان لیا تھا۔ پھر مومنوں کو توجہ دلائی کہ اگر تم خواہش رکھتے ہو کہ تمہارے عزیز اس کلام کو مان لیں تو اس کا علاج یہی ہے کہ اُن کے دلوں کو صاف کرو۔ اللہ تعالےٰ جبر سے انہیں ہدایت نہ دے گا۔ کیونکہ جس کے دل میں گمراہی ہو اُسے ہدایت دینا مومنوں پر ظلم ہے۔ کیونکہ بعث بعد الموت کی حکمت باطل ہو جاتی ہے۔ اس پر کفار کا انکار دُہرایا کہ بعث بعد الموت کیا ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اس کی دلیل یہ دی کہ وہ ایک ضروری شے ہے اور جس امر کی ضرورت ظاہر ہو۔ الٰہی قاعدہ کے مطابق اس کا وجود ضروری ہے۔

پھر بعث بعد الموت کا اس دنیا میں ہونے والے بعض امور سے ثبوت دیا۔ کہ اس دنیا میں بھی اللہ تعالےٰ قوموں کا بعث کرتا ہے۔ اور ہجرت سے اس بعث کا آغاز ہوتا ہے جیسا کہ اس نبی کی جماعت سے ہوگا۔ مومنوں اور کافروں کو جدا کرنا کامل ترقی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ پھر جو سب سے اعلیٰ کمال ہے اس کے لئے کیوں اللہ تعالیٰ مومن اور کافر کو الگ نہ کرے گا کہ ہر ایک اپنے راستہ پر بلا روک ٹوک چل سکے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کیلئے روحانی ہجرت کی ضرورت ہے جو موت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اس ہجرت کے بعد مومن اور کافر الگ الگ راستہ پر چل پڑتے ہیں۔ اور مومن بلا روک ٹوک اپنے خالص انتظام کے ماتحت جنت میں روحانی ترقیات کو حاصل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو دنیوی ہجرت کے بعد جو ترقی ہوگی۔ اُسے کفار دیکھ ہی لیں گے۔ وہ اسی سے قیاس کر سکتے ہیں کہ مومن روحوں کا کافروں سے الگ کر کے رکھنا ان کی پیدائش کی غرض کے پورا کرنے کے لئے کیسا ضروری ہے۔

پھر ہجرت دنیوی کے نتائج کی طرف اشارہ کیا۔ کہ کس کس طرح اُس سے کفار پر عذاب آئیں گے اور کس طرح مومنوں کو ترقی حاصل ہوگی۔ اور اس کی وجہ کوئی دنیوی ذرائع نہیں ہوں گے۔ بلکہ محض توحید پر قیام اس کا باعث ہوگا۔

پھر بتایا کہ آخرت پر ایمان نہ لانے سے انسانی اعمال میں نقص آجاتا ہے۔ یہ بھی یوم البعث کی ضرورت کا ثبوت ہے۔

پھر بتایا کہ ڈھیل کا ملنا اس امر کی علامت نہیں۔ کہ خدا تعالےٰ دین کو قائم نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ انسانی نجات کی اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔ دنیا میں ڈھیل کا قانون طبعی عالم میں بھی پایا جاتا ہے۔ پھر کیوں دین کے بارہ میں نہ ہو۔ خصوصاً جبکہ اللہ تعالےٰ انسانوں کو نجات دینے کی غرض سے ڈھیل دے کر انہیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں نجات دینا چاہتا ہے۔

پھر جبر کا رد اس طرح کیا۔ کہ بدی کو خوبصورت کر کے دکھانا شیطان کا کام ہے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالےٰ کا کام تو صرف ہدایت کو بیان کرنا ہے۔ ہاں وہ اپنے عظیم الشان رحم سے ہدایت کے مزید سامان اس طرح پیدا کر دیتا ہے کہ کلام الٰہی ہمیشہ مومنوں کے لئے رحمت ثابت ہوتا ہے اور اس طرح عقلمندوں پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس راہ کو پسند کرتا ہے۔

پھر بتایا۔ کہ ان کا یہ اعتراض ہے کہ اگر یہ سچا ہے تو پہلی تعلیموں کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔ اور بتایا کہ پہلے نبیوں کو کافر قرار دینا اور بات ہے اور رائج الوقت باتیں جو ان کی طرف منسوب ہیں۔ ان کو ماننا اور بات ہے۔ نبی تو آتا ہی تب ہے۔ جب لوگ پہلی تعلیموں کو جو بھی تھیں مسخ کر دیتے ہیں اور جب وہ الٰہی حفاظت سے باہر ہو جاتی ہیں۔

پھر ایک لطیف مثال دی کہ ہدایت دینا اللہ تعالےٰ ہی کے شایانِ شان ہے۔ جانور کو دیکھو۔ گھاس کھاتا ہے اور دودھ دیتا ہے۔ اور یہ خدا تعالےٰ ہی کی بنائی ہوئی مشین کا کام ہے۔ اسی طرح انسانی اخلاق جو بہیمیت کے تابع ہوتے ہیں۔ گھاس کی طرح ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ انہی بہیمی اخلاق کو اپنے الٰہی قانون کے ماتحت لاکر اعلیٰ اخلاق بنا دیتا ہے۔

پھر نحل کی مثال دی کہ اس کے کاموں کو دیکھو کہ وہ بھی

توایک وحی کے ماتحت عمل کرتی ہے اور معمولی نباتی اجزاء سے
شہد تیار کرتی ہے۔ اس سے سمجھ لو کہ دنیا کے سب کام ایک
وحی خفی کے ماتحت چل رہے ہیں پھر کیوں نہ انسان کے اخلاق
کو اعلیٰ بنانے کے لئے کسی وحی کا نزول ہو۔ اور کیوں نہ اس
وحی کے نتائج اسی طرح شفا کی صورت میں پیدا ہوں جس طرح
شہد کی مکھی کے عمل کا نتیجہ شفاء ہوتی ہے۔ ہاں جس طرح شہد
کی مکھیوں کی اقسام ہیں اور شہد کے مدارج ہیں۔ اسی طرح
انسانوں کے مدارج ہیں۔ اور گو سب مومن وحی کے تابع ہیں۔
مگر ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق روحانی شہد تیار کرتا ہے۔

پھر ایک اور طرح وحی الٰہی کی ضرورت بتائی اور فرمایا
جب بھی اللہ تعالےٰ کسی قوم کو ترقی دیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد
اس کی حاصل کردہ ترقیاں ایک خاص گروہ کے قبضہ میں آجاتی
ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کے لئے ترقی کا راستہ مسدود
ہوجاتا ہے۔ کیونکہ قوم پر قابض لوگ انہیں باوجود قابلیت کے
آگے نہیں آنے دیتے حالانکہ اللہ تعالےٰ نے سب کو اپنے
فضل کا وارث بنایا ہے۔ ان حالات کو سوائے وحی کے کس طرح
بدلا جاسکتا ہے۔ یقیناً اس زمانہ کے بڑے لوگ یہ دعوےٰ
کرتے ہیں کہ ہم قابل ہیں۔ اس لئے قوم کی باگ پر قابض ہیں
اور ان کے دعویٰ کو رد کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ سوائے
اس کے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ایک نئے امتحان کا انتظام
کیا جائے۔ پس اس غرض کو پورا کرنے کے لئے نبی کا آنا
ضروری ہوتا ہے۔ جب وہ آتا ہے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ
جو لوگ قوم پر حکومت کر رہے تھے وہ قابل نہ تھے۔ کیونکہ وہ
الٰہی کلام کو ماننے سے محروم رہ جاتے ہیں اور جو لوگ ادنیٰ
سمجھے جاتے تھے وہ مان جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوجاتا
ہے کہ قابلیت والے اور لوگ تھے۔ اس طرح اللہ تعالےٰ
انسانی حقوق کی پھر سے حفاظت کر دیتا ہے اور پھر سے ہر
انسان اپنی قابلیت کے مطابق ترقی کرنے لگ جاتا ہے۔
اور نسلی امتیاز کے نظام کو توڑ دیا جاتا ہے۔

اس امر کی تائید میں ایک اور دلیل دی اور فرمایا۔
کہ جب قومیں اللہ تعالےٰ سے دُور ہوجاتی ہیں تو شرک کرنے
لگتی ہیں۔ اور اس طرح ایسے وجودوں سے متعلق ہوجاتی ہیں جو
خیر و شر کے مالک نہیں اور اس طرح ترقی کے حقیقی سامانوں سے
محروم ہوجاتی ہیں۔ اگر اس حالت کو نہ بدلا جائے۔ تو سب دنیا
ترقی سے محروم ہو جائے۔

پھر فرمایا کہ ایک نقص تو وحی سے بُعد کا یہ ہوتا ہے کہ بعض
لوگ جبراً قوم کی باگ لے لیتے ہیں اور لوگوں کو قابلیت کے اظہار
کا موقعہ ہی نہیں دیتے۔ ایک اور نقص بھی پیدا ہوجاتا ہے اور وہ
یہ کہ شرک کی وجہ سے اکثروں کی قابلیتیں مر ہی جاتی ہیں۔ پھر
خدائے رحیم اس حالت کو کس طرح برداشت کرے۔ اس طرح
تو وہ اپنے عمل کو خود باطل کرے گا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ
پہلے قابلیت دے۔ پھر اس قابلیت کو مرنے دے یا ظالموں کو
موقعہ دے کہ اس قابلیت کو ظاہر ہونے سے روک دیں۔

غرض کفار کے دعاوی باطل ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کی حکمت
چاہتی ہے کہ جو ان ظلموں کے بانی ہیں۔ اُن کو تباہ کرے۔ پس
جنہوں نے اللہ تعالےٰ کی ظاہری حفاظت کے سامانوں سے
سبق حاصل نہیں کیا۔ انہیں ظاہری حفاظت سے بھی محروم
کر دیا جائے گا۔ اور اس دنیا میں بھی اور اگلے جہان میں بھی
وہ جھوٹی حفاظت جو شرک کے رنگ میں انہوں نے اپنے لئے
تجویز کی تھی اُن کی ذلت کا موجب ہوگی۔

لیکن بتایا کہ ظالموں میں بھی ہم فرق کریں گے جو گمراہ
کرنے والے ہیں زیادہ سزا پائیں گے۔ اور جو جہالت سے
اُن کے تابع ہوئے کم سزا پائیں گے۔

پھر فرمایا کہ یہ دیکھتے نہیں کہ جن تغیرات کا ہم نے
ذکر کیا ہے۔ اس کے سامان کیسے واضح ہیں۔ اول قرآن کریم
میں اندرونی شہادت موجود ہے۔ کہ وہ ایک مکمل تعلیم پر مشتمل
ہے۔ پھر اس کی تعلیم ترقی کی طرف لے جانیوالی ہے۔ پھر عملاً
اس پر چلنے والے برکتیں پاتے ہیں۔

اس کے بعد کامل تعلیم کی بعض مثالیں بیان کیں۔
اس پر کفار کا اعتراض پھر دُہرایا۔ کہ یہ تعلیمیں تو پہلی کتب کے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى

(اے منکرو) اللہ (تعالیٰ) کا حکم آ گیا ہے اس لئے (اب) تم اس کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔ وہ پاک (ذات) ہے اور جن چیزوں

عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ

کو وہ (لوگ) شریک قرار دیتے ہیں اس سے بہت بالا ہے ۲ؕ وہ فرشتوں کو اپنے اُن بندوں پر جنہیں وہ پسند کرتا ہے (اپنی) خاص وحی

خلاف ہیں۔ اور فرمایا کہ یہ اختلاف سطحی ہے۔ ہر زمانہ کے مطابق کلام اُترتا ہے۔

پھر بتایا کہ اس جواب کو سن کر کفار بیشتر وہ بدلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پہلی کتب کی نقل ہے۔ اس کا جواب دیا اور ثابت کیا کہ نقل کا اعتراض بالکل خلاف عقل ہے۔

پھر ہدایت کے سلسلہ میں بتایا کہ بے شک بعض لوگ اس مذہب سے مرتد بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا مرتد ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ قرآن کریم نے یقین کامل پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ یہ تو ثابت ہوتا اگر ایسے لوگوں کا ارتداد کسی دلیل کی بنا پر ہو جبکہ دنیوی غرض سے انحراف ہو۔ تو ارتداد مرتد کا گند ثابت کرتا ہے نہ کہ تعلیم کی کمزوری۔

پھر بتایا کہ مومنوں کے لئے اب حکومت کرنیکا وقت آگیا ہے۔ اور قرآنی بشارات اب اُن کے حق میں پوری ہونے کو ہیں۔ ایک زبردست جنگ کفر و اسلام میں ہونے والی ہے اس میں ہر ایک کو اس کے ایمان کے مطابق بدلہ مل جائیگا۔

پھر صاف لفظوں میں مکہ والوں کی تباہی کی خبر دی اور بتایا کہ مکہ والوں کی حکومت جاتی رہے گی۔

پھر رحمت کے مضمون کو الگ کر کے بیان فرمایا۔ کہ قرآن کریم کس طرح بنی نوع انسان کے لئے ظاہری رحمت بھی ہے کہ خلاف عقل رسوم سے انہیں بچاتا ہے۔

پھر حضرت ابراہیم جو مکہ والوں کے جدامجد تھے انکی یاد دلائی کہ دیکھو وہ خدا تعالیٰ کا فرمانبردار تھا۔ تم بھی اُسی کے نقشِ قدم پر چلو اور اس کی پیروی کرو جو ابراہیمی سُنت پر ہے۔

پھر یہود و مسیحی لوگوں کو مخاطب کیا اور فرمایا کہ تم نے بھی دین کو بدل دیا ہے۔ تم بھی اپنی اصلاح کرو۔ اور جو اعلیٰ علم کے سامان خدا تعالیٰ نے دیئے ہیں۔ اُن سے گمراہی میں ترقی نہ کرو۔

آخر میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو توجہ دلائی کہ اب تیری تبلیغ کا دائرہ وسیع ہو کر یہود و نصاریٰ کو بھی گھیرنے والا ہے۔ اس کے بارہ میں ہم کچھ ہدایات ابھی سے دے دیتے ہیں۔

پھر بتایا کہ اب تک تو مکہ والے ظلم کرتے تھے۔ آئندہ یہود و نصاریٰ بھی ظلم شروع کریں گے۔ اس وقت بھی رحم کرنا اور صبر سے کام لینا۔ ہاں جب خدا تعالیٰ نے سزا دینا چاہے تو ان کی تباہی پر غم بھی نہ کرنا۔ اور ساتھ ہی یہ خبر بھی دے دی کہ یہود و نصاریٰ سے جو مقابلہ ہوگا۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ تم کو فتح دے گا۔

۲ؕ حل لغات۔ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ: اِسْتَعْجَلَهٗ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ کے معنے ہیں۔ طَلَبَ عَجَلَتَهٗ وَلَمْ يَصْبِرْ اِلٰى وَقْتِهٖ۔ کسی کام کے لئے خواہش کی کہ وہ وقت سے پہلے ہو جائے۔ اِسْتَعْجَلَ فُلَانًا: سَبَقَهٗ وَتَقَدَّمَهٗ۔ فلاں شخص سے

اس سورۃ میں ہجرت مدینہ کی طرف اشارہ ہے۔

آگے نکل گیا۔ مَرَّ فلانٌ یَسْتَعْجِلُ ای یُکَلِّفُ نَفْسَہٗ الْعَجَلَۃَ۔ یعنی اپنی طبیعت پر زور ڈال کر تیزی سے چلا۔ (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس ۱۲ع۵ اَتٰی اَمْرُ اللّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ کے معنے ہوں گے کہ اللہ کے عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو۔

سُبْحَانَہٗ اور یُشْرِکُوْنَ کیلئے دیکھو یونس ع۹ہ

تفسیر:۔ پہلی سورۃ میں کہا تھا کہ اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ۔ اب فرمایا کہ اب تو اس ساعت کو آیا ہوا ہی سمجھو۔ یعنی وہ اب دروازے پر ہے۔ قرآن کے محاورہ کے مطابق ماضی یقین اور قرب وقوع کے اظہار کے لئے بھی آتی ہے اور اس جگہ یہی مراد ہے۔

امر اللہ کے دو معنے

اَمْرُ اللّٰہِ۔ امر اللہ کے دو معنے ہو سکتے ہیں:۔

(۱) وہ وعید جس کا پچھلی سورتوں میں ذکر تھا۔

(۲) وہ وعدہ جس کی طرف وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اس جگہ دونوں معنے چسپاں ہوتے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ کفار کی سزا اور مومنوں کی کامل اور آزاد تربیت کرنے کا وقت آگیا ہے۔

فلا تستعجلوہ میں دو امور کی طرف اشارہ

فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ۔ اس میں بھی دونوں امور کی طرف اشارہ ہے۔

(۱) عذاب مانگنے میں اب جلدی نہ کرو۔ وہ تو اب تمہارے دروازوں پر ہے

سبحانہٗ کہہ کر پہلی سورۃ کے حکم کی طرف اشارہ

(۲) تم مسلمانوں کے نئے نظام کا بار بار مطالبہ کرتے تھے لو وہ اب آپہنچا۔ اب اس کی نسبت جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو کہ وہ مطالبہ پورا ہونے لگا ہے۔

اَتٰی اَمْرُ اللّٰہِ کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ یہ سورۃ سورۂ حجر کی پیشگوئی کی وضاحت کرتی ہے اور اس کا مضمون اس کے مضمون کے تسلسل میں ہے اور اس کا اس مقام پر رکھا

ترتیب سور مضمون کے لحاظ سے ہے

جانا بتاتا ہے کہ قرآن کریم کی سورتیں مضمون کے لحاظ سے آگے پیچھے رکھی گئی ہیں نہ کہ لمبائی اور چھوٹائی کے لحاظ سے۔ جیسا کہ بعض ناواقف خیال کرتے ہیں۔

یہ سورۃ مکی زندگی کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔ اور ایسے وقت میں جبکہ مسلمان کفار کے جور و ستم سے تنگ آکر گھر چھوڑ رہے تھے اور ہجرت شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس میں ہجرت کا ذکر صاف لفظوں میں آتا ہے۔ یہ ہجرت کونسی تھی۔ اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض مفسرینؒ نے اس سورۃ میں مذکورہ ہجرت سے حبشہ کی ہجرت مراد لی ہے۔ بعض نے مدینہ کی وہ ہجرت مراد لی ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو مدینہ بھجوا دیا تھا۔ اور بعض نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ہجرت بھی مراد لی ہے۔

میرے نزدیک حبشہ والی ہجرت مراد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ کئی سال پہلے شروع ہو چکی تھی اور وہ اَتٰی اَمْرُ اللّٰہِ کی قائم مقام بھی نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ اس ہجرت کے نتیجہ میں کافروں کے خلاف خدائی جلال ظاہر نہیں ہوا۔ نیز سورۃ حجر میں جو اعتراض بیان ہوئے ہیں اَتٰی اَمْرُ اللّٰہِ کے الفاظ اُن کے جواب میں آئے ہیں اور ان میں سے کئی ہجرت حبشہ کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ پس اگر اس ہجرت سے رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی پیشگوئی مراد نہیں۔ تو یہ بعض صحابہ کے مدینہ جانے کی طرف اشارہ ہے جبکہ مدینہ کی ہجرت کی بنیاد مضبوطی سے قائم ہو گئی تھی۔ گویا پچھلی سورۃ میں کلام الٰہی کے جس اثر کا ذکر کیا گیا تھا۔ اَتٰی اَمْرُ اللّٰہِ کہہ کر یہ بتایا کہ وہ تاثرات اب جلد ظاہر ہونے والے ہیں۔

سُبْحَانَہٗ۔ سبحانہٗ کہہ کر بتایا ہے کہ ہم پہلی سورۃ کے آخری حصہ میں فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ کہکر تسبیح کا حکم دے چکے ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ عام مباحثات کو چھوڑ کر اب تم خدا تعالیٰ کی تسبیح میں لگ جاؤ اور مومنوں پر خدا تعالیٰ کی سبوحیت کو ظاہر کرو۔ اب تم کو بتاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی سبوحیت کے ظاہر ہونے کا وقت آگیا ہے۔

پہلی سورۃ کے آخر میں سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ کے الفاظ آئے تھے۔ اس سورۃ کے شروع میں سُبْحَانَہٗ کے الفاظ ہیں۔ یہ بھی اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ قرآنی مطالب

اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ

یعنی یہ حکم دے کر اُتارتا ہے کہ (لوگوں کو) آگاہ کرو کہ بات یہی (درست) ہے کہ میرے سوا کوئی بھی (سچا) معبود

اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ○ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

نہیں ہے اس لئے تم مجھے (ہی) اپنے بچاؤ کا ذریعہ بناؤ ۵۳ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق (و حکمت) کے ساتھ پیدا کیا

میں ترتیب پائی جاتی ہے۔ ایک طرف پہلی سورۃ کے الفاظ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ کے جواب میں اس سورۃ میں اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فرمایا اور وعدہ الٰہی کے قریب ہی میں پورا ہونے کی خبر دی۔ دوسری طرف سورۃ حجر کے آخر میں سَبِّحْ کہکر جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا۔ اس سورۃ میں سُبْحَانَهٗ کہہ کر اس حکم پر کامیاب طور پر عمل ہو جانے کی خبر دی۔ کیونکہ ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔ کہ ہم نے جو کہا تھا کہ خدا تعالیٰ کی پاکیزگی کو اب ظاہر کرو۔ اب تجھے یہ بتاتے ہیں کہ تیری یہ کوشش ناکام نہ رہے گی۔ بلکہ عنقریب تیرے ذریعہ سے خدا تعالےٰ کی سبوحیت یعنی اس کا سب اعتراضات سے پاک ہونا ثابت ہو جائے گا۔ گویا اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ کہکر خدا تم پر جو اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ کے وعدہ کے پورا نہ ہونے کی صورت میں اعتراض ہو سکتا تھا۔ اُسے دُور کیا۔ اور سُبْحَانَهٗ کہہ کر اس اعتراض کو دُور کیا۔ جو سَبِّحْ کے حکم کے پورا نہ ہونے کی صورت میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر پڑ سکتا تھا۔

وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ یعنی ان کے شرک سے اللہ تعالیٰ بالا ہے۔ ان کا شرک اس کی تدابیر میں روک نہیں بن سکتا۔ اور ان کے معبود اس کے فیصلہ کو نہیں مٹا سکتے۔

اس آیت سے خدائی کلام اور بندے کے افتراء میں خوب فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ دنیا کے لوگ جتھے پر زور دیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ ہم اپنے جتھے کو بلائیں گے۔ اور اکیلے ہوں۔ تو اس کی شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کیا کریں اکیلے ہیں۔ کوئی ساتھی نہیں۔ ورنہ بتا دیتے۔ بہاء اللہ نے بھی جو الوہیت کا مدعی تھا۔ اپنے فرید ہونے کا رونا رو کر اپنی کمزوری کا اقرار کیا ہے۔

خدائی کلام اور بندے کے افتراء میں فرق

اس کے مقابلہ میں سچا خدا ہمیشہ اپنے ایک ہونے پر زور دیتا ہے۔ اور خدا کے لئے جتھا قرار دینے والوں پر ناراض ہوتا ہے۔ بیٹا، بیٹیوں یا درباریوں کے ماننے یا درباری کہنے والوں پر اظہار غضب فرماتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو حقیقی اور اصلی طاقت و شوکت کا مقام ہے۔ جھوٹے مدعی اپنے اکیلا ہونے کا ماتم کرتے ہیں۔ سچا خدا اپنے اکیلے ہونے کو اپنی بڑائی کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔

۳ حل لغات۔

الرّوح

الرُّوْح کیلئے دیکھو حجر ۳۰۔

اَنْذِرُوْا۔ اَنْذَرَ سے امر کا جمع کا صیغہ ہے۔ انذر کے لئے دیکھو یونس ۳۔

روح سے مراد دنیا کو زندہ کرنے والا کلام یا امر نبوت

تفسیر:۔ بِالرُّوْحِ۔ روح سے مراد دنیا کو زندہ کرنے والا کلام ہے۔ امر نبوت کو بھی روح کہتے ہیں۔

نبیوں اور ماموروں کا کلام چونکہ دنیا کے لئے زندگی بخش ہوتا ہے اس لئے اُسے روح قرار دیا جاتا ہے۔

اَنْ اَنْذِرُوْا میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس آیت میں وحی نبوت کا ذکر ہے۔

وحی کی دو قسمیں

وحی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک صرف انسان کے اپنے نفس کے لئے۔ اس وحی کو ظاہر کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا۔ گو اجازت ہوتی ہے کہ انسان اس کا اظہار کر دے۔ دوسری وحی بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے ہوتی ہے اور پھیلانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے نہ پھیلانے کو جرم قرار دیا جاتا ہے۔ یہ دوسری قسم کی وحی نبیوں کی ہوتی ہے۔ اس جگہ اَنْذِرُوْا

کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم جس وحی کا اس جگہ ذکر کر رہے ہیں۔ وہ وحی نبوت ہے۔

من امرہ میں چار باتوں کیطرف اشارہ

مِنْ اَمْرِهٖ۔ ان الفاظ سے ایک تو یہ بتایا ہے کہ ملائکہ خود کلام نازل نہیں کر سکتے۔ بلکہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ اور اسی کا بھیجا ہوا کلام لاتے ہیں۔

دوسرے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس جگہ اس رُوح یعنی کلام الٰہی کا ذکر ہے جو من امر اللہ ہوتا ہے۔ یعنی اس میں خدا تعالےٰ کے اوامر و نواہی کا ذکر ہوتا ہے۔ ان معنوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ وحی نبوت کا ذکر ہے۔

کلام الٰہی ہمیشہ آہستہ آہستہ اترتا ہے

مِنْ اَمْرِهٖ سے اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ جو ہم نے کہا ہے اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ۔ یہ سُنّت ہماری سب نبیوں کے متعلق ہے۔ ہم ان میں سے ہر اک کی طرف فرشتوں کو وحی دے کر بھیجتے ہیں۔ اور اس میں ہمارے امر کا بیان ہوتا ہے یعنی کفار کی ہلاکت اور مومنوں کی ترقی کا۔ گویا کوئی نبی نہیں آتا کہ اس کے ذریعہ سے ایک قوم کی ہلاکت اور دوسری قوم کی ترقی کی خبر نہ دی گئی ہو۔

مسیحیوں کے اعتراض کا رد

مِنْ اَمْرِهٖ میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر نبی کا ماننا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ وحی نبوت امر الٰہی پر مشتمل ہوتی ہے پس ہر رسول کا انکار اس کا ہی انکار نہیں۔ بلکہ خدا تعالےٰ کا انکار ہوتا ہے جس نے اس پر وحی کی۔

من عبادہ سے مراد عابد بندے ہیں

عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ میں عِبَادِهٖ سے مراد اللہ تعالےٰ کے عابد بندے ہیں نہ کہ ہر انسان۔ اور اس طرف اشارہ ہے کہ گو نبوت وہبی ہے [illegible] اس کا نزول عباد اللہ پر ہی ہوتا ہے۔ گویا یہ وہب ایک کسب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور یہ وہب مشروط ہے عبد ہونے کے ساتھ۔ ان موہبتوں میں سے نہیں جو بلا قید ہر ایک کو مل سکتی ہیں۔

من عبادہ کہنے سے تین باتوں کی طرف اشارہ

مِنْ عِبَادِهٖ سے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وحی نبوت صرف موحد بندوں پر نازل ہوتی رہی ہے جو توحید کی دلیل ہے۔ اگر شرک بھی جائز ہوتا۔ تو کیوں نہ کوئی نبی ایسا بھی پایا جاتا جو خالص اللہ تعالےٰ کا عبد نہ ہوتا۔ بلکہ دوسرے معبودوں کی عبادت بھی کر لیا کرتا۔ توحید کا یہ ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ کہ آج تک ایک بھی نبی نہیں ہوا جو مشرک ہو۔ پھر نہ معلوم مشرک اپنے عقیدہ کی بنیاد کس دلیل پر رکھتے ہیں۔

عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ نبی کا انتخاب اللہ تعالےٰ بندوں کی مرضی کے مطابق نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا ہے۔ اس لئے بندوں کا اس سے مختلف الخیال ہونا ضروری ہے۔ اور جب نبی خدا کا منتخب کیا ہوا ہوتا ہے۔ تو کفار کا یہ اعتراض کہ اس کے خیال قومی خیالات سے مختلف کیوں ہیں کم عقلی کی علامت ہے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ۔ تنزیل کے ایک معنے آہستہ آہستہ اتارنے کے ہوتے ہیں۔ اس جگہ یہی معنے مراد ہیں اور بتایا ہے کہ کلام الٰہی ہمیشہ اور ہر نبی پر آہستہ آہستہ اترتا ہے پس یہ اعتراض جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر بعض لوگوں کی طرف سے خصوصاً مسیحیوں کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ اس کا تھوڑا تھوڑا کر کے اترنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسانی کلام ہے۔ اور ضرورت کے مطابق تصنیف کر لیا جاتا تھا۔ الٰہی سنّتِ الٰہیہ سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ کیونکہ کونسا نبی ہے جس نے ایک وقت میں ہی ساری کتاب لا کر دنیا کو دے دی ہے موسیٰؑ کے صحف۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات سب اس امر پر شاہد ہیں۔ کہ تعلیم آہستہ آہستہ ایک لمبے عرصہ میں دنیا کو دی گئی اگر اس طرح تعلیم کا دنیا کے سامنے پیش کرنا قابلِ اعتراض ہے تو یہ اعتراض حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر بھی وارد ہوتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ اعتراض ہی غلط ہے۔ جو تعلیم دنیا کے رائج الوقت خیال کے خلاف ہو اور اس کو مٹا کر اوامر الٰہی کو رائج کرنے کیلئے آئے۔ اس کا آہستہ آہستہ اترنا ضروری ہے۔ تا لوگ اس پر اچھی طرح عمل کر سکیں۔ اور تا وہ ان کے دماغوں میں راسخ ہو جائے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے سورۃ فرقان کی اس آیت میں کہ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (فرقان ع۳) یعنی کافر کہتے ہیں کہ کیوں سب قرآن اس پر ایک ہی دفعہ نہیں

بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ

ہے جو ان چیزوں کو یہ لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں (۲) اس سے بہت بالا ہے ۵۔ اس نے انسان کو ایک حقیر نطفہ سے پیدا کیا ہے

اترا۔ یعنی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں۔ بلکہ محمد رسول اللہ حسب موقعہ اسے تصنیف کر لیتے ہیں۔ فرماتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن ایک ہی دفعہ نہیں اترا۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس طرح تیرے دل کو ثبات اور ایمان بخشنا چاہتے ہیں یعنی تو اور تیرے مومن اس کے مطالب کو عملی جامہ پہنا کر اس کے معانی سے خوب آگاہ ہوتے جاؤ اور اس لئے بھی کہ اگر پہلے ایک پیشگوئی بیان کی جائے۔ پھر جب وہ پوری ہو جائے اور اس کا ذکر بعد کی وحی میں کیا جائے۔ تو ایمان بہت زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور یہ طریق بیان بعد میں آنے والے لوگوں کے ایمان کی زیادتی کا بھی موجب ہوتا ہے۔ لیکن اگر کلام الٰہی میں پیشگوئیوں کا تو ذکر ہو۔ لیکن ان کے پورا ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہ ہو۔ تو اس وقت کے لوگ بھی اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اور بعد کے لوگوں کے لئے بھی وہ کلام کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسری کتب کے وہ محتاج رہتے ہیں۔

مِنْ اَمْرِہٖ میں مِنْ تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے سارے حکم ایک ہی وقت میں کسی ایک نبی پر نازل نہیں کئے۔ بلکہ ہر زمانہ میں ضرورت کے مطابق اپنے احکام مختلف انبیاء کی معرفت نازل کئے ہیں۔ پس یہ اعتراض کہ پہلے نبیوں کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے غلط ہے جس طرح پہلے نبی کے بعد دوسرے نبی کی ضرورت تھی۔ اسی طرح سابق نبیوں کے بعد اس نبی کی ضرورت ہے۔

اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ۔ یہ تمام دینی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ نبیوں کی تعلیم جزئیات میں مختلف رہی ہے۔ مگر ایک ہی اصل سب کی تعلیم میں کارفرما تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور دین کا خلاصہ یہی تعلیم ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ سے فرمایا۔ کہ جا جو ملے اُس سے کہہ دے مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا داخل جنت ہو گیا۔ (مسلم کتاب الایمان) انہیں سب سے پہلے حضرت عمرؓ ملے اور انہوں نے انہیں روکا اور آنحضرت صلعم کی خدمت میں لائے۔ اور آپؐ سے پوچھا کہ کیا ابوہریرہؓ جو کہتے ہیں۔ وہ درست ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ درست ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یا رسول اللہ اگر اس طرح اعلان ہوا۔ تو فَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یَّتَّکِلَ النَّاسُ عَلَیْھَا یعنی لوگ یہ کہنے لگ جائیں گے کہ بس لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا اب کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا رہنے دو۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ آپؐ نے اس کو ضروری نہ سمجھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو اعلان کرنا تھا ہو چکا۔ جو اس کا مفہوم سمجھتے تھے ان کو معلوم ہو گیا۔ نااہلوں تک پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ اس حکم کے اہل جو سمجھتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ میں سب احکام شامل ہیں۔ وہ خود اس کی مناسب تشریح کے ساتھ سب کو پہنچا دیں گے۔

قرآن کریم کو آہستہ آہستہ اتارنے کی حکمت

انّہٗ لا الٰہ الا اللہ دینی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

اِتَّقُوْنِ وَقٰی یَقِیْ سے باب افتعال کا صیغہ ہے اور اس کے معنے ہیں۔ اپنی حفاظت کا ذریعہ کسی کو بنانا۔ پس اِتَّقُوْنِ کے معنے ہیں۔ کہ مجھے ہی اپنی حفاظت اور بچاؤ کا ذریعہ بناؤ۔ یہ مطلب نہیں کہ مجھ سے اس طرح ڈرو جس طرح نقصان رساں چیزوں سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ تو خود اپنے بندوں کو اپنی طرف بلاتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔

اِتَّقٰی کے معنے

مِنْ امرہ میں مِنْ تبعیضیہ کے لحاظ سے معنی

۴ حل لغات:۔ الحق کے لئے دیکھو رعد ۱۵

الحق

تفسیر:۔ بِالْحَقِّ (۱) ہر ایک کا حق مقرر کر دیا ہے یعنی کچھ کام کا حصہ آسمان کے سپرد کر دیا اور کچھ زمین کے سپرد کر دیا۔ دونوں مل کر نتائج پیدا کرتے ہیں۔

حق کے دو معنی

(۲) یعنی دونوں کو حکمت کے ماتحت اس لئے پیدا کیا تا انسان کی توجہ خدا کی طرف پھرے۔ اور انسان سمجھے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی فی ذاتہٖ کامل نہیں۔ آسمان اپنے کام کی

مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَالْاَنْعَامَ

پھر (اس کے باوجود) وہ اچانک کھلم کھلا جھگڑنے والا بن جاتا ہے ۵۵ اور (نیز) چار پایوں کو

تکمیل میں زمین کا محتاج ہے اور زمین آسمان کی دست نگر۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے کام لے رہا ہے۔

خصیم

تَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ - فرمایا کہ جو انسان آسمان اور زمین کو بالحق نہیں مانتا - وہ لازماً مشرک بنتا ہے۔ کیونکہ کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس جہان کو خدا نے بنایا ہے مگر اس میں مقصد کوئی مقرر نہیں کیا۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا ہے تو ضرور اس کا کوئی مقصد ہے۔ اور اگر اس کا کوئی مقصد نہیں۔ تو یقیناً خدا نے نہیں بنایا۔ بلکہ یہ خودبخود ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ذرّہ ذرّہ خدا کا شریک ہے۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ زمین و آسمان کا بنانا حق کے ساتھ ہے یعنی ان کا مادّہ ہمارا پیدا کردہ ہے۔ اس لئے اس میں تصرف کا ہم کو حق حاصل ہے۔ اس میں ان لوگوں کا ردّ ہے جو ایک طرف خدا تعالیٰ کو مادہ کا خالق نہیں سمجھتے۔ دوسری طرف اس کی ترکیب کا فاعل خدا تعالیٰ کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جو خالق نہیں۔ اُسے کیا حق حاصل ہے کہ اس میں تصرف کرے اور ایک موجود بالذات کو اپنے حکم کے پیچھے لائے یہ تو ظلم ہو جاتا ہے۔ اور نیز یہ عقیدہ مشرکانہ بھی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ اَنْ گِنت وجودوں کو ازلی قرار دیا گیا ہے۔

آیت خلق الانسان ۱۷ میں تین باتوں کی طرف اشارہ

نطفة

۵۵ حل لغات - نُطْفَةٌ :- اَلنُّطْفَةُ کے معنے ہیں۔ اَلْمَاءُ الصَّافِیْ قَلَّ اَوْ کَثُرَ صاف و شفاف پانی خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ - یقال سقانی نطفةً عذبةً۔ چنانچہ سقانی نطفةً عذبةً کا محاورہ بول کر یہ مراد لیتے ہیں کہ اس نے مجھے صاف شیریں پانی پلایا۔ وَقِیْلَ قَلِیْلُ ماءٍ یَبْقٰی فِی دَلْوٍ اَوْ قِرْبَةٍ۔ بعض نے نطفہ کے معنے اس تھوڑے سے پانی کے کئے ہیں جو ڈول یا مشکیزہ کو خالی کرتے وقت باقی رہ جاتا ہے۔ ماءُ الرَّجُلِ وَالْمَرْاَةِ - مرد یا عورت کی منی - اَلْبَحْرُ - نطفہ کے ایک معنے سمندر کے بھی ہیں۔ اس کی جمع نِطَاف اور نُطَف آتی ہے (اقرب)

خَصِیْمٌ : خَصَمَ (یَخْصِمُ خصمًا) سے صفت مشبّہ ہے اور خَصَمَه کے معنے ہیں غلبہٗ فِی الْخُصُوْمَةِ - اس پر جھگڑے میں غالب آیا۔ اَلْخَصِیْمُ - اَلْمُخَاصِمُ خصیم کے معنے ہیں۔ جھگڑنے والا۔ اس کی جمع خُصَمَاءُ آتی ہے (اقرب)

تفسیر :- اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ زمین و آسمان کو ایک خاص نظام کے ماتحت پیدا کر کے ہم نے انسان کو بنایا۔ اور اپنے حق کی بنا پر اس کے لئے ہدایت نامے نازل کئے۔ مگر باوجود اس کے کہ ہم نے اُسے ایک حقیر مادہ سے پیدا کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیت عطا کی۔ وہ اُلٹا ہمارے حقوق کے متعلق بحث کرنے لگتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عدم سے وجود کس طرح پیدا کیا۔ اس لئے دنیا خودبخود بنی ہے۔ کوئی کہتا ہے خدا نے مادہ نہیں بنایا۔ بلکہ یونہی جبراً اس پر تصرف کر لیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ خدا کو کیا حق حاصل ہے کہ میرے لئے ہدایت نامہ جاری کرے۔ میں آزاد ہوں۔ میں اپنے لئے خود قانون بناؤں گا۔ غرض اس کے احسان کا انکار کرنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو آزاد بتاتا ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ خود تو ایک حقیر مادہ سے پیدا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھنے لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے بھی بحث کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف نبیوں پر اعتراض کرتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ جس خدا نے ایک حقیر نطفہ سے پیدا کر کے ایک سمجھدار انسان بنا دیا جو اُلٹا نافرمان ہو گیا۔ کیا وہ ایک بظاہر حقیر نظر آنے والے انسان کو آگے ترقی دے کر انسان کامل نہیں بنا سکتا۔ کہ تا وہ اس کی فرمانبرداری کرے اور دوسروں سے کرائے۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ خلق زمین و آسمان

خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۝

(پیدا کیا ہے اور) انہیں اس نے ایسا بنایا ہے کہ اُنہیں تمہارے لئے گرمی کا سامان اور (اور بھی) کئی نفعے ہیں اور تم ان (کے گوشت) کا کچھ حصہ کھاتے ہو

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ

اور (اسکے علاوہ) تمہارے لئے انہیں ایک (قسم کا) زینت (کا سامان بھی) ہے جب تم (انہیں) چرا کر شام کو (انکے تھانوں کی طرف) واپس لاتے ہو اور

سے یہ غرض تو نہ ہو سکتی تھی۔ کہ ایک نافرمان انسان پیدا ہو یقیناً خلق کا مقصد اس سے بالا ہونا چاہیئے تھا۔ پھر جب اس مقصد کو پورا کرنے والا انسان دنیا میں آتا ہے۔ تو لوگوں کو تعجب کیوں ہوتا ہے۔

۶ حل لغات۔ دِفْءٌ۔ دَفِئَ دَیدَ فَأُ دَفْأً وَدَفُؤَ یَدْفُؤُ دَفَاءَۃً من البرد کے معنے ہیں تَسَخَّنَ وَوَجَدَ الحرّ۔ گرم ہوا اور گرمی کو محسوس کیا الدِّفْءُ۔ نَقِیضُ حِدَّۃِ البَرْدِ۔ گرمی۔ دِفْءٌ مِنَ الحائطِ۔ رِکْنُہٗ۔ دیوار کی پناہ۔ یقال " اُقْعُدْ فِی دِفْءِ ھذا الحائطِ" ای فی رکنہ۔ چنانچہ اُقْعُدْ فی دِفْءِ ھذا الحائطِ کہہ کر یہ معنے لیتے ہیں کہ اس دیوار کی پناہ اور اوٹ میں بیٹھ۔ مَا اَدْفَأَ مِنَ الاَصْوافِ وَ الاَوْبَارِ۔ گرم کپڑے (اقرب)

مَنَافِعُ۔ مَنْفَعَۃٌ کی جمع ہے اور منفعۃ کے معنے ہیں۔ المنفع۔ نفع۔ وکُلّ شیءٍ یُنْتَفَعُ بِہٖ۔ ہر وہ چیز جس سے فائدہ اٹھایا جاتے۔ (اقرب)

تفسیر:۔ اس آیت میں نہایت لطیف پیرایہ میں انسان کی خصومت کا جواب دیا ہے۔ فرماتا ہے ہم نے تم کو پیدا کیا۔ لیکن تم کو آزادی کا دعویٰ ہے۔ حالانکہ خود تم ان چیزوں پر تصرف کرتے ہو جن کو تم نے پیدا نہیں کیا اور ان سے خوب فائدہ اٹھاتے ہو۔ حتیٰ کہ ان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور کہتے ہو کہ انسان اعلیٰ ہے۔ اس لئے اس کی خاطر دوسرے جانوروں کو ذبح کرنا تک درست ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ اعلیٰ کے لئے ادنیٰ قربان کیا جا سکتا ہے اور اعلیٰ کو ادنیٰ سے کام لینا جائز ہے۔ تو ہماری حکومت پر یا رسول کی حکومت پر تم کو کیا اعتراض ہے۔ وہی قانون جو تم ان کے لئے جاری کرتے ہو۔ اپنے متعلق جاری کرنے کے لئے کیوں تیار نہیں ہوتے۔

آیت خلق الانعام کے دو معنے

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ایک پہلی آیت یعنی عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ پر جو کفار اعتراض کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے اس حقیر بندہ پر کس طرح کلام نازل کیا۔ اس کا جواب یہ کہہ کر دیا تھا۔ کہ کیا تم کو ہم نے ایک حقیر نطفہ سے پیدا کر کے اعلیٰ مرتبہ تک نہیں پہنچایا۔ پھر اگر بعض لوگوں کو جن کو تم حقیر سمجھتے ہو۔ اگر نبی بنا کر عزت دی۔ تو اس پر تمہارا اعتراض کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ اب اس آیت میں انکے دوسرے اعتراض کا جواب دیا۔ جو اَنْ اَنْذِرُوْا سے پیدا ہو سکتا تھا۔ یعنی یہ کہ ہم تو گندے اور کمزور انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری طرف توجہ کس طرح کر سکتا ہے۔ اور فرمایا کہ خدا تو تمہارے کھانے پینے کی فکر تو کر سکتا ہے۔ اس میں اس کی شان میں فرق نہیں آتا۔ لیکن جب وہ تمہاری روحانی غذا کی طرف توجہ کرے۔ تو تم کو یہ اعتراض سوجھتا ہے۔ کہ انسان جیسے حقیر وجود کی طرف خدا تعالیٰ کو کلام بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔

دِفْءٌ

مَنَافِعُ

آیت والانعام میں انسانی خصومت کا جواب

تعجب ہے کہ ہمیشہ سے یہ متضاد اعتراض نبیوں اور نبوت پر ہوتے چلے آئے ہیں۔ نبیوں کے دشمن ایک طرف تو یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اُن حقیر لوگوں کو خدا تعالیٰ کیوں چن سکتا تھا۔ اگر چنتا تو کسی بڑے آدمی کو چنتا۔ دوسری طرف یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی شان بلند ہے

تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ

جب تم انہیں صبح کو چرنے کیلئے چھوڑتے ہو۔ اور وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر اس (دور کے) شہر تک بھی لے جاتے ہیں

لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ

جہاں تک تم اپنی جانوں کو مشقت میں ڈالے بغیر نہیں لے جا سکتے۔ تمہارا

الجمال

اس کی نسبت یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ حقیر انسان کی طرف توجہ کرے گا۔ اور اس کے لئے الہام بھیجے گا۔ فلاسفر خصوصاً یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ دونوں اعتراض غلط ہیں اور متضاد بھی۔ کیونکہ ایک اعتراض سے تو اپنا بڑا ہونا اور نبیوں کا حقیر ہونا ظاہر کیا جاتا ہے اور دوسرے اعتراض میں اپنے حقیر ہونے کا اقرار ہوتا ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے الہام کے جوئے سے بچنا چاہتے ہیں۔

تریحون

آیت منہا تاکلون میں منہا کو پہلے رکھنے کی وجہ

یہ جو فرمایا مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ اس میں منہا کو پہلے رکھا گیا ہے جو تخصیص کے معنے دیتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض پڑ سکتا ہے کہ کیا انسان اَنعام کے سوا دوسری چیزوں کے گوشت نہیں کھاتے یا سبزیاں نہیں کھاتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تخصیص کبھی حصر کے مضمون کے اظہار کے لئے آتی ہے اور کبھی یہ بتانے کے لئے کہ اس قسم کی چیزوں میں سے یہ اہم ہے اور اس جگہ پر اس کے یہی معنے ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ تمہاری بڑی غذا اَنعام کا گوشت یا دودھ گھی ہے۔ بے شک مرغی شکار وغیرہ بھی انسان کھاتے ہیں۔ لیکن اہم غذا اَنعام کا گوشت یا دودھ گھی ہے یا جو بمنزلہ اَنعام کے ہیں۔ جیسے نیل گائے یا ہرن وغیرہ۔ یہ چیزیں انسانی غذا کا اہم جزو ہیں اور دوسری اشیاء ان سے اتر کر ہیں۔ اس آیت میں اَنعام کے دو استعمال تو کھول کر بیان فرما دیے اوّل گرمی سردی کے اثرات سے بچتے ہیں۔ یعنی ان کی کھالیں اور اون وغیرہ کو تم استعمال کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تم ان کا گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہو۔ تیسرے لفظ منافع کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد جانوروں کی تجارت بھی ہو سکتی ہے اور نسل کشی بھی۔

تسرحون

تخصیص کبھی حصر کے لئے اور کبھی اہمیت کے لئے آتی ہے۔

اس آیت میں تخصیص اہمیت کیلئے ہے

حل لغات۔ اَلْجَمَالُ:۔ اَلْحُسْنُ فِی الْخَلْقِ وَالْخُلُقِ۔ جمال ظاہری و باطنی خوبی کو کہتے ہیں (اقرب) اس جگہ جمال سے مراد جمال معنوی ہے یعنی عزت۔ کیونکر جس شخص کا گلہ صبح و شام آتا جاتا ہے وہ لوگوں میں معزز ہوتا ہے۔

تُرِيْحُوْنَ:۔ اَرَاحَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَرَاحَ الرَّجُلُ اِرَاحَةً وَاِرَاحًا کے معنے ہیں رَاحَتْ عَلَيْهِ اِبِلُهٗ وَغَنَمُهٗ وَمَالُهٗ وَلَا يَكُوْنُ ذَالِكَ اِلَّا بَعْدَ الزَّوَالِ۔ اس کے جانور (اونٹ۔ بکریاں وغیرہ) شام کو چر کر آگئے۔ اور اَرَاحَ الْاِبِلَ وَالْغَنَمَ کے معنے رَدَّهَا اِلَى الْمُرَاحِ کے بھی ہیں۔ یعنی انہیں ان کے تھانوں کی طرف واپس لوٹایا (اقرب) پس تُرِيْحُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ تمہارے پاس تمہارے جانور شام کو چر کر آتے ہیں۔ یا تم شام کو جانور چرا کر واپس لاتے ہو۔ تَسْرَحُوْنَ۔ سَرَحَ (يَسْرَحُ سَرْحًا) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور سَرَحَ الرَّاعِي الْمَوَاشِيَ کے معنے ہیں۔ اَسَامَهَا اَيْ اَرْسَلَهَا تَرْعٰى۔ جانور کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ (اقرب) پس تَسْرَحُوْنَ کے معنے ہوں گے تم جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑتے ہو۔

تفسیر:۔ یعنی یہ جانور تمہاری عزت اور بڑائی کا موجب بھی ہوتے ہیں۔ تم فخر کرتے ہو کہ میرے پاس اس قدر بھینسیں ہیں۔ اس قدر گائیں گھوڑے اونٹ بکریاں ہیں۔ غرض ان کو اپنی عزت کا ذریعہ بناتے ہو۔ پھر سوچو تو سہی کہ تم اپنی چیزوں کو جو تمہاری مخلوق بھی نہیں اپنے لئے جمال کا موجب بناتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ خیال کرتے ہو کہ انسان کو پیدا کر کے وہ اسے یوں ہی چھوڑ دے۔ حتی کہ وہ اس کی سوجھت کی بجائے

رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ

رب یقیناً (تم پر) نہایت شفقت کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ ۵۵ اور (اُس نے) گھوڑوں اور خچروں

وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۝ وَيَخْلُقُ مَا

اور گدھوں کو (بھی) تمہاری سواری کے لئے اور (نیز) زینت (وشان) کے لئے (پیدا کیا ہے) اور (آئندہ بھی) وہ (تمہارے لئے سواری وغیرہ کا

اس پر اعتراض کرے اور بجائے اس کے کہ اس کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی اعلیٰ شان ظاہر ہو اس کی پیدائش موجب اعتراض بن جائے۔ تم کیوں خیال نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو خالق ہے۔ وہ بھی یہی چاہے گا کہ اس کی مخلوق اس کے لئے جمال کا موجب ہو یعنی اعلیٰ اخلاق اور دین والی ہو جس کو دیکھ کر انسان محسوس کرے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی اعلیٰ مخلوق پیدا کی ہے

یہاں تُرِیْحُوْنَ یعنی شام کو جانوروں کے آنے کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور تَسْرَحُوْنَ یعنی صبح کو انہیں چرنے کے لئے بھیجنے کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ حالانکہ جانور پہلے گھر سے جاتا ہے اور پھر شام کو واپس آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ جمال کا ذکر ہے اور جانوروں کے صبح گھر سے نکلنے کی نسبت شام کو گھر آنے کی حالت میں جمال زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ شام کو کھلا پھرنے اور پیٹ بھر کر گھاس کھا لینے کے بعد وہ تروتازہ نظر آتے ہیں۔ نیز اس لئے بھی کہ صبح جب جانور جاتے ہیں۔ تو انسان کے دل میں خطرہ ہوتا ہے کہ کوئی جانور کھویا نہ جائے۔ یا کوئی درندہ اُسے نہ پھاڑ کھائے۔ مگر جب شام کو جانور صحیح سلامت گھر کی طرف لوٹتے ہیں تو انسان کا دل مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ ان کو دیکھ کر اپنے اندر فخر محسوس کرتا ہے۔

۵۵ حل لغات۔ شِقّ کے معنے ہیں الْمَشَقَّةُ مشقت۔ (اقرب) رَءُوْفٌ:۔ رَأَفَ (یرأَف ورَإِفَ یَرْأَفُ رَافَةً) سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور رَأَفَ اللّٰہ بِكَ کے معنے ہیں رَحِمَ اشَدَّ الرَّحْمَةِ۔ کہ اللہ نے تجھ پر بہت رحمت کی (اقرب) رأفت کے معنے رحم کے ہوتے ہیں

اس کے استعمال کو دیکھنے سے پتہ لگتا ہے کہ رأفت محبت والے جذبہ کو کہتے ہیں۔ رحم کے موجبات کئی ہوا کرتے ہیں۔ بیکسی کسی کی تکلیف اور دکھ کو دیکھ کر دل میں جو ہمدردی اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ اُسے رأفت کہتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کے رؤوف ہونے کے یہ معنے ہیں کہ وہ دُکھوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے اُس نے مخلوق کو تکلیف سے بچانے کیلئے ہر قسم کی آرام دہ چیزیں بنادی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کیلئے رؤوف کے لفظ کے استعمال کا مطلب

تفسیر:- یہ جانور تمہارے بوجھ اُٹھاتے ہیں اور وہاں لے جاتے ہیں جہاں تم بغیر تکلیف کے نہیں پہنچ سکتے تھے یعنی یہ نہ ہوتے تو بوجھ اُٹھا کر چلنا پڑتا اور تکلیف میں پڑتے۔ پھر سوچو کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے جسمانی سفر کے لئے اس قدر سامان سہولت پیدا کئے ہیں۔ تو کیوں وہ روحانی سفر کے لئے سامان پیدا نہ کرے گا۔ اور تم ان روحانی سامانوں کو دیکھ کر کیوں یہ کہنے لگ جاتے ہو کہ انسان جیسے حقیر وجود کے لئے خدا یہ کام کس طرح کر سکتا تھا۔ تم خدا تعالیٰ کی بڑائی کا راگ اس موقعہ پر محض بہانہ سازی کی غرض سے الاپتے ہو لیکن یہ بھول جاتے ہو کہ وہ بڑی شان والا بھی ہے مگر ساتھ رؤوف اور رحیم بھی تو ہے۔ علو شان والے وجود جب رؤوف و رحیم بھی ہوں تو کمزوروں کے بوجھ اٹھاتے ہیں اور اس میں ان کی ہتک نہیں ہوتی بلکہ ان کی شان کا اظہار ہوتا ہے ؛

جسمانی سفر کا ذکر کرکے روحانی سفر کیطرف اشارہ

آیت میں شام کو جانوروں کے آنے کا ذکر صبح چھوڑنے سے پہلے کرنے کی وجہ

شِقّ
رَءُوْف

لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا

مزید سامان) جسے تم (ابھی) نہیں جانتے پیدا کریگا ۹؎ اور (تمہیں سیدھی راہ (کا بتانا بھی) اللہ تعالیٰ) ہی کے ذمہ ہے۔ اور (اسکی ضرورت اس لئے ہے کہ) ان میں سے

ع ۹ جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ هُوَ

بعض (راستے) ٹیڑھے (ہوتے) ہیں۔ اور اگر وہ (اپنی (ہی) مشیت نافذ کرتا تو تم سب کو ہدایت (ہی) دیتا ۱۰؎ وہ

الخیل

۹؎ حل لغات۔ الخَيْل: جماعة الافراس گھوڑے۔ خَیل کا لفظ جمع ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مفرد نہیں آتا۔ (اقرب)

البغال

البِغَال: اَلْبَغْل کی جمع ہے اور اَلْبَغْلُ کے معنے ہیں حَيَوَانٌ اَهْلِيٌّ لِلرَّكُوب والحمل اَبُوْهُ حِمَارٌ وَاُمُّه فَرَسٌ۔ خچر۔ وَيتوَسَّعُ فيه فَيُطْلَقُ على كُلِّ حيوانٍ اَبُوْهُ من جنسٍ واُمُّهُ من اٰخَر۔ اس جانور پر بھی یہ لفظ اطلاق پاتا ہے جس کے ماں باپ دو مختلف جنسوں سے ہوں یعنی دوغلا (اقرب)

دو قسم کی اشیاء کی پیدائش کی چھ غرضیں

الحمیر

الحَمِيْر: حمار کی جمع ہے۔ اس کے معنے ہیں۔ گدھے۔ اس کے علاوہ حمار کی جمع اَحْمِرَةٌ وحُمُرٌ بھی آتی ہے (اقرب)

تفسیر:۔ زِيْنَةً۔ زینت سے یہاں مراد خالی زینت نہیں۔ کیونکہ پہلے وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ فرما چکا ہے۔ اس سے وہ زینت مراد ہے جو لِتَرْكَبُوْهَا کے ساتھ تعلق رکھتی ہے یعنی طاقت۔ قوت۔ شوکت اور دبدبہ کا اظہار۔

گھوڑے۔ خچریں اور گدھے جنگی قوموں کو طاقت کا مظاہرہ کرنے میں مدد دیتے ہیں اور یہاں زینت سے یہی مراد ہے۔

زِيْنَةً پر نصب اس لئے آئی ہے کہ یہ خَلَقَ کا مفعول لہٗ ہے

انسانوں کے نفع کے لئے دو قسم کی چیزوں کی پیدائش کا ذکر

فرمایا دو قسم کی چیزیں تمہارے واسطے پیدا کی ہیں۔

(۱) وہ جن سے تم کو غذا ملتی ہے تم ان کا گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہو ان سے گرمی سردی سے بچاؤ کا سامان حاصل کرتے ہو۔ اور وہ تمہارے لئے لوگوں میں عزت و فخر کا موجب ہوتے ہیں اور پھر وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر دوسرے شہروں تک پہنچاتے ہیں، جیسے اونٹ گائے وغیرہ

پہلی قسم کی اشیاء

یہ جانور اہلی زندگی میں کام آنے والے ہیں۔

(۲) دوسری وہ چیزیں ہیں جو تمہاری جنگی اور سیاسی زندگی میں کام آتی ہیں۔ کیونکہ ان سے جنگ وغیرہ میں کام لیا جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں چھ غرضوں کے لئے بنائی گئی ہیں۔

۱۔ موسموں کے اثرات سے حفاظت کے لئے

۲۔ غذا کے مہیا کرنے کے لئے

۳۔ عزت و فخر کے لئے

۴۔ بوجھ اٹھانے کے لئے

۵۔ سفر میں سواری کے کام آنے کے لئے

۶۔ طاقت اور قوت کا موجب بننے کے لئے

جب ان چھ دنیوی اور مادی ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ نے پورا کیا ہے۔ تو تم کس طرح خیال کرتے ہو کہ اسی قسم کی چھ روحانی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے، اللہ تعالیٰ نے سامان نہ پیدا کئے ہوں گے۔

دوسرے ان آیات میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تم دوسری مخلوق سے باوجود اس کے خالق نہ ہونے کے ہر طرح کے کام لیتے ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ جو تمہارا محتاج نہیں اور تم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اُسے یہ حق بھی نہیں دیتے کہ تمہاری اصلاح کرکے تم کو ایسا بنائے کہ تم اس کی سبوحیت اور قدوسیت کی دلیل اور اس کی بڑائی کے اظہار کا ذریعہ ہو۔

القصد

۱۰؎ حل لغات۔ القَصْدُ: قَصَدَ کا مصدر ہے اور قَصَدَهٗ (وله واليه) کے معنے ہیں۔ اِعْتَزَمَ عليه وتَوَجَّهَ اليه۔ کسی چیز کا ارادہ کرلیا اور اس کی طرف گیا۔ قَصَدَ اليه۔ اِعْتَمَدَهٗ۔ اس پر اعتماد کیا۔ قصد فی الامر۔ ضِدُّ اَفْرَطَ۔ کسی معاملہ میں میانہ روی اختیار کی۔ القصْدُ

استقامۃُ الطّریقِ۔ راستہ کا سیدھا ہونا۔ نقیضُ الافراط۔ میانہ روی۔ وَعَلَى اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ ای بیانُ الطریقِ المستقیمِ الموصلِ اِلیَ الحقِ۔ اور عَلَى اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ کے معنے ہیں حق تک پہنچانے والے سیدھے رستے کا بیان کرنا اللہ کے ذمہ ہے (اقرب)

جَائِرٌ :۔ جَارَ (یَجُوْرُ۔ جَوْرًا) سے اسم فاعل ہے۔ اور الجائر کے معنے ہیں۔ الحائدُ عَنِ القصدِ راستہ کی سیدھ سے ایک طرف ہونے والا۔ الزّائغُ عَنِ الطّرِیقِ۔ کج رَو۔ الظّالِمُ۔ ظالم۔ (اقرب)

تفسیر:۔ وَعَلَى اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ کے معنے ہیں۔ خدا تعالےٰ پر سیدھے راستے کا بتانا واجب ہے۔ یعنی حَقٌّ عَلَى اللّٰہِ بَیَانُ قَصْدِ السَّبِیْلِ۔ یہی مضمون دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی (سورۃ اللّیل) یعنی ہدایت کا بیان کرنا ہمارا ہی کام ہے۔ اور ہم ہی پر واجب ہے۔ قَصْدُ السَّبِیْلِ سے بتایا کہ سیدھا راستہ یا افراط و تفریط سے محفوظ راستہ اللہ تعالےٰ ہی بتا سکتا ہے۔ ورنہ انسان جب بھی دنیا کے لئے کوئی رستہ تجویز کرتا ہے اس میں افراط و تفریط سے کام لیتا ہے۔

اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ کوئی انسان بھی ایسا نہیں (سوائے اس کے جو خدا تعالےٰ کی نگرانی میں ہو) جو جنبہ دار نہ ہو کسی سے اُسے عداوت ہوتی ہے کسی سے محبت۔ کسی کو اپنا سمجھتا ہے اور کسی کو غیر۔ اس لئے انسانی قوانین میں ہمیشہ یہ نقص ہوتا ہے کہ بعض کے حقوق تلف کئے جاتے ہیں اور بعض کو زیادہ دیا جاتا ہے۔ پس وہ قانون جس میں سب کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ نہ کسی کے حق میں کمی کی جائے۔ نہ کسی کا حق لے کر دوسرے کو دیا جائے صرف اللہ تعالےٰ بنا سکتا ہے جو مخلوق کی مدد کا محتاج نہیں۔ اور سب ہی اس کے بندے ہیں۔

یہ کیسی زبردست سچائی ہے۔ ہزاروں سالوں سے انسان قانون بنا رہا ہے۔ مگر کس طرح اس میں کسی کی حق تلفی کی جاتی ہے اور کسی کو حق سے زیادہ دیا جاتا ہے۔ آج کل کے سیاسی اختلافات کو ہی دیکھو۔ کوئی حکومت مزدوروں کے حق کو دبا رہی ہے تو کوئی اُنہی کو سب کچھ دے کر دوسروں کو حقوق انسانیت سے ہی محروم کر رہی ہے۔

جائر

اسی طرح انسان چونکہ جذبات کا غلام ہوتا ہے۔ جو قانون بناتا ہے وہ اپنے جذبات کو نمایاں کر دیتا ہے۔ ساری دنیا کے جذبات کا خیال نہ رکھتا ہے نہ رکھ سکتا ہے اگر رہبانیت کی طرف میلان رکھنے والا دنیا ترک کر دینے کا نام ہی نیکی رکھتا ہے تو دنیا کا حریص دنیوی ترقیات کا نام ہی نیکی رکھتا ہے۔ اس نقص سے وہی تعلیم پاک ہو سکتی ہے جو انسان کے پیدا کرنے والے کی طرف سے ہو۔ جو سب انسانوں کے جذبات سے واقف ہو اور سب کے جذبات کو مناسب حد تک ابھارنے کا خیال رکھے۔

روحانی کلام میں چھ باتوں کا پایا جانا

اس اسلوب بیان سے ظاہر ہے کہ ہر روحانی کلام میں بھی ان چھ باتوں کا پایا جانا ضروری ہے:۔

(۱) سردی گرمی کے اثرات سے بچاوے یعنی افراط و تفریط سے محفوظ رکھے۔ محبتِ الٰہی کی کمی کا نام سردی ہے۔ اور مذہب کے معاملہ میں غلو سے کام لیتے ہوئے لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنا اور انہیں مجبور کرنا کہ وہ اس مذہب کو قبول کریں گرمی ہے۔ کلام الٰہی کا کام یہ ہے کہ ایک طرف محبتِ الٰہی پیدا کرے اور دوسری طرف اپنے پیروؤں کو میانہ روی سے زندگی بسر کرنے کی تلقین کرے

(۲) وہ غذا کا کام دے۔ یعنی وہ روحانی طاقتوں کا ضروری مجموعہ ہو۔ اس میں وہ باتیں بتائی گئی ہوں جس سے بدی کی رغبت سرد پڑتی ہو۔ اور ایسے عقائد کی تلقین کی گئی ہو جن سے اصلاح ہو کر روحانی طاقت و قوت پیدا ہو۔

(۳) وہ جمال کا موجب ہو۔ یعنی جو لوگ اس تعلیم پر عمل کریں وہ خوبصورت نظر آئیں۔ یعنی اچھے معلوم ہوں۔

سبیل مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے

دنیا ان کو دیکھ کر محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کلام نے ان لوگوں کے اندر تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

(۴) وہ سواری کا کام دے۔ یعنی انسان کی ذات کو عرفان الٰہی کے ذریعہ سے جلد سے جلد خدا تعالیٰ تک پہنچا دے۔ اور ایک روحانی سفر کو غیر معمولی طوالت سے بچائے۔

ضمیر کو السبیل کی طرف راجع کرنے میں ایک نکتہ

(۵) وہ انسان کے بوجھوں کو اٹھانے والا ہو یعنی انسان کو اس کی ذمہ واریوں کا احساس کرائے اور اسے رسوم وعادات کی تکلیف دہ زنجیروں سے آزاد کر کے حریت سے کام کرنے کے قابل بنائے۔

(۶) طاقت وقوت دینے والا ہو یعنی اس پر عمل کرنے سے دین اور دنیا میں عزت حاصل ہو قوم کا نظام مضبوط ہو اور وہ دنیا میں باوقار زندگی بسر کرنے والی ہو۔ اور آخرت میں عزت پائے۔ جس کلام میں یہ چھ باتیں نہ ہوں۔ وہ کلام الٰہی کہلانے کا مستحق نہیں۔

منہا جائر کا مطلب

وَمِنْهَا جَائِرٌ۔ لوگ کہہ سکتے تھے کہ انسان کے خدا تک پہنچنے میں الہام الٰہی کی کیا ضرورت تھی۔ انسان خود ہی پہنچ جاتا اور خود ہی راستہ تلاش کر لیتا۔ اس کے جواب میں فرمایا۔ کہ وَمِنْهَا جَائِرٌ۔ خود تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ بعض راستے غلط ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ سیدھا راستہ نہ بتائے تو بہت سے انسان غلط راستوں پر چل پڑیں گے اور تباہ ہو جائیں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہر انسان تسلیم کرتا ہے کہ بعض طور اور طریق ناپسندیدہ ہوتے ہیں اور باوجود اس کے بعض لوگ انہیں اختیار کر لیتے ہیں مگر باوجود اس اقرار کے بعض لوگ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آئے۔

منہا کی ضمیر السبیل کی طرف جاتی ہے

مِنْهَا کی ضمیر السبیل کی طرف جاتی ہے۔ کیونکہ وہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مذکر کی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ج وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا (اعراف ع ۱۷) اور مؤنث کی مثال یہ آیت ہے۔ قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ (یوسف ع ۱۲) تاج العروس میں بعض ادباء کا قول ہے۔ کہ سبیل مذکر ہی ہے۔ اس کی طرف مؤنث کی ضمیر بالمعنیٰ پھرائی جاتی ہے۔ اور سبیل کے معنے محجّة کے لئے جاتے ہیں مگر یہ امتیاز صرف علمی ہے۔ اصل مضمون پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

یہاں ضمیر کو السبیل کی طرف راجع کر کے ایک عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ انبیاء کے ذریعہ سے قصد السبیل (صراط مستقیم) بتاتا ہے۔ پھر اس سیدھے راستے سے بگڑ کر ٹیڑھے راستے نکل آتے ہیں پس ایک الہام کے نزول کے بعد دوسرے الہام کے نزول کی ضرورت باقی رہتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب کے نازل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیونکہ جب لوگ قصد السبیل کو کاٹ کر اس میں سے جائر رستے نکال لیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کیلئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ پھر ایک اور نبی کی معرفت سیدھا راستہ لوگوں کو بتا دے۔

صرف ضمیر کے مرجع سے اس وسیع مضمون کیطرف توجہ دلا دی گئی ہے کہ سچے دین آخر بگڑ کر گمراہی کا موجب ہو جاتے ہیں اور یہ کہ جائر راستے بھی قصد السبیل کے بگڑنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ پس کسی مذہب کا ابتدائے نزول میں سچا ہونا اُسے ہر وقت کے لئے قابل عمل ثابت نہیں کرتا۔

وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ۔ اس میں فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہدایت کا کام اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا۔ تو اس کا ایک ہی منصفانہ طریق ہو سکتا تھا کہ انسانی فطرت کو ایسا بنا دیا جاتا۔ کہ وہ غلطی کیطرف جا ہی نہ سکتی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ یہ حکمت کے خلاف تھا اور جب اس نے ایسا نہیں کیا اور انسان کو مقدرت دی ہے کہ وہ غلط راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے یا صحیح راستہ کو غلط بنا سکتا ہے۔ تو پھر اس کے سوا اور کونسا منصفانہ طریق رہ جاتا ہے کہ وہ ہدایت نازل کر کے انسان کو گمراہی سے بچنے اور روحانی ترقی کرنے کا موقعہ دیتا رہے۔

الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ

وہ (پاک) ذات ہے جس نے بادلوں سے پانی اتارا ہے اسی میں سے تمہارے پینے کا (پانی جمع کیا جاتا) ہے

وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ○ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ

اور اسی سے وہ درخت (تیار) ہوتے ہیں جنہیں تم (مویشیوں کو) چراتے ہو ؎۱۱ وہ اس کے ذریعہ سے تمہارے لئے

؎۱۱ **حل لغات**۔ السَّمَاءُ کے معنے ہیں آسمان۔ كُلُّ مَا عَلَاكَ فَاظَلَّكَ - ہر اوپر سے سایہ ڈالنے والی چیز۔ سَقْفُ كُلِّ شَيْءٍ وَّكُلِّ بَيْتٍ: چھت رُوَاقُ الْبَيْتِ۔ برآمدہ۔ ظَهْرُ الْفَرَسِ۔ گھوڑے کی پیٹھ۔ السَّحَابُ۔ بادل۔ الْمَطَرُ۔ بارش۔ الْمَطْرَةُ الْجَيِّدَةُ ایک دفعہ کی برسی ہوئی عمدہ بارش۔ الْعُشْبُ۔ سبزہ و گیاہ (اقرب)

تُسِيْمُوْنَ: اَسَامَ (جس کا مجرد سام ہے) کا مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَسَامَ الْاِبِلَ اِسَامَةً کے معنے ہیں۔ اَرْعَاهَا۔ اونٹوں کو چرایا۔ وَقِيْلَ اَخْرَجَهَا اِلَى الْمَرْعٰى۔ اور بعض نے اَسَامَ الْاِبِلَ کے معنے یہ کئے ہیں کہ اونٹوں کو چراگاہ کی طرف نکالا (اقرب)۔ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ اسی پانی سے وہ درخت تیار ہوتے ہیں جن میں تم مویشیوں کو چراتے ہو۔

تفسیر:۔ سماء کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے۔ بادل کے بھی ہوتے ہیں اور اس جگہ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے بادل کے معنے ہی ہیں۔ فرماتا ہے۔ وہ بادل جن سے تم کو پینے کا پانی ملتا ہے اور جن کے ذریعہ سے وہ درخت اور پودے اُگتے ہیں جن سے تمہارے گلوں کو چارہ ملتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہی تو اتارا ہے۔

قرآن کریم کے پہلے مخاطب عرب تھے جن کے ملک میں کنویں کم ہیں۔ زیادہ حصہ ملک کا باولیوں سے پانی پیتا ہے۔ جن میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ اگر وہ پانی جمع نہ کیا جائے تو وہ پیاسے مر جائیں۔ مکہ مکرمہ میں بھی صرف ایک چشمہ زمزم کا ہے جس کا پانی سخت کھارا ہوتا ہے۔ اور نہر زبیدہ کے نکلنے سے پہلے وہاں پینے کا پانی باولیوں سے ہی مہیا ہوتا تھا۔ بلکہ اب تک بھی نہر زبیدہ کے نکلنے کے باوجود پانی کا کچھ حصہ باولیوں سے ہی مہیا کیا جاتا ہے۔ جو پیپوں میں ڈال کر لوگ فروخت کرنے کے لئے مکہ میں لاتے رہتے ہیں۔ باقی ملک کا اکثر حصہ بھی ایسے ہی پانیوں پر گذارہ کرتا ہے۔ اور چونکہ عرب کا اکثر حصہ اونٹوں اور بکریوں بھیڑوں کے گلوں پر گذارہ کرتا ہے۔ ان کا چارہ یعنی درخت بھی اسی پانی سے پلتے ہیں۔

اس آیت میں بھی اسی پہلے مضمون کی طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کاموں کی سہولت کے لئے قانون قدرت میں ہزاروں اشیاء پیدا کی ہیں جن سے تم فائدہ اٹھاتے ہو۔ پھر کیوں نہیں سمجھتے کہ تمہاری روحانی آسائش کا سامان بھی وہ ضرور کرے گا۔ اور جب کہ دُنیوی سامانوں کو تم شوق سے قبول کرتے ہو۔ کیوں اس کے بنائے ہوئے روحانی سامانوں کو قبول نہیں کرتے۔ اور جب کہ تم یہ مانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کا تمہاری جسمانی ضرورتوں کو پیدا کرنا اس کی شان کے خلاف نہیں۔ تو یہ کیوں سمجھتے ہو کہ خدا تعالیٰ کا روحانی سامان پیدا کرنا اسکی شان کے خلاف ہے۔

حق یہ ہے کہ جو خدا تعالیٰ کے وجود کا ہی انکار کرتا ہو اور مادی سامانوں کو آپ ہی آپ سمجھتا ہو۔ وہ تو یہ کہہ بھی سکتا ہے کہ نہ کوئی خدا ہے نہ وہ کوئی سامان پیدا کرتا ہے۔ لیکن جو خدا تعالیٰ کے وجود کو مانتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ خدا تعالیٰ نے اس دنیا کے سامانوں کو پیدا کیا ہے اُسے تو اس بات کے کہنے کا ہرگز کوئی حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کیا پڑی ہے یا اُسے کیا حق ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے نبی بھیجے اور کتابیں اتارے۔ کیونکہ

السماء

عرب میں باولیاں کی کثرت

تسیمون

ظاہری سہولتوں کے پیدا کرنے سے روحانی سہولتوں کی طرف اشارہ

سماء کے معنے بادل

اللہ تعالیٰ کو خالق ماننے والے کا حق نہیں کہ وہ نبیوں کا انکار کرے

الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ

کھیتی اور زیتون اور کھجور کے درخت اور انگور اور (دوسرے)

كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

ہر قسم کے پھل (بھی) پیدا کرتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو فکر سے کام لیتے ہیں اس میں یقیناً ایک نشان (پایا) جاتا ہے ۱۲ؗ

اس کا ایک عقیدہ دوسرے عقیدہ کو رد کرتا ہے اور اُسے اپنی غلطی معلوم کرنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ قانونِ قدرت جس قدر سامان پیدا کرتا ہے۔ وہ حقیقتاً انسان ہی کے کام آتے ہیں۔ پانی بھی اُترتا ہے تو اس کے لئے۔ کیونکہ جانور اور درخت اگر اس سے پلتے ہیں۔ تو ان کو بھی تو انسان ہی استعمال کرتا ہے۔ پس آخری نقطہ کائنات کا انسان ہی ہے۔ اور اس کی روحانی ترقی کے سامان پیدا کرنا خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف نہیں۔ بلکہ پیدا نہ کرنا اس کی شان کے خلاف ہے۔ کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جس کے فائدہ کے لئے ایک حیرت انگیز وسیع نظام بنایا۔ لیکن اس کی پیدائش کا کوئی اعلیٰ مقصد نہ قرار دیا۔

قانونِ قدرت سے پیدا شدہ سب اشیاء انسان ہی کے کام آتے ہیں

جس طرح زمین اُگانے کیلئے پانی کی محتاج ہے اسی طرح عقل جوہر دکھانے کیلئے پانی کی محتاج ہے

پہلی آیات میں حیوانات کی پیدائش کا ذکر تھا اور حیوانی غذا کا۔ اس آیت میں پانی کا ذکر کیا اور نباتی غذا کا۔ اسی مضمون کو اگلی آیت میں اور وسیع کیا گیا ہے۔

۱۲ؗ تفسیر:۔ پہلی آیت میں پانی کا ذکر کیا گیا تھا جسے انسان پیتے ہیں۔ اور ایسے درختوں کی پیدائش کا ذکر کیا تھا جن سے جانور پلتے ہیں۔ اور پھر ان جانوروں سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ اب ایسی نباتی غذاؤں کا ذکر فرماتا ہے جن کو براہ راست انسان استعمال کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ اس پانی سے کچھ اور نباتات بھی اُگتی ہیں جن کو انسان براہِ راست استعمال کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو کھیتیاں ہیں جن سے انسانی غذا کے لئے غلّہ پیدا ہوتا ہے۔ کچھ درخت ہیں جن سے انسان کے کھانے کے لئے پھل اترتا ہے۔ جیسے زیتون اور کھجور اور انگور

الہام کے بغیر فطرت کو نشو و نما نہیں ہوتا۔

اور ان کے علاوہ اور بھی کئی اقسام کے میوے اور پھل پھر کیا تم اس امر پر غور نہیں کرتے کہ جس طرح انسان کے سوا دوسرے حیوانات انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح نباتات بھی اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ زمین میں اُگانے کی خواہ کس قدر بھی طاقت ہو وہ آسمانی پانی کے بغیر کچھ نہیں اُگا سکتی اسی طرح انسانی فطرت کا حال ہے کہ انسانی ذہن اور انسانی عقل خواہ کس قدر اعلیٰ ہو۔ وہ اپنے جوہر دکھلانے کے لئے آسمانی پانی کی محتاج ہے۔ اور اس پانی کے بغیر انسانی عقل کی تکمیل نہیں ہوتی۔ پس صرف اپنی عقل پر اپنی روحانی ترقیات کا انحصار رکھنے والا ایسا ہی ہے۔ جیسے کہ وہ شخص جو بغیر پانی کے کھیتی اُگانے کی کوشش کرے۔ بے شک کھیتی بعض دفعہ اُگ تو آئیگی مگر وہ اپنی پوری شان ظاہر نہیں کرے گی۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ نبی کون سی نئی چیز دنیا میں لاتے ہیں۔ سب باتیں جو وہ کہتے ہیں۔ پہلے سے ہی انسانی فطرت میں موجود ہیں۔ ان کا بھی اس آیت میں جواب دیا گیا ہے اور پانی کی مثال سے بتایا ہے کہ کسی چیز کا موجود ہونا اور بات ہے اور اس کا نشو و نما پانا اور بات ہے۔ گو سب کچھ جو نبی بتاتے ہیں۔ فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن الہام کے بغیر فطرت کو نشو و نما نہیں حاصل ہوتا جس طرح پانی کے بغیر زمینی طاقتیں اُبھرتی نہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ جب بیج اور نشو و نما کی طاقت زمین میں موجود ہے تو پانی کی کیا ضرورت ہے۔ پانی نہ بیج لاتا ہے اور نہ زمین میں نشو و نما کی طاقت پیدا کرتا ہے۔ مگر ہر اک جانتا ہے کہ پانی بیج اور نشو و نما کی طاقت لاتا تو نہیں۔ بہ وہ نشو و نما کی

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ

اور اس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے بے اُجرت خدمت پر لگا رکھا ہے.

وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

اور (دوسرے) تمام (سیارے اور) ستارے (بھی) اس کے حکم سے بلا اجرت (تمہاری) خدمت پر متعین ہیں جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کیلئے اس میں

لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۙ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا

یقیناً کئی نشان (پائے جاتے) ہیں ۱۳ اور جو کچھ اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کیا ہے جسکی مختلف قسمیں ہیں (وہ بھی

طاقت کو اُبھارتا ضرور ہے اور اس کے بغیر وہ طاقت بالفعل اپنا اظہار یا کرتی ہی نہیں یا بہت کم کرتی ہے۔ یہی حال الہام کا ہے کہ وہ نئی فطرت نہیں بناتا۔ لیکن فطرت کی خوابیدہ طاقتوں کو اُبھارتا ہے۔

جس طرح حیوانی فوائد کے بیان میں ترتیب کو مدنظر رکھا گیا تھا کہ پہلے حیوانی غذا کا ذکر کیا تھا جو انسان کیلئے نہایت ضروری ہے اور پھر حیوانات کے دوسرے فوائد بیان کئے تھے جو گو ویسے ضروری نہیں۔ لیکن انسانی شان کے بڑھانے والے ہیں۔ نباتات کے ذکر میں بھی پہلے کھیتی کا ذکر کیا ہے جو عام انسانی غذا پیدا کرتی ہے۔ پھر زیتون کا جو روٹی کے ساتھ سالن کا کام دیتا ہے اور پھر کھجور کا جو غذا بھی ہے اور میوہ بھی۔ اور پھر انگور اور دوسرے پھلوں کا جو ضروری غذا تو نہیں لیکن انسانی صحت اور دماغی طاقتوں کے بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں۔

شاید کوئی اعتراض کرے کہ انسان کی مقدم غذا حیوانی نہیں کیونکہ ایک خاصہ طبقہ دنیا کا صرف نباتی غذا استعمال کرتا ہے۔ مگر یہ اعتراض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہوگا۔ کیونکہ جو حیوانی غذا استعمال نہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ بیشک گوشت تو نہیں کھاتے۔ مگر انکی اہم غذا بھی حیوانی ہوتی ہے۔ ماں کا دودھ پئے بغیر کتنے بچے پلتے ہیں۔ پھر کیا ماں کا دودھ حیوانی غذا نہیں؟ اور جو ماں کا دودھ نہیں پیتے وہ جانوروں کا دودھ پیتے ہیں اور وہ بھی حیوانی غذا ہے۔ اور جو لوگ حیوانی غذا کے استعمال سے بظاہر انکار کرتے ہیں وہ بڑی عمر میں بھی گھی دودھ استعمال کرتے ہیں جو حیوانی غذائیں ہیں پس ایسا آدمی کوئی بھی نہیں جس کی اہم ترین غذا حیوانی نہ ہو اور جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حیوانی غذا استعمال نہیں کرتے۔ وہ یا تو خود فریب میں مبتلا ہوتے ہیں یا جان بوجھ کر دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔ وہ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم گوشت نہیں کھاتے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کوئی حیوانی غذا بھی استعمال نہیں کرتے۔

نباتات کا ذکر ان کے فوائد کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔ غذاؤں کے ذکر کے آخر میں فرمایا کہ اس میں فکر کرنے والوں اور سوچنے والوں کے لئے نشان ہے۔ اس سے ایک تو اس طرف اشارہ کیا۔ کہ انسانی دماغ غذا سے نشوونما پاتا ہے۔ اسی طرح روحانیات سے تعلق رکھنے والا دماغ رُوحانی غذاؤں سے نشوونما پاتا ہے دوسرے اس طرف اشارہ کیا کہ فطرۃ کے اندر افکار تو موجود ہوتے ہیں۔ مگر ان کے اُبھارنے کے لئے عمدہ غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روحانی افکار بھی انسان کے اندر موجود تو ہوتے ہیں۔ مگر اُن کے ابھارنے کے لئے بھی روحانی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب انسان ایک ہی قسم کے ہیں۔ مگر ایک اعلیٰ درجہ کی قوت فکریہ رکھتا ہے دوسرا نہیں۔ اور اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ایک کو مناسب غذا ملتی ہے دوسرے کو نہیں یہی حال روحانی عالم کا ہے۔ سب ہی انسانوں کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت کا جذبہ ہے لیکن ایک آدمی جو روحانی غذائیں کھاتا ہے۔ اس کی قوتِ فکریہ کو جلا اور روشنی مل جاتی ہے دوسرے کو نہیں۔

غذا کے حیوانی ہونے کے متعلق ایک اعتراض اور اس کا جواب

۱۳ حل لغات۔ مُسَخَّرٌ کیلئے دیکھو سورۃ رعد ۳

مُسَخَّرٌ

يعقلون

يَعْقِلُوْنَ: عَقَلَ يَعْقِلُ عَقْلًا سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور عَقَلَ الغلامُ کے معنے ہیں: اَدْرَكَ لڑکا بالغ ہو گیا۔ عَقَلَ الشَّیْءَ عقلًا کے معنے ہیں: فَهِمَهٗ وَ تَدَبَّرَهٗ کسی چیز کو سمجھا اور اس پر غور کیا۔ عَقَلَ البعیرَ: ثَنٰی وَظِیفَهٗ مع ذِرَاعِهٖ فشدّهما معًا بِحَبْلٍ۔ اونٹ کی پنڈلی کو اس کی ران کے ساتھ ملا کر باندھ دیا۔ اور عقال اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اونٹ کی پنڈلی باندھی جاتی ہے۔ (اقرب) پس اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ کے معنے ہوں گے۔ کہ جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں یعنی بات کو سمجھتے اور اس پر تدبر کرتے ہیں۔ اُن کے لئے اس میں کئی نشان پائے جاتے ہیں۔

رات اور دن کے علاوہ سورج چاند وغیرہ کے ذکر کی ضرورت

جمادات سے تعلق رکھنے والی نعمتوں کا ذکر

تفسیر:- اب ایک اور قسم کی نعمتوں کا ذکر کیا جو جمادات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ان میں سے بھی اُنہی کا انتخاب کیا ہے جو انسانی دماغ کے نشوونما پر خاص طور پر اثر انداز ہوتی ہیں بیشک انسان لوہے۔ لکڑی۔ سونے۔ چاندی۔ پیتل سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے لیکن ان اشیاء سے وہ بڑا فائدہ بیرونی آرام کی قسم کا حاصل کرتا ہے۔ برتن بناتا ہے۔ مکان بناتا ہے۔ آلات بناتا ہے۔ براہِ راست ان اشیاء کا اثر انسانی دماغ پر نہیں پڑتا۔ لیکن چونکہ اس جگہ انسانی دماغ کے نشوونما کے ذکر پر زور دینا مقصود ہے۔ اس لئے جمادات کی مذکورہ بالا اقسام کی بجائے رات اور دن سورج، چاند اور ستاروں کا ذکر کیا گیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ رات اور دن تو جمادات میں سے نہیں۔ اور یہ درست بھی ہے۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ

رات اور دن در حقیقت جمادی اثرات میں ہی شامل ہونے کے مستحق ہیں۔

رات اور دن کے فوائد سورج اور چاند اور ستاروں کے اثرات سے وابستہ ہیں۔ اور وہ اجرام فلکی ان کے ذریعہ سے اپنی تاثیرات ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی اپنی شعاعوں کو نازل کر کے یا ان کو روک کر۔ اس لئے رات اور دن بھی درحقیقت جمادی اثرات میں ہی شامل ہونے کے مستحق ہیں۔

شعاعوں کی تاثیر کے متعلق سائنس کی تحقیقات

اگر کہا جائے کہ رات اور دن جب سورج اور چاند اور ستاروں کے ظہور اور فوائد پر دلالت کرتے ہیں۔ تو پھر سورج چاند وغیرہ کا الگ نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو رات اور دن ان اجرامِ فلکی کی تاثیرات کے ظہور کا نام ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی سورج اور چاند اور ستاروں کے اثرات ہیں۔ اور ان سے ایسی تاثیرات بھی دنیا پر پڑتی ہیں جو آنکھوں سے نظر آنے والی شعاعوں کے علاوہ دوسرے ذرائع سے انسان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ جیسے برقی یا مقناطیسی اثرات۔ اور ان کے سوا اور کئی قسم کی تاثیرات ہیں جو سائنس روز بروز دریافت کر رہی ہے اور کئی وہ شاید کبھی بھی دریافت نہ کر سکے پس باوجود اس کے کہ رات اور دن اجرام فلکی کی تاثیرات کے ظہور کا ذریعہ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی سورج چاند ستاروں کا نام لینے کی ضرورت تھی۔ تا ان دوسری تاثیرات کا ذکر کیا جائے جن سے انسانی دماغ فائدہ اُٹھا رہا ہے۔

اس جگہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر یہ بات ہے۔ تو پھر رات اور دن کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ سورج چاند اور ستاروں کا ذکر کافی تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج چاند اور ستاروں کی دوسری تاثیرات سے تو عرب کے لوگ ابھی واقف نہ تھے۔ صرف رات اور دن کی تاثیرات سے ان کو آگاہی تھی اور اب بھی علمی طبقہ کے علاوہ باقی لوگ رات اور دن کی تاثیرات اور ان کے فوائد سے تو آگاہ ہیں۔ لیکن سورج چاند اور ستاروں کی دوسری تاثیرات سے واقف نہیں ہیں۔ پس فائدہ کو وسیع کرنے کے لئے اور قرآن کریم کے پہلے مخاطبوں کے ذہنوں سے مضمون کو قریب الفہم بنانے کے لئے ضروری تھا کہ دن اور رات کو الگ بھی بیان کر دیا جاتا تاکہ ان کا دماغ بسہولت آیت کے مضمون کی طرف منتقل ہو سکتا۔

یاد رہے کہ سائنس کی موجودہ تحقیق نے سپکٹرم کے ذریعہ سے جو ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ سے روشنی کی شعاعوں کو پھاڑ کر الگ الگ کر لیا جاتا ہے۔ یہ معلومات حاصل کی ہیں کہ فلاں ستارے میں فلاں قسم کی دھاتیں ہیں اور فلاں میں فلاں قسم کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف روشنی ہی نہیں بلکہ روشنی کے ساتھ مختلف دھاتوں کی تاثیرات بھی دنیا پر اُترتی رہتی ہیں اور ان سے اہل دنیا کے دماغ اور قویٰ پر مختلف اثرات

نازل ہوتے رہتے ہیں۔ چاند کی شعاعوں کی تاثیرات تو کئی رنگ میں دنیا پر ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ عام طور پر ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ چاند گرہن جب مکمل ہو۔ تو حاملہ عورتوں پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے چنانچہ ایسے وقت میں حاملہ عورتیں کمروں سے باہر نہیں نکلتیں۔ گو عام طور پر اسے وہم سمجھا جاتا ہے۔ مگر میں نے اس سوال پر خاص طور پر غور کیا ہے اور معلوم کیا ہے کہ جب چاند گرہن مکمل ہو۔ تو اس کے بعد بہت سی عورتوں کی زچگی سخت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اور ان میں بکثرت موتیں ہوتی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تکلیف اٹھانے والی عورتیں وہ ہوتی ہیں جو ایسے وقت میں چاند کو دیکھتی ہیں۔ یا اس کے بغیر بھی اُن پر یہ تاثیر عمل کرتی ہے۔ مگر بہرحال میں نے کئی دفعہ اس کا تجربہ کیا ہے اور دوسروں کو بھی بتایا ہے۔ جنہوں نے اپنے تجربہ سے اس کی تصدیق کی ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تاثیر ہمیشہ ہوتی ہے یا اس کا ظہور بعض اور ستاروں کی نسبت سے ہوتا ہے۔ یعنی چاند دوسرے ستاروں سے ایک خاص زاویہ پر ہو۔ تو اس وقت اس کی یہ تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔ یا آزادانہ ہوتی ہے۔ یہ منجم ہی بتا سکتے ہیں۔ میں نے تو بعض توہمات کی تحقیق کرتے ہوئے جو چاند گرہن کی حاملہ عورتوں پر تاثیر کے متعلق ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں یہ امور مشاہدہ کئے ہیں۔ ان کو معین اور علمی صورت دینا ستاروں کے علماء کا کام ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمادات کی روشنیاں اور شعاعیں اور مقناطیسی تاثیرات بھی انسانی نشوونما پر خاص اثر ڈالتی ہیں جن میں سے بعض ظاہر ہوتے ہیں بعض مخفی۔ اور بعض بلا واسطہ ہوتے ہیں اور بعض بالواسطہ۔ بالواسطہ سے میری مراد ان تاثیرات سے ہے جو نباتات یا حیوانات پر وارد ہوتی ہیں اور پھر ان حیوانات اور نباتات کو انسان استعمال کرتا ہے۔

سورج اور چاند کی موٹی تاثیرات سے مراد وہ تاثیرات ہیں جو صحت پر پڑتی ہیں۔ دن کی روشنی کئی قسم کی بیماریوں کو دور کرتی ہے اور انسانی جسم میں صحت کا مادہ بڑھاتی ہے۔ چنانچہ

چاند کی شعاعوں کی تاثیر

جو لوگ دن رات بند کمروں میں رہتے ہیں ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح رات کی تاریکی اعصاب پر تسکین دہ اثر ڈالتی ہے۔ اسی وجہ سے رات کی نیند بہت آرام دہ ہوتی ہے بہ نسبت دن کی نیند کے۔ خصوصاً دوپہر کی نیند کے۔ کہ اُس سے نہ صرف یہ کہ آرام کم ملتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ اس سے نزلہ وغیرہ کی قسم کی بیماریاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ غرض دن کام کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے اور رات آرام کے لحاظ سے۔

سورج اور چاند کی روشنی کی تاثیر

پھر بعض قسم کی سبزیوں پر دن کی روشنی کی مبارک تاثیر پڑتی ہے اور بعض پر رات کی روشنی کی جو چاند اور ستاروں سے آتی ہے چنانچہ ککڑی رات کو اس سرعت سے بڑھتی ہے کہ دیکھ کر حیرت آتی ہے بعض دفعہ کھیت کے پاس بیٹھو تو یوں آواز پیدا ہوتی ہے گویا کہ ککڑی بیتوں میں پھیل رہی ہے اسی طرح بعض پھل چاندنی راتوں میں پکتے ہیں۔ بعض اندھیری راتوں میں۔

چاند گرہن کا اثر

اور یہ سب امور اس امر کی شہادت ہیں کہ رات اور دن اور اجرام فلکی کی تاثیرات اہل دنیا کے نشوونما پر خاص اثر ڈال رہے ہیں اور ان کا وجود صرف آنکھوں کے لئے روشنی مہیا کرنا نہیں۔ یا اعصاب کے آرام کے لئے تاریکی دینا ہی نہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ بھی ان کی وسیع تاثیرات ہیں۔ جن لوگوں کو چاند کی روشنی میں بسر کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ اس وقت خیالات میں ایک عجیب قسم کا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور قوتِ فکریہ میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رات اور دن اور سورج اور چاند اور ستارے۔ دن کا تعلق راستہ دکھانے سے بھی ہے۔

جمادات کی روشنیاں شعاعیں مقناطیسی تاثیرات انسانی نشوونما پر خاص اثر ڈالتی ہیں۔

دن کو سورج کی روشنی اگر سب فضاء کو روشن کر کے راستہ دکھانے میں ممد ہوتی ہے اور جہات اربعہ یعنی مشرق مغرب شمال جنوب کو بتا کر اگر راہگیروں کی راہنمائی کرتی ہے۔ تو رات کو چاند اپنی روشنی سے سورج کا سا کام کرتا ہے اور ستارے اپنے مقامات سے ہدایت کا موجب ہوتے ہیں۔ چنانچہ سمندروں میں جہازوں کے چلنے میں ستاروں کے مقامات خاص طور پر مدد کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رات اور دن اور سورج چاند اور ستارے انسانی دماغ کو نشوونما دینے میں

أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ○

تمہارے کام آرہا ہے) اس میں (بھی) ان لوگوں کے لئے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں یقیناً ایک نشان (پایا جاتا) ہے ۱۴؎

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا

اور وہ وہ (پاک) ذات ہے جس نے سمندر کو (بھی تمہاری) بے اجرت کی خدمت پر لگا رکھا ہے تاکہ تم اس میں سے (مچھلی وغیرہ کا) تازہ گوشت

وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ج وَتَرَى

کھاؤ۔ اور اس سے زیور (کا سامان) نکالو جسے تم (لوگ) پہنتے ہو۔ اور (اے مخاطب) تُو

حیوانی و نباتی غذا کے بعد مخفی غذا کی طرف اشارہ

اور اس کے کاموں میں سہولت پیدا کرنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور یہ جمادات میں سے ہیں جو انسان سے بہت دور کا تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی ذاتی نشوونما کی طاقت ایسی مخفی ہے کہ اس کا اندازہ ظاہری نگاہ سے نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ اپنی تاثیرات سے نباتات اور حیوانات کے نشوونما پر اور اُن کے ذریعہ سے بھی اور براہِ راست بھی انسان کے نشوونما پر خاص اثر ڈالتے ہیں۔ پس حیوانی غذا اور نباتی غذا کے بعد اس مخفی غذا کی طرف اشارہ کیا جو انسان جمادات سے اور خصوصاً ان بڑے جلوی اجرام سے جو آسمان پر ہیں حاصل کر رہا ہے۔

حیوانوں اور نباتات کے متعلق پیدا کرنے کے الفاظ اور سورج چاند کے لئے سخّر لفظ استعمال کرنے کی وجہ۔

اس جگہ ایک اور لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حیوانوں اور نباتات کے بارہ میں تو صرف یہ فرمایا تھا کہ ہم نے ان کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن رات اور دن اور سورج چاند ستاروں کے ذکر میں سَخَّرَ کا لفظ فرمایا ہے۔ جس کے معنے ہیں بغیر اجرت کے کام پر لگا رکھا ہے۔ یہ فرق اس لئے کیا کہ حیوانوں اور نباتات سے انسان جو فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کے متعلق وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے زور سے یہ فائدہ اٹھایا ہے۔ گو یہ ہے غلط۔ کیونکہ خدا تعالیٰ ان کو پیدا نہ کرتا تو وہ فائدہ کہاں سے اٹھاتا۔ مگر پھر بھی چونکہ بظاہر اس میں انسانی اختیار کا دخل ہے۔ وہاں صرف پیدائش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مگر اس آیت میں جو فوائد بیان ہوئے ہیں اُن کے حصول میں انسانی تصرف کا کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اس جگہ سَخَّرَ کا لفظ استعمال کر کے بتایا کہ کم سے کم ان اشیاء کی نسبت تو تم کو ماننا پڑے گا کہ وہ جو انسانی خدمت کر رہی ہیں، اُن کا موجب حکم الٰہی ہے۔ کیونکہ اُن پر تم کو کوئی تصرف حاصل نہیں ہے۔

اس آیت کے آخر میں یہ فرمایا کہ یہ امور عقلمندوں کے لئے نشان ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوتِ فکریہ نزدیک کی اشیاء کا حال معلوم کرتی ہے اور قوتِ عقل دور کی چیزوں سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ چونکہ پہلی آیات کی اشیاء خوراک سے تعلق رکھتی تھیں اور انسان اُن کے اثر کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اس لئے وہاں فکر کا لفظ رکھا ہے اور ان چیزوں کی تاثیر بیرونی ہے اور ان سے فائدہ اٹھانا دانش سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ فرمایا۔

۱۴؎ **حل لغات**۔ ذَرَأَ: ذَرَأَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کے معنے ہیں: خَلَقَهُمْ۔ اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا۔ ذَرَأَ الشَّيْءَ: كَثَّرَهُ۔ کسی چیز کو زیادہ کیا۔ ذَرَأَ الْأَرْضَ: بَذَرَهَا۔ زمین میں بیج بویا (اقرب)

أَلْوَان: لَوْنٌ کی جمع ہے۔ اور اللَّوْنُ کے معنے ہیں۔ مَا فَصَلَ بَيْنَ الشَّيْءِ وَ بَيْنَ غَيْرِهِ۔ یعنی لون اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے ایک چیز دوسری چیز سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اللَّوْنُ۔ النَّوْعُ قسم۔ اللَّوْنُ۔ صِفَةُ الْجَسَدِ وَهَيْئَتُهُ مِنَ الْبَيَاضِ وَالسَّوَادِ وَالْحُمْرَةِ کسی جسم کا سیاہ، سفید سرخ رنگ (اقرب)

ذَرَأَ

أَلْوَان

تفسیر:۔ ذرأ کے معنے پیدا کرنے کے ہیں۔ پس اس

جگہ ان سب اشیاء کا ذکر ہے جو دنیا میں موجود ہیں خواہ حیوانات کی قسم کی ہوں، خواہ نباتات کی قسم کی خواہ جمادات کی قسم کی۔

اس آیت سے ایک نئے مضمون کو شروع کیا اور رنگوں کے اختلاف کو پیش کیا کہ وہ بھی تاثیرات رکھتے ہیں اور انسان اُن سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ قرآن کریم کیسا عظیم الشان کلام ہے جو ان حکیمانہ امور کو اس زمانہ میں بیان فرماتا ہے جبکہ دنیا ان سے کلی طور پر ناواقف تھی۔ رنگوں کی تاثیرات کی دریافت علمی طور پر موجودہ زمانہ میں ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ بنفشئی شعاعوں اور ماوراء بنفشئی شعاعوں اور کئی قسم کی دوسری شعاعوں کی دریافت سے بیماریوں کے علاج میں غیر معمولی مدد ملی ہے اور طب میں بھی ایک نیا باب علاج باللّون کا کھل گیا ہے۔ یعنی مختلف رنگوں کی بوتلوں میں پانی رکھ کر اور سورج کی شعاعوں کے مقابل پر رکھ کر خالی پانی کو دوا کی صورت میں بدل دیا جاتا ہے۔ گو یہ طریق علاج اب تک علمی حد تک نہیں پہنچا۔ مگر اس کے بعض فوائد ناقابلِ انکار ہیں۔ ان کے علاوہ یہ امر تجربہ شدہ ہے کہ ایک ہی قسم کی اشیاء رنگ کے اختلاف کی وجہ سے مختلف تاثیرات ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً تُوت ہے۔ اس میں سے سفید گلے میں خراش کرتا ہے اور سیاہ تُوت خناق جیسی مرض میں مفید ہوتا ہے۔ صندل سفید اور سُرخ تاثیرات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بعض امور میں قوی یا ضعیف ہوتے ہیں۔ یہی حال اَور سینکڑوں اشیاء کا ہے کہ چیز ایک ہی ہوتی ہے لیکن رنگ کے تغیر سے اس کے فوائد میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ بہت سی چیزوں کے فوائد معلوم ہو گئے ہیں اور بہت سی کے ابھی مخفی ہیں۔ مگر اس حد تک اس علم کا انکشاف ہو چکا ہے کہ رنگوں کی تاثیرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ طب میں تو مختلف رنگوں سے بعض شدید بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اگر سرخ رنگ کی اکری فلیوین بیرونی زخموں کے لئے مفید ہے تو مرکیورو کروم اندرونی زخموں کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح اور کئی رنگ ہیں۔ میں نے ایک دفعہ اکری فلیوین کو دیکھ کر خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے زرد رنگ کی تاثیر زخموں کے لئے اچھی ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے پرانے زمانہ میں زخموں کے علاج کے لئے ہلدی کو بکثرت استعمال کیا جاتا تھا۔ اس خیال سے میں نے ہلدی کا رنگ الگ نکال کر زخموں کے لئے ایک ڈاکٹر کو دیا۔ انہوں نے تجربہ کرکے بتایا کہ گو اکری فلیوین جیسی تاثیر تو نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ملتی ہوئی تاثیر اس دوا میں ضرور تھی۔ اس فرق کی وجہ میں نے یہ سمجھی کہ اس حد تک ہم اس کا جوہر نہیں نکال سکا جس حد تک کہ جرمنوں نے نکال لیا ہے۔ ورنہ بات وہی ہے۔ غرض رنگوں کی تاثیرات ایک ثابت شدہ حقیقت ہیں۔

ذرأ کے لفظ سے سب اشیاء کی پیدائش کا ذکر

رنگوں کے اختلاف اور تاثیر کا ذکر ان کی علمی دریافت سے پہلے

گو اب تک یہ علم مکمل نہیں ہوا۔ قرآن کریم اس کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور توجہ دلاتا ہے کہ اجرام تو الگ رہے اُن کے رنگ تک تمہارے فائدہ میں لگے ہوئے ہیں۔ اور کیسی کیسی باریک باتوں سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جسمانی ترقی کے سامان پیدا کئے ہیں۔ مگر تم اب بھی نہیں سمجھتے کہ روحانی ترقی کے لئے بھی ویسے ہی وسیع بلکہ ان سے بھی زیادہ وسیع سامان پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک ہی قسم کی اشیاء کا رنگوں کے اختلاف کی وجہ سے مختلف تاثیرات کا ظاہر کرنا

علاوہ ازیں اس رنگوں کے تغیر سے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ ایک ہی چیز کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ اور اگر ایک طرح اُسے اپنی قسم کی دوسری چیزوں سے اتحاد ہوتا ہے۔ تو دوسری طرح اُن سے وہ مختلف بھی ہوتی ہے۔ سب انسان، انسان ہیں مگر کوئی دو آدمی ظاہری شکل یا باطنی قوتوں میں یکساں نہیں ملتے۔ سب اُونٹ، اُونٹ ہیں۔ مگر پھر ہر اُونٹ کی شکل اور عقل دوسرے اونٹ سے مختلف ہوتی ہے۔ گویا ایک طرف شدید اتحاد ہے تو دوسری طرف شدید اختلاف۔ یہی حال نباتات کا ہے۔ سب آموں کے درخت آموں کے ہی درخت ہیں۔ مگر ہر درخت دوسرے سے الگ پہچانا جاتا ہے اور ایسا ہی حال اس کے پھلوں کا ہے۔ غرض دنیا میں ہر جنس کے افراد دوسرے افراد سے مشابہت رکھتے ہیں۔ مگر پھر اُن سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔ اگر رنگوں کا یہ فرق نہ ہوتا۔ تو ایک کو دوسرے سے پہچاننا ناممکن ہو جاتا۔ اب تو ہر ماں باپ اپنے بچے کو، ہر بیٹا اپنے ماں باپ کو۔ ہر خاوند بیوی کو، بیوی خاوند کو۔ بھائی، بھائی کو پہچانتا ہے۔ اگر امتیازی نشان نہ ہوتے تو پہچاننا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے کس قدر وسیع فرق ہر شئے میں رکھا ہے۔ سفید رنگ ہے تو

طب میں مختلف رنگوں سے بیماریوں کا علاج

رنگوں کے ذریعہ کو ایک ہی جنس کی دو چیزوں میں امتیاز

اس کے اس قدر مدارج ہیں کہ انسان ان کے نام نہیں رکھ سکتا۔ سیاہ رنگ ہے تو اس کے اس قدر مدارج ہیں کہ ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔ صرف آنکھ اس فرق کو پہچانتی ہے اور اس فرق کی وجہ سے فوراً دو چیزوں میں امتیاز کر لیتی ہے۔ مگر زبان اس فرق کو اکثر نہیں بتا سکتی۔

اللہ تعالیٰ اسی امتیاز کے روحانی پہلو کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ دیکھو جس طرح اشیاء کے مادی رنگ مختلف ہیں۔ اسی طرح ان کے باطنی رنگ بھی مختلف ہیں۔ پھر جس طرح انسان کے جسم کی ضروریات مختلف ہیں۔ اس کے مقابل پر مختلف رنگ کی اشیاء بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں۔ نہ انسان کے جسم کی ضرورتوں کو کلی طور پر کوئی سمجھ سکتا ہے نہ ان کے پورا کرنے کے سامان کوئی پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہر انسان کا ذوق الگ ہوتا ہے اور اس کے جسم کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں کسی کو میٹھا مفید ہے، کسی کو کھٹا۔ کسی کو کدو پسند ہے، کسی کو بینگن۔ ایک کیلے پر جان دیتا ہے، دوسرا اس کے چکھنے کی برداشت نہیں رکھتا۔ غرض انسانی طبائع ایسے مختلف انواع کی ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیا بلحاظ قوتِ ذائقہ کے اور کیا بلحاظ مختلف تاثیرات سے مناسبت رکھنے کے۔ ان میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور ہر ایک کی ضرورت اللہ تعالیٰ نے بیرونی اشیاء میں پوری کر چھوڑی ہے۔ انسان تو ان اختلافات کی اقسام گن تک نہیں سکتا۔ وہ ان کے مطالبات کو پورا کرنے کی طاقت کہاں رکھ سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے مختلف رنگوں اور مختلف ذوقوں اور مختلف مزاجوں کے لوگوں کو پیدا کیا اور پھر ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ویسی ہی مختلف الانواع چیزیں بھی پیدا کر دیں۔ ان معنوں کے رُو سے لَوْن کے معنے نہ صرف رنگ کے لئے جائیں گے بلکہ نوع کے بھی۔ اور جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے لَوْن کے معنے نوع کے بھی ہوتے ہیں۔

لَوْن کے معنے مختلف انواع کے

فکر عقل اور تذکر کا مضمون کے ساتھ مناسبت

اس مضمون سے اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ دیکھو دنیا میں مختلف رنگوں اور مختلف انواع کی چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں۔ تاکہ تمہاری مختلف ضرورتوں اور تمہارے مختلف میلانوں کو پورا کرے۔ تم خود یہ کام نہیں کر سکتے۔ پھر تم کس طرح سمجھ سکتے ہو کہ تمہاری اخلاقی قوتوں کے فرق اور اختلاف کے باوجود کوئی انسانی تعلیم سب انسانوں کے لئے یکساں مفید ہو سکتی ہے۔ یہ ضرورت بھی اللہ تعالیٰ ہی پوری کر سکتا تھا جو انسان کی طبیعت اور اس کے اختلافات کا پیدا کرنے والا ہے اور اُسے جانتا ہے۔ ورنہ جو انسان قانون بنائے گا اپنے ذوق اور اپنے میلان کے مطابق قانون بنا لیگا اور اگر جماعت بنائے گی۔ تو اس جماعت کے میلانوں تک وہ تعلیم محدود رہے گی۔ صرف اللہ ہی کی دی ہوئی تعلیم ہو گی جس میں ہر طبیعت کے میلان اور ہر فطرت کے تقاضے کا خیال رکھا گیا ہو گا اور ہر مخفی ضرورت کو پورا کیا گیا ہو گا۔ پس الہام کا آنا انسان کی روحانی ترقی کیلئے ضروری ہے۔ ورنہ اوّل تو انسان اپنی عقل سے روحانی ضرورتوں کو پورا کر ہی نہ سکے گا۔ اور اگر ایک حد تک ضرورت پورا کرنے کا سامان کرے گا بھی۔ تو وہ محدود ہو گا اور وہ نہ تو کسی انسان کی سب ضرورتوں کو پورا کر سکے گا اور نہ تمام انسانوں کی بعض ضرورتوں کو پورا کر سکے گا۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ یہ لفظ اس جگہ اس لئے استعمال فرمایا کہ مختلف الوان کی ضرورت پورا کرنے کا سوال خالص اخلاقی سوال ہو جاتا ہے اور اس کا براہِ راست نصیحت سے تعلق ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فکر، عقل اور تذکر کو ہر آیت کے مضمون کی مناسبت سے نہیں بلکہ سارے مضمون کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ اور درحقیقت تینوں لفظوں کا تعلق سارے ہی مضمون سے ہے۔ صرف ان کو ان کے درجہ کے مطابق پھیلا کر سارے مضمون میں رکھ دیا گیا ہے۔ پہلے فکر کو رکھا ہے کیونکہ یہ پہلا ذریعہ اصلاح کا ہے۔ کیونکہ جب انسان نیک یا بد تغیر کی طرف جھکنے لگتا ہے تو پہلے فکر پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب فکر کامل ہو جائے تو عقل پیدا ہوتی ہے۔ یعنی انسان بدی سے رُکنے لگتا ہے اور اس کے عمل میں اصلاح شروع ہوتی ہے۔ جب

الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ

اسمیں کشتیوں کو پانی پھاڑتے (اور زور سے چلتے) ہوئے دیکھتا ہے (جو اس لئے چلتی ہیں کہ تم سمندری سفر طے کرو) اور تاکہ تم اس کے بعض فضل (بھی) تلاش کرو اور تاکہ

تَشْكُرُوْنَ ○ وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ

تم (اس کا) شکر ادا کرو ۱۵؎ اور اس نے زمین میں (بہت سے) محکم پہاڑ (گاڑ) رکھے ہیں تاکہ وہ تمہیں ہلا کر نہ ڈالے

یہ عملی اصلاح ہو جاتی ہے تو تیسرا درجہ تذکر کا شروع ہوتا ہے یعنی نیکی راسخ ہو جاتی ہے اور ہر قدم پر انسان کو اس کا فرض یاد آتا رہتا ہے اور عقل کے مقام پر جس طرح اُسے اپنے نفس کو روکنا پڑتا تھا اب اس کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ نفس خود ہی نیکی کے اصول کو یاد رکھتا ہے اور نیکی اس کی طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہے۔

۱۵؎ حل لغات۔ اَلطَّرِيُّ: طَرِيَ الْغُصْنُ واللحمُ والثَّوْبُ (يَطْرٰى وَطَرًا وَيَطْرُوْ طَرَادَةً وَطَرَاوَةً وَطَرَاءً) كَانَ طَرِيًّا۔ ہر چیز جو نئی ہو اور بناوٹ کے لحاظ سے تر و تازہ ہو۔ اُسے طَرِیٌّ کہتے ہیں۔ جیسے نیا کپڑا۔ گوشت جو تازہ ہو۔ اسی طرح درخت کی شاخ جو تازہ ہو (اقرب) پس لحم طرِیٌّ کے معنے ہوں گے۔ تازہ گوشت۔

اَلْحِلْيَةُ: مَا يُزَيَّنُ بِهٖ مِنْ مَصُوْغِ المعدنيات اوِ الحجارةِ الكريمةِ۔ معدنیات اور قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے زیورات جو زینت کیلئے پہنے جاتے ہیں اس کی جمع حُلِیٌّ آتی ہے (اقرب)

اَلْفُلْكُ: السَّفِيْنَةُ۔ کشتی۔ يُذَكَّرُ وَيُؤَنَّثُ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (اقرب)

مَوَاخِرَ: مَاخِرَةٌ کی جمع ہے۔ اور مَاخِرَةٌ۔ مَخَرَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مَخَرَتِ السَّفِيْنَةُ کے معنے ہیں۔ جَرَتْ تَشُقُّ الْمَاءَ مع صَوْتٍ۔ کشتی پانی کو چیرتی ہوئی چلی گئی اور اس کی آواز نکلتی تھی۔ وَقِيْلَ اِسْتَقْبَلَتِ الرِّيْحَ فِيْ جَرْيَتِهَا۔ اور بعض نے یہ معنے کئے ہیں کہ کشتی ہوا کے رُخ پر چلی مَخَرَ السَّابِحُ کے معنے ہیں۔ شَقَّ الْمَاءَ بِيَدَيْهِ۔ تیرنے والا اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرتا ہوا تیرا۔ اَلْفُلْكُ الْمَوَاخِرُ اَلَّتِي تَشُقُّ الْمَاءَ مَعَ صَوْتٍ۔ وہ کشتیاں جو پانی کو اس طور پر چیرتی ہوئی چلتی ہیں کہ اُن سے آواز پیدا ہوتی ہے (اقرب)

تفسیر۔ ۱۔ پہلی آیات میں خشکی کی چیزوں کا ذکر کیا تھا یا ان چیزوں کا جن سے انسان خشکی پر ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اب تری کا ذکر کیا اور سمندر کے مسخر ہونے کا ذکر فرمایا۔

(حاشیہ: خشکی کی چیزوں کے مقابل تری کی چیزوں کا ذکر)

سمندر کے لفظ کو بھی تسخیر کے لفظ سے شروع کیا۔ کیونکہ سمندر بھی انسان کے تصرف میں نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان محض اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ مگر رات دن سورج چاند ستاروں کی تسخیر کے ذکر میں مُسَخَّرَاتٌ بِاَمْرِهٖ فرمایا تھا۔ سمندر کے ذکر میں باَمرِہٖ نہیں فرمایا۔ اس لئے نہیں کہ اس کی تسخیر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اجرام فلکی سے فائدہ اٹھانے کے لئے انسان کچھ بھی کام نہیں کرتا۔ پس ان کی تسخیر کامل طور پر باَمرِہٖ ہوتی ہے۔ مگر سمندر سے فائدہ اٹھانے میں کشتی۔ جال وغیرہ انسان بناتا ہے۔ اس لئے وہاں امر کا لفظ نہ رکھا۔ ورنہ یوں تو ہر کام باَمرِہٖ ہی ہوتا ہے۔

(حاشیہ: الطری — سمندر کے سوا ستاروں کی تسخیر کے ساتھ باَمرِہٖ کا لفظ لگانے کا مطلب — الحلية — الفلك — المواخر)

سمندر کی تخلیق بھی انسانی ضرورتوں کے پورا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس میں بہت سے خزانے محفوظ ہیں جو اس کے بغیر محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ مثلاً وہ پانی کا ذخیرہ جمع رکھتا ہے۔ جہاں سے پھر سورج اس کو اُٹھا کر لاتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ سے سفروں میں سہولت ہوتی ہے۔ خشکی کے سفر سے وہ بہت زیادہ سستا ہوتا ہے۔ جو ملک سمندر کے کنارہ پر ہوتے ہیں، وہ بہت زیادہ تجارتی اور سیاسی ترقی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ سمندر کسی کے قبضہ میں اس طرح نہیں آ سکتا جس طرح

(حاشیہ: سمندر کی تسخیر کے ذکر کی وجہ)

بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَعَلٰمٰتٍ ط

اور (اس نے تمہارے لئے) کئی دریا (چلائے ہیں) اور کئی (خشکی کے) راستے (بھی بنائے) ہیں تا کہ تم (آسانی سے اپنی منزلِ مقصود تک) راہ پا سکو ۱۶ ؎ اور (ان کے علاوہ اس نے) کئی

سمندر حریت کے قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

خشکی قبضہ میں ہوتی ہے۔ اس طرح سمندر گویا حریت کے محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ پس سمندر کی مثال دی کہ سمندر بھی تمہاری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بنایا ہے اور اس میں

اَلْقٰی

بھی دیکھو کہ تمہاری غذا کا سامان رکھا ہے۔ مچھلی وغیرہ کا تازہ گوشت تم کو مل جاتا ہے۔ اب کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ خدا تو

خشکی تری کے سامانوں کے ذکر کے ساتھ روحانی سامانوں کی طرف اشارہ

تمہارے جسم کے لئے تو خشکی تری میں سفر کی سہولتیں بہم پہنچائے مگر دین کے لئے وہ کچھ بھی نہ کرے۔ اور کیا پھر یہ اس سے بھی عجیب بات نہیں کہ تم دنیاوی سامانوں کو تو شوق سے قبول کرو لیکن روحانی سامانوں کے وقت کہو کہ خدا تعالیٰ کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ہمارے لئے روحانی ترقی کا کوئی سامان پیدا کرے۔

رَوَاسِیَ

اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسانی ضرورتوں کو پانی پورا کرتا ہے اور یہ پانی زمین میں سمندر کی صورت میں موجود بھی ہے لیکن باوجود اس کے اس پانی سے انسان پینے کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ کھیتوں کو سیراب کرنے کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ اس پانی سے مچھلی جیسی اعلیٰ غذا پیدا کرتا ہے

صداقتیں اسی وقت فائدہ مند ہو سکتی ہیں جب وہ صاف کر کے استعمال کے قابل بنا دی جائیں

اور اس پانی کو سورج کے ذریعہ سے اٹھا کر پینے کے قابل بنا دیتا ہے پس صداقتوں کا دنیا میں موجود ہونا کافی نہیں۔ وہ اسی وقت مفید ہوتی ہیں جب ان کو صاف کر کے اللہ تعالیٰ انسانی روح کے استعمال کے قابل بنا دے۔

وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً ۔ یعنی موتی وغیرہ اسی ناقابل استعمال چیز سے ہی پیدا ہوتے ہیں جن سے تم زیور بناتے ہو۔ اسی طرح اس میں کشتیاں چلتی ہیں جن سے سفر

انہار، سُبل اور رواسی کے ساتھ القٰی کے لفظ کا استعمال

کی سہولت بھی حاصل ہوتی ہے اور تجارت بھی ترقی کرتی ہے جس طرح جانوروں کے متعلق فرمایا تھا کہ تم کو بھی لے جاتے ہیں اور تمہارے اسباب اور سامان بھی۔ وہی کشتیوں کے متعلق فرمایا کہ تمہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہیں اور تمہارے

تجارتی سامان بھی لے جاتی ہیں۔ تجارتی سامان جس طرح ارزاں طور پر سمندر میں لے جایا جا سکتا ہے خشکی میں نہیں۔ اسی وجہ سے سمندری کناروں کے لوگوں کی تجارت زیادہ چمک جاتی ہے۔

۱۶ ؎ حل لغات

اَلْقٰی: اَلْقَاهُ اِلَی الْاَرْضِ کے معنے ہیں طَرَحَهٗ۔ اس کو زمین کی طرف پھینکا۔ اَلْقٰی اِلَیْهِ الْقَوْلَ وَبِالْقَوْلِ۔ اَبْلَغَهٗ اِیَّاهُ۔ کوئی بات اُسے پہنچائی۔ اَلْقَی الْمَتَاعَ عَلَی الدَّابَّةِ۔ وَضَعَهٗ۔ سامان کو جانور پر لادا۔ اَلْقٰی فِیْهِ الشَّیْءَ۔ وَضَعَهٗ۔ کسی چیز کو کسی جگہ رکھا۔ اَلْقٰی اِلَیْهِ السَّمْعَ: اَصْغٰی۔ اس کی بات سننے کے لئے پوری توجہ کی (اقرب)

رَوَاسِیَ کے لئے دیکھو سورۃ رعد ۵ ؎

اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ: تَمِیْدُ مَادَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور مَادَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں۔ تَحَرَّكَ وَ زَاغَ۔ کسی چیز نے حرکت کی اور ایک طرف پر مائل ہو گئی۔ یقال مَادَتْ بِهِ الْاَرْضُ: دَارَتْ اور مَادَتْ بِهِ الْاَرْضُ کا محاورہ بول کر یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ زمین نے اپنے چکر کھانے کے ساتھ اسے بھی چکر دیا۔ اَلسَّرَابُ۔ اِضْطَرَبَ۔ سراب نے حرکت کی (اقرب) پس اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ کے معنے ہوں گے کہ اس ڈر سے کہ زمین متحرک ہوتے ہوئے تمہیں چکر میں نہ ڈالے۔ اس ڈر سے کہ تم کو اضطراب میں نہ ڈالے ہماری زبان اور عربی زبان میں فرق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس ڈر سے کہ فلاں کام نہ ہو جائے۔ اور عرب کہتے ہیں۔ اس ڈر سے کہ ایسا ہو جائے۔ گویا وہ 'نہ' کو محذوف کر دیتے ہیں۔

تفسیر:۔ اس آیت میں اَلْقٰی کا لفظ استعمال کر کے اس کے بعد رَوَاسِیَ اَنْهٰرًا اور سُبُلًا تین چیزوں کو بیان فرمایا ہے۔ گویا سب کا عامل اَلْقٰی کا لفظ ہے۔ اَلْقٰی کے عام معنے پھینکنے کے ہوتے ہیں۔ اگر ان معنوں کو مدِّنظر

رکھا جائے۔ تو آیت کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ زمین میں پہاڑ دریا اور راستے پھینکے۔ اور اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ پہاڑ تو زمین میں سے نکلے ہیں اور دریا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پانی لے جاتے ہیں اور راستے چلنے کی جگہ کا نام ہے۔ پھر ان کے پھینکنے کے کیا معنے ہوئے۔ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اَلْقٰی کا لفظ صرف رواسی کے ساتھ لگتا ہے باقی دو لفظوں سے پہلے جَعَلَ کا لفظ محذوف مانا جائے گا۔ اور اس کے یہ معنے ہوں گے کہ پہاڑ پھینکے اور دریا اور راستے بنائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب دو اشیاء ایک ساتھ بیان ہوتی ہیں۔ تو مشارکت کی وجہ سے ایک ہی فعل کو دونوں کا عامل بنا دیا جاتا ہے۔ اور دوسرا فعل محذوف سمجھا جاتا ہے۔ جیسے کہ ایک عرب شاعر کا شعر ہے۔

قَالُوا اقْتَرِحْ شَيْئًا نُجِدْ لَكَ طَبْخَهُ
قُلْتُ اطْبُخُوا لِيْ جُبَّةً وَّقَمِيْصًا

یعنی کہنے والوں نے کہا کہ آپ ہم سے کچھ خواہش کریں۔ تو ہم آپ کے لئے کوئی کھانا اچھی طرح تیار کریں گے۔ میں نے کہا کہ ہاں کھانا بھی پکاؤ اور جُبّہ اور قمیص بھی پکاؤ۔ اس جگہ پکاؤ کا لفظ ہی جُبّہ اور قمیص کے ساتھ لگا دیا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ تم نے کچھ پکانے کی خواہش کی ہے۔ تو پھر میری خواہش یہ ہے کہ میرے لئے جُبّہ اور قمیص پکا دو۔ گویا جو لفظ پکانے کا میزبانوں نے کھانے کے متعلق استعمال کیا تھا۔ وہی اُس نے جُبّہ اور قمیص کے متعلق بھی استعمال کر دیا۔

پس اسی قاعدہ کے ماتحت اگر اس آیت کی تشریح کی جائے اور سمجھا جائے کہ اَلْقٰی صرف رواسی کے لئے ہے اور باقی دونوں اسموں کا عامل جَعَلَ ہے جو محذوف ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ پہاڑ زمین میں ڈالے اور دریا اور راستے بنائے۔ تو یہ عربی کے قواعد کے مطابق بالکل درست ہوگا لیکن یہ مشکل پھر بھی رہ جائے گی کہ کیا پہاڑ زمین پر پھینکے گئے ہیں۔ جہاں تک جیالوجی یعنی علم پیدائش عالم کا تعلق ہے، یہ امر ثابت ہے کہ پہاڑوں کا مادّہ زمین سے نکلا ہے نہ کہ باہر سے لا کر ڈالا گیا ہے۔ پس جو مشکل جَعَلَ محذوف مان کر انہار اور سُبُلًا سے دُور کی گئی تھی، پہاڑوں کے بارہ میں پھر بھی قائم رہتی ہے۔ پس یہ جواب پیش آمدہ مشکل کو حل نہیں کرتا۔

اَلْقٰی کے عام معنوں کے لحاظ سے اس پر ایک اعتراض

اس وجہ سے میرا یہ خیال ہے کہ انہار اور سُبُل سے پہلے کسی اور فعل کے محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں۔ جو توجیہ اَلْقٰی کی رواسی کے متعلق کی جا سکتی ہے۔ وہی انہار اور سُبُل کے متعلق بھی کی جا سکتی ہے اور میرے نزدیک قرآن کریم میں اس کا جواب موجود ہے۔ اس آیت میں تین چیزوں کے بارہ میں اَلْقٰی کا لفظ استعمال ہوا ہے (۱) رواسی (۲) انہار (۳) سُبُل انہی تین چیزوں کے لئے دوسری جگہ جَعَلَ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ نمل میں ہے۔ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا (نمل ع ۱) یعنی زمین کے نشیبوں میں ہم نے دریا بنائے ہیں۔ پہاڑوں کے متعلق آتا ہے۔ وَجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ (مرسلات ع ۱) زمین میں ہم نے پہاڑ بنائے ہیں۔ اور راستوں کے متعلق آتا ہے۔ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا (انبیاء ع ۳) ہم نے زمین میں راستے پیدا کئے ہیں۔ پس وہ تینوں چیزیں جن کی نسبت اَلْقٰی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ان تینوں کے بارہ میں دوسری جگہ جَعَلَ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اَلْقٰی کے یہ معنے تو نہیں کہ باہر سے لا کر کوئی چیز پھینک دی۔ کیونکہ دوسری آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تینوں چیزیں زمین میں ہی بنی ہیں۔ پس جب یہ امر دوسری آیات سے ثابت ہوگیا۔ تو ماننا پڑے گا کہ اَلْقٰی کے اس آیت میں کوئی اور معنے ہیں۔ اب دوسرے معنے یا تو لغوی ہو سکتے ہیں یا مجازی۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے دوسرے لغوی معنوں میں سے کوئی بھی یہاں چسپاں نہیں ہوتے۔ وضع کے معنے بھی نہیں۔ کیونکہ اس کے معنے ہیں۔ کوئی چیز ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دی۔ پہنچانے کے معنے بھی نہیں لگ سکتے۔ سُنانے کے معنے بھی نہیں۔ لکھوانے کے معنے بھی نہیں اور حُسنِ سلوک کے معنے بھی نہیں لگ سکتے۔ پس ایک ہی بات رہ جاتی ہے کہ اس لفظ کو مجازی معنوں میں مستعمل سمجھا جائے اور میرے نزدیک یہی حقیقت ہے۔ ہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ

اعتراض کے مختلف جواب اور اس کا اصل حل

دو اشیاء کی مشارکت کی وجہ سے دونوں کا ایک ہی فعل کا عامل ہونا۔

انہار، سُبُل، رواسی کے لئے قرآن مجید میں جَعَلَ کا استعمال

اَلْقٰی کے لفظ کا استعمال مجازی معنوں میں ہے

طریق کسی مزید فائدہ کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ کیا فائدہ تھا جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بعض جگہ جَعَلَ کا لفظ چھوڑ کر اَلْقٰی کا لفظ استعمال فرمایا سو اس کا جواب یہ ہے کہ درست ہے کہ یہ طریق کلام کسی زائد فائدہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس آیت میں بھی یہی وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ اَلْقٰی کے اصل معنے پھینک دینے کے ہوتے ہیں اور رکھنے اور پھینکنے میں فرق ہوتا ہے کہ رکھی چیز محدود جگہ میں جاتی ہے اور پھینکی ہوئی چیز اِدھر اُدھر بکھر جاتی ہے۔ اگر کسی چیز کی نسبت ہم یہ بیان کرنا چاہیں۔ کہ وہ کثرت سے پائی جاتی ہے۔ تو ہم بعض دفعہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کا تو وہاں چھٹہ کا دیا ہوا ہے۔ یا کہتے ہیں کہ وہ سب جگہ بکھری ہوئی ہے یہی معنے اَلْقٰی کے لفظ سے اس جگہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اگر خالی جَعَلَ کا لفظ ہوتا۔ تو اس سے صرف یہ نتیجہ نکلتا کہ زمین کے بعض حصوں میں پہاڑ ہیں یا بعض حصوں میں دریا ہیں یا بعض حصوں میں راستے ہیں۔ لیکن یہ بتانے کے لئے کہ دنیا کے ہر حصہ اور ملک میں پہاڑ، دریا اور راستے اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں اَلْقٰی کے الفاظ ہی مناسب تھے اور یہ حقیقت اس مجاز سے ہی ظاہر ہوسکتی تھی کہ یہ تینوں چیزیں دنیا کے ہر حصہ میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کر رکھی ہیں اور سب دنیا کو اس کے فوائد سے حصہ دیا ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں دنیا میں اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں، دریاؤں اور راستوں کا ایک چھینٹا دیا ہے جس سے وہ سارے طول و عرض میں پھیل گئے ہیں۔ ان معنوں کی رو سے قرآنی علم کی وسعت بھی ظاہر ہوتی ہے جس وقت قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ دنیا کا ایک حصہ معلوم ہی نہ تھا۔ جیسے امریکہ آسٹریلیا وغیرہ۔ ایک دوسرا حصہ معلوم تو تھا۔ مگر اس کی پوری چھان بین نہ تھی۔ جیسے وسطی اور جنوبی افریقہ اور اور بہت سے جزائر۔ اس وقت قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ پہاڑ، دریا اور راستے کسی ایک ملک یا جگہ کی نعمت نہیں۔ بلکہ یہ نعمت ساری دنیا کو خدا نے دی ہے اور گویا آسمان سے دنیا کی سطح پر ان کو پھینک دیا ہے اور وہ دنیا میں بکھر گئے ہیں۔ ایک ایسی صداقت ہے جو علم الٰہی کے ذریعہ سے ہی ظاہر ہوسکتی تھی۔ اب جبکہ دنیا قریباً سب کی سب دریافت ہوچکی ہے یہ صداقت کیسی کھل چکی ہے کہ دنیا کے تمام براعظموں میں پہاڑ دریا اور راستے پائے جاتے ہیں۔ اور سب دنیا اس نعمت سے حصہ لے رہی ہے۔ پس اَلْقٰی کے لفظ کو ان تین اشیاء کے متعلق مجازاً استعمال کرکے قرآن کریم نے ایک نئے معنے پیدا کر دئے ہیں اور ایک نئی صداقت ظاہر کر دی ہے اور دوسرے مقامات پر جَعَلَ کے لفظ کے استعمال سے ان نادانوں کا مُنہ بھی بند کر دیا ہے جو اس لفظ سے دھوکا کھا کر یہ کہہ سکتے تھے کہ قرآن کے رُو سے پہاڑ دریا اور راستے کہیں باہر سے لا کر زمین پر پھینک دئے گئے ہیں۔

ایک اور سوال اس جگہ ہوسکتا ہے کہ پہاڑ اور دریا تو قدرت بناتی ہے۔ ان کے ساتھ راستوں کا کیوں ذکر کیا ہے۔ وہ تو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ انسانی بنی ہوئی سڑکوں کا ذکر نہیں۔ وہ تو دنیا کے ہر حصہ میں نہیں ہوتیں۔ اس جگہ صرف ان راستوں کا ذکر ہے جو طبعی ذرائع سے بن جاتے ہیں۔ مثلاً دریاؤں کی وجہ سے یا پہاڑوں کی وجہ سے یا جنگلوں کی وجہ سے۔ اور یہی راستے ہیں جو عام ہیں اور جن سے سب دنیا فائدہ اٹھاتی ہے بخصوصاً پرانے زمانہ میں فائدہ اٹھاتی تھی۔ افغانستان اور ہندوستان کی سرحد سینکڑوں میل تک ملی ہوئی ہے مگر ہر حصہ اس کا راستہ نہیں۔ راستے صرف چند ہیں۔ جو پہاڑی دروں کی مناسبت سے بن گئے ہیں۔ یہی حال چینی ہندوستانی سرحد کا اور ہندوستانی برہمی سرحد کا ہے۔ اور سب ممالک کا یہی حال ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شہروں کے درمیان تو سڑک کا بنانا اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ مگر علاقوں اور ملکوں کے درمیان سڑکوں کا بنانا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا تعلق دریاؤں سے پار ہونے کی سہولت، پہاڑوں کے دروں یا جنگلوں کے کناروں سے ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ سے دنیا ان راستوں کو استعمال کرتی چلی آئی ہے۔ گو ان جگہوں پر کوئی سڑک نہیں بنی ہوئی تھی۔ صرف قدرتی سہولتوں کی وجہ سے لوگوں نے ان راستوں کو اختیار کرلیا تھا۔ اور ہزاروں سالوں سے آج تک وہ راستے کام دے رہے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے پُرانے زمانہ میں تجارت ہوتی تھی۔ ایک ملک سے

جَعَلَ کو چھوڑ کر اَلْقٰی کے استعمال کی وجہ

اَلْقٰی کے لفظ کے استعمال کے ساتھ نئے معنے پیدا کر دئے گئے ہیں

یہاں اَلْقٰی کے لفظ ہی رکھے جانے مناسب تھے

راستوں کے بنانے پر ایک سوال اور اس کا جواب

دوسرے ملک پر چڑھائی ہوتی تھی۔ ہندوستان پر جس قدر حملے شمال پر ہوئے ہیں۔ دیکھ لو صرف چند حصوں سے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں آریہ قوم پھیلی ہے۔ تو پہلے اسی طبعی راستہ پر چل کر جو پنجاب کے دریاؤں کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اور پھر اس راستہ پر چل کر جو جمنا گنگا کے کنارے پر جاتا تھا۔ یا ان راستوں پر چل کر جو ہمالیہ اور دوسرے پہاڑوں یا گھنی بن کے دامن پر قدرت کے ہاتھوں سے تیار کیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں راستہ کے لئے طبعی نشانوں کا موجود ہونا ضروری ہوتا تھا جن کی وجہ سے لوگ مسافتوں اور جہات کا اندازہ لگا سکیں۔ اسی طرح غذا کا مہیا ہونا ضروری ہوتا تھا۔ پس پہاڑوں کے دامنوں جنگلوں کے ساتھ ساتھ اور دریاؤں کے کناروں کے ساتھ ساتھ لوگ بالعموم سفر کرتے تھے اور یہ گویا طبعی راستے تھے جن سے دنیا کے تعلق قائم تھے۔ اور اس آیت میں انہی راستوں کا ذکر ہے نہ کہ مقامی سڑکوں کا جو مختلف شہروں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ اس بیان سے اس امر کی حکمت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ کیوں ان تینوں چیزوں کو اکٹھا کر کے بیان کیا گیا ہے۔

راستوں سے مراد دریاؤں کے رستے

اس کے علاوہ راستوں سے مراد وہ راستے بھی ہو سکتے ہیں جن پر دریا چلتے ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ زمین میں ایسے ڈھلوان یا نشیب نہ پیدا کرتا جن میں دریاؤں کا پانی سکڑ کر چلتا ہے تو سب زمین پر پانی ہی پانی ہوتا اور دنیا رہنے کے قابل نہ ہوتی۔

پہاڑوں دریاؤں اور راستوں کا خاص طریق پر پھیلنا

پہلی اشیاء کے ذکر کے بعد ان اشیاء کو الگ کیوں بیان کیا گیا ہے؟ اس میں یہ حکمت ہے کہ پہلے متفرق چیزوں کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں ان چیزوں کا ذکر ہے جو خزانہ کو جمع رکھتی ہیں۔ پہاڑ برف کے ڈھیر جمع رکھتے ہیں۔ درخت اور جڑی بوٹیاں کے ذخیرے رکھتے ہیں۔ دریا پہاڑوں سے پانی لے کر سال بھر تک پانی ملک کو مہیا کرتے ہیں اور طبعی راستے ان جگہوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے انسان کی مدد کرتے ہیں۔ اگر پہاڑ صرف ایک بلند ٹیلا ہوتے اور اس طرح تدریجی طریق پر بڑھنے والی ڈھلانیں نہ ہوتے تو انسان اُن کی چوٹیوں تک کس طرح پہنچ سکتا تھا۔ اگر دریا ایک پھیلا ہوا پانی ہوتے تو اُن سے دنیا فائدہ نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ اُلٹا اُن سے نقصان ہوتا کہ قابل کاشت زمینوں کو وہ پانی کے نیچے چھپائے رہتے اور چلنا پھرنا لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا۔ پس پہاڑوں اور دریاؤں سے فائدہ اسی صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے کہ وہ خاص قانون کے ماتحت پھیلیں یا ان تک پہنچنے کے لئے ان کے ساتھ ساتھ راستے ہوں جن پر چل کر انسان اُن کے فوائد سے متمتع ہو سکے۔

اس آیت کا پہلی آیت سے تعلق

اس آیت کا پہلی آیات سے تعلق ایک تو نعماءِ الٰہی کے شمار کے لحاظ سے ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب تمہارے مادی فوائد کے لئے یہ کچھ سامان پیدا کئے گئے ہیں۔ تو تمہاری روحانی ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا۔ دوسرے یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی تدابیر صرف ایک وقت کی ضرورت کو پورا کر سکتی ہیں۔ اللہ ہی ہے جو مستقل ذخائر کے جمع رکھنے کے سامان پیدا کرتا ہے۔ باولیاں کب تک پانی دے سکتی ہیں اور کہاں تک۔ دریا ہی ہیں جو سارا سال پانی دیتے ہیں اور ملکوں کے ملک ان سے سیراب ہوتے ہیں۔ اسی طرح پہاڑ ہیں جو ملکوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور سارا سال قسما قسم کی ضروری ادویہ اور پھل پھول اور نہ ختم ہونے والے ذخائر لکڑی کے ان سے ملتے ہیں۔ اور پھر یہ بڑے راستے ہی ہیں کہ جو دنیا کے درمیان تعلق قائم کر رہے ہیں۔ پس اسی طرح روحانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایسے کلام کی ضرورت ہے جو صرف ایک وقت کے لوگوں یا چند لوگوں کے فائدہ کے لئے نہ ہو۔ بلکہ مختلف فطرتوں اور مختلف زمانوں کی ضرورت کو پورا کرنے والا ہو۔ اور جس کے ذریعہ سے دنیا روحانی مسافت طے کر سکے یعنی ایک نبی کے زمانہ سے اس کے بعد کے نبی کے زمانہ تک پہنچانے کی اس میں قابلیت ہو یعنی اس میں ایسا ارتقاء ہو کہ فطرت انسانی اس پر چل کر اگلے روحانی ملک میں یعنی بعد میں آنے والے نبی کی تعلیم تک پہنچنے کی قابلیت پیدا کر لے۔ انسان کو کیا معلوم ہے کہ سو یا دو سو سال بعد انسانی دماغ نے کیا ترقی کرنی ہے۔ کہ وہ اس کے مطابق ذہنوں کو روشنی پہنچانے کے سامان کرے۔ یہ سفر تو الٰہی بنائے

پہلی اشیاء کو بیان کرنے کے بعد جبل انہار اور راستوں کے بیان میں حکمت

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ

(اور) علامات بھی (قائم کی ہیں) اور ستاروں کے ذریعہ سے (بھی) (لوگ) راہ پاتے ہیں۔ ۱۸ پھر (بتاؤ تو سہی کہ) کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے

لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ

جو (کچھ بھی) پیدا نہیں کرتا کیا تم پھر (بھی) نہیں سمجھتے ۱۹ اور اگر تم اللہ (تعالیٰ) کے احسان شمار کرنے لگو۔

مختلف قوموں اور مختلف فطرتوں کی روحانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کلام الٰہی کیفرورت

ہوئے راستہ پر ہی طے ہو سکتا ہے جو انسانی دماغ کو برابر ترقی دیئے چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف فلسفے ایک شاہراہ پر گامزن نہیں ہوتے۔ بلکہ کبھی آگے قدم بڑھاتے ہیں اور کبھی پھر واپس صدیوں کے فلسفہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی تعلیمات نبیوں کی معرفت انسانوں کو ایک ہی شاہراہ پر آگے ہی آگے بڑھاتی چلی گئی ہیں اور ان میں کسی جگہ بھی رجعت قہقری پیدا نہیں ہوئی۔

علامت کا عطف الٰقی پر ہے۔

۱۷ تفسیر ۔ عَلٰمٰتٍ کا عطف بھی الٰقی پر ہی ہے اور اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا بھر میں سطح زمین یکساں اور مشابہ نہیں۔ بلکہ نشیب و فراز، پانی، خشکی، جنگل اور بیابان زمینوں کی مٹی کے فرق اس قدر ہیں کہ ان کے ذریعہ سے انسان راستہ معلوم کر لیتا ہے۔ اگر سب دنیا ایک ہی شکل کی ہوتی۔ تو انسان کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی جگہ چکر لگاتا رہتا۔ یہ تو زمین پر راستوں کے معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔

آیت النجم یہتدون میں اس کی ترتیب کے متعلق ایک سوال اور مفسرین کا جواب

ایک آسمانی ذریعہ بھی ہے جو رات کی تاریکی اور سمندر میں کام آتا ہے اور وہ ستارے ہیں، ان کو دیکھ کر انسان اپنے راستے کو معلوم کرتا ہے۔ یہی حال روحانی سفر کا ہے۔ اس میں بھی علامات ہیں۔ یعنی روحانی ترقی کے مدارج میں امتیازی نشان پیدا کئے گئے ہیں جس کو دیکھ کر انسان سمجھ سکتا ہے کہ آگے کو کون سا راستہ جاتا ہے اور پیچھے کو کونسا۔ اسی طرح ستاروں کی طرح انبیاء کا وجود ہے کہ ان کے مقام سے بھی انسان روحانی سیر میں راستہ پاتا ہے۔ اور ہر نبی کو جو دوسرے نبی سے نسبت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے وہ روحانی سیر میں

ظاہری ستاروں کے بالمقابل روحانی ستارے

مدد دیتا ہے جس طرح ایک ستارہ اپنے مقام سے دوسرے ستارے کے مقام کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسی طرح ہر نبی اپنی تعلیم سے دوسرے نبی کی خبر دیتا ہے اور اس طرح انسان اپنے ایمان میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ موسیٰؑ نے اپنے بعد آنے والے نبی کی اُس نے اپنے بعد کے نبی کی اور اس نے اپنے بعد کے نبی کی خبر دی)۔ اور گویا ہر ستارہ دوسرے ستارے کی طرف رہنمائی کرتا گیا اور سب ستاروں نے سورج کی یعنی محمد رسول اللہ صلعم کی منزل کی طرف رہنمائی کی جس سے انسان کو روحانی سفر کے طے کرنے اور مرکز روحانیت کے مقام تک ہدایت پانے کا موقعہ مل گیا۔

۱۸ تفسیر ۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جس نے پیدا نہیں کیا۔ اس پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ کہنا تو یہ چاہیئے تھا کہ کیا جو پیدا نہیں کرتا وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جو پیدا کرتا ہے (کشاف) کیونکہ مقابلہ میں ادنیٰ کو اعلیٰ کے مقابل پر رکھتے ہیں نہ کہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے مقابل پر۔ طاقت کے اظہار کے لئے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ کیا بچہ پہلوان کی طرح ہو سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیا پہلوان بچہ کی طرح ہو سکتا ہے۔ یہ اعتراض بالکل درست ہے۔ اگر اس آیت میں طاقت کا اظہار مقصود ہوتا تو ضرور یہی کہا جاتا کہ کیا جو نہیں پیدا کرتا وہ پیدا کرنے والے کے برابر ہو سکتا ہے۔ مگر اس جگہ یہ مراد ہی نہیں۔ علامہ زمخشری اس سوال کو بیان کر کے اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ مشرک خدا تعالیٰ کی صفات غیر اللہ کو دیکر گویا اللہ تعالیٰ کو بھی ایک مخلوق قرار دیتے تھے۔ اس لئے

اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاللّٰهُ

تو (کبھی) تم ان کا احاطہ نہ کر سکو گے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً بہت (ہی) بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے ۱۹؎ اور جو کچھ تم

يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ

چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اللہ (تعالیٰ) اس (سب) کو جانتا ہے ۲۰؎ اور اللہ تعالیٰ کے سوا

یہ فرمایا کہ اس طرح خدا تعالیٰ پر الزام لگتا ہے تمہارے جھوٹے معبودوں کا درجہ تو نہیں بڑھتا۔ خدا تعالیٰ کا ہی درجہ گھٹانا پڑتا ہے مگر کیا خدا تعالیٰ ان ادنیٰ وجودوں کے برابر ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ جواب اس قدر معقول نہیں جیسا کہ اعتراض جو انہوں نے اوپر اٹھایا ہے۔

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب اس ترتیب کو مدنظر رکھ کر دیا جا سکتا ہے جو میں نے گزشتہ آیات میں بتائی ہے۔ اصل مضمون جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یہ تھا کہ کیا خدا تعالیٰ کو کسی الہام بھیجنے کی ضرورت ہے؟ مشرک لوگ اپنے معبودوں کی نسبت یہ ظاہر کرتے تھے کہ ان کے معبود اس لئے الہام نازل نہیں کرتے کہ یہ ان کی شان کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ نہیں بلکہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ نہ انہوں نے کوئی دنیوی نعمت انسان کو دی ہے نہ دینی نعمت دینے کی توفیق رکھتے۔ پھر تم کس طرح سمجھتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی انہی کی طرح ہو جائے حالانکہ اس میں تو الہام بھیجنے کی طاقت ہے۔ پس جس طرح اس نے دنیوی نعمتیں دی ہیں وہ روحانی نعمتیں بھی دیتا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ وہ بھی تمہارے خیالی معبودوں کی طرح بے بس ہو کر بیٹھ جائے مگر وہ تو زندہ خدا اور طاقتور ہے۔ اور اس نے ہزاروں سامان دنیوی ترقی کے پیدا کئے ہیں۔ پس وہ تمہارے معبودوں کی طرح رُوحانی ترقی کے طریق بتانے میں کیوں کوتاہی کرے۔ تمہارے معبودوں کا ایسا نہ کرنا اُن کی علوّ شان کی وجہ سے نہیں بلکہ معذوری کے سبب سے ہے اور خدا تعالیٰ معذور نہیں۔ اس لئے وہ کلام بھیجتا رہا ہے اور بھیجتا رہے گا۔ چنانچہ اگلی آیت بھی انہی معنوں کی تصدیق کرتی ہے۔

۱۹؎ تفسیر:۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں گننا چاہو تب بھی گن نہیں سکتے۔ پھر جس طرح اس نے یہ دنیوی نعمتیں نازل کی ہیں، کیوں روحانی نعمتیں نازل نہ کرے۔ اور معبودانِ باطلہ کی طرح جو کوئی طاقت نہیں رکھتے گونگا ہو کر بیٹھ رہے۔

(۲ دنیاوی نعمتوں کے ذکر سے روحانی نعمتوں کی طرف اشارہ)

دوسرے فرمایا کہ وہ غفور رحیم ہے اگر وہ ہدایت نہ بھیجے تو کمزوروں کی معافی اور قابل لوگوں کی عزت کے بڑھانے کے سامان کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ ہدایت بھیجنے سے کوتاہی کرے۔ تو ساتھ ہی اس کی غفور اور رحیم کی صفات بھی معطل ہو جاتی ہیں۔ پس وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

(۱ آیت افمن یخلق میں اسکی ترتیب کے متعلق مشکل کا حل)

۲۰؎ تفسیر:۔ اب ایک اور دلیل دیتا ہے کہ کیونکر انسان یا اُن کے معبودانِ باطلہ ہدایت کا سامان بہم نہیں پہنچا سکتے اور اللہ تعالیٰ ہی ایسا کر سکتا ہے۔ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ ظاہر اور مخفی طاقتوں کو جانتا ہے۔ ان شبہات کو بھی جانتا ہے جن کو تم بیان کرتے ہو اور ان کو بھی جن کو تم چھپاتے ہو۔ پس ہدایت کا کام بھی وہی کر سکتا ہے۔

(۳ انسانی ہدایت کے لئے دو امور کی واقفیت کی غرض)

یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانی ہدایت کے لئے دو امور کا ہونا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ انسانی فطرت کی گہرائیوں سے کامل واقفیت ہو۔ کیونکہ جب تک ظاہری و باطنی قوتوں کا علم نہ ہو صحیح راہنمائی نہیں کی جا سکتی اور ساری قوتوں کے نشوونما کا سامان نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ ضروری ہے کہ دلوں کے خیالات کا علم ہو۔ کیونکہ ہزاروں لاکھوں انسان اپنی قوم کے ڈر سے اپنے دلی شبہات بیان نہیں کر سکتے۔ پھر جب ان کی مرض کا علم نہ ہو۔ تو علاج کرنے والا علاج کس طرح کر سکتا ہے۔ مثلاً اس زمانہ میں سینکڑوں تعلیم یافتہ ہیں جو درحقیقت الہام

يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ

جن (معبودان باطلہ) کو وہ پکارتے ہیں وہ کچھ (بھی) پیدا نہیں کر سکتے اور (اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ)

يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ

وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں ۲۱؎ وہ (سب) مردے ہیں نہ زندہ۔ اور وہ (یہ بھی) نہیں جانتے

کے وجود سے منکر ہیں۔ اگر ان کے سامنے الہام جاری ہونے کا مسئلہ پیش کیا جائے۔ تو وہ قوم کے ڈر سے یہ تو نہیں کہتے کہ الہام کا وجود ہی کوئی نہیں اور سب مدعیان الہام یا جھوٹے تھے یا دھوکا خوردہ۔ پس اس کی بجائے وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کے بعد الہام کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح نئی تعلیم کے دلدادہ میں سے ہزاروں لاکھوں کو اللہ تعالیٰ پر اعتقاد نہیں مگر جب ان سے خدا تعالیٰ کے متعلق بات کی جائے تو یہ کبھی نہ کہیں گے کہ خدا تعالیٰ نہیں ہے بلکہ دوسری قسم کی باتیں کریں گے کہ خدا تعالیٰ تو ہے۔ مگر اُسے کیا ضرورت ہے کہ دنیا کے معاملات میں دخل دے پس دل میں نیکی پیدا کرنی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ خوش ہو جائے گا۔ غرض تصوف کے جھوٹے مسائل کی آڑ لے کر وہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کے جوئے سے آزاد ہونا چاہیں گے۔ مگر قوم کے ڈر سے یہ ظاہر نہ ہونے دیں گے کہ درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کے وجود سے ہی منکر ہیں۔ اب اس قسم کے دلی شبہات کو اگر مصلح نہیں جانتا تو وہ ان امور کے متعلق دلائل دیتا رہے گا جو اصل میں خرابی کا موجب نہیں۔ بلکہ دھوکا دینے کے لئے صرف مُنہ سے بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن جو دل کے عیب کا واقف ہے۔ وہ مُنہ کی باتوں کو نظر انداز کر کے اس شبہ کے ازالہ پر زور دے گا جو دل میں چھپایا گیا ہے اور اصلاح میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور دل کی باتوں کا علم چونکہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے جس طرح صرف وہی انسانی قوتوں کا مکمل علم رکھتا ہے۔ اس لئے ہدایت نامہ بھیجنا بھی اس کے شایانِ شان ہے اور اسی کا بھیجا ہوا ہدایت نامہ دنیا کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

مصلح کیلئے انسانی فطرت کی گہرائیوں کی کامل واقفیت اور دلوں کے خیالات کا علم ہونا ضروری ہے

اس دعویٰ کا عملی ثبوت قرآن کریم کا وجود ہے۔ اس میں تمام انسانی قوتوں کی راہنمائی کے سامان موجود ہیں اور انسان کی مخفی سے مخفی قوتوں کو ابھارنے کے لئے تعلیم موجود ہے اسی طرح اس میں ہر انسانی شبہ کا جواب موجود ہے۔ حتیٰ کہ جو شبہات سائنس کی ترقی کی وجہ سے آج کل کے زمانہ میں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کو اکثر آدمی اپنی قوم کے ڈر سے زبان پر لانے سے ڈرتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہیں بھی بیان کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے۔

۲۱؎ تفسیر: اس جگہ یہ خیال مشرکوں کی طرف سے معاندانہ رنگ میں ظاہر کیا جا سکتا تھا کہ یہ تمہارا دعویٰ غلط ہے کہ ہمارے معبود ہدایت نہیں دے سکتے۔ وہ بھی دلوں کے بھید جانتے ہیں اور وہ بھی ہدایت دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ اکثر مشرک اپنے معبودوں کو علم غیب کا جاننے والا ظاہر کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض جاہل صوفی مسلمانوں میں سے بھی اس امر پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی نعوذ باللہ من ذالک علم غیب رکھتے تھے۔ میں جب چھوٹا تھا۔ تُرکی ٹوپی کا استعمال کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک ایسے ہی شخص سے گفتگو کر رہا تھا اور ٹوپی کا پھُندنا میرے ہاتھ میں تھا۔ اس نے کہا کہ رسول کریم صلعم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں یہ پھُندنا ہے۔ بہرحال دوسری اقوام میں یہ خیال بڑی شدت سے پایا جاتا ہے۔ پس مشرک جواب میں یہ بات پیش کر سکتے تھے کہ انہیں بھی علم تو ہے مگر وہ اپنی مرضی سے الہام نہیں بھیجتے۔ کیونکہ انسان کو کسی بیرونی الہام کی ضرورت ہی نہیں سو اس کا جواب دیا کہ علم غیب خالق ہونے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو خالق ہے وہی اپنی مخلوق کے اندر کی طاقتوں اور اس کے

أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ○ إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِيْنَ ع ۱۲ ۸

کہ کب (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے ۲۲ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اور جو لوگ

فعلوں سے آگاہ ہو سکتا ہے دوسرا واقف نہیں ہو سکتا اور اگر واقف ہو تو ویسا ہی خالق وہ بھی ہو جائے۔ مگر جن کو تم معبود مانتے ہو وہ تو خالق نہیں۔ بلکہ سب کے سب خود مخلوق ہیں۔

اس آیت سے کس لطیف پیرایہ میں خدا تعالےٰ کے سوا سب باقی ہستیوں کے علم غیب جاننے کے دعویٰ کو رد کیا گیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ مسلمانوں میں اس تعلیم کی موجودگی میں ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو علم غیب بھی تھا اور وہ پرندے بھی پیدا کیا کرتے تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس جگہ صاف فرماتا ہے کہ جس قدر وجودوں کی اللہ کے سوا پوجا کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک بھی کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ اور حضرت عیسیٰؑ ان ہی وجودوں میں سے ہیں جن کی لاکھوں کروڑوں انسان پوجا کرتے ہیں۔

۲۲ حل لغات:۔ يَشْعُرُوْنَ: شَعَرَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور شَعَرَ بِهٖ (شُعُوْرًا) کے معنے ہیں عَلِمَ بِهٖ۔ کسی چیز کو معلوم کیا۔ شَعَرَ لَهٗ: فَطِنَ لَهٗ، اس کو سمجھا۔ عَقَلَهٗ، کسی چیز کو جانا۔ اَحَسَّ بِهٖ۔ اسکو محسوس کیا (اقرب) پس مَا يَشْعُرُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ انہیں معلوم نہیں۔ وہ محسوس نہیں کرتے۔

تفسیر:۔ خالق ہونے کے علاوہ ہدایت دینے والے وجود کے لئے زندہ ہونا بھی ضروری ہے۔ تا کہ جب کوئی خرابی ہو وہ اس کی اصلاح کر سکے۔ اس دلیل سے معبودانِ باطلہ کے ہدایت دینے کے قابل ہونے سے انکار کیا اور فرمایا کہ جن کو تم پوجتے ہو سب فوت ہو چکے ہیں پھر وہ ہادی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اگر اس زمانہ میں خرابی پیدا ہو تو وہ اسے کس طرح دُور کریں گے۔ تعجب ہے کہ مسلمانوں میں اس ارشاد کے خلاف بھی عقیدہ پیدا ہو رہا ہے اور ایک کثیر جماعت حضرت عیسیٰؑ کو زندہ مان رہی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جس قدر جھوٹے معبود قرآن مجید کے زمانہ میں تھے وہ سب فوت ہو چکے تھے۔ پس چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ کو معبود مانتے تھے۔ اس الٰہی شہادت کے ماتحت وہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے فوت ہو چکے تھے اور اگر انہیں زندہ تسلیم کیا جائے۔ تو ماننا پڑے گا کہ وہ نعوذ باللہ معبودانِ باطلہ میں ہی نہ تھے۔ بلکہ فی الواقعہ خدا تھے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

ان دونوں آیات میں شرک کا رد بھی نہایت زبردست دلائل سے کیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے چار دلائل دئے ہیں:۔

(۱) لَا يَخْلُقُوْنَ۔ وہ پیدا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا ہونے کے لئے خالق ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ کامل وجود ہی معبود ہو سکتا ہے۔

(۲) وہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔ یعنی ان میں احتیاج الی الغیر پائی جاتی ہے اور محتاج الی الغیر ناقص ہوتا ہے معبود نہیں ہو سکتا۔

(۳) وہ مردہ ہیں۔ زندہ نہیں یعنی اس زمانہ میں وہ بے نفع اور بے ضرر ہیں۔ اور خدا وہی ہو سکتا ہے جو ہمیشہ نفع اور ضرر کی طاقت رکھتا ہو۔

(۴) انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے گویا ان کا انجام بھی دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ اس آخری دلیل کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ انہیں علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے سو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے زیادہ پوجا جانے والا وجود حضرت مسیح کا ہے۔ وہ یوم البعث کے متعلق خود کہتے ہیں کہ:۔

"لیکن اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔ نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا۔ مگر باپ۔ خبردار! جاگتے اور دعا مانگتے رہو۔ کیونکہ تم نہیں جانتے کہ وہ وقت کب آئیگا" (مرقس ب ۱۳ آیت ۳۲-۳۳)

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس اقرار پر باقی خدا مانے جانیوالے انسانوں کے متعلق بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ےؔ یابن یبعثون کی آیت سے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا ثبوت

ےؔ خدا تعالیٰ کے سوا باقی ہستیوں کے علم غیب جاننے کا رد

ےؔ آیت ایان یبعثون۔ الٰھکم الٰہ میں شرک کے رد میں چار زبردست دلائل

ےؔ یشعرون

ےؔ حضرت مسیحؑ کا یوم البعث کے متعلق عدم علم کا اقرار

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ

آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل (حق سے) ناآشنا ہیں - اور وہ

مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ

تکبّر سے کام لے رہے ہیں ۲۳ؔ یہ یقینی بات ہے کہ جو کچھ وہ پوشیدہ (طور پر) کرتے ہیں (اسے بھی)

قلوبہم منکرۃ

۲۲ؔ حل لغات - قلوبھم منکرۃٌ - منکرۃٌ انکر سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور اس کے معنے جاہل اور ناواقف کے ہیں۔ پس قلوبھم منکرۃٌ کے معنے یہ ہوئے کہ ان کے دل جہالت میں مبتلا ہو گئے - مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر ۵۴ؔ

قرآن مجید کے منکروں سے خطاب کرنے کے دو طریق

تفسیر:- یہ جو فرمایا کہ تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے - یہ خالی دعویٰ نہیں - قرآن کریم جب منکروں سے خطاب کرتا ہے تو صرف دعویٰ پیش نہیں کرتا - کیونکہ ان پر خالی دعویٰ کا اثر نہیں ہو سکتا - بلکہ وہ ایسے موقعہ پر دو میں سے ایک طریق اختیار کرتا ہے - یا تو دعویٰ بیان کرنے کے بعد ہی اس کے دلائل دیتا ہے یا دلائل بیان کرکے بعد میں اس کا نتیجہ پیش کرتا ہے اور یہی دو طبعی طریق ہیں جن سے انسانی دماغ تسلی پاتا ہے اور دونو اپنے اپنے رنگ میں نہایت موثر ہیں - بعض دفعہ دعویٰ بیان کرکے بعد میں دلائل دینا مفید ہوتا ہے اور بعض دفعہ واقعات بیان کرکے بعد میں ان کا طبعی نتیجہ بیان کرنا مفید ہوتا ہے - اس جگہ دوسرا طریق اختیار کیا ہے اور پہلی آیات کا عقلی نتیجہ پیش کیا ہے -

قرآن مجید کا دعویٰ کے بعد دلائل بیان کرنا یا واقعات کے بعد ان کے طبعی نتائج کو بیان کرنا -

پہلی آیات میں دو مضمون بیان ہوئے ہیں - ایک تو یہ کہ سب کائنات ایک ہی رشتہ میں پروئی ہوئی ہے اور ایک چیز کا دوسری پر انحصار ہے - انسان کی پیدائش اصل ہے - اس کی غذا اول حیوانی ہے - حیوان درختوں وغیرہ سے غذا حاصل کرتے ہیں - آگے وہ درخت اور بوٹیاں آسمانی پانی سے پلتے ہیں اور وہ پانی انسان کے پینے کے کام بھی آتا ہے - پھر اسی پانی سے نباتات اُگتی ہیں جو انسان کی غذائیں بنتی ہیں - یہ سب اشیاء رات دن سورج چاند اور ستاروں کی تاثیرات سے نشوونما پاتی ہیں - دوسری طرف ان کے قیام کا ذریعہ سمندر ہے جس میں پانی کا ذخیرہ رہتا ہے - اور اس سے پانی چھن کر پھر انسانوں کو ملتا ہے - اور اس سمندر کو اپنے حال پر رکھنے کے لئے پہاڑ ہیں جو پانی جمع رکھتے ہیں - وہاں سے دریاؤں کے ذریعہ سے پانی بہتا ہے جو خاص راستوں پر چل کر سمندر میں آکر گر جاتا ہے اور سطح زمین پر پھیل نہیں جاتا - کہ زمین انسانوں کی رہائش کے قابل نہ رہے - ان سب امور سے ایک واضح نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ دنیا کی ہر چیز ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور دنیا متفرق چیزوں کا مجموعہ نہیں - بلکہ اس کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسے ایک زنجیر کی کڑیاں - اگر ایک کڑی نکال دی جائے تو زنجیر، زنجیر نہیں رہتی - اسی طرح کائنات میں سے ایک چیز کو نکال دو - ساری دنیا تباہ ہو جائے گی - سمندر خشک کر دو پانی ختم ہو جائیگا دریا خشک کر دو سمندر خشک ہو جائیگا - اس نشیب کو جو دریاؤں کے لئے راستہ بناتا ہے دور کر دو - سب دنیا پر پانی پھیل جائیگا اور زمین رہائش کے قابل نہ رہے گی - پہاڑ مٹا دو زمین پر زلزلے آئیں گے اور انسان ہلاک ہو جائے گا - دریاؤں کے لئے پانی کا ذخیرہ باقی نہ رہے گا اور وہ سارا پانی یکدم سمندر میں جا گرائیں گے اگر ایک طرف دنیا سیلاب کی نظر ہو گی - تو دوسری طرف سال بھر تک پانی کے مہیا رہنے کی صورت مفقود ہو جائے گی - چاند ستاروں کو مٹا دو تو جو ان کی وجہ سے پیدائشِ عالم پر اثر ہے وہ جاتا رہے گا اور زمین اپنی حالت پر نہ رہے گی - سورج کو الگ کر دو یہ بادلوں کا سلسلہ جاتا رہے گا اور لوگ پانی کو ترس جائیں گے اور سبزیوں کا پکنا بند ہو جائے گا - اور انسان کی صحت خراب ہو جائے گی - اور اس کی حیوانی غذا کے پیدا ہونے کا بھی امکان نہ

رہے گا۔ غرض یہ سب کائنات مل کر انسان کی خدمت کر رہی ہے اور اس کا ہر حصہ دوسرے حصہ کے قیام کا ذریعہ ہے۔ جب یہ حال ہے تو پھر دو خدا کا عقیدہ کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ اگر دنیا کو کئی خداؤں نے پیدا کیا ہے۔ تو وہ کون سا حصہ ہے جس کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ دوسرے سے آزاد ہے کہ سمجھا جا سکے کہ اُسے کسی اور نے پیدا کیا ہوگا۔ اور اگر ساری کائنات ایک زنجیر کی کڑیوں پر مشتمل ہے تو اس کا بنانے والا ایک ہی خدا تسلیم کرنا پڑے گا۔ سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ خدا تعالےٰ میں سب کائنات بنانے کی قدرت نہ تھی۔ اس لئے کئی خداؤں نے مل کر کام تقسیم کر لیا اور پہلے سے تجویز کردہ نقشہ کے مطابق ہر اک نے اپنا اپنا حصہ پورا کیا۔ لیکن یہ عقیدہ مشرکوں کا بھی نہیں اور ہے بھی خلاف عقل۔ کیونکہ ناقص وجود خدا نہیں ہو سکتے۔ پس اس دلیل کی موجودگی میں ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ تمہارا خدا وہی ہے جو ایک ہے۔

دوسرا مضمون پہلی آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ سب وجود جن کو خدا کہا جاتا ہے فوت ہو چکے ہیں۔ پس جب وہ فوت ہو چکے ہیں تو پھر بھی ایک ہی خدا باقی رہ جاتا ہے جو موت سے بالا ہے۔ پس اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ میں پہلے مضامین کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے اور کوئی بے دلیل دعویٰ بیان نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ اس جگہ فاء واؤ کے معنوں میں ہے اور فاء واؤ کے معنوں میں عربی زبان میں مستعمل ہوتی ہے۔ (اقرب) اور ترجمہ یہ ہے کہ "اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے دل منکر ہیں اور وہ تکبر سے کام لیتے ہیں۔" اس فقرہ میں اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اگر خدا تعالےٰ کا ایک ہونا ایسا بدیہی امر ہے تو لوگ اس کے ایک ہونے کا انکار کیوں کرتے ہیں۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ یہ انکار کسی دلیل پر مبنی نہیں۔ بلکہ باوجود ان دلائل کے شرک میں مبتلا ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ بعث بعد الموت کے منکر ہیں اور اس انکار کی وجہ سے ان کے اندر سنجیدگی باقی نہیں رہی۔ کیونکہ جب یہ اپنے افعال کو بغیر نتیجہ سمجھتے ہیں۔ تو انہیں اُن کے اچھا بُرا ہونے کے متعلق خاص فکر پیدا نہیں ہوتی۔ اور ضد اور تعصب میں کوئی حرج نہیں دیکھتے۔ کیونکہ ان کے خیال میں گرفت تو کوئی ہونی نہیں۔ اس لئے آہستہ آہستہ اُن کے دل جاہل اور غبی ہو گئے ہیں اور وہ مادہ سمجھ اور ہدایت کا ان میں باقی نہیں رہا جو اس وقت انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میرے اعمال کا کوئی اہم نتیجہ نکلنے والا ہے۔ غرض آخرت کے انکار کی وجہ سے لاابالی پن اور سنجیدگی کا فقدان ان میں پیدا ہو گیا ہے اور دل علم سے محروم رہ گئے ہیں۔ اور اس وجہ سے بدیہی اور یقینی باتوں کا انکار بھی دلیری سے کر دیتے ہیں اور غور کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ غرض اس جگہ مُنْكِرَةٌ کے معنے انکار کرنے والے کے نہیں بلکہ جاہل اور ناواقف کے ہیں۔ اور یہ بتایا ہے کہ بعث بعد الموت پر ایمان نہ ہونے کے سبب سے چونکہ سنجیدگی سے غور کرنے کا احساس نہیں۔ اس لئے اس علت کی وجہ سے دلوں سے سمجھ کا مادہ جاتا رہا ہے اور ان کو حِس ہی نہیں ہوتی کہ ہمارا ایک عقیدہ دوسرے عقیدہ کے خلاف ہے۔

دوسرا نتیجہ بعث بعد الموت کے انکار کا یہ بتایا کہ ان میں تکبر پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ جو شخص جزا وسزا کا مومن نہ ہو وہ نڈر ہو جاتا ہے۔ اور جو نڈر ہو جائے وہ سچائی کا اقرار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

غرض قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ اور هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ کے الفاظ سے درحقیقت دو قسم کے مشرکوں کا ذکر فرمایا ہے ایک وہ ہیں جن سے سنجیدگی سے غور کرنے کا مادہ جاتا رہا ہے اور جہالت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ پس بوجہ ان کے بیمار ہو جانے کے وہ سچائی کے سمجھنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ جو دلائل سُن کر ایک خدا کے عقیدہ کو دل میں تو صحیح سمجھتے ہیں۔ لیکن تکبر اور ضد کی وجہ سے اس کا اقرار نہیں

بعث بعد الموت کے انکار کے دو نتائج

کائنات کا نظام خدا تعالیٰ کے واحد ہونے کی دلیل ہے

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ میں پہلے بیان شدہ مضامین کا نتیجہ

قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ کے الفاظ سے دو قسم کے مشرکوں کا ذکر

وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۞ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝

اور جو کچھ وہ ظاہر (طور پر) کہتے ہیں (اُسے بھی اللہ تعالیٰ) جانتا ہے۔ وہ تکبر کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ۵۲۴

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے (کہ) وہ (کلام) جو تمہارے رب نے اتارا ہے کیا (ہی شاندار) ہے۔ تو وہ کہتے ہیں (کہ) یہ (خدا تعالیٰ کا کلام

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً

نہیں بلکہ) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ ۵۲۵ جس (قول) کے نتیجہ میں وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ (بھی) پورے

کرتے۔ کیونکہ جزا و سزا کے انکار کی وجہ سے وہ بےخوف ہیں اور سچائی کے انکار میں کوئی نقصان نہیں دیکھتے۔

لاجرم

۵۲۴ حل لغات:۔ لَاجَرَمَ کی تشریح کے لئے دیکھو ہُود ۵۲۲

تفسیر:۔ فرمایا جس طرح اوپر بیان کئے گئے دلائل سے ایک خدا کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے عالم الغیب ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ جو ان کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے سو ان کو ان کے اعمال کی ضرور سزا دے گا۔ ہاں وہ یہ فرق ضرور کرے گا۔ کہ جو لوگ انکار بعث کی وجہ سے جہالت میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی سزا ان لوگوں سے کم ہوگی۔ جو توحید کو سمجھتے تو ہیں۔ مگر تکبر کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ کے الفاظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں وہ زیادہ سزا کے مستحق ہوں گے۔

انکار بعث بوجہ جہالت میں پڑنے والوں کی سزا جان بوجھ کر تکبر سے انکار کرنے والوں سے کم ہوگی۔

اساطیر

۵۲۵ حل لغات۔ اَسَاطِيْر:۔ سَطَرَ سے بنا ہے۔ اور سَطَرَ الْكَاتِبُ کے معنے ہیں كَتَبَ۔ اُس نے لکھا۔ اور سَطَرَ الرَّجُلَ کے معنے ہیں صَرَعَهٗ۔ کسی کو کشتی میں گرا لیا۔ سَطَرَهٗ بِالسَّيْفِ۔ قَطَعَهٗ بِهٖ۔ اسکو تلوار سے کاٹ ڈالا۔ اَلْاِسْطَارُ وَالْاُسْطَارُ وَالْاُسْطُوْرُ وَالْاُسْطِيْرُ۔ مَا يُسْطَرُ اَیْ يُكْتَبُ وَتُسْتَعْمَلُ فِي الْحَدِيْثِ لَا نِظَامَ لَهٗ یعنی اِسْطَار اور اُسْطَار اُسطُور اور اُسطِیر کے معنے لکھی ہوئی چیز کے ہیں اور ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن میں کوئی نظام نہ ہو۔ والحکایات اور قصے کہانیوں کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَسَاطِیْر آتی ہے (اقرب) پس اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کے معنے ہونگے پہلے لوگوں کی تحریری حکایتیں یا کہانیاں یا بے جوڑ باتیں۔

منکرین توحید و بعث بعد الموت کا قرآن کے اثر کو مٹانے کا طریق

تفسیر:۔ اس آیت سے پھر اصل مضمون کی طرف رجوع فرمایا اور بتایا کہ یہ منکرین توحید اور بعث بعد الموت جب ان دلائل کو سنتے ہیں۔ تو بجائے غور کرنے کے کہہ دیتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تو پہلے لوگوں کی باتوں کو نقل کر دیا گیا ہے۔ اُسطور جس کی جمع اساطیر ہے۔ اس کے معنے کہانی کے بھی ہوتے ہیں اور کتاب کے بھی۔ اور گو دونوں معنے اس آیت میں چسپاں ہو سکتے ہیں۔ مگر سیاق کو مدنظر رکھتے ہوئے کتاب کے معنے زیادہ چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ اس سورۃ میں نبیوں کے واقعات بیان نہیں ہوئے بلکہ بعض دلائل بیان ہوئے ہیں۔ پس سیاق کے لحاظ سے یہاں یہی معنے زیادہ چسپاں ہوتے ہیں۔ کہ وہ لوگ جو دلائل کو سنتے ہیں تو ڈرتے ہیں کہ لوگوں پر اثر نہ ہو جائے اور اثر کو مٹانے کے لئے تخفیف کے لئے کہتے ہیں کہ اجی یہ کوئی نئی بات نہیں پہلے کئی لوگ یہ باتیں لکھ چکے ہیں ہم ان باتوں سے خوب واقف ہیں۔ گویا اس طرح وہ اپنے اتباع پر یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ یہ خدائی کلام نہیں صرف پہلے لوگوں کی

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ

(پورے) اٹھائیں گے اور ان کے بوجھ بھی جن جاہلوں کو وہ گمراہ

بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ قَدْ

کر رہے ہیں - سنو! جو بوجھ وہ اٹھا رہے ہیں وہ بہت (ہی) بُرا ہے ۲۶ ج

ع ۳ ۹

باتوں کو نقل کرکے یہ شخص بیان کر رہا ہے اور ہم ان باتوں کو پہلے سے ہی جانتے ہیں اور ان کی غلطی سے واقف ہیں۔

یہ حربہ حق کے خلاف ہمیشہ استعمال ہوتا چلا آتا ہے جب ائمۃ الکفر دیکھیں کہ دلائل زبردست ہیں اور ان کا جواب دینا مشکل ہے۔ تو ہمیشہ یہ کہہ کر بات ٹال دیتے ہیں کہ اجی بس کرو یہ بھی کوئی دلائل ہیں۔ ہمیشہ سے لوگ یہ بات کہتے چلے آئے ہیں۔ تم نے ان سے نقل کرکے آگے لوگوں کو سنا دی ہیں اور ان کے جاہل اتباع دلیل کی خوبی سے غافل ہو جاتے ہیں اور اسی پر خوش ہو جاتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس لئے خدائی کلام نہیں ہو سکتا۔ گویا کہ خدائی کلام وہ ہوتا ہے جس میں نئی نئی باتیں بیان کی جائیں۔ حالانکہ خدائی کلام کی غرض تو گمشدہ صداقتوں کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ گو اس میں زمانہ کی ضرورت کے مطابق نئے علوم بھی ہوتے ہیں۔ مگر اصولی باتیں سب نبیوں کی ایک ہی ہوتی ہیں۔ ان اصولی باتوں کو چھوڑ کر جو نئی بات کہے گا وہ تو جھوٹ ہی بولے گا۔

۲۶ حلّ لغات - اَوْزَار - وِزْرٌ کی جمع ہے اور وِزْرٌ وَزَرَ کا مصدر ہے - وَزَرَہٗ کے معنے ہیں حَمَلَہٗ. اس نے اس کو اٹھایا - وفی الْمِسَانِ حَمَلَ مَا يُثْقِلُ ظَهْرَهٗ من الاشیاءِ الْمُثْقِلَةِ - اور لسان میں لکھا ہے کہ وِزْرٌ کا لفظ ایسے بوجھ کے اٹھانے کے لئے بولتے ہیں جس کا اٹھانا مشکل ہو۔ نیز الوِزْرُ کے معنے ہیں اَلْاِثْمُ گناہ۔ اَلثِّقْلُ بوجھ - السِّلَاحُ لِثِقْلِهٖ علی حاملہٖ - ہتھیار کیونکہ وہ بھی اٹھانے والے پر بوجھل ہوتے ہیں۔ اَلْحِمْلُ الثَّقِيْلُ - بھاری بوجھ - اس کی جمع اَوْزَار آتی ہے (اقرب)

تفسیر:- فرمایا اس قسم کی باتوں سے یہ عوام کو دھوکا تو دے لیتے ہیں لیکن اپنی عاقبت کو اور بھی خراب کر لیتے ہیں۔ آخر جزاء کے دن ان کے اپنے بد اعمال کے علاوہ اس جرم کی سزا بھی ان کو ملے گی کہ فریب اور دھوکے سے جاہل عوام کو گمراہ کرتے رہے۔

لِيَحْمِلُوْٓا میں لام - لام عاقبت ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ پہلی بات کے نتیجہ میں یہ بات پیدا ہوئی ہے اور معنے یہ ہیں کہ اس دھوکہ دہی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ اپنے گناہوں کی سزا بھی پائیں گے اور ان کے اعمال کی بھی جن کو انہوں نے گمراہ کیا ہوگا۔

بغیر علم - یُضِلُّوْنَهُمْ کی ضمیر مفعول کا حال ہے اور یہ مراد نہیں کہ گمراہ کرنے والے بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ان آیات میں تو ذکر ہی یہ ہے کہ یہ لوگ شرارت سے گمراہ کر رہے ہیں۔ بلکہ . . . . معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنے اتباع کو جو کوئی علم نہیں رکھتے باتیں بنا کر گمراہ کر دیتے ہیں۔

حَامِلَۃٌ - اس لفظ کے دو طرح معنے کئے جا سکتے ہیں (۱) اگر تو اسے یوم القیامۃ کا متعلق سمجھا جائے تو معنے یہ ہوں گے۔ کہ کچھ سزا تو انہیں یہاں دنیا میں ملیگی لیکن پوری سزا ان کو قیامت میں ملیگی (۲) اگر اسے لیحملوا کا متعلق سمجھا جائے تو اس کے معنے ہونگے کہ یہ اپنے سارے کے سارے بوجھ اٹھائیں گے اور کوئی بوجھ کم نہ ہوگا۔ یعنی مومن تو استغفار کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اسکے بوجھ کم ہوتے رہتے ہیں اور گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں مگر یہ متکبر ہیں اس لئے انکے سب گناہ باقی رہ جائیں گے اور سب کی سزا ان کو ملے گی۔

ابھی دونوں کو مخالفین کا پہلوں کی نقل کردہ باتیں کہنا ہمیشہ کا وطیرہ ہے

بغیر علم یضلونہم کی ضمیر مفعول کا حال ہے

اوزار

کاملۃ کے لفظ کے دو معنے

مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ

لوگ اُن سے پہلے تھے انہوں نے (بھی اپنے اپنے زمانہ کے انبیاء کے خلاف) تدبیریں کی تھیں جس کے نتیجہ میں اللہ (تعالیٰ) اُنکی عمارتوں

مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ

کے پاس ان کی بنیادوں کی طرف سے آیا۔ جس پر چھت ان کے اوپر کی طرف سے اُن پر آن گری۔

وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ ثُمَّ

اور (اس کا یہ) عذاب اُن پر ایسی طرف سے آیا کہ وہ (کچھ) نہیں سمجھتے تھے (کہ کہاں سے آگیا) ۲۷؎ پھر

۲۷؎ حل لغات۔ مکر: کسی کو اس کے قصد سے کسی تدبیر کے ذریعہ سے پھیرنے کا نام مکر ہے اور یہ اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھیں رعد ۴۳؎ اَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ: اَتَى کی تشریح کے لئے دیکھو رعد ۴۲؎ القواعدُ: اس کا مفرد القاعدۃ ہے اور قَوَاعِدُ الْبَيْتِ کے معنے ہیں۔ اَسَاسُهٗ۔ گھر کی بنیادیں (اقرب) خَرَّ کے لئے دیکھو یوسف ۹۴؎

مکر — نبی کی نقل اور کفار کی نقل میں فرق

اَتَى

القواعد

تفسیر:۔ فرمایا اس طرح اشتعال دلاکر اور دھوکا دے کر لوگوں کو نبیوں کی تعلیم سے ناواقف رکھنا کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ پہلے انبیاء کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر ان تدبیروں سے کبھی بھی نبیوں کے دشمن کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ تدابیر آخر اُلٹ کر اُنہی پر پڑتی رہی ہیں۔

مکر کر کے لوگوں کو دھوکہ دیکر نبیوں کی تعلیم سے ناواقف رکھنے کی سزا۔

یہ طریق کلام کیسا لطیف ہے۔ دشمنان اسلام کا یہ اعتراض پہلے بیان ہوا ہے کہ یہ مدعی کوئی نئی تعلیم تو نہیں لایا۔ پہلے لوگوں کی باتوں کو نقل کر رہا ہے۔ اس آیت میں ان کا اعتراض انہی کے متعلق دُہرا دیا اور فرمایا کہ یہ سچ ہے کہ یہ نبی بہت سی باتیں وہ بیان کرتا ہے جو پہلے نبیوں نے بھی کہی ہیں۔ اور تم ان کو نقل کہتے ہو۔ مگر اپنا حال نہیں دیکھتے کہ تم بھی پہلے نبیوں کے دشمنوں کی نقل کر رہے ہو اور ویسی ہی شرارتیں کر رہے ہو جیسی کہ پہلے نبیوں کے دشمن کیا کرتے تھے۔ اگر اس نبی کا کلام پہلے لوگوں کی نقل ہے تو وہ اچھی نقل ہے۔ مگر تمہارے کام بھی نقل ہیں اور بُرے لوگوں کی نقل ہیں۔ پس نقل کہہ کر بھی تو تم اعتراض سے نہیں بچ سکتے۔ کیونکہ یہ تو ان کی نقل کرتا ہے جو آخر کامیاب ہوئے اور تم ان کی نقل کر رہے ہو جو آخر ہلاک ہوئے۔ پس اگر دونوں طرف سے نقل ہو رہی ہے تو بھی تم ہی خسارہ میں رہتے ہو۔ کیونکہ تباہ ہونے والوں کی نقل کر رہے ہو۔ چنانچہ ان لوگوں کا حال بتاتا ہے جن کی کفار نقل کر رہے تھے۔ اور فرماتا ہے کہ تمہاری ہی طرح پہلے انبیاء کے دشمن بھی لوگوں کو نبیوں کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکایا کرتے تھے کہ یہ نقّال ہیں۔ مگر کیا اس اعتراض یا ایسے ہی اور اعتراضوں سے وہ نبیوں کی تعلیم کے پھیلنے میں کوئی کامیاب روک پیدا کر سکے۔ کیا اس طرح وہ نبیوں کے تباہ کرنے میں کامیاب ہو سکے؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ خود ہی تباہ ہوئے۔ پھر ان کے عذاب کی نوعیت بتائی کہ تباہی بھی معمولی تباہی نہ تھی بلکہ اَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر اس طرح عذاب نازل کیا کہ ان کی خود ساختہ عمارتوں کی بنیادوں کو اُکھاڑ پھینکا اور دیواروں کے ساتھ چھتیں بھی گر گئیں یعنی نہ توابع رہے نہ افسر سب ہی ہلاک ہوئے۔ اور وہی دیواریں یعنی توابع جن پر انہیں ناز تھا اس طرح اوندھے منہ گرے کہ اپنے ساتھ اپنے سرداروں کو بھی لے گرے پس عوام الناس پر جو تم کو اثر حاصل ہے اس پر مغرور

آنحضرتؐ پر نبیوں کی نقل کرنے کے اعتراض کا جواب

زخمۂ

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ

وہ قیامت کے دن (دوبارہ) انہیں رسوا کریگا اور کہیگا (کہ اب) کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کی وجہ سے تم (میرے

الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ

انبیاء سے) دشمنی (اور مخالفت) رکھتے تھے ۔ (اور) جنہیں علم دیا گیا ہوگا وہ

اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَي

(اس وقت) کہیں گے ۔ کہ آج کافروں پر یقیناً رسوائی اور مصیبت

الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ

(آنے والی) ہے ۵۲۸ (ان پر) جن کی روحوں کو فرشتے (عین) اس وقت کہ وہ اپنی

نہ ہو کہ جب خدا تعالےٰ کا عذاب آتا ہے تو یہ حکومت دھری رہ جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کفار کے سارے نظام کو تباہ کر دیتا ہے اور افسر اور ماتحت سب ہی گرتے ہیں۔ بلکہ توابع ہی سرداروں کی تباہی اور ہلاکت کا موجب ہو جاتے ہیں۔

پھر بتایا کہ یہ عذاب ہمیشہ غیر معمولی طریق سے آتے رہے ہیں۔ حتی کہ ائمۂ کفر کو علم بھی نہ ہوتا تھا کہ عذاب آرہا ہے اور عذاب آجاتا تھا۔ اور ایسی راہوں سے آتا تھا۔ جن کا انہیں وہم اور گمان تک نہ ہوتا تھا۔

اَتَی اللّٰهُ - اللہ تعالیٰ کے منکروں کے پاس آنے کے معنے ہمیشہ عذاب کے ہوتے ہیں۔

بہائیوں نے اسی قسم کی آیات پیش کر کے کہا ہے۔ کہ دیکھو قرآن کریم میں لکھا ہے کہ خدا خود آئے گا۔ اس سے مراد بہاء اللہ کا ظہور ہے۔ حالانکہ یہ معنے قرآنی محاورہ کے سراسر خلاف ہیں۔ جیسا کہ یہ آیت صاف ظاہر کر رہی ہے۔ ہاں اگر بہاء اللہ کو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ایک عذاب سمجھا جائے تو ان کو بھی اللہ کی آمد کا عذابی ظہور ماننے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ دین سے غافلوں کو اور زیادہ غفلت کے سامان پیدا کر کے عذاب

دیا کرتا ہے۔

اس آیت میں اہل مکہ کو گذشتہ واقعات کا حوالہ دیکر ہوشیار کیا گیا ہے کہ اب تمہارا نظام کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اب تو وہ خود ہی گرنے کو تیار کھڑا ہے۔ تم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام کو کیا تباہ کرنا ہے۔ تمہارے دیکھتے دیکھتے تمہاری عمارت دیواروں اور چھتوں سمیت زمین پر آ رہے گی۔ تاریخ دان جانتے ہیں کہ فتح مکہ سے پہلے آخری دن تک کفار غالب معلوم ہوتے تھے۔ لیکن یکدم ان کی عمارت پیوند خاک ہو گئی۔

(حاشیہ: اس آیت میں مکہ کی حکومت کے انہدام کا اشتباہ)

۵۲۸ حل لغات۔ ثُمَّ: حرف عطف ہے

جو ترتیب اور تراخی کے لئے آتا ہے۔ یعنی یہ ظاہر کرتا ہے کہ معطوف اپنے معطوف علیہ کے بعد ترتیباً اور کچھ دیر بعد واقع ہوا ہے (اردو زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے پھر، تب، بعد از اں کے الفاظ استعمال کرتے ہیں) اور بعض اوقات ثُمَّ کے آخر میں تاء بھی لے آتے ہیں۔ جیسے کہ اس شعر میں اسے لایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَي اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ
فَمَضَيْتُ ثُمَّتَ قُلْتُ لَا يَعْنِيْنِيْ (اقرب)

(حاشیہ: ۲ ثُمَّ ؛ ۳ اللہ کے منکروں کے پاس آنے سے مراد عذاب کا آنا ہوتا ہے ؛ ۳ بہائیوں کا اَتَی اللّٰهُ سے غلط استدلال اور اس کا جواب)

اَنْفُسِهِمْ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ

جانوں پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں نکالتے ہیں۔ تو وہ (یہ کہہ کر) صلح کی طرح ڈالتے ہیں (کہ) ہم (تو) کوئی بھی برائی (کا کام) نہیں کیا کرتے

سُوْٓءٍ ؕ بَلٰۤى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

تھے (رسوا نہیں کیا جائیگا کہ واقعہ) یوں نہیں بلکہ (اس کے برعکس ہے۔ یاد رکھو) جو کچھ تم کرتے تھے اُسے اللہ تعالیٰ یقیناً خوب جانتا ہے ۲۹

یَوْمَ کے لئے دیکھو یونس ۵

بَلٰى

اَخْزٰى

يُخْزِيْهِمْ: يُخْزِى اخزیٰ سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اَخْزَاہُ کے معنے ہیں۔ اَوْقَعَہٗ فِی الْخِزْیِ او الْخِزَایَةِ وَاَهَانَہٗ۔ اس کو کسی ایسی بات میں پھنسایا۔ جس سے اُسے ندامت ہو اور اس طرح سے اُسے ذلیل کیا۔ اخزی اللّٰہُ فلانًا کے معنے ہیں فَضَحَہٗ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے عیوب کو ظاہر کر دیا۔ اور اس طرح وہ رسوا ہو گیا (اقرب) پس يُخْزِيْهِمْ کے معنے ہوں گے۔ ان کے عیوب کو ظاہر کر کے اللہ تعالیٰ انہیں رسوا کرے گا۔

تشاقون

تُشَاقُّوْنَ: شَاقَّ سے مضارع جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے اور شَاقَّہٗ کے معنے ہیں خَالَفَہٗ۔ اس سے ناموافقت کی۔ عَادَاہُ۔ اس سے دشمنی کی (اقرب) پس كُنْتُمْ تُشَاقُّوْنَ کے معنے ہوں گے (۱) تم مخالفت کرتے تھے (۲) تم دشمنی کرتے تھے

ظالمی انفسہم کنا کفار کو مجرم قرار دیا گیا ہے۔

الخزیُ: کے اصل معنے ایسی ذات کے ہیں جو لوگوں کے سامنے شرمندگی کا موجب ہو۔ مزید تشریح کیلئے دیکھو یونس ۹۵

آنحضرت کے مخالفین پر رسوائی اور ہلاکت کے دونوں عذاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ... جانے کی وجہ

تفسیر:۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان پر آفت آتی ہے مگر وہ رسوائی کا موجب نہیں ہوتی۔ اور بعض دفعہ رسوائی تو ہوتی ہے مگر ہلاکت اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں پر جب عذاب آئے گا۔ تو اس میں دونوں باتیں شامل ہوں گی تباہی بھی اور رسوائی بھی۔

السلم

۲۹ حل لغات

السَّلَمَ۔ الاِسْمُ مِنَ التَّسْلِيْمِ بمعنى السَّلَامِ۔ باب تفعیل سے اسم مصدر ہے اور اس کے معنے وہی ہیں جو سلام کے ہیں یعنی سلامتی صلح۔ نیز اس کے معنے ہیں۔ الاستسلامُ۔ تابعداری۔ فرمانبرداری (اقرب)

بَلٰى: جَوَابٌ لِلتَّحْقِيْقِ تُوْجِبُ مَا يُقَالُ لَكَ لِاَنَّهَا تَرْكٌ لِلنَّفْيِ فَاِذَا قُلْتَ لِزَيْدٍ لَيْسَ عِنْدَكَ كِتَابٌ فَقَالَ بَلٰى لزمہُ الکتابُ وان قال نعم فلا یلزمہُ۔ یعنی یہ نفی کے بعد آتا ہے۔ لیکن معنوں کو مثبت کر دیتا ہے۔ جیسے کوئی کسی کو کہے کہ تیرے پاس کتاب نہیں۔ تو جواب میں وہ بَلٰى کا لفظ کہے۔ تو اس کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ کیوں نہیں؟ میرے پاس کتاب ہے۔ لیکن اگر جواب میں نَعَمْ کا لفظ کہے۔ تو معنے ہوں گے۔ کہ میرے پاس کتاب نہیں۔ (اقرب)

تفسیر:۔ اس آیت میں بتایا کہ یہ عذاب ان کفار پر آئے گا جو موت تک کفر پر قائم رہیں گے۔ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کہہ کر بتایا کہ ایسے لوگوں کی ساری عمر اپنی جانوں پر ظلم کرنے میں گذر جاتی ہے اور وہ سمجھتے یہ رہتے ہیں کہ وہ نبیوں پر ظلم توڑ رہے ہیں گویا ان کی مثال اس درندہ کی سی ہوتی ہے جو پتھر کو چاٹتا ہے اور اس کی زبان سے خون بہنے لگتا ہے۔ مگر خون کی لذت کو پتھر کا مزا سمجھ کر وہ اس کے چاٹنے میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی ساری زبان ہی گھس جاتی ہے۔

فَاَلْقَوُا السَّلَمَ۔ سَلَمَ کے معنے صلح کے ہیں اور صلح کو سلم اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے ہر ایک دوسرے کے شر سے بچ جاتا ہے۔ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ سے یہ مراد ہے کہ وہ یہ دیکھ کر کہ اب تو ہم پکڑے گئے اور بچنے کی کوئی راہ نہیں مصالحانہ باتیں کریں گے۔ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ کے لفظی معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ صلح کی طرح ڈالیں گے۔

مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اس

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ

اس لئے (اب) تم جہنم کے دروازوں میں سے اس میں ہمیشہ کے لئے ٹھکانہ بناتے ہوئے داخل ہو۔ کیونکہ تکبر کرنے والوں

مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ○ وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَا

کا ٹھکانا یقیناً بہت بُرا (ہوتا) ہے ن۳۰ اور (جب) ان لوگوں سے جنہوں نے تقویٰ (کا طریق) اختیار کیا ہے کہا گیا

وقت یہ تو کہہ نہیں سکیں گے کہ ہم نے معبودانِ باطلہ کی عبادت نہیں کی۔ پس وہ اپنے مشرکانہ اعمال کی اس طرح تشریح کرینگے کہ جو کچھ ہم نے کیا بدی کی نیت سے نہیں کیا۔ بلکہ نیک نیتی سے کیا تھا۔

میرے نزدیک مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ کے معنے یہ نہیں کہ ہم نے کوئی شرک نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہ ہمارا فعل جو بھی تھا وہ بدی کی نیت سے نہ تھا۔ اس کا محرک سُوء نہیں تھا۔ بلکہ نیک نیتی سے وہ فعل کیا گیا تھا۔

اس دنیا میں بھی جب مشرک توحید کے دلائل کے سامنے عاجز آجاتے ہیں۔ تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو بتوں وغیرہ کو سجدہ خدا سمجھ کر نہیں کرتے۔ بلکہ صرف توجہ کے قیام کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ ورنہ عبادت تو ہم اللہ تعالیٰ کی ہی کرتے ہیں۔

بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کہہ کر یہ بتلایا ہے کہ یہ تمہارا صرف ڈھکوسلا ہے۔ خدا تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ تم کس نیت اور ارادہ سے معبودانِ باطلہ کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی تلاش سچے دل سے کرتے تو ان کو توجہ کے لئے ان جھوٹے سامانوں کی کیا ضرورت تھی۔ نیز یہ بھی بتایا کہ یہ عذر جھوٹا ہے تم تو فی الواقع مشرک تھے۔

مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کی اور جو کچھ کیا حق سمجھ کر کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے۔ اگر تم نیک نیتی سے یہ کام کرتے تو ہم تم کو ہدایت کیوں نہ دیتے۔ ہمارا تو یہ قانون ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت ع۷) جو لوگ صحیح طور پر ہماری تلاش کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنا رستہ دکھاتے ہیں۔ پس اگر تم نیک نیتی سے ہمیں پانے کی کوشش کرتے تو غلط راستہ پر کبھی نہ چلتے۔ ہم خود تم کو ہدایت دیتے۔ پس اس عذر کی وجہ سے تم سزا سے نہیں بچ سکتے۔

ماکنا نعمل کے الفاظ میں کفار کیطرف سے اپنے شرک کرنے میں معذرت

بلیٰ ان اللہ میں کفار کی معذرت کا جواب

ن۳۰ حل لغات۔ جَهَنَّم: کے لئے دیکھو رعد ۱۹

جہنم

بئس

بِئْسَ: فعل ذم کہلاتا ہے۔ یعنی جب کسی کی مذمت مقصود ہو۔ اس وقت یہ فعل استعمال کرتے ہیں جس کی مذمت کی جائے اُسے مخصوص بالذم کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا فاعل آتا ہے اور پھر مخصوص بالذم۔ فاعل اور مخصوص بالذم دونوں مرفوع ہوتے ہیں۔ اس کے فاعل کے لئے ضروری ہے کہ لام جنس کے ساتھ مقرون ہو۔ یا مقرون بلام الجنس کی طرف مضاف ہو۔ جیسے بِئْسَ الرَّجُلُ زَيْدٌ اور بِئْسَ غُلَامُ الرَّجُلِ بَكْرٌ۔ اور کبھی اس کا فاعل ظاہراً مقرون باللام نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی جگہ نکرہ منصوب تمییز کے رنگ میں لے آتے ہیں یا مَا نکرہ استعمال کر لیتے ہیں۔ جیسے بِئْسَ رَجُلًا زَيْدٌ اور بِئْسَ مَا زَيْدٌ میں رَجُلًا اور مَا استعمال ہوئے ہیں (اقرب)

مثوی

مثویٰ کے لئے دیکھو یوسف ۲۲

تفسیر۔ اس آیت میں پھر اس امر پر زور دیا ہے۔ کہ جو متکبر ہو یعنی حق کو سمجھتا ہو۔ لیکن شرارت کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ میں کیوں نبی کا تبع ہو کر چھوٹا بنوں۔ حق کا انکار کرنے والا ہو۔ وہ بہت سزا پائے گا۔ بہ نسبت اس کے جو مجرم تو ہے مگر اس کا جرم شرارت سے نہیں۔ بلکہ غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے ہے۔ یہ موجب بھی گو مستحق سزا بناتا ہے مگر تکبر کے موجب سے کم ہے۔ بِئْسَ کے معنی زیادہ بُرے کے ہوتے ہیں پس اس لفظ سے دونوں قسم کے مجرموں کا فرق بیان کیا گیا ہے۔

ماکنا نعمل کے ایک اور معنے

ذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا

دکہ) تمہارے رب نے کیا (شاندار کلام) اتارا ہے تو انہوں نے کہا کہ (ہاں) بہترین ۔ جنھوں نے نیکوکاری (کی راہ) اختیار کی ان کیلئے

فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ

اس دنیا (کی زندگی) میں بھی بھلائی (مقدر) ہے ۔ اور آخرت کا گھر (توان کے لئے) اور بھی بہتر ہوگا۔

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا

اور تقویٰ اختیار کرنیوالوں کا گھر یقیناً بہت (ہی) اچھا (ہوتا) ہے ۱۳۱ (وہ گھر) دائمی رہائش کے باغات (ہیں) جن میں وہ داخل ہوں گے

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ

ان کے اندر نہریں بہتی ہوں گی ۔ ان (باغوں) میں جو کچھ وہ چاہیں گے انہیں ملے گا۔

كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ

تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اللہ (تعالیٰ) اسی طرح جزاء دیا کرتا ہے ۔ ۱۳۲ (وہ متقی) جن کی

۱۳۱ حل لغات ۔ خَیْرًا : اَلْخَيْرُ: وِجْدَانُ الشَّيْءِ عَلٰى كَمَالَاتِهِ اللَّائِقَةِ : کسی چیز کا اس کے مناسب کمالات سمیت پائے جانے کا نام خیر ہے ۔ وَقِيْلَ حُصُوْلُ الشَّيْءِ لِمَا مِنْ شَأْنِهٖ اَنْ يَّكُوْنَ حَاصِلًا لَهٗ ـ اي مَنَاسِبُهٗ وَيَلِيْقُ بِهٖ ۔ اور بعض محققین نے کہا ہے کہ کسی چیز کا ایسے طور پر ہونا کہ اس میں اس کے شایانِ شان باتیں پائی جائیں خیر کہلاتا ہے ۔ المال مطلقًا ۔ مال ۔ الکثیر الخیر ۔ خیر اس شخص کو بھی کہتے ہیں جس میں ہر قسم کے کمالات بکثرت پائے جائیں (اقرب)

نِعْمَ : فعل مدح کہلاتا ہے ۔ یعنی جب کسی کی تعریف کرنی مقصود ہو ۔ تو اس وقت یہ فعل استعمال کیا جاتا ہے ۔ جس کی تعریف کی جائے اسے مخصوص بالمدح کہتے ہیں ۔ اس کے فاعل اور مخصوص بالمدح کے وہی احکام ہیں جو پہلے بئس کے متعلق لکھے جا چکے ہیں ۔

تفسیر:۔ اس آیت میں مومنوں کے نقطۂ نگاہ کو ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ قرآن مجید کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ اگر کوئی کہے کہ وہ تو مسلمان تھے انہوں نے تو یہ کہنا ہی تھا ان کی گواہی کوئی قیمت نہیں رکھتی ۔ تو ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ قول اس وقت کا ہے جبکہ وہ مکہ میں تھے ۔ چاروں طرف سے ان کو تنگ کیا جاتا تھا اور ان کو جان کے لالے پڑ رہے تھے ۔ ایسے وقت میں ان کا اس کتاب کو قبول کر لینا اور اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کرنا اس کی سچائی کی نہایت زبردست شہادت ہے ۔

قَالُوْا خَيْرًا ۔ انہوں نے کہا یہ کتاب مناسب کمالات کے ساتھ نازل ہوئی ہے یعنی جو باتیں کسی روحانی کتاب میں چاہئیں وہ سب بتمام و کمال اس میں موجود ہیں ۔ یا جیسا خیال تھا کہ ایسی کتاب آنی چاہیئے اس سے بھی بہتر اس کو پایا ۔

اَحْسَنُوْا ۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ نقطۂ نگاہ کے بدلنے سے عمل میں کتنا فرق پڑ جاتا ہے ۔ ایک گروہ نے اسے اساطیر الاولین کہا ۔ پس اس کے وعید سے نہ ڈرے اور ہلاکت کا شکار ہو گئے اور مومن جنہوں نے اسے خیر سمجھا وہ اس کی پوری اتباع کرنے میں لگ گئے اور آخر خیر والے مقام یعنی جنت میں پہنچ گئے ۔ وہ مقام کیسا ہے ۔ اس کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے ۔

۱۳۲ حل لغات ۔ جَنّٰتِ عَدْنٍ کیلئے دیکھو رعد ۲۴

خیرًا

قرآن مجید کے متعلق مومنوں کا نقطہ نگاہ

نِعْمَ

نقطہ نگاہ بدلنے سے عمل میں فرق

جنات عدن

تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ

روحوں کو فرشتے اس حالت میں کہ وہ پاک نفس ہوں (یہ) کہتے ہوئے قبض کرتے ہیں کہ (اب) تمہارے لئے

عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

سلامتی (ہی سلامتی) ہے۔ جو کچھ (تم) کرتے تھے اس کے مطابق تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ۵۳۳

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ

(اب) یہ (لوگ) اس بات کے سوا کس کا انتظار کر رہے ہیں کہ فرشتے ان کے پاس (آسمانی عذاب لیکر) آئیں یا تیرے رب کا

اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ

(فیصلہ کن) حکم آجائے۔ اسی طرح ان لوگوں نے کیا تھا۔ جو ان سے پہلے (زمانوں کے) تھے۔ اور

تفسیر:۔ یعنی وہ مقام خیر ہمیشہ رہنے والا ہوگا کیونکہ اچھی چیز کو ہمیشہ رکھا جاتا ہے۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ یہ نہیں کہ اس کی تہ میں نہریں بہتی ہوں گی۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس میں بہنے والی نہریں اُسی کے نظام کے ماتحت ہوں گی۔ دنیا میں نہریں اور دریا ضروری نہیں کہ ان لوگوں کے تابع ہوں جن کے ملک یا زمین میں وہ بہتے ہوں۔ جب ایسی صورت ہو تو وہ ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بسا اوقات دریا کئی ملکوں میں سے گذرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے ملکوں میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ پس ان الفاظ سے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ جنت کی نہریں جنت کے نظام کے کلی طور پر ماتحت ہوں گی اور کوئی دوسرا ان میں شریک نہ ہوگا۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ — سے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ وہ ایسا مقام ہے جس میں کوئی نقص نہیں۔ کیونکہ فنا کا موجب نقص ہی ہوتا ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ — اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں (۱) ان کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ کیونکہ ان کی مشیت مشیتِ ایزدی ہوگی۔ گویا مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کی حالت ہوگی۔ اور اُن کے دل میں اُنہی اشیاء کی خواہش پیدا ہوگی جو ان کو مل سکتی ہوں گی اور مل جائیں گی۔ حرص و آز سے ان کے دل خالی ہوں گے اور حسد کی آگ سے وہ محفوظ ہوں گے اور ہر گندگی سے دل پاک ہو جائیں گے۔

(۲) ان کو ان جنتوں کے متعلق جن میں وہ رکھے جائیں گے پورا اختیار حاصل ہوگا اور ان کے متعلق ان کے دل میں جو خواہش پیدا ہوگی وہ ضرور پوری ہوگی۔ کیونکہ انہیں وہاں پورا اختیار دیا جائے گا۔

تجری من تحتہا الانہار کا مطلب

۵۳۳ حل لغات۔ سَلَامٌ: کیلئے دیکھو یونس ۱۱ سلام

تفسیر:۔ یعنی متقی وہ ہوتے ہیں جن کو موت اس وقت کہ وہ طیب النفس ہوتے ہیں آتی ہے۔ وہ ہر قسم کے نقصوں سے پاک ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی خوبیاں۔ صفائی۔ ترقی اور علو ہمت کے جذبات ان میں پائے جاتے ہیں (طیبین کے معنوں کے لئے کلمہ طیبہ کی تفسیر سورہ ابراہیم رکوع ۴ میں دیکھو)

جنات عدن سے اس مقام کے بے نقص ہونے کی طرف اشارہ ہے

يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ — یعنی کفار تو خود ڈر کر صلح کی طرح ڈالیں گے اور مومنوں کو فرشتے خود بڑھ کر سلام کہیں گے ؎

لہم فیہا ما یشاءون کے دو معنے

مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

اللہ (تعالیٰ) نے ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا تھا بلکہ وہ (خود ہی) اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ۳۴۵

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا

پس اُن کے عملوں کی سزانے انہیں آپکڑا۔ اور جس (عذاب کی خبر) پر وہ ہنسی کیا کرتے تھے اس نے انہیں

ع ۴ / ۱۰

كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا

گھیر لیا (اور تباہ کر دیا) ۳۵۵ اور جن لوگوں نے شرک (کا طریق اختیار) کیا انہوں نے (یہ بھی) کہا کہ

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ

اگر اللہ (تعالیٰ ہی) چاہتا (کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے) تو نہ ہم (ہی) اسکے سوا کسی چیز کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے

وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ

باپ دادا ایسا کرتے۔ اور نہ (ہی) ہم اس کے (فرمانے کے) بغیر کسی چیز کو (خود بخود) حرام ٹھہراتے۔ جو (لوگ) ان سے

۳۴۵ تفسیر:- یعنی یہ کفار اب اپنی مدت گذار چکے ہیں۔ اب تو یہ صرف ان عذابوں کا انتظار کر رہے ہیں جو (۱) فردی طور پر ان پر آنیوالے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کی آیات سے ظاہر ہے ملائکہ کا آنا فردی عذاب پر دلالت کرتا ہے۔ (۲) اس عذاب کا انتظار کر رہے ہیں جو قومی طور پر ان پر نازل ہوگا۔ امر ربك سے اسی طرف اشارہ ہے۔

کفار پر فردی اور قومی عذاب کے آنے کی طرف اشارہ

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ۔ یعنی اپنے اعمال سے اپنے آپکو عذاب کا مستحق بنانے کا فعل پہلے کفار بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی ویسا ہی کر رہے ہیں۔ مگر اس کا نقصان انہی کی جانوں کو پہنچے گا۔ نبی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

سیئات ما عملوا میں عذاب الٰہی کی فلاسفی بیان کی گئی ہے

۳۵۵ حل لغات۔ حَاقَ بِهِمْ: حاق بہ کے معنے ہیں۔ اَحَاطَ بِهٖ کسی چیز کا احاطہ کر لیا (اقرب)

حاق بہم

يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ اِسْتَهْزَاَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھیں رعد ۳۳۵

یستھزءون

تفسیر:- سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا۔ سے مراد عمل کے نتائج [illegible] بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالمانہ عذاب نہیں دیتا بلکہ کافر خود اپنی سزا اپنے عمل سے پیدا کرتا ہے۔ عذاب الٰہی کوئی بیرونی چیز نہیں بلکہ بدعمل انسان کے عمل کا طبعی نتیجہ ہے۔ اس میں عذاب الٰہی کی فلاسفی بیان کی گئی ہے۔ یہی عذاب ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ وہ عذاب جو طبعی نتائج کی قسم سے نہیں ہوتا بسا اوقات قابل اعتراض ہو جاتا ہے جیسے بعض دفعہ دنیاوی مجسٹریٹ مجرم کو سزا دیتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس نے جرم سے زیادہ سزا دے دی ہے۔ مگر بدپرہیزی سے جو بیماری پیدا ہوتی ہے۔ اسکی نسبت کوئی نہیں کہتا کہ وہ بدپرہیزی کی مناسب سزا نہیں۔ کیونکہ ہر اک جانتا ہے کہ وہ طبعی نتیجہ ہے اور اپنی حد سے بڑھ سکتا ہی نہیں۔

حَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ سے بتایا ہے کہ کفار جس قسم کے اعتراض نبیوں پر کرتے ہیں۔ ویسے ہی حالات میں سے انہیں گذرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ انہیں جھوٹا کہتے ہیں تو خود جھوٹ کے الزام کے نیچے آتے ہیں۔ اگر بدکار کہتے ہیں تو خود ان کی بدکاریاں کھولی جاتی ہیں۔

فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ

پہلے (سچائی کے دشمن) تھے انہوں نے (بھی) ایسا ہی کیا تھا۔ بھلا کیا یہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ) رسولوں پر (خدا کا پیغام)

اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ

پہنچا دینے کے سوا (اور) کیا ذمہ واری ہے۔ ۳۶ اور ہم نے یقیناً ہر قوم میں (کوئی نہ کوئی) رسول (یہ حکم دیکے)

رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ

بھیجا ہے۔ کہ تم اللہ (تعالے) کی عبادت کرو اور حد سے بڑھنے والے سرکش سے کنارہ کش رہو۔

۳۶ تفسیر: اوپر اللہ تعالےٰ کی طرف سے وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ بیان ہو چکا ہے یعنی کفار یہ نہ خیال کریں کہ کج راستے کیوں بنے ہیں یہ راستے انہوں نے خود بنائے ہیں اللہ تعالےٰ نے نہیں بنائے۔ اللہ تعالےٰ تو جبر سے کام نہیں لیتا۔ اگر لیتا تو ہدایت دیتا اب خود کفار کے منہ سے وہی اعتراض نقل کیا گیا ہے فرماتا ہے۔ کافر کہتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ہم یا ہمارے باپ دادے شرک نہ کرتے۔ پس جب اس نے روکا نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ہمارے شرک کو ناپسند نہیں کرتا۔

جو شخص یا جماعت بھی غلط عقائد اختیار کرے اُسے دلائل کے سامنے دب کر غیر معقول رویہ ہی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ کی بنیاد کسی مقررہ اصل پر نہیں ہوتی۔ بلکہ اُسے حملہ کے مطابق جگہ بدلنی پڑتی ہے۔ رکوع تیں کے آخر میں بتایا گیا تھا کہ کفار تنگ آکر کہتے ہیں کہ بڑی اعلیٰ تعلیم لئے پھرتے ہو۔ آخر یہ تعلیم پہلوں کی کتب سے نقل کی ہوئی ہے اور ہے کیا؟ اس کے دو جواب دئے گئے تھے۔ اول تو یہ کہ یہ اعتراض محض لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے ہے۔ ورنہ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ یعنی اگر نقل بھی ہو۔ تو بھی اگر سچی بات ہے تو مانتے کیوں نہیں۔

دوسرا جواب یہ دیا تھا کہ اگر یہ نقل ہے۔ تو تم بھی تو پہلے انبیاء کے مخالفین کی نقل کر رہے ہو۔ وہ بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ مگر نہ وہ کامیاب ہو سکے نہ تم کامیاب ہو سکتے ہو۔ یہ عملی ثبوت ان کے اعتراضات کے بودا ہونے کا دیا کیونکہ اگر معقول اعتراض ہوتا اور انبیاء کی تعلیم واقع میں محض نقل ہوتی۔ تو دنیا اپنے پہلے مذاہب کو چھوڑ کر انہیں اختیار کیوں کرتی۔ اس کے بعد کفار اور مسلمانوں سے جو الگ الگ قسم کے سلوک ہونگے

کفار کا اپنے اعتراضوں کو غیر مؤثر پاکر پہلو بدلنا

اس کے بعد پھر کفار کے اعتراضوں کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ جب کفار اپنے پہلے اعتراض کا جواب سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ اعتراض مؤثر نہیں ہو سکتا تو وہ پھر پہلو بدلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالےٰ نے سزا کیوں دینے لگا کیا خدا تعالیٰ قادر نہیں۔ پھر اگر وہ ہمارے طریق کو غلط سمجھتا ہے تو ہمیں اور ہمارے باپ دادوں کو اُس سے ہٹا کیوں نہیں دیتا اور شرک کی توفیق ہم سے کیوں نہیں چھین لیتا۔ اللہ تعالےٰ اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ اس کا ذریعہ ایک ہی ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالےٰ جن انبیاء کو بھیجتا انہیں جبر کرنے کی تلقین کرتا۔

قرآنی دلائل سے عاجز آکر کفار کے غیر معقول اعتقاد

لیکن کافر بھی تو بعض نبیوں کو مانتے ہیں۔ کیا وہ کوئی نبی پیش کر سکتے ہیں جس نے جبر سے کام لیا ہو۔ حالانکہ ان کے مخالفوں کو یہ بھی غلطی پر سمجھتے ہیں۔ پس اگر ان کے مسلمہ نبیوں (مثلاً حضرت ابراہیم حضرت لوط علیہما السلام) نے جبر سے کام نہیں لیا اور خدا تعالےٰ نے انہیں یہ توفیق نہ دی کہ اپنے مخالفوں کو زبردستی منوا لیتے۔ تو اب اس امر کی کیوں توقع رکھتے ہیں جس طرح ہمیشہ سے انبیاء محض تبلیغ سے کام لیتے آئے ہیں۔ اب بھی

فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ

اس پر ان میں سے بعض (تو) ایسے (اچھے ثابت) ہوئے کہ انہیں اللہ (تعالیٰ) نے ہدایت دی۔ اور بعض ایسے کہ ان پر ہلاکت

الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ

واجب ہو گئی پس تم (تمام) ملک میں پھرو اور دیکھو کہ (انبیاء کو) جھٹلا نے

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى

والوں کا انجام کیسا ہُوا تھا ۝۳۷ (اے رسول) اگر تو ان (لوگوں) کی

اسی طرح ہوگا۔

تعجب ہے اس آیت کی موجودگی میں بعض مسلمان دین میں جبر کو جائز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ امر قرآن کریم کی متعدد آیات کے خلاف ہے۔

۳۷ حل لغات

اجتنبوا — اِجْتَنِبُوْا: اِجْتَنَبَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِجْتَنَبَهٗ کے معنے ہیں بَعُدَ عَنْهُ۔ اس سے دور ہوگیا (اقرب)

الطاغوت — الطَّاغُوت: كُلُّ مُتَعَدٍّ۔ حد سے بڑھنے والا۔ كُلُّ رَاسِ ضَلَالٍ۔ ہر شخص جو گمراہی کا سردار ہو۔ اَلْكَاهِنُ۔ کاہن۔ اَلشَّيْطَانُ۔ شیطان۔ اَلْاَصْنَامُ۔ بُت۔ كُلُّ مَعْبُوْدٍ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ معبود باطل۔ مَرَدَةُ اَهْلِ الْكِتٰبِ اہل کتاب میں سے سرکش لوگ۔ اس کی جمع طَوَاغِيْت اور طواغ آتی ہے (اقرب) الطَّاغُوْتُ: السَّاحِرُ۔ ساحر۔ اَلْمَارِدُ مِنَ الْجِنِّ۔ جنات میں سے سرکش۔ الصَّارِفُ عَنْ طَرِيْقِ الْخَيْرِ۔ نیکی سے روکنے والا (مفردات) هدیٰ کے لئے

العاقبة — دیکھو رعد ۲۹ العاقِبَةُ: اٰخِرُ كُلِّ شَيْءٍ۔ ہر چیز کا آخر۔ انجام (اقرب)

تفسیر

آیات میں کفار کے اعتراضات کے پانچ جوابات

تفسیر:۔ اس آیت میں کفار کے مذکورہ بالا اعتراض کے متعدد جواب دئے گئے ہیں۔

پہلا جواب یہ دیا گیا ہے۔ کہ ہم ہر قوم میں رسول مبعوث فرما چکے ہیں۔ اور ان میں سے ہر اک نے توحید کی ہی تعلیم دی ہے پس اگر تمہارا یہ دعویٰ درست ہے کہ خدا تعالیٰ شرک کو بھی کسی حالت میں پسند کر سکتا ہے۔ تو بتاؤ کہ سب کے سب نبی شرک کے خلاف کیوں رہے اور کیوں توحید کی تعلیم دیتے رہے۔ اگر شرک بھی خدا تعالیٰ کی تصدیق کی مہر رکھتا ہے تو کوئی نبی تو شرک کی تعلیم دینے والا بھی آتا۔

دوسرا جواب بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ کے الفاظ میں دیا یعنی اگر جبر ہوتا تو پھر ایک ہی رسول کافی تھا جو ان لوگوں کو جنہیں ہدایت پر چلانا مقصود تھا ہدایت دے دیتا۔ بار بار اور ہر قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت تو تبھی ہوئی۔ جبکہ لوگ بار بار نبیوں کے راستے کو چھوڑ گئے۔ جبر کی صورت میں یہ امر ممکن نہ تھا۔

تیسرا جواب یہ دیا کہ ہر نبی کی تعلیم میں بد صحبت سے بچنے کا حکم موجود ہے اور برے آدمیوں کو نہ ماننے کی تعلیم ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں شیطان کے حملہ سے محفوظ رہنے کا ارشاد ہے اگر یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو موحد بنا دیا اور بعض کو مشرک۔ اور اس دنیا میں جبر سے ہی کام لیا گیا ہے۔ تو اس تعلیم کے کیا معنے ہوئے۔ اگر ہر اک شخص جس مذہب اور اصل پر ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہی اُسے اس مقام پر کھڑا کیا ہے اور اس کا اس میں اختیار نہیں۔ تو نبی بھیج کر ہوشیار کرنے کا فائدہ کیا۔ جو موحد ہے موحد رہے گا۔ اور جو مشرک ہے مشرک ہی رہے گا۔

چوتھا جواب یہ دیا ہے کہ ہر نبی کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے ان کے پیغام کو مان لیا حالانکہ پہلے وہ کافر تھے اور کچھ نے نہ مانا۔

هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ

ہدایت یابی کی بہت خواہش رکھتا ہے تو (سمجھ لے کہ) جو لوگ (دوسروں کو دانستہ) گمراہ کر رہے ہوں انہیں (اللہ تعالیٰ) ہرگز ہدایت نہیں دیتا۔ اور نہ انکا کوئی مددگار ہوتا ہے ۳۸؎ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بڑی زور دار قسمیں

اب اگر یہ درست ہے کہ خدا تعالےٰ نے جو کچھ کسی کو بنا دیا، بنا دیا۔ تو ہر نبی کے زمانہ میں ایک جماعت ایمان کیوں لاتی رہی۔ اگر خدا تعالیٰ نے انہیں کافر بنا دیا تھا تو انہیں ایمان کس طرح نصیب ہوا پس ہر نبی کے زمانہ میں کافروں کی ایک جماعت کا مومن بن جانا ایک عملی ثبوت ہے اس امر کا کہ خدا تعالیٰ نے جبراً کسی کو کافر نہیں بنایا۔

پانچواں جواب یہ دیا کہ ہر نبی کے دشمن ہلاک ہوتے چلے آئے ہیں۔ دنیا ان کے نشانوں سے معمور ہے۔ علم نہ ہو تو دنیا میں پھر کر دیکھ لو۔ اب اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ خدا تعالےٰ نے ہی بعض لوگوں کو کافر یا مشرک بنایا ہے تو وہ لوگ تو مجبور محض تھے۔ انہیں سزا دینا کس طرح جائز ہو سکتا تھا۔ پس ان الٰہی عذابوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے ان کو مشرک یا کافر نہ بنایا تھا۔ بلکہ وہ اپنی مرضی سے مشرک یا کافر بنے تھے۔

۳۸؎ **تفسیر**:۔ اس آیت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اتباع سے خطاب ہے کہ تم میں سے ہر ایک ان کفار کی ہدایت چاہتا ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ ہر ایک کو ہدایت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ جس طرح وہ جبر سے کافر مشرک نہیں بناتا جبر سے مومن موحد بھی نہیں بناتا۔ کیونکہ اس طرح ایمان کی غرض باطل ہو جاتی ہے۔ یعنی قلبی صفائی پیدا نہیں ہوتی۔ پس وہ تم کو بتا دینا چاہتا ہے کہ جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ انہیں وہ جبر سے ہدایت نہ دے گا بلکہ ان کے مددگاروں کے سلسلہ کو بھی کاٹ دے گا۔

لفظ حرص کا استعمال اور اس کے معنے

اس آیت میں حرص کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کو دھوکا نہیں کھانا چاہیئے حرص کے معنے اُردو میں بُرے ہوتے ہیں۔ لیکن عربی میں صرف شدید خواہش کے ہوتے ہیں اور یہ اپنے استعمال کے موقعہ کے لحاظ سے اچھے اور بُرے دونوں معنے دیتا ہے۔ اگر بُرے کام کے لئے اس لفظ کو استعمال کیا جائے۔ تو اس کے معنے بُرے ہوتے ہیں۔ اور اگر اچھے کام کے لئے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس کے معنی اچھے ہوتے ہیں۔ گویا یہ لفظ ذاتی معنے کوئی نہیں رکھتا اس نسبت کے مطابق اس کے معنے ہوتے ہیں جو جملہ میں اسے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں چونکہ خیرخواہی کے مفہوم میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اس کے معنے اس جگہ اچھے ہیں۔

یضل میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ مَنْ کی طرف ہے

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ — اس میں یُضِلُّ کی ضمیر خدا تعالےٰ کی طرف نہیں پھرتی اور یہ معنے نہیں کہ جس کو خدا تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اُسے ہدایت نہیں دیتا۔ کیونکہ اسی مضمون کو تو پہلی آیت میں رد کیا گیا ہے۔ پس ضمیر مَنْ کی طرف پھرتی ہے اور مراد یہ ہے کہ جو دوسروں کو گمراہ کرتا ہے اُسے اللہ تعالےٰ ہدایت نہیں دیتا۔

اس آیت میں رسول کریم اور آپ کے اتباع سے خطاب

اس جملہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہدایت تو توجہ سے ملتی ہے۔ جو دوسروں کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں اپنے لئے ہدایت کے کب طلبگار ہو سکتے ہیں۔ اور جب دل میں تبدیلی نہ ہو تو ہدایت کس طرح ملے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ — اس سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نصرت تو انسان کو ہدایت کے معاملہ میں سوائے خدا کے کوئی دیتا ہی نہیں۔ مگر یہ لوگ ہدایت کے ذریعہ کو بند کر چکے ہیں۔

اگر یہ سمجھیں کہ ان کو خود بخود ہدایت ہو جائے گی۔ تو یہ غلط بات ہے۔ ان کی اصلاح محض اس طرح ہو سکتی تھی کہ یہ اسلام کو

اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا

کھائی ہیں ۔ (کہ) جو مر جائے اللہ (تعالےٰ) اسے (پھر) زندہ نہیں کریگا ۔ (مگر حقیقت) یوں نہیں یہ (تو ایک

عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

ایسا) وعدہ ہے جس (کے پورا کرنے) کا وہ ذمہ وار ہے ۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۵۳۹

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ

(یہ دوبارہ زندگی اس لئے ہوگی ۔ کہ) تا وہ ان پر اس (حقیقت) کو ظاہر کرے جس میں وہ (آج) اختلاف کر رہے ہیں ۔ اور تا جن لوگوں نے

قبول کرتے ۔ مگر یہ لوگ تو بتوں کو ہدایت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں ۔

کفار کے قسمیں کھانے کی وجہ

اس لئے ان کی ہدایت مشکل ہے ۔ اور جب یہ خدا تعالےٰ سے منہ موڑ کر جھوٹے معبودوں کی طرف متوجہ ہیں تو خدا تعالےٰ تو ان کی مدد کرے گا نہیں ۔ باقی رہے ان کے معبود ۔ وہ ان کی مدد کر ہی نہیں سکتے ۔ پس ان کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا ۔

جهد ایمانهم

۵۳۹ حل لغات ۔ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ : جَهَدَ فِی الْاَمْرِ (يَجْهَدُ جَهْدًا) کے معنے ہیں ۔ جَدَّ وَتَعِبَ فِيْهِ ۔ کسی معاملہ میں خوب محنت اور کوشش سے کام لیا ۔ جَهَدَ دَابَّتَهٗ : بَلَغَ جَهْدَهَا وَحَمَّلَهَا فَوْقَ طَاقَتِهَا جانور پر بہت بھاری بوجھ لادا ۔ اَلْجَهْدُ : مصدر ہے ۔ نیز اس کے معنے ہیں ۔ اَلطَّاقَةُ ۔ طاقت ۔ يُقَالُ اَفْرَغَ جَهْدَهٗ " اَیْ طَاقَتَهٗ ۔ چنانچہ اَفْرَغَ جَهْدَهٗ کا فقرہ بول کر جہد سے مراد طاقت لیتے ہیں ۔ اَلْمَشَقَّةُ : مشقت (اقرب) اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۔ اَیْ بَالَغُوْا فِی الْيَمِيْنِ وَاجْتَهَدُوْا یعنی انہوں نے بڑی زور دار قسمیں کھائیں ۔ (اقرب)

ائمۃ الکفر کا قسمیں کھا کر عوام کو ان کے سابق عقیدہ پر قائم رکھنا

لا یبعث

لَا يَبْعَثُ : بعث سے مضارع يَبْعَثُ آتا ہے ۔ اور لَا يبعث مضارع منفی ہے بعث کی تشریح کیلئے دیکھو حجر ۲۰

کفار کا دلائل کے عاجز آکر قسمیں کھانا

تفسیر :۔ فرمایا یہ لوگ جب دلائل سے عاجز آ جاتے ہیں تو قسمیں کھانے لگتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ۔ تاکہ اپنے اتباع کو عذاب سے محفوظ رہنے کا یقین دلائیں اور سچ کی جستجو سے غافل کر دیں ۔

اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کفار قسمیں کیوں کھاتے ہیں ۔ ایسی قسموں کا کیا فائدہ تھا اس کا جواب یہ ہے کہ بعض لوگ کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں وہ خود فیصلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ جب سچے مذہب کے دلائل سن کر اُن کے دل متذبذب ہو جاتے ہیں ۔ تو ان کے سردار اور لیڈر قسمیں کھا کھا کر انہیں اپنے سابق عقیدہ پر برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اور چونکہ ان لوگوں میں عزم نہیں ہوتا ۔ کچھ ان میں سے ان قسموں سے مرعوب ہو کر پھر اپنے پرانے خیالات کی طرف عود کر جاتے ہیں پس یہ بھی لوگوں کو ہدایت سے محروم کرنے کا ایک ذریعہ ہے جو کفار کے سردار ہمیشہ سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں ۔ عوام الناس اس امر کو نہیں سمجھتے کہ قسم تو اس شخص کی قابل اعتبار ہوتی ہے جو نیک ہو اور صرف مزید زور دینے کے لئے ہوتی ہے ورنہ جھوٹے لوگ جس طرح بغیر قسم کے جھوٹ بولتے ہیں قسم کے ساتھ بھی جھوٹ بولتے ہیں ۔ یا پھر قسم شہادت کا فائدہ دیتی ہے یعنی جن امور میں اللہ تعالےٰ نے جھوٹی قسم پر اس دنیا میں گرفت کرنے کا فیصلہ کیا ہو ۔ اُن کے متعلق جھوٹی قسم کھانیوالا اگر عذاب سے محفوظ رہے تو یہ اس کے سچے ہونیکا ثبوت ہوتا ہے ورنہ ہر قسم کی نہ اس دنیا میں سزا ملتی ہے نہ وہ کوئی دلیل ہوتی ہے ۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عدالت دینی میں جھوٹی قسم کھانیوالے سزا پاتے ہیں یعنی ہر ایک کو اس دنیا میں سزا نہیں ملتی ۔

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ○ اِنَّمَا

کفر (کا طریق) اختیار کیا ہے۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے ؀۳۹ ہمارا قول

قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ

کسی (ایسی) چیز کے متعلق جس (کے پورا کرنے) کا ہم ارادہ کریں صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا

؀۴۰ **تفسیر**:- اس میں اوپر کے مضمون کی دلیل بیان فرمائی گئی ہے اور وہ یہ کہ حشر بعد الموت مذہبی امور میں یقین پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس دنیا میں تو اختلاف کبھی مٹتا نہیں۔ ہمیشہ ہی بعض لوگ مدعیان نبوت کے منکر ہوتے ہیں اور بعض مومن اگر اسی دنیا تک انسانی زندگی ختم ہو جائے تو اوّل تو نبی کے دعوی کے متعلق کامل انکشاف نہ ہوگا۔ یہی امر مشتبہ رہے۔ دوسرے وہ طبقہ جو منکر ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے ہدایت سے محروم رہ جائے اور یہ اللہ تعالٰے کی شان کے خلاف ہے۔ اس نے تو سب انسانوں کو عبد بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر اسی دنیا میں انسانی زندگی ختم ہو جائے تو پھر منکر کبھی عبد نہیں بن سکتے۔ اس لئے ضرور ہے کہ ایک اور زندگی انسان کو ملے۔ جس میں حقیقت واضح کر دی جائے تا سب لوگوں پر حقیقت کھل جائے اور جو اس دنیا میں حق کے سمجھنے سے محروم رہے ہیں۔ اس دنیا میں حق کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔

اس آیت پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالٰے نبیوں اور آسمانی کتب کی نسبت بھی فرماتا ہے کہ وہ تبیین کرتی ہیں پس جب تبیین یہاں ہو جاتی ہے تو اس کے کیا معنے ہوئے کہ بعث بعد الموت کی اس لئے ضرورت ہے کہ جن امور میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالٰے تبیین کر دے۔ اس دنیا میں تبیین کا دعویٰ خود اسی سورۃ میں کیا گیا ہے فرماتا ہے وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (نحل ع ۸) یعنی ہم نے تجھ پر یہ کامل کتاب صرف اس لئے اتاری ہے کہ جس بارہ میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں اس کے متعلق تو انہیں حقیقت کھول کر سنا دے۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس دنیا میں حقیقت کھول دی گئی تو اگلے جہان کی ضرورت نہ رہی۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا کے متعلق جب تبیین کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تو اس کے معنے عقلی طور پر اور دلائل سے حقیقت کے کھول دینے کے ہوتے ہیں اور ایسی تبیین صرف ان لوگوں کے لئے کافی ہوتی ہے جو حق کے متلاشی ہوتے ہیں۔ مگر جو لوگ حق کے متلاشی نہ ہوں۔ ان کیلئے یہ تبیین مفید نہیں ہوتی۔ پس ان کے لئے ایسی تبیین کی ضرورت ہے جو اس قدر واضح ہو کہ اس کے بعد انکار کی گنجائش نہ رہے اور بہانہ سازی کا موقعہ ہی باقی نہ رہے۔ یہ تبیین اس دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسی تبیین کے بعد اعلیٰ ایمان نصیب نہیں ہو سکتا جس طرح سورج کو سورج ماننا کوئی اعلیٰ خوبی نہیں۔ اسی طرح ایسے اظہار حق کے بعد ایمان کے اعلیٰ مقامات حاصل نہیں ہو سکتے۔

بعث بعد الموت کی ضرورت

اختلاف کو دور کرنے اور منکرین کے عبد بنائے جانے کے لئے بعث بعد الموت ضروری ہے

پس انسانوں میں سے جو اللہ تعالٰے کے خاص فضلوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو موقعہ دینے کے لئے نبیوں والی تبیین تو اس دنیا میں ہو جاتی ہے اور سب بنی نوع انسان پر صداقت ظاہر کرنے کے لئے وہ تبیین جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ اگلے جہان میں ہوتی ہے۔ ایسی تبیین کے بعد ایمان خاص نفع نہیں دیتا۔ ہاں کفار کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ سزا بھگتنے کے بعد خدا تعالٰے کی بخشش کو حاصل کر لیں۔

غرض اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ وہ تبیین جو سب کو ایمان دیدے اس دنیا میں ہو نہیں سکتی۔ پس ایک اور جہان کی ضرورت ہے جہاں اس تبیین کو اللہ تعالٰے ظاہر فرمائے۔

تبیین کے لئے بعث بعد الموت کی ضرورت پر اعتراض اور اس کا جواب

وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا- اس جملہ سے پہلی دلیل کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس جگہ جس تبیین کا ہم نے ذکر

ع ۵ فَيَكُوْنُ ۝ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ

تو وہ ہو جاتی ہے ۴۱ اور جن لوگوں نے اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا اللہ (تعالیٰ) کے لئے ہجرت

ایسی تبیین جس کا کوئی انکار نہ کر سکے۔ بعث بعد الموت کے وقت ہوگی

کیا ہے وہ ایسی تبیین ہے جس کے بعد کافر انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اور اپنے جھوٹے ہونے کا اُسے یقین ہو جاتا ہے نہ کہ عام تبیین جس کا ذکر دوسری آیات میں کیا گیا ہے۔

۴۱ تفسیر: - فرمایا کہ ایک وجہ قیامت کے انکار کی یہ ہے کہ لوگ اُسے ناممکن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس دنیا میں جو ہماری طاقت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس سے وہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی بات انہونی نہیں۔ ہم تو جب کسی امر کے متعلق کہتے ہیں کہ ایسا ہو جائے ویسا ہی ہو جایا کرتا ہے۔ پھر قیامت پر کیوں شک ہے۔

قیامت کے انکار کی وجہ

اس جگہ ان پیشگوئیوں کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے جو اس دنیا میں نبی کرتے ہیں اور باوجود حالات کے خلاف ہونے کے وہ پوری ہوتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کو ثابت کر دیتی ہیں۔ فرماتا ہے ان پیشگوئیوں پر قیاس کر کے تم قیامت کے امکان کو بھی سمجھ سکتے ہو۔

پیشگوئیوں کو قیامت کے بطور دلیل بیان کیا گیا ہے۔

کُنْ ؛ — بعض لوگوں کو اس آیت کے بارہ میں یہ شبہ پیدا ہوا کرتا ہے کہ کُنْ کہنے سے کیا مراد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی چیز موجود ہی نہ تھی تو پھر حکم کس کو دے دیا۔

لفظ کُنْ سے مراد

آریہ لوگ کہتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کوئی مادہ موجود تھا تبھی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر حکومت کی۔ جو چیز ہے ہی نہیں وہ اسے حکم کس طرح دے سکتا ہے۔ مگر یہ استدلال ان کا غلط ہے۔ کیونکہ اس آیت کا وہ ترجمہ جس پر اعتراض کیا جاتا ہے یہ ہے "جب ہم ارادہ کرتے ہیں اس چیز کا جس کے متعلق ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہو جائے اس کے متعلق کہتے ہیں کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے"۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ پر آریہ کا اعتراض اس صورت میں بھی کہ مادہ کو پہلے سے موجود مانا جائے وارد ہوتا ہے۔ کیونکہ خواہ پہلے سے موجود مادہ سے ہی کسی چیز کو بنایا جائے۔ جب تک اُس کی وہ نئی صورت نہ بنے جسے بنانے کا ارادہ کیا گیا ہو۔ اُسے کوئی حکم نہیں دیا جا سکتا۔

لفظ کُنْ سے آریہ صاحب کا غلط استدلال

غرض آریوں کا اس آیت سے اپنے حق میں استدلال بالکل باطل ہے۔ کیونکہ مادہ کو موجود ماننے کی صورت میں بھی وہی اعتراض باقی رہتا ہے جسے وہ دور کرنا چاہتے ہیں جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ آیت کے وہ معنے ہی نہیں جو اوپر کئے گئے ہیں۔ بلکہ آیت کے معنے ہی کچھ اور ہیں۔

وہ صحیح معنے کیا ہیں؟ اسے سمجھنے کے لئے کُنْ کے معنوں کو پہلے صاف کر لینا ضروری ہے۔ کُنْ کے عربی زبان میں کئی معنے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک معنے "ایسا ہو جائے" کے ہیں۔ اس کا ثبوت مندرجہ ذیل واقعہ سے ملتا ہے۔ تاریخ میں آتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کو روانہ ہو گئے۔ تو بعض صحابہؓ پیچھے رہ گئے۔ ان میں سے ایک ابو خیثمہ بھی تھے یہ بہت نیک تھے۔ ان کا خیال بھی نہ تھا کہ پیچھے رہیں۔ مگر جب جنگ کے لئے باہر نکلنے کا حکم ہوا۔ تو اس وقت وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ جب وہ گھر آئے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی ان کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ جیسے کوئی باتیں کرنے کی خواہش رکھتا ہو۔ انہوں نے بیوی کی اس خواہش کو نظر انداز کرتے ہوئے بیوی سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلعم تشریف لے گئے ہیں۔ ان کی بیوی نے کہا کہ ذرا بیٹھ تو جاؤ۔ انہوں نے جواب دیا کہ خدا کا رسول تو جنگ کے لئے روانہ ہو جائے اور میں گھر میں آرام کروں ابو خیثمہ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور اُسی وقت نکل کر گھوڑے کو تیار کیا اور اس پر سوار ہو کر اس راستہ پر چل پڑے جس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تھے۔ آخر مارا مار سفر کر کے کئی منزلوں کے بعد آنحضرت صلعم کے ساتھ شامل ہو گئے جب یہ لشکر کے قریب پہنچے۔ تو بعض صحابہ نے دور سے گرد اٹھتی ہوئی دیکھی اور خیال دوڑانے لگے کہ یہ کون آ رہا ہے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کُنْ اَبَاخَیْثَمَةَ۔ ابو خیثمہ ہو جا۔

مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۚ وَ

اختیار کی (انہیں اپنی ذات کی قسم ہے کہ) ہم انہیں ضرور ہی دنیا میں اچھی جگہ دیں گے - اور

لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۟ وقف لازم

آخرت کا اجر (تو) اور بھی بڑا ہوگا۔ کاش یہ (منکر اس حقیقت کو) جانتے ۵۴۲

اب اس فقرہ کا یہ مطلب تو ہو نہیں سکتا کہ آنے والا کوئی بھی ہو وہ ابو خیثمہ بن جائے پس اس کے معنے یہی ہیں کہ میری خواہش ہے کہ آنے والا ابو خیثمہ ہو (طبری) کُنْ کے یہی معنے اس آیت میں ہیں۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب ہم چاہتے ہیں کہ کوئی امر وقوع میں آئے تو ہم خواہش کرتے ہیں کہ وہ امر اس طرح ظہور میں آجائے اور ہمارے اس ارادہ کے بعد اسی طرح ظہور میں آجاتا ہے۔ پس اس جگہ کسی معدوم شئے کو حکم دینے کا سوال ہی نہیں۔ کُنْ کا لفظ صرف آئندہ وقوع کی خواہش پر دلالت کرتا ہے۔

غرض اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ جب ہم چاہتے ہیں کہ کوئی امر ہو جائے۔ تو ہم اس قسم کی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں اور جس طرح ہم ارادہ کرتے ہیں۔ اسی طرح واقع ہو جاتا ہے۔

۵۴۲ حل لغات ۔ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ : بَوَّأَ سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے اور بَوَّأَهُ اور بَوَّأَ لَهُ منزلًا کے معنے ہیں۔ هَيَّأَهُ وَمَكَّنَ لَهُ فِيْهِ۔ اس نے اس کے رہنے کے لئے مکان تیار کیا (اقرب) پس لَنُبَوِّئَنَّهُمْ کے معنے ہوئے۔ ہم ضرور ان کے لئے جگہ بنائیں گے۔

تفسیر :- اس رکوع میں پچھلی آیت کُنْ فَيَكُوْنُ کا ثبوت دیا ہے کہ دیکھ لو۔ تھوڑی سی جماعت ہے تم نے ان پر ایسے ظلم کئے ہیں کہ ان کو ملک چھوڑنا پڑا۔ پس ایسے لوگوں کو ہم دنیا میں اچھی سے اچھی جگہ دیں گے اور یہ ہو کر رہے گا۔

فِي اللّٰهِ - اس کے معنے کئی طرح ہو سکتے ہیں (۱) فی بمعنی لام ہو۔ اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ انہوں نے اللہ کی خاطر ہجرت کی۔ اس کے سوا کوئی اور مقصد ان کا نہ تھا

آنحضرت کا ایک واقعہ میں لفظ کُنْ کا استعمال

حدیث میں آیا ہے کہ ہجرتیں کئی قسم کی ہوتی ہیں - کوئی انسان بیوی کی خاطر ہجرت کرتا ہے کوئی مال کی خاطر۔ کوئی خدا کی خاطر۔ تو فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف خدا تعالےٰ کی خاطر ہجرت کر رہے ہیں۔ آج دشمن اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے روپے کی خاطر لڑائیاں کیں۔ عالم الغیب خدا جو جانتا تھا کہ ایسے اعتراض اس کے پاک بندوں پر کئے جائیں گے۔ اس نے لڑائیوں کے شروع ہونے سے بھی پہلے اس اعتراض کا جواب دے دیا۔

آیت کا مطلب

(۲) اس میں مضاف کو مقدر سمجھا جائے اور عبارت یوں سمجھی جائے فِي دِيْنِ اللّٰهِ یعنی وہ اللہ کے دین کی خاطر ہجرت کرتے ہیں۔ یعنی ان کی ہجرت اس غرض سے ہے کہ مکہ میں تو دین کا کام کرنے کی آزادی نہیں۔ پس ترک وطن کر کے ایسی جگہ چلے جائیں جہاں دین کی خدمت کرنے کی آزادی ہو۔

لنبوئنهم

(۳) فِي کے وہی معنے لئے جائیں جو زیادہ معروف ہیں۔ اس صورت میں ان الفاظ کا یہ مطلب ہوگا کہ انہوں نے اللہ میں ہو کر ہجرت کی۔ یعنی کلی طور پر اللہ تعالےٰ کو اپنے پر مستولی کر لیا۔ اور اس کی صفات کو اختیار کر لیا اور اپنے نفس کو مار کر اپنے ہر اک کام کو خدا تعالےٰ کے لئے کر دیا۔ پس گویا ان کا مکہ سے نکلنا چند انسانوں کا نکلنا نہ تھا۔ بلکہ اللہ کا مکہ سے نکل جانا تھا۔ ان کے جانے کے ساتھ ہی اللہ تعالےٰ بھی مکہ والوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

فی اللہ میں لفظ فی کے تین معنی

مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا یعنی ان کی ہجرت بغیر کسی وجہ کے نہیں۔ بلکہ اس لئے ہے کہ لوگوں نے انکو وہاں رہنے نہیں دیا۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ وَمَآ

جو (ظلموں کا نشانہ بن کر بھی) ثابت قدم رہے اور (جو ہمیشہ ہی) اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں ۵۴۳ اور ہم نے

اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ

تجھ سے پہلے (بھی ہمیشہ) مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا کرتے تھے ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے

ونکلنے پر مجبور کر دیا۔

مومن کو کفار کے ظلم کے باعث جلدی اپنی جگہ نہیں چھوڑنی چاہیئے۔

اس آیت سے استدلال ہوتا ہے کہ مومن کو جلدی ہی اپنی جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ تبلیغ کرتے رہنا چاہیئے۔ جب تک کہ لوگ اس حد تک مجبور نہ کر دیں کہ دین پر عمل وہاں ناممکن ہو جائے۔

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ کے وعدہ کے مطابق صحابہ کی عزت

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ضرور ہی ہم اُن کو اسی دنیا میں اس سے بہتر مقام دیں گے چنانچہ اس کے مطابق جہاں بھی مسلمان گئے۔ وہیں ان کو بہتر مقام ملا۔ یہ ذکر اُس ہجرت کا ہے جو مدینہ کی طرف حضرت عمرؓ اور بعض اور صحابہؓ نے کی تھی۔ مگر اس سے پہلے یا اس کے بعد جدھر بھی مسلمانوں نے ہجرت کی وہ جگہ ان کے لئے بہتر ہو گئی۔ اگر ہجرت کے آخری انجام کو دیکھا جائے تو اس ہجرت کے نتیجہ میں معمولی تاجر اور اونٹ پالنے والے دنیا کے بادشاہ ہو گئے۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ــــ یعنی اصل مقام تو جزاء کا بعد الموت آئے گا اور وہ انعام بہت بڑا ہوگا۔ مگر ان لوگوں کو سمجھانے کے لئے دنیا میں بھی ہم مسلمانوں کو اعلیٰ مقام عطا فرمائیں گے

صَبَرُوْا

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ کے معنے اس مقام سے جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو دنیا میں ملا خوب سمجھ میں آ سکتے ہیں ان کو خدا تعالےٰ نے تمدن دنیا کے اکثر حصہ پر حکومت دی۔ جب انعام کا یہ حقیر حصہ تھا تو بڑا حصہ کیا ہوگا اور ہر ایک صحابی کیا اجر پا رہا ہوگا۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیت سے یہ ہے کہ اس میں بتلایا تھا کہ تم قیامت کے منکر اس لئے ہو کہ ایسا ہونا ناممکن ہے لیکن دیکھتے نہیں کہ کس طرح ہم اس دنیا میں حکم دیتے ہیں اور ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ پھر بعث بعد الموت کو تم ہمارے لئے کیوں ناممکن خیال کرتے ہو۔ اب اس دعویٰ کی تائید میں ایک پیشگوئی فرماتا ہے جو یہ ہے کہ مکہ والے تو مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کو تکلیف دے کر اس لئے وطن سے نکالنا چاہتے ہیں کہ یہ باہر جا کر بے گھر بے در ہو جائیں اور تکلیف پائیں۔ مگر ہم پیشگوئی کرتے ہیں کہ ان کا باہر نکلنا مفید ہو جائے گا اور اس ہجرت کے نتیجہ میں ان کو دینی ہی نہیں بلکہ دنیوی فوائد بھی پہنچیں گے اور انہیں حکومت مل جائے گی۔ یہ پیشگوئی اس وقت کی گئی تھی جبکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے۔ اور مسلمان ایسے کمزور تھے کہ مکہ والے آپ کو قتل کرنے یا گھر سے نکال دینے یا قید کرنے کے منصوبے کر رہے تھے۔ اس کے ایک دو سال کے اندر اسی ہجرت کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ ایک زبردست نشان ہے ان لوگوں کے لئے جو قیامت کا انکار اس لئے کرتے ہیں کہ ایسی بات کس طرح ہو سکتی ہے۔ جو خدا عجائبات دکھانے کا عادی ہے۔ اس کی کس قدرت پر انسان تعجب کر سکتا ہے۔

۴۳ھ حل لغات۔ صَبَرُوْا: صَبَرَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ صَبَرَ کی تشریح کے لئے دیکھو رعد ۲۳ھ

يَتَوَكَّلُوْنَ: تَوَكَّلَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف ۵۶ھ

تفسیر:۔ مراد یہ ہے کہ هَاجَرُوْا اور ظُلِمُوْا جن لوگوں کی نسبت ہم نے کہا ہے۔ وہ ایسی جماعت ہے کہ اس پر ظلم ہوئے اور انہوں نے صبر کیا اور گھروں سے بے گھر کئے گئے مگر اللہ تعالےٰ پر امید نہ چھوڑی۔

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۙ

اور (اے منکرو) اگر تم (اس حقیقت کو) نہیں جانتے تو اس (اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے) ذکر کو ماننے والوں (ہی) سے پوچھ کر معلوم کر لو۔

بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ

(ہم نے انہیں) روشن نشانات اور (الٰہی) نوشتے دیکر (بھیجا تھا) اور تجھ پر ہم نے یہ (کامل) ذکر نازل کیا ہے

اس آیت میں پہلی دو صفات کی گویا مزید تشریح کی گئی ہے مظلوم ہونا خدا تعالیٰ کی مدد کو کھینچتا ہے۔ مگر جو مظلوم بھی ہو اور پھر صبر بھی کرے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو بہت زیادہ اور بہت جلدی جذب کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی خاطر تکلیف اٹھا کر ہجرت کرنا ایک بڑی نیکی ہے۔ مگر اس حالت میں جبکہ سب سامان لٹ جائے اور وطن تک چھوڑنا پڑے۔ دل کو اس یقین سے پُر رکھنا کہ ہم تباہ نہیں ہو سکتے اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد کرے گا اس سے بھی بڑی نیکی ہے۔

۴۴ حل لغات۔ الذکر: کیلئے دیکھو یوسف ۱۰۴

تفسیر:۔ یعنی ان لوگوں کی مخالفت کی بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مدعی ہمارے جیسا آدمی ہے۔ اس لئے ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ پہلے نبی بھی تو انسانوں جیسے انسان تھے پھر وہ کس طرح کامیاب ہو گئے۔

فَاسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ کہہ کر کفار کو شرمندہ کیا گیا ہے۔ وہ دعویدار تھے کہ وہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں اور ان کے حالات بھی ان کے سامنے تھے کہ کس طرح تکالیف اٹھا کر کامیاب ہوئے پس فرماتا ہے کہ تم تو شاید اپنے بزرگوں کو بھول گئے ہو۔ اگر تم کو ان باتوں کا علم نہیں تو دوسری اقوام سے دریافت کر لو۔

ذکر کے معنے چونکہ یاد رکھنے کے بھی ہیں۔ اہل الذکر سے مراد یاد رکھنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں یوں معنے ہوں گے کہ اگر تم نہیں جانتے اور باپ دادوں کی باتوں کو بھولا گئے ہو تو جن کو یاد ہیں ان سے پوچھ لو یعنی مسلمانوں کو۔ یہ پیرایہ کلام نہایت لطیف اور بلیغ ہے۔ کفار یہ طنز سن کر دل ہیں کٹ کر مرے ہوں گے۔

نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نبی کا شرف فوجوں اور سامانوں سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی دولت اس کی وحی ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ فتح پاتا ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر کفار خیال کریں کہ اس بے سامان آدمی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو حکومت کہاں سے مل جائے گی۔ تو ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ پہلے انبیاء بھی ایسے ہی تھے اور ان کے پاس وحی الٰہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ دنیا میں بہت بڑے تغیرات پیدا کر دئے اور اسی دنیا میں ایک حشر برپا کر دیا۔

یہاں پر رِجَالًا اس لئے فرمایا کہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارے پر ملائکہ کیوں نازل نہیں ہوتے۔ چنانچہ پہلی سورۃ میں بھی ان کا مطالبہ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ کے الفاظ میں گذر چکا ہے۔ یہاں ان کے اس خیال کو مدنظر رکھ کر ایک طنز بھی کی ہے۔ اور وہ یہ کہ تم تو فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے ہو۔ پھر وہ ایلچی بن کر تمہارے پاس کیونکر آئیں ایلچی بن کر تو مرد ہی آئینگے۔

چونکہ ہجرت کے بعد حکومت ملنی تھی اور حکومت کے ساتھ ان لالچیوں کے گروہ نے بھی پیدا ہونا تھا جو اس حکومت کو دنیوی حکومت سمجھ کر اس میں سے حصہ بٹانے کی کوشش کرنیوالے تھے جیسے کہ مسیلمہ۔ سجاح وغیرہ نے۔ اس لئے کوئی بعید نہیں کہ اس آیت میں اس آنیوالے فتنہ کا بھی سدباب کیا گیا ہو کہ جب لوگوں نے فصاحت پر دعوئ نبوت کی بنیاد رکھنی تھی اور بعض عورتیں بھی نبوت کا دعویٰ کرنے والی تھیں۔ ان دونوں خیالات کا رد رِجَالًا اور نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ کے الفاظ سے کیا گیا۔

آنحضرت کی نزول کے متعلق کفار کے خیالات کی تردید[1]

الذکر[1]

رجالاً کہے جانے کی وجہ[2]

فَاسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ کہہ کر کفار کو شرمندہ کیا گیا ہے۔[1]

اھل الذکر کے معنی یاد رکھنے والے کے

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ

تاکہ تُو سب لوگوں کو وہ (فرمانِ الٰہی) جو (تیرے ذریعہ سے) ان کی طرف نازل کیا گیا ہے کھول کر بتائے اور تاکہ وہ

يَتَفَكَّرُونَ ۝ أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ

(اس پر) تدبر کریں ۔ ۵۴۵ پھر کیا جو لوگ (تیرے خلاف) بُری بُری تدبیریں کرتے چلے آئے ہیں وہ اس بات سے امن میں ہیں

۵۴۵ حل لغات

بِالْبَيِّنٰتِ: البیّنات البیّنة کی جمع ہے۔ اور البیّنة کے معنے ہیں۔ الدلیل الحجّۃ۔ دلیل۔ (اقرب)

الزُّبُر: زَبَرَہٗ (یزبُرُ) زبراً کے معنے ہیں۔ رَمَاہُ بالحجارۃِ۔ اس کو پتھر مارے۔ زَبَرَ الکتابَ (یَزْبِرُ یَزْبُرُ) کتَبَہٗ۔ کتاب کو لکھا۔ وَزَادَ فی مفردات الرّاغب کتابۃً غلیظۃً۔ اور مفردات میں زَبَرَ کے معنے موٹی قلم یا گہری روشنائی سے لکھنے کے ہیں۔ زبرالسائلَ: انتھرہٗ۔ سائل کو ڈانٹا۔ زبرعن الامر۔ مَنَعَہٗ وَنَہَاہُ کسی کام سے روکا۔ الزِبْرُ کے معنے ہیں۔ الکتابُ۔ کتاب اس کی جمع زُبُور ہے۔ اور الزَّبُور کے معنے ہیں۔ الفِرْقَۃُ۔ حصہ۔ الملک۔ ملک۔ الکتابُ۔ کتاب۔ کیونکہ یہ بھی لکھی جاتی ہے۔ اس کی جمع زُبُور ہے (اقرب)

اس جگہ الذکر سے مراد اعلیٰ شرف والی کتاب کے ہیں

تفسیر :۔ اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی مزید تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ نبی بیّنات اور زُبُر لے کر آتے رہے ہیں۔ یعنی نشانات اور احکام الٰہی لانا ہی اُن کی غرض تھی اور انہی دونوں سامانوں سے انکی ترقی ہوتی رہی ہے۔

اس آیت میں پہلے مضمون کی مزید تشریح

وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکَ الذِّکْرَ کے گو لفظی معنے تو یہی ہیں کہ تجھ پر ہم نے ذکر اُتارا ہے۔ لیکن چونکہ یہ زُبُر کے مقابل پر ہے جس کے معنے کتاب کے ہیں یعنی اس وحی کے جس کا ماننا فرض ہو۔ اس لئے ذکر کے معنے اس جگہ خاص ہو جائیں گے۔ کیونکہ جب دو لفظ ایک دوسرے کے مقابل استعمال کئے جائیں۔ تو اگر دونوں لفظ مختلف قسم کی اشیاء پر دلالت نہ کرتے ہوں۔ تو بعد میں آنے والا لفظ یا پہلے سے اعلیٰ معنے دیتا ہے یا ادنیٰ۔ اس جگہ چونکہ موقعہ اعلیٰ معنوں کے اظہار کا ہے۔ اس لئے الذکر کے معنے اعلیٰ شرف والی کتاب کے ہوں گے یا زیادہ مکمل کتاب کے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ پہلوں کو تو بیّنات اور زُبر ملتے رہے ہیں۔ تجھے بیّنات اور الذکر ملے ہیں جو ان کے انعام سے زیادہ ہے۔ پس اگر تیری کتاب سے ادنیٰ درجہ کی کتب کی مدد سے پہلے انبیاء اپنے دشمنوں کو شکستیں دیتے رہے ہیں۔ تو تُو ان سے اعلیٰ انعام کا مورد ہو کر کیوں اپنے دشمنوں کو شکست نہ دے سکیگا۔ ان معنوں کے رُو سے الذکر کا الف لام کمال کے معنوں میں لیا جائے گا۔

اس آیت میں ذکر کے دوسرے معنی بھی چسپاں ہو سکتے ہیں

اس کے علاوہ ذکر کے جو دوسرے معنے ہیں۔ وہ بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں (۱) دعا (۲) محکم مضبوط (۳) ثناء۔ تعریف (۴) کسی چیز کا اس طرح ذہن میں گھسنا کہ وہ بھول نہ سکے۔ ان معنوں کے رُو سے آیت کے معنی ہونگے کہ ہم نے تجھے جو کتاب دی ہے۔ اس میں خاص خوبی یہ ہے کہ وہ کامل دعاؤں پر مشتمل ہے اور اس وجہ سے وہ خدا تعالیٰ کے خاص فضل جذب کرنے کا موجب ہوگی۔ اور پھر وہ محکم تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اس لئے کوئی اعتراض اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اور پھر وہ ثناء ہے جو لوگ اس سے تعلق رکھیں گے ان کی تعریف کا موجب ہوگی۔ ان کے اخلاق اور اعمال کو ایسا بنا دے گی کہ دنیا ان کی تعریف کرے گی یا یہ کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کامل ثنا ہے اس وجہ سے ماننے والوں کا عرفان بڑھے گا۔ پھر وہ ایسی مقبول ہوگی کہ اُسے بھلایا نہ جائے گا۔ ہر وقت لوگ اس کی تلاوت میں مشغول رہیں گے۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ۔ لِتُبَيِّنَ کا لام لام تعلیل بھی ہو سکتا ہے اور لام عاقبت بھی۔ لام تعلیل کی صورت

اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ

کہ اللہ (تعالےٰ) انہیں اس ملک میں (ہی) ذلیل (و رسوا) کر دے ۔ یا وہ عذاب (جس کی خبر

الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ اَوْ یَاْخُذَهُمْ

دی جاچکی ہے) جہاں سے وہ جانتے (بھی) نہ ہوں اُن پر آ جائے ۵۴۶ یا وہ انہیں (قومی معاملات میں) ان کے

میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے تجھ پر دوسری کتب سے اعلیٰ خوبیوں والی کتاب اُتاری ہے۔ تاکہ تو سب دنیا کو وہ تعلیم سنائے۔ جہان کے لئے اُتاری گئی ہے۔ یعنی تجھ پر اترنے والی تعلیم کا سب سے اعلیٰ ہونا اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُسے کسی ایک قوم یا ایک زمانہ کے لوگوں کے لئے نازل نہیں کیا۔ بلکہ سب لوگوں کے لئے نازل کیا ہے۔ خواہ وہ کسی قوم کے ہوں یا کسی زمانہ کے ہوں۔ لام عاقبت کی صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ چونکہ تجھ پر اعلیٰ کتاب نازل ہوئی ہے۔ اس لئے تو اسے مخفی کس طرح رکھ سکتا تھا۔ اس اعلیٰ کتاب کا نزول اس کا باعث ہوا ہے۔ کہ تو سب دنیا کو اس کی طرف بلا رہا ہے۔ ایسی کتاب جس پر نازل ہو وہ خاموش کس طرح رہ سکتا ہے۔

نُزِّلَ اِلَیْهِمْ کہہ کر کفار کے جذبات محبت کو ابھارا ہے۔ یعنی گو کتاب تجھ پر نازل ہوئی ہے۔ لیکن چونکہ غرض یہ ہے کہ اس کتاب سے سب دنیا فائدہ اٹھائے۔ اس لئے درحقیقت یہ نزول ساری دنیا پر ہی ہے۔ پھر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اس محبت کی قدر کیوں نہیں کرتے۔

نُزِّلَ اِلَیْهِمْ سے اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اس کتاب کا سب دنیا تک پہنچانا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا نزول سب دنیا کی طرف ہے اور یہ سب دنیا کا مال ہے۔ پس اُن تک اس کا پہنچانا نہایت اہم فرض ہے۔ کاش! مسلمان اس نکتہ کو سمجھتے اور تبلیغ اسلام کے فریضہ کے ادا کرنے میں سستی نہ کرتے۔ تو آج دنیا میں اسلام کے سوا کوئی اور مذہب نظر نہ آتا کیونکہ اس کی پاک تعلیم کے سامنے کوئی اور تعلیم ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ آج بے شک اس کی اشاعت میں روک ہے۔ کیونکہ دنیوی حرص و آز اسلام کے قبول کرنے میں روک ہو رہی ہے۔ مگر یہ حالت تو اَب پیدا ہوئی ہے۔ پہلے تو دنیا بھی مسلمانوں کے قبضہ میں تھی۔ جس طرح دین اُن کے ہاتھ میں تھا۔

لِتُبَیِّنَ کے الفاظ سے قرآن مجید کی دوسری کتب کے بالمقابل فضیلت

لِتُبَیِّنَ میں ایک اور لطیف مضمون بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض کتب ایسی ہیں کہ جن کو انسان شرم کی وجہ سے سُنا ہی نہیں سکتا۔ مثلاً بائبل کے بعض ٹکڑے۔ لیکن قرآن کریم ایسی شریفانہ باتوں پر مشتمل ہے کہ ہر جگہ پر اُسے سنایا جا سکتا ہے۔

ایک عیسائی کا قول ہے کہ قرآن میں یہ خوبی ہے کہ ہر مجلس میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مگر ہماری کتابیں ایسی ہیں کہ ہر مجلس میں نہیں پڑھی جا سکتیں۔

نزل الیھم کے الفاظ سے دو باتوں کی طرف اشارہ

حضرت لوطؑ اور ان کی لڑکیوں کا واقعہ۔ بنی اسرائیل کا عورتوں بچوں کو خدا تعالےٰ کے حکم سے قتل کرنا یہ ایسے واقعات ہیں کہ ان کا مجالس میں بیان کرنا طبیعت پر سخت گراں گذرتا ہے۔ آریہ لوگوں کی نیوگ کی تعلیم بھی ایسی ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ تو الگ رہے۔ خود آریہ خاوند اپنی بیوی کو وہ تعلیم پڑھ کر نہیں سُنا سکتا۔

مگر قرآن کریم ایسے مضامین پر مشتمل ہے اور ایسے الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ اسے ہر قوم پر اور ہر عمر کے لوگوں کے سامنے پڑھا جا سکتا ہے۔

الہام فکر انسانی کو تیز کر دیتا ہے

لَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ سے اس طرف اشارہ کیا گیا کہ الہام فکر انسانی کو تیز کر دیتا ہے۔ صحابہ کا نمونہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ وہ اَن پڑھ اور زمانہ کے حالات سے ناواقف تھے۔ مگر الہام قرآنی کو سُن کر اور سمجھ کر دنیا کے علماء کے استاد بن گئے اور ایسی سمجھ ان کو عطا ہوئی کہ دنیا کے ہر علم میں انہوں نے آئندہ زمانہ کیلئے ایک بہترین سبق چھوڑا ہے۔

یخسف

۵۴۶ حل لغات

یخسف: خَسَفَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور خَسَفَ الْمَکَانُ خُسُوْفًا

فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ اَوْ يَاْخُذَهُمْ

آزادانہ تصرف کی حالت میں ہلاک کرے پس وہ یاد رکھیں کہ وہ ہرگز اللہ تعالیٰ کو ان باتوں کے پورا کرنے سے) عاجز نہ پائیں گے ۴۷ یا وہ انہیں آہستہ آہستہ

پیشگوئی کے مطابق فتح کر کے دقت کفار پر اچانک عذاب کا نزول

کے معنے ہیں۔ ذَهَبَ فِی الْاَرْضِ وَغَابَ ۔کوئی جگہ زمین کے اندر دھنس گئی خَسَفَ اللّٰہُ تعالیٰ الارضَ : اساخَها بما عَلَیها ۔ اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کو زمین سمیت غرق کر دیا۔ خَسَفَ اللّٰہُ الارضَ بِفُلَانٍ غَیَّبَہٗ فیها۔ اللہ تعالیٰ نے اسکو زمین میں غائب کر دیا۔ خَسَفَ فِی الْاَرْضِ وَخُسِفَ به مجهولاً۔ ای غابَ فیها زمین میں دھنس کر غائب ہو گیا۔ خسف فلاناً (بغیر صلہ کے) اَذَلَّہٗ وحَمَّلہ مایکرهُه ۔اس کو ذلیل کیا۔ اور اس پر ایسے معاملات ڈالے جن کو وہ ناپسند کرتا تھا (اقرب) پس یَخْسِفُ بِهِم کے معنے ہوں گے کہ (۱) ان کو زمین میں دھنسا دے (۲) ان کو زمین کے اندر غائب کر دے (اقرب)

تنبت من یخسف میں کفار کے انجام کی پیشگوئی

تفسیر :۔ اس آیت میں ایک اور پیشگوئی بیان کی گئی ہے جو کفار کے انجام کے متعلق ہے۔ فرماتا ہے کیا کفار اس سے مامون ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین کے اندر دھنسا دے۔

تقلبہم

خسف ۔ کے معنے دھنسانے کے بھی ہیں اور ذلیل کرنے کے بھی۔ مگر جب ذلیل کرنے کے معنوں میں آئے تو اس وقت اس کا مفعول بغیر کسی صلہ کے آتا ہے جیسے کہ خسف فلاناً اور جب باء کا صلہ آئے تو اس کے معنے دھنسا دینے کے یا اندر غائب کرنے کے ہوتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں خسف الارض بفلانٍ فلاں شخص کو زمین میں غائب کر دیا۔ چونکہ اس آیت میں باء کا صلہ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے یہی معنے اس کے ہو سکتے ہیں کہ ان کو زمین کے اندر غائب کر دے یا دھنسا دے۔ لیکن مراد گمنام ہو جانے اور جیتے جی دفن ہو جانے کے ہوں گے اور استعمال مجازی سمجھا جائیگا۔

خسف کے معنی گمنام ہونیکے

معجزین

کفار پر موعود عذاب کا ظہور اور صحابہ کی عزت

یہ عذاب کفار پر اس شان کے ساتھ آیا کہ آج صنادید عرب کے ناموں اور ان کے خاندانوں کو کوئی جانتا بھی نہیں لیکن ابو بکرؓ عمرؓ عثمانؓ علیؓ اور انکی نسلوں کو آج بھی لوگ سر پر بٹھاتے ہیں۔

اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔ گو ہر عذاب ہی اسی طرح آتا ہے کہ کفار جانتے نہیں لیکن رسول کریمؐ کی زندگی کے بعض واقعات اس آیت پر حیرت انگیز طور پر چسپاں ہوتے ہیں۔ مثلاً صلح حدیبیہ کا واقعہ ہی لے لو اس صلح کے وقت مکہ والوں کا خیال تھا کہ انہوں نے ایک بہت بڑی فتح حاصل کی ہے لیکن اس کے بعد جس طرح حالات نے یکدم پلٹا کھایا۔ وہ ایک زبردست نشان ہے پہلے مکہ والوں نے اس شرط کے پورا کرنے پر اصرار کر کے کہ جو ہم میں سے اسلام لا کر مدینہ جائے اُسے واپس کر دیا جائے، مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام سے آزاد ہو کر مکہ والوں سے برسر پیکار ہو گئی۔ پھر آخر مکہ والوں کو ذلیل ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرنی پڑی کہ اس جماعت کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی جائے۔ اس کے بعد خود کفار کی باہمی لڑائی نے معاہدہ کے رُو سے مسلمانوں کو مکہ پر چڑھائی کا حق دے دیا اور اس طرح مکہ اچانک اور یکدم فتح ہو گیا۔

۴۷ حل لغات

تَقَلُّبِهِمْ :۔ تقلَّبَ الشیءُ کے معنے ہیں۔ تَحَوَّلَ عن وجهه۔ اپنی جہت سے پھر گیا تقلَّبَ علٰی فِراشِهِ ۔ تَحَوَّلَ من جانبٍ الٰی جانبٍ بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ تقلَّبَ فی الامورِ تصرَّفَ فیها کَیْفَ شاءَ یعنی جس طرح چاہا اپنے معاملات میں خود مختاری سے کام لیا (اقرب)

مُعْجِزِیْنَ : اَعْجَزَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ اور اَعْجَزَہُ الشیءُ کے معنے ہیں فَاتَہٗ ۔ وہ چیز اس کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اعجز فلانٌ فلاناً ۔ صیّرہٗ عاجزاً۔ فلاں نے فلاں کو عاجز کر دیا۔ اَعْجَزَہٗ ۔ وَجَدَہٗ عاجزاً ۔ اس کو عاجز پایا (اقرب) پس فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ کے معنی ہوں گے۔ وہ اس کو عاجز نہیں پائیں گے ۔ وہ اس کو عاجز نہیں کر سکیں گے۔

تفسیر ۔ تَقَلُّب کے معنے سفر کے بھی ہوتے ہیں

عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ اَوَلَمْ

گھٹا کر ہلاک کر دے ۔ کیونکہ تمہارا رب یقیناً (مومنوں پر) بہت بڑی شفقت کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے ۴۸؎ اور کیا باوجود

يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ

اس کے کہ وہ ذلیل ہو رہے ہیں انہوں نے (کبھی) اللہ (تعالیٰ) کے حضور (تذلل کے ساتھ) جھکتے ہوئے جو کچھ بھی

جیسے کہ فرمایا ہے لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِى الْبِلَادِ (آل عمران ع ۲۰) یعنی کفار کا اِدھر اُدھر اموال تجارت لے کر پھرنا تجھے دھوکہ میں نہ ڈالے اور تجھے یہ خیال نہ ہو کہ ان کے پاس تو بڑا سرمایہ ہے۔ بڑی طاقت ہے یہ کس طرح مغلوب ہوں گے۔ ان معنوں کے رُو سے آیت زیر بحث کے معنے یہ ہوں گے کہ کفار مطمئن نہ ہوں کہ ان کے سفر ان کی طاقت کا موجب ہیں اللہ تو انہیں ان سفروں میں ہی عذاب میں مبتلا کرے گا۔ چنانچہ غزوۂ بدر ایک قافلہ کی حفاظت ہی کی غرض سے ہوا اور اس میں کفار مکہ کی شوکت جاتی رہی۔ دوسرے معنے تقلّب کے تصرّف کے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے آیت کے معنے ہوں گے کہ اُن کے تصرّف میں خلل آجائے گا اور حکومت ضعیف ہو جائے گی چنانچہ یہ عذاب بھی مکہ والوں پر صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوا اور بعض کافر قبائل نے مکہ والوں کے جتھا میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور فیصلہ کیا کہ باوجود مذہبی اختلاف کے وہ مسلمانوں کے ساتھ ہوں گے اور یہی تبدیلی مکہ پر حملہ کروانے کا موجب بنا۔

۴۸؎ حل لغات۔ تَخَوُّف: تَخَوَّفَ عليه شَيْئًا تَخَوُّفًا۔ خافهُ عليه۔ اس پر کسی مصیبت کے آنے کا خوف محسوس کیا۔ وتخوّف الشيءَ۔ تنقّصهُ۔ کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے لیا۔ تخوّف حقّه۔ تهضّمهُ اِيّاهُ۔ اس کے حق کو مار لیا۔ هو ياخذهُم على تخوّفٍ۔ اى يصابون فى اطرافِ قراهم بالشّرِ حتّى ياتى ذالكَ عليهم۔ هو ياخذهم على تخوّف کے معنے ہیں کہ ان کی ارد گرد کی بستیوں پر تکالیف آ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ اب ان کی نوبت بھی آ رہی ہے (اقرب) والتخوّف ظهورُ الخوفِ من الانسان۔ انسان سے کسی خوف اور ڈر کے ظاہر ہونے کا نام تخوّف ہے (مفردات)

تفسیر:۔ یعنی ایک اور رنگ کا عذاب بھی مکہ والوں کو ملے گا اور وہ یہ کہ مکہ والوں کے تابع جو علاقے ہیں وہ آہستہ آہستہ انہیں چھوڑتے جائیں گے۔ چنانچہ مختلف علاقوں کے لوگوں نے مکہ فتح ہونے سے پہلے ہی اسلام لانا شروع کر دیا تھا۔

(حاشیہ: ۲ یاخذھم علی تخوّف کے دو معنی)

اس آیت کے یہ معنے بھی ہیں کہ ایک عذاب تم پر خوف کا آئے گا یعنی باوجود زیادہ ہونے کے تمہارے دلوں پر مسلمانوں کا ایسا رعب بٹھا دیا جائے گا کہ تم اندر ہی اندر خوف سے مرتے جاؤ گے۔ اس قسم کا عذاب نہایت شدید ہوتا ہے کیونکہ اس کا اثر اعصاب پر پڑ کر انسان کی حالت سخت پریشانی کی ہو جاتی ہے یہ عذاب بھی مکہ والوں پر نازل ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا رعب ان پر ایسا تھا کہ ہر وقت وہ اسی غم میں گھلے جاتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ (بخاری جلد اول کتاب التیمم) اللہ تعالیٰ نے میری مدد رعب کے قیام سے بھی کی ہے جدھر میں نکلوں مہینہ بھر کی مسافت کے علاقہ تک لوگوں میں دہشت پھیل جاتی ہے۔

(حاشیہ: ۱ تقلّب کے معنی)

(حاشیہ: ۱ تخوّف)

اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ــ یہ عجیب بات ہے کہ سزا کے ذکر کے بعد رؤف ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ یہ سارے عذاب تدریجاً آئے ہیں۔ پہلے تخوّف سے انکو سمجھایا یعنی اِدھر اُدھر بستیوں میں اسلام پھیلایا۔ پھر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں۔ پھر صلح حدیبیہ ہوئی جس سے ان کا رعب اڑ گیا۔ پھر اچانک فتح مکہ کے وقت ان کو شہر میں جا پکڑا۔ پس یہ رأفت اور رحم ہی تھا کہ آہستہ آہستہ پکڑا۔ تاکہ جو ہدایت کے قابل تھے ہدایت پا جائیں۔ ورنہ چاہتا تو یکدم عذاب میں مبتلا کر دیتا۔ دوسری وجہ اس کی یہ

(حاشیہ: ۲ سزا کے بعد صفت رؤف کے ذکر کی وجہ)

عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ

اللہ (تعالیٰ) نے (ان کے لئے) پیدا کیا ہے اُسے غور سے نہیں دیکھا کہ اس کے سائے دائیں جانب سے اور شمالی جانبوں سے اِدھر

دَاخِرُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا

اُدھر ہو رہے ہیں لٹکے اور جو (شے بھی) آسمانوں میں ہے اور (نیز)

ہو سکتی ہے اور میرے نزدیک یہی زیادہ درست ہے کہ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ مسلمانوں کے لئے آیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں پر عذاب لانا مسلمانوں پر رأفت اور رحم کی غرض سے ہوگا تا انہیں ان عذابوں اور ظلموں سے بچایا جائے جو کہ والوں کی طرف سے ان پر روا رکھے جاتے رہتے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ جہاں عذابوں کا ذکر تھا وہاں غائب کی ضمیریں استعمال کی گئی تھیں اور رءوف رحیم سے پہلے یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّ رَبَّهُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ بلکہ فرمایا ہے۔ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ پس غائب سے خطاب کی ضمیر کو بدل دینا بتاتا ہے کہ عذاب کفار کے لئے ہوگا اور رأفت اور رحمت مسلمانوں کے لئے ہوں گی۔

عذاب کفار کے لئے ہے اور رأفت مومنوں کے لئے

۴۹ حل لغات۔ يَتَفَيَّؤُا: تَفَيَّأَ سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَفَيَّأَتِ الظِّلَالُ کے معنے ہیں تَقَلَّبَتْ۔ سائے اِدھر سے اُدھر ہو گئے۔ (اقرب)

يتفيؤا

دَاخِرُوْنَ: دَاخِرٌ سے جمع کا صیغہ ہے اور دَاخِرٌ دَخَرَ ودَخِرَ سے اسم فاعل ہے اور دَخَرَ کے معنے ہیں۔ ذَلَّ وَصَغُرَ ذلیل اور چھوٹا ہو گیا وفی القرآن "سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ" اى اَذِلَّاءَ مُهَانِيْنَ۔ اور قرآن مجید کی آیت "سیدخلون جہنم داخرین" میں داخرین کے معنے ذلیل کے ہیں یعنی وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ (اقرب)

داخرون

یمین کے لفظ کے مفرد رکھے جانے اور شمائل کے جمع رکھے جانے کی وجہ

تفسیر:- اس آیت میں کفار کو توجہ دلائی ہے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اور دلوں میں خشوع پیدا کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کے قانون پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح ہر شئے پر ایک دن زوال آتا ہے، ہر قوم ایک دن ختم ہو جاتی ہے شہر اُجڑ جاتے ہیں۔ حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ ملک تباہ ہو جاتے ہیں

مختلف اشیاء کے زوال سے کفار کو انتباہ

امیر غریب اور غریب امیر ہو جاتے ہیں۔ غرض ہر چیز کا سایہ ایک وقت آکر سمٹ جاتا ہے یعنی اُسے جو رتبہ اور درجہ اور اقتدار اور نفوذ یا رعب یا شوکت یا شہرت حاصل ہوتی ہے جاتی رہتی ہے پھر اس عام قانون سے تم کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے اور غرور اور تکبر کو چھوڑ کر حقیقت پر غور نہیں کرتے تا تم کو عبرت حاصل ہو اور تم سچائی کو قبول کرو۔

میں نے جو معنے کئے ہیں ان کے مطابق سُجَّدًا لِّلّٰهِ اور هُمْ دَاخِرُوْنَ کو اَوَلَمْ يَرَوْا کی ضمیر کا حال بنایا ہے۔ بعض لوگوں نے ان کو مَا کا حال بنایا ہے۔ مگر چونکہ یہاں ذوی العقول کا صیغہ اور ضمیر استعمال کئے گئے ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک وہی معنے زیادہ درست ہیں جو میں نے کئے ہیں۔ ایک اور بات اس آیت میں قابل حل ہے اور وہ یہ کہ یَمِیْن کا لفظ مفرد ہے اور شمائل کا جمع ہے۔ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ حالانکہ چاہیئے تھا کہ یا دونوں کو جمع رکھا جاتا یا دونوں کو مفرد۔ بعض نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ عرب کا محاورہ ہے اور قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ کہ مقابل کی چیزوں کا جب ذکر کریں تو ایک جمع اور دوسرے کو مفرد لاتے ہیں۔ جیسے جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ کہ ظلمات جمع استعمال ہوا ہے اور نور مفرد۔ یہ فرق اس لئے کیا جاتا ہے کہ ایک لفظ کو مفرد بول کر افراد جماعت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دوسرے لفظ کو جمع استعمال کر کے جماعت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض دوسرے علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یمین کا لفظ جمع کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔

اس آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے عذاب کا ذکر کیا تھا اب اس کی دلیل بیان فرماتی ہے کہ ان کی سمجھ میں اتنا بھی نہیں

فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا

زمین پر جو بھی جاندار (موجود) ہے اور (تمام) فرشتے بھی اللہ (تعالیٰ) کے حضور میں ہی جھکے رہتے ہیں

يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ

اور وہ بڑائی نہیں کرتے ۵۰ وہ اپنے رب سے جو ان پر غالب ہے ڈرتے رہتے ہیں۔

آتا کہ اسباب کبھی پیدا کرنے والے کے خلاف ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ سورج کے سایہ میں تغیر ہوتا رہتا ہے جس کی پیٹھ پر وہ ہوتا ہے اس کا سایہ بڑھ جاتا ہے۔ پھر کیا خدا کو اتنی بھی طاقت نہیں جتنی تم سورج میں سمجھتے ہو۔ جب اللہ تعالیٰ محمدؐ رسول اللہ کی پیٹھ پر ہو جائے گا کیا اس کا سایہ نہ بڑھے گا اور ترقی نہ ہوگی۔ اسی طرح جن کی پشت پر سے وہ ہٹ جائے گا کیا ان کے سائے سمٹ نہ جائیں گے؟

اس آیت میں جو یمین و شمائل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کی تفسیر کرنے میں مفسروں نے بڑی مشکل محسوس کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سورج کے اِدھر اُدھر ہونے سے سایہ کی لمبائی چھوٹائی تو مشرق اور مغرب میں ہوتی ہے مگر یہاں خدا تعالیٰ یمین و شمال بیان فرماتا ہے حالانکہ دائیں بائیں کا تعلق سایوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ بعض نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یمین و شمال سے مراد مشرق و مغرب ہے۔ کیونکہ اگر شمال کی طرف منہ کیا جائے تو مشرق و مغرب دائیں بائیں آجاتے ہیں مگر یہ عام دنیا کے خلاف ہے۔ دنیا کا قانون یہ ہے کہ مشرق کی طرف منہ کر کے سمتوں کی تعیین کرتے ہیں۔ پس یہ توجیہ درست نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اس مثال سے اصل مقصد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور مکہ والوں کے اثرات کا مقابلہ کرنا اور یہ بتانا تھا کہ ان دونوں میں سے کس کے سائے بڑھیں گے اور کس کے گھٹیں گے۔ اور چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے جانے والے تھے اور اس آیت میں بھی ہجرت کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے آپؐ گویا شمالی علاقہ کی طرف جانے والے تھے اور مکہ والے آپؐ سے جنوب میں آنے والے تھے۔ پس اگر کوئی شخص دونوں ملکوں کی سرحد پر کھڑا ہو کر مشرق کی طرف مُنہ کرے تو مکہ اس کے دائیں آئے گا اور مدینہ اس کے بائیں آئے گا۔ پس یمین و شمائل سے مکہ اور مدینہ مراد ہیں اور میرے نزدیک اسی وجہ سے یمین کو مفرد استعمال کیا ہے اور شمال کو جمع استعمال کیا ہے جس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تمہارا سایہ محدود ہوگا اور وہ بھی گھٹ جائیگا اور محمد رسول اللہ (صلعم) جو بائیں طرف کے ملک میں چلا جائیگا اس کے کئی سائے ہوں گے یعنی وہ مختلف جہات میں ترقی کریگا۔

دَآبَّة

۵۰ حل لغات۔ دَآبَّةٌ: دَبَّ (دَبًّا) کے معنے ہیں۔ مَشَى عَلٰى هِيْنَتِهٖ كَمَشْيِ الطِّفْلِ والمخلوق والضعيف۔ آہستہ آہستہ چلا جس طرح بچہ یا ضعیف یا چیونٹی چلتی ہے۔ اور دَابَّةٌ دَابٌّ کا مؤنث ہے دَابَّةٌ کے معنے ہیں مادَبَّ مِنَ الْحَيَوانِ۔ ہر وہ حیوان جو زمین پر ضرب لگا کر چلتا ہے۔ وَغَلَبَ عَلٰى مايركب ويحمل عليه الاحمال۔ دابّة کا استعمال زیادہ تر اس حیوان کے لئے ہوتا ہے جس پر سواری کی جاتی ہے یا اس پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ ويقع على المذكر وانها فيها للوحدة كما فى الحمامة۔ دابّة کا لفظ مذکر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور ۃ وحدت کی سمجھی جائے گی۔ یعنی دابّة کے معنے ہونگے۔ ایک حیوان (اقرب)

یمین اور شمال کے الفاظ کی تفسیر میں مفسرین کو مشکل

مشکل کا حل

تفسیر۔ فرماتا ہے جو آسمانوں میں ہیں یعنی فرشتے وہ بھی خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور جو کوئی زمین میں بستے ہیں وہ بھی اس کے حکم کے ماتحت ہیں۔ پس جب خدا کے قبضے میں سامان بھی ہیں اور سامانوں کے مدبر ملائکہ بھی۔ تو جب دونوں کو اس کی ترقی کے لئے لگا دیا جائے گا تو کیوں نہ محمدؐ رسول اللہ کا سایہ بڑھے گا۔

یمین اور شمال کے الفاظ سے ہجرت مدینہ کی طرف اشارہ

سجدۃ ع ۱۲

وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۞ وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا

اور جس بات کا انہیں حکم دیا جاتا ہے (وہی) کرتے ہیں ۵۱ اور اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہر قوم کو یہی فرمایا ہے (کہ) تم

اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ

دو معبود مت بناؤ۔ وہ (یعنی معبود برحق تو) ایک ہی ہے پس تم مجھ سے ہی ڈرو

فَارْهَبُوْنِ ۞ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ

پھر (تم کو کہتا ہوں کہ) مجھ سے ہی ڈرو ۵۲ اور جو کچھ (بھی) آسمانوں اور زمین میں (رہا یا جاتا) ہے اسی کا ہے اور

مِّنْ فَوْقِهِمْ کا مطلب وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ میں بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت پر جن کو لگایا گیا ہے وہ تو کامل فرمانبردار ہیں وہ تو پورے زور سے کام میں لگ جائیں گے مگر تمہارے اتباع تو تمہاری اس طرح فرمانبرداری نہیں کریں گے اس لئے تمہارا نظام کمزور کھلا اور ناقص ہو جائے گا۔

وَاحِد ۔ فارھبون

لفظ دابہ کے استعمال کی وسعت اس آیت میں دابۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور دابہ کا عام استعمال چوپایوں کے لئے ہے پھر اس جگہ یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ دَبَّ سے ہے جس کے معنے آہستگی سے چلنے کے ہیں اور اس کا اسم فاعل دابٌّ اور مؤنث دابّۃٌ ہے۔ انہی معنوں میں اس جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور انسان اس میں شامل ہیں۔

۵۱ تفسیر: - یہ ملائکہ کی صفت بیان فرمائی ہے اس سے ہاروت ماروت کا قصہ بھی باطل ہو جاتا ہے۔ فرشتے تو اللہ تعالیٰ سے خوف کرتے اور اس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں وہ اس کے حکموں کو توڑنے والے نہیں ہو سکتے۔

يفعلون ما يؤمرون کے الفاظ میں ہاروت و ماروت کے قصہ کا ابطال

من فوقهم — یہ ترکیب میں ربّ کا حال ہے یعنی فرشتے اس حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں جبکہ وہ ان کے اوپر ہے یعنی ان پر غالب ہے۔

۵۲ حل لغات: - اِلٰهَيْنِ : اِلٰه سے تثنیہ کا صیغہ ہے۔ اور الالٰہ کے معنے ہیں المعبود مطلقًا بحقٍّ او بباطلٍ لِاَنَّ الاسماءَ تتبعُ الاعتقادَ لا عَلٰی ما علیہ الشیءُ فی نفسِہٖ۔ یعنی ہر معبود پر اِلٰہ کا لفظ بولتے ہیں۔ خواہ وہ سچا ہو یا جھوٹا۔ کیونکہ اشیاء کا نام اعتقاد پر رکھا جاتا ہے۔ نہ اس بات کو مدنظر رکھ کر کہ وہ چیز اپنے نام کے مطابق اپنے اندر حقیقت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ (اقرب) وَاحِد کے معنے کے لئے دیکھو رعد ۱۷

اِلٰهَيْن

فَارْهَبُوْنِ : اِرْهَبُوْا رَهَبَ سے جمع مخاطب کا صیغہ امر ہے۔ اور رَهِبَ الرَّجُلُ رَهْبَةً کے معنے ہیں۔ خَافَ۔ ڈر گیا (اقرب) ارْهَبُوْنِ اصل میں ارْهَبُوْنِي تھا۔ ی کو گرا یا گیا۔ پھر ن کو جسے نون وقایہ کہتے ہیں۔ لایا گیا اور صرف کسرہ پر اکتفاء کیا گیا۔ پس ارھبونِ کے معنے ہوں گے کہ مجھ ہی سے ڈرو اس کے لئے دیکھو سورۃ بقرہ رکوع ۵)

فایای فارھبون کی ترکیب

تفسیر: - فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ — اصل میں فَاِيَّايَ ارْهَبُوْا فَارْهَبُوْنِ ہے جس کے معنے ہیں پس مجھ ہی سے ڈرو اں میں پھر کہتا ہوں کہ تم مجھ سے ڈرو ارْهَبُوْا کو حذف کر دیا گیا اور فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ رہ گیا۔ فَاِيَّايَ بعد کے فعل یعنی فَارْهَبُوْنِ کا معمول نہیں بن سکتا۔ کیونکہ درمیان میں ف آئی ہے۔ اس لئے اس فعل سے پہلے ایک ارْهَبُوْا محذوف ماننا جائے گا۔ اس طرز کلام سے مضمون پر زور دینا ہوتا ہے۔ یعنی رھب اور خوف صرف خدا ہی سے ہونا چاہیئے۔

الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝ وَمَا بِكُمْ

اطاعت ہمیشہ اسی کا حق ہے پھر کیا تم اللہ (تعالیٰ) کے سوا اوروں کو اپنے بچاؤ کا ذریعہ بناتے ہو ۵۳؎ اور جو نعمت بھی

مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ

تمہارے شامل حال ہے وہ اللہ (تعالیٰ) ہی کی طرف سے ہے پھر جب تمہیں (کوئی تنگی اور) تکلیف پہنچتی ہے تو (اس وقت بھی)

اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۔۔۔ یہ جو فرمایا کہ دو معبود نہ بناؤ اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ دو کا لفظ کیوں فرمایا جمع کا صیغہ رکھ کر یہ کیوں نہ فرمایا کہ لا تَتَّخِذُوْا اٰلِهَةً ایک سے زیادہ معبود نہ بناؤ۔ اس سے تو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ دو سے زائد خدا بنانے جائز ہیں۔ ایسا اعتراض قلتِ تدبر سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کے آگے ہی یہ الفاظ ہیں اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ خدا صرف ایک ہے۔ ان الفاظ کی موجودگی میں یہ شبہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا کہ دو سے زیادہ خدا ماننے جائز ہیں۔ پس دو کا لفظ ایک کے مقابل پر زور دینے کے لئے رکھا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ خدا صرف ایک ہے پس زیادہ خدا بنانے تو الگ رہے تم کو دو خدا بھی نہیں بنانے چاہئیں۔

دوسری حکمت ان الفاظ کے اختیار کرنے میں یہ ہے کہ مشرک بھی اللہ اور دوسرے معبودوں میں فرق کرتے تھے وہ سب دنیا کے پیدا کرنے والے کو تو اللہ کہتے تھے اور دیگر معبودانِ باطلہ کو محدود اختیارات والے خدا سمجھتے تھے یا تو اس لحاظ سے کہ انہیں محدود طاقتیں حاصل تھیں مثلاً کوئی مینہ برساتا تھا، کوئی اولاد دیتا تھا، کوئی بیماریوں سے شفا دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اور یا اس لحاظ سے کہ کوئی خدا ایک قبیلہ کی حفاظت کرتا تھا تو کوئی دوسرے کی۔ چنانچہ ان کے ہاں جس طرح مختلف اغراض کے لئے الگ الگ دیوتا تھے اسی طرح مختلف اقوام کے لئے بھی الگ الگ دیوتا تھے۔ گویا ایک خدا تو قادرِ مطلق تھا اور دوسرے معبود محدود اغراض اور محدود علاقوں کے لئے تھے۔ اس طرح خداؤں کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک قسم قادرِ مطلق خدا کی جو ان کے نزدیک بھی صرف ایک تھا اور دوسری قسم محدود اختیارات اور محدود علاقوں کے خداؤں کی جو ان کے نزدیک بہت سے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جو یہ فرمایا ہے کہ دو خدا نہ بناؤ اس سے مراد یہ ہے کہ دو قسم کے خدا نہ بناؤ۔ خدا ایک ہی ہے اس کے سوا کوئی اور قسم کا خدا نہیں ہے۔

تیسری حکمت ان الفاظ کے استعمال کرنے میں یہ ہے کہ اس میں مجوس کے اس عقیدہ کا بطلان کیا گیا ہے جو دو خدا مانتے ہیں ایک خیر کا خدا دوسرا شر کا خدا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس قسم کے دو خدا موجود نہیں ہیں خدا صرف ایک ہی ہے جزائے خیر بھی اسی کی طرف سے آتی ہے اور جزائے شر بھی اُسی کی طرف سے آتی ہے پس دو خدا نہ بناؤ۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ جب ایک ہی خدا ہے تو پھر بتاؤ کہ شریعت اس کے سوا اور کون بنا سکتا ہے شریعت کا بنانا اسی کے اختیار میں ہوگا۔

اس آیت میں ہجرت اور اس کے نتائج کے متعلق جو پیشگوئی کی گئی تھی اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان واقعات کے پورا ہونے پر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا ایک ہی ہے اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں یعنی مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی اللہ تعالیٰ کی توحید اور رذات کا ایک زبردست ثبوت ہوگی۔

ان آیات میں قرآن کریم کی تعلیم اور کفار کی تعلیم کا مقابلہ بھی ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ کیا کبھی انسان قرآن کریم کی تعلیم سے مستغنی ہو سکتا ہے تم لوگوں نے اپنی عقل سے کام لے کر بے شمار معبود بنا رکھے ہیں یہ الہام ہی ہے جو سچی توحید کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور انسانی دماغ کو تشتت اور پراگندگی سے بچاتا ہے ؁

۵۳؎ حل لغات۔ الدِّيْنُ: کے لئے دیکھو یوسف ۴۱ ؎

اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ کے الفاظ یا جمع کو چھوڑ کر تثنیہ کے ذکر کرنے میں تین حکمتیں

اس آیت میں ہجرت اور اس کے نتائج کی پیشگوئی کا اشارہ

الدّین

فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ ۞ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ

تم اسی کے حضور فریاد کرتے ہو ۵۴؎ پھر جب وہ تم سے اس تکلیف کو دُور کر دیتا ہے۔

واصبًا ۱

واصبًا: وَصَبَ الشَّیُٔ (یصبُ وصُوبًا) کے معنے ہیں دَامَ وثَبَتَ۔ کوئی چیز قائم دائم رہی۔ وصبَ الدَّیْنُ: وَجَبَ: قرضہ کی ادائیگی واجب ہوگئی۔ وَصَبَ فلانٌ علی الامر: واظَبَ واحسنَ القیامَ علیہ۔ کسی امر پر دوام اختیار کیا اور اس پر اچھی طرح کاربند رہا۔ الواصبُ: الدَّائمُ: ہمیشہ رہنے والا۔ لہ الدِّیْنُ واصبًا کے معنے ہیں دائمًا۔ کہ اطاعت ہمیشہ اسی کا حق ہے (اقرب)

نعمۃ ۲

تفسیر:۔ شرک کے ردّ میں یہ ایک نہایت زبردست دلیل ہے جسے قرآن مجید نے متعدد جگہ پر پیش کیا ہے۔ فرماتا ہے آسمان وزمین کے نظام پر غور کرو۔ کائنات عالم کو دوربین نگاہ سے دیکھو تو تمہیں سب جگہ پر ایک ہی قانون جاری نظر آئے گا اور یہ تمام اشیاء ایک انتظام میں منسلک نظر آئینگی جب قانون ایک ہے تو بادشاہ دو یا زیادہ کیسے ہوسکتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا خدا ہوتا تو ضروری تھا کہ ہمیں دنیا میں قانون کا اختلاف نظر آتا۔ کیونکہ دوسرے خدا کا وجود ماننے کی صورت میں نظامِ عالم کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں:۔

۱۔ یہ کہ وہ پہلے خدا کی اطاعت کرے اور اس کے احکام کے ماتحت چلے۔ اس صورت میں اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ کیونکہ جو کام ایک کرسکتا ہے دو کو اس کام پر لگانے کی کیا ضرورت؟

لہ الدین واصبًا میں شرک کے رد میں ایک زبردست دلیل

۲۔ وہ پہلے خدا کے علاوہ کوئی اور نیا کام کرتا ہو اور اس کا قانون اور نظام الگ ہو۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ نظامِ عالم میں اختلاف نظر آوے لیکن چونکہ واقعہ میں ایسا نہیں ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ دوسرا خدا ہی کوئی نہیں صرف ایک ہی واحد و یگانہ خدا ہے۔

لَہُ الدِّیْنُ وَاصِبًا۔ اس میں بتایا ہے کہ دوسری صورت ایک سے زیادہ خداؤں کی یہ ہوسکتی تھی کہ ایک خدا ایک زمانہ تک کام کرتا اور اس کے بعد وہ معطل ہوجاتا اور اس کی جگہ دوسرا خدا لے لیتا۔ لیکن یہ بات بھی واقعات سے غلط ثابت ہورہی ہے۔ جو قانون قدرت شروع سے چلایا گیا ہے وہی آج تک چلا آرہا ہے۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں سال گذرے مگر اس کے قانون میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کا قانون اٹل ہے پس ایسے خدا کی موجودگی میں کہ جو زمین وآسمان کا مالک ہو اور جس کا قانون ازل سے ابد تک ہو دوسرے خدا کا وجود ماننا سخت غلطی اور بے وقوفی ہے۔

۵۴؎ حل لغات۔ نِعمۃ

اَلنِّعْمَۃُ کے معنے ہیں۔ الصَّنیعۃُ والمِنَّۃُ: احسان۔ مَا انعم بہ علیکَ من رزقٍ ومالٍ وغیرہ۔ وہ مال یا رزق یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز جو بطور انعام ملے۔ المسرَّۃ۔ خوشی۔ الیدُ البیضاء الصالحۃ: ایسا احسان جس میں کوئی کدورت اور کمی نہ ہو۔ وفی الکلّیات: "النِّعْمَۃُ فی اصل وضعھا الحالۃ التی یَستلذّ بھا الانسانُ و ھذا مبنیٌّ علی ما اشتَہَر عندھُم من انّ النِعمۃَ بالکسر لِلحالۃِ وبالفتح لِلمَرَّۃِ" اور کلیات میں یوں لکھا ہے کہ نعمت اصل وضع کے لحاظ سے اس حالت کو کہتے ہیں جس سے انسان لذت اٹھاتا ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ حالت بیان کرنے کے لئے عربی زبان میں فِعْلَۃٌ اور کسی کام کے ایک دفعہ ہونے کے لئے فَعْلَۃٌ کا وزن لاتے ہیں اور نعمۃ فِعْلَۃٌ کے وزن پر ہے اس لئے اس میں نعمت والی حالت کے معنے پائے جاتے ہیں۔ نِعْمَۃُ اللہِ: مَا اَعْطَاہُ اللہُ لِلْعَبْدِ مِمَّا لَا یتمنّٰی غیرہ ان یُعطیہٗ اِیَّاہُ۔ اللہ کی نعمت وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالےٰ اپنے بندے کو دیتا ہے اور پھر بندہ اللہ کے سوا کسی اور سے یہ خواہش نہیں رکھتا کہ وہ

إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ۝ لِيَكْفُرُوا بِمَا

تو تم میں سے بعض لوگ جھٹ (اوروں کو) اپنے رب کا شریک ٹھہرانے لگتے ہیں ۵۵؎ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے

اُسے دے۔ اس کی جمع اَنْعُمٌ اور نِعَمٌ آتی ہے۔ اور جب فلانٌ واسعُ النِّعْمَةِ کہیں۔ تو اس کے معنے ہونگے واسعُ المَالِ یعنی فلاں مالدار ہے (اقرب)

الضُّرّ کے معنے کیلئے دیکھو یوسف ۵۹؎

تَجْأَرُوْنَ : جَأَرَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور جَأَرَ الدَّاعِي جَأْرًا کے معنے ہیں رَفَعَ صَوتَهُ بالدُّعاءِ پکارنے والے نے اونچی آواز سے پکارا۔ جَأَرَ اِلَی اللّٰهِ بالدُّعاءِ: ضَجَّ وتَضَرَّعَ واستغاثَ: اللہ کے حضور عاجزی سے فریاد اور دعا کی اور اُسی سے مدد چاہی۔ وَمِنْهُ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ۔ اور آیت اِذَا مَسَّكُم ...الخ میں تجأرُوْنَ کے معنی عاجزی کرنے اور فریاد کرنے کے ہیں (اقرب)

تفسیر :- اس آیت میں ان آیات اور نشانات کا ذکر فرمایا ہے جو توحید کی تائید میں خود ان کی جانوں میں موجود تھے۔ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے تم کو سب نعمتیں ملی ہیں۔ کیونکہ جس قدر نعمتیں ہیں وہ ایک ہی نظام کا حصہ ہیں۔ مگر باوجود اس کے تم بعض نعمتوں کو دوسرے معبودوں کی طرف منسوب کر دیتے ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب کبھی کوئی سخت قومی آفت آتی ہے تم کو اپنے معبودان باطلہ بھول جاتے ہیں اور اسی ایک خدا کی طرف جو حقیقی خدا ہے جھک جاتے ہو۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ تمہارے دل شرک پر مطمئن نہیں۔ پس جب شرک پر تم خود مطمئن نہیں تو اس پر اس قدر زور کیوں دیتے ہو۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ شدید مصائب کے وقت ہی لوگ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جھکتے ہیں مسیحی جو مسیح کو خدائی کا مقام دیتے ہیں اس جنگ میں جو اس وقت جرمنی اور انگلستان کے ساتھ ہو رہی ہے مسیح کو نہیں پکار رہے بلکہ ایک خدا کو پکار رہے ہیں۔ اگر انہیں مسیح کی خدائی پر پورا یقین ہوتا تو کبھی ایسا نہ کرتے۔

بدر کی جنگ کے موقعہ پر جب کہ گھمسان کا رن پڑا تھا تو کفار نے لات اور عزیٰ کو نہیں پکارا۔ ابوجہل نے بھی ان باطل معبودوں سے دعا نہیں کی۔ بلکہ کہا تو یہی کہا۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (انفال ع ۴) کہ اے اللہ اگر یہ مذہب اسلام سچا ہے اور ہم اس کی مخالفت ضد کی وجہ سے کر رہے ہیں، تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا اس کے سوا کوئی اور دردناک عذاب ہمیں دے۔ اور خدائے واحد نے اس کی دعا سن بھی لی اور بدر میں ان پر پتھروں کی بارش بھی نازل کی اور اور کئی قسم کے دردناک عذاب بھی ان پر نازل کئے۔ اگر ان لوگوں کے دلوں میں لات اور عزیٰ کا ہی گہرا نقش و اثر ہوتا تو انہی کو اس مصیبت میں پکارتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ انہوں نے خدا تعالیٰ ہی کو بلایا اور یہی فطرت کی شہادت ہے۔

۵۵؎ **تفسیر** :- بِرَبِّهِمْ - کا لفظ استعمال فرما کر انہیں شرم اور غیرت دلائی ہے کہ تم اپنے ہی رب کے شریک ٹھہراتے ہو۔ حالانکہ انسان کو اپنی چیز کی ایک غیرت ہوتی ہے وہ تو تمہارا اپنا رب ہے تمہیں اس کے ساتھ کوئی ضد تو نہیں کہ ضرور اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مصیبت کے وقت تو اس کو یاد کرتے ہو اور جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر تم کو اپنے جھوٹے معبود یاد آ جاتے ہیں۔

~~~~~~~~

حاشیہ:
- ۱؎ الضُّرّ
- ۱؎ تجأرون
- ۱؎ توحید کی تائید میں ان دلائل کا ذکر جو کفار کی جانوں میں موجود تھے۔
- ۱؎ آیت میں برّبہم کے الفاظ استعمال کرنے کی حکمت
- ۱؎ مشرکین کو تکلیف کے وقت معبودان باطلہ سے اعراض
~~~~~~~~

اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ٙ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ وَ

انہیں دیا ہے وہ اس کا انکار کردیتے ہیں۔ اچھا ۵۶ تم عارضی (اور ناقص سامانوں سے) نفع اٹھالو۔ اور (اس کا انجام بھی) تم جلد معلوم کرلوگے ۵۶ اور

يَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ

جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اسمیں سے ایک حصہ (اپنے) ان (جھوٹے معبودوں) کے لئے مخصوص کردیتے ہیں۔ جن (کی حقیقت) کے متعلق وہ (کچھ بھی) علم

تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ○ وَيَجْعَلُوْنَ

نہیں رکھتے ۵۷ اللہ (تعالیٰ) کی قسم جو کچھ تم (جھوٹ سے کام لیکر) اپنے پاس سے گھڑتے رہے ہو (ایک دن) اس کی نسبت تم سے یقیناً بازپرس ہوگی اور وہ اللہ (تعالیٰ) کیلئے

۵۶ حل لغات۔ ف فاء کا ترجمہ اس جگہ 'اچھا' زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

لیکفروا میں لام لام عاقبت ہے۔

تفسیر:- لِيَكْفُرُوْا میں لام۔ لام عاقبت ہے اور مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جب تم پر سے مصیبت ٹلا دیتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بجائے اس کا شکریہ ادا کرنے کے تم اس کے فضل کا انکار کر دیتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ فضل فلاں دیوتا کی وجہ سے نازل ہوا ہے۔ جب تمہاری یہ حالت ہے تو تم دائمی فضل کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ ہم تمہاری ہدایت کی غرض سے اور اپنے رحم سے کام لیتے ہوئے چند بار تو تمہاری دعاؤں کو سن کر مصائب ٹال دیں گے مگر ہمیشہ تو ایسا نہ ہوگا آخر ایک دن ہم تمہاری دعاؤں کو رد کر دیں گے اور عذاب میں مبتلا کر دینگے۔

اس آیت میں شرک کے خلاف ایک عام فہم دلیل

۵۷ حل لغات۔ النَّصِيْبُ: الحظ: حصہ (اقرب)

النصیب

تفسیر:- شرک کی ایک اور شناعت اس آیت میں بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ الٰہی نعمتوں کو ایسے وجودوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جن کے وجود کا خود کوئی ثبوت نہیں۔ یہ دلیل شرک کے رد میں ایک زبردست ثبوت ہے مشرکوں نے شرک کی تائید میں بعض ایسے فلسفیانہ مسائل بنا رکھے ہیں کہ ان میں پڑ کر کمزور دماغ کے آدمی کچھ حیران سے ہو جاتے ہیں اور شرک اور توحید میں فرق کرنا ان کے لئے

اس آیت میں شرک کی ایک اور شناعت

مشکل ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں شرک کے متعلق ایک ایسی عام فہم دلیل دی گئی ہے۔ جو ان سب فلسفیانہ وسوسوں کو رد کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس اصولی بحث کو جانے دو کہ ایک سے زیادہ معبود ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ کسی چیز کا ہو سکنا اَور امر ہے اور ہونا اَور امر ہے۔ فرض کر لو کہ ایک سے زیادہ معبود ممکن ہوں مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہو جاتا کہ کوئی خاص بُت یا خاص انسان جسے خدا تعالےٰ کا شریک بنایا جاتا ہے وہ بھی سچا معبود ہے۔ اس امر کا ثبوت کہ کوئی شخص یا بُت معبود سچا ہے تو الگ دینا ہوگا۔ فرماتا ہے اپنے ایک ایک معبود کو لے لو کیا ان میں سے کسی کی خدائی کا ثبوت بھی تمہارے پاس ہے۔ اگر کسی معبود کی خدائی کا ثبوت بھی تمہارے پاس نہیں تو صرف فلسفیانہ دلائل شرک کی تائید میں دے کر تم توحید کے حملہ سے کس طرح بچ سکتے ہو۔ یہ وہ دلیل ہے جس کے سامنے کوئی مشرک نہیں ٹھہر سکتا۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک سے زیادہ خدا ممکن ہیں۔ مگر یہ کیوں کر ثابت ہوا۔ کہ کالی بھی خدا ہے یا رام یا کرشن بھی خدا ہیں یا مسیح اور ایسے ہی ان لوگوں کے مزعومہ خدا، خدا ہیں۔ ان کے خدا ہونے کا تو الگ ثبوت دینا پڑے گا جو کبھی کوئی مشرک نہیں دے سکتا۔ وہ ہمیشہ عام فلسفیانہ دلائل شرک کی تائید میں پیش کرے گا۔ اپنے مزعومہ معبود کی تائید میں کبھی کوئی معقول دلیل نہ دے گا اور نہ دے سکیگا۔ کیونکہ شرک کی تائید میں

بِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ وَ

لڑکیاں منسوب کرتے ہیں (یہ کیسا جھوٹ ہے) وہ پاک ذات ہے اور (لطف یہ کہ) انہیں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) وہ کچھ ملا ہے جو وہ چاہتے ہیں ۵۹ اور

فلسفیانہ دلائل دینا اور بات ہے اور ایک کمزور وجود کو خدا ثابت کرنا اور بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے ان سب وجودوں کے متعلق جن کو خدا مانا جاتا ہے ایسے زبردست شواہد ان کے کمزور اور بے بس ہونے کے پیدا کر رکھے ہیں کہ جب اس طرف رُخ کیا جائے مشرک کی سب شیخی کرکری ہو جاتی ہے۔

لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ سے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ ان معبودوں کو حصہ دیتے ہیں جو معبود اس بات تک کو نہیں جانتے کہ انہیں خدا تعالیٰ کی صفات دی جا رہی ہیں۔ مثلاً بُت۔ نہریں۔ دریا۔ پہاڑ وغیرہ جن کو لوگ خدا بناتے ہیں خود بے جان اشیاء ہیں۔

ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت امام حسینؓ ہیں۔ لوگ ان کی طرف الوہیت کو منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے فلاں فلاں چیز دی مگر اُن بے چاروں کو اس بات کا پتہ بھی نہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی دعویٰ خدائی کا نہیں کیا۔ اس صورت میں لَا يَعْلَمُوْنَ کی ضمیر معبودوں کی طرف مانی جائے گی۔

دوسرے معنے وہی ہیں جو اوپر بیان ہو چکے ہیں یعنی ان ہستیوں کی طرف خدا تعالیٰ کے افعال کو منسوب کرتے ہیں جن کے خدا ہونے کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ان معنوں کے رو سے لَا يَعْلَمُوْنَ کی ضمیر يَجْعَلُوْنَ کے فاعل کی طرف پھرے گی۔

تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ پوچھنے سے مراد خالی دریافت کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ سزا دینا ہوتا ہے اور یہ ہر زبان و ملک کا محاورہ ہے۔ مطلب یہ کہ تمہارے اس افتراء کی تم کو ضرور سزا ملے گی۔

بعض نادان تَاللّٰهِ کے لفظ سے یہ استدلال کیا کرتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام خدا کا نہیں ورنہ یہ کیوں کہا جاتا کہ خدا کی قسم بلکہ یوں کہنا چاہیے تھا کہ ہمیں اپنی قسم ہے۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں کیونکہ شاہانہ کلام میں اس قسم کا طرز بیان جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ نام کے اظہار سے رُعب پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ باپ اپنے بیٹے پر رُعب ڈالنے کے لئے بعض دفعہ یہ کہتا ہے کہ تمہارا باپ تم کو یہ حکم دیتا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ بولنے والا باپ نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ اسی طرح بادشاہ خاص زور دینے کے لئے کہا کرتے ہیں کہ تمہارا بادشاہ تم کو یوں حکم دیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ بادشاہ اس وقت اپنی بادشاہت کا انکار کرکے کسی اور کی بادشاہی کا اعلان کر رہا ہے۔

(حاشیہ: لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ کے دو معنی)

۵۹ حل لغات۔

سُبْحٰنَهٗ کے لئے دیکھو یونس ۱۹۔ يَشْتَهُوْنَ: اِشْتَهٰى سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اِشْتَهٰى کے معنے ہیں کسی چیز کو پسند کیا۔ اور اس کے لینے کی تمنا کی۔ (اقرب) پس وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ کے معنے ہوں گے۔ ان کو وہ کچھ حاصل ہے جو وہ چاہتے ہیں۔

(حاشیہ: سُبْحٰنَهٗ ۔ يَشْتَهُوْنَ)

تفسیر: اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ کو اس لئے ناراضگی ہے کہ وہ اس کی طرف بیٹے کیوں منسوب نہیں کرتے اور بیٹیاں کیوں منسوب کرتے ہیں۔ وہ تو بیٹوں کے عقیدہ پر بھی ویسا ہی ناراض ہوتا ہے۔ جیسے بیٹیوں کے عقیدہ پر۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم ع ۶) قریب ہے کہ آسمان پھٹ کر گر جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں کیونکہ یہ لوگ رحمٰن خدا کا ایک بیٹا تجویز کرتے ہیں۔ پس بیٹوں کا ذکر کرکے مشرکوں کی کم عقلی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ بتایا ہے کہ غلط راہ پر چل کر

(حاشیہ: تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ کا مطلب)

(حاشیہ: بعض لوگوں کا تَاللّٰهِ کے لفظ سے غلط استدلال)

إِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ

جب ان میں سے کسی کو لڑکی (کی پیدائش) کی بشارت دی جائے تو اس کا منہ جبکہ وہ اپنے غیظ (وغضب) کو (سینہ میں) دبا رہا ہوتا ہے

هُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا

سیاہ ہو جاتا ہے ۵۹؎ (اور) جس بات کی اُسے بشارت دی گئی ہے اس کی (مزعومہ) شناعت کے باعث وہ لوگوں سے

بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى

چھپتا (پھرتا) ہے (اور سوچتا ہے کہ) آیا وہ اسے (آئندہ آنیوالی) ذلت کے باوجود (زندہ) رہنے دے یا اُسے (کہیں)

التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ لِلَّذِيْنَ لَا

مٹی میں گاڑ دے۔ سنو! جو رائے وہ قائم کرتے ہیں بہت بُری ہے ۶۰؎ جو لوگ آخرت پر

انسان ایسی باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جو خود اس کے اپنے مسلمات کے رو سے قابل اعتراض ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ خدا تعالےٰ کی طرف بیٹیاں منسوب کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ بیٹیوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اگر عقل سے کام لیتے تو جس چیز کو یہ اپنے لئے ذلت کا موجب سمجھتے ہیں اس چیز کو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب نہ کرتے۔

یہ اس امر کی دلیل بیان کی گئی ہے کہ الہام کے بغیر ہدایت کا راستہ تلاش کرتے ہیں انسان کیسی کیسی موٹی غلطیاں کر جاتا ہے پھر باریک مسائل میں وہ کیوں غلطی نہ کرے گا۔ پس سچا راستہ بتانا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔

اس کے جواب میں ممکن تھا کہ وہ کہہ دیتے کہ ہم تو خدا کی طرف کوئی برائی منسوب نہیں کرتے۔ لڑکیاں بھی خدا کی ہی ایک نعمت ہیں اُسی کی پروردہ ہیں۔ اس لئے یہ کوئی عیب نہیں۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دیا گیا ہے۔

۵۹؎ حل لغات۔ بُشِّرَ: بَشَّرَ سے مجہول کا صیغہ ہے۔ اور بَشَّرَهٗ کے معنے ہیں اَخْبَرَهٗ فَفَرِحَ اس کو ایسی خبر دی جس سے وہ خوش ہوا (اقرب)

كَظِيْمٌ کے معنے ہیں اَلْمَكْرُوْبُ۔ رنجیدہ (اقرب)

(حاشیہ: يَتَوَارٰى، هُوْنٍ، يَدُسُّهٗ، بُشِّرَ، كَظِيْمٌ)

مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف ۸۵؎

تفسیر:۔ یعنی ان کی یہ حالت ہے کہ ان میں سے کسی کو جب بیٹی کی پیدائش کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا ہو جاتا ہے اور غم اور شرم کے جذبات کو بمشکل دبا رہا ہوتا ہے۔ لیکن یہ شخص جو بیٹی کی پیدائش پر سیاہ رو ہو جاتا ہے اس ہستی کی طرف جو نور ہی نور ہے اسی چیز کو جسے اس قدر قابل شرم سمجھتا ہے منسوب کر دیتا ہے۔

۶۰؎ حل لغات۔ يَتَوَارٰى: تَوَارٰى سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور تَوَارٰى کے معنے ہیں اِسْتَتَرَ: چھپ گیا (اقرب) پس يَتَوَارٰى کے معنے ہونگے وہ چھپتا ہے۔ هُوْنٌ: هَانَ الرَّجُلُ هُوْنًا کے معنے ہیں ذَلَّ وَحَقُرَ: وہ ذلیل اور حقیر ہوگیا۔ ضَعُفَ۔ کمزور ہوگیا۔ الهُوْن هان کا مصدر ہے۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلْخِزْيُ۔ رسوائی (اقرب) يَدُسُّهٗ: دَسَّ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور دَسَّ الشَّيْءَ تَحْتَ التُّرَابِ کے معنے ہیں۔ اَدْخَلَهٗ فِيْهِ۔ وَدَفَنَهٗ تَحْتَهٗ وَاَخْفَاهُ کسی چیز کو زمین میں دبا کر مخفی کر دیا (اقرب) پس اَمْ يَدُسُّهٗ کے معنے ہونگے۔ یا اُسے مٹی میں دبا دے۔ گاڑ دے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ

ایمان نہیں لاتے ان کی حالت بُری ہے۔ اور (ہر) اعلیٰ صفت (اور شان)

الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ ع ۱۰ / ۱۴

اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ اور وہی غالب (اور) حکمت والا ہے ۔ ۵۶۱ اور اگر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہوتی کہ وہ)

تفسیر:۔ یعنی بلوجود پدری محبت کے اس تذبذب میں پڑ جاتا ہے کہ ذلت برداشت کرکے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا اس بے چاری کو زندہ درگور کر دے۔

اس بارہ میں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ عام طور پر لوگوں کو یہ غلطی لگی ہوئی ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا علاج عربوں میں عام تھا۔ لیکن یہ بات نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ان کے ملک میں لڑکیوں کی تعداد بہت کم ہو جانی چاہیئے تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ بے شک لڑکی کی پیدائش کو تو عرب کے سارے ملک میں ہی بُرا سمجھا جاتا تھا مگر ان کو زندہ دفن کرنے کا رواج عملاً صرف بعض بڑے بڑے اور متکبر لوگوں میں تھا۔ لڑکی کی پیدائش کو بُرا سمجھنا اَور بات ہے اور اُسے زندہ درگور کر دینا اَور۔ آج تک لوگ لڑکی کی پیدائش کو عموماً بُرا سمجھتے ہیں اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔ مگر انہیں مارتے چند ہی لوگ ہیں۔ عرب میں بھی یہ فعل کم میں بہت ہی کم ہوتا تھا۔ عام طور پر ان قبائل میں جو اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے تھے یہ طریق رائج تھا اور وہ بھی بعض بڑے لوگوں میں۔ پس اس جگہ عام رسم کا ذکر نہیں بلکہ قوم کے عمائدین کے ایسے فعل کو بیان کیا گیا ہے جس کی نقل گو ساری قوم نہیں کرتی تھی مگر اسے ایک عزت کا فعل سب سمجھتے تھے۔

اَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ میں بتایا ہے کہ وہ جو بیٹیوں کو بُرا سمجھتے ہیں ان کا یہ فعل نہایت ہی گندہ ہے اگر بیٹیاں نہ ہوتیں تو وہ کس طرح پیدا ہوتے۔ اور اگر آئندہ بیٹیاں نہ ہوں، تو ان کے بیٹوں کی نسل کس طرح چلے۔

قرآن کریم نے شروع سے ہی عورتوں کی عزت کو قائم کیا ہے اور ان کے حق کو تسلیم کیا ہے۔ مگر باوجود اس کے اب تک یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں پر ظلم کیا۔ بھلا وہ کون سی کتاب ہے جس میں ابتدا ہی سے عورت کے حقوق کی حفاظت اور نگہداشت کی گئی ہو۔ وہ صرف اور صرف قرآن مجید ہی ہے۔

(حاشیہ: قرآن مجید کے ذریعہ عورتوں کی عزت کا قیام)

۵۶۱ حل لغات

- لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى۔ اَلْمَثَل اعلیٰ صفت اور شان اللہ ہی کی ہے۔ المثل کے معنے کے لئے دیکھو رعد ۵۳۵

تفسیر:۔ مثل کے مختلف معنوں میں سے ایک معنے بات کے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً عرب لوگ کہتے ہیں۔ بسط لہٗ مثلاً ای حدیثا (اقرب) فلاں شخص نے اس کو خوب لمبی بات کی۔ اس آیت میں مثل کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے مُنہ سے جب بات نکلتی ہے بُری ہی نکلتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بات بتائی جاتی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ یہاں اصل مضمون جس کے بارہ میں سورت نازل ہوئی ہے کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ کلام الٰہی کے وجود کے بھی منکر ہوتے ہیں اور اپنی ہدایت کے لئے خود قانون بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کوشش میں بُری طرح ناکام رہتے ہیں اور جو بات کرتے ہیں الٹی ہی کرتے ہیں۔ لیکن جو کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے وہ سب عیبوں سے پاک ہوتا ہے اور سب خوبیوں کا جامع ہوتا ہے پھر کلام الٰہی کی ضرورت کا یہ لوگ کس طرح انکار کر سکتے ہیں۔

(حاشیہ: لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج سارے عرب میں نہ تھا۔)

(حاشیہ: لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کے ذکر میں صرف قوم کے عمائدین کا ذکر ہے۔)

(حاشیہ: الا ساء ما یحکمون کا مطلب)

النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ

لوگوں کو ان کے ارتکاب ظلم پر (فوراً) پکڑ لیتا (اور توبہ کے لئے مہلت نہ دیتا) تو وہ اس (زمین) پر کسی جاندار کو (زندہ) نہ چھوڑتا

وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ

مگر (اپنی صفت رحم کی بنا پر) وہ (اصلاح کیلئے) انہیں ایک معین وقت تک مہلت دیتا (چلا جاتا) ہے پھر جب ان کی سزا کا وقت

اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝

آجاتا ہے تو وہ نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ (کر بچ) سکتے ہیں اور نہ (اس سے) آگے نکل (کر بچ) سکتے ہیں ۶۲

قرآن مجید کے بیان کا ایک خاص انداز[1]

اس جگہ کہا جا سکتا ہے کہ کیوں یوں نہ کہا گیا کہ جو لوگ کلام الٰہی کے منکر ہوتے ہیں وہ غلط باتیں کرتے ہیں۔ یہ کیوں کہا گیا کہ جو لوگ یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے غلط باتیں کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ ایسے طریق پر بات کرتا ہے کہ جس نقص کا وہ ذکر کر رہا ہو اس کے بواعث بھی وہ ساتھ ہی بیان کرتا جاتا ہے۔ اسی انداز کو یہاں اختیار کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ کلام الٰہی کی ضرورت کے منکر ہوتے ہیں وہ ایسا یوم آخر کے انکار کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ورنہ کوئی شخص جو یوم آخر پر ایمان لاتا ہو کلام الٰہی کی ضرورت کا انکار نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا شخص انسانی زندگی کا سب سے اہم زمانہ اسی زمانہ کو سمجھے گا جو مرنے کے بعد آنے والا ہے اور چونکہ مرنے کے بعد پھر واپس لوٹنے کی کوئی صورت نہیں وہ اُخروی زندگی کی اہمیت کو جانتے ہوئے اس ضرورت کو بھی محسوس کرے گا کہ اس عالم سے واقف ہستی کی طرف سے ہی وہ راہ بتائی جانی چاہیئے جس پر چل کر بعد الموت زندگی اچھی گذار سکے۔ اگر صرف اس قدر کہا جاتا کہ جو کلام الٰہی کے منکر ہیں ان کی باتیں غلط ہوتی ہیں تو اس سے یہ مفہوم ادا نہ ہو سکتا تھا۔

صفت عزیز اور حکیم سے یوم آخر کا ثبوت[2]

اَلْعَزِیْزُ اور اَلْحَکِیْمُ کی صفات آخر میں اس لئے رکھی ہیں تا اس طرف اشارہ ہو کہ غالب ہی اپنی طاقت کا اظہار کر سکتا ہے اور الحکیم ہی حکمتوں کو بیان کر سکتا ہے اس لئے یقیناً اس کی تعلیم حق ہو گی اور انسان کی نجات کا موجب ہو گی۔ ورنہ جو حکیم نہیں اور عزیز نہیں وہ اوّل تو پُر حکمت کلام نہیں کر سکتا اور اگر کوئی بات کرے گا تو اس کے پورا کرنے کی اس میں طاقت نہ ہو گی۔

ان صفات سے یوم آخر کا بھی ثبوت پیش کیا اور بتایا کہ خدائے حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا اور بغیر یوم آخرت کے انسانی پیدائش ایک بے حکمت فعل رہ جاتی ہے۔

اسی طرح عزیز خدا کا غلبۂ کامل اس دنیا میں نہیں ہو سکتا اس کے لئے یوم آخر کی ضرورت ہے۔ اگر کہو اس دنیا میں کیوں نہیں ہو سکتا تو اس کا جواب صفت حکیم ہے یعنی اسی دنیا میں کامل غلبہ ظاہر ہو تو ایمان فضول ہو جاتا ہے۔

۶۲ حل لغات۔

دَآبَّةٌ کے لئے دیکھو نحل ۵۰[3]

اَجَلٌ کے معنے کے لئے دیکھو رعد ۳۰[4]

اَلسَّاعَةُ: کے معنے ہیں الوقت الحاضر۔ موجودہ وقت۔ القیامۃ: قیامت۔ وقیل الوقت الّذی تقوم فیہ القیامۃ: اور بعض نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ وہ وقت جبکہ قیامت برپا ہو گی۔ وعبارۃ عن جزء قلیل من النہار والّیل: رات یا دن کے تھوڑے حصے کو بھی ساعۃ کہتے ہیں۔ جب یہ کہیں کہ جلست عندک ساعۃً من النہار والّیل تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔ اَیْ وقتاً قلیلا منہ۔ یعنی میں تمہارے پاس کچھ دیر بیٹھا رہا (اقرب)

[3] دَآبَّةٌ
[4] اَجَلٌ، اَلسَّاعَةُ

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ

اور وہ (اللہ تعالیٰ) کے لئے وہ چیز تجویز کرتے ہیں جسے وہ (خود اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں علاوہ اسکی زبانیں (بڑی جرأت سے

الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ

کام لے کر یہ) جھوٹ بولتی ہیں کہ انہیں بھلائی ملے گی یہ اٹل بات ہے کہ ان کے لئے (دوزخ کی)

النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ۝ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ

آگ (کا عذاب مقدر) ہے اور یہ کہ انہیں (اس میں) چھوڑ دیا جائیگا ۵۶۳ اللہ (تعالیٰ) کی قسم! ہم نے تجھ سے پہلے کی

تفسیر:۔ اس میں کفار کے ایک شبہ کا ازالہ کیا ہے جو پہلی آیت سے پیدا ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر انسان غلط تعلیم دیتا ہے اور خدا کی کلام ہی سے ہدایت ملتی ہے تو چاہیئے تھا کہ سب کفار ہلاک ہو جاتے مگر وہ تو ہلاک نہیں ہوئے بلکہ دنیا میں کئی قسم کی ترقیاں ان کو ملتی ہیں معلوم ہوا کہ وہ بھی کوئی زیادہ غلطی پر نہیں ہیں یا یہ کہ وہ بھی حق پر ہیں اس شبہ کا یہ جواب دیا کہ کلام الٰہی کو تو خیر تم نہیں مانتے لیکن بعض امور کو تو تم بھی خدا تعالیٰ کے منشاء کے خلاف سمجھتے ہو۔ مثلاً چوری، ڈاکہ، قتل وغیرہ۔ کیا ان جرائم کے مرتکب فوراً پکڑ لئے جاتے ہیں۔ اگر نہیں تو اس ڈھیل کو دیکھتے ہوئے تم الٰہی کلام کے منکروں پر فوری گرفت نہ آنے کی وجہ سے یہ کس طرح استدلال کر سکتے ہو کہ یہ کلام خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ورنہ اس کے انکار پر فوراً گرفت ہوتی اور کوئی کافر نہ بچتا۔

(حاشیہ: آیت ما ترک علیہا من دابۃ سے کفار کے ایک شبہ کا ازالہ)

پھر اس فوری گرفت نہ ہونے کی وجہ بھی بتائی کہ یہ ڈھیل کا قانون اللہ تعالیٰ نے اس لئے جاری کیا ہے کہ اس کے بغیر نسل انسانی چل ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اگر ہر جرم کی سزا میں انسان کو فوراً تباہ کر دیا جاتا تو دنیا پر انسان کی نسل کس طرح باقی رہتی۔ اگر کوئی کہے کہ دنیا میں نیک بھی تو ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک نیک بھی ہوتے ہیں مگر یہ تو نہیں کہ نیکوں کے باپ دادا آدم تک سب نیک ہی ہوں پس اگر ان کے باپ دادوں کو پکڑا جاتا اور وہ ہلاک کر دئے جاتے تو ساتھ ہی ان کے وہ نسل بھی غائب ہو جاتی جس نے آئندہ کسی زمانہ میں نیک ہونا تھا۔ پس اگر ہر گناہ پر اس دنیا میں گرفت کا قانون جاری ہو تو ماننا پڑے گا کہ دنیا کبھی کی تباہ ہو جانی چاہیئے تھی مگر ایسا نہیں۔

(حاشیہ: فوری سزا نہ آنے کی وجہ)

معلوم ہوا کہ ہر گناہ کی سزا فوراً نہیں ملتی اور یہ مزید ثبوت یوم آخرت کا ہے جہاں جزاء سزا کا عمل تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ اگر اس دن کو نہ مانا جائے تو خدا تعالیٰ کا فیصلہ نامکمل رہ جاتا ہے۔

(حاشیہ: ہر گناہ کی سزا فوری نہیں ملتی)

ایک سوال اس آیت کے متعلق یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں فرمایا گیا ہے کہ اگر ہر گناہ پر اسی دنیا میں گرفت ہو جاتی تو اس دنیا کے پردہ پر کوئی حیوان نہ رہتا۔ مکلف تو انسان ہیں سزا ملتی تو انسان کو ملتی دوسرے حیوان کیوں ہلاک ہو جاتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ شروع سورۃ میں بیان کیا گیا ہے باقی حیوان انسان ہی کے فائدہ کے لئے پیدا کئے گئے ہیں پس جب انسان ہلاک کر دیا جاتا تو ان کی بھی ضرورت نہ رہتی اور عام قیامت آجاتی۔

(حاشیہ: آیت ما ترک پر ایک سوال اور اس کا جواب)

۵۶۳ حل لغات۔ تَصِفُ: وَصَفَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور وَصَفَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں نَعَتَهٗ بِمَا فِيْهِ وَحَلَّاهُ۔ کسی چیز کو پورے طور پر اور عمدہ طریق سے بیان کیا۔ وصف الطبیب المریض:

(حاشیہ: تَصِفُ)

اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ

(تمام) امتوں کی طرف رسول بھیجے تھے پھر انہیں شیطان نے ان کے (بد) اعمال خوبصورت

اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

کرکے دکھائے سو آج وہی ان کا آقا (بنا ہوا) ہے اور ان کے لئے (آج) دردناک عذاب (مقدر) ہے ۶۴

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ

اور ہم نے یہ کتاب تجھ پر اسی لئے اتارا ہے کہ جس (جس) بات کے متعلق انہوں نے (باہم) اختلاف

الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ

(پیدا) کر لیا ہے اس (کی اصل حقیقت) کو ان پر روشن کرے۔ اور (نیز) جو (اس پر) ایمان لائیں انکی رہنمائی کے لئے اور (ان پر) رحمت

یبیّن له ما یتداوی به۔ طبیب نے مریض کو علاج کے لئے دوا بتائی (اقرب) پس تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ کے معنے ہوں گے۔ ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں۔

انہم مفرطون کا مطلب

الحسنیٰ

الحسنیٰ کے معنے کیلئے دیکھو رعد ۱۹ یونس ۲۷

لاجرم

لاجرم کے معنے کیلئے دیکھو ھود ۲۲

مُفْرَطُوْنَ: افراط سے اسم مفعول مُفْرَطٌ آتا ہے اور مُفْرَطُوْنَ اس کی جمع ہے۔ افرط الامر کے معنی ہیں نَسِيَهٗ کسی بات کو بھول گیا۔ ترکهٗ و خَلَّفه۔ اسکو پیچھے چھوڑ دیا۔ افرط علیه: حمّله ما لا یطیق: اس پر اسکی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا۔ وما افرطتُ من القوم احداً کے معنے ہیں۔ ای ما ترکتُ میں نے لوگوں میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑا (اقرب) پس اَنَّهُمْ مُفْرَطُوْنَ کے معنے ہوں گے۔ انہیں اس میں چھوڑ دیا جائے گا۔

الولیّ

مفرطون

تفسیر:۔ اس آیت میں پہلے مضمون کی طرف پھر ایک اور رنگ میں رجوع کیا ہے۔ فرماتا ہے کہ یہ لوگ کس طرح یقین رکھتے ہیں کہ ان کا انجام اچھا ہوگا جبکہ اللہ تعالےٰ کی نسبت وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جن کو یہ خود بھی ناپسند کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالےٰ کی طرف عیب منسوب کرتے ہیں ان کا انجام کس طرح اچھا ہو سکتا ہے۔

وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح انہوں نے خدا تعالےٰ کو چھوڑ دیا ہے ان کو بھی اللہ تعالےٰ عذاب میں ڈال کر چھوڑ دے گا اور وہ خبر نہ لے گا۔

۶۴ حل لغات

۔ الوَلِيُّ کے معنے ہیں المُحِبّ والصدیق دوست اور محبت کرنیوالا۔ النصیر: مددگار۔ وکلّ من ولی امر احد فهو ولیّه۔ جس شخص کے تصرف میں کسی کا معاملہ ہو (اقرب)

تفسیر تَاللّٰهِ کے متعلق دیکھو نوٹ ۵۸ سورۃ نحل۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے نبیوں کے زمانے میں بھی شیطان نے انبیاء کے مخالفین کو یہ تسلی دیکر گمراہ کئے رکھا تھا کہ جو ہم کر رہے ہیں اس پر کوئی گرفت نہیں۔ یہی حال ان کا ہے یہ بھی اس قدر غلطیاں کرکے مطمئن بیٹھے ہیں اور جانتے نہیں کہ ایک دردناک عذاب ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ ○ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا

(نازل) کرنے کے لئے ۶۵ اور اللہ (تعالیٰ) نے (ہی) آسمان سے (عمدہ) پانی اتارا ہے اور اس کے ذریعہ سے اس نے تمام

بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

زمین کو اس کے مردہ ہو چکنے کے بعد (از سرِنو) زندہ کیا ہے۔ جو لوگ (حق بات کو) سنتے (اور اُسے قبول کرنے کیلئے تیار رہتے) ہیں

لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ○ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ ع ۱۴

ان کیلئے اسمیں یقیناً ایک (بہت بڑا) نشان (پایا جاتا) ہے ۶۶ اور تمہارے لئے چارپایوں میں (بھی) یقیناً

۶۵ تفسیر:- یعنی کلام الٰہی کے نزول کی ایک اور بھی ضرورت ہے کہ دنیا میں لوگوں میں اخلاقی اور مذہبی امور کے بارہ میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف بغیر اس کے کس طرح دور ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک یقینی علم حاصل ہو جائے۔ پس اس علم کے دینے کے لئے یہ کتاب نازل ہوئی ہے۔ اس کے سوا کون سی تعلیم دنیا کے اختلاف مٹا سکتی ہے۔ اگر دنیا کو معلوم ہو جائے کہ یہ کلام خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے تب تو وہ اپنے خیالات کو چھوڑ دیگی۔ اس کے بغیر وہ کس طرح اپنے خیالات کو چھوڑ سکتی ہے۔ کیونکہ طبعاً ہر شخص اپنے خیالات کو دوسروں کے خیالات پر ترجیح دیتا ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تم کو پہلے نبیوں کے بعد دوسرے نبی کے آنے پر اعتراض ہے۔ دوسرا نبی تو خود تمہارے اعمال کی وجہ سے آیا ہے تم نے سچائی کو چھوڑ کر اختلاف کیوں کیا۔ تم اختلاف نہ کرتے تو بے شک نبی کی ضرورت نہ ہوتی مگر تم نے مرض تو پیدا کر لی اب کہتے ہو کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے کسی اختلاف کو دور کرنے والے شخص کی آمد کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا مضمون پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ فرض کرو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر ہی عمل کرتے رہتے اور اختلاف نہ کرتے تو کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کامل شریعت یا کامل تعلیم نہ آتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فرضی کلام ہے۔ حقیقتاً نہ اختلاف کرنے سے لوگوں نے رُکنا تھا اور نہ اس تعلیم کے آنے میں روک پیدا ہونی تھی۔ مگر بفرضِ محال ایسی صورت ہوتی بھی۔ تو اللہ تعالےٰ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل ع) اگر دنیا میں سب فرشتے ہی فرشتے ہوتے یعنی سب کے سب انسان نیک ہوتے تو ہم ان میں سے ہر ایک شخص پر اپنا کلام نازل کرتے یعنی اس صورت میں ایک نبی قوم کی طرف نہ بھیجا جاتا بلکہ سب ہی نبی ہو جاتے اور انکار اور کفر کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ مگر نہ دنیا سب کی سب نیک بنی نہ خدا تعالےٰ نے نبیوں کے سلسلہ کو بند کیا۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ میں مضمون کے دوسرے پہلو کو لیا کہ جو اختلاف کرتے ہیں ان کے لئے تیرا یہ کام ہے۔ کہ قرآن کریم کے رُو سے ان کے اختلاف دُور کرے اور جو مومن ہیں ان کے لئے ترقیٔ مدارج اور رحمت کے حصول کا ذریعہ اس قرآن کو بنائے۔

۶۶ تفسیر:- اس جگہ پانی سے مراد کلام الٰہی ہے۔ کیونکہ پانی کے نزول کے ذکر کے بعد لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ فرمایا ہے۔ یعنی اس پانی کے نزول میں سننے والوں کے لئے نصیحت ہے۔ مادی پانی کے نزول

۱ کلام الٰہی کے نزول کی ضرورت

۲ انبیاء کی بعثت کی ضرورت

۳ پانی سے مراد کلام الٰہی

لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ

نصیحت حاصل کرنے کا ذریعہ (موجود) ہے (کیا تم دیکھتے نہیں کہ) جو کچھ ان کے پیٹوں میں (گند وغیرہ بھرا) ہوتا ہے اس میں سے یعنی گوبر

وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ○ وَمِنْ

اور خون کے درمیان سے ہم تمہیں پینے کیلئے (پاک اور) صاف دودھ (مہیا کر) دیتے ہیں جو (اسکے) پینے والوں کیلئے خوشگوار (بھی) ہوتا ہے ۶۷ اور

آیت وانزل من السماء میں ماءً سے مراد الہام الٰہی کے نزول کا ثبوت آنے کے انداز ہی ہے۔

میں سُننے والوں کے لئے نشان نہیں ہوتا۔ بلکہ دیکھنے والوں یا سمجھنے والوں یا غور کرنے والوں کے لئے نشان ہوتا ہے۔ سننے کے لفظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روحانی پانی یعنی کلام الٰہی مراد ہے اور پہلے نبیوں کی وحیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالےٰ کئی دفعہ آسمان سے روحانی پانی اتار چکا ہے اور اس کے ذریعے سے دنیا کو زندہ کر چکا ہے اگر تم پہلے انبیاء کے حال سُنتے تو ضرور اس صداقت کو تسلیم کرتے۔

احیا بہ الارض سے ھدیٰ و رحمۃ ہونے کا دلیل

اَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ سے وَهُدًى وَّرَحْمَةً کی دلیل دی کہ یہ کلام کیوں مسلمانوں کے لئے رحمت اور ہدایت ثابت نہ ہوگا جبکہ سابق کلام مردہ قوموں کو زندہ کرتے چلے آئے ہیں۔ جو اس وقت ہوا وہی اب بھی ہوگا۔

الانعام ۔ فرث ۔ سائغا

۶۷ حل لغات ۔ اَلْاَنْعَامُ: اَلنَّعَمُ: الْاِبلُ والشَّاءُ وقیل خاصٌّ بالابل۔ نعَم کا لفظ اونٹ اور بکریوں پر بولا جاتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ صرف اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ وقال فی المصباح النَّعَمُ: المال الراعی وھو جمعٌ لا واحد لہ من لفظہ واکثر ما یقع علی الابل۔ اور مصباح میں یوں لکھا ہے۔ کہ نَعَم چرنے والے جانوروں کو کہتے ہیں۔ اور لفظ نَعَم جمع ہے اور اس کے مادہ (ن۔ع۔م) سے

انعام میں عبرت

اس کا کوئی مفرد نہیں (جیسے عربی میں نسوۃ کا لفظ ہے جس کے معنے عورتوں کے ہیں۔ اس کا مفرد اس کے مادہ میں سے نہیں آتا۔ ہاں مفرد کے لئے اِمْرَاۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے) وقال ابو عبید النَّعَمُ: الجمالُ فقط یؤنَّثُ ویذکَّر۔ اور ابو عبید کہتے ہیں کہ نَعَم کا لفظ صرف اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ اور یہ نر اور مادہ دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع اَنعام ہے وقیل النَّعَم الابل خاصۃً والانعام ذوات الخفّ والظِّلف وھی الابل والبقر والغنم۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ نَعَم کا لفظ اونٹوں کے لئے خاص ہے لیکن انعام میں اونٹ بھیڑ اور گائے سبھی شامل ہیں۔ وقیل یطلق الانعام علی ھٰذہ الثلاثۃ فاذا انفردت الابل فھی نَعَم۔ وان انفردت الغنم والبقر لم تسمّ نَعَمًا اور بعض کے نزدیک انعام کا لفظ بھیڑ اونٹ اور گائے کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ اور اگر اونٹوں کو ان سے علیحدہ کیا جائے تو اونٹوں کے لئے نَعَم کا لفظ بولا جائے گا مگر صرف گائے بھیڑ بکریوں کو نَعَم نہیں کہیں گے۔ (اقرب)

فرث: السرجین مادام فی الکرشِ۔ گوبر جب وہ اوجھڑی میں ہو فرث کہلاتا ہے۔ (اقرب)

سائغًا: السائغ: السّہلُ المدخلِ من الطعام والشّراب۔ کھانے پینے کی آسانی سے حلق سے اُترنے والی اشیاء سائغ کہلاتی ہیں (اقرب)

تفسیر:- یہ فرما کر کہ چارپایوں میں بھی تمہارے لئے عبرت ہے کیا لطیف بات بیان فرمائی ہے۔ چارپائے غذا کے طور پر بھی کام آتے ہیں۔ ان میں سے دودھ بھی لیا جاتا ہے۔ ان کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انعام اسباب اٹھانے کے بھی کام آتے ہیں۔ عرب میں زیادہ تر اونٹ اس کام آتے تھے کیونکہ وہاں گائے بیل کم

ہوتے ہیں۔ لیکن دوسرے ملکوں میں بیل بھی بوجھ اٹھا کر لے جانے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ رہ گئیں بکریاں اور بھیڑیں سو بعض پہاڑی ملکوں میں ان سے بھی اسباب اٹھانے کا کام لیا جاتا ہے خصوصاً جبکہ سفر اونچے پہاڑوں کا ہو تو ان جانوروں پر تھوڑا تھوڑا اسباب لاد کر گلّہ بانی والے کرایہ کا فائدہ بھی اٹھا لیتے ہیں۔ میں نے کانگڑہ میں دیکھا ہے کہ لاہول کے پہاڑوں پر سے آنے والے گڈریے اپنے اسباب کثرت سے بھیڑوں پر لاد کر لاتے ہیں۔ سینکڑوں بھیڑوں پر دس دس۔ بیس بیس سیر اسباب لدا ہوا عجیب لطف دیتا ہے۔ پس سب انعام ہی اسباب اٹھانے کا کام دیتے ہیں۔ پس عبرۃ کا لفظ جو عبور سے نکلا ہے جس کے معنے سفر کے بھی ہوتے ہیں۔ اسے استعمال کر کے اس طرف اشارہ فرمایا کہ جانوروں سے سفروں میں کام لیتے ہو وہ تم کو اور تمہارے اسباب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جاتے ہیں مگر ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ یعنی اپنے ذہنوں کے سفر میں ان سے مدد نہیں لیتے اور ان کی حالت پر غور کر کے اس زیر بحث مسئلہ میں جہالت کے ملک سے علم کے ملک کی طرف سفر نہیں کرتے۔

عِبْرَۃً کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایک چیز کو دیکھ کر دوسری اسی کے مشابہ چیز کی طرف ذہن کا انتقال کیا جائے اور پہلی پر قیاس کر کے دوسری کو سمجھا جائے۔ پس جانوروں کے ذکر میں عبرۃ کا لفظ استعمال فرما کر ایک عجیب پر لطف مضمون پیدا کر دیا گیا ہے۔

وہ عبرۃ کیا ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ خود ہی اگلے الفاظ میں بیان فرما دی ہے اور وہ یہ ہے کہ چارپائے گھاس پتے کھاتے ہیں جس سے گوبر بنتا ہے پھر گوبر میں سے ایک حصہ خون بنتا ہے اور اس خون کا ایک حصہ دودھ بن جاتا ہے جسے انسان مزے لے کر پیتا ہے اور وہ ایسا خالص ہوتا ہے کہ کوئی نفاست پسند انسان بھی اس کے پینے میں کراہت محسوس نہیں کرتا۔ حالانکہ دودھ پہلے خون تھا اور خون اس فضلہ سے بنتا ہے جو غذا سے جانور کے معدہ میں تیار ہوتا ہے اور وہاں سے انتڑیوں میں جا کر باریک عروق کے ذریعہ سے دل کی طرف لے جایا جاتا ہے جہاں جاتے ہی وہ خون بن جاتا ہے اور خون تھنوں میں آ کر دودھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

انعام کا بوجھ اٹھانے کے لئے کام میں استعمال ہونا

اس آیت میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہی گھاس اور پتے جن کو انسان استعمال نہیں کر سکتا جانور کے پیٹ میں جا کر گوبر بنتے ہیں اور اس سے خون بنتا ہے اور اس سے دودھ۔ اور وہ دودھ خالص ہوتا ہے کوئی گندگی اس میں نہیں ہوتی اور پینے میں مزہ دار ہوتا ہے۔ اس گھاس کو انسان اس جانور سے باہر دودھ کی شکل میں تبدیل نہیں کر سکتا لیکن اللہ تعالیٰ اس کو لے کر جانور کے ذریعہ سے دودھ بنا دیتا ہے اس سے انسانوں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیئے کہ وہی فطرتی تعلیم جس پر چل کر انسان یقین کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا اور ہزاروں گند اور نقص اس میں پائے جاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی روحانی مشین میں سے گذرتی ہے تو مصفّٰی دودھ کی طرح ہو جاتی ہے جس سے کسی قسم کا نقصان روحانی صحت کو نہیں پہنچ سکتا بلکہ ہر طرح فائدہ پہنچتا ہے۔ پس جانوروں کے اندر جو دودھ بنتا ہے اس سے یہ لوگ کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور نہیں سمجھتے کہ انسان کی سچی غذا فطرت کے میلان تب ہی بن سکتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ ان کو روحانی دودھ کی شکل میں بدل دے۔ اور یہ کام انسان خود نہیں کر سکتا۔ جو گھاس کو دودھ میں تبدیل نہیں کر سکتا وہ فطرت کے ان گھڑے جذبات کو اعلیٰ تعلیم میں کب تبدیل کر سکتا ہے؟

گھاس پتوں سے دودھ بننے کے ذکر سے روحانی تعلیم کے صاف کرنے کی طرف اشارہ

عبرۃ کے معنے

اس آیت میں ایک لفظی اشکال بھی ہے اور وہ یہ کہ بطونہٖ میں مفرد کی ضمیر ہے اور ماقبل اس کے اَنعام جمع کا لفظ ہے۔ مفسرین نے اس کے دو جواب دئے ہیں۔ ایک یہ کہ مفرد کی ضمیر معنًی پھرائی گئی ہے اور مراد یہ ہے کہ جس چیز کا ہم نے ذکر کیا ہے یعنی انعام۔ اس کے پیٹ میں مذکورہ طریق سے دودھ بنتا ہے گویا ضمیر انعام کی طرف نہیں بلکہ ماذُکر یا ماذکرناہ کی طرف ہے اور ما کی طرف خواہ وہ جمع کے لئے ہو مفرد کی ضمیر پھیرنی جائز ہے۔

اس آیت میں ایک لفظی اشکال

دوسری تاویل مفسرین یہ کرتے ہیں کہ کبھی جمع کا لفظ بول کر اس کی طرف مفرد ضمیر اس اشارہ کے لئے لاتے ہیں کہ

مختلف مفسرین کے نزدیک لفظی اشکال کی تاویل

ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا

کھجوروں کے پھلوں اور انگوروں سے (بھی کہ) جن سے تم شراب (بھی) بناتے ہو

اس کے ہر فرد یا اس کی ہر قسم کے ساتھ یہ معاملہ گذرتا ہے۔ یہ دونوں تاویلات درست ہیں اور عربی قواعد کے مطابق ہیں۔

یہ آیت اس امر پر بھی شاہد ہے کہ قرآن کریم کا نازل کرنے والا دنیا کا خالق بھی ہے۔ کیونکہ اس میں دودھ کے پیدا ہونے کا وہ طریق بتایا گیا ہے جو اس وقت دنیا کو معلوم نہ تھا اور بعد میں دریافت ہوا ہے۔ اور وہ یہ کہ غذا معدہ میں سے انتڑیوں میں آتی ہے اور اس سے فرث تیار ہوتا ہے اسی فرث سے ایک مادہ خون بن جاتا ہے اور اس خون سے دُودھ بنتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو نزول قرآن کے بعد کی تحقیق سے ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ بعد کے مفسرین نے ابتدائی مفسرین کی غلطی کو پیش کر کے ظاہر کیا ہے کہ درحقیقت فرث سے خون اور خون سے لبن بنتا ہے۔ مگر جو تشریح انہوں نے بیان کی ہے وہ بھی پوری طرح سائنس کے مطابق نہیں لیکن قرآن کریم کے الفاظ سائنس کی موجودہ تحقیق کے بالکل مطابق ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ غذا معدہ سے انتڑیوں میں جاتی ہے وہاں سے اس کا منہضم لطیف حصہ بعض عروق کے ذریعہ سے ایک حصہ سیدھا دل تک جاتا ہے اور وریدوں میں گر کر فوراً خون بن جاتا ہے اور ایک اَور لطیف حصہ معدہ سے براہ راست جگر میں جا کر وہاں سے وریدوں کے ذریعہ دل میں گر کر خون بن جاتا ہے۔ پھر یہ خون جب تھنوں کے قریب جاتا ہے تو وہاں اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کئے ہیں کہ وہ خون وہاں جا کر دودھ بن جاتا ہے۔

سائنس کی جدید تحقیق دودھ بننے کے متعلق قرآن مجید کے بیان کے مطابق ہے۔

اس حقیقت سے پُرانے زمانہ کے لوگ ایسے ناآشنا تھے کہ مفسرین نے اس آیت کے معنے کرنے میں سخت مشکلات محسوس کی ہیں اور رائج الوقت خیالات کے مطابق یہ سمجھا ہے کہ شاید فرث اور خون کے بننے کے درمیان کوئی تغیر ایسا ہوتا ہے جس سے دودھ بنتا ہے۔ چنانچہ صاحب کشاف لکھتے ہیں کہ جب غذا جانور کے معدہ میں جاتی ہے تو اس کا نچلا حصہ گوبر بن جاتا ہے اور درمیانی حصہ دودھ بن جاتا ہے اور اوپر کا حصہ خون بن جاتا ہے۔ حالانکہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ فرث اور خون میں سے ہوتے ہوئے دودھ کا مادہ آتا ہے یعنی پہلے فرث کی حالت ہوتی ہے پھر خون کی پھر دودھ کی۔ اور ان پہلی دو چیزوں میں سے کسی کو بھی انسان خوشی سے کھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ نہ گوبر کھانے پر راضی ہو سکتا ہے اور نہ خون پینے پر خوشی سے تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن جب وہی خون دودھ بن جاتا ہے تو اسے خوب مزے لے کر پیتا ہے اور اس میں فرث کی گندگی اور خون کے زہروں میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

پرانے زمانہ کے لوگوں کی دودھ کے بننے کے طریق سے ناواقفیت

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی تھوڑی سی مقدار میں بھی دودھ نہیں بنا سکتا۔ ممکن ہے کسی وقت لوگ کچھ دُودھ بھی بنا لیں۔ لیکن اس طرح ساری دنیا کو غذا نہیں پہنچا سکتے۔ یوں تو لوگ گیسوں سے پانی بھی بنا لیتے ہیں۔ لیکن وہ چند قطرے پانی کے بادلوں کا کام نہیں دے سکتے۔ اسی طرح اگر کسی وقت کوئی شخص گھاس پات سے دودھ بھی بنا لے تو تعجب نہیں۔ مگر دنیا کو غذا دینے کا کام پھر بھی جانوروں کے سپرد ہی رہے گا جس طرح پانی مہیا کرنے کا کام بادلوں کے سپرد ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان غذا کو گندہ تو کر سکتا ہے لیکن اسے دُودھ نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح انسان انبیاء کی تعلیم کو لے کر خراب تو کر دیتے ہیں لیکن انسان دماغوں میں پائی جانے والی غیر مصفّٰے فطرتی صداقتوں کو مصفّٰے اور اعلیٰ روحانی تعلیم نہیں بنا سکتے۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

اور اچھا رزق (بھی) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے اس میں یقیناً ایک بڑا نشان (پایا) جاتا ہے ۶۸

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ

اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف (بھی) وحی کی (جو یہ تھی) کہ تو پہاڑوں میں اور درختوں میں

الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝

اور جو (انسان انگوروں وغیرہ کے لئے) ٹیک بناتے ہیں۔ ان میں (اپنے) گھر بنا ۶۹

۶۸ حل لغات۔ النَّخِیْل: نخل کی جمع ہے اور یہ مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ لیکن نخل کا لفظ مؤنث مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنے ہیں کھجور کے درخت (اقرب)

الاعناب: عِنَبٌ کی جمع ہے اور عِنَبٌ کے معنے ہیں ثمر الکرم وھو طریٌّ۔ فاذا یبس فھو الزبیبُ یعنی عنب تازہ انگوروں کو کہتے ہیں جب وہ خشک ہو جائیں تو وہ زبیب (منقّہ) کہلاتے ہیں (اقرب)

سکرًا: الخمر: شراب۔ نبیذٌ یتخذ من التمر والکشوث۔ کھجوروں کا رس۔ کل ما یُسکر۔ ہر نشہ آور چیز الخل۔ سرکہ۔ الطعام۔ کھانا (اقرب)

تفسیر:۔ اس آیت میں بعض مفسرین نے سکر کے معنے شراب کے کئے ہیں۔ پھر ان کو یہ مشکل پڑی ہے کہ اس آیت میں سکر کو تو اللہ تعالےٰ نے اِنعام کے طور پر ذکر فرمایا ہے حالانکہ شراب ناجائز ہے۔ اس پر انہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ یہ آیت اس وقت کی نازل شدہ ہے جبکہ شراب جائز تھی۔ اور یہ جواب دے کر انہوں نے اس آیت کو منسوخ قرار دے دیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس مشکل کو مدنظر رکھتے ہوئے سکر سے کھانا مراد لیا ہے۔ ان معنوں پر دوسرے علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر یہ معنے ہوں تو آیت میں تکرار واقع ہو جائے گا۔ کیونکہ آگے وَرِزْقًا حَسَنًا بھی بیان فرمایا ہے اس کا انہوں نے یہ جواب دیا ہے کہ سکر کے لفظ میں لذت مدنظر رکھی ہے اور رزق میں غذائیت مدنظر رکھی ہے۔ یہ سب مشکل ان کو اس لئے پڑی ہے کہ انہوں نے جواز اور عدم جواز کا مسئلہ اس جگہ سے نکالنا چاہا ہے۔ حالانکہ خدا تعالےٰ نے اس جگہ بات ہی یہ بتانا چاہتا ہے کہ بسا اوقات ہماری پیدا کردہ طیب چیزوں میں جب تم تصرف کرتے ہو تو اُسے گندہ کر دیتے ہو۔ وہی چیز جو تازہ ہونے کی حالت میں پاک ہوتی ہے جب تم اس میں تغیر کرتے ہو تو کیسی گندی ہو جاتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ — ان الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا کہ عقلمند سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جس چیز کو جس غرض سے بناتا ہے اس میں تغیر کرنا اس کی اصلاح کا موجب نہیں ہوتا۔ بلکہ خراب کرنے کا موجب ہوتا ہے پس نہ تو انسان خود روحانی تعلیم بنا سکتا ہے نہ اُسے یہ اختیار ہے کہ خدا تعالےٰ کی بھیجی ہوئی تعلیم میں کسی قسم کا دخل دے اور اُسے اس مقصد سے پھرا دے جس کے لئے وہ نازل ہوئی ہے ورنہ ضرور خرابی پیدا ہو جائے گی۔

۶۹ تفسیر:۔ وحی الٰہی کی ضرورت کے متعلق یہ تیسری مثال بیان فرمائی ہے اور اس میں پہلی دو مثالوں سے بھی زیادہ وضاحت ہے۔

یہاں فرمایا ہے کہ ہم نے نحل یعنی شہد کی مکھی کی طرف بھی اس کے ظرف کے مطابق ایک وحی کی ہے اور وہ یہی

النخیل

تتخذون منه سکرا کا مطلب

الاعناب

سکرا

مفسرین کے نزدیک سکر کے معنی شراب

وحی الٰہی کی ضرورت کے متعلق تیسری مثال

یہ ہے کہ پہاڑوں پر یا درختوں پر یا عرشوں پر گھر بنا۔ یہ وحی استعدادِ باطنی ہے جو شہد کی مکھی میں پیدا کی گئی ہے اور اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمام کائنات کا کارخانہ وحی الٰہی پر چل رہا ہے۔ کسی پر وحی خفی نازل ہوتی ہے، کسی پر وحی جلی۔ مگر بہرحال سب کارخانہ وحی پر چل رہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقتوں اور میلانوں پر چل کر ہی ہر چیز اپنا صحیح فرض ادا کرتی ہے۔ اگر اس طریق کو چھوڑ دے تو کبھی اپنا فرض اچھی طرح ادا نہ کر سکے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی وحی بہت وسیع ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ کے بعد وحی نہیں آسکتی حالانکہ اس آیت سے جانوروں کو بھی وحی ثابت ہوتی ہے۔ اس وحی سے instinct یعنی طبعی میلانوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس قسم کی وحی عارضی طور پر انسان کو بھی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ یکدم اس کو کوئی خیال آتا ہے جو اس کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام موجد یہی کہتے ہیں کہ اکثر ایجادوں کا خیال ان کے دل میں یکدم پیدا ہوا یا ایجاد کا خیال تو علمی تحقیق کے سلسلہ میں پیدا ہوا لیکن کئی درمیانی مشکلات کا حل ایک فوری ذہنی لہر کے پیدا ہونے سے حاصل ہوا۔

ایڈیسن جو سب سے بڑا موجد ہے۔ اس نے اپنے متعلق صاف لکھا ہے کہ میں نے ایک ہزار ایجاد کی ہے ان میں سے سب بڑی ایجادیں ایک فوری خیال کی بناء پر ہوئی ہیں۔ درحقیقت یہی وہ کیفیت ہے جسے صوفی لوگ الہام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

جانوروں کی تحقیقات میں سے شہد کی مکھی اور چیونٹی کی تحقیقات بہت وسیع ہوئی ہے۔ اس تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ چیونٹیوں میں بہت بڑا بھاری نظام ہوتا ہے۔ یہ ہاتھوں سے بات کرتی ہے۔ انسان کی طرح اپنی لاش کی حفاظت کرتی ہے۔ غلے کا ڈھیر رکھتی ہے۔ سردی اور گرمی کے مکانات علیحدہ علیحدہ رکھتی ہے۔ چوپائے بناتی ہے۔ ایک قسم کا کیڑا ہے جس میں سے ایک مادہ نکلتا ہے جو چیونٹی کے لئے دودھ کا کام دیتا ہے ان کیڑوں کو یہ جمع کر کے اپنے گھروں میں رکھتی ہیں اور ان کی غذا کا خیال رکھتی ہیں اور جب غلّہ میں کمی ہو تو تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ان کیڑوں کو پہلے غذا دیتی ہیں۔ پھر بچ رہے تو خود کھاتی ہیں۔ ان میں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں، صلح بھی ہوتی ہے۔ غرض ایک وسیع نظام ان میں پایا جاتا ہے یہ سب ایک قسم کی وحی خفی کے نتیجہ میں ہے۔

اسی طرح نحل کا بھی بڑا عظیم الشان نظام ہے بعض ماہروں کا خیال ہے کہ انسانوں کے نظام سے ان کا نظام بہتر ہوتا ہے۔ ان کا احساس بعض باتوں میں انسان سے زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے ہر چھتہ میں ایک ملکہ ہوتی ہے۔ سب مکھیاں اس کی پیروی کرتی ہیں۔ ان کی نسلیں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں انسانوں کی طرح سب مل کر نہیں رہتیں۔ جب نئی ملکہ پیدا ہوتی ہے تو پرانی مکھیاں اس کو مارنا چاہتی ہیں تو ساری نئی جوان مکھیاں اس کا پہرہ دیتی ہیں اور مل کر اس کی حفاظت کرتی ہیں وہ ملکہ بڑی ہو کر اپنے ساتھیوں سمیت علیحدہ چھتہ بناتی ہے۔ پھر ملکہ لڑائی کر کے یا تو پہلی بڑی مکھیوں کو پہلے چھتہ سے نکال دیتی ہے یا شکست کھا کر دوسری جگہ پر چلی جاتی ہے۔ ان کے نظام کی اور بھی تفصیلات ہیں جو حیرت انگیز ہیں۔ خدا تعالیٰ نے نحل کے ذکر کو اس لئے چنا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ ایک بالا ہستی ہے جس نے اسے یہ علم دیا ہے اور اس کو ایسا نظام دیا ہے جو خود اس کا سوچا ہوا نہیں ہے۔ نیز اس مثال کو اس لئے چنا ہے کہ شہد کی مکھی کا نظام معمولی غور سے نظر آجاتا ہے اور اس لئے بھی کہ اس سے ایک ایسی غذا پیدا ہوتی ہے جسے انسان نے بہترین سمجھا ہے۔ اس نظام کا اس میں پایا جانا یہ بتاتا ہے کہ اس میں عقل ہے۔ مگر اس کا ایک ہی حالت میں رہنا اور ترقی نہ کر سکنا یہ بتاتا ہے کہ وہ نظام اس کو کسی اور ہستی نے دیا ہے اور باہر سے آیا ہے اس نے خود وہ نظام تیار نہیں کیا۔

اس آیت میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ نحل

تمام کائنات کا کارخانہ وحی الٰہی پر چل رہا ہے۔

خدا تعالیٰ کی وحی کی وسعت

شہد کی مکھیوں کا نظام اور اس کے ذکر کی وجہ

ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ

پھر ہر قسم کے پھلوں میں سے (تھوڑا تھوڑا لیکر) کھا اور اپنے رب کے (بتائے ہوئے) طریقوں پر جو (تیرے لئے) آسان (کئے گئے)

ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ

ہیں چل۔ ان (مکھیوں) کے پیٹوں سے (تمہارے) پینے کی ایک (لطیف) چیز نکلتی ہے جو مختلف

اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

رنگوں کی ہوتی ہے (اور) اس میں لوگوں کیلئے شفاء (کی خاصیت رکھی گئی) ہے۔ جو لوگ سوچ (اور فکر) سے کام لیتے ہیں ان کے لئے

لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ

اس میں یقیناً کئی نشان (پائے جاتے) ہیں ۵ اور اللہ (تعالیٰ) نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر وہ تمہاری روحیں قبض کرتا ہے

یعنی شہد کی مکھیاں بھی مختلف قسم کی ہیں۔ بعض پہاڑوں میں چھتے بناتی ہیں، بعض میدان کے درختوں پر اور بعض گھروں یا ان عرشوں پر جو انگور وغیرہ کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسانوں میں سے مَوردِ وحی بھی ایک سے نہیں ہوتے۔ بعض کا مقام پہاڑ پر ہوتا ہے بعض کا درخت پر اور بعض کا چھتوں اور عرشوں پر۔ یعنی بعض بہت اونچے مقام کے ہوتے ہیں بعض اُن سے ادنیٰ اور بعض ان سے ادنیٰ۔ اس میں گویا اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے جو آیت تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (بقرہ ع ۳۳) میں بیان کیا گیا ہے۔

حل لغات۔

اُسْلُكِيْ: سلك سے امر مؤنث مخاطب واحد کا صیغہ ہے۔ اور سَلَكَ المكانَ سلكًا کے معنے ہیں۔ دخل فیہ۔ وكذالك الطريقَ دخلہٗ۔ سار فیہ متبعًا ايّاهُ۔ کسی جگہ میں داخل ہوا۔ یا کسی راستہ پر چلا۔ اس سے اسم فاعل سالكٌ آتا ہے (اقرب) مزید تشریح کیلئے دیکھو حجر ۵۱۳

ذُلُلًا: ذلول کی جمع ہے۔ اور ذلول ذَلَّ يذِلّ ذُلًّا و ذِلًّا) سے صیغہ صفت ہے اور ذلّ البعير کے معنے ہیں۔ ضد صَعُبَ۔ اس کا کام میں لانا آسان ہو گیا۔ کہتے ہیں۔ ذلّت لہ القوافي ای سهلت۔ قافیے اس کے تابع ہو گئے ہیں اور شعر بنانا اس کے لئے آسان ہو گیا۔ پس ذلول کے معنے ہوں گے۔ آسان (اقرب) آیت فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا میں ذُللاً کے معنے ہیں منقادة غیر متصعبة۔ آسان جو مشکل نہ ہو (مفردات) پس فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا کے معنے ہوں گے کہ اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقوں پر جو تیرے لئے آسان کئے گئے ہیں چل۔ اَلْوَانٌ کے لئے دیکھو نحل ۵۱۴

تفسیر: اس میں مکھی کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مکھی کو ہم یہ وحی بھی کرتے ہیں کہ مختلف پھلوں پھولوں سے غذا لے اور پھر اس کو ان ذرائع سے کام لیکر جو ہم نے تیرے اندر پیدا کئے ہیں اور احکام الٰہی کے مطابق چل کر شہد تیار کر۔ پھر فرماتا ہے کہ جب وہ شہد نکلتا ہے تو وہ مختلف رنگوں اور مختلف قسموں کا ہوتا ہے۔ مگر سب قسموں کے اور سب رنگوں کے شہدوں میں یہ خاصیت مشترک ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے شفا کا موجب ہوتے ہیں۔

الوان

اسلکی

ذُللاً

آیت ان اغذیٰ الیا بہوتا ہے انسانو کے مختلف درجے میں مورد وحی ہونے کی طرف اشارہ

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ

اور تم میں سے بعض (بعض آدمی) ایسا ہوتا ہے کہ وہ عمر کی بدترین حالت کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ علم (والا ہونے) کے

بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ ع ۹ / ۱۵

بعد پھر بےعلم ہو جاتا ہے۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت جاننے والا (اور) ہر بات پر پورا (پورا) قادر ہے ۔ ۵۷ ۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ

اور اللہ (تعالیٰ) نے رزق میں (بھی تو) تم میں سے بعض کو بعض سے بڑھایا (ہوا) ہے۔

من فی ذالک خفیہ میں مختلف وحی کے بغیر کسی کام کے نہ چل سکنے کی طرف اشارہ

اس میں انسانی وحی کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ وحی بھی مختلف وقتوں اور مختلف رنگوں میں نازل ہوتی رہی ہے ایک نبی کی تعلیم دوسرے نبی کی تعلیم سے بعض باتوں میں مختلف ہوتی تھی لیکن باوجود اس کے ہر نبی کی وحی اس قوم کے لئے جس کے لئے وہ نازل ہوتی تھی شفاء کا موجب ہوتی تھی۔

فاسلکی سبل ربک سے انسان کے صاحب وحی ہو سکنے کی طرف اشارہ

فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر انسان صاحب وحی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق پر فرمانبرداری سے چلے اور جہاں تک فطرت کا تعلق ہے اُسے خراب نہ ہونے دے۔ جب وہ اپنی فطرت کو پاک رکھے اور اس وحی پر عمل کرے جو وحی خفی کے رنگ میں ہر انسان بلکہ ہر مخلوق پر نازل ہوتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ اس پر وہ وحی نازل کرتا ہے جو شہد کی مانند ہوتی ہے۔ یعنی خالص ہوتی ہے۔ اور اس میں بنی نوع انسان کیلئے

کلام الٰہی بھی شہد کی طرح شفاء کی تاثیر رکھتا ہے۔

شفاء کی خاصیت ہوتی ہے۔ یعنی انسانی کمزوریوں کو دور کرکے انسان کو کامل بنا دیتی ہے۔

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ـــ

اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بغیر وحی الٰہی کے دنیا میں کوئی کام نہیں چلتا۔ جو انسان کہتا ہے کہ میں خود ہدایت کا کام کر لوں گا وہ غلطی پر ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس مضمون پر خاص زور دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ انسانی کوشش دنیوی امور میں بمنزلہ دعا کے ہے اور اس کے نتیجہ میں انسان کے ذہن میں جو تدبیر آتی ہے وہ بھی وحی ہے۔ غرض مکھی کی مثال سے یہ بتایا ہے کہ کلام الٰہی کے بغیر کامیاب زندگی ناممکن ہے حتیٰ کہ جانور بھی وحی کے محتاج ہیں اور ان پر ایک قسم کی وحی نازل ہوتی ہے جس کی نمایاں مثال شہد کی مکھی میں پائی جاتی ہے۔ پس جبکہ موجودات کے ہر طبقہ کے لئے خدا نے وحی نازل کی ہے حالانکہ ان کی زندگی محدود اور عقل مختصر ہے۔ تو انسان جس کی زندگی کا اثر اگلے جہان پر بھی پڑتا ہے اس کا نظام بغیر وحی کے کس طرح چل سکتا ہے۔

قرآن کریم کے متعلق متعدد جگہ وہی الفاظ آئے ہیں جو شہد کے بارہ میں اس آیت میں آئے ہیں اور ان سے یہ بتایا ہے کہ یہ کلام اپنے اندر وہی خاصیت رکھتا ہے جو وحی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے یعنی شفاء کی تاثیر۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل رکوع ۹ میں فرماتا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ سورۃ یونس رکوع ۶ میں فرماتا ہے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ۔ پھر حٰم سجدہ رکوع ۵ میں فرماتا ہے قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۔

ارذل

۷۱ **حل لغات** - اَرْذَلُ الْعُمُرِ : ارذل کے معنے ہیں۔ الدُّوْنُ فی منظرہ وحالاتہ۔ اپنے حالات اور منظر میں حقیر۔ الرَّدِیُّ من کل شیءٍ۔ ہر چیز کا ردی حصہ۔

فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا

پھر جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنا (مقبوضہ) رزق (کسی صورت میں بھی تو) ان کی طرف جن پر

مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ط اَفَبِنِعْمَةِ

ان کے داہنے ہاتھ قابض ہیں لوٹانے والے نہیں تا وہ اس میں برابر کے حصہ دار ہو جائیں۔ پھر کیا وہ (اس حقیقت کے جاننے کے

ارذل العمر: أخره فی حال الکبر والعجز بڑھاپے اور کمزوری میں عمر کا آخری حصہ۔ عمر کی بدترین حالت (اقرب) پس وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ کے معنے ہونگے کہ تم میں سے بعض ایسے ہیں جو عمر کی بدترین حالت کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔

تفسیر:۔ پچھلے رکوع میں تو اس بات کا ذکر تھا کہ تمہارے معبود کلام الٰہی نہیں بنا سکتے۔ اس رکوع میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ تم خود بھی کلام نہیں بنا سکتے۔ اب اسی سلسلہ میں ایک عام بات بیان فرمائی کہ کامل کلام تو وہ بنا سکتا ہے جس کے قبضہ میں پیدائش اور موت کا اختیار ہو۔ پھر اپنی عقل پر بھی اُسے قبضہ حاصل ہو۔ پس انسان کلام تیار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نہ اس کے قبضہ میں پیدائش ہے کہ وہ اپنی تعلیم کے مطابق خاصیتیں دوسرے انسانوں میں رکھ دے نہ اس کے قبضہ میں موت ہے کہ وہ بعد الموت زندگی کے سامان پیدا کر سکے۔ نہ اس کے قبضہ میں عقل ہے کہ وہ ایسے وجود بنی نوع انسان کی تعلیم کے لئے مقرر کر سکے جن کی عقل ہمیشہ سلامت رہے۔ کئی حکومتیں بہترین دماغ کے انسان چن کر پروفیسر مقرر کرتی ہیں لیکن وہ بوڑھے ہو کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب یہ فرق کون کرے کہ کس وقت سے ان کے دماغ میں فتور شروع ہوا ہے کہ اس وقت کی باتوں کو ردّی قرار دے۔ پس کئی شاگرد ایسے ضعیف دماغ کی باتوں کو صحیح سمجھ کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ پس کلام ہدایت خدا تعالےٰ ہی کی طرف سے آ سکتا ہے۔ کیونکہ وہی انسان کا پیدا کرنے والا ہے اور اس کی ضرورتوں کو سمجھتا ہے۔ وہی وفات دینے والا ہے۔ اور بعد الموت اس کی رہنمائی کا فرض ادا کر سکتا ہے اسی کے قبضہ میں انسانی عقل ہے۔ پس وہ جن لوگوں کو اس وحی کے کام پر مقرر کرتا ہے ان کی عقلوں کی صحت کا بھی ضامن ہوتا ہے۔

سوچنے والوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا نشان ہے کہ آج تک کوئی نبی دنیا میں نہیں گذرا جو ارذل العمر تک پہنچا ہو اور جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ فلاں وقت دماغی کمزوری کی وجہ سے اس کی باتوں کا اعتبار نہیں رہا تھا۔ کیا سینکڑوں نبیوں میں سے جن کو دنیا جانتی ہے ایک بھی ایسی مثال کا نہ ملنا اس امر کا ثبوت نہیں کہ ان کو بھیجنے والا عقل انسانی کا مالک ہے۔ اس لئے اُس نے جن کو اپنے بندوں کی تعلیم پر مقرر کیا ان کی عقل کی بھی خود ہی حفاظت کی۔

کوئی نبی ارذل العمر تک نہیں پہونچا

قومی زندگی کو لیا جائے تو اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ قوموں پر بھی بڑھاپا آتا ہے اور وہ علم کو بھلا بیٹھتی ہیں۔ اس وقت ایک نئی نسل کی ضرورت ہوتی ہے جن کو خدا تعالےٰ پھر نئے سرے سے اپنی وحی کے ذریعے سے تعلیم دے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا۔ کہ جس کا علم قائم رہتا ہے اور جو قدرت سے کام کر سکتا ہے الہام نازل کرنا اسی کا کام ہے ؎

من یرد الی ارذل العمر کا مطلب

~~~~~~
~~~~~~

اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ

باوجود) اللہ (تعالیٰ) کی نعمت کا انکار کرتے ہیں ۵۷۲ اور اللہ (تعالےٰ) نے تمہارے لئے خود تم ہی سے

۵۷۲ حل لغات - عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ: هو ملكة يمينى کے معنے ہیں۔ اَملكهٗ وا قدر عليه۔ کہ میں اس کا مالک ہوں اور اس پر پورا قابو رکھتا ہوں (اقرب) پس عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ کے معنے ہوں گے جن پر ان کے داہنے ہاتھ قابض ہیں۔

ملکت ایمانہم

نعمة: نعمة کے لئے دیکھو سورۃ ہذا ۵۵۳

یجحدون: يَجْحَدُوْنَ: جَحَدَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور جحد حقہٗ اور بحقہٖ کے معنے ہیں۔ اَنكره مع علمه به۔ اس نے جان بوجھ کر کسی کے حق کا انکار کر دیا۔ کفر به: اس کا انکار کیا۔ كذبهٗ۔ اس کو جھٹلایا (اقرب) پس يَجْحَدُوْنَ کے معنے ہوں گے۔ کہ اللہ کی نعمتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔

اس آیت میں الہام الٰہی کے نزول کی دلیل

تفسیر:- اس آیت میں الہام کی ایک اور زبردست دلیل دی ہے اور وہ یہ کہ الہام الٰہی صرف عقائد کی اصلاح ہی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے علاوہ اس کے ذریعہ سے دنیاوی حکومتوں کے توازن کی بھی اصلاح کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالےٰ کا بعض افراد یا بعض قوموں پر فضل نازل ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ یہاں تک تو عام قانون ہے اور اگر ایسے لوگ انصاف سے کام لیں اور کسی کی حق تلفی نہ کریں تو قابل اعتراض بات نہیں۔ لیکن ہمیشہ ہوتا یہ ہے کہ جن لوگوں کے اختیار میں دنیا آتی ہے وہ کسی صورت میں ان لوگوں کے ساتھ جو ان کے غلام یا بمنزلہ غلام ہوں ان اختیارات کو تقسیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو انہیں حاصل ہو چکے ہوں۔ ان کے قبضہ سے دنیا کو نکال کر عزت اور رتبہ کو لیاقت اور قابلیت اور بنی نوع انسان کی مساوات کی بنیاد پر رکھنے کا صرف اور صرف ایک علاج ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نبی ارسال فرما کر پھر بنی نوع انسان کو ان کے حقوق واپس دلائے۔

جو لوگ ملکوں اور حکومتوں کی باگ پر قابض ہو جاتے ہیں۔ ان کا بڑا بہانہ یہی ہوتا ہے کہ دنیا کا انتظام لائق آدمیوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔ اور وہ بعض خاندانوں اور گھرانوں کو لیاقت کے لئے مخصوص کر لیتے ہیں اور بادشاہتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ بعض خاندان حکومت کرنے کے اہل قرار دے دئے جاتے ہیں اور عوام الناس سے نہ کوئی رائے لیتا ہے نہ ان کا انتظام میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حقوق انسانوں کے مذہبی لیڈر، پیر اور کاہن چھین لیتے ہیں۔ دین کو پنڈتوں، مولویوں اور پادریوں کی جائداد قرار دے لیا جاتا ہے۔ نہ عوام کو دین سے واقف رکھا جاتا ہے نہ انہیں اس کے متعلق دلچسپی لینے کا موقع دیا جاتا ہے۔ بس یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ ان کا کام صرف مذہبی پیشواؤں کے بتائے ہوئے مسائل کو ماننا ہے۔ مذہبی کتابوں پر خود غور کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا ان کا کام نہیں۔

غرض جب قوم نبوت کے زمانہ سے دُور ہو جاتی ہے اس کے حقوق بعض خاندانوں کے قبضہ میں بطور توارث چلے جاتے ہیں اور عام لوگ دین اور دنیا کے معاملہ میں بھی مشورہ دینے یا رائے دینے کے قابل نہیں سمجھے جاتے اور اس فرق کو امتیاز کو ایک فرضی قابلیت کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ ایک بادشاہ کا احمق بیٹا دنیا کا سب سے بڑا سمجھدار سمجھا جاتا ہے وہ نادان خود ایسا مغرور ہوتا ہے کہ جب دنیا کے سامنے اپنا کوئی احمقانہ اعلان کرتا ہے تو اس میں اس قسم کے نامعقول الفاظ استعمال کرتا ہے کہ ما بدولت نے لوگوں کے فائدہ کے لئے فلاں اعلیٰ تجویز سوچی ہے جس کا اظہار اس اعلان کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ اور کبھی وہ اس قسم کا اعلان کرتا ہے

کہ اہل دنیا کی یہ خوش قسمتی ہے کہ مال و دولت فلاں بات میں اس کے شریک ہیں اور جس قدر وہ بے وقوف ہوتا ہے اُسی قدر زیادہ تعلّی کرتا ہے۔

• یہی حال مذہبی دنیا کا ہوتا ہے۔ علماء کے بیٹے نیم علم رکھتے ہوئے اور غور و فکر کی طاقتوں سے محروم ہوتے ہوئے صرف اس لئے مشائخ میں سے کہلاتے ہیں کہ وہ علماء کی اولاد ہیں۔ اور دنیا سے مطالبہ کرتے ہیں کہ بغیر دلیل کے ان کی جاہلانہ باتوں کو تسلیم کیا جائے اور جو اُن کے سامنے خدا تعالیٰ کا کلام رکھے۔ اُسے ان فرسودہ قصوں اور بے معنی روایتوں کا جن کی سند اُن کے پاس کوئی نہیں ہوتی، انکار کرنے والا قرار دے کر کافر و مرتد قرار دے دیا جاتا ہے۔

ایسے وقت میں صرف ایک نبی ہی کام آ سکتا ہے اور ان امور کا علاج کر سکتا ہے۔ جب وہ ظاہر ہوتا ہے۔ تو وہ جاہل جو اپنے آپ کو عالم کہتے تھے اس کی شناخت سے محروم رہ جاتے ہیں اور وہ عالم جو جاہل کے نام سے مشہور تھے اپنی بصیرت اور پاکیزہ فطرت کی مدد سے اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ تب فرشتوں اور شیطان کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ اور وہ جو ناقابل سمجھے جاتے تھے قابلیت کے نام پر بنی نوع انسان کو غلام بنا کر رکھنے والوں کی ایک ایک تدبیر کو اس طرح کچل ڈالتے ہیں کہ جیسے چیل مردار کی بوٹیوں کو ٹھونگیں مارتی ہے اور ان خود ساختہ قابلوں کی قابلیت کی قلعی کھل جاتی ہے اور مدتوں سے دبے ہوئے عوام کو پھر اُبھرنے کا موقعہ ملتا ہے اور انسانیت پھر آزادی کا سانس لیتی ہے۔ یہی مضمون ہے جسے اس آیت میں بیان کیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ جس کے قبضہ میں خدا تعالیٰ کی نعمت آ جاتے وہ انہیں جنہیں اس نے غلام بنا کر رکھا ہے۔ کبھی اپنے حصہ میں برابر کا شریک نہیں بناتا۔ بھلا کبھی بھی بنی نوع انسان کو ایسے لوگوں نے آزادی رائے اور آزادی عمل دی ہے۔ اگر نہیں تو پھر نبیوں کے سوا جو وقتاً فوقتاً آ کر دنیا کو آزادی بخشیں اور کون سی صورت انسان کی ترقی کی رہ جاتی ہے؟ اس

دلیل میں نبوت کی عملی ضرورت کو ثابت کیا گیا ہے اور یہ ایسی زبردست دلیل ہے کہ ہر صاحبِ بصیرت اسے دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نبوت کے بغیر کبھی بھی دنیا اپنے حقوق کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ یہ نعمت جب تک دنیا کو بار بار نہ ملے انسان کا قدم ترقی کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔

شریعت کے نزول کی ضرورت[1]

اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ سے عوام الناس کو ملامت کی ہے کہ تمہاری ہی آزادی کے لئے یہ رسول آیا ہے اور تم اس نعمت کی ناقدری کرتے ہوئے انہی ظالموں کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہو جو تمہارے حقوق پر ناجائز طور پر قابض ہو رہے ہیں۔

افبنعمة اللّٰہ سے عوام الناس کو ملامت[2]

اس آیت میں نہایت لطیف پیرایہ میں اس قانون کو جو ملکیت کے بارہ میں اسلام نے پیش کیا ہے بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف بِرَازِقِيْهِمْ کہہ کر مال و متاع پر ان لوگوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا ہے جو مالدار اور بڑے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف بِرَآدِّيْ کہہ کر جس کے معنے واپس لوٹانے والے کے ہیں یہ امر تسلیم کیا ہے کہ مال کے مالک عوام الناس ہیں۔ کیونکہ لوٹائی وہی چیز جاتی ہے جو دوسرے کی ہو۔ اپنی چیز دی جاتی ہے لوٹائی نہیں جاتی پس ان دو الفاظ سے بظاہر متضاد مضمون نکلتا ہے۔ برازقیھم بتاتا ہے کہ مالدار لوگ اپنے مالوں کے مالک ہیں اور برادّی بتاتا ہے کہ عوام الناس ان مالوں کے مالک ہیں۔ مگر درحقیقت اس میں تضاد نہیں اسلام کی تعلیم کا امتیازی نشان ہی یہ ہے کہ اس نے ہر چیز پر دو ملکیتوں کو تسلیم کیا ہے۔ اس شخص کی ملکیت کو بھی جس نے اُسے کمایا اور من حیث الجماعت بنی نوع انسان کی ملکیت کو بھی بعض حقوق کمانے والے کو دئے گئے ہیں اور بعض حقوق بنی نوع انسان کو۔ کیونکہ اصل ملکیت دنیا کی اشیاء پر ہر انسان کو بحیثیت انسان حاصل ہے۔ پھر یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ قبضہ ایسا نہ ہو کہ دوسرے انسانوں کی ترقی میں روک ہو۔ بلکہ وہ دروازے کھلے رہیں جن میں سے ہو کر دوسرے لوگ بھی آگے آ سکیں۔ اس پر زکوٰۃ۔ ورثہ اور سونے چاندی کے

ملکیت کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نگاہ[3]

برازقیھم اور برادّی سے ملکیت کی طرف اشارہ[4]

نبی لوگوں کو آزادیٔ عمل اور آزادیٔ رائے دیتے ہیں[5]

اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ

بیویاں بنائی ہیں اور (نیز) اس نے تمہاری بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے

وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ

اور پوتے پیدا کئے ہیں اور اُس نے تمہیں تمام (قسم کی) پاکیزہ چیزوں سے رزق بخشا ہے کیا پھر (بھی) ایک ہلاک ہونیوالی چیز پر

يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝ وَ

(تو) وہ ایمان رکھیں گے اور اللہ (تعالیٰ) کے انعام کا وہ انکار کر دیں گے ۵۷۳ اور

اسلام نے ملکیت پر بعض حقوق بنی نوع انسان کو دیے ہیں۔ اور بعض کا تبرع کیا

جمع کرنے کی ممانعت، سود کی ممانعت وغیرہ مسائل سے بہت واضح روشنی پڑتی ہے۔ مگر یہ موقعہ ان امور کے بیان کا نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام نہ تو بے قید شخصی ملکیت کا قائل ہے اور نہ غیر محدود جماعتی تصرف کا۔ وہ دونوں کو قیود سے پابند کر کے انفرادی اور جماعتی کشمکشوں کو اپنے اپنے دائرہ میں اپنی قابلیتوں کے اظہار کا موقعہ دیتا ہے۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ — اس سے مراد عام طور پر غلام ہیں اور قرآن مجید کے محاورہ میں بھی اکثر جگہ یہی معنے مستعمل ہوتے ہیں۔ مگر اپنی بناوٹ کے لحاظ سے یہ لفظ عام ہے۔ جو شخص کسی نہ کسی لحاظ سے کسی کے قبضہ و تصرف میں ہو وہ بھی اس لفظ کے اندر شامل ہے۔ اس لحاظ سے تمام ماتحت نوکر، مزارعین اور مزدور وغیرہ اس کے اندر شامل ہوں گے۔

نفس

اس آیت میں اس سوال کا بھی جواب دیا گیا ہے کہ شریعت ہم خود ہی بنالیں گے خدائی الہام کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ شریعت بنانا خدا کا ہی حق ہونا چاہیئے کیونکہ صحیح قانون وہی بنا سکتا ہے جس کی اپنی غرض حقوق کی تقسیم میں کوئی نہ ہو۔ اگر غرض والا شخص شریعت بنائے گا تو وہ اپنا اور اپنی قوم کا فائدہ مدنظر رکھے گا۔ مثلاً اگر شریعت کا بنانا مردوں کے سپرد ہوگا تو وہ عورتوں کے حقوق پوری طرح ادا نہ کریں گے اور

حفدہ

اس آیت میں شریعت کے خود بنانیوالوں کا جواب

الباطل

اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ شریعت ہی بے غرضانہ ہو سکتی ہے۔

اگر امراء قانون بنائیں گے تو وہ امراء کے حقوق کا خاص خیال رکھیں گے اور غرباء کے حقوق کو نظر انداز کر دینگے۔ علیٰ ہذا القیاس جو کوئی بھی قانون بنائے گا وہ اپنے حقوق کا زیادہ خیال رکھیگا اور دوسروں کے حقوق پوری طرح ادا نہ کرے گا۔ اس لئے فرمایا کہ ہم نے شریعت بندوں کے اختیار میں نہیں رکھی۔ تا ایسا نہ ہو کہ جس کے قبضہ میں کوئی نعمت آئی ہوئی ہو وہ اُسے دبا کے بیٹھا رہے۔ اور اس کا بیان کرنا اپنے ذمہ رکھا ہے تاکہ عبام الناس، کو جو بطور غلاموں کے ہیں اور اپنے حقوق منوانے میں کوئی آواز نہیں رکھتے ان کو ان کے حقوق دلوائے جاتے رہیں۔

۵۷۳ حل لغات۔ مِنْ اَنْفُسِكُمْ: انفس نفس کی جمع ہے۔ اور نفس الشیء کے معنے ہیں عینُہٗ۔ خود وہی چیز (اقرب) پس من انفسکم کے معنے ہونگے کہ خود تم ہی میں سے۔

حَفَدَةً: جمع ہے اور اس کا مفرد الحافد ہے اور اس کے معنے ہیں۔ الخادم۔ نوکر۔ الناصر۔ مددگار۔ التابع۔ تابع۔ ولد الولد۔ پوتا (اقرب)

الباطل۔ ضد الحق۔ جھوٹ۔ (اقرب)

تفسیر:- ان آیات میں بدل بدل کر شریعت کے نزول کی ضرورت اور شرک کے مضمون کو بیان کیا گیا ہے یونہی بے جوڑ طور پر نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی تائید کے

يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا

وہ اللہ (تعالیٰ) کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں

مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۚ

سے ان کے (دینے کے) لئے کسی رزق کے ذرہ بھر (بھی) مالک نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں ۷۴

لئے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ الہام کے بغیر انسان شرک جیسی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور توحید کامل تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی رہنمائی کرے۔ کیونکہ جب خدا ایک ہی ہے تو بندوں کی ہدایت کا کام کسی دوسرے پر کس طرح چھوڑ سکتا ہے۔ اگر کئی خدا ہوتے تو ایک دوسرے پر کام چھوڑ دیتا۔ جیسے بچوں کی نگرانی کا کام بعض دفعہ ماں باپ پر چھوڑ دیتی ہے اور بعض دفعہ باپ، ماں پر چھوڑ دیتا ہے۔ مگر ایک ہی خالق، ایک ہی مالک کس پر اس کام کو چھوڑ دے۔ وہ تو خود ہی کرے گا۔ اسی طرح توحید کمال کو چاہتی ہے اور بنی نوع انسان کو کسی مقصد کے بغیر پیدا کرنا نقص پر دلالت کرتا ہے اور توحید کا عقیدہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پس اگر انسان بغیر مقصد کے پیدا نہیں ہوا تو پھر بعد الموت زندگی بھی ضروری ہے۔ اور اگر وہ زندگی ضروری ہے تو ایسی وسیع زندگی کے لئے تیار کرنے کی غرض سے ایک شریعت اور ہدایت کا خدا تعالیٰ کی طرف سے آنا بھی ضروری ہے پس اسی سلسلہ میں اپنے موقعہ پر بعد الموت کی زندگی کا ثبوت بھی بیان کیا گیا ہے۔

غرض توحید اور آسمانی ہدایت کی ضرورت کے مضمون کو ایک دوسرے کی تائید میں اس طرح بدل بدل کر لایا گیا ہے کہ مضمون میں ایک غیر معمولی شوکت پیدا ہو گئی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادی دنیا کے تمام اجرام ایک دوسرے پر سہارا لئے کھڑے ہیں اسی طرح روحانی دنیا کی عمارت بھی ایک دوسرے کو سہارا دے رہی ہے اور اس کا ایک حصہ دوسرے کی اس طرح تائید کر رہا ہے کہ جدھر سے بھی رُخ کرو ایک ہی حقیقت اور ایک ہی نظام کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

توحید کامل کا تقاضہ کامل رہنمائی ہے۔

چنانچہ اس آیت میں پھر توحید کی طرف رُخ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جہاں دولت و حکومت پر انسانی قبضہ اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ انسانی فطرت دوسرے انسانوں کو جو اس کے محکوم ہیں اپنے ساتھ شریک کرنے پر تیار نہیں ہوتی اور اس وجہ سے ایک بیرونی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے جو اس بگڑے ہوئے نظام کو بدل کر مساوات انسانی اور حقوق انسانی کو قائم کرے۔ اسی طرح اس سے خدا تعالیٰ کی توحید کی طرف بھی توجہ ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ تم کو کوئی نعمت دیتا ہے۔ تو جہاں تک وہ تمہارے قبضہ کو تسلیم کرتا ہے وہ تمہارے حقوق تمہاری اولاد کی طرف بطور وراثت منتقل ہونے کی اجازت دیتا ہے اور تم اپنے اچھے مال جو خدا تعالیٰ نے تم کو دئے ہیں اپنی اولاد کی طرف منتقل کرتے ہوئے دوسروں کو نہیں دے دیتے اور نہ دوسروں کو یہ حق دیتے ہو کہ وہ تمہاری جائداد جس کو چاہیں دے دیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم باطل یعنی شرک میں مبتلا ہوتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہو۔ یہ انکار وہ کس طرح کرتے ہیں اس کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔

توحید عین فطرت ہے

شریعت اور بعث بعد الموت لازم ملزوم ہیں

۷۴ حل لغات۔ السموات اور الارض کے لئے دیکھو یونس ۵

السموات الارض

تفسیر:- فرماتا ہے۔ کہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے وراثت کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ ان کے

توحید اور آسمانی ہدایت کی ضرورت کا بیان

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ

پس (اے مشرکو) تم اللہ (تعالےٰ) کے متعلق (اپنے پاس سے) باتیں مت بناؤ (اللہ تعالیٰ) یقیناً (سب کچھ) جانتا ہے

لَا تَعْلَمُوْنَ ○ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا

اور تم (کچھ بھی) نہیں جانتے ۹۷۵ اللہ تعالیٰ تمہارے سمجھانے کو) ایک ایسے بندے کی حالت بیان کرتا ہے جو غلام ہو

مال اور ان کی جائدادیں ان کی اولادوں کو ملیں۔ مگر یہ لوگ خدا تعالےٰ پر یہ ظلم کرتے ہیں کہ اس کے اختیارات اور اس کی حکومت ان کو دے دیتے ہیں جن کو اس نے اپنا وارث تجویز نہیں کیا۔ یعنی خدا تعالےٰ تو اپنے اختیارات سپرد نہیں کرتا اور یہ کر دیتے ہیں گویا اپنے متعلق تو انکی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہمارے اختیارات انہیں ملیں جو ہماری اولاد ہیں اور جن سے ہم تعلق رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ چاہتے ہیں کہ اس کے اختیارات خود ہی ان کے سپرد کر دیں جن کو خدا تعالےٰ وہ اختیارات دینا نہیں چاہتا۔ اور جن کو اس نے ایسے اختیارات نہیں دئے۔ حالانکہ اگر باوجود اس کے کہ ان کی جائدادیں حقیقی طور پر ان کی مقبوضہ نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کی دی ہوئی ہیں۔ ان کو یہ حق حاصل ہے کہ جن کو اپنا وارث سمجھتے ہیں اپنی جائدادیں ان کو دے دیں تو خدا تعالےٰ کو کیوں اختیار نہیں کہ وہ اپنی منشاء کے مطابق اپنے دین کا وارث ان کو بنائے جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔

شرک اللہ تعالیٰ پر ظلم ہے۔

لَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ

لَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ کے معنی

الہامی کلام میں بیٹے سے مراد

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ شرک کی وجہ سے انسانی ترقی بھی رُک جاتی ہے۔ کیونکہ جب مشرک کی توجہ ان ہستیوں کی طرف ہو جاتی ہے جن کو کوئی طاقت حاصل نہیں تو ان سے تو اُسے کوئی فائدہ ملتا نہیں ہاں یہ نقصان ضرور پہنچ جاتا ہے کہ اس ہستی کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے جو ان کو ہر اک قسم کی نعمتیں دے سکتی ہے اس لئے ہمیشہ مشرک قوموں کی ذہنی ترقی رک جاتی ہے اور دینی امور میں ان کا فکر نہایت کُند ہو جاتا ہے اس کے مقابل پر جو اقوام مشرک نہیں ہوتیں اگر کسی وقت سچائی سے ہٹ بھی جائیں تو ان کی ذہنی ترقی کچھ نہ کچھ ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ وہ اس وجود کے متعلق غور کرتی رہتی ہیں جس میں سب طاقتیں ہیں پس کچھ نہ کچھ سچائی ان کو بغیر الہام کے بھی ملتی رہتی ہے۔

شرک انسانی ترقی میں روک ہے۔

۹۷۵ حل لغات

لَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ کے معنے ہیں کہ تم اللہ کے متعلق باتیں مت بناؤ۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ رعد ۳۵

تفسیر:۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے متعلق خود قانون نہ بناؤ کیونکہ تم تو اللہ تعالےٰ کی قدرتوں تک سے ناواقف ہو وہ جس قدر حقوق دین کے بارہ میں بندوں کو دینا پسند کرتا ہے آپ ہی اپنے بندوں کو دے گا اور ان کو دے گا جن کو وہ ان کے اخلاص کی وجہ سے اپنی روحانی اولاد کا مرتبہ بخشتا ہے

بعض دفعہ الہامی کلام میں بعض نبیوں کو خدا تعالیٰ کے بیٹے کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مسیح علیہ السلام کے بارہ میں آتا ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کے بیٹے تھے۔ چنانچہ انجیل میں آتا ہے کہ مسیح نے حواریوں سے کہا کہ:۔

"پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور انہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو"

(متی ۲۸۔ ۱۹)

اس جگہ بیٹے کے لفظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو برگزیدہ کر کے اپنی آسمانی بادشاہت کا وارث بنایا تھا۔ قرآن کریم میں بھی اس مضمون کا ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (انبیاء ع ۲) یعنی مشرک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا

(اور) جو کسی بات کی (بھی) طاقت نہ رکھتا ہو اور (اس کے مقابلہ میں اس بندے کی حالت کو بھی) جسے ہم نے اپنے پاس سے اچھا رزق دیا ہو

فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ

اور وہ اس میں سے پوشیدہ طور پر (بھی) اور علانیہ طور پر بھی ہماری راہ میں خرچ کرتا ہو کیا وہ دونوں قسم کے لوگ برابر ہو سکتے ہیں (ہرگز نہیں) تمام تعریف

لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ

(تو) اللہ تعالیٰ ہی کو (سزاوار) ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر (لوگ) جانتے نہیں ۵۷۶ اور اللہ (تعالیٰ) دو اور

نے اپنے لئے بیٹے پیدا کئے ہیں یہ غلط کہتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ بیٹا کہتا ہے وہ صرف اس کے مکرم بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا منشاء اس لفظ کے استعمال سے ان کے اعزاز کو ظاہر کرنا ہوتا ہے جو انہیں اس کے حضور حاصل ہے۔ مگر افسوس کہ نادان ان محاورات سے دھوکا کھا کر خدا تعالیٰ کے عاجز بندوں کو حقیقتاً خدا تعالیٰ کا بیٹا سمجھنے لگتے ہیں اور بعض دوسرے نادان ان محاورات پر اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ ایک ایسی حقیقت پر مبنی ہوتا ہے جو اس کی دوسری صفات کے مخالف نہیں ہوتی۔ مگر تم ایسے معنوں میں ان الفاظ کا استعمال کرتے ہو جو محض جہالت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان سے کوئی حقیقت بھی تو ظاہر نہیں ہوتی۔ مثلاً خدا تعالیٰ جن معنوں میں بیٹا کہتا ہے۔ اس سے تو اس گہرے تعلق کا اظہار مقصود ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنے پاک بندوں سے ہے۔ مگر مشرک اسے حقیقی بیٹا بنا کر اس پاکیزہ تعلق کو ایک جسمانی تعلق بنا دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بھی گرا دیتے ہیں اور ان بندوں کی بھی ہتک کرتے ہیں جن کو وہ معبود بناتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ ان کے متعلق اس عظمت کا تو انکار کر دیتے ہیں جو عرفان اور قربانی سے حاصل ہوتی ہے اور وہ فرضی عظمت ان کو دیتے ہیں جو جسمانی تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔

اور جو پہلی کے مقابل اس کی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

۵۷۶ تفسیر:- چونکہ پہلی آیت میں اس طرف اشارہ تھا کہ روحانی امور میں اس حد پر کھڑا رہنا چاہیئے جو اللہ تعالیٰ مقرر کرے۔ ورنہ انسان دھوکا کھا کر کہیں کا کہیں چلا جاتا ہے اور اس طرف اشارہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو عزت دے کر بعض پیار کے ناموں سے یاد کرتا ہے تو اس کے اور معنے ہوتے ہیں اور مشرک جب ویسے ہی ناموں سے مخلوق میں سے بعض کو یاد کرتے ہیں تو اس کے معنے اور ہوتے ہیں۔ اور اس کی مثال کے طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو اشارۃً پیش کیا اور فرمایا کہ کیا تم سوچتے نہیں کہ ایسا شخص جو ہوا و ہوس کا شکار ہو اور عبد مملوک کی حیثیت رکھتا ہو اور بوجہ دوسروں کا غلام ہونے کے اپنی قابلیتوں کا صحیح استعمال نہ کر سکتا ہو اور رسم و رواج اور توہمات کی قیود میں جکڑا ہوا ہو اور اسے ایک غلام کی حیثیت حاصل ہو کیا اس دوسرے شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو رسوم اور توہمات کی غلامی سے آزاد ہو کر خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقتوں سے ظاہر اور مخفی طور پر خدا تعالیٰ کے بندوں کی خدمت کرتا رہتا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ اس شخص کی مدد کرے گا جو اس کی دی ہوئی قوتوں کو مفید طور پر اس کے بندوں کی خدمت میں لگاتا ہے اور یہی شخص کامیاب ہوگا۔ اس مثال سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وجود کی طرف

۱۔ آیت من بعد العلم ایک الٰہی کلام میں بر لفظ کے حقیقت پر مبنی ہونے کی طرف اشارہ

۲۔ آزاد اور غلام شخص کی مثال

۳۔ روحانی امور میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حد پر کھڑا رہنا چاہیئے

مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ

شخصوں کی حالت (بھی) بیان کرتا ہے جن میں سے ایک گونگا ہو جو کسی بات کی طاقت نہ رکھتا ہو

آزاد اور غلام کی مثال میں آنحضرتؐ کے لئے اچھے الفاظ کا استعمال

اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ شخص ہی خدا کے فضلوں کا وارث ہو سکتا ہے اور اس شخص کے لئے اللہ تعالےٰ نے جو بھی اچھے الفاظ استعمال فرمائے وہ ان کا مستحق ہے۔

محمد رسول اللہ کی کامیابی کی وجہ

اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ تم تو خدا تعالیٰ کے دیے ہوئے انعامات سے صرف اپنے خاندانوں اور اولاد کو فائدہ پہنچاتے ہو اور محمدؐ رسول اللہ سب دنیا کو اپنے انعامات میں شریک کرتا ہے۔ پس اس کی کامیابی یقینی ہے اور تمہاری ناکامی یقینی۔

سرًّا وجهرًا کے تین معنی

سِرًّا وَّجَهْرًا کے تین معنے ہو سکتے ہیں:-

۱- پوشیدہ طور پر بھی ظاہر بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بنی نوع انسان کی وہ خدمت بھی کرتے تھے جو لوگوں کو نظر نہ آتی تھی جیسے دعا اور استغفار۔ اور وہ بھی جو لوگوں کو نظر آتی تھی۔ جیسے اخلاق فاضلہ جو بنی نوع انسان کے متعلق آپؐ سے ظاہر ہوتے تھے جن کا ذکر حضرت خدیجہؓ کے اس قول میں ہے کہ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا

آنحضرتؐ کا سرًّا وجهرًا بنی نوع انسان کی خدمت کرنا

اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری جلد اول باب کیف کان بدء الوحی) یعنی خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز نہ چھوڑے گا۔ کیونکہ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے اور مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان اخلاق کو ظاہر کرتے ہیں جو دنیا سے مفقود ہو چکے تھے اور جو لوگ ایسے مصائب میں مبتلا ہوں جو ناحق ان پر پڑ گئے ہوں انکی آپ مدد کرتے ہیں اور جو شخص بالکل بے بس ہوتا ہے اس کا بوجھ آپ اٹھا لیتے ہیں۔

سرًّا وجهرًا کے معنی رات اور دن کے

۲- دوسرے معنے اس کے رات اور دن کے بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ رات کا کام مخفی ہوتا ہے اور دن کا ظاہر۔ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ آپ نے خدمتِ خلق میں رات اور دن ایک کر دیتے ہیں اور بغیر آرام کرنے کے بنی نوع انسان کی بہتری میں کوشاں رہتے ہیں۔

۳- تیسرے معنے یہ ہیں کہ آپؐ وہ خدمات بھی کرتے ہیں جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ یعنی ان کی قدر نہیں جانتے۔ جیسے تبلیغ حق۔ کہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے اُسے خدمت نہیں سمجھتے تھے حالانکہ وہ اعلیٰ درجہ کی خدمت تھی اور آپ وہ خدمات بھی کرتے ہیں جن کو لوگ پہچانتے ہیں اور اُن کی خوبی کا اعتراف کرتے ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک آدمی حضورؐ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ ابوجہل میرا روپیہ نہیں دیتا۔ آپ اُسی وقت اس آدمی کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ اور ابوجہل کے دروازہ پر دستک دی۔ ابوجہل باہر نکلا اور حضور کو کھڑے دیکھ حیران سا رہ گیا اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ (کیونکہ وہ تو دن رات آنحضرت صلعم کی ایذا دہی اور سب و شتم میں مشغول رہتا تھا۔ اس کے لئے آپؐ کا اس کے پاس آنا تعجب کا موجب تھا) آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس شخص کا روپیہ دینا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں دینا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو اس شخص کو پریشان نہ کرو فوراً اس کا حق ادا کرو۔ وہ ایسا مرعوب ہوا کہ گھر جا کر فوراً روپیہ لے آیا اور اس شخص کو دے دیا۔ جب لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا تو لوگوں نے ابوجہل کو ملامت کی کہ آپ ہم سے تو یہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی بات نہ مانو اور خود اس سے ایسے ڈر گئے۔ اس نے جواب دیا کہ کیا بتاؤں اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اس کی بات کا انکار کیا تو ایک وحشی اونٹ اسی وقت مجھ کو چبا جائے گا اور میں نے اس ڈر سے اس کی بات کو مان لیا (سیرت ابن ہشام)

ممکن ہے کہ کشفی طور پر واقعی ایک مست اونٹ بھی آپؐ کے ساتھ اسے نظر آگیا ہو۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا

وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ

اور وہ اپنے مالک پر بے فائدہ بوجھ ہو جدھر بھی (اس کا آقا) اسے بھیجے (وہ) کوئی بھلائی (کما کر)

بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ

نہ لائے۔ (پس) کیا وہ (شخص) اور وہ (دوسرا) شخص جو انصاف کرنے کا حکم دیتا ہو

وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ

۱۰ ع ۶ ۱۶

اور وہ (خود بھی) سیدھی راہ پر (قائم) ہو باہم برابر ہو سکتے ہیں ؏۷۷ اور آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز (بھی)

تذکرہ نہیں فرمایا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابو جہل نے بعد میں اپنے ڈر کو چھپانے کے لئے جو آپؐ کے پیچھے ہٹ آنے کی وجہ سے ہوا اور کفار کے اعتراض سے بچنے کے لئے بہانہ بنا کر یہ بات کہہ دی ہو۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کے بعض نیک اعمال مخفی ہوتے ہیں اور بنی نوع انسان ان کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتے۔ اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا یوم جزا لائے جس میں اس کے ایسے اعمال بھی دنیا پر ظاہر کئے جائیں اور اُسے اپنا حق مل جائے۔

۷۷ حل لغات۔ ابکم: بکم۔ یبکم بَکْمًا کے معنے ہیں خرس۔ گونگا ہو گیا۔ فَهُوَ اَبْکَمُ۔ اور اس سے صیغہ صفت اَبْکَم آتا ہے۔ (اقرب)

اَلْکَلُّ: المصیبة۔ الکَلّ کے معنے مصیبت۔ الثقیل لاخیر فیه۔ ایسا بوجھ جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ العیّل والعیال۔ گھر کے لوگ جن پر خرچ کرنا پڑتا ہے الثِّقْلُ۔ بوجھ۔ الضعیف: کمزور۔ و یطلق الکَلّ علی الواحد وغیرہ اور کَلّ کا لفظ واحد تثنیہ جمع سب کے لئے استعمال کرتے ہیں (اقرب)

المولیٰ: کے معنے کے لئے دیکھو یونس ۳۱؏

یوجّهه: وَجَّهَهُ الیه فی حاجة کے معنے ہیں۔ ارسلَهُ فتوجّه الیه ای فذهب لازم ومتعدٍ۔ اس کو کسی ضرورت کے لئے بھیجا اور وہ اس کے لئے چلا گیا یہ لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (اقرب) پس اینما یوجّهه کے معنے ہونگے۔ جہاں کہیں وہ اسے بھیجتا ہے۔

تفسیر: اس آیت میں پہلے مضمون کو ایک اور مثال سے واضح کیا۔ پہلی مثال میں تو یہ بتایا تھا کہ اگر ایک شخص کو قابلیت تو رکھتا ہو لیکن بوجہ دوسروں کے قبضہ میں ہونے کے اسے اس قابلیت کے اظہار کی طاقت نہ ہو تو اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہوتا ہے۔ اب اس آیت میں ایک ایسے غلام کی مثال بیان فرمائی ہے جو گونگا ہو اور کسی نیک کام کے کرنے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو۔ ایسا شخص بھی کسی فضل کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیونکہ نہ تو اس میں کام کی طاقت ہوتی ہے کہ لوگوں کو نفع پہنچائے اور نہ اس کی زبان چلتی ہے کہ منہ سے ہی لوگوں کو نیک باتوں کی تعلیم دیتا رہے۔ پھر فرمایا کہ ان عیوب کی وجہ سے اس کا آقا جو کام بھی اس کے سپرد کرے وہ اُسے پورا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے مقابل پر وہ غلام جو اپنے مالک کے حکم کے مطابق لوگوں کو بھی عدل کرنے کا حکم دیتا ہو اور خود بھی سیدھے راستے پر قائم ہو یعنی نیک کام کر کے اپنے آقا کو خوش کرتا رہتا ہو۔ بڑی فضیلت رکھتا ہے اور یہ دونوں کسی صورت میں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور آقا ان دونوں سے یکساں سلوک نہیں کر سکتا۔

ابکم

الکلّ

اس آیت میں پہلے مضمون کی مزید وضاحت

المولی

یوجّهه

وَالْاَرْضِ ۚ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ

اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ اور اس (موعود) گھڑی (کی آمد) کا معاملہ تو ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا بلکہ وہ (اس سے بھی)

اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

قریب تر (وقت میں واقع ہوجانیوالا) ہے اللہ (تعالیٰ) یقیناً ہر بات پر پورا (پورا) قادر ہے ۵۷۸

آنحضرت اور کفار کے ایک گروہ کا مقابلہ

اس آیت میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے ایک گروہ کا مقابلہ کرکے دکھایا ہے۔ فرماتا ہے تم گونگے ہو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمام عیب کئے جاتے تھے، شرک ہوتا تھا اور ہو رہا ہے۔ خدا کی صفات کو غلط طور پر پیش کیا جاتا تھا اور کیا جاتا ہے۔ مگر تم میں سے کسی کی زبان نہ ہلی اور کسی نے لوگوں سے نہ کہا کہ شرک نہ کرو اور خدا کی ہتک نہ کرو۔ اگر کسی نے (زبان ہلائی اور حق بیان کیا اور اپنے آقا کی عزت کے تحفظ کے لئے کلمہ خیر کہا۔ تو وہ صرف محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہے۔

پھر اسی پر بس نہیں اگر تم دوسروں کو نیکی کا حکم نہ دے سکتے تھے تو خود ہی نیکی پر قائم رہتے اور اپنے نیک اعمال سے خدا تعالیٰ کی سبوحیت اور پاکیزگی کا اعلان کرتے۔ شرک سے دوسروں کو نہیں روک سکتے تھے تو کم از کم خود تو شرک نہ کرتے مگر تم سے یہ بھی نہ ہوا۔ پھر دین کو جانے دو۔ تم اگر دنیا کے اموال اور متاع کے پیچھے پڑے تھے تو اسی میں ترقی کی ہوتی۔ مگر تم تو دنیا میں بھی دوسروں کا بوجھ اٹھانے کی بجائے خود بوجھ بن رہے ہو۔ مگر اس کے مقابل پر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو دیکھو کہ وہ غیروں کو انصاف کا حکم دیتے ہیں اور اپنی ذات میں صراط مستقیم پر ہیں یعنی ہر لحاظ سے کامل ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ہم اس کی مدد کریں یا تمہاری؟

آیت ضرب اللہ مثلاً میں دو قسم کے کفار کی حالت کا بیان

اس آیت اور اس سے پہلی آیت میں دو قسم کے کفار کی حالت کو بیان کیا ہے اور ان دونوں گروہوں کے مقابل پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حالت کو پیش کیا ہے۔ ایک قسم کفار کی یہ بیان کی کہ وہ رسوم و توہمات کے غلام ہیں اور گو ان میں کام کی قابلیت ہے مگر وہ لوگوں کے ڈر سے کام کر نہیں سکتے۔ اور دوسری قسم کے کفار کی حالت یہ بتائی کہ وہ رسوم و توہمات کے غلام بھی ہیں اور ان کی قابلیتیں بھی ماری گئی ہیں۔ اگر رسوم اور توہمات سے آزاد بھی ہو جائیں تب بھی ان کی حالت ایسی مسخ ہو چکی ہے کہ وہ کوئی نیک کام نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ پر بوجھ ہیں کہ اس کی سبوحیت پر ان کے وجود سے داغ لگ رہا ہے۔ اس کے مقابل پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے غلام نہیں اور جو طاقتیں انہیں ملی ہیں انہیں بنی نوع انسان کی خدمت میں لگائے ہیں۔ نیز وہ زبردست روحانی طاقتیں رکھتے ہیں جن کی مدد سے خود بھی اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق دکھاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی ہدایت کی طرف بلاتے ہیں اب تم خود ہی سوچو کہ ایسے شخص کو ہم اپنے کام کے لئے چنیں گے جو قابل بھی ہو اور ہمارے دین کی خدمت بھی کر رہا ہو یا اس گروہ کو جو قابل تو ہو مگر اپنی طاقتوں کو خدا کی راہ میں لگانے سے معذور ہو۔ کیونکہ وہ رسم و رواج کی طاقت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یا پھر اس کو جو نہ تو قابل ہو نہ رسم و رواج کی قیود سے آزاد۔

۵۷۸ حل لغات — الساعة کے لئے دیکھو سورۃ ہذا ۵۶۳ الصّراط: الطریق۔ راستہ (اقرب)

الساعۃ

لمح البصر

لَمْحُ الْبَصَرِ: لَمَحَ (یَلْمَحُ لَمْحًا) البصرُ: امتدّ الی الشئ۔ کسی چیز کو آنکھ نے دیکھا۔

لمح الرجل الشئَ والی الشیٔ: ابصره بنظر خفیف او اختلس النظر: کسی چیز پر سرسری نگاہ ڈالی۔ لمح الشئ بالبصر: صَوَّبه الیہ۔ اُسے ٹکٹکی لگا کر دیکھا (اقرب) پس لمح البصر کے معنے ہوں گے۔ آنکھ کا دیکھنا یا اتنی دیر دیکھنا جتنی دیر کہ آنکھ ایک دفعہ کھل کر پھر بند ہوتی ہے۔ شَیْءٌ: شَاءَ کا مصدر ہے اور شَاءَہٗ (یشاء ہ شیئًا) کے معنے ہیں ارادہ کسی چیز کا ارادہ کیا۔ اللّٰہُ الشئَ: قدّرہ کسی چیز کا اندازہ کیا نیز الشئُ کے معنے ہیں۔ مایصحّ ان یعلم ویخبر عنہ وھو مذکر یطلق علی المذکر والمؤنث ویقع علی الواجب والممکن: جس کو معلوم کرکے اس کے متعلق خبر دینی صحیح ہو۔ اور یہ لفظ مذکر ہے لیکن مذکر اور مؤنث دونو کے لئے بولا جاتا ہے اور اللہ تعالٰی اور دیگر مخلوقات کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع اشیاء ہے (اقرب)

تفسیر:۔ گذشتہ آیات میں بیان فرمایا تھا کہ کیا گونگے نکمے اور نااہل وجود ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو عدل کی تعلیم دوسروں کو دیتے اور خود نیک عمل کرتے ہیں یعنی نہیں ہو سکتے۔ اب بیان فرماتا ہے کہ جب یہ بُرے نیکوں جیسے سلوک کے مستحق نہیں ہو سکتے تو سنو ہم جو زمین و آسمان کا راز جاننے والے ہیں تم کو ایک راز کی خبر بتاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی ہلاکت کا وقت آنکھ جھپکتے آنے والا ہے بلکہ وہ اس سے بھی قریب تر ہے۔ اس جگہ چونکہ یہ سوال ہو سکتا تھا کہ غیب جاننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان اپنی مرضی کے مطابق نتیجہ نکالنے پر قادر بھی ہو اس لئے اس آیت کو اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر کے الفاظ پر ختم کیا اور بتایا کہ ہم غیب ہی نہیں جانتے بلکہ آئندہ ہونے والے واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی بھی پوری طاقت رکھتے ہیں۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمن تباہ ہوں گے تو بعد میں آنے والے لوگ اس واقعہ کی قدر کم کرنے کے لئے کہیں گے کہ آپؐ کے دشمنوں کی تباہی ایک اتفاقی حادثہ تھا یا یہ کہ ان کے حالات ہی ایسے تھے کہ ہلاک ہو جاتے۔ چنانچہ آج کل کے مسیحی مصنف اس مضمون پر بہت ہی زور دیا کرتے ہیں اور آپؐ کے مخالفوں کی ہلاکت کو طبعی امور کا نتیجہ قرار دیا کرتے ہیں۔ دیکھو قرآن کریم کا اتارنے والا عالم الغیب اس آیت میں کس طرح ان لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتا ہے۔ آیت کو شروع غیب کا علم رکھنے کے دعویٰ سے کرتا ہے اور پھر کفار کی ہلاکت کی خبر دیتا ہے اور ختم اس پر کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقی نہ ہوگا بلکہ ہماری قدرت کے ذریعہ سے ہوگا۔ کس طرح اس آیت میں ایک طرف تو مکہ میں رہتے ہوئے جبکہ کفار کے ظلم زوروں پر تھے اور مسلمانوں کے پاس کوئی طاقت نہ تھی وہ ہجرت پر مجبور ہو رہے تھے فرماتا ہے کہ ہم غیب کا علم رکھنے والے خدا تم کو بتا دیتے ہیں کہ کفار کی ہلاکت کا وقت اب آن پہنچا اور یہ بھی بتلا دیتے ہیں کہ ان کی تباہی ہماری قدرت کے ذریعہ سے ہوگی اور ان حالات کے ذریعہ سے جو انسانی طاقت میں نہیں۔

اب دیکھو کس طرح اس آیت کے نزول کے بعد مدینہ کے سب لوگ مسلمان ہو گئے۔ حالانکہ پہلے صرف چند آدمی مسلمان ہوئے تھے اور کس طرح خود کفار نے محمد رسول اللہ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا ورنہ آپؐ مکہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ صرف اسی وقت آپؐ نے مکہ چھوڑا جبکہ کفار نے آپؐ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور پھر اسی رات آپ وہاں سے نکلے بلکہ اس وقت نکلے جبکہ کفار نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ گویا کفار پر آخری حجت پوری کر دی کہ میں مکہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا مگر چونکہ تم نے میرے لئے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا اس لئے یہاں سے جاتا ہوں۔ اس کے بعد کفار نے کس قدر زور آپؐ کو مدینہ میں کمزور کرنے کے لئے لگایا۔ مگر کس طرح آناً فاناً آپ کا زور بڑھتا چلا گیا اور آخر کفار تباہ ہوئے۔ اسے کون اتفاقی امر کہہ سکتا ہے؟ کون طبعی نتائج کہہ سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ قبل از وقت

آنحضرتؐ کے دشمنوں کی تباہی کو اتفاقی حادثہ کہنے والوں کا جواب

شَیْءٌ

آنحضرتؐ کے منکرین کی تباہی کی خبر سے ایک اعتراض کا جواب

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

اور اللہ (تعالیٰ) نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حالت میں پیدا کیا ہے کہ تم کچھ (بھی) نہیں جانتے

شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ

تھے اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل پیدا کئے ہیں

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ

تا کہ تم شکر ادا کرو ۷۹ کیا انہوں نے پرندوں کو جو آسمان کی

پیشگوئی بھی کر دی گئی تھی۔ مسیحی مصنف یہ تو ثابت کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے کسریٰ اور قیصر پر حملہ کیا انکی حکومتیں تنزل کی طرف جا رہی تھیں۔ مگر سوال یہ نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع نے جب ایران اور روم پر حملہ کیا تھا اس وقت ایرانی اور رومی حکومت کی مسلمانوں کے مقابل پر کیا حیثیت تھی۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلعم نے مکہ میں بیٹھے اپنی فتح اور منکرین کی شکست کی خبر دی تھی اس وقت کون سی طاقت آپؐ کے پاس تھی؟ اگر خدا نے آپ کو وہ طاقت دی جس نے ایک طرف عرب کو تہ و بالا کر دیا اور دوسری طرف ایران و روم کو۔ تو اس کا نام معجزہ نہیں تو اور کس چیز کا نام معجزہ ہوا کرتا ہے۔

آنحضرتؐ کی ترقی معجزانہ ہے

یہ پیشگوئی مکی زندگی کے آخر میں کی گئی تھی اور سب سے پہلی فتح بدر کے موقعہ پر ہوئی۔ گویا کوئی اڑھائی تین سال بعد۔ اور فتح مکہ کا واقعہ اس پیشگوئی کے بعد کوئی نو دس سال بعد ہوا۔ لیکن اس آیت میں فتح کے وقت کی خبر ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ آنکھ جھپکنے بلکہ اس سے بھی پہلے یہ واقعہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں اس قسم کے الفاظ کے معنے قریب زمانہ کے ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پلک جھپکنے سے پلک جھپکنا ہی مراد ہو۔ بعض لوگ ایسے الفاظ پیشگوئیوں میں دیکھکر اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں اور الہامی زبان کے محاورات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

آنکھ جھپکنے کے معنی زمانہ قریب کے

۷۹ تفسیر:۔ فرماتا ہے کہ اے لوگو ہم نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے جبکہ تم کچھ نہ جانتے تھے تم کو آنکھ کان اور دل دے کر دنیا میں بھیجا تا کہ تم علم سیکھو لیکن تم نے ہماری اس بخشش سے کچھ بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔ نہ آنکھوں سے دیکھا۔ نہ کانوں سے سُنا۔ نہ دل سے سوچا۔ اس فقرہ میں کیسا رحم اور افسوس بھرا ہوا ہے۔ خدائے قادر اپنے بندوں کی اس غفلت پر جس نے انہیں عذاب کا مستحق بنا دیا کیسے محبت سے بھرے ہوئے الفاظ میں افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

واللہ اخرجکم کا تعلق سورت کے مضمون سے

اس آیت کا تعلق سورۃ کے مضمون سے یہ ہے کہ اس میں الہام الٰہی کی ضرورت کی ایک اور دلیل دی گئی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ہر ایک علم سے خالی ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اُسے آنکھ کان اور دل دے کر پیدا کرتا ہے تا وہ علم حاصل کرے اور ان کی مدد سے وہ علم سیکھتا ہے۔ پس جو دنیوی علوم انسان سیکھتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے مہیا کئے ہوئے ذرائع سے سیکھتا ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں جو کہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے ان ذرائع کی ضرورت نہیں، میں خود ہی اپنے لئے حصول علم کے سامان پیدا کر دوں گا۔ پھر روحانی علم کے سیکھنے کے لئے جو ذرائع اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے

مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ط مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ط

فضاء کے اندر مسخر کئے گئے ہیں (غور کی نظر سے) نہیں دیکھا انہیں (تم پر آگرنے اور نوچ کھانے سے) اللہ (تعالیٰ) کے سوا

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ

(اور) کوئی نہیں روک رہا۔ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کیلئے اسمیں یقیناً کئی نشان (پائے جاتے) ہیں ۸۰ اور اللہ (تعالیٰ) نے

ان کے استعمال سے اُسے کیوں انکار ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ انسان کی سب عظمت ان ذرائع کے استعمال سے ہوتی ہے جو اُسے قدرت عطا فرماتی ہے۔ انسان کے جس قدر کمالات ہیں وہ انہی طاقتوں کی مدد سے حاصل کئے جاتے ہیں اور ان طاقتوں کے استعمال میں وہ کوئی شے کی محسوس نہیں کرتا۔ مگر جب روحانی ذرائع کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے مجھے ان کی کیا ضرورت ہے میں خود اپنا کام کر سکتا ہوں۔ حالانکہ جس طرح اُسے مادی ترقی کے لئے عطا کردہ جوارح کی ضرورت ہے اسی طرح روحانی کمالات کے حصول کے لئے اُسے ان سامانوں کی ضرورت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ کاملہ سے اس کے لئے پیدا کرتا ہے۔

آیت کے اخیر میں فرماتا ہے کہ ان چیزوں کے دینے کی غرض تو یہ تھی کہ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی قدر پیدا ہو۔ تم اُلٹا ان طاقتوں سے مغرور ہو جاتے ہو اور کہتے ہو کہ ہمیں کسی بیرونی مدد کی ضرورت نہیں۔

بچے کے اعضاء کے کام کرنے کے متعلق سائنس کی قرآن مجید کے بیان کے مطابق تحقیقات

اس آیت میں کانوں کے بعد آنکھوں اور آنکھوں کے بعد دلوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی ترتیب سے یہ اعضاء انسان کے علم کے بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے بچے کے کان کام کرتے ہیں اس کے بعد آنکھیں اور سب کے بعد دل یعنی قوت فکریہ کام کرتی ہے۔ آج سائنس نے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بچے کے کان کام کرنے لگتے ہیں اور اس کے بعد آنکھیں کام شروع کرتی ہیں اور سب سے آخر میں قوتِ فکریہ کام کرنا شروع کرتی ہے۔ چنانچہ جانوروں میں بچوں کی آنکھیں بعض دفعہ کئی کئی دن کے بعد کھلتی ہیں۔ اس عرصہ میں صرف کان کام کر رہے ہوتے ہیں۔ انسانوں کے بچوں کی آنکھیں بہ ظاہر کھلی ہوتی ہیں لیکن ان کا فعل کانوں کے فعل کے بعد شروع ہوتا ہے اور قوتِ فکریہ تو ایک عرصہ کے بعد کام شروع کرتی ہے۔ یہ ترتیب بھی قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا ایک ثبوت ہے کیونکہ اس میں مضمون بیان کئے گئے ہیں جو اس زمانہ میں مخفی تھے۔

۸۰ حل لغات۔ جَوّ: ما بین السماء والارض: زمین اور آسمان کی درمیانی فضا۔ جوّ البیت: داخلہ۔ گھر کا اندر کا حصہ (اقرب)

يُمْسِكُهُنَّ: یمسک امسک سے مضارع کا صیغہ ہے اور امسک الشئ بیدہ کے معنے ہیں۔ قبضہ: کسی چیز کو ہاتھ سے پکڑا۔ امسک اللّٰہ الغیث: حبسہ ومنع نزولہ: اللہ تعالیٰ نے بارش کو روک دیا۔ امسک عن الکلام: سکت: کلام کرنے سے خاموش رہا۔ امسک عن الامر: کفّ عنہ وامتنع: کسی کام سے رُکا رہا (اقرب)۔ پس مَا يُمْسِكُهُنَّ کے معنے ہوں گے۔ انہیں کوئی نہیں روکتا۔

اَلْقَوْم: القوم: الجماعة من الرجال خاصة وقیل تدخل النساء علی تبعیة سُمّوا بذالک لقیامهم بالعظائم والمهمات: قوم کا لفظ مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس میں عورتیں بھی بالواسطہ شامل ہو جاتی ہیں۔ اور مردوں پر قوم کا لفظ اس لئے بولتے ہیں کہ وہ اہم امور کو سرانجام دیتے ہیں۔ یذکر ویؤنث فیقال قام القوم وقامت القوم۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قام القوم (مذکر) اور

لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ

تمہارے گھروں کو تمہاری رہائش کا ذریعہ بنایا ہے اور اس نے چار پایوں کے چمڑوں سے

الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ

(بھی) تمہارے لئے گھر بنائے ہیں جنہیں تم سفر کے وقت ہلکا (پھلکا) پاتے ہو اور (نیز)

قامت القوم (مؤنث) دونوں طرح کہہ دیتے ہیں (اقرب)

تفسیر: مفسرین نے مُسَخَّرَاتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ کے یہ معنے کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر ظاہری سامانوں کے ان کو جوّ میں اڑنے کی طاقت دی ہے اور یہ گویا اس کی قدرت کا اظہار ہے۔ مگر یہ معنے صحیح نہیں۔ اس آیت میں درحقیقت کفار کی سزا کا ذکر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان پرندوں کو خدا تعالیٰ نے روکا ہوا ہے مگر ایک دن آئیگا کہ یہ پرندے تم پر گریں گے اور تمہاری لاشوں کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ جیسا کہ بعد کی جنگوں میں ہوا کہ کئی جنگوں میں کفار میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے راستوں پر لاشیں چھوڑ گئے اور وہ پرندوں کی خوراک بنیں۔

[حاشیہ: ۱ مفسرین کے نزدیک مسخرات فی جو السماء کے معنی]

[حاشیہ: ۲ آیت مذکورہ کے اصل معنی]

نابغہ ذبیانی کا ایک شعر ان معنوں کی تائید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

اِذَا مَا غَدَا بِالْجَيْشِ حَلَّقَ فَوْقَهٗ
عَصَائِبُ طَيْرٍ تَهْتَدِيْ بِالْعَصَائِبِ

یعنی میرا ممدوح ایسا ہے کہ جب وہ لشکر لے کر نکلتا ہے تو پرندے اس کے ساتھ اڑتے جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ ضرور اپنے دشمن کو مار بھگائے گا اور ہماری غذا کا سامان پیدا ہو جائے گا۔

[حاشیہ: ۳ پرندوں کے مسخر ہونے کے ذکر سے کفار پر عذاب کی پیشگوئی]

امیر تیمور کے متعلق تاریخ میں آتا ہے کہ جدھر وہ جاتا تھا اس کے لشکر کے ساتھ گدھ اڑتے جاتے تھے۔ کیونکہ جدھر وہ جاتا تھا اس کو دشمن پر فتح حاصل ہوتی تھی اور گدھوں کو اندرونی شعور سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے میں غذا ملتی ہے۔ غرض پرندوں کا اڑنا درحقیقت محاورہ ہے کسی قوم کی شکست اور ہلاکت کے اظہار کے لئے۔ اور اس جگہ اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں بھی آتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ۔ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ۔ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ۔ یعنی ابرہہ کا لشکر جو مکہ پر حملہ کرنے آیا تھا اس کو ہم نے ہلاک کر دیا اور ایسی بھاگڑ پڑی کہ وہ اپنے مردے جنگل میں چھوڑ گئے جن پر پرندے اکٹھے ہو گئے اور ان کی بوٹیاں نوچ نوچ کر اور پتھروں پر مار مار کر انہوں نے کھائیں۔ یہ بھی گدھوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ مردہ کی بوٹی نوچ کر کسی اونچی جگہ پر بیٹھ کر کھاتے ہیں اور مٹی سے صاف کرنے کے لئے اُسے پتھر یا لکڑی پر مار مار کر کھاتے ہیں۔

[حاشیہ: ۴ آیت کے آخر میں ان فی ذلک لآیات کہنے کا مطلب]

ممکن ہے اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو کہ تم دیکھ چکے ہو اللہ تعالیٰ کے ایک دشمن کی لاشوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے پرندوں نے نوچ کر کھایا تھا وہی پرندے آسمان پر اڑ رہے ہیں اور ہمارے حکم کے منتظر ہیں۔ اس وقت تک ہم ہی نے مسلمانوں کو جہاد سے روکا ہوا ہے جب یہ جہاد کے لئے نکلیں گے تو تمہارا ابرہہ کے لشکر کا سا حال ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوا۔

آخر میں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ یعنی اس پیشگوئی پر آج تم کو تعجب آتا ہوگا مگر جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اس میں خدا تعالیٰ کے نشانات مشاہدہ کر رہے ہیں اور انہیں اس کے وقوع پر کامل یقین ہے۔

وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا

اپنے قیام کے وقت (ان سے فائدہ اٹھاتے ہو) اور ان (جانوروں) کی باریک اُونوں اور (نیز) ان کی موٹی اُونوں

وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝ وَاللّٰهُ

اور ان کے بالوں کو بھی مستقل سامان اور ایک وقت تک (کیلئے) عارضی سامان (بنایا ہے) ۱۸۱ اور اللہ (تعالیٰ)

جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ

نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس میں اس نے تمہارے لئے کئی سایہ دینے والی چیزیں بنائی ہیں (جنکے نیچے تم آرام پاتے ہو) اور پہاڑوں میں

الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ

(بھی) تمہارے لئے پناہ کی جگہیں بنائی ہیں اور (نیز) اس نے تمہارے لئے کئی (قسم کی) قمیصیں بنائی ہیں جو تمہیں

۱۸۱ حل لغات۔ سَكَنًا: سَكَنَ سے

مصدر ہے۔ اور سکن فلان دارہ کے معنے ہیں استوطنها واقام بها۔ اپنے گھر میں قیام پذیر ہوا۔ سَكَنَ اليه: ارتاح اور جب سکن کا صلہ الیٰ آئے۔ تو اس کے معنے ہیں۔ اُس نے اس کے پاس آرام پایا۔ نیز السکن کے معنے ہیں۔ کل مایسکن الیه وفیه۔ ویستانس به۔ ہر وہ چیز جس سے انس و آرام حاصل ہو۔ الرحمة۔ رحمت۔ البرکة: برکت (اقرب) بُيُوْت کے لئے دیکھو سورۃ حجر ۴۷ ؎

تَسْتَخِفُّوْنَهَا: استخفّ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور استخفّہ کے معنے ہیں۔ اسے ہلکا سمجھا (اقرب) يَوْمَ ظَعْنِكُمْ: ظَعْنٌ ظَعَنَ کا مصدر ہے اور ظَعَنَ (يَظْعَنُ ظَعْنًا) کے معنے ہیں۔ سار۔ وہ چل پڑا۔ چنانچہ کہتے ہیں "ظعنوا عن دیارهم" کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر کوچ کر گئے (اقرب) پس تستخفونها یوم ظعنکم کے معنے ہوں گے۔ کہ تم کوچ کے وقت انہیں ہلکا سمجھتے ہو۔

اَصْوَاف: صوف کی جمع ہے۔ بھیڑوں بکریوں کی اُون کو کہتے ہیں اور وَبَر۔ اونٹوں کی اُون کو کہتے ہیں اس کی جمع اوبار ہے (اقرب)

اشعار: شعر کی جمع ہے اور الشعر ان سب قسم کے بالوں کو کہتے ہیں جو وبر اور صوف کے علاوہ ہوتے ہیں (اقرب)

الاثاث: متاع البیت بلا واحد۔ اثاث کا مفرد نہیں آتا۔ اور گھر کے سامان پر یہ لفظ بولتے ہیں۔ وقیل هو ما یتخذ للاستعمال والمتاع لا للتجارة۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اثاث اس سامان کو کہتے ہیں جو استعمال اور فائدہ اٹھانے کے لئے بنایا جاتا ہے نہ کہ تجارت کی غرض سے۔ وقیل اَلْمَالُ کلّه۔ اور بعض نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے سامان کو اس میں شامل کیا ہے (اقرب)

تفسیر:۔ یعنی اس وقت تم آرام سے زندگی بسر کر رہے ہو مستقل گھر بھی ہیں اور سفروں کے لئے خیمے بھی ہیں کہ آسانی سے اٹھا سکتے ہو۔ اور جہاں ڈیرہ لگانا چاہو ڈیرے لگا دیتے ہو۔ اور تجارت کرتے پھرتے ہو۔ اس انعام کو اپنے اعمال سے کیوں ضائع کرتے ہو۔

خیموں کے متعلق جو یہ فرمایا کہ تم انہیں سفر اور حضر میں ہلکا پاتے ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سفر کے وقت اٹھانا سہل ہوتا ہے اور اقامت کے وقت گھر کا کھڑا کرنا آسان ہوتا ہے۔ چند منٹ میں جنگل میں شہر بن جاتا ہے۔ چمڑوں

مسکن

اشعار

الاثاث

تستخفونها

خیموں کے متعلق تستخفونها کہنے کا مطلب

الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ

گرمی سے بچاتی ہیں اور کئی (قسم کی) قمیصیں (یعنی زرہیں) جو تمہیں تمہاری (آپس کی) جنگ (کی سختی) سے بچاتی ہیں۔ اسی طرح وہ تم پر اپنے

نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا

(روحانی) انعام کو (بھی) پورا کرتا ہے تا کہ تم (اس کے) کامل فرمانبردار بنو ۸۲؎ پس اگر وہ (اب بھی) پھر جائیں

کے خیموں کا ذکر اس لئے کیا کہ عربوں میں انہی کا رواج تھا۔ اور وہ بارش وغیرہ سے اور سردی سے بچانے کے لئے کپڑا کے خیمہ سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔

اکنان

۸۱؎ حل لغات۔ اکنان: کِنٌّ کی جمع ہے اور الکِنُّ کے معنے ہیں۔ وقاء کُلِّ شیٍ وسترہ۔ ہر چیز کا پردہ۔ اور اس کو محفوظ رکھنے والا جسم۔ البیت: گھر (اقرب) سَرَابِيْل کے لئے دیکھو سورۃ ابراہیم ۴۹؎

لعلکم تسلمون کے معنی

باس

بَأْسَ: الشدّۃ فی الحرب: لڑائی کی شدت کو بَأْس کہتے ہیں (اقرب)

تسلمون

تُسْلِمُوْنَ: اسلم سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور اَسْلَمَ کے معنے ہیں انقاد: مطیع ہو گیا اَسْلَمَ فلانٌ: تدین بالاسلام۔ مذہب اسلام میں داخل ہو گیا۔ اَسْلَمَ العدوَّ: خَذَلہ۔ دشمن کو رسوا کیا۔ اسلم امرہ الی اللہ: سلّمہ۔ اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیا (اقرب) پس لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ کے معنے ہوں گے (۱) تا کہ تم کامل فرمانبردار بنو (۲) تم اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کرو۔

اسلم کا مادہ

تفسیر:۔ اس آیت میں بھی سابق آیت کا مضمون چل رہا ہے اور چند اور انعامات گنا تا ہے کہ سفر کرتے ہو تو آرام سے درختوں تلے رہتے ہو۔ پہاڑوں میں آرام کرتے ہو۔ لباس دئے ہیں جن سے گرمی کی تکلیف سے محفوظ رہتے ہو۔ اور زرہیں دی ہیں جن کی مدد سے لڑائی میں تمہاری حفاظت ہوتی ہے۔ یہ سب نعمتیں اس لئے دی گئی ہیں تا آرام سے رہو اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہو۔ مگر اب تم اپنے ہاتھوں سے اس امن کو برباد کرنے لگے ہو اور اللہ تعالےٰ کی دی ہوئی نعمتیں اُسی کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہو۔ خدا تعالےٰ تو چاہتا تھا کہ ان نعمتوں کے شکریہ میں تم اس کے فرمانبردار بنو۔ لیکن ہوا یہ ہے کہ یہی امن تم کو مغرور کر کے خدا تعالےٰ ہی کے خلاف کھڑا کر رہا ہے۔

مسلم کے معنی حدیث سے

لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۔ علاوہ ان معنوں کے جو اوپر بیان ہوئے ہیں مُسلم کے معنے دوسرے کو شر سے اور تکلیف سے محفوظ رکھنے والے کے بھی ہیں۔ کیونکہ تُسْلِمُوْنَ، اسْلَمَ سے نکلا ہے جس کا مادہ سَلِمَ ہے اور اس کے معنے محفوظ ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ اَسْلَمَ اس کا متعدی ہے۔ پس اس کے معنے ہوئے جو دوسرے کو شر اور نقصان سے محفوظ رکھے۔ عربی زبان کا عام قاعدہ ہے کہ ہر فعل لازم ثلاثی پر ہمزہ زائد کر کے اسے متعدی بنایا جا سکتا ہے۔ عربوں میں عام طور پر گو سَلِمَ کا لفظ محفوظ ہو جانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اسلم متعدی کے اور استعمال تو ہیں مگر سَلِمَ مادہ کے ان معنوں سے متعدی کے معنے موجودہ کتب لُغت سے ثابت نہیں۔ مگر اسلامی ادب میں ان معنوں کا جو عربی لُغت کے عام قاعدہ کے رُو سے جائز ہیں استعمال ثابت ہے۔ حدیث میں ہے المسلم من سلم المسلمون مِن لسانہٖ ویدہٖ (مسلم کتاب الایمان) مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے اور ہاتھ سے سب وہ لوگ محفوظ رہتے ہیں جو اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ میرے نزدیک اس آیت میں یہ معنے بھی مراد ہیں اور مفہوم یہ ہے کہ ان نعمتوں کے دینے کی غرض تو یہ تھی کہ تم محفوظ رہو اور خدا کے شکر گذار بن کر دوسرے لوگوں کو شر سے محفوظ رکھو مگر تم

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ

تو (اگر وہ بھاگ جائیں تو) تجھ پر کوئی الزام نہیں آئیگا کیونکہ تیرے ذمہ صرف کھول کر پہنچا دینا ہے ۵۸۳ وہ اللہ (تعالیٰ) کے (اس) انعام کو (بخوبی) پہچانتے

اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ ع ۱۱ / ۱۷

ہیں (مگر) پھر (بھی) اس کا انکار کر رہے ہیں اور ان میں سے اکثر تو پکے کافر ہیں ۵۸۴

بنے تو ان نعمتوں کو ظلم کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

اس آیت سے ایک سیاسی نکتہ بھی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ کسی اکثریت کو یہ نہیں چاہیئے کہ اقلیت کو ملک سے نکال دے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظالموں کو نہ نکالا جائے جو قوم کسی کے نظام کو توڑتی ہو ان کا تو نکالنا ضروری ہے مگر مسلمان مکہ والوں کے نظام کو توڑتے نہیں تھے۔ صرف یہ کہتے تھے کہ آزادی سے ہمیں رَبُّنَا اللّٰہ کہنے دو اور مذہب کے معاملہ میں جبر نہ کرو۔ مگر باوجود اس کے کہ وہ ان کے نظام میں خلل نہ ڈالتے تھے وہ انہیں ایذا دیتے تھے۔

۵۸۳ تفسیر:- یعنی اس مصالحانہ پیش کش کے بعد بھی اگر یہ لوگ اپنے ارادہ سے باز نہ آئیں اور بلاوجہ مسلمانوں کو دکھ دیں تو تیرا کام تو صرف نصیحت ہے وہ تو نے کر دی۔ اب یہ اپنے نیک و بد کے خود ذمہ وار ہیں۔

۵۸۴ حل لغات۔ ینکرونہا: انکر سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اس کے معنے کے لئے دیکھو نحل ۵۲۳ و حجر ۵۲

تفسیر:- یعنی الٰہی نعمتوں کو اپنے نفوس میں دیکھتے ہوئے پھر بھی یہ لوگ ناشکری سے کام لے رہے ہیں۔ یَعْرِفُوْنَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اول تو انسان کو محض نعمت کو دیکھ کر ہی نصیحت حاصل کر لینی چاہیئے مگر ان کو تو اس سے بڑا مقام حاصل ہے اور وہ یہ کہ خود ان پر یہ نعمتیں نازل ہیں اور یہ اپنے نفوس میں ان نعمتوں کا وجود پاتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کا انکار کرتے جاتے ہیں۔ یعنی عملاً ان کی ناقدری کرتے ہیں یہ مراد نہیں کہ لفظاً انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ منہ سے تو کفار بھی کہتے تھے کہ یہ نعمتیں ہمیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں۔

(حاشیہ: ینکرونہا کے بعد اکثرھم الکافرون کہنے کی وجہ)

آخر میں فرمایا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ ان میں سے اکثر منکر ہیں کیونکہ یہ معنی تو ثُمَّ ینکرونہا میں آ چکے ہیں۔ نیز یہاں یہ الفاظ نہیں فرمائے کہ اکثرھم کافرون بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اکثرھم الکفرون۔ حالانکہ خالی یہ بات کہنے کے لئے کہ یہ کافر ہیں اس قدر کہنا کافی تھا کہ اکثرھم کٰفرون۔ الف لام کی زیادتی کی ضرورت نہ تھی۔ پس الف لام کی زیادتی زائد مفہوم پیدا کرنے کے لئے ہے جو اس موقعہ پر کامل کے معنے دیتا ہے۔ پس اکثرھم الکٰفرون کے معنے ہیں وہ پکے منکر ہیں۔ یعنی انکار عام نہیں بلکہ بڑا شدید ہے اور اصرار کے ساتھ ہے۔ الف لام کا یہ مفہوم قواعد نحو سے ثابت ہے۔ کہتے ہیں اَنْتَ الرَّجُلُ۔ تو کامل مرد ہے (اقرب)

(حاشیہ: لفظ کافرون پر الف لام لانے کی وجہ)

(حاشیہ: ینکرونہا)

یہی وجہ ہے کہ ینکرونہا میں تو سب کو شامل رکھا تھا اور اس جملہ میں اکثرھم کا لفظ استعمال فرمایا یہ بتانے کے لئے کہ یہ قوم ساری ہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کر رہی ہے۔ مگر ان میں سے اکثر تو اس انکار میں حد کو بڑھ گئے ہیں گویا قوم کی اکثریت میں عناد اور انکار کا مادہ شدت سے پیدا ہو گیا ہے۔

(حاشیہ: ترتیب مضمون کے لحاظ سے اس آیت کے معنی)

ترتیب مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ ایک طرف تو دنیوی نعمتوں کو تسلیم کرتے ہیں دوسری طرف روحانی نعمتوں کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ گویا اعتراف کا لفظ دنیوی نعمتوں کے متعلق ہے جن کا اقرار کرتے تھے

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ

اور (اس دن کو بھی یاد کرو) جس دن ہم ہر ایک قوم میں ایک گواہ کھڑا کریں گے پھر (اسوقت) ان لوگوں کو جنہوں نے کفر

لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ○ وَإِذَا رَاَ

(کا طریق) اختیار کیا ہو (معذرخواہی یا تلافی کی) اجازت نہیں دیجائیگی اور نہ (ہی) ان کا کوئی عذر قبول کیا جائیگا ۱۵۵ اور جن

اور مینکرونھا میں روحانی نعمتوں کا ذکر ہے جن کا وہ انکار کرتے تھے۔

۱۵۵ حل لغات۔ شہید کے معنے ہیں الشاھد۔ گواہ۔ الامین فی شہادتہ۔ ٹھیک ٹھیک گواہی دینے والا (اقرب)

شہید

يُسْتَعْتَبُوْنَ: اِسْتَعْتَبَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِسْتَعْتَبَهٗ کے معنے ہیں۔ اعطاہ العُتبیٰ۔ اس سے راضی ہوگیا۔ وطلب الیہ ای منہ العُتبیٰ۔ اس کی رضاء چاہی۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ "استعتبتُهٗ فاعتبنِي" ای استرضیتُهٗ فارضانی میں نے اس کی خوشنودی چاہی تو وہ مجھ سے خوش ہوگیا۔ اور انہی معنوں میں یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے کہ ما بعد الموت مستعتب ای استرضاءٌ۔ موت کے بعد کوئی طلب رضاء نہ ہوگی۔ العتبیٰ: الرضاء۔ عتبیٰ کے معنے رضامندی (اقرب) الاستعتاب ان یطلب من الانسان ان یذکر عتبَہٗ لیُعْتَب۔ استعتاب جو استعتب کا مصدر ہے۔ کے معنے ہیں کہ کوئی عذر بیان کرے تا کہ اس سے ناراضگی دور ہو سکے (مفردات) پس وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ ان کا کوئی عذر قبول نہ کیا جائے گا (۲) انکو رضا جوئی کا موقعہ نہ دیا جائیگا

یستعتبون

تفسیر:۔ اس جرم عظیم کے ذکر کے بعد پھر اُخروی زندگی کا حوالہ دیا کہ اس دنیا میں تو اس جرم کی سزا ملے ہی گی مگر آخرت میں یہ اور بھی زیادہ سزا پائیں گے اور وہ سزا اور ذلت بہت سخت ہوگی کیونکہ تمام ارواح انسانی خواہ ان کے اجسام کسی زمانہ میں کیوں نہ دنیا میں رہے ہوں جمع کی جائیں گی اور ہر قوم کا نبی سامنے لایا جائے گا اور اپنی قوم کے متعلق گواہی دے گا۔ پھر کیوں یہ لوگ اس ذلت کا جو اس وقت ان کو نصیب ہوگی خیال نہیں کرتے۔ ایک دوسری جگہ اس ذلت کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ (نساء ع۶) یعنی جب سب اقوام اور نبی جمع ہوں گے اس وقت ان کو ایسی ندامت ہوگی کہ یہ خواہش کریں گے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں دفن ہو جائیں۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں نبی مبعوث فرمائے ہیں۔ قرآن کریم نے یہ عقیدہ مختلف آیات میں بیان فرمایا ہے اور اس میں وہ دوسرے سب مذاہب سے منفرد ہے اور یہ اس کی صداقت کے ثبوتوں میں سے ایک زبردست ثبوت ہے۔

ہر قوم میں نبی کے مبعوث ہونے کا ثبوت

یہ جو فرمایا کہ کافروں کو اس وقت اذن نہ دیا جائیگا اس کے معنے بعض نے یہ کئے ہیں کہ انہیں بولنے کا اذن نہ دیا جائے گا۔ یہ معنے درست نہیں کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ کفار قیامت کو اللہ تعالیٰ سے کلام کریں گے اور اپنے عذرات بھی پیش کریں گے پس لَا يُؤْذَنُ سے مراد یا تو جنت میں دخول کی اجازت ہے اور یا اس کے معنے شفاعت کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ جب نبی حشر کے دن آئیں گے اور ان کو اپنی قوم کے ان افراد کے حق میں شفاعت کی اجازت دیجائیگی

کافروں کو اذن نہ دیئے جانے کا مطلب

الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا

لوگوں نے ظلم (کا طریق اختیار) کیا ہے وہ جب اس (موعود) عذاب کو دیکھیں گے تو (اسوقت) نہ (تو) وہ (عذاب) ان پر سے ہلکا کیا جائیگا اور نہ (ہی)

هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ

انہیں مہلت دی جائے گی ۵۸۶ اور جن لوگوں نے (اللہ تعالیٰ کے) شریک بنائے ہیں جب وہ (ان) اپنے (بنائے ہوئے) شریکوں کو

قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا

دیکھیں گے تو کہیں گے (کہ) اے ہمارے رب یہ ہمارے (بنائے ہوئے) شریک ہیں جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر

مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ

پکارا کرتے تھے جس پر وہ (بڑی جلدی سے) انہیں کہیں گے (کہ) تم

جو گو پوری طرح کامل نہ ہوئے تھے مگر اس کے قابل تھے کہ نبی انہیں اپنا کر سکیں اس وقت یہ لوگ شفاعت سے محروم رہ جائیں گے اور ان کے حق میں شفاعت کی اجازت نہ دی جائے گی۔ قرآن کریم اور حدیث سے شفاعت کے متعلق ثابت ہے کہ اذن سے ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا ع ۳) یعنی شفاعت صرف انہی کو فائدہ دے گی جن کے حق میں اذن الٰہی ہوگا۔ سورۃ یونس رکوع ۱۔ طٰہٰ رکوع ۶ اور النجم رکوع ۲ میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے اور سورۃ بقرہ رکوع ۳۴ میں بھی۔ حدیث میں بھی شفاعت کے متعلق اذن کا لفظ آتا ہے۔ مسند احمد حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۳ پر ابوبکرۃ کی روایت میں ہے ثُمَّ يُؤْذَنُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَالشُّهَدَآءِ اَنْ يَّشْفَعُوْا۔ یعنی پھر فرشتوں، نبیوں اور شہداء کو اللہ تعالےٰ اجازت دے گا کہ وہ شفاعت کریں۔

قرآن کریم میں ایک اور مفہوم بھی اس اذن کا بیان ہوا ہے۔ سورۃ المرسلات میں ہے وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ۔ یعنی کفار کو ایسی اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ عذر پیش کر سکیں یعنی ایسی کوئی اجازت انہیں نہ ملیگی کہ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ کوئی معقول عذر پیش کر سکیں۔

قیامت پر انبیا کی شہادت سے مراد — یہ جو فرمایا کہ قیامت کے دن انبیاء بطور گواہ کھڑے کئے جائیں گے میرے نزدیک انبیاء کی شہادت سے مراد ان کا نمونہ ہے کہ وہ اپنے نمونے کو پیش کریں گے کہ کلام الٰہی نے ہم پر یہ اثر کیا ہے۔ اس تعلیم کو ماننے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہمیں خدا مل گیا اور ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ اس طرح پر خدا تعالےٰ اس وقت کافروں کو شرمندہ کرے گا کہ دیکھو ہماری کلام کا اعجاز جس سے روحانی قوتیں حاصل کر کے ہمارا یہ نبی اس کمال تک پہنچ گیا اور تم اس کلام کا انکار کر کے کہاں سے کہاں جا گرے۔

شفاعت کیلئے اذن ضروری ہے

نبی اور کلام الٰہی میں تلازم — ہر نبی کلام الٰہی کے نتیجے کا عملی نمونہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کلام بغیر نبی کے نہیں آتا۔ نبی سے کلام کی شان کا پتہ لگتا ہے اور کلام سے نبی کی شان کا۔

۵۸۶ حل لغات - وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ — يُنْظَرُوْن

اَنْظَرَ سے مضارع جمع مذکر مجہول کا صیغہ ہے اور اس کے معنے ہیں انکو مہلت نہ دی جائیگی۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر ۵۹

تفسیر: ۔۔۔ اس جگہ عذاب سے مراد اُخروی عذاب ہے۔

ثلث

لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ۣالسَّلَمَ وَ

یقیناً جھوٹے ہو ۵۸۷ اور (اس حالت کو دیکھکر) وہ (ظالم جلدی ہی) اللہ تعالیٰ کے حضور (اپنی) اطاعت کا اظہار کرینگے اور

ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

جو کچھ وہ اپنے پاس سے گھڑا کرتے تھے وہ (سب انکے ذہن سے) غائب ہوجائیگا ۵۸۸ جن لوگوں نے (خود بھی) کفر (کا طریق) اختیار کیا

دُوْن

۵۸۷ حل لغات مِنْ دُوْنِكَ، دُوْنَ کا لفظ عربی میں آٹھ معنوں میں مستعمل ہوتا ہے (۱) فوق (یعنی بلند ہونے) کے مخالف معنے دیتا ہے۔ کہتے ہیں۔ ھو دونہ اَیْ احطّ منہ رتبۃً۔ کہ وہ اس سے رتبہ میں کم ہے (۲) ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنے اَسْفل (یعنی نیچے ہونے) کے ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں ھذا دُون ذالک ای مُتَسفّل عَنْہ۔ یہ اس سے نیچے واقع ہے۔ (۳) اَمَام (یعنی آگے) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں مشی دونہ ای اَمَامَہٗ وہ اس کے آگے آگے چلا۔

کفر اور جرم کی دوستی کبھی پکی نہیں ہوتی

(۴) وراء (پیچھے) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں قَعَد دونَہ ای ورَاءہٗ۔ وہ اس کے پیچھے بیٹھا۔ (۵) اور کبھی دُون کے معنے فوق (یعنی بلند ہونے) کے ہوتے ہیں۔ گویا یہ لفظ اضداد میں سے ہے (۶) اس کے معنی غیر (یعنی سوا) کے بھی ہوتے ہیں (۷) اس کے معنی شریف (اعلیٰ درجہ) کے ہوتے ہیں (۸) کسی چیز کے خسیس ہونے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں شیءٌ دونٌ ای خسیس کہ یہ چیز کم درجہ کی ہے۔ (اقرب) علاوہ ازیں کہتے ہیں۔ حَالَ القومُ دون فلانٍ ای اعْتَرَضُوا بینَہٗ وبین من یطلبہٗ فلم یقدر ان ینالہ۔ یعنی فلاں کے درمیان قوم حائل ہوگئی اور اس کو اسکے تلاش کرنیوالے سے بچالیا (اقرب)

اَلْقَوْا

اَلْقَوْا: اَلقیٰ سے جمع کا صیغہ ہے اور القاء الی الارضِ کے معنے ہیں طَرَحَہٗ۔ اس کو زمین پر پھینکا۔ اور اَلقیٰ الیہ القولَ و بالقولِ کے معنے ہیں۔ ابلَغَہٗ ایّاہ اس کو کوئی بات پہنچا دی۔ القیٰ علیہ القولَ۔ اَمْلاہ۔

اَلسَّلَم

اُسے کوئی بات لکھا دی۔ اَلْقیَ الیہ السمعَ: اَصْغیٰ۔ اس کی بات توجہ سے سنی (اقرب) مزید تشریح کیلئے دیکھو نحل ۵۲۹۔ پس القوا الیھم القول کے معنی ہونگے۔ وہ انکو جلدی یہ کہینگے۔

تفسیر:۔ القی الیہ القول کے معنے ہیں کہ اس کی طرف جواب پھینکا۔ اور پھینکنے سے مراد یہ ہے کہ وہ فوراً ان کے منہ پر جواب الٹا کر مارینگے کہ بس جھوٹ نہ بولو۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں ان کی خاطر یہ لوگ نبیوں سے لڑا کرتے تھے مگر قیامت کو خدا تعالے سے کہیں گے کہ ان معبودوں کو پکڑو کہ یہی ہم کو گمراہ کرتے تھے۔ اس میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ کفر و گناہ کی دوستی کبھی پکی نہیں ہوتی۔ کیونکہ انسان ایک حد تک دوسرے کی خاطر تکلیف اٹھا سکتا ہے حد سے زیادہ نہیں۔ پس کفر کی وجہ سے چونکہ مختلف عذاب آتے رہتے ہیں درمیان میں ایسے مواقع بھی آتے رہتے ہیں۔ جب اس دوستی کی حد ختم ہوجاتی ہے اور ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار شروع ہوجاتا ہے۔

یہ جو فرمایا فالقوا الیھم القولَ اس کے معنے ایک تو اچھی طرح کہنے کے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں القی الیہ القول: اَبلَغَہٗ۔ ان کلمات پنجابی ۲ان معنوں کے رو سے ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ خوب زور سے انہیں کہدینگے۔ نیز القی کے معنے پھینکنے کے ہیں اور پھینکنے کے لفظ میں جلدی کا مفہوم پایا جاتا ہے پس اَلْقیٰ الیھم القولَ کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ فوراً جواب دیں گے۔ ولا یخفف عنھم سے بتایا کہ یہ عذر ان کا غیر معقول ہے اگر کسی نے گمراہ کیا تھا تو وہ گمراہ ہوئے کیوں؟ کیوں نہ ورغلانے والے کی بات کو رد کیا۔

۵۸۸ حل لغات۔ السَّلَمَ کیلئے دیکھو نحل ۱۹ ۵

وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ

ہے اور (دوسروں کو بھی) اللہ (تعالیٰ) کی راہ سے روکا ہے ان کو ہم اس عذاب سے بڑھ کر ایک اور

الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ۝ وَيَوْمَ نَبْعَثُ

عذاب دیں گے کیونکہ وہ (ہمیشہ) فساد (کے کام) کرتے تھے ۵۸۹ اور (اس دن کو بھی یاد کرو) جس دن ہم

فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا

ہر ایک قوم کے اندر ان کے خلاف خود انہی میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے رسول)

بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

تجھے ہم ان (سب) کے خلاف گواہ بنا کر لائیں گے۔ اور ہم نے یہ کتاب ہر ایک بات کو کھول کر بیان

تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى

کرنے کے لئے اور (تمام لوگوں کی) رہنمائی کے لئے اور (ان پر) رحمت کرنے اور کامل فرمانبرداری اختیار کرنے وال

ضَلَّ عَنْهُمْ کے لئے دیکھو یونس ۳۱

يَفْتَرُوْنَ : اِفْتَرٰى سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اِفْتَرٰى علیه الکذب کے معنے ہیں۔ اِخْتَلَقَهٗ۔ اس کے خلاف جھوٹ بنا لیا (اقرب) پس ضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ کے معنے ہوں گے جو وہ گھڑا کرتے تھے ضائع ہو جائے گا۔

تفسیر:۔ یعنی جب کفار دیکھیں گے کہ آج تو وہ بھی ہمارے دشمن ہو رہے ہیں جن کی ہم عبادت کیا کرتے تھے تو وہ جلدی سے اپنے رویہ کو بدل کر لجاجت سے باتیں کرنی شروع کر دیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو آپ ہی کے بندے ہیں یہ عبادت وغیرہ تو صرف توجہ کے قیام کے لئے تھی یا ہم یہ کام نیک نیتی سے بیچ سمجھ کر کرتے تھے کوئی اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا منشا نہ تھا۔ اور جو بڑے بڑے دعوے وہ دنیا میں کرتے تھے سب غائب ہو جائیں گے۔

۵۸۹ حل لغات۔ اَلْفَوْقُ: فاق کا مصدر ہے جس کے معنے بلند ہونے کے ہیں۔ اصل میں ظرف مکان ہے۔ جیسے کہتے ہیں صَعِدْتُ فَوْقَ الْجَبَلِ کہ میں پہاڑ پر چڑھا۔ اور کبھی کبھی ظرف زمان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں لَبِثْنَا فوق شهرٍ ای زمانًا اکثر من شهرٍ ہم ایک ماہ سے زائد ٹھہرے۔ یہ معرب ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کا مضاف الیہ حذف ہو۔ اور معنے وہ ذہن میں ہو تو اس وقت یہ مبنی ہوتا ہے۔ اور اس کے آخر پر ضمہ آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں عندی مائةٌ فما فوقُ۔ کہ میرے پاس سَو سے اوپر چیزیں ہیں۔ یہاں فوق کے بعد مضاف الیہ حذف ہے۔ اور اگر مضاف الیہ بولا جائے۔ تو وہ معرب ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی فوق کا لفظ بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات زیادتی کے بیان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں العشرةُ فوق التسعةِ ای تزید علیها۔ دس نو سے زیادہ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کہتے ہیں هذا فوق ذالكَ ای افضلُ منه۔ کہ یہ اُس سے افضل ہے۔

يفترون

قیامت کے دن کفار کی بابت اپنے معبودان کے سامنے

الفوق

ع ۱۲ / ۱۸

لِلْمُسْلِمِيْنَ ۞ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ

کو بشارت دینے کے لئے اتاری ہے ۹۰ اللہ تعالیٰ یقیناً عدل کا اور احسان کا اور (غیر رشتہ داروں کو بھی)

وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ

قرابت والے (شخص) کی طرح (جانے اور مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور (ہر ایک قسم کی) بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں

افضل ہے (اقرب)

گمراہ کرنے والے کو قیامت کے دن زیادہ سزا ملے گی

تفسیر:- اس آیت میں بڑی فرق بتایا کہ کافر دو قسم کے ہیں ایک گمراہ اور ایک گمراہ کرنے والے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو دوسروں سے زیادہ سزا ملے گی۔

لطف یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ دنیا میں جاہلوں سے کہتے ہیں کہ ہم تمہاری نجات کے ذمہ وار ہیں لیکن وہاں جن کی نجات کے ذمہ وار بنتے تھے ان سے بھی زیادہ انہیں سزا ملے گی۔

تبیاناً

۹۰ حل لغات۔ تِبْيَانًا: یہ بَانَ کا مصدر ہے۔ اور بانَ الشیءُ (یبین تبیاناً) کے معنے ہیں۔ اتضح۔ کوئی چیز واضح ہوگئی اور بان کا فعل لازم ہے لیکن کبھی کبھی متعدی بھی استعمال ہوتا ہے (اقرب)

قرآن کریم میں ہر چیز کے متعلق موجود ہیں۔

تفسیر:۔ اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کو مکمل کیا گیا ہے فرماتا ہے جب سب نبی اپنے اپنے نمونہ کو پیش کریں گے اس وقت تو بھی ان لوگوں پر بطور گواہ پیش ہوگا اور ہم تجھے دکھا کر ان سے پوچھیں گے کہ یہ بھی تو تم میں سے ایک تھا یہ کیوں شرک وغیرہ بدعقائد میں نہ پھنسا۔ اور کیوں اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ بن کر دوسروں کی ہدایت کا موجب ہوا۔ کیا اسی وجہ سے نہیں کہ اس پر خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہوا تھا اور تم اس سے محروم تھے بلکہ اس کلام کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے۔

آیت میں آنحضرت کی شہادت سے مراد آپ کا نمونہ پیش کرنا ہے

اہل قرآن کو غلطی لگنے کی وجہ

اس کے بعد اس وحی کی برکات کی طرف اشارہ فرمانے کے لئے فرماتا ہے۔ اے محمدؐ ہم نے تجھ پر وہ کتاب اتاری ہے جس میں ہر روحانی ضرورت کی تشریح ہے اور اس میں رحمت اور ہدایت کے سامان ہیں۔ یعنی تجھ میں اور تیری قوم کے لوگوں میں جو فرق ہے وہ اسی کلام کی وجہ سے ہے۔

یہاں کُلّ شیءٍ سے دنیا کی ہر چیز مراد نہیں بلکہ وہ چیزیں مراد ہیں جو اسی کتاب سے مناسبت رکھتی ہیں۔ کوئی استاد اگر اپنے شاگرد کو کہے کہ ساری کتب اٹھا لاؤ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ لائبریری کی سب کتب اٹھا لائے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اپنی کتب اٹھا لاؤ ایسا ہی یہاں پر کُلّ سے مراد وہ چیزیں ہیں جو روحانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ بعض مسائل کی تفصیل صرف احادیث میں ملتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصول سب قرآن کریم میں بیان ہیں جو تفاصیل احادیث میں ہیں وہ قرآن کریم کی تفسیر ہیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا فہم سب سے زیادہ دیا تھا۔ وہ قرآن کریم سے جو مطالب اخذ کرتے تھے ہم نہیں کر سکتے۔ پس اگر آپ نے قرآنی مطالب کی بعض تفاصیل بیان کی ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم نامکمل ہے بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کامل فہم سے ان مسائل کا قرآن سے استنباط کیا۔ گو ہمارا ذہن اس باریکی کو نہیں پا سکا۔

اہل قرآن کہلانے والوں کو اس مسئلہ میں سخت غلطی لگی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرح کے آدمی تھے ان کی بات کیوں مانیں جو قرآن کریم میں ہے وہ مانیں گے حالانکہ رسول کریم

وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ وَاَوْفُوْا

اور بغاوت سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ سلا۹۱ اور (چاہیئے کہ)

بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ

اللہ (تعالیٰ) کے (ساتھ کئے ہوئے اپنے) عہد کو جب تم نے (اس سے کوئی) عہد کیا ہو پورا کرو اور قسموں کو

کی بات کے ماننے کا سوال نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ آپ ہم سے قرآن کریم کو زیادہ سمجھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے متعلق جو کچھ فرماتے تھے وحی الٰہی کے مطابق فرماتے تھے غلطی نہیں کرتے تھے پس جس کو اللہ تعالےٰ نے محفوظ رکھا اس کے فہمِ قرآن کو دوسروں کے فہم پر مقدم کیا جائے گا۔ ہمارا یہ حق ہے کہ یہ بحث کریں کہ یہ حدیث صحیح نہیں مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ حدیث تو صحیح ہے مگر رسول کریم صلعم نے غلطی کی۔ نعوذ باللہ من ذالک قرآن کریم کی تعلیم کے بارہ میں آپؐ کی تفسیر اگر ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو بھی آپؐ ہی کی تفسیر کو ہمیں صحیح ماننا پڑے گا بشرطیکہ جس حدیث میں وہ مذکور ہے وہ صحتِ احادیث کے اصول پر پوری اُترتی ہو

قرآن کریم کے چار کام

اس جگہ قرآن کریم کے چار کام بتائے ہیں۔ (۱) تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے یعنی سب ضروری امور روحانیہ کی تشریح اس میں موجود ہے (۲) ہدایت ہے (۳) رحمت ہے۔ (۴) مومنوں کے لئے بشارت ہے۔ اگلی آیات میں ان مطالب کی تشریح کی گئی ہے۔

سلا۹۱ حل لغات۔ اَلْعَدْلُ: عَدَلَ کا مصدر ہے اور عَدَلَ (يَعْدِلُ) فلانًا بفلانٍ کے معنے ہیں۔ سَوّٰى بينهما۔ دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا۔ عَدَلَ الْقَاضِي والوالی (عدلًا و عدالۃً) قاضی نے انصاف کیا۔ نیز العدل کے معنے ہیں۔ ضِدُّ الجور۔ انصاف۔ العادل المرضیّ للشہادۃ۔ درست گواہی دینے والا۔ راستباز۔ العدلُ من القضاۃِ والحکامِ: الوافونَ للحقِّ فی احکامِہم۔ وہ حکام اور قاضی جو درست فیصلے کرنے والے ہوں۔ (اقرب)

الاحسان: اَحْسَنَ سے مصدر ہے اور اَحْسَنَ کے معنے ہیں اتیٰ بالحسنِ۔ پسندیدہ کام کیا۔ احسن الشیءَ جعلہ حسنًا۔ کسی چیز کو عمدہ بنا دیا۔ عَلِمَہ کسی چیز کو جانا۔ اور انہی معنوں میں یہ فقرہ بولا جاتا ہے کہ فلان یحسن القرآءۃ ای یعلمُہا۔ فلاں شخص اچھی طرح پڑھنا جانتا ہے (اقرب)

القربیٰ: القربُ فی الرَّحِمِ۔ رشتہ داری (اقرب)

الفحشاءُ: الفاحشۃ سخت قباحت والا گناہ یا ہر وہ بات جس سے اللہ نے روکا ہے۔ البخل فی اداءِ الزکوٰۃ۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل (اقرب)

المُنکَر: انکر سے اسم مفعول ہے (اس کیلئے دیکھو حجر ۵۸) نیز اس کے معنے ہیں مالیس فیہ رضی اللہ من قولٍ او فعلٍ۔ والمعروفُ ضِدّہ۔ ناپسندیدہ بات یا فعل۔ معروف اس کے مخالف معنے دیتا ہے (اقرب)

تذکرون: تَذَکَّرَ سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور تذکّر کے وہی معنے ہیں جو ذکر کے ہیں۔ ذکر کے لئے دیکھو رعد ۲۰

تفسیر:۔ پچھلے رکوع کے آخر میں دعویٰ کیا گیا تھا وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔

یعنی قرآن کریم ان چار خوبیوں کا حامل ہے (۱) تبیانًا لکل شیئٍ (۲) ھدایت (۳) رحمۃ (۴) بشریٰ للمسلمین - اس رکوع میں اور اگلے رکوعوں میں اس امر کا ثبوت دیا گیا ہے کہ یہ چاروں امور قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں اور ان کی بنا پر قرآن کریم کے کامیاب ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

سب سے پہلا ثبوت یہ آیت ہے اور میرے نزدیک اس آیت میں جو مضمون بتایا گیا ہے وہی ان چاروں باتوں کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

کمل مذہبی تعلیم کے لئے تین ضروری خصوصیتیں

اس آیت میں تین باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تین باتوں سے رُکنے کا حکم دیا گیا ہے اور بُری باتوں سے روکنا رحمت پر دلالت کرتا ہے اور اچھی باتوں کے کرنے کا حکم دینا ہدایت پر دلالت کرتا ہے۔

پھر اس میں اخلاقی امور کے سب مدارج کو جمع کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ آیت جامع ہو گئی ہے اور تبیانًا لکل شیئٍ کی بہترین مثال ہے۔ آیت کو ختم لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ پر کیا گیا ہے۔ تذکّر کے وہی معنے ہوتے ہیں جو ذِکر کے معنے ہیں پس اس کے معنے یاد رکھنے یا خدا کی بڑائی کرنے کے ہیں اور لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ کے معنے ہیں تا تم اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کو یاد رکھو یا یہ کہ تا تم اللہ تعالیٰ کی تحمید و تمجید کرو۔ اور چونکہ یہی دونوں مقصد ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس آیت میں یہ بشارت بھی دی گئی ہے کہ اس تعلیم پر چل کر تم اپنی پیدائش کے مقصود کو پا لو گے۔

یہ آیت قرآن کریم کے جامع ہونے کی بہترین مثال ہے

دیکھو کس قدر چھوٹی سی آیت ہے اور کس طرح اس میں ان سب امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا قرآن کریم کی فضیلت کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس اعجاز کے ساتھ ایسی تفصیل قرآن کریم کے سوا اور کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ اور پھر کوئی اغلاق نہیں معمّہ نہیں مضمون صاف ہے ہر عقلمند ایک ادنیٰ تامل سے حقیقت کو معلوم کر سکتا ہے۔

اب میں آیت کے مضمون کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں ہر ایک چیز کیلئے ایک اثبات کا پہلو ہوتا ہے اور دوسرا نفی کا۔ کوئی چیز مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے دونوں پہلو مکمل نہ ہوں یعنی جن چیزوں کا اس کی تکمیل کے لئے موجود ہونا ضروری ہے وہ اس میں پائی جائیں اور جن چیزوں سے اس کی ذات میں نقص پیدا ہوتا ہو ان سے وہ پاک ہو۔

مذہب کو مدنظر رکھتے ہوئے مکمل تعلیم کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱- یہ کہ وہ ان باتوں کے کرنے کا حکم دے جن سے روحانیت اپنے کمال کو پہنچ سکتی ہو اور ان باتوں سے منع کرے جو اس کمال سے محروم رکھنے والی ہوں۔

۲- یہ کہ وہ ایسا قانون تجویز کرتے وقت جو صرف ایک شخص یا قوم سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ کثیر افراد اور کثیر اقوام سے تعلق رکھتا ہو۔ ان تمام طبائع کا لحاظ رکھے جن کے لئے وہ وضع کیا گیا ہو۔ اور ایسے احکام دے جن پر ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق عمل کر سکے۔

۳- تیسری خصوصیت مکمل تعلیم میں یہ ہونی چاہیئے کہ اس کے احکام بنی نوع انسان کے لئے قابل عمل ہوں اور ان سے کوئی فساد نہ مذہب میں یا اخلاق میں یا عقل میں یا تمدن میں نہ پیدا ہوتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان تینوں خوبیوں کو جمع کر دیا ہے۔ دیکھو کتنی چھوٹی سی آیت ہے مگر اس میں تکمیل کے دونوں پہلو (نفی و اثبات) کس خوبی اور خوش اسلوبی سے جمع کر دئے گئے ہیں۔ تین باتوں یعنی عدل۔ احسان اور ایتاءِ ذی القربیٰ کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تین باتوں یعنی فحشاء۔ منکر اور بغی سے روکا گیا ہے۔ عدل کے معنی برابری کے ہوتے ہیں یعنی انسان دوسرے سے ایسا سلوک یا معاملہ کرے جیسا کہ اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس پر ظلم کیا جاتا ہے تو وہ اتنا بدلہ لے سکتا ہے جتنا ظلم ہوا ہے مگر اس سے

زیادہ سختی نہیں کر سکتا۔ اگر اس سے کوئی شخص حسن سلوک کا معاملہ کرتا ہے تو اس کا بھی فرض ہے کہ کم سے کم اتنا حسنِ سلوک اس سے کرے۔

اللہ تعالےٰ سے عدل کرنے کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالےٰ نے اس کے ساتھ نیک معاملہ کیا ہے یہ بھی اس کا حق ادا کرے اور اپنے وجود سے اللہ تعالیٰ کیلئے اعتراضات کے مواقع پیدا نہ کرے۔ اسی طرح یہ کہ اس کا حق غیر اللہ کو نہ دے اور شرک میں مبتلا نہ ہو کیونکہ شرک کرنا گویا خدا کا حق چھین کر دوسرے کو دینا ہے اور یہ ظلم ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں شرک کا نام ظلم بھی رکھا گیا ہے۔ پس خدا کا بیٹا یا بیوی یا اس کے شریک قرار دینا عدل نہیں بلکہ ظلم ہے۔ کیونکہ ظلم اسی کو کہتے ہیں کہ ایک کا حق کسی اور کے سپرد کر دیا جائے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کی صفات کو اپنی طرف منسوب کر لینا بھی عدل کے خلاف ہے۔ مثلاً شریعت کا بنانا اور الہام الٰہی کا بھیجنا خدا تعالےٰ کا کام ہے۔ اب اگر کوئی شخص خود ہی شریعت بنانے کا مدعی بن بیٹھے یا الہام نازل کرنے کا۔ جیسا کہ بہاءاللہ وغیرہ نے کیا تو وہ عدل کو توڑتا ہے۔ اگر انسان خدا تعالےٰ کے ساتھ عدل کرے تو شرک، کفر اور نافرمانی سب مٹ جائیں۔

عدل سے بڑھ کر دوسرا درجہ احسان بتایا ہے احسان کا مفہوم یہ ہے کہ یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ دوسرا ہم سے کیا سلوک کرتا ہے بلکہ اگر وہ بُرا سلوک کرتا ہو تب بھی ہم اس کے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں۔ یہ مقام پہلے مقام سے بڑا ہے اور عفو، درگذر، غرباء کی مدد، صدقہ و خیرات اور قومی خدمات وغیرہ نیکیاں سب اس کے اندر شامل ہیں۔

علوم کی ترقی و تدوین کے لئے کوشش کرنا بھی اس کے اندر آ جاتا ہے کیونکہ ان کے نتیجہ میں اپنوں اور بیگانوں کو جسمانی اور روحانی فائدہ اور آرام پہنچتا ہے۔

تیسرا مقام ایتاء ذی القربٰی کا بتایا ہے جس کے معنے "رشتہ داروں کو دینا یا رشتہ داروں کا دینا ہے"۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ بنی نوع انسان سے ایسا سلوک کرو جیسا کہ ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار سے سلوک کیا کرتا ہے۔

۱ اللہ تعالیٰ سے عدل کے معنی

اس سلوک سے احسان کا سلوک مراد نہیں کیونکہ احسان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس سلوک سے وہ سلوک مراد ہے جو محبت طبعی کی وجہ سے مبادلہ کے خیال کے بغیر کیا جاتا ہے۔ احسان کرتے وقت تو انسان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے مجھ سے اچھا سلوک کیا ہے میں اس سے بہتر بدلہ دوں تا میری نیک نامی ہو یا گنہگار کی خطا معاف کرتے ہوئے یہ خیال آ جاتا ہے کہ میں اس سے حسن سلوک کروں گا تو اس کے دل سے بغض نکل جائے گا اور یہ میرا دوست بن کر میری تقویت کا موجب ہو گا۔ لیکن ماں جو اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے اور اس کے لئے قربانی کرتی ہے اس میں ذرہ بھر بھی بدلہ کی خواہش نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی محبت کی بنیاد اس کی اپنی ہی قربانی پر ہوتی ہے۔ ایک عورت کے ہاں جب اولاد نہیں ہوتی تو اس کے دل میں یہ خیال نہیں پیدا ہوتا کہ میرا لڑکا ہوتا تو وہ میری خدمت کرتا۔ بلکہ اُسے اولاد کی خواہش اس جذبہ کے ساتھ ہوتی ہے کہ میں اُسے پالتی، اس کی خدمت کرتی، اُسے کپڑے پہناتی، اُسے بیاہتی، اس کے بچوں کو کھلاتی۔ غرض اولاد کی خواہش کے وقت ماں کے دل میں خدمت لینے کا ادنےٰ سے ادنےٰ احساس بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس خواہش کا موجب اولاد کی خدمت کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ یہی وہ نیکی کا جذبہ ہے جو انسان کے لئے سب سے بڑی نیکی ہے اور جس کے حصول کے بعد انسان کا اخلاقی وجود مکمل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ احسان کا مقام حاصل کرنے کے بعد جبکہ تم کو لینے سے زیادہ دینے کی خواہش ہوتی ہے تو وہ مقام نیکی کا بھی حاصل کرو کہ جب بنی نوع انسان تمہیں اپنے بچے نظر آنے لگیں اور ان کی خدمت کی خواہش تمہارے دل میں اس طرح موجزن ہو جائے جس طرح ایک ماں کے دل میں اپنے بچہ کی محبت جوش مارتی رہتی ہے۔

۱ ماں کی محبت بے لوث ہوتی ہے

۲ ایتائ ذی القربیٰ کا درجہ

۱ احسان اور ایتای ذی القربیٰ قربِ الٰہی کی دو سیڑھیاں ہیں۔

یہ تعلیم جو اوپر بیان ہوئی ہے اس میں اثباتی تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے اور نہایت مختصر الفاظ میں اخلاق فاضلہ کے سب پہلوؤں کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس موقعہ پر یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق تو عدل میں ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شخص احسان یا ایتاء ذی القربیٰ کا معاملہ نہیں کر سکتا۔ مگر بندوں کے ساتھ سلوک کا حکم عدل میں بھی ہے اور پھر احسان و ایتاء ذی القربیٰ میں بھی ہے بلکہ پچھلے دو مقامات میں تو خالص بندوں ہی کے ساتھ تعلقات سلوک مراد ہیں۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کی مرضی کو پانے کے لئے بندوں سے سلوک ضروری ہے۔ گویا احسان اور ایتاء ذی القربیٰ قربِ الٰہی کی دو سیڑھیاں ہیں۔

۲ کامل تعلیم کے لئے تمام فطرتوں کا لحاظ ضروری ہوتا ہے۔

۳ فحشاء سے مراد

اس اثباتی تعلیم کے بعد نفی کے پہلو کو لیا گیا ہے اور اس میں بھی تین ہی باتوں سے روکا گیا ہے۔ سب سے پہلے فحشاء سے روکا ہے اور فحشاء کا لفظ جب مُنکر کے مقابل میں آئے تو اس سے مراد صرف وہ بدی ہوتی ہے جس کا علم صرف اس کے مرتکب کو ہو۔ دوسرے کو نہ ہو۔ اس کے بعد مُنکر سے روکا ہے۔ مُنکر سے مراد وہ بدی ہے جو لوگوں کو نظر آتی ہو اور وہ اُسے بُرا محسوس کرتے ہوں اگرچہ اس کا اثر باقی لوگوں کے حقوق پر عملاً بہت کم پڑتا ہو۔ مثلاً گالیاں دینا جھوٹ بولنا وغیرہ یہ سب منکر میں شامل ہیں۔ پس منکر سے اس لئے منع فرمایا کہ اس سے لوگوں کو ذہنی تکلیف پہنچتی ہے۔

۴ قرآنی تعلیم کی مکمل تعلیم ہے۔

تیسری بات جس سے روکا ہے وہ بغی ہے۔ یعنی کسی کا حق مار لینا۔ یہ بدی نہ صرف لوگوں کو محسوس ہی ہوتی ہے بلکہ اس سے لوگوں کو نقصان بھی پہنچتا ہے۔

۵ دنیا کی تمام بدیاں فحشاء منکر اور بغی میں آجاتی ہیں۔

دنیا میں جس قدر بدیاں پائی جاتی ہیں خواہ وہ کسی قسم کی ہی کیوں نہ ہوں اِن تینوں اقسام میں آجاتی ہیں یا تو بدی ایسی مخفی ہوتی ہے کہ لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہتی ہے یا ایسی ہوتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کا علم ہو جاتا ہے اور انہیں اس سے ذہنی تکلیف پہنچتی ہے اور یا پھر وہ بدی ایسی سخت ہوتی ہے کہ اگر بعض کو اس سے ذہنی تکلیف پہنچتی ہے تو بعض دوسروں کے حقوق اس فعل کی وجہ سے تلف ہو جاتے ہیں۔ ان سب قسم کی بدیوں سے بچنے کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے۔

میں نے اوپر بتایا تھا کہ کامل تعلیم کے لئے جو سب ضرورتوں پر حاوی ہو یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں تمام فطرتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

اس آیت میں جو تعلیم دی گئی ہے اس میں وہ بات بھی موجود ہے کیونکہ دنیا میں بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو فحشاء میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن ظلم کرنا ہرگز پسند نہیں کرتے اور اسی طرح کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جو ظلم کر کے دوسروں کا مال تو لے لیتے ہیں مگر جھوٹ سے ان کو نفرت ہوتی ہے اور وہ کسی کا حق مارنا بھی پسند نہیں کرتے مگر شریعت کی بیان کردہ وہ بدیاں جو انسان کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں یعنی دل میں کسی کا کینہ رکھنا یا عیب جوئی کرنا یا چغلی کرنا وغیرہ۔ وہ ان میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تین جامع الفاظ رکھ کر ہر قسم کی بدیوں کو اور سب طبائع کی بدیوں کو شامل کر دیا ہے۔ اور ایسا ہی نیکیوں کے ذکر میں بھی ہر قسم کے میلان والوں کو جمع کر دیا ہے۔ عدل کو بھی اور احسان کو بھی اور بلا مبادلہ خدمت کرنے کی طاقت کو بھی۔ اس کے علاوہ ان مختصر سے الفاظ میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ بدی سے بچنے اور نیکی کے اختیار کرنے کا راستہ کون سا ہے۔ چنانچہ نیکیاں گناتے ہوئے نیکی کے نچلے درجے کو پہلے بیان فرمایا ہے پھر اس کے اوپر کے درجہ کو پھر اُس کے اوپر کے درجہ کو۔ اسی طرح بدیوں کے ذکر کو سب سے پہلے نچلے درجہ کی بدی سے شروع کیا ہے پھر اس سے اوپر کی بدی بیان کی ہے اور پھر اس سے اوپر کی اور اسی طرح انسان کو نیکیوں کے حصول اور بدیوں سے بچنے کا طبعی طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جو انسان نیکی کے حصول کے لئے کوشش کرنی چاہے

اُسے پہلے عدل کا مقام اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے پھر احسان کا پھر ایتاء ذی القربیٰ کا۔ اسی طرح جو بدیوں سے بچنا چاہے اُسے پہلے بغی سے بچنا چاہیئے پھر منکر سے بچنے کے قابل ہو سکے گا اور پھر منکر سے بچنے کی جدوجہد کرنی چاہیئے پھر کہیں جاکر وہ فحشاء سے بچنے کے قابل ہوگا۔ اس کے برخلاف اس ترتیب سے اس امر کی طرف بھی رہنمائی کی گئی ہے کہ نیکی میں تنزل کی سیڑھی کون سی ہے۔ جو انسان ایتاء ذی القربیٰ کے مقام پر ہے اُسے اس پر مضبوطی سے قائم ہونا چاہیئے ورنہ گر کر احسان کے مقام پر آ جائے گا اور احسان پر جو کھڑا ہے اُسے اپنے مقام کا خیال رکھنا چاہیئے ورنہ عدل کے مقام پر آ گرے گا۔ اسی طرح اس پر خوش نہ ہونا چاہیئے کہ مجھ میں صرف فحشاء پائی جاتی ہیں کیونکہ جو فحشاء کا مرتکب ہوتا ہے منکر کا ارتکاب اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور پھر بغی کا۔

غرض اس بیان میں ترتیب کو مدنظر رکھ کر انسانی ذہن کو اس طرف منتقل کیا ہے کہ نیکی کرنے میں سب سے چھوٹی نیکی پہلے حاصل ہوتی ہے اور بدی کو ترک کرتے ہوئے سب سے بڑی بدی کو پہلے چھوڑا جاتا ہے۔ اس جدوجہد کی مثال سیڑھی کی ہے جو انسان نیکی کی عمارت پر چڑھنا چاہے وہ سب سے پہلے نچلے زینہ پر قدم رکھے گا اور پھر ایک ترتیب سے ترقی کرتا ہوا اوپر تک چڑھ جائے گا۔ اور جو شخص بدیوں کے مکان پر چڑھ چکا ہے اور نیچے اُترنا چاہتا ہے اُسے سب سے پہلا قدم اوپر کے زینہ پر رکھنا ہوگا۔ اور پھر وہ تدریجاً نیچے آتا جائے گا۔

میں نے اوپر ذکر کیا تھا کہ تیسری خوبی جس کا مکمل تعلیم میں پایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا سب انسانوں کے لئے ممکن ہو۔ یہ خوبی بھی مذکورہ بالا تعلیم میں پائی جاتی ہے۔ جہاں یہ تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے وہاں اس پر عمل بھی ہر درجہ اور طبقہ کے آدمیوں کے لئے ممکن ہے۔ وہ نہ تو ادنیٰ اخلاق کی تعلیم دے کر خاموش ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ ترقیات کے خواہشمند اس سے تسلی نہ پا سکیں اور نہ اعلیٰ اخلاق کے بیان پر بس کر دیتی ہے کہ کمزور انسان نیکی سے محروم رہ جائیں۔ بلکہ وہ نیکی اور بدی کے تمام مدارج کو بیان کرتی ہے تاکہ بدوں کو بدی چھڑانے میں مدد دے اور نیکوں کی نیکی کے حصول میں اعانت کرے۔ ایک بدی میں ڈوبے ہوئے انسان کو یہ کہنا کہ تُو ایسا نیک ہو جا کہ سب دنیا کا سہارا تُو ہی ہو اور تُو سب کے لئے بمنزلہ ماں کے ہو جا۔ ایسا ہی بے فائدہ ہوگا جیسے ایک الف، ب پڑھنے والے کو ایم اے کا کورس شروع کرا دینا۔ اسی طرح ایک اعلیٰ درجہ کے نیک آدمی کو یہ کہنا کہ دیکھو بغاوت اور سرکشی نہ کرو اور ظلم نہ کرو بالکل فضول بات ہوگی۔ جو شرارت میں بڑھا ہوا ہو اس سے پہلے بڑی بدیاں چھڑوائی جائیں تبھی اصلاح ممکن ہے۔ اور جو نیکی میں ترقی کر رہا ہو اُسے صرف باریک گناہوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بدی کی عام راہوں کو تو وہ پہلے ہی چھوڑ چکا ہے۔ اور یہ سب خوبیاں اوپر کی تعلیم میں موجود ہیں۔ وہ بڑی نیکی کی راہیں بھی بتاتی ہے اور چھوٹی نیکی کی بھی۔ اور بڑی بدیوں سے بھی بچاتی ہے اور چھوٹیوں سے بھی۔ اور ہر شخص خواہ کسی درجہ کا ہو اس کو سمجھ سکتا ہے اور اس پر عمل بھی کر سکتا ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں تین درجے بدی کے اور تین درجے نیکی کے بیان فرمائے گئے ہیں۔ چونکہ نیچر میں ہمیں یہ قانون رائج معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل سے پہلے ہر شے کو چھ مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس آیت میں گویا روحانی تکمیل کا سب نصاب بیان کر دیا گیا ہے جسے پڑھ کر انسان ساتویں درجہ یعنی کمال کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ جو بدیوں میں پڑے ہوئے لوگ ہیں انہیں پہلی جدوجہد بغی سے بچنے کے لئے کرنی پڑتی ہے۔ اس دلدل سے نکلتا ہے تو منکر کا کیچڑ آ جاتا ہے اور جب منکر کے کیچڑ سے نکلتا ہے تو فحشاء کے گرد و غبار میں پھنس جاتا ہے۔ جب اس سے نجات پاتا ہے تو عدل کے مرغزار کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

نیکی کے حصول اور بدی سے بچنے کا طبعی طریق

نیکی کرنے میں سب سے پہلے بدی کو پھر بڑی کو چھوڑنا چاہیئے

ہر چیز کی تکمیل کے چھ درجے ہوتے ہیں۔ ساتواں کمال کا

اسلامی تعلیم پر ہر درجہ کا آدمی عمل کر سکتا ہے

بدی سے نیکی کی طرف ترقی کے مدارج

اُسے قطع کر لیتا ہے تو احسان کا چمن آجاتا ہے۔ اسے طے کر لیتا ہے تو ایتاء ذی القربیٰ کا چشموں والا باغ آجاتا ہے اور اس کے آگے جنت ہی جنت ہے۔ اسی مناسبت سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ اس آیت میں بھی ایتاء ذی القربیٰ کو جو ماں کے سے سلوک پر دلالت کرتا ہے تکمیل کا آخری اور جنت کا پہلا مقام بتایا گیا ہے۔ اور جنت کا مقام ذاکر کا ہے جو خدا تعالیٰ میں محو ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کے دل میں ڈیرا جما لیتا ہے اور محب اور محبوب دائمی اور نہ ٹوٹنے والے رشتہ میں پروئے جاتے ہیں۔

اس آیت کی اہمیت ابتداء اسلام سے ہی مسلم ہے

یہ آیت ہر جمعہ میں خطبہ کے دوسرے حصہ میں پڑھی جاتی ہے اور یہ رواج حضرت عمر بن عبد العزیز اموی خلیفہ کے عمل سے شروع ہوا ہے۔ اس امر سے ظاہر ہے کہ مسلمان ابتداء ہی سے اس آیت کی اہمیت کو سمجھتے رہے ہیں۔

عیسائی اس آیت پر بہت چڑتے ہیں اور ویری نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ مسلمان اس تعلیم کو اعلیٰ اعلیٰ کہہ کر پیش کرتے ہیں وہ ہمارے مسیح کی تعلیم سے تو اس کا مقابلہ کریں جو متی باب ۲۲۔ ۳۷۔ ۳۹ میں بیان ہے جہاں لکھا ہے "خداوند اپنے خدا سے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ" حالانکہ مسیح کی اس تعلیم پر عیسائیوں کا فخر بالکل بے جا اور فضول ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم کے مقابلہ میں اس تعلیم کو پہلے قدم کی سی حیثیت حاصل ہے۔

مسیحیت کی تعلیم کا مقابلہ اسلامی تعلیم سے

بے شک مسیح نے کہا کہ "خدا سے اپنے سارے دل اور ساری جان اور ساری عقل سے محبت رکھ" مگر سوال یہ ہے کہ دل کس نے دیا؟ جان کس نے دی؟ عقل کس نے عطا فرمائی؟ اللہ نے۔ پس ان کے ساتھ جو بھی محبت کی جائیگی وہ عدل کے مقام سے اوپر نہیں جا سکتی ہاں عدل کا لفظ اس فقرہ سے بہت زیادہ وسیع ہے کیونکہ ان چیزوں کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں جن کی قربانی ضروری ہوتی ہے مثلاً احساسات وجذبات جب تک انسان اپنی ہر ایک خواہش ہر ایک ارادہ اور دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر خدا سے محبت نہ کریگا تو وہ عدل کرنے والا نہیں کہلا سکتا۔ بے شک ساری جان سے محبت کرنا اچھی بات ہے مگر کئی لوگ ہیں جو اپنی جان سے بڑھ کر اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور کئی ایسی طبائع ہیں جو اپنے دل اور اپنی جان کی نسبت مال سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اور کئی اس فطرت کے ہوتے ہیں جو اپنی عزت وناموس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ تو خالی ساری جان، سارے دل اور ساری عقل کے لفظ کے اندر ہر قسم کی قربانی اور خدا تعالیٰ سے کامل محبت جس کو عدل کا لفظ ظاہر کرتا ہے نہیں آسکتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دوسری جگہ مختلف قسم کے جذبات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

"قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ" (توبہ ع ۳)

کہہ دے کہ اگر تمہیں اپنے آباؤ اجداد یا اپنی اولاد یا اپنے بھائی یا اپنی بیویاں یا اپنی قوم اور قبیلہ یا اپنے اموال اور تجارتیں خدا اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے پیارے ہیں تو تم وہ چیز نہیں ہو جو قبول کئے جانے کے لائق ہو پس انتظار کرو یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کا فیصلہ آجائے۔ اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو کبھی کامیاب نہیں کرتا۔

دیکھو اس میں ہر قسم کے انسانوں کے لئے خدا تعالیٰ سے محبت کا معیار بتا دیا ہے۔ بعض لوگ جن میں احسان کی قدر کا مادہ زیادہ ہوتا ہے انہیں اپنے ماں باپ سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کے لئے فرمایا کہ قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ اگر تم خدا کے مقابلہ میں اپنے آباء سے

زیادہ محبت کرتے ہو تو تم ابھی تک مومن نہیں۔

بعض لوگوں کے اندر بقائے نسل کا تقاضا بہت نمایاں ہوتا ہے اور وہ اپنی اولاد کو سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے "ابناء کم" کا لفظ فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ جب تک تم اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر خدا سے محبت نہ کرو گے اس وقت تک تمہارا ایمان قبولیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔

پھر کئی لوگوں کو بھائی سب سے پیارا لگتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے "اخوانکم" کا لفظ رکھ کر فرمایا کہ جب تک تم اپنے بھائیوں سے بھی زیادہ خدا تعالیٰ سے محبت نہ کرو تم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔

کئی ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر شہوت کا غلبہ ہوتا ہے اور انہیں اپنی بیویاں دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہیں ایسے لوگوں کے لئے "ازواجکم" کا لفظ رکھا گیا اور بتایا گیا کہ اس صورت میں جب تک تم اپنی بیویوں کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع نہ کرو گے تم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض لوگ اپنے قبیلے اور خاندان کو سب چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں ان کے لئے "عشیرتکم" کا لفظ فرما کر توجہ دلائی کہ جب تک اللہ تعالیٰ کو اپنے قبیلہ سے بھی زیادہ نہ چاہو گے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض ایسے بخیل ہوتے ہیں کہ جنہیں روپیہ اپنی اولاد اور جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ بیسیوں ایسے لوگ دیکھے گئے ہیں جنہوں نے باوجود مالدار ہونے کے اپنی اولاد کے لئے کوئی دوائی تک منگا کر نہ دی اور وہ ان کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ تو ایسے لوگوں کے لئے فرمایا کہ اپنے اموال کو بھی خدا تعالیٰ کی محبت پر مقدم نہ رکھو ورنہ کبھی نیکی کا اعلیٰ مقام نہ پا سکو گے۔

بعض لوگ اس طبیعت کے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ملک اور وطن کی خدمت کو اپنی ہر ایک چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور ان کا نعرہ ہی حب الوطن من الایمان ہوا کرتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے ملک میں ہجرت کے زمانہ میں ہزاروں لوگ اپنی اولاد۔ جائداد اور اموال چھوڑ کر ملک کی محبت کے نام پر ملک بدر ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے لئے فرمایا کہ اگر تمہیں اپنے وطن اور گھر خدا سے زیادہ پیارے ہیں تو تم ابھی مومن نہیں ہو۔

فطرت انسانی کی محبوب ترین اشیاء کی تفصیل

قرآن کریم نے عدل کی یہ مختصر سی تشریح فرمائی ہے اب اس تعریف کے مقابلہ میں "سارے دل سارى عقل اور ساری جان" والی بات کیا حقیقت رکھتی ہے؟

متی کے اس حکم کا دوسرا حصہ یہ ہے "دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔" اول تو یہی خلاف عقل ہے کہ اس حکم کو پہلے کی مانند قرار دیا جائے بے شک یہ ضروری حکم ہے مگر اسے پہلے حکم کی مانند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خدا تعالیٰ بہر حال مقدم ہے۔ مانند ماننے کا تو یہ مطلب ہے کہ اگر کبھی خدا تعالیٰ کا حکم اور پڑوسی کی خواہش ٹکرا جائیں تو تم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور کہیں کہ دونوں پہلو برابر ہیں یہ بھی ویسا ہی پیارا ہے اور وہ بھی۔ ایک کو دوسرے پر کس طرح ترجیح دی جائے۔

اور پھر یہ حکم بھی عدل سے اوپر نہیں جاتا۔ کیونکہ اس میں ہر شخص کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے پڑوسی سے اپنے جیسی محبت کرے۔ تو گویا یہ وہ پہلا مقام ہے جس کو اسلام نے عدل قرار دیا ہے یا زیادہ سے زیادہ احسان کا مقام ہے۔ مگر اسلام اس مقام سے انسان کو اوپر لے جاتا ہے اور فرماتا ہے کہ نہ صرف تم عدل کرو اور نہ صرف احسان کرو بلکہ تم بنی نوع انسان سے ایسا سلوک کرو جس میں کسی قسم کی ریاء یا بدلے کی خواہش کا شائبہ بھی نہ ہو۔ جس طرح ماں اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے وہ اُسے اپنے برابر نہیں چاہتی بلکہ اپنے آپ کو اس کے آرام کے لئے قربان کر دیتی ہے۔

عیسائیت کی تعلیم کا معیار صفت عدل سے بڑھ کر نہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے اس آیت میں نیکی اور بدی کے جو مدارج بیان فرمائے ہیں اور پھر جو ان کی ترتیب بیان فرما کر ان سے بچنے کی راہنمائی کی ہے وہ انجیل میں کہاں؟ پھر قرآن مجید نے اس حکم میں مختلف فطرتوں کا لحاظ

بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ

انہیں پختہ کرنے کے بعد جب کہ تم نے اللہ (تعالےٰ) کو (اس کی قسم کھا کر) اپنا ضامن بنا لیا

كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا

ہے مت توڑو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ (تعالےٰ اُسے) یقیناً جانتا ہے۔ ۱۲۵۹ اور تم اس ڈر سے کہ کوئی قوم

رکھتے ہوئے ایک جامع تعلیم دی ہے۔ مگر انجیل میں ان سب باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پس قرآن کریم کی تعلیم ہی جامع۔ کامل۔ قابلِ عمل اور اعلیٰ ہے ؛

عہد اللہ سے مراد اسلام قبول کرنا ہے

۱۲۵۹ حل لغات۔ كَفِيْلٌ: كَفَلَ الرجلَ والصغيرَ (كفلًا وكفالةً) عالهٗ وانفقَ عليه وقامَ بهٖ. کسی کی پرورش کی اور اس کے اخراجات کو اٹھایا۔ اس سے اسم فاعل کَافِلٌ ہے۔ کفل بالمالِ (كفلًا وكفولًا) ضَمِنَهٗ۔ کسی مال کا ضامن ہوا۔ اور اس سے صیغہ صفت کفیل آتا ہے کفیل کے معنے ضامن کے ہیں۔ کافل اور کفیل ایک ہی معنے رکھتے ہیں۔ نیز لفظ کفیل مذکر و مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں۔ رجلٌ كفيلٌ ۔ وامرأةٌ كفيلٌ۔ اور لیث نے کفیل اور کافل کے درمیان فرق کیا ہے۔ کہتا ہے۔ کہ کفیل ضامن کو کہتے ہیں اور کافل وہ شخص ہوتا ہے جو کسی کے اخراجات برداشت کرتا ہے (اقرب)

کفیل

تفسیر:۔ بِعَهْدِ اللّٰهِ ۔ عہد اللہ سے کیا مراد ہے۔ اس کی تشریح دوسری جگہ قرآن شریف میں آئی ہے (۱) اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

عہد اللہ کی تشریح

"اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا" (الفتح ع ۱) وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ یقیناً اللہ کی بیعت کرتے ہیں اور اللہ کی مدد ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ پھر جو شخص اس بیعت کو توڑ دیتا ہے وہ اپنے نفس کا نقصان کرتا ہے اور جو اس "عہد اللہ" کو پورا کرتا ہے تو اس کو خدا تعالیٰ اجر عظیم دے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ "عہد اللہ" سے مراد اسلام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں آپؐ کی بیعت مراد ہوتی تھی اور آپ کے بعد اسلام میں داخل ہونا۔

(۲) اللہ تعالےٰ کفار کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے وَقَالَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْهِ۔ کہ کفار کہا کرتے تھے کہ تم صبح کے وقت مسلمان بن جاؤ اور شام کو مرتد ہو جانا۔ اسی سلسلہ کے ضمن میں چند آیات کے بعد فرماتا ہے بَلٰي مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰۗىِٕكَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُھُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (آل عمران ع ۸) یوں نہیں جو تم کہتے ہو بلکہ بات یوں ہے کہ جو اپنے عہد کو پورا کرے اور تقویٰ سے کام لے تو (اس کا انجام اچھا ہوگا کیونکہ) اللہ متقیوں سے پیار کرتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلہ میں دنیوی فوائد اٹھاتے ہیں یقیناً ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے کلام نہ کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف (محبت سے) دیکھے گا۔ اور نہ انہیں پاک قرار دیگا۔ اور انہیں دردناک عذاب ملے گا۔

كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ

ایسی (نہ) ہو جائے جو (کسی) دوسری قوم سے زیادہ طاقتور ہو اپنی قسموں کو آپس میں دھوکا کرنے کا ذریعہ

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ

بناتے ہوئے اس عورت کی طرح مت. جس نے اپنا محنت سے کاتا ہوا) سوت (اس کے) مضبوط ہو چکنے

ان آیات سے بھی ظاہر ہے کہ "عہد اللہ" سے مراد اسلام قبول کرنا ہے۔

(۳) پھر فرمایا ہے وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا۔ فرمایا کہ ان لوگوں نے لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ کا عہد کیا تھا مگر اسے پورا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے جو عہد کئے جاتے ہیں ان کے توڑنے پر ضرور پرسش ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم قرآن کریم میں دیکھتے کہ ان کا یہ عہد کہاں مذکور ہے تو منافقوں کی طرف سے اس کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں ملتا۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ملتا ہے۔ چنانچہ سورۃ انفال میں ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (انفال ع ۲) کہ اے مومنو جب کفار سے تمہارا مقابلہ ایسی حالت میں ہو کہ تم مل کر حملہ کرنے لگے ہو تو کبھی پیٹھ نہ پھیرا کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا حکم ہے منافقوں کا کوئی ایسا عہد قرآن و حدیث میں مذکور نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ "عہد اللہ" سے مراد وہی بیعت والا عہد تھا جس میں سب نیک باتوں کے ماننے کا عہد کیا گیا تھا۔ اور سب احکام الٰہی اس میں شامل تھے۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں اس عہد کی تشریح یوں کی گئی ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (توبہ ع ۱۴) کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جانیں اور ان کے اموال اس وعدہ کے مقابل کہ انہیں جنت ملے گی خرید لئے ہیں۔ چنانچہ اس سودے کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں کبھی تو وہ دشمن کو قتل کر دیتے ہیں کبھی خود مارے جاتے ہیں۔ یہ جنت دینے کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پکا وعدہ ہے جو تورات و انجیل اور قرآن سب میں بیان ہوا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے عہد کر کے اُسے پورا کرتے ہوں ہم انہیں کہتے ہیں کہ اس نفع مند بیع پر جو تم نے کی ہے خوش ہو جاؤ اور یہ بیع ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

غرض قرآن مجید سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ "عہد اللہ" سے مراد اسلام ہی ہے اور اذا عاھدتم کے معنے یہی ہیں کہ جب تم مسلمان ہوئے ہو تو اسلام کی تعلیم پر پورے طور سے عمل کرو۔ چونکہ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ والی آیت میں بتایا گیا تھا اس لئے اس کے بیان کرنے کے بعد اس آیت میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ اب تم لوگ اس تعلیم کے مطابق عملدرآمد کرو۔

آنحضرت کے زمانہ کی بیعت سے مراد بیعت والا عہد تھا

اس آیت کے پہلے حصہ میں یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تم جو عہد کرتے ہو اس کو بھی پورا کرو۔ اور جو تمہارے آپس میں معاہدات ہوتے ہیں اُن کو بھی مت توڑو۔ یعنی جب تم خدا تعالیٰ کو ضامن

أُمَّةٌ هِيَ أَرْبٰى مِنْ أُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ

کے بعد توڑ کر پارہ پارہ کر دیا تھا اس (ذریعہ) سے اللہ (تعالیٰ عنقریب) تمہارا امتحان لے گا

وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ

اور جس بات کے متعلق تم آپس میں اختلاف کرتے رہے ہوگے اس (کی حقیقت) کو وہ قیامت کے دن ضرور تمہارے

تَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً

سامنے کھول (کر رکھ) دیگا ۹۳ اور اگر اللہ (تعالیٰ) اپنی (ہی) مشیت نافذ کرتا تو وہ تم (سب) کو ایک ہی جماعت بناتا۔ لیکن

کر کے کسی انسان سے معاہدہ کرو۔ تو اس کو ضرور پورا کرو۔ کیونکہ تم خدا تعالےٰ کو ضامن مقرر کر چکے ہو۔ پس خدا کا نام لیکر کئے ہوئے معاہدہ کو اگر تم توڑو گے تو گویا خدا تعالےٰ کو بد نام کرنے والے ہوگے۔ اور خدا تعالےٰ کو غیرت آئے گی اور اُسے تمہیں سزا دینی پڑے گی۔

اس آیت میں پھر اسی مضمون کو قائم رکھا گیا ہے جو پہلی آیت میں بیان ہوا تھا۔ یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا اسلام اور عہد الٰہی اللہ تعالیٰ اور بندوں کے صحیح تعلق پیدا کرنے کے دو نام ہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورا کرنیکا حکم

یہاں جو یہ فرمایا کہ اس عہد کو پورا کرو جس میں تم نے اللہ تعالےٰ کو ضامن مقرر کیا ہو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے عہد پورے نہ کرو تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ خدائی عہد میں سچ بولنا شامل ہے۔ بلکہ ان الفاظ سے اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انہی عہدوں کی پابندی انسان پر فرض ہے کہ جن کا ضامن اللہ تعالیٰ ہو۔ جن عہدوں کا ضامن اللہ تعالےٰ نہ ہو ان کا پورا کرنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ گناہ ہے۔ مطلب یہ کہ ہر وہ عہد جو انصاف اور سچائی پر مبنی ہو اس کا اللہ تعالےٰ ضامن ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر مومن سے سچائی کا عہد لے چکا ہے اور جو شخص اس عہد کے بعد کسی انسان سے کسی جائز امر کا اقرار کرتا ہے وہ اس عہد کے ساتھ گویا خدا تعالےٰ سے بھی ایک عہد باندھتا ہے اور خدا تعالیٰ اس عہد کا ضامن ہو جاتا ہے۔ لیکن جو عہد کسی ناپاک امر یا ظلم کے متعلق ہو اس کا پورا کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ گناہ ہے۔ اللہ تعالےٰ اس عہد کا ضامن نہیں۔ کیونکہ وہ گناہ اور ناپاکی کے لئے ضامن نہیں ہوتا۔ غرض اللہ تعالیٰ کے ضامن ہونے سے اس طرف اشارہ نہیں کیا کہ جن عہدوں پر قسم کھاؤ صرف انہیں پورا کرو۔ بلکہ اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سب وہ عہد جو عدل، احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کے مطابق ہوں انہیں پورا کرو اور وہ عہد جن میں فحشاء، منکر اور بغی کا رنگ پایا جاتا ہو انہیں پورا نہ کرو ان کے بارہ میں تم سے کوئی سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ ان کا ضامن نہیں۔ بلکہ اُن سے منع کرتا ہے۔ مذکورہ بالا حکم میں ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو اگر کسی ناجائز امر پر قسم کھا لیتے ہیں تو عہد کی پابندی کے نام سے اس پر مصر رہتے ہیں۔

۹۳ حل لغات

نقضت

نَقَضَتْ: نَقَضَ سے مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور نقض البناءَ کے معنے ہیں ھَدَمَہٗ۔ عمارت کو گرا دیا۔ نَقَضَ العظمَ: کسرَہٗ۔ ہڈی کو توڑ دیا۔ نقض الحبلَ: حلّہٗ: رسّہ کے بل کو کھول دیا (اقرب)

غزلہا

غزلہا: غزلت المرأۃُ القطنَ والصوفَ: مدّتہٗ

وَ غَزَلَتْهُ خَيطاناً عورت نے سُوت کاتا۔ الغزل مصدر ہے۔ اور غزل سُوت کو بھی کہتے ہیں (اقرب) اَنْكَاثًا: نِكْثٌ کی جمع ہے۔ اور النکث کے معنے ہیں مَا نقض من الاكسية والاَخْبِيَةِ ليغزل ثانيةً۔ کچے تاگے۔ اس کی جمع انکاث آتی ہے (اقرب) دَخَلاً: الدَّخَلُ کے معنے ہیں ما دَاخَلك من فساد في العقل او في الجسم۔ جسم اور عقل میں خرابی۔ الخديعةُ والمكرُ۔ دھوکا اور فریب اور آیت لا تتخذوا ايمانكم دخلاً بينكم میں انہی معنوں میں آیا ہے۔ اور وہاں پر مفعول لہٗ ہے (اقرب)

اَرْبٰى: رَبَى سے اسم تفضیل ہے اور ربا (یربو) المالَ کے معنے ہیں زاد و نما۔ مال زیادہ ہو گیا اور بڑھ گیا۔ اَرْبَى عليه كذا۔ یعنی کسی سے آگے بڑھ گیا (اقرب) پس اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ کے معنے ہوں گے۔ کہ ایک قوم دوسری سے زیادہ طاقتور ہے۔

يَبْلُوْكُمْ: يبلو۔ بلیٰ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور بَلَاهُ يَبْلُوْهُ بَلاءً کے معنے ہیں۔ جرّبه واختبره۔ اس کا امتحان لیا (اقرب) پس يبلوكم کے معنے ہونگے۔ کہ وہ تمہارا امتحان کرتا ہے۔

تفسیر:۔ اس آیت کو ایک نیا مضمون بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور پچھلی آیت کے مضمون کا تسلسل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر پہلی آیت کے مضمون کو ہی جاری سمجھا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ آپس کے معاہدات کو پوری طرح سے نبھاؤ۔ اگر تم ان عہدوں کو توڑو گے تو خدا تعالیٰ نے جو تمہاری مضبوط جماعت بنا دی ہے وہ تباہ ہو جائیگی اور آپس کا اعتبار جاتا رہے گا۔

معاہدات کی پابندی قومی اتحاد کے قیام کیلئے اشد ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ جماعت کا قیام ایک دوسرے سے حسن سلوک پر مبنی ہوتا ہے اور حسن سلوک اسوقت تک رہتا ہے جب تک لوگ معاہدات کی پابندی کریں۔ جب لوگ معاہدات پورے نہ کریں۔ تو پہلے بددلی اور اس کے بعد بدظنی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک شخص کے بُرے عمل کے نتیجہ میں دوسرے سینکڑوں آدمی قومی نظام کے فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ پس چاہیئے کہ انسان جسطرح بھی ہو سکے اپنے وعدوں کو پورا کرے تا کہ اعتبار قائم ہو اور لوگ برضا و رغبت ایک دوسرے کی امداد کے لئے تیار رہیں اور قوم ترقی کر سکے۔

دَخَلاً

انفرادی عہد کے علاوہ ایک قومی عہد بھی ہوتا ہے یعنی افراد ایک شخص کے ہاتھ پر قومی ترقی کے لئے عہد کرتے ہیں جس کا نام خلافت ہے۔ وہ عہد بھی اس کے اندر شامل ہے اور اس آیت میں اسکی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہاری ایک جماعت بنا دی ہے اور ایک نظام قائم کر دیا ہے اور تم نے اس نظام کی پابندی کی قسمیں کھائی ہیں۔ اب اسکی پابندی کرتے رہنا۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری قربانیوں سے جو رعب اسلام کا قائم ہوا ہے وہ جاتا رہیگا۔ اور پھر نئے سرے سے محنت کرنی پڑیگی۔ یہ ایک بہت بڑا سیاسی نکتہ بتایا ہے۔ چند آدمیوں کے تفرقہ سے سب نظام برباد ہو جاتا ہے اور قوم کی محنت اکارت جاتی ہے اور نئے سرے سے محنت اور قربانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر اُدھڑی ہوئی چیز پھر اس طرح نہیں جُڑتی جیسے کہ نئی۔ اور پھٹے ہوئے دل پھر اس طرح نہیں ملتے جس طرح کہ وہ جو ہمیشہ متصل رہے۔ اس لئے اس عہد کے قیام کے لئے نہایت سخت کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

قومی عہد کی تشریح

اَرْبٰى

يبلوكم

اس آیت کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غیر قوموں کے ساتھ معاہدات کا بھی ذکر ہے۔ اس مضمون کے لحاظ سے اس آیت کو ایک مستقل مضمون قرار دینا ہوگا۔ یعنی لا تكونوا سے نیا مضمون شروع سمجھا جائیگا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنے اندرونی عہد کی پابندی لازمی ہے۔ اسی طرح دوسری اقوام کے ساتھ جو عہد کئے گئے ہوں انکی پابندی بھی ضروری ہے۔ ان معاہدات کی نگہداشت رکھو ورنہ دنیا کا امن برباد ہو جائیگا۔ چنانچہ دخلا کا لفظ بھی اسی بات کو ظاہر کرتا ہے اور كَالَّتِيْ

اس آیت کا مطلب پہلی آیت سے متعلق ہونے کی صورت میں

اس آیت سے بھی دوسری اقوام سے معاہدات کی پابندی لازمی ہے۔

نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ سے بھی یہی مراد ہے کہ امن کے قائم ہونے کے بعد فساد کی صورت پیدا نہ کرو۔

معاہدہ کے متعلق مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام

اس صورت میں اس آیت کے تین معنے ہو سکتے ہیں (۱) یہ جائز نہیں کہ تم کسی دوسری قوم سے اس لئے صلح کر لو کہ ابھی وہ طاقتور ہے تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ معاہدہ کے بعد جب وہ تمہاری طرف سے غافل ہو جائے گی تو تم اندر ہی اندر تیاری کر کے یکدم اس پر حملہ کر کے اُسے تباہ کر دو گے۔ سیاسی دنیا اس قسم کی حرکات ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔ اسلام کی بنیاد چونکہ عدل۔ احسان اور ایتاء ذی القربیٰ پر ہے وہ اس فعل کو خواہ وہ دشمن اسلام کے مقابل پر کیا جائے ناپسند کرتا اور اس سے منع فرماتا ہے۔

دوسری قوم سے معاہدہ کرتے وقت صفائی نیت ضروری ہے

(۲) دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ ایسے معاہدات نہیں کرنے چاہئیں کہ جن کی غرض یہ ہو کہ کسی کمزور قوم کے ساتھ بظاہر تو معاہدہ کیا جائے اور دراصل غرض اس کے ملک پر قبضہ کرنے کی ہو۔ جیسا کہ یوروپین قومیں آج کل کر رہی ہیں۔

ایسے معاہدے ناجائز ہیں جو کسی قوم کو کمزور کر کے اس کے ملک پر قبضہ کرنے کی نیت سے ہوں

(۳) تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ ایسے معاہدات ہرگز جائز نہیں جن کی غرض معاہد قوم کو کمزور کرنا ہو۔ چاہیئے کہ جس سے صلح کرو اس سے پوری صلح کرو۔

اس آیت میں کس قدر زبردست اخلاقی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ قومی برتری بے شک اچھی چیز ہے لیکن دھوکے اور فریب سے اس کا حصول ہرگز جائز نہیں معاہدات کی غرض قیام امن ہونا چاہیئے نہ کہ دوسرے کا نقصان یا فریب دہی۔

کس مپرسی کی حالت میں اسلام کی یہ اعلیٰ تعلیم بھی معاہدات کی دلیل ہے۔

آجکل یورپ کی تباہ شدہ حالت معاہدہ کی اسلامی تعلیم کو چھوڑنے کی وجہ سے

اس کے مقابل میں دیکھو یورپ آج کیا کر رہا ہے۔ معاہدات کر کے کمزور قوموں کو تباہ کیا جاتا ہے۔ جیسے چین میں ہوا۔ مصر میں ہوا۔ ترکی میں ہوا اور ایران میں ہوا۔ اور ایک زمانہ میں ہندوستان میں بھی ہو چکا ہے اور آج کل پھر پولینڈ۔ فرانس۔ فن لینڈ۔ ناروے۔ رومانیہ چیکوسلواکیہ وغیرہ ممالک سے کر رہے ہیں واقعات پیش آ رہے ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ:۔

(۱) کوئی معاہدہ اس نیت سے نہ کیا جائے جس کا مقصد کسی دوسری طاقت کو دھوکا دے کر کمزور کرنا ہو۔

(۲) کسی کمزور قوم سے کوئی ایسا معاہدہ نہ کیا جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ اس قوم کو اس معاہدہ کے پیچ میں لا کر اپنے ماتحت کر لیا جائے۔

(۳) کوئی معاہدہ اس نیت سے نہ کیا جائے جس کا مقصد کسی دوسری طاقت کو ترقی سے روکنا ہو۔ قیام امن کے لئے کیا ہی لطیف تعلیم دی ہے۔ اگر اس کی پابندی کی جائے تو تمام فسادات یکدم مٹ سکتے ہیں۔ اتحادیوں اور اتلافیوں کی سابق عالمگیر اور موجودہ لڑائی ایسے ہی معاہدات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اور ہو رہی ہے معاہدہ وارسائی نہ ہوتا تو یہ نئی جنگ بھی نہ ہوتی۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ ایسے معاہدات جائز ہی نہیں۔ معاہدہ نیک نیتی پر مبنی ہونا چاہیئے اور اس کا واحد مقصد قیام امن ہونا چاہیئے۔

اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اے مسلمانو! یہ مواقع بطور امتحان آتے ہیں اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ تم طاقت پا کر اسلام کی اخلاقی تعلیم پر کس طرح کاربند رہتے ہو اور دنیا کی ترقیات تمہیں کہیں دوسری اقوام کے نقش قدم پر تو نہیں چلا دیتیں۔

یہ مضمون قرآن مجید کی سچائی کا کتنا بڑا ثبوت ہے۔ اور اسلام کی برتری کی کیسی عظیم الشان دلیل ہے۔ ابھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکہ ہی میں تشریف رکھتے ہیں اور مسلمان ایک چپہ بھر زمین کے بھی مالک نہیں۔ مگر اس شان اور عظمت کے ساتھ ایک زبردست حکومت کے احکام بیان ہو رہے ہیں۔ اور پھر ایسے رنگ میں کہ ہر عقلمند اور شریف انسان انہیں سُن کر اس تعلیم کی برتری کو تسلیم

وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ

(وہ ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ) جو شخص (گمراہی کو) چاہتا ہو اُسے وہ گمراہ کرتا ہو اور جو (ہدایت کو) چاہتا ہو اُسے وہ ہدایت دیتا ہے۔ اور

لَتُسْـَٔـلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا

جو کچھ تم کیا کرتے ہو اس کی بابت (قیامت کے دن) تم سے پوچھا جائے گا ۹۴ اور تم اپنی قسموں کو آپس

اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ

میں فریب کرنے کا ذریعہ مت بناؤ ورنہ (تمہارا) قدم بعد اس کے کہ وہ (خوب مضبوطی سے) جم چکا ہو پھر اُکھڑ جائیگا۔

کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا یہ سچ نہیں کہ آج بھی جبکہ تیرہ سو سال گذر چکے ہیں اس کلام کی سچائی ظاہر ہو رہی ہے۔ آج کل کے فسادات اور قوموں کی بےچینیاں صرف ان احکام کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہی پیدا ہو رہی ہیں۔

۹۴ **تفسیر**:۔ یہاں سوال ہو سکتا تھا۔ کہ تعلیم تو یہ بہت اعلیٰ ہے مگر اللہ تعالےٰ نے اس تعلیم کو جبراً کیوں نہ جاری کر دیا کہ فسادات سے دنیا محفوظ ہو جاتی۔ اس بارہ میں فرماتا ہے کہ بے شک اگر اللہ تعالےٰ اپنی مشیت جاری کرتا تو ایسا ہی کرتا۔ لیکن چونکہ انسان کو مقدرت دے کر اس کا امتحان لینا مقصود ہے اس لئے جو گمراہ ہونا چاہتا ہے خدا تعالےٰ اُسے گمراہ ہونے دیتا ہے۔ اور جو مومن بننا چاہتا ہے اس کی راہنمائی ایمان کی طرف کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو اپنے اعمال کا جواب دِہ بنایا ہے۔ اور یہ امر جائز نہیں جب تک اُسے قدرت دے کر آزاد نہ چھوڑ دیا گیا ہو۔ تا وہ اپنی مرضی سے ہدایت کا یا گمراہی کا جو راستہ بھی پسند کرے اختیار کرلے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو بھی نصیحت کی گئی ہے کہ ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم ایسے معاہدات اسلام کے فائدہ کے لئے کریں گے پھر وہ کیوں ناجائز ہونے لگے؟ اور فرماتا ہے کہ ایسے معاہدات بہرحال ناجائز ہیں خواہ اسلام کی تائید کے لئے ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ اگر ساری دنیا کا ایک طریق پر آجانا تمام امور انصاف پر مقدم ہوتا تو اللہ تعالےٰ خود ہی ایسا کر سکتا تھا۔ وہ تم کو گناہ میں ملوث کیوں کرتا۔ پس سب دنیا کا اسلام پر جمع کرنا بھی ایسا مقصد نہیں جس کے لئے یہ طریق اختیار کرنا جائز ہو۔ غرض اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو قوم بھی جبر سے اور تعدّی سے دنیا کو ایک کرنا چاہے گی وہ کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ اور اس کے ان اعمال کے متعلق اُسے پوچھا جائے گا یعنی اس کی اس کو سزا ملے گی۔

حاشیہ: اس آیت میں مسلمانوں کو نصیحت

حاشیہ: اللہ تعالےٰ کے تعلیم کو جبراً نافذ نہ کرنے کی وجہ

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ بغیر رضامندی کے زیادہ دیر تک غیر اقوام کسی قوم کے ماتحت نہیں رہ سکتیں اور جو قومیں دوسری قوموں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہیں آخر اس غلامی کا نتیجہ خود ان اقوام کے ہی خلاف نکلتا ہے اور ان اقوام کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی تباہی کی بڑی وجہ یہی تھی۔ ان کی آئندہ نسلیں گھر کے غلاموں ہی سے اخلاق سیکھتی تھیں اور اسی وجہ سے ہوتے ہوتے آخر کار اُن کے

حاشیہ: مسلمانوں کی تباہی کی بڑی وجہ

تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ

اور تم اس بدی کا مزہ چکھو گے کیونکہ تم نے (اس طرح سے اور لوگوں کو بھی) اللہ (تعالےٰ) کی راہ سے روکا اور

لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ

تم پر بڑا عذاب (نازل) ہو گا ؂۹۵ اور تم اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ کئے ہوئے عہد کے بدلے میں (اسکے مقابل پر)

ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ

تھوڑی سی (اور تھوڑی سی) قیمت (رکھنے والی چیزیں) مت لو۔ اگر تم علم رکھتے ہو تو (سمجھ لو کہ) جو کچھ اللہ (تعالےٰ) کے پاس ہے

اخلاق غلاموں کے سے ہو گئے۔ اگر وہ قرآنی احکام پر عمل کر کے جلد سے جلد غلامی کو مٹا دیتے تو کبھی یہ دن دیکھنا انہیں نصیب نہ ہوتا۔ ان کی تباہی گویا وَلَتُسْـَٔلُنَّ کا ایک دردناک نظارہ تھی۔

۹۵ تفسیر:- اس آیت میں لَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ کے الفاظ کو دہرایا ہے۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ گو معاہدات کی بنیاد بدنیتی پر رکھنا اور معاہدہ توڑنے کی نیت سے کرنا اصولاً بھی بُرا ہے لیکن مسلمانوں کے لئے خصوصاً بُرا ہے کیونکہ مسلمان دین حق کے حامل ہیں۔ ان کے خراب رویّہ کو دیکھکر خواہ وہ سیاسی معاملات میں ہی کیوں نہ ہو لوگ دین سے بھی متنفر ہو جائیں گے اور خود مسلمانوں کے حق میں بھی یہ اچھا نہ ہو گا۔ کیونکہ اس قسم کی باتوں سے وہ کمزور ہو جائینگے اور ان میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا۔

معاہدات کی پابندی پر زور

تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر تم معاہدات توڑو گے تو تم دنیا کے فائدہ کی خاطر دین کو بھی نقصان پہنچاؤ گے۔

تذوقوا السوء سے معاہدات کے توڑنے کے نتیجہ کی طرف اشارہ

یہ جو فرمایا کہ ایک قدم قائم ہونے کے بعد پھسل جائے گا۔ اس میں قدم سے مراد مسلمانوں کی حکومت کا استحکام ہے اور قدم کی تنکیر عظمت کے اظہار کے لئے ہے اور اس میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کی بشارت ہے۔

ان آیات میں جو معاہدات پر اس قدر زور دیا گیا ہے۔ اس میں اس امر کی خبر دی گئی ہے کہ مسلمان ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ کیونکہ جس قوم کے معاہدات توڑنے سے دنیا میں فساد برپا ہو جاتا ہے وہ وہی قوم ہوتی ہے جو اپنے زمانہ میں سب اقوام پر غالب ہو، ورنہ کمزور اقوام کو معاہدہ توڑنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ان کے معاہدہ توڑنے سے دنیا پر کوئی زلزلہ آتا ہے۔ پس اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو اس عظمت کی خبر دیتے ہوئے نصیحت فرماتا ہے کہ تم اپنے معاہدات کو اچھی طرح نباہنا اور سمجھ سوچ کر معاہدات کرنا۔

افسوس ابتدائی زمانہ کے بعد مسلمانوں نے اس راز کو نہ سمجھا اور تباہ ہو گئے۔ ایک زمانہ تھا کہ جب مسلمان کا لفظ مجسم اعتبار سمجھا جاتا تھا اور کسی اور ضمانت کی ضرورت نہ ہوتی تھی مگر اب مسلمان کے لفظ سے زیادہ بے اعتبار لفظ کوئی نہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ مَا عِنْدَ كُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ

وہ تمہارے لئے یقیناً (اس سے بدرجہا) بہتر ہے ۹۶ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائیگا اور جو کچھ اللہ (تعالیٰ) کے پاس ہے

اللّٰهِ بَاقٍ ۔ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ

وہ (ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے اور (ہمیں اپنی ذات کی قسم ہے کہ) جو لوگ ثابت قدم رہے ہیں ہم انہیں یقیناً ان کے بہترین عمل

بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا

کے مطابق (انکے تمام اعمال صالحہ کا) بدلہ دیں گے ۹۷ جو کوئی مومن ہونیکی حالت میں مناسب حال عمل کریگا۔

۹۶ تفسیر:۔ چونکہ اس جگہ ترقیات اور حکومت کی پیشگوئیاں تھیں اور حکومت کے زمانہ میں دشمن سازش کرنے اور جاسوس رکھنے کی کوشش کیا کرتے ہیں جس کے لئے وہ اپنے مقابل فریق کے آدمیوں کو بڑی بھاری رقم بھی پیش کرتے ہیں۔ اور یہ زمانہ مسلمانوں پر بھی آنیوالا تھا۔ اس لئے پہلے سے ہی آگاہ کر دیا کہ دیکھنا ایسی حرکت نہ کرنا تمہارے لئے کئی قسم کے لالچ پیدا ہوں گے اور ایک زمانہ آئیگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دریافت کرنے کے لئے مکہ والے تمہیں رشوتیں بھی پیش کریں گے مگر لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا تم اللہ تعالیٰ کے عہد کو دنیا کی قیمت پر فروخت نہ کر دینا یعنی کمزوری نہ دکھانا۔ جو عہد کیا ہے اس کو ضرور پورا کرنا۔ یہ رشوتیں تو ثمن قلیل ہی ہوں گی۔ مگر جو کچھ تمہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملے گا وہ تمہارے لئے اس سے کہیں بہتر ہوگا اور آج تم اس کو جان بھی نہیں سکتے۔ مکہ میں رہتے ہوئے مسلمان اس پیشگوئی کو سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ آیت "سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ" (قمر ع۳) اس وقت تک کہ جنگ بدر واقع نہ ہوگئی اور مکہ فتح نہ ہو گیا میری سمجھ میں پوری طرح نہ آئی تھی۔

۹۷ حل لغات۔ يَنْفَدُ: نَفِدَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور نَفِدَ الشَّيْءُ (يَنْفَدُ نَفَادًا) کے معنے ہیں فَنِيَ و ذَهَبَ۔ وَانْقَطَعَ۔ کوئی چیز فناء ضائع اور ختم ہوگئی (اقرب) پس ينفد کے معنے ہوں گے کہ ختم ہو جائے گا۔

تفسیر: اس میں یہ بتایا ہے کہ رشوتوں کے مال جن کی وجہ سے لوگ قوم سے غداری کرتے ہیں آخر ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ عزت جو اپنی قوم کی ترقی سے ملتی ہے وہ دیرپا ہوتی ہے اور بہت بڑی ہوتی ہے۔

آیت میں دو باتوں کی طرف اشارہ

دوسرے یہ بھی بتایا کہ آخر دشمن جو کچھ بھی دے گا محدود مال ہوگا۔ لیکن وہ انعام جو نیکی اور تقوےٰ اور وفاداری کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ سے ملیگا وہ ہمیشہ رہنے والا ہوگا کہ اس کا فائدہ اس دنیا سے گذر کر اگلے جہان کی زندگی تک بھی پہنچے گا۔

بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ ہم کنجوس گاہک کی طرح ردی چیز کو چُن کر باقی کو اس پر قیاس نہ کریں گے۔ بلکہ جو عمل تمہارے اعلیٰ سے اعلیٰ ہونگے ان کے مطابق تمام اعمال کو قرار دے کر ان کا اجر دیں گے۔ نیز یہ بھی بتایا کہ ان کا بدلہ ان کے اعمال سے زیادہ ہوگا۔ کیونکہ لکھا ہے ایک نیکی کا اجر کم سے کم دس گنا ملتا ہے۔ لیکن یہ قید لگا دی کہ یہ انعام صرف انہی کو ملے گا جو صبر کریں گے یعنی مشکلات سے گھبرائیں گے نہیں اور دین کو بیچیں گے نہیں۔

باحسن ما کانوا یعملون میں اعلیٰ انعام کا اشارہ

ینفد

مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً

مرد ہو کہ عورت ہم اسکو یقیناً ایک پاکیزہ زندگی عطا

طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا

کریں گے۔ا(ور)ہم ان (تمام لوگوں) کو ان کے بہترین عمل کے مطابق ان (کے تمام اعمال صالحہ) کا

يَعْمَلُوْنَ ○ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ

بدلہ دیں گے ۹۸؎ اس لئے (اے مخاطب) جب تو قرآن پڑھنے لگے تو دھتکارے ہوئے شیطان (کے شر) سے (محفوظ رہنے کیلئے)

مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ

اللہ (تعالیٰ) کی پناہ مانگ (لیا کر) ۹۹؎ (یہ بھی) یقیناً (سچ) ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اپنے

۹۸؎ **تفسیر**۔ اس آیت میں ایک طرف تو مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ آئندہ جدوجہد میں ہر شخص کو مرد ہو یا عورت اس کے عمل کے برابر بدلہ ملے گا اور عورت و مرد میں فرق نہ کیا جائیگا دوسری طرف کفار کو یہ توجہ دلائی ہے کہ تم عورت کو مارتے ہو تم کو حکومت کس طرح دیجا سکتی ہے۔ اب تو وہ حکومت قائم کی جائے گی جس میں مرد اور عورت دونوں کے حقوق محفوظ ہوں۔

(حاشیہ: مضمون میں مرد و عورت کے حقوق کی مساوات)

اسلام کی سچائی کا یہ کسقدر زبردست ثبوت ہے۔ کہ ہزاروں سالوں کی انسانی زندگی کے بعد اس نے پہلی مرتبہ مرد اور عورت کے حقوق کو تسلیم کیا اور اس کے جاری کرنے کی اسوقت خبر دی جبکہ ابھی مسلمانوں کو حکومت بھی نہ ملی تھی اور اس کے باوجود ظالم دشمن اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہمیں عورتوں کے حقوق کی نگہداشت نہیں کی گئی۔

(حاشیہ: اِسْتَعِذْ)

۹۹؎ **حل لغات**۔ اِسْتَعِذْ: اِسْتِعَاذَ سے امر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور اِسْتِعَاذ۔ عَاذَ سے باب استفعال ہے اور عَاذَ بِهٖ كَذَا (يَعُوْذُ۔ عَوْذًا۔ وَ عِيَاذًا) کے معنے ہیں لَجَأَ اِلَيْهِ وَاعْتَصَمَ۔ اس کی پناہ لی۔ تَقُوْلُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اَىْ اَلْتَجِي اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْتَصِمُ مِنَ الشَّيْطَانِ۔ اور اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کے معنے ہیں کہ میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں اور شیطان سے بچتا ہوں۔

اِسْتَعَاذَ بِهٖ مِنْهُ۔ اِعْتَصَمَ وَلَجَأَ اِلَيْهِ مِنْهُ۔ اسنے اس کے ذریعہ پناہ لی (اقرب)

پس اِسْتَعِذْ کے معنے ہوں گے کہ شیطان سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ چاہو۔

تفسیر۔ اِذَا قَرَاْتَ کے یہ معنے نہیں کہ جب تو قرآن ختم کیا کرے تو معوذتین پڑھ لیا کر۔ کیونکہ وہ سورتیں تو قرآن میں شامل ہیں۔ بہرحال پڑھی ہی جائیں گی انکو چھوڑ تو نہ دیا جائیگا۔ پس اس جگہ جیسا کہ سُنّت نبوی ؐ سے ثابت ہے شروع تلاوت میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھنے کا حکم ہے۔

پہلے فرمایا تھا کہ ثابت قدم لوگوں کو یہ عظیم الشان انعامات ملنے والے ہیں۔ اب اس نعمت کی حفاظت کے لئے ایک گر بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم شیطان کے حملوں سے بچنے کے لئے

خداتعالیٰ کی پناہ میں آجاؤ۔ تا تم ان انعامات کے وارث ہوسکو اور رستہ سے بھٹک نہ جاؤ۔

بعض نادانوں نے غلط آراء اور روایات پر بنیاد رکھ کر اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے اور اس کی شانِ نزول یہ ہے۔ کہ سورۃ النجم کی تلاوت کرتے ہوئے ایکدفعہ آپ کی زبان پر بعض شرکیہ کلمات شیطان نے جاری کر دیئے تھے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ آیندہ جب قرآن پڑھا کرو تو پہلے اَعُوذ ضرور پڑھ لیا کرو۔ تا شیطان پھر تمہاری زبان پر کوئی کلمۂ شرک جاری نہ کردے۔

حالانکہ اوّل تو یہ واقعہ ہی غلط ہے (اس واقعہ کی اصل گفتگو اس کے اصل مقام یعنی سورۂ حج میں ہوگی) دوّم اس آیت کے سیاق وسباق سے اس مضمون کا کوئی جوڑ ہی نہیں ہے بھلا کون عقلمند اس امر کو تسلیم کرسکتا ہے۔ کہ واقعہ ہوا ہو سورۃ النجم کی تلاوت پر۔ اسکا ذکر ہوا ہو سورۃ حج میں اور اَعُوذ پڑھنے کے لئے سورۃ النحل میں تاکید کیجاوے۔ اور تاکید بھی اسلامی غلبہ کے ذکر میں کیجائے تاکسی کا ذہن اس کے مضمون کیطرف جا ہی نہ سکے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

میں جیسا کہ اوپر بتا چکا ہوں یہ آیت اپنے مضمون ماسبق کے ساتھ پوری طرح مطابق ہے اور کسی دوسرے واقعہ کی طرف اسے منسوب کرنا ظلم ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیئے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا شیطان مسلمان ہوگیا ہے وہ مجھے سوائے خیر کے کسی چیز کا حکم ہی نہیں دیتا (مسند احمد حنبل جلد اول ص۲۵۷) اس ارشاد کی موجودگی میں کوئی عقلمند کس طرح تسلیم کرسکتا ہے کہ شیطان نے آپکی زبان پر شرک کے کلمات جاری کردئے تھے۔ مسلمان تو توحید کا قائل ہوتا ہے پس آپ کا شیطان جب موحد ہوگیا تھا۔ تو اگر اسے کوئی طاقت تھی بھی۔ تو بھی وہ آپکی زبان پر شرک کے کلمات جاری نہیں کرسکتا تھا۔ پس اس فرضی واقعہ کو اس آیت پر چسپاں کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک بہتان ہے۔

قرآن کریم پڑھنے سے پہلے تعوذ کی حکمت

یہ سوال کہ قرآن سے پہلے استعاذہ (اَعوذ پڑھنے) کی کیا ضرورت ہے؟ اسکا جواب یہ ہے۔ کہ چور وہیں آتا ہے جہاں خزانہ ہو۔ اور اسی سے مقابلہ کرنے کی فکر کی جاتی ہے جس سے خطرہ ہو۔ قرآن کریم ایک ایسا روحانی خزانہ ہے جس کے مٹانے کے لئے شیطان تڑپتا ہے۔ اور وہی ہتھیار ہے جس سے اس کا سر کچلا جاتا ہے۔ پس شیطان اور شیطانی لوگ پوری کوشش کرتے ہیں۔ کہ اس سے لوگوں کو دور رکھیں۔ اس وجہ سے اس کی تلاوت سے پہلے استعاذہ کا حکم دیا۔ اس حکم سے یہ بھی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جب قرآن کریم سے پہلے بھی استعاذہ کا حکم ہے۔ تو باقی سارے کاموں سے پہلے تو بدرجۂ اولیٰ استعاذہ کر لینا چاہیئے۔

اسلامی ترقیات کے ساتھ تعوذ کا گہرا تعلق

اس سوال کا جواب کہ یہ حکم اس موقعہ پر کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں یہ سب سے پہلا موقعہ ہے کہ اسلامی حکومت کی ایسی وضاحت سے خبر دی گئی ہو۔ پہلے بھی اشارات تھے مگر اس سے پہلے اس قدر وضاحت نہ ہوئی تھی اور جب دنیوی ترقیات کا ذکر ہو تو بعض کمزور طبائع دینی فرائض سے غافل ہو کر دنیوی امور کی ادھیڑ بن میں پڑ جاتی ہیں پس چونکہ اس سورۃ میں دنیوی ترقیات کی خبر دی گئی تھی ساتھ ہی مسلمانوں کو حکم دیدیا گیا کہ آیندہ جب قرآن کریم پڑھنے لگو اس سے پہلے تعوّذ کر لیا کرو۔ تاکہ دنیوی فتوحات کی پیشگوئیاں تمہاری توجہ کو اپنی طرف پھرا کر تم کو دین کے اعلیٰ مقاصد سے غافل نہ کردیں۔ اور دنیا دین پر مقدم نہ ہو جائے۔

اللہ اللہ! کیا پاک کلام ہے۔ اور اس میں کس طرح مومنوں کے ایمان کی حفاظت کے سامان پیدا کئے گئے ہیں اور اس کے باوجود دشمن کہتا ہے۔ کہ لالچ دے دے کر

عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ اِنَّمَا

رب (کی پناہ) پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ان پر اس کا کوئی تسلط نہیں ہے۔ ۱۰۰؎ اس کا تسلط

سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ

صرف ان لوگوں پر (رہتا) ہے۔ جو اس سے دوستی رکھتے ہیں۔ اور جو اس کی وجہ سے شرک

مُشْرِكُوْنَ ۝ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ

ع ۱۳ ۱۱ ۱۹

کرتے ہیں۔ ۱۰۱؎ اور جب ہم کسی نشان کی جگہ پر کوئی اور نشان لاتے ہیں۔ اور (اس میں کیا شک ہے کہ) اللہ تعالیٰ جو کچھ اتارتا ہے

قرآن کریم نے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا تھا۔

۱۰۰؎ تفسیر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں پڑ کر انسان خدا تعالیٰ سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ حضرت مسیح کی طرف انجیل میں یہ قول منسوب کیا گیا ہے:۔

انجیلی تعلیم کے مقابل قرآن مجید کی دنیوی کاموں میں حصہ لینے کی تعلیم

(۱) "اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو" (متی باب ۱۹ آیت ۲۴)۔

نیز (۲) "دولتمندوں کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کیسا مشکل ہے کیونکہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو" (لوقا باب ۱۸ آیت ۲۴ و ۲۵)۔

اس خیال کے لوگوں کیطرف سے یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ دنیا کے متعلق خبریں پڑھنے سے بعض لوگوں کے ایمان میں کمزوری پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا تو مسلمانوں کو دنیوی فتوحات اور حکومت کی خبر دی ہی کیوں گئی؟ اسکا جواب یہ دیا کہ شیطان کا قبضہ کمزوروں پر ہوتا ہے۔ مومن دنیا میں پڑ کر بھی دین کیطرف سے غافل نہیں ہوتا پس اسجگہ ہم صرف کمزوروں کو ہوشیار کرتے ہیں یہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ مضبوط ایمان والے بھی دنیا میں پڑ کر نجات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ گویا اسلام کی تعلیم اس بارہ میں یہ ہے کہ دست درکار دل بایار۔ اور یہی مقام اعلیٰ مقام ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے دنیا کو چھوڑنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ دنیا کے کاموں میں حصہ لیتے ہوئے اس کی اصلاح کا حکم دیا ہے۔ اگر نیکوں کو دنیا سے علیحدہ رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی اصلاح کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دنیا کی باگ آئے جو باوجود دنیا پر تصرف حاصل کر لینے کے انصاف اور عدل اور تقویٰ قائم رکھیں تبھی دنیا کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور دوسروں کے لئے نیک مثال قائم ہو سکتی ہے دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے ہاتھ جب دنیا کا نظم و نسق آیا۔ تو انہوں نے کس طرح اس میں پڑ کر اس سے علیحدہ رہنے کا نمونہ دکھایا۔ اور ایک ایسی شاندار مثال قائم کی۔ جو اب بھی کہ اس پر تیرہ سو سال گذر چکے ہیں۔ اہل عقل کے دلوں میں گدگدیاں پیدا کر دیتی ہے۔

هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ میں ضمیر بِهٖ کا مرجع

۱۰۱؎ تفسیر ـ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ـ بِهٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف بھی جا سکتی ہے جس کا ذکر رَبِّهِمْ کے الفاظ میں پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔ اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ اس کا تصرف ان لوگوں پر ہے جو اپنے رب کے شریک قرار دیتے ہیں۔ اور اس ضمیر کا مرجع شیطان بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ وہ شیطان کے سبب سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں یہ بتلایا کہ شیطان کا قبضہ اور تصرف اس کے

أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوٓا إِنَّمَآ أَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ

اس (کی ضرورت) کو وہ (سب سے) بہتر جانتا ہے تو (مخالفین) کہتے ہیں کہ تو مفتری ہے (مگر حقیقت یوں) نہیں بلکہ انہیں سے

أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ

اکثر علم نہیں رکھتے۔ ۱۰۳ تو (ایسے معترض سے) کہہ (کہ) روح القدس نے اسے

دوستوں پر ہوتا ہے جو شخص استعاذہ کرتا ہے وہ تو گویا اس سے دشمنی کا اعلان کرتا ہے اس سلئے وہ اس کے قبضہ سے نکل جائیگا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ والی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہیں کیونکہ اسمیں تو یہ بتایا ہے کہ اسکا قبضہ اپنے دوستوں پر ہوتا ہے نہ کہ ان لوگوں پر جو خدا تعالیٰ پر توکل کرنیوالے ہوں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کیطرف سے متواتر اعلان ہو چکا ہے کہ "میرا توکل تو صرف خدا پر ہے"۔ پس اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسرے لوگوں کا ہی ذکر ہے۔

۱۰۲ حل لغات۔ يُنَزِّلُ : نَزَّلَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ حجر ۳۰۲۔

تفسیر۔ اٰیَۃ کے اصل معنے نشان کے ہیں۔ گو قرآن کریم کے جملوں کو بوجہ اس کے کہ انہیں سے ہر ایک اپنی ذات میں ایک نشانِ ہدایت ہے۔ آیت کہتے ہیں۔ مگر اٰیَۃ کے معنے کتاب کے فقرے کے نہیں ہوتے۔ اور قرآن کریم میں کسی جگہ پر اس لفظ کا استعمال یقینی طور پر ان معنوں میں نہیں ملتا۔ اگر بعض جگہ آیت کا لفظ جملہ کے معنوں میں نظر بھی آتا ہے تو وہ بھی یقینی نہیں کیونکہ اس جگہ دلیل اور نشان کے معنے بھی ہو سکتے ہیں ہاں مسلمانوں میں شروع سے اس لفظ کا استعمال ان معنوں میں مروج چلا آتا ہے۔ صحابہ بھی قرآنی جملوں کو اٰیَۃ کہہ کر پکارتے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کلام میں بھی یہ استعمال پایا جاتا ہے۔ اس استعمال سے دھوکا کھا کر بعض مفسرین نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ جب قرآن کریم کی ایک آیت منسوخ کرکے دوسری آیت نازل کی جاتی۔ تو کفار اعتراض کرتے کہ تم جھوٹے ہو اگر قرآن خدا تعالیٰ کا کلام ہوتا تو اسکی آیتیں منسوخ کیوں ہوتیں

میرے نزدیک یہ معنے درست نہیں کیونکہ تاریخ سے کوئی ایک آیت بھی ثابت نہیں ہوتی جسے بدلکر اس کی جگہ دوسری آیت رکھی گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کے سینکڑوں حافظ جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قرآن کریم کو حفظ کر لیا تھا اس امر کی شہادت دیتے کہ پہلے ہمیں فلاں آیت کے بعد فلاں آیت یاد کروائی گئی تھی لیکن اس کے بعد اسے بدل کر فلاں آیت یاد کرائی گئی۔ اس قسم کی شہادت کا نہ ملنا بتاتا ہے کہ اس بارہ میں جسقدر خیالات رائج ہیں۔ انکی بنیاد محض ظنیات پر ہے نہ کہ علم پر۔

میں اسکا منکر نہیں کہ بعض احکام زمانہ نبوی میں بدلے گئے ہیں۔ مگر مجھے قرآن کریم کے کسی حکم کی نسبت ثبوت نہیں ملتا کہ پہلے اور طرح ہو۔ اور بعد میں بدلدیا گیا ہو۔ میرے نزدیک جو احکام وقتی ہوتے تھے وہ غیر قرآنی وحی سے نازل ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں اترتے ہی نہ تھے۔ اس لئے قرآن کریم کو بدلنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی۔

اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر آیاتِ قرآنیہ کو کبھی بدلا نہیں گیا تو اس آیت کے کیا معنے ہوئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اٰیَۃ کے دو معنے جنمیں یہ لفظ بالعموم قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ نشانِ آسمانی کے ہیں۔ اور یہی اسجگہ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہم ایک نشان بدل کر اس کی جگہ دوسرا نشان لے آتے ہیں لو ایسا کرنا قابل اعتراض نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس امر کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا

استعاذہ کے حکم میں آنحضرت کا ذکر نہیں ہو سکتا

يُنَزِّل

آیت کے معنی اور اس سے مراد

ناسخ و منسوخ کے متعلق بحث

ہے کہ کونسا نشان کس موقعہ کے لئے مناسب ہے تو کفار اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو جھوٹا ہے مگر یہ اعتراض ان کا جہالت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ وہ قانون ہے جس کا ظہور ہر نبی کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ یعنی ہر نبی کو بعض انذاری آیتیں دی جاتی ہیں جو درحقیقت مشروط ہوتی ہیں۔ مخاطب قوم کے قلوب کی حالت سے۔ اگر وہ اپنے دل کی حالت بدل لیں تو وہ انذار کی خبر بھی ٹل جاتی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں حضرت یونس ؑ کی قوم کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ان کی ہلاکت کی خبر حضرت یونس ؑ کی معرفت دی گئی۔ مگر بعد میں ان کی توبہ کی وجہ سے اسے بدل دیا گیا۔ (یونس ع ۱۰)۔

ؔانذاری پیشگوئیاں مشروط ہوتی ہیں۔

یہ عام قانون انذاری پیشگوئیوں کے متعلق ہے کہ اگر مخالف توبہ کرلیں تو مقدّر عذاب کو روک دیا جاتا ہے۔ ہاں وعدہ کی خبر ضرور پوری ہوکر رہتی ہے مگر اس کے متعلق بھی سنّت اللہ یہ ہے کہ اگر وہ قوم جس سے وعدہ ہو پوری قربانی سے کام نہ لے یا پوری فرمانبرداری نہ دکھائے تو اس کے پورا ہونے میں تاخیر کر دی جاتی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب انہوں نے متواتر حضرت موسیٰ ؑ کی نافرمانی کی۔ تو وہ ارضِ موعودہ جس میں داخل کرنے کے لئے حضرت موسیٰ ؑ انہیں مصر سے نکال کر لائے تھے چالیس سال تک کے لئے اس کی فتح روک دی گئی اس کے موعود ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :-

ؔجھوٹ کی تعریف

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (مائدہ ع ۴) اے قوم اس پاک زمین میں داخل ہو جاؤ جو خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ رکھی ہوئی ہے۔

اس کے بعد یہود کی نافرمانی کا ذکر کرکے فرماتا ہے۔ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (مائدہ ع ۴)۔ یعنی جب انہوں نے نافرمانی کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اب یہ ملک چالیس سال تک کے لئے بنی اسرائیل پر حرام کر دیا گیا ہے پس تو نافرمان قوم کی حالت پر افسوس نہ کر۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ کو ٹلا دیا گیا ہے لیکن اسے منسوخ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ وعدہ خدا تعالیٰ منسوخ نہیں کیا کرتا۔

مذکورہ بالا قانون کے مطابق انذار کی پیشگوئی جب کبھی ٹلتی ہے تو کفار شور مچا دیتے ہیں کہ دیکھو یہ جھوٹا ہے۔ اگر سچا ہوتا تو کیوں اس کی بات پوری نہ ہوتی۔ ایسے ہی اعتراضات وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا کرتے تھے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آیات تو کسی غرض اور مقصد کے لئے نازل ہوتی ہیں۔ جب ہم دیکھیں کہ ایک شخص نے اپنی اصلاح کر لی ہے تو ہم اس کے متعلق اپنے حکم کو بھی بدل دیتے ہیں اور اس کی سزا منسوخ کر دیتے ہیں۔ اس کی جگہ اس کے لئے اپنی رحمت کا نشان دکھاتے ہیں کیونکہ ہماری غرض سزا دینا نہیں بلکہ اصلاح کرنا ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسے کئی مواقع پیش آئے ہیں۔ مثلاً یہی کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کفارِ مکہ کی نسبت فرماتا ہے۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ (بقرہ ع ۱)۔ لیکن بعد میں ان میں سے بہت سے لوگ ایمان لے آئے۔ یہ عذاب کی خبر تھی اس وجہ سے جن جن لوگوں نے خشیت اللہ پیدا کر لی۔ ان کا عذاب بدل دیا گیا اور انکو ایمان عطا ہو گیا۔

بظاہر یہ مسئلہ بالکل صاف ہے لیکن ہمیشہ سے لوگ اس بارے میں ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ بات بدلنے کو جھوٹ سمجھتے ہیں حالانکہ سزا کو بدلنا جھوٹ نہیں ہوتا۔ وعدہ کو بدلنا جھوٹ ہوتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں وعدہ کے بدلنے کو جھوٹ کہتے ہیں۔ وعید یعنی عذاب کی خبر کو بدلنے کو جھوٹ نہیں کہتے بلکہ اسے رحم اور احسان کہتے ہیں۔ اقرب میں لکھا ہے۔ اَلْخُلْفُ فِي الْوَعْدِ عِنْدَ الْعَرَبِ كَذِبٌ وَفِي الْوَعِيْدِ كَرَمٌ۔ یعنی وعدہ کا بدلنا عربوں کے نزدیک جھوٹ کہلاتا ہے اور وعید یعنی سزا کی خبر کا بدلنا شرافت اور احسان کہلاتا ہے۔

غرض ایک معنے تو اس آیت کے یہ ہیں کہ ہم وعید کی خبروں کو بعض دفعہ بدل دیا کرتے ہیں کفار اس پر اعتراض کرتے

ہیں لیکن ان کا اعتراض صحیح نہیں۔ ایسا کرنا حکمت کے عین مطابق ہے اسمیں کسی کا حق نہیں مارا جاتا کہ قابل اعتراض ہو۔ ان معنوں کے رو سے اس آیت کا تعلق ان انذاری آیات سے ہوگا جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

ایک اَور معنے بھی اس آیت کے ہیں اور وہ ترتیب قرآن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مقام پر زیادہ چسپاں ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ اس سورۃ میں کلام الٰہی کی ضرورت کے دلائل بیان کئے جا رہے ہیں اور اس کے ثبوت میں پہلے انبیاء کو بھی پیش کیا گیا ہے مثلاً اسی سورۃ کے آٹھویں رکوع میں فرماتا ہے کہ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ۔ ہمیں اپنی ذات ہی کی قسم کہ جو تجھ سے پہلے قومیں گذر چکی ہیں ان میں بھی ہم رسول بھیج چکے ہیں۔ پھر رکوع ۱۲ میں فرماتا ہے۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی اس دن کو یاد کرو جبکہ ہم ہر قوم کے خلاف اسی قوم کا ہی گواہ بنا کر کھڑا کریں گے۔

اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ سب قوموں میں نبی مبعوث ہو چکے ہیں۔ تو چونکہ گذشتہ انبیاء کے وجود کو کلام الٰہی کی ضرورت کے ثبوت میں پیش کیا گیا تھا جب کفار ہر طرف سے عاجز آ گئے تو انہوں نے یہ دلیل اسلام کے خلاف پیش کی کہ اگر پہلے بھی نبی گذر چکے ہیں تو چاہیئے تھا کہ انکی تعلیم اور اسلام کی تعلیم ایک ہی ہوتی مگر اس میں تو ان کی تعلیموں کے خلاف تعلیم بھی پائی جاتی ہے پس معلوم ہوا کہ محمد (رسول اللہؐ) جو اپنے تسلیم کردہ نبیوں کے خلاف باتیں کہتے ہیں جھوٹے ہیں ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ ان نبیوں کو کچھ کہے اور اسکو کچھ اَور کہے۔

سو اس اعتراض کو بیان کر کے اس کا جواب دیا کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ اسے کس زمانہ میں کیا نازل کرنا چاہیئے۔ یعنی پہلے انبیاء کی تعلیم سے جہاں جہاں قرآن کریم نے اختلاف کیا ہے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس سچی تعلیم کی قرآن نے مخالفت کی ہے بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ جن کی طرف کلام نازل ہوا ہے وہ پہلے لوگوں سے مختلف ہیں اور ایک ہی شخص مختلف لوگوں کو ان کے حالات کے مطابق مختلف حکم دیتا ہے اور دے سکتا ہے اور یہ اختلاف اس امر کی دلیل کبھی اور کسی صورت میں نہیں قرار دیا جاتا۔ کہ چونکہ حکم مختلف ہیں حکم دینے والے بھی مختلف ہیں۔

اس آیت کے ایک اور معنی

اختلاف ہمیشہ حکم دینے والوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ بعض دفعہ اختلاف ان لوگوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جنہیں حکم دیا گیا ہو۔ جب مخاطب مختلف قابلیتوں کے ہوں تو ایک ہی حکم دینے والا مختلف لوگوں کو ان کے حسب حال مختلف حکم دیتا ہے۔ اصل سوال تو یہ ہونا چاہیئے کہ قرآن کی تعلیم زمانہ کے حسب حال ہے یا نہیں۔ اگر وہ زمانہ کے حسب حال ہے تو اس اختلاف سے علم الٰہی کا ثبوت ملا نہ اس کا کہ محمد رسول اللہؐ پر کلام نازل کرنے والا کوئی اَور ہے اور پہلے نبیوں پر کلام نازل کرنے والا کوئی اَور۔

یہ معنے اگلی آیات سے بھی بالکل مطابق آتے ہیں اس لئے یہی اس موقعہ کے لحاظ سے زیادہ صحیح ہیں۔ ہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس صورت میں اٰیَةً کے معنے پہلی کتاب کے لے جائیں گے

نسخ آیات کے ایک لطیف معنی

یعنی جب ایک کتاب کی جگہ دوسری کتاب کو بدلا جاتا ہے اور کتاب بھی آیت ہوتی ہے۔ بلکہ سب سے بڑا معجزہ انبیاء کا کتاب ہی ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ یہ اعتراض آجتک قرآن کریم پر ہو رہا ہے چنانچہ مسیحی مصنف آجتک یہی اعتراض کرتے چلے جا رہے ہیں کہ

قرآن کریم کے دیگر کتب کے مصدق ہونے سے مراد

جب قرآن کریم کتب سابقہ کا مصدق ہونے کا دعویٰ کرتا تو ان سے اختلاف کیوں کرتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بنایا ہوا ہے اور انہوں نے پہلی کتب سے ناواقفیت کیوجہ سے ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو پہلی کتب کے خلاف ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے معنے کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس میں سورۃ النجم کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی تلاوت کے وقت شیطان نے بعض آیتیں بلند آواز سے آپ کی تلاوت کے درمیان میں پڑھ دی تھیں۔ اول تو یہ واقعہ ہی سر

مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى

تیرے رب کیطرف سے حق (و حکمت) کے ساتھ اتارا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں وہ (ایمان پر) ہمیشہ کے لئے قائم کر دے

وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ

اور (نیز اسے) کامل فرمانبرداروں کی (مزید) رہنمائی کے لئے اور (انہیں) بشارت دینے کے لئے اسے اتارا ہے ۱۰۳ اور ہم یقیناً جانتے ہیں (کہ) وہ

سے باطل ہے جیسا کہ انشاء اللہ اسکے موقعہ پر بتایا جائیگا لیکن اگر بفرض محال اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی اس آیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس آیت میں تو یہ ذکر ہے کہ جو آیت بدلی گئی وہ بھی اللہ تعالیٰ کیطرف سے تھی اور جس نے بدلا وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی۔ اور جس واقعہ کو وہ اس آیت پر چسپاں کرتے ہیں اس میں خود وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو آیات بدل گئیں وہ شیطان کی تھیں پس انکی اپنی تشریح ہی ثابت کرتی ہے کہ اس فرضی واقعہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن مجید کا پہلی کتب سے اختلاف اس کے جھوٹا ہونیکی دلیل نہیں

علاوہ ازیں اگلی آیت بھی ان معنوں کو رد کر رہی ہے کیونکہ اس آیت میں اس اعتراض کا دوسرا جواب دیا گیا ہے جو یہ ہے کہ اس قرآن کو روح القدس نے اتارا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ روح القدس کا اتارنا کفار کے اس اعتراض کا جواب نہیں ہو سکتا کہ پہلے اس نے نعوذ باللہ مشرکانہ تعلیم دی تھی اب اسے بدل کیوں دیا گیا ہے۔ کیونکہ روح القدس کا اتارنا اس کے محفوظ ہونے کی دلیل تو بن سکتا ہے۔ شیطان کی طرف اور اس کے بعد اسکی منسوخی کی دلیل نہیں بن سکتا۔

۱۰۳ **حل لغات**۔ اَلْحَقّ کے لئے دیکھو ابراہیم ۲۳ رعد ۱۵۔ رَبّ کے لئے دیکھو یونس ۵۔

یثبت

يُثَبِّتُ: ثَبَّتَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ ثَبَتَ کے معنوں کے لئے دیکھو ابراہیم ۲۷۔

ھدی

هُدًى: ھدٰی کا مصدر ہے۔ ھدٰی کے لئے دیکھو رعد ۲۸۔

تفسیر۔ اس آیت میں کفار کے اعتراض کا ایک اور جواب دیا ہے۔ پہلی آیت میں تو یہ جواب دیا تھا کہ یہ تعلیم زمانہ کے مطابق ہے۔ اس لئے اگر بعض مواقع پر اس کو پہلی کتب سے اختلاف ہے تو یہ اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل نہیں۔ بلکہ اس امر کی دلیل ہے۔ کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب بعض اور جواب دیتا ہے۔

(۱) اس کتاب کو روح القدس نے اتارا ہے یعنی اس کلام میں نہایت پاکیزہ تعلیم ہے۔ اگر یہ مفتری کا کلام ہوتا تو افترا کرنے والے کی کوئی غرض تو اس کلام میں نظر آتی لیکن سارا قرآن پڑھ جاؤ اس میں محمد رسول اللہ صلعم کی اپنی کوئی غرض تم کو نظر نہ آئے گی۔ بلکہ اس کلام کے پیچھے ایک پاکیزگی کی روح کام کرتی ہوئی تم کو دکھائی دے گی۔ اس پاکیزگی کی روح سے تم سمجھ سکتے ہو کہ جہاں اس کو پہلی کتب سے اختلاف ہو اور اس اختلاف کی کوئی توجیہ نہ ہو سکے تو یہی ماننا پڑیگا کہ وہ کتب بگڑ گئی ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن خدا کا کلام نہیں۔ کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ خدائی کلام تو پاکیزگی کی روح سے خالی ہو اور مفتری کا کلام پاکیزگی کی روح سے معمور ہو۔

(۲) دوسرا جواب اس میں یہ دیا گیا ہے کہ یہ کلام حق پر مشتمل ہے۔ جہاں کہیں اس کلام نے پہلی کتب سے اختلاف کیا ہے۔ اگر وہ اختلاف زمانہ کے بدلنے کے سبب سے نہیں تو تم دیکھو گے کہ عقلِ انسانی اسی بات کی تصدیق کرے گی جو قرآن کریم نے بیان کی ہے اور اسے رد کرے گی جو پہلی کتب میں بیان ہوا ہے۔ یہ بھی ایک زبردست ثبوت قرآن کریم کی سچائی کا ہے مثلاً حضرت ہارون کا واقعہ ہی لے لو۔ قرآن میں لکھا ہے کہ انہوں نے شرک نہیں کیا۔ اب اول تو عقلاً ایک نبی کی طرف

إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۚ لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ

کہتے ہیں (کہ یہ وحی الٰہی نہیں بلکہ) ایک آدمی اسے سکھاتا ہے (مگر وہ نہیں سمجھتے کہ) جس شخص کیطرف وہ (اشارہ کرتے اور اس کے ذہن میں

أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ

کیطرف) مائل ہوتے ہیں اسکی زبان اعجمی ہے اور یہ (قرآنی زبان تو خوب) روشن (کر کے دکھانیوالی) عربی زبان ہی ہے۔ جو لوگ

شرک کا منسوب کرنا کسی صورت میں جائز نہیں لیکن عقلی بحث کو جانے دو خود بائبل اپنے اس بیان کی تردید کر رہی ہے۔ کیونکہ جنہوں نے بچھڑا بنایا تھا بائبل کے بیان کے رو سے انہیں قتل کر دیا گیا تھا لیکن اس واقعہ کے معاً بعد ہارونؑ سے بائبل کے رو سے یہ سلوک کیا گیا کہ کہانت انکی نسل کے لئے مخصوص کر دی گئی اور انہیں اللہ تعالیٰ نے خاص عزت بخشی۔ یہ سلوک جو اُن سے بچھڑے کے واقعہ کے معاً بعد بائبل میں بیان ہوا ہے بتاتا ہے کہ اس موقعہ پر ان کا رویہ قابل تعریف تھا۔ اور بائبل نے جو شرک میں شمولیت ان کی طرف منسوب کی ہے خود اسکی اپنی شہادت کے رو سے باطل ہے۔ (خروج باب ۴۰۔ آیت ۱۲ تا ۱۵)۔

غرض قرآن کریم کو جہاں جہاں بھی پہلی کتب سے اختلاف ہے اسکی بات کی عقلاً یا نقلاً تصدیق ہو جاتی ہے۔ اور اس کے خلاف بیانات کی تردید یا عقل کر دیتی ہے یا نقل یا دونوں ہی سے اس کی تردید ہو جاتی ہے پس اس امر کی موجودگی میں پہلی کتب سے اس کا اختلاف اس بات کی علامت نہیں کہ قرآن کریم کو محمد رسول اللہ نے بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں کیا۔ بلکہ اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ تازہ بتازہ محفوظ کلام ہے اور پہلے کلام محرف مبدل ہو گئے ہیں۔

(۳) تیسری دلیل اس اعتراض کے جواب میں اس آیت میں یہ دی گئی ہے کہ قرآن ہدایت مجسم ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان صحیح تعلق قائم کرتا ہے اور اسے خدا تعالیٰ تک پہنچاتا ہے اور یہ کام افترا والے کلام سے ناممکن ہے پس جب اسکی چل کر انسان خدا سے تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ اور پہلی کتب سے نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ گو وہ نزول کے لحاظ سے سچی کتب تھیں مگر موجودہ زمانہ کے لحاظ سے مردہ ہیں۔ اور اس غرض کو پورا نہیں کر رہیں جو ان سے متوقع ہے۔ پس اختلاف کی صورت میں ان کا قول غلط ہے اور قرآن کا درست۔

پہلی کتب سے اختلاف رکھتے ہوئے قرآن مجید کے سچا ہونے کے چار دلائل

(۴) چوتھی دلیل یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ مومنوں کے لئے بشارت ہے یعنی اس پر چل کر انسان اللہ تعالیٰ کے فضلوں کا وارث ہوتا ہے اور اس کے نشانات اس کی تائید میں دکھلائے جاتے ہیں۔ اگر یہ جھوٹا ہوتا تو اس پر چلنے والوں کے لئے متعدد بشارات کے سامان کون پیدا کر سکتا تھا۔ جھوٹ بولنے والا دعویٰ تو کر سکتا ہے مگر ان دعووں کے پورا کرنے کے سامان تو پیدا نہیں کر سکتا۔

غرض چار دلائل اس آیت میں ان کے اعتراض کے رد میں بیان کئے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اکیلا ہی ان کے اعتراض کو توڑنے کے لئے کافی ہے۔

۱۰۴ حل لغات۔ البشر [۲] اَلْبَشَرُ: اَلْاِنْسَانُ ذَكَرًا كَانَ اَوْ اُنْثٰى وَاحِدًا اَوْ جَمْعًا وَقَدْ يُثَنّٰى كَقَوْلِ الْقُرْاٰنِ :- "اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا" بَشَر کے معنے ہیں انسان خواہ وہ مذکر ہو یا مؤنث واحد ہو یا جمع۔ بعض اوقات لفظ بَشَر کا تثنیہ بھی بنایا جاتا ہے جیسے قرآن کی آیت اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ میں بَشَرَيْن تثنیہ ہے۔ (اقرب)

لسان [۲] لِسَانٌ کے معنے ہیں اَلْمِقْوَلُ بولنے کا آلہ (زبان) اَللُّغَةُ۔ بولی جانے والی زبان۔ مذکر اور مؤنث ہر دو طرح استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ لِسَانٌ فَصِيْحٌ اور لِسَانٌ فَصِيْحَةٌ دونوں طرح بولتے ہیں (اقرب)

يُلْحِدُوْنَ

يُلْحِدُوْنَ : اَلْحَدَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور لَحَدَ (مجرد اَلْحَدَ) بِلِسَانِهٖ اِلٰی کَذَا کے معنے ہیں مَالَ۔ کسی طرف مائل ہوا۔ اور اَلْحَدَ فُلَانٌ کے معنے ہیں مَالَ عَنِ الْحَقِّ۔ حق سے منحرف ہوگیا۔ (مفردات) پس يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ کے معنے ہونگے کہ وہ اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

اَعْجَمِيٌّ : اَلْاَعْجَمُ الَّذِیْ لَا يُفْصِحُ وَلَا يُبَيِّنُ كَلَامَهٗ وَاِنْ كَانَ مِنَ الْعَرَبِ۔ وہ شخص جو اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح واضح نہ کرسکے خواہ وہ عرب ہی کیوں نہ ہو۔ مَنْ لَيْسَ بِعَرَبِيٍّ وَاِنْ اَفْصَحَ بِالْعَجَمِيَّةِ وہ شخص جو عرب نہ ہو اگرچہ وہ عجمی یعنی غیر عربی زبان فصیح بولتا ہو۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں کفار کا ایک اور اعتراض بیان کیا گیا ہے جو آج تک مسلمانوں اور مسیحیوں کا محلِ نزاع بنا ہوا ہے میں آیت کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے اس اعتراض کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔

جیسا کہ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے اس میں کفار کا یہ اعتراض بیان کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم پر الہام نہیں ہوتا بلکہ انکو ایک آدمی یہ باتیں سکھاتا ہے۔ گو قرآن کریم نے اس شخص کا نام نہیں بتایا لیکن عبارت سے ظاہر ہے کہ کفار کا اعتراض اس موقعہ پر یہ نہ تھا کہ اسے کوئی نامعلوم شخص سکھاتا ہے بلکہ اس موقعہ پر ان کا اعتراض کسی خاص شخص کے متعلق تھا جس کا وہ اپنے پروپیگنڈا میں نام بھی بتاتے تھے۔ قرآن کریم نے گو اس کی شخصیت کا اظہار نہیں کیا۔ مگر یہ بتایا ہے کہ جس شخص پر وہ اعتراض کرتے تھے وہ اعجمی تھا اور اسی بنا پر ان کے اعتراض کو رد کیا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ ایک اعجمی کی مدد سے یہ کتاب جو عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ زبان میں ہے کیونکر تیار ہوسکتی تھی۔

کفار کے اس اعتراض کا جواب کوئی بشر آنحضرت کو سکھاتا ہے

مفسرین نے اس اعتراض کے متعلق مختلف واقعات بیان کئے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ حویطب بن عبدالعزّیٰ کا ایک غلام جس کا نام عائش یا یعیش تھا۔ وہ پہلی کتب پڑھا کرتا تھا اور اسلام لے آیا تھا اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہا تھا۔ مکہ کے لوگ اس کی نسبت الزام لگاتے تھے کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا ہے (روح المعانی۔ جلد ۱۴)۔ فراء اور زجاج کا یہی قول ہے اور مقاتل اور ابن جبیر کا قول ہے کہ مکہ کے لوگ ابو فکیہہ پر الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سکھاتا ہے (روح المعانی)

بعض نے کہا ہے کہ ابو فکیہہ کا نام یسار تھا اور وہ مکہ کی ایک عورت کا غلام تھا۔ اور یہودی تھا۔

بیہقی اور آدم بن ابی ایاس نے عبداللہ بن مسلم الحضرمی سے روایت کی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے دو نصرانی غلام تھے۔ وہ عین التمر کے رہنے والے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام یسار اور دوسرے کا نام جبر تھا۔ دونوں مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے اور کام کرتے وقت انجیل بھی پڑھتے تھے۔ رسول کریم بازار سے گزرتے ہوئے انکو انجیل پڑھتے ہوئے دیکھکر کچھ دیر کے لئے وہاں ٹھیر جاتے۔ (فتح البیان جلد ۵ نیز روح المعانی جلد ۱۴)۔

ایک روایت میں ہے کہ ان میں سے ایک سے لوگوں نے پوچھا کہ اِنَّكَ تُعَلِّمُ مُحَمَّدًا۔ کیا تم محمدؐ کو سکھاتے ہو؟ فَقَالَ لَا بَلْ هُوَ يُعَلِّمُنِیْ۔ اس نے کہا نہیں بلکہ محمدؐ مجھے سکھاتے ہیں (روح المعانی جلد ۱۴)۔

ابن عباس رض سے روایت ہے کہ ایک عجمی رومی غلام مکہ میں تھا اس کا نام بلعام تھا۔ رسول اللہ صلعم اسے اسلام سکھایا کرتے تھے۔ اس پر قریش کہنے لگے کہ یہ محمدؐ کو سکھاتا ہے۔ (روح المعانی جلد ۱۴)۔

علاوہ ازیں علامہ سیوطی رح لکھتے ہیں کہ قیس ایک عیسائی غلام تھا اس کی ملاقات رسول اللہ صلعم سے تھی۔ اس پر الزام لگائے گئے تھے کہ وہ محمدؐ کو سکھاتا ہے۔

درمنثور میں لکھا ہے کہ عدّاس ایک غلام تھا جو اوسہ بن ربیع کا غلام تھا اس کی نسبت الزام لگایا جاتا تھا۔ اور روح المعانی (جلد ۱۴) اور کشاف میں لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کفار سلمانؓ فارسی

کے متعلق الزام لگایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر تسیل لکھتا ہے کہ ڈاکٹر پرنیڈیا نے سوانح محمدؐ میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن سلام کے متعلق لوگ اعتراض کیا کرتے تھے جس کا نام یہودیوں میں حبیب بن سلوم تھا لیکن خود تسیل نے ہی اس کا رد کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پرنیڈیا نے عبداللہ بن سلام کے متعلق غلطی کھائی ہے۔ سلمان کا نام اس نے غلطی سے عبداللہ ابن سلام سمجھ لیا ہے۔ (یعنی دراصل جس کا نام لیا جاتا تھا وہ سلمان تھا)۔

تسیل کہتا ہے کہ عام خیال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نسطوری پادری سے جس کا نام سرگیس تھا مدد لی تھی۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ سرگیس بحیرہ راہب کا نام تھا جس سے محمد صاحبؐ جبکہ آپ حضرت خدیجہ رضؓ کی طرف سے تجارت کے لئے شام کو گئے تھے ملے تھے۔ اس کی سند میں مشہور مصنف اَلْمَسْعُوْدِی کو پیش کیا جاتا ہے جس نے لکھا ہے کہ بحیرہ راہب کا نام عیسائیوں کی کتاب میں سرگیس آتا ہے۔

پادری ویری مختلف روایات بیان کر کے اپنی رائے کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ناموں میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن یہ بات ہم کو یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صاحب کے پاس ایسے ذرائع موجود تھے کہ ہجرت سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کی مدد حاصل کر سکتے تھے۔ اور یہ بات کہ وہ اس مدد سے فائدہ حاصل کیا کرتے تھے اس کا ناقابل تردید ثبوت مکی زندگی کے آخری دور کی سورتوں میں جن میں یہودیوں اور مسیحیوں کی کتب کی کہانیاں بیان ہیں۔ ملتا ہے۔

پھر یہی صاحب آیت زیر بحث کا حوالہ دیکر لکھتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صاحبؐ کے ہمسائے غیر مذاہب کے لوگوں سے مدد حاصل کرنے کا الزام ان پر لگایا کرتے تھے اور اس اعتراض کا جو جواب قرآن نے دیا وہ محمد صاحبؐ کی پوزیشن کی کمزوری کو ثابت کر رہا ہے۔ چنانچہ آرنلڈ صاحب بھی اس بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ غیر ملکی تھے ہم کہتے ہیں کہ وہ انہیں مسالا تو مہیا کر کے دے سکتے تھے۔ آگے ویری کہتا ہے کہ یہی تو ہے جو وہ کیا کرتے تھے اور اسی وجہ سے کہ محمد صاحب اس مسالے کو لیکر اور اپنی نبوت کے مقصد کی تائید میں ڈھال کر خدا (تعالیٰ) کی طرف منسوب کر کے ان واقعات کو دُہرا دیا کرتے تھے اور جبرائیل فرشتہ کی وحی اس کو بتاتے تھے ہم اس کئے الزام کو دُہرانے میں ہچکچاتے نہیں کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولا کرتے تھے (نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات)۔

مسلمان مفسروں اور عیسائی مؤرخوں اور پادریوں کے خیالات تحریر کرنے کے بعد اب میں اس آیت کا مفہوم بیان کرتا ہوں۔ آیت زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے تھے کہ رسول کریمؐ کو قرآن کا مضمون کوئی انسان سکھاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ انکی زبان تو عجمی ہے اور یہ کلام تو عربی میں ہے۔ سیل کہتے ہیں کہ یہ جواب غلط ہے کیونکہ معترض یہ نہیں کہتا کہ وہ غلام قرآن کا مضمون عربی زبان میں گھڑ کر آپکو دیدیا کرتے تھے۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ وہ یہودی کتب کے مضامین آپکو بتاتے تھے اور آپ ان مضامین کو اپنی عبارت میں ڈھال لیا کرتے تھے۔

آنحضرتؐ کو کسی بشر کے سکھانے کے متعلق پادریوں کی غلط آراء

میرے نزدیک کسی کے کلام کو سمجھنے سے پہلے اس کی عام حالت کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اگر قرآن کے دوسرے جوابات جو وہ مخالفوں کے اعتراضوں کے دیتا ہے ایسے ہی بیہودہ ہوتے ہیں جیسا کہ یہ جواب ہے جو پادری ویری اور آرنلڈ صاحب نے قرآن کریم کی طرف منسوب کیا ہے تو بیشک انکی یہ تنقید قابل اعتناء ہو سکتی ہے لیکن اگر اس کے برخلاف قرآن اپنے مخالفوں کے اعتراضات کے مناسب اور مدلل جواب دیتا ہے۔ تو پھر اس امر کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو پادری صاحبان نے سوال نہیں سمجھا یا جواب نہیں سمجھا۔

آیت یعلمہ بشر کا اصل مفہوم

دوسرا قابل غور امر اس بارہ میں یہ ہے کہ اگر یہ جواب ایسا ہی بے جوڑ تھا جیسا کہ میسرز ویری اور آرنلڈ ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو کیوں مکہ والوں نے اس کو رد نہ کیا؟ اگر ان کا وہی اعتراض تھا جو میسرز ویری اور آرنلڈ نے سمجھا ہے تو انہوں نے کیوں اس کے جواب میں یہ بات نہ کہی کہ ہمارا تو یہ اعتراض نہیں کہ آپ عربی اس یہودی یا عیسائی غلام سے بنواتے ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ

آپ مسالہ اس سے لیتے ہیں۔ اور پھر اپنی زبان میں اس کے مضامین کو بیان کر دیتے ہیں۔ کفار کی طرف سے یہ اعتراض کسی کمزور روایت میں بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شاید مسلمانوں نے وہ اعتراض تاریخ میں نقل نہ کیا ہو کیونکہ جب بیسیوں اتہام جن سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یا اسلام پر زد پڑتی ہے کتب احادیث میں درج ہیں۔ تو اس ایک اعتراض کے نقل کرنے میں ان کے لئے کیا روک تھی؟ پس صاف ظاہر ہے کہ کفار نے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا کہ ان کے سوال کو ٹھیک طور پر سمجھ لیا گیا ہے اور جواب اس کے مطابق ہی دیا گیا ہے۔

اعجمی لفظ کا استعمال زبان کے لئے

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ مذکورہ سوال کا جواب جو قرآن کریم نے دیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا مطلب سمجھنے سے پہلے اَعْجَمِیٌّ کے معنے سمجھ لینے ضروری ہیں۔ عربی زبان میں عرب اور عجم دو لفظ عربوں اور غیر عربوں کے لئے مستعمل ہوتے ہیں۔ اور اسی مادہ سے اَعْجَمُ کا لفظ ہے جو غیر عرب کے لئے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ تاج العروس جلد ۸ میں ہے۔ عرب کہتے ہیں رَجُلٌ اَعْجَمُ وَ قَوْمٌ اَعْجَمُ۔ وہ شخص اعجم ہے یا وہ قوم اعجم ہے مطلب یہ کہ وہ آدمی یا قوم غیر عرب ہے۔ عربوں میں سے نہیں ہے۔

آیت کے دو معنے

اعجمی کے معنے

اس حد تک کے حوالہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اعجم غیر عرب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے سوا اعجم کے معنے مَنْ لَا یُفْصِحُ کے بھی ہیں یعنی وہ شخص جو بات کھول کر نہ بیان کر سکے۔ اسی طرح یہی معنے اعجمی کے بھی ہیں (تاج)۔ اور ان معنوں میں عرب کی نسبت بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اعجم اس شخص کی نسبت بھی بولتے ہیں جس کی زبان میں لکنت ہو خواہ وہ فصیح الکلام ہی کیوں نہ ہو۔ (تاج)۔

اعجمی کے معنی غیر عرب کے

ان معانی کو بیان کرنے کے بعد اب میں اس طرف توجہ پھیرنا چاہتا ہوں کہ اس جگہ اعجمی کا لفظ انسان کی نسبت نہیں بولا گیا بلکہ زبان کی نسبت بولا گیا ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ جس کی نسبت قرآن بنانے میں مدد دینے کا الزام لگایا گیا ہے وہ اعجمی ہے۔ بلکہ یوں فرمایا ہے کہ جس شخص کی نسبت یہ لوگ ایسا گمان کر رہے ہیں اس کی زبان اعجمی ہے یعنی (۱) غیر عرب لوگوں کی زبان ہے۔ یا (۲) یہ کہ اس کی زبان ایسی ناقص ہے کہ وہ اپنا مطلب بیان ہی نہیں کر سکتا۔

اعجمی کے ایک معنے لکنت کے بھی ہیں وہ معنے بولی کی نسبت استعمال نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ لکنت چمڑے کی بات میں ہوتی ہے۔ الفاظ سے مرکب بولی میں لکنت نہیں ہوا کرتی پس جب اعجمی کا لفظ زبان کی نسبت بولا جائے تو اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ غیر عرب زبان یعنی جسے اعجم لوگ بولتے ہیں یا پھر اس حد تک غیر فصیح زبان جو مطلب واضح نہ کر سکتی ہو خواہ اس کا بولنے والا عرب ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ عربی میں ہی کیوں بات نہ کر رہا ہو۔

اعجمی زبان کے معنوں کی تعیین کرنے کے بعد اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ان دونوں معنوں کو مدنظر رکھ کر اس آیت کے یہ دو معنے ہوتے ہیں:۔

(۱) یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ کو قرآن کوئی دوسرا شخص سکھاتا ہے۔ وہ شخص جس کی طرف یہ لوگ اس کام کو منسوب کرتے ہیں اس کی زبان تو غیر عربی ہے۔

(۲) جس کی نسبت یہ لوگ اس کام کو منسوب کرتے ہیں وہ تو اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر ہی نہیں اور قرآن کی زبان عربی ہے۔ اور عربی بھی وہ کہ مضمون اس میں سے پھوٹ پڑتے ہیں۔

ان دونوں جوابوں کو دیکھ لو کہ نہایت معقول اور مدلل اور مسکت ہیں۔ جو عربی نہ جانتا ہو وہ بھی عرب کو کچھ سکھا نہیں سکتا۔ اور جس کی دماغی حالت ایسی کمزور ہو کہ صحیح طور پر بات نہ کر سکتا ہو وہ بھی کوئی علمی بات کسی کو نہیں بتا سکتا۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ کفار کس شخص کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اس غلام کے مختلف نام آتے ہیں۔ مگر ان مختلف ناموں میں سے اکثر کے مطابق وہی روایت ہے جس میں جبر کی نسبت سکھانے کا شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کیونکہ باقی غلام جن کے نام

لئے گئے ہیں کھلے طور پر مسلمان تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صبح و شام ملتے رہتے تھے۔ ان میں کسی ایک کو اعتراضات کا نشانہ بنانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اگر اعتراض ہوتا تو سب پر ہوتا۔ وہ شخص جو اکیلا تھا اور جس کی نسبت کفار کو شبہ ہوتا تھا کہ شاید یہ باتیں سکھاتا ہے وہ جبر ہی ہے جو بہت دیر بعد مسلمان ہوا ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں نہیں آتا تھا بلکہ جیسا کہ روایات سے ثابت ہے آپ بعض دفعہ اس کے پاس جبکہ وہ تلواریں بناتے ہوئے انجیل کی آیات پڑھا کرتا تھا کھڑے ہو جاتے تھے۔ پس اس آیت میں جس شخص کی طرف اشارہ ہے وہ یہی شخص ہے۔ اور جیسا کہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے مذہبی جوش کی وجہ سے لوہا کوٹتے ہوئے انجیل پڑھتا جاتا تھا اور وجہ غیر زبان ہونے کے عجوبہ خیال کرتے ہوئے لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے جوش سے متاثر ہوتے اور آپ بھی بعض دفعہ اس کے پاس کھڑے ہو جاتے اور یہ خیال کرکے کہ جس شخص میں مذہب کا اس قدر جوش ہے وہ ضرور سنجیدگی سے دینی مسائل پر غور کرے گا۔ اسے اسلام کی تلقین کرتے بعض لوگ جنہوں نے اس کے پاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے دیکھا انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ آپکو سکھاتا ہے۔ چنانچہ اوپر جو احادیث نقل ہوئی ہیں انہیں یہ بھی آتا ہے کہ اس سے یا اس کا جو ایک اور ساتھی تھا اس سے بعض لوگوں نے سوال کیا کہ کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے دین کی باتیں سکھاتے ہو؟ تو اس نے کہا نہیں وہ مجھے سکھاتے ہیں۔ (روح المعانی جلد ۱۴)

اس سوال و جواب سے ظاہر ہے کہ لوگ اسی کی نسبت گمان کرتے تھے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا ہے اس الزام کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا ہے کہ اسکی زبان تو عجمی ہے یعنی وہ عربی زبان نہیں جانتا یا ایسی تھوڑی جانتا ہے جیسے زبان جانتا نہیں کہہ سکتے۔ اور قرآن کی زبان تو عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ہے پھر بتاؤ کہ ان دونوں کے درمیان تبادلۂ خیال کس طرح ہو سکتا ہے۔ آخر مذہب کی تعلیمات سکھانے کے لئے زبان ہی ذریعہ ہے اگر دونوں شخصوں کی زبان ایک نہیں۔ ایک کی زبان غیر عربی ہے اور دوسرے کی عربی۔ تو عربی دان غیر عربی دان سے کس ذریعہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ جواب نہایت معقول ہے اور اس جواب کو کوئی غیر معقول نہیں کہہ سکتا۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہو سکتے تھے کہ اس کی زبان جس کی نسبت اتہام لگایا جاتا ہے کہ وہ سکھاتا ہے گو عربی ہو۔ مگر وہ اپنا مفہوم ادا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اگر یہ معنے کئے جائیں تب بھی جواب درست ہے۔ کیونکہ جواب میں قرآن کریم کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن کی زبان اس قدر وسیع مطالب پر مشتمل ہے کہ وہ مُبِين کہلانے کی مستحق ہے۔ یعنی وہ ہر اعتراض کا خود ہی جواب بھی دیتی جاتی ہے۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جو اپنا مطلب بھی پوری طرح واضح نہیں کر سکتا یعنی موٹی عقل اور کُند ذہن ہے وہ ایسے مطالب محمد رسول اللہ کو بتائے کہ ہر دعویٰ کے ساتھ اس کی دلیل بھی موجود ہو۔ اور ہر مشکل جو قرآن پڑھتے ہوئے انسانی ذہن پیدا کرے اس کا حل بھی ساتھ ہی موجود ہو۔ جو شخص کسی علمی بات کے بیان کرنے کے قابل نہیں اور موٹی عقل کا آدمی ہے اور اپنے مطلب کو واضح نہیں کر سکتا وہ اس قسم کی باتیں سمجھا ہی کس طرح سکتا ہے۔ یہ دلیل بھی ایسی کامل اور مُسکت ہے کہ اس کے معقول اور لاجواب ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

آنحضرت پر عیسائی غلام سے سیکھنے کا اعتراض اور اس کا جواب

ممکن ہے کوئی اعتراض کرے کہ ہو سکتا تھا کہ وہ غلام اپنے بھدے پیرایہ میں اناجیل کے واقعات سنا دیتا ہو۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مُبِين کا لفظ اس سوال کا جواب بھی دے رہا ہے۔ کیونکہ بتانے والا اگر نامکمل سچائیاں بتاتا تھا تو کونسی صورت تھی کہ محمد رسول اللہ ان کو مُبِين صداقتوں یعنی ان صداقتوں میں جو اپنی سچائی کی آپ ہی دلیل ہوں تبدیل کر سکتے تھے کیا کوئی شخص یہ طاقت رکھتا ہے کہ جھوٹ یا غلط بات کو مُدلّل ہی نہیں بلکہ ایسا مدلل بنا دے کہ مضمون روزِ روشن کی طرح کھل جائے۔

بعض مسیحی اعتراض کو یہ رنگ دیتے ہیں کہ قرآن کا یہ دعویٰ ہے

کہ اس میں چونکہ یہود و نصاریٰ کی کتب کی باتیں ہیں اور محمد رسول اللہ صلعم بوجہ اُمّی ہونے کے خود ان باتوں سے واقف نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ یہ باتیں انہوں نے خدا تعالیٰ سے معلوم کر کے دنیا کو بتائی ہیں۔ اس دعویٰ کے خلاف یہ اعتراض ہے کہ وہ بعض مسیحی غلاموں سے غلط اور بے جوڑ روایات سن کر قرآن میں داخل کر لیتے تھے۔ اور اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ جس شخص سے وہ ان قصوں کو سنیں وہ ضرور بڑے دماغ کا اور بڑی سمجھ کا آدمی ہو۔ بلکہ واقعات چونکہ غلط بیان ہوئے ہیں اس لئے جاہل یا ادنیٰ غلام کی نسبت ایسا الزام واقعات کے زیادہ مطابق بیٹھتا ہے نہ کہ اعتراض کو دور کرتا ہے۔

اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں کہیں وہ دعویٰ بیان نہیں جو مسیحی قرآن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ قرآن کریم اپنی سچائی کی یہ دلیل نہیں دیتا کہ چونکہ اس میں اہل کتاب کی کتب کی باتیں بیان ہوئی ہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ بلکہ قرآن تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں وہ صداقتیں موجود ہیں جو اہل کتاب کی کتب میں نہیں ہیں اس لئے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ چنانچہ اسی سورۃ نحل میں یہ آیات گذر چکی ہیں کہ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (نحل ع ۸)۔ یعنی ہمیں اپنی ہی ذات کی قسم ہے کہ تجھ سے پہلے ہر قوم میں نبی گزر چکے ہیں۔ اور ہر قوم کے پاس ہدایت نامہ آچکا ہے مگر باوجود اس کے شیطان نے ان قوموں کو گمراہ کر دیا اور اب وہ مختلف باتیں اپنے مذہب کی طرف منسوب کر رہے ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل نہ ہوئی تھیں اور وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کے تصرف میں آئے ہوئے ہیں اور دردناک عذاب کا مورد بننے کے خطرہ میں ہیں۔ پس ان کے ان اختلافات کے مٹانے کے لئے ہم نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ سچائیاں جو ان سے مخفی ہو چکی ہیں اور وہ ان کے متعلق اختلاف کر رہے ہیں بیان کرے۔ اور اس قرآن کے ذریعہ سے ہم نے مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت کے سامان پیدا کئے ہیں۔

قرآن مجید اپنے اندر جملہ کتب کی صداقتیں رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

اس آیت میں پہلے سب قوموں میں نبی آنے کا ذکر ہے اور بعد میں قرآن کریم کے نزول کا۔ اور یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ یہ پہلے نبیوں کی کتب کی باتیں بیان کرتا ہے اس لئے سچا ہے۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ پہلی کتب کو لوگوں نے چھوڑ دیا اور شیطان کے پیچھے چل پڑے اور ان میں قسم قسم کے اختلاف پیدا ہو گئے۔ یہ قرآن ان اختلافوں کو مٹانے اور جو صداقت مخفی ہو گئی تھی اسے ظاہر کرنے کے لئے آیا ہے۔ قرآن کریم کے اس دعوے کی موجودگی میں یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ محض پچھلی کتب کی باتیں بیان کر کے جن کو وہ چند غلاموں سے سن لیتے تھے اپنی سچائی کا دعویٰ کرتے تھے کس قدر غلط ہے۔

خود یہ آیت بھی تو جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہی بات پیش کر رہی ہے۔ کہ قرآن کریم کی برتری کسی نقل کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے مُبِیْن ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور مُبِیْن ہونے کے لئے وسیع اور مخفی علوم کی ضرورت ہے۔ جن کی اس آدمی کو جس کی طرف یہ کام منسوب کیا جاتا ہے۔ تو کیا امید کی جا سکتی ہے بڑے سے بڑا عقلمند انسان بھی اس کتاب کے بنانے میں مدد نہیں دے سکتا جس میں سب سچائیاں با دلیل بیان کی گئی ہوں اور سب اعتراضوں کا رد موجود ہو۔ ایسی کتاب تو صرف خدا تعالیٰ ہی اتار سکتا ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ غلام جاہل تھے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ کوئی بڑا عالم رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ جن مسیحیوں نے اس آیت کا مشار الیہ سرگیس کو قرار دیا ہے اسی حکمت سے قرار دیا ہے کیونکہ وہ زیادہ عقلمند تھے۔ اور انہوں نے اس امر کو محسوس کر لیا تھا کہ قرآن کریم میں یہود و نصاریٰ اور اسلام کے درمیان اختلافی امور کی جو بحث ہے وہ غلام تو الگ رہا اچھے لکھے پڑھے عیسائی کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ اس لئے انہوں نے ایک فرضی سرگیس کو

تجویز کیا کہ وہ ایک نسطوری راہب تھا اور آپکو سکھلایا کرتا تھا۔ تاریخی طور پر تو خود مسیحی مصنفوں نے ہی انکی بات کو رد کر دیا ہے۔ مگر میں عقلی طور پر بھی اسکا ایک جواب بیان کر دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر نصارٰی اس الزام کو یہ شکل دیں تو پھر بھی انہی کے مذہب پر زد پڑتی ہے کیونکہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ یہود و نصارٰی کی جو تصویر اسلام نے پیش کی ہے خواہ انسانوں سے سیکھ کر کی ہے مگر ہے وہی سچی۔ اور اگر وہ تصویر سچی ہے تو ان کے مذاہب کے غلط ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ اِس پہلو کے بدلنے سے صرف انکو یہ تسلی ہو گئی کہ ہمارے مذاہب تو جھوٹے ثابت ہو ہی گئے ہیں ہم نے قرآن پر بھی اعتراض کر دیا کہ اسے بھی انسان نے بنایا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ شبہ یقین کا قائم مقام نہیں ہو سکتا قرآن کریم کی طرف جو بات وہ منسوب کر رہے ہیں اسے تو خود ان کے اپنے آدمی ناقابل قبول قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ تسلیم کر کے کہ قرآن کریم نے یہودیوں اور مسیحیوں سے جہاں جہاں اختلاف کیا ہے وہ کسی بڑے عالم کی تحقیق ہے جس نے اہل کتاب کی لائبریریاں چھان کر ان باتوں کو نکالا ہے۔ اور موجودہ مذاہب کی غلطیوں کو ظاہر کر دیا ہے۔ اس سے تو ان مذاہب کا کچھ بھی نہیں رہتا۔ اور یہودی اور مسیحی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے سکتے ہیں کہ یہودیت وہ نہیں جو موجودہ تورات اور کتب یہود میں موجود ہے بلکہ وہ ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اور نصرانیت وہ نہیں جو موجودہ اناجیل میں ہے۔ بلکہ وہ ہے جو قرآن میں ہے۔ اور اگر وہ ایسا کہیں گے تو دوسرے لفظوں میں قرآن کریم کی تصدیق کریں گے۔

اب ایک پہلو آیت کے ترجمہ کا رہ گیا ہے جو قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آیت کا ترجمہ کہ جس کی نسبت لوگ گمان کرتے ہیں۔ اس کی زبان غیر عربی ہے۔ اس کے گو ایک معنے یہ بھی ہو سکیں کہ اس کو عربی یا آتی ہی نہیں یا اتنی نہیں آتی کہ وہ اپنا مطلب بیان کر سکے۔ لیکن اس کے یہ معنے بھی تو ہو سکتے ہیں کہ اس کی مادری زبان غیر عربی ہے۔ اور ایسا شخص جس کی مادری زبان غیر عربی ہو بعد میں عربی سیکھ بھی تو سکتا ہے پس جواب مکمل نہ ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معنے اس آیت کے نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ سوال قرآن کریم نے دوسری جگہ خود بیان کیا ہے۔ اور اس کا الگ جواب دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معنے آیت زیر بحث میں نہیں ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پادری وہیری کا یہ استنباط کہ سورۃ نحل کا جواب بالکل بودا ہے اور اس سے اعتراض کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔ انکی ناواقفیت کی وجہ سے ہے کیونکہ جب قرآن کریم نے وہی سوال جو وہیری صاحب اور دوسرے مسیحی مصنفوں نے اس آیت سے نکالا ہے سورۃ فرقان میں خود بیان کیا ہے اور اس کا جواب نہایت زبردست دیا ہے۔ تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ سورۃ نحل میں اس سوال کا نہایت بودا جواب دیا جاتا۔

عیسائیوں کے اعتراض کا عقلی رد

سورۃ فرقان خود وہیری صاحب کے نزدیک ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اس سورۃ کی آیتیں محمد (صلعم) کی ابتدائی مکی وحی میں سے ہیں۔" (تفسیر قرآن جلد ۲ صفحہ ۲)

اور سورۃ نحل کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"تمام شہادت اندرونی ہو یا بیرونی ہمیں اس امر کے ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ (نحل) آخری مکی سورتوں میں سے ہے" (تفسیر القرآن جلد ۳۔ صفحہ ۲۴، صفحہ ۲۵)

اب کیا کوئی عقلمند تسلیم کر سکتا ہے کہ جس اعتراض کو سورۃ فرقان میں نہایت زبردست دلائل کے ساتھ رد کیا ہے اس کے چھ سال کے بعد اس سوال کا جواب سورۃ نحل میں نہایت بودا اور کمزور دیا ہے۔ اگر فرقان بعد کی ہوتی تو کوئی شبہ بھی کر سکتا تھا کہ اس وقت جواب نہیں سوجھا بعد میں جواب بنا لیا۔ مگر فرقان خود مسیحی مصنفوں کے نزدیک پہلے کی ہے اور نحل بعد کی۔

اب میں مضمون کو یکجا بیان کرنے کے لئے پہلے وہ دلائل بیان کرتا ہوں جو سورۃ فرقان میں بیان کئے گئے ہیں۔ سورۃ فرقان میں آتا ہے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۚ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۔ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔

(سورہ فرقان ع ۱)۔

یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن ایک جھوٹی کتاب ہے اور محمد رسول اللہ ؐ کو اس کے بنانے میں دوسرے لوگ مدد دیتے ہیں ان کفار نے یہ اعتراض کر کے سخت ظلم کیا ہے اور جھوٹ بولا ہے اور وہ اس اعتراض کو پکا کرنے کے لئے یوں دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے کیا بس پرانے لوگوں کی باتیں نقل کر دی گئی ہیں۔ محمد (صلعم) وہ باتیں لکھوا لیتے ہیں اور صبح وشام ان کے سامنے وہ پڑھی جاتی ہیں (تاکہ یاد رہیں)۔ تو ان سے کہہ کہ قرآن کو تو اس نے اتارا ہے جو آسمان اور زمین کے رازوں کو جانتا ہے۔ وہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس آیت میں صاف لفظوں میں اس اعتراض کو نقل کیا گیا ہے جو ویری صاحب سورۃ نحل کی آیت سے نکالنا چاہتے ہیں اور اس اعتراض کو پڑھ کر یہ بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سورۃ نحل والی آیت کا اعتراض اس اعتراض سے مختلف ہے کیونکہ سورۃ نحل میں ایک شخص کی طرف سکھانا منسوب کیا گیا ہے اور یہاں کئی شخصوں کی طرف۔ پھر سورۃ نحل والی آیت میں گو نام نہیں لیا گیا مگر یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ جس پر الزام لگایا جاتا ہے وہ معین شخص ہے لیکن سورۃ فرقان میں وہ جماعت غیر معین کہی گئی ہے۔ اسی طرح سورۃ نحل میں سکھانے کے کام کا وقت نہیں بتایا گیا لیکن سورۃ فرقان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صبح وشام یہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

سورۃ فرقان کی آیات کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ چونکہ صبح وشام نماز کے لئے اور قرآن سیکھنے کے لئے دار ارقم میں جمع ہوتے تھے وہ نادان خیال کرتے تھے کہ شاید اس جگہ جمع ہو کر بعض مسیحی غلام اپنی کتب کی باتیں ان کو بتاتے ہیں یا ان سے لکھ کر صحابہ لے آتے ہیں اور پھر وہ صبح وشام حفظ کی جاتی ہیں۔ ان جاہلوں کی عقل میں صبح وشام کی نمازیں تو آ ہی نہیں سکتی تھیں۔ وہ اس اجتماع کو منصوبہ بازی کا وقت سمجھتے تھے۔ خود مجھے اس بارہ میں ایک تجربہ ہو چکا ہے جس سے اس قسم کی بدگمانی کی حقیقت خوب معلوم ہو جاتی ہے۔

کوئی بیس سال کا عرصہ ہوا۔ میں لاہور گیا۔ مجھ سے آریوں کے مشہور لیڈر لالہ رام بھجدت جو اب فوت ہو چکے ہیں ملنے کے لئے آئے۔ ان کے ساتھ کچھ اور صاحبان بھی تھے۔ جن میں شیر پنجاب جو سکھوں کا مشہور اخبار ہے۔ اس کے ایڈیٹر صاحب بھی شامل تھے۔ اتفاق سے اس دن میرا لیکچر تھا۔ وہ لیکچر سننے کے لئے ٹھہر گئے۔ مجھے سارا دن کام کی وجہ سے حوالے نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لئے میں نے حافظ روشن علی صاحب مرحوم کو (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے)۔ جو آیات کو نکالنے کا خاص ملکہ رکھتے تھے سٹیج پر بٹھا لیا۔ اور کہا کہ میں آپ کو مضمون بتاتا جایا کروں گا۔ آپ مجھے آیت کے الفاظ بتاتے جایا کریں۔ خیر میں نے لیکچر شروع کیا۔ جہاں کہیں آیت سے استدلال کی ضرورت ہوتی۔ میں آہستہ سے ایک دو لفظ آیت کے پڑھ دیتا یا مضمون بتا دیتا اور وہ ساری آیت پڑھ دیتے۔ میں اسے پڑھ کر جو استدلال پیش کرنا ہوتا تھا اسے بیان کر دیتا۔ دوسرے دن شیر پنجاب میں ایک مضمون نکلا کہ کل ہم بھی امام جماعت احمدیہ قادیان کے لیکچر میں تھے لیکچر اچھا تھا۔ مگر ہم نے ذرا تجسس کیا اور سٹیج کے پچھلی طرف گئے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے پیچھے ایک عالم چھپایا ہوا تھا۔ وہ مضمون بتاتا جاتا تھا اور مرزا صاحب دہراتے جاتے تھے۔ واقف کار لوگوں میں کئی دن اس پر ہنسی اڑتی رہی اور سردار صاحب سے بھی کسی نے جا ذکر کیا۔ وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ اور کہا کہ میں نے تو سمجھا تھا کہ میں نے اپنی ہوشیاری

سے راز معلوم کرلیا ہے۔

ایسی ہی ہوشیاری مکّہ والوں نے دکھائی تھی۔ کام والے لوگوں کو صبح و شام ہی فرصت مل سکتی تھی۔ وہ صبح اور شام کی نمازیں ادا کرنے کے لئے اور قرآن پڑھنے کے لئے دار ارقم میں جمع ہو جاتے تھے۔ کفار کے بعض زیادہ عقلمند لوگ خیال کرتے تھے کہ ہم نے راز معلوم کرلیا ہے۔ یہ قرآن کی تصنیف کے لئے جمع ہوتے ہیں۔

عقلمند کے لئے اس میں بھی ایک نشان ہے کیونکہ اس میں بھی یہ اعتراف پایا جاتا ہے کہ قرآن کو کوئی ایک شخص نہیں بنا سکتا۔ تبھی انہوں نے اس کے بنانے میں مدد دینے والی ایک جماعت قرار دی۔ جن میں سے بعض عقلی باتیں جمع کرتے تھے اور بعض پرانی کتب کی تعلیم جمع کرتے تھے۔

اب میں سورۃ فرقان میں اس اعتراض کے جو جواب دئے گئے ہیں بیان کرتا ہوں۔ کفار کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اس کے دو پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) اول یہ کہ جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ کیا وہ ایسا کر سکتے تھے؟

(۲) دوسرے یہ کہ جس چیز کی نسبت کہا جاتا ہے کہ بعض غلاموں نے لکھائی ہے۔ کیا وہ انسانوں کی لکھائی ہوئی ہو سکتی ہے؟

پہلے سوال کا جواب قرآن کریم یہ دیتا ہے کہ یہ سوال نہایت "ظالمانہ اور جھوٹا ہے۔ اس جواب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جن غلاموں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ آ آ کر رسول کریمؐ کو قرآن سکھایا کرتے تھے ان کے متعلق دیکھنا چاہیئے کہ وہ اسلام کی خاطر کیا کیا تکالیف اٹھا رہے تھے۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا۔ کہ ایسے لوگ جو خود قرآن بنا بنا کر محمد رسول اللہؐ کو دیتے تھے۔ اس جھوٹے کلام کی خاطر رات اور دن تکلیفیں اُٹھا رہے تھے۔ اسلام کی خاطر ان غلاموں میں سے بعض نے جانیں دیں بعض کی آنکھیں نکالی گئیں۔ ایک میاں بیوی کو اس طرح قتل کیا گیا کہ خاوند کی دونوں لاتوں کو دو اونٹوں سے باندھ کر دو طرف چلا دیا۔ اور اس کی بیوی کی شرمگاہ میں نیزہ مار کر اس کے سامنے قتل کیا۔ اور ان کے لڑکے کو بھی سخت ایذائیں دیں۔ اس دوران میں انہیں بار بار کہا جاتا تھا کہ محمد رسول اللہؐ کا انکار کر دیں تو چھوڑ دئے جائیں گے۔ مگر میاں بیوی مرتے مر گئے پر صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہ آزادوں کا سردار نام تھا۔ غلام یک بھی انہی غلاموں میں سے تھا جن کے متعلق یہ اتہام لگایا جاتا تھا کہ وہ محمد رسول اللہؐ کو سکھاتے ہیں۔ کیا کوئی انسان مان سکتا ہے کہ خود ہی قرآن بنا کر دینے والے محمد رسول اللہؐ کے نام پر ایسے ایسے عذاب اٹھا کر جانیں قربان کر رہے تھے۔

مکّے کا فر تو وقتی جوش میں اندھے ہو رہے تھے کیا آج کل کی عیسائی دنیا میں بھی کوئی دیکھنے والی آنکھ نہیں؟ کوئی بولنے والی زبان نہیں جو اس بار بار دہرائے جانے والے ظالمانہ اور جھوٹے اعتراض کے خلاف آواز اٹھائے؟

اعتراض کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا وہ کلام ان غلاموں کا سکھایا ہُوا ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب دیا ہے کہ جنہیں تم قصے کہتے ہو وہ قصے ہیں ہی نہیں۔ بلکہ پیشگوئیاں ہیں۔ ان کا اتارنے والا تو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں کا جاننے والا خدا ہے۔ یعنی ان میں آئندہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں نہ کہ پرانے واقعات۔ اور انسان آئندہ کے حالات نہیں جان سکتا۔ اور نہ بتا سکتا ہے۔ اب دیکھو تو یہ جواب کیسا واضح اور صحیح ہے

غرض سورہ نحل میں یہ اعتراض نہیں کہ دوسرا کوئی شخص اسے مضمون سکھاتا ہے۔ وہ اعتراض فرقان میں بیان ہوا ہے اور اس کا ایسا دندان شکن جواب دیا گیا ہے کہ شریف آدمی اسے سنکر پھر اس اعتراض کو نہیں دہرا سکتا۔ اور سورۃ نحل میں وہ اعتراض نہیں بلکہ یہ اعتراض بیان ہوا ہے کہ فلاں غلام قرآن سکھاتا ہے۔ حالانکہ وہ غلام عربی نہیں جانتا تھا۔ صرف کچھ آیات انجیل کی غالباً یونانی زبان میں ہونگی کام کرتے وقت پڑھا کرتا تھا۔ محمد رسول اللہؐ اس کے جوش کو

آنحضرتؐ کا جبر غلام سے انجیل سیکھنا غلط ہے۔

دیکھ کر اس کے پاس تبلیغ کے لئے ٹھیر جاتے تھے کہ کوئی بات اس کے کان میں پڑ جائے تو شاید کسی وقت ہدایت کا موجب بنے تبھی اسنے خود اقرار کیا ہے کہ یہ مجھے سکھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتا ہے کہ اسے تو عربی بولنی اسقدر نہیں آتی کہ کوئی علمی مضمون بیان کر سکے۔ یہ اتنی ہی مدد کر سکتا ہے کہ انجیل کی عبارتیں عبرانی یا یونانی زبانوں میں آپ کو یاد کرا دے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو قرآن کا ایک حصہ عبرانی یا یونانی ہوتا مگر قرآن تو سارا عربی میں ہے۔ پھر جبکہ ترجمانی وہ غلام کر نہیں سکتا اور عبرانی یونانی کی عبارتیں قرآن میں موجود نہیں تو سکھایا کس نے اور سیکھا کس نے؟

انجیل کے تراجم کا رواج چودہویں صدی عیسوی سے ہوا

اس سے زبردست جواب اور کیا ہو سکتا ہے اور اسے بودا کہنے والے کو سوائے متعصب یا موٹی عقل والے کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ روایت میں دو غلاموں کا ذکر آتا ہے لیکن میں نے ایک غلام کا ذکر کیا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کریم کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک غلام کے متعلق اعتراض کیا کرتے تھے۔ دوسرے ایک روایت جس میں ذکر ہے کہ اس شخص سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا تو محمد (صلعم) کو سکھاتا ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہیں۔ اس میں بھی ایک ہی آدمی کا ذکر ہے۔ پس خواہ دو غلام ہی یکجا اکٹھے کام کرتے ہوں پر شبہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی کے متعلق کیا جاتا تھا۔

آنحضرتؐ پر ایک غلام سے سیکھنے کا اعتراض

آنحضرتؐ کے زمانہ میں انجیل کا عربی ترجمہ نہ ہوا تھا

اس جگہ ایک اور سوال بھی غور طلب ہے جو اس اعتراض کے متعلق ہماری صحیح راہ نمائی کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا اس وقت تورات اور انجیل کے عربی تراجم ہو چکے تھے اور وہ اسقدر رائج تھے کہ غلام بھی انکو کام کے وقت پڑھا کرتے تھے؟ کیونکہ اگر یہ صورت نہ ہو تو عبرانی اور یونانی کتب کی عبارتوں سے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی فائدہ اٹھا سکتے تھے اور نہ وہ غلام خود ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے کیونکہ عبداللہ بن سلام کے سوا کسی ایک مسلمان کے متعلق بھی تاریخ سے ثابت نہیں کہ وہ عبرانی جانتا تھا اور یونانی سے واقف کا تو تاریخ میں میرے علم میں کوئی ذکر ہی نہیں آتا۔

جہانتک میری تحقیق ہے اس وقت تک عربی زبان میں تورات اور انجیل کے تراجم نہیں ہوئے تھے۔ اور جب ان کتب کے تراجم نہیں ہوئے تو طالمود وغیرہ جو یہود کی روایتوں کی کتب ہیں ان کے تراجم کس نے کرنے تھے۔ میرے اس خیال کی تائید مندرجہ ذیل دلائل سے ہوتی ہے:-

(۱) اس وقت تک انجیل کے تراجم کا رواج ہی نہ تھا۔ تراجم کا رواج تیرہویں چودہویں صدی سے شروع ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفسرین جنہوں نے تفسیر میں مدد لینے کے لئے ہر قسم کے علوم پڑھ ڈالے تھے جب تورات و انجیل کے حوالے دینے بیٹھتے ہیں تو بالکل بے ثبوت کہانیاں انکی طرف منسوب کر دیتے ہیں جن کا نام و نشان بھی بائبل میں نہیں ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ انکو عربی کی انجیل میسر نہ تھی۔ اگر عربی میں تورات اور انجیل ہوتی تو کیا یونان کا فلسفہ اور حکمت پڑھنے والے ان کتب کو نہ پڑھتے؟

(۲) اسلامی روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انجیل یونانی یا عبرانی زبان میں ہی تھیں۔ بخاری باب بدء الوحی میں ورقہ بن نوفل کے متعلق لکھا ہے۔ قَدْ تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ فَيَكْتُبُ مِنَ الْإِنْجِيْلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَكْتُبَ۔ یعنی ورقہ عبرانی زبان میں انجیل لکھا کرتے تھے۔

بعض روایات میں بجائے عبرانی کے عربی کا لفظ بھی ہے مگر ہم اس روایت کو ترجیح دینے پر مجبور ہیں کیونکہ اگر عربی میں تورات و انجیل ہوتی تو بہت سے لوگ اس کے پڑھنے والے نکلتے۔ بلکہ میرے نزدیک تو یہ بھی ممکن ہے کہ عبرانی بھی راوی کی غلطی سے لکھا گیا ہو۔ کیونکہ اسوقت یونانی انجیل ہی مروج تھیں اور عبرانی انجیل قریباً مفقود ہو چکی تھی۔

(۳) تیسرا ثبوت اس امر کا کہ تورات کا ترجمہ عربی میں

ذہوا تھا یہ ہے کہ یہودی جن کے بعض قبائل مدینہ میں آکر بس گئے تھے ان کے پاس بھی تورات کا عربی ترجمہ نہ تھا۔ چنانچہ اگر کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی حوالہ کی ضرورت ہوتی۔ تو عبداللہ بن سلام سے آپکو مدد لینی پڑتی تھی جو عبرانی جانتے تھے۔

(۳) احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبرانی پڑھنی شروع کی تھی۔ تاکہ وہ تورات و انجیل کو پڑھ سکیں (مشکوٰۃ المصابیح کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

(۴) چوتھے ثبوت کے طور پر میں ایک مسیحی مضمون نویس کی شہادت پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر الگزنڈر سوٹر ایم اے ایل۔ ایل۔ ڈی۔ اپنی کتاب دی ٹیکسٹ اینڈ کینن آف دی نیو ٹیسٹمنٹ کے صفحہ ۷۴ پر لکھتے ہیں[1]:-

"ARABIC VERSIONS:
THESE COME PARTLY DIRECTLY FROM GREEK PARTLY THROUGH SYRIAC AND PARTLY THROUGH CAPTIC.

MUHAMMAD HIMSELF KNEW THE GOSPEL STORY ONLY ORALLY. THE OLDEST MANUSCRIPT GOES NO FURTHER BACK THAN 8TH CENTURY... .....TWO VERSIONS OF THE ARABIC ARE REPORTED TO HAVE TAKEN PLACE AT ALAXANDRIA IN THE 13TH CENTURY.

"THE TEXT & CANNON OF THE NEW TESTAMENT."
BY. DR. ALEXANDER SOUTER
M.A. L.L.D. PAGE 74

انجیل کے عربی تراجم کے عنوان کے نیچے لکھتے ہیں:-

"ان تراجم کے کچھ ٹکڑے تو براہ راست یونانی سے ہوئے کچھ ٹکڑے سریانی زبان سے ترجمہ ہوئے اور کچھ قبطی زبان سے۔ محمد (صلعم) بھی اناجیل کے متعلق صرف زبانی معلومات رکھتے تھے۔ پرانے سے پرانا ترجمہ عربی کا آٹھویں صدی سے اوپر نہیں جاتا۔ (رسول کریم صلعم چھٹی صدی میں پیدا ہوئے تھے)۔"

پھر لکھتے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے دو ترجمے عربی کے تیرہویں صدی میں سکندریہ کے مقام پر کئے گئے تھے۔

ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کا عربی ترجمہ اس وقت تک نہ ہوا تھا اور جن لوگوں نے انجیل پڑھنی ہوتی تھی وہ عبرانی یا یونانی میں پڑھا کرتے تھے۔

پس یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ جبر عربی زبان میں تورات اور انجیل پڑھتا تھا اور آپ اس سے سیکھ لیتے تھے۔ وہ عبرانی یونانی زبان کے الفاظ جو اسے رٹے ہوئے ہوں گے پڑھا کرتا ہوگا۔ پس آپ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے کہ اس کے بولے ہوئے لفظوں کو یاد کرلیں مگر اس سے آپ کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

آخر میں ایک باریک اشارہ کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ جس اعتراض کا ذکر کیا گیا ہے وہ جبر کے متعلق تھا۔ اور وہ اشارہ یہ ہے کہ اس اعتراض کی تفصیلات کے بعد جو سب سے پہلی آیت ہے اس میں مرتدوں کا ذکر ہے اور جبر کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کا تعلق بھی ایک مرتد سے ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ جبر دل سے مسلمان ہو گئے تھے مگر ظاہر نہ کرتے تھے۔ رسول کریم صلعم جب مدینہ تشریف لے گئے تو ایک شخص کو کاتب وحی مقرر کیا جس کا نام عبداللہ بن ابی سرح تھا۔ یہ وہاں قرآن کریم ہی کے متعلق ایک شبہ میں پڑ کر مرتد ہو گیا۔ اور جب مکہ میں آیا تو لوگوں کو جبر کے مسلمان

(حاشیہ: آنحضرت کے عہد میں صرف عبداللہ بن سلام ہی عبرانی جانتے تھے۔)

(حاشیہ: آنحضرت کے زمانہ میں انجیل یونانی یا عبرانی میں تھی۔)

(حاشیہ: آنحضرت پر کسی خاص شخص سے سیکھنے کا الزام ... یہ ارتداد کا ذکر اور اس کی وجہ)

---

[1] پہلے یہ کتاب ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔ اب دوبارہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ صفحہ دوسرے ایڈیشن کا دیا گیا ہے۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ

اللہ (تعالیٰ) کے نشانوں پر ایمان نہیں لاتے انہیں اللہ (تعالیٰ) ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لئے دردناک

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ

عذاب (مقدر) ہے۔ ۵۵۵ جھوٹ وہی لوگ باندھا کرتے ہیں جو اللہ (تعالیٰ)

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ○

کے نشانوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہی لوگ جھوٹ بولنے میں کامل ہوتے ہیں ۵۵۶

ہونے کی اطلاع دے دی جس کی وجہ سے سالہا سال تک انکو سخت تکالیف دی گئیں۔ پس اس اعتراض کے معًا بعد آیت ارتداد رکھکر ایک باریک اشارہ اس طرف کیا گیا ہے۔ کہ اس متہم غلام پر ایک زمانہ میں ایک مرتد کی طرف سے بھی ظلم ٹوٹنے والا ہے۔

آنحضرتؐ پر کسی سے سیکھنے کے اعتراض کے جواب میں چار امور

مذکورہ بالا اعتراضات کے بارہ میں میں بعض اور امور بھی بیان کردیتا ہوں تاحسب ضرورت کام آئیں :-

(۱) قرآن کریم نے کسی ایک فرقہ کو نہیں لیا۔ بلکہ سب سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کس فرقہ کا آدمی تھا۔ جو اس کام میں آپ کی مدد کرتا تھا؟ کیا وہ خود اپنے مذہب کے خلاف تعلیم بھی آپکو سکھاتا تھا؟

(۲) قرآن کریم نے بائبل کے غلط واقعات کی اصلاح کی ہے یہ اصلاح کس غلام کی مدد سے آپ کر سکتے تھے۔ جیسے مثلاً ہارونؑ کا شرک نہ کرنا اور داؤدؑ و سلیمانؑ و نوحؑ کی پاکیزگی ثابت کرنا یہ ایسے واقعات ہیں کہ آج تیرہ سو سال کے بعد یورپین مسیحی مصنف ان کے بارہ میں قرآن کریم کی تائید پر مجبور ہو رہے ہیں

(۳) آپ نے بائبل کے واقعات کے متعلق بعض نئی باتیں بیان کی ہیں جن کا اسوقت کسی یہودی اور عیسائی فرقہ کو بھی علم نہ تھا لیکن وہ آج بھی ثابت ہو رہی ہیں۔ جیسے فرعون کی لاش کا محفوظ رہنا اور آخر مل جانا۔

(۴) روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم چوتھے یا پانچویں سال بعد دعویٰ کے اس غلام کے پاس کھڑے ہوا کرتے تھے کیونکہ روایت میں آتا ہے کہ جب آنحضرت صلعم کا بائیکاٹ ہوا ہے اسوقت اس کے پاس کھڑے ہوا کرتے تھے لیکن قرآن کریم کی بعض سورتیں اس واقعہ سے پہلے اتر چکی تھیں اور انہیں عیسائیوں کا ذکر موجود تھا جیسے سورۃ طٰہٰ۔ سورۃ فرقان۔ کہف مریم وغیرہ۔ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ جو بالکل ابتدائی زمانہ میں اسلام لانے والے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ سورۃ بنی اسرائیل و کہف سورۃ طٰہٰ سورۃ مریم سورۃ انبیاء هُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْاُوَلِ وَهُنَّ مِنْ تِلَادِيْ (بخاری جلد ۳ ص۲ کتاب التفسیر) یہ قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں میں سے ہیں اور میرا پرانا مال ہیں یعنی میں نے ابتداء اسلام میں یہ سورتیں یاد کی تھیں۔ ان سورتوں میں کثرت سے یہودیوں اور عیسائیوں کے واقعات آتے ہیں *

الْعَذَابُ

الْاَلِيْمُ

۵۵۵ حل لغات۔ اَلْعَذَابُ کے معنوں کے لئے دیکھو حجر ۵۳

اَلْاَلِيْمُ : اَلْمُوْجِعُ دکھ دینے والا۔ (اقرب)۔

تفسیر۔ یعنی چونکہ یہ لوگ ایسی زبردست آیتوں اور نشانوں کے ہوتے ہوئے بھی ایسے بیہودہ اعتراض کرتے ہیں اور ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر بجائے ایمان لانے کے اس پر ہنسی کرتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ ضرور سزا پائیں گے *

۵۵۶ تفسیر۔ اس جگہ رسول کریم صلعم کی زندگی کو بطور نمونہ کے پیش کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ خدا تعالیٰ پر جھوٹ تو وہی شخص بنا سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی طاقت پر ایمان نہ ہو

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ

جو لوگ (بھی) اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ (تعالیٰ) کا انکار کریں مگر وہ نہیں جنہیں کفر پر مجبور کیا گیا ہو سلسلہ اور

قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ

ان کا دل ایمان پر مطمئن ہو بلکہ وہ جنہوں نے (اپنا) سینہ کفر کے لئے

بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ

کھول دیا ہو ان پر اللہ (تعالیٰ) کا (بہت) بڑا غضب (نازل) ہوگا اور ان کے لئے

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ

بڑا (بھاری) عذاب (مقدر) ہے ؎ (اور) ایسا اس سبب سے ہوگا کہ انہوں نے اس ورلی زندگی سے محبت کر کے

مگر محمد رسول اللہ ؐ کو دیکھو کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عظمت دنیا میں قائم کر رہے ہیں اور نہ صرف خود بلکہ لوگوں کو بھی یہی تعلیم دے رہے ہیں کہ اس کی تعظیم کرو۔ اس لئے ایسے شخص پر اعتراض کرنا کسی سیاہ دل کا ہی کام ہے۔ دوسرے یہ کام ایک عادی جھوٹے شخص کے سوا دوسرا شخص نہیں کر سکتا اور محمد رسول اللہ ؐ کی سچائی کے گواہ تو تم بھی ہو؛

سلسلہ حل لغات۔ اُكْرِهَ: اَكْرَهَ سے مجہول کا صیغہ ہے۔ اور اَكْرَهَهٗ عَلَى الْاَمْرِ کے معنے ہیں۔ حَمَلَهٗ عَلَيْهِ قَهْرًا۔ کسی کو کسی کام پر زبردستی آمادہ کیا۔ اَكْرَهَ فُلَانًا۔ حَمَلَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ يَكْرَهُهٗ اس کو کسی ایسے کام پر آمادہ کیا جس کو وہ ناپسند کرتا تھا۔ وَ قِيْلَ عَلَى الْاَمْرِ لَا يُرِيْدُهٗ طَبْعًا اَوْ شَرْعًا۔ اور بعض کہتے ہیں اَكْرَهَ فُلَانًا کے معنے ہیں کہ اس نے اسے ایسے کام پر آمادہ کیا جس کو وہ طبعاً یا مذہباً ناپسند کرتا تھا۔ اس سے اسم فاعل مُكْرِهٌ اور اسم مفعول مُكْرَهٌ آتا ہے۔ (اقرب)۔

ؑ پہلے حصہ میں واحد کے صیغے استعمال ہوئے ہیں لیکن ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا سے جمع کے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں مَنْ جمع کے لئے بھی آتا ہے اور مفرد کے لئے بھی۔ اور چونکہ یہ لفظ مفرد ہے۔ بعض دفعہ اس کے بعد مفرد کے صیغے استعمال ہوتے ہیں مگر مراد جمع ہوتی ہے۔ ایسا ہی یہاں ہوا ہے۔ اس لئے معنوں کے مطابق اردو میں مفرد کی جگہ جمع کے صیغے استعمال کر دئے گئے ہیں۔ ورنہ ترجمہ غلط ہو جاتا۔

قَلْبٌ: اَلْفُؤَادُ۔ دل۔ وَقَدْ يُطْلَقُ عَلَى الْعَقْلِ۔ اور کبھی قلب کا لفظ عقل کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کی جمع قُلُوْبٌ آتی ہے۔

مُطْمَئِنٌّ: اِطْمَاَنَّ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور اِطْمَاَنَّ کے معنوں کے لئے دیکھو رعد ؑ۔

اَلْغَضَبُ: ثَوَرَانُ دَمِ الْقَلْبِ لِاِرَادَةِ الْاِنْتِقَامِ۔ سزا دینے کی غرض سے دل کے خون کے جوش مارنے کا نام غضب ہے۔ وَاِذَا وُصِفَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِهٖ فَالْمُرَادُ بِهِ الْاِنْتِقَامُ دُوْنَ غَيْرِهٖ۔ اور جب غضب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنے صرف سزا دینے کے ہوتے ہیں۔ جوش وغیرہ کے معنے اس میں نہیں پائے جاتے۔ (مفردات)

تفسیر۔ اس ضمنی اعتراض کا جواب دے کر کہ جب

محمد رسول اللہ کو جھوٹا کہا جاتا ہے حالانکہ آپ نے اللہ تعالیٰ پر افترا نہیں کیا

کلب

اکرہ

مطمئن

الغضب

الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ

اسے آخرت پر مقدم کر لیا اور (نیز اس وجہ سے) کہ اللہ (تعالیٰ) کفر اختیار کرنے والے لوگوں کو ہدایت

الْكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

نہیں دیتا ۝ یہ وہ لوگ ہیں جن (کے کفر کی وجہ سے ان) کے دلوں اور ان کے

انہیں آیندہ زمانہ کی ترقیات کی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور دلائل سے بتایا جاتا ہے کہ اس قسم کے روحانی حشر ہمیشہ دنیا میں ہوتے آئے ہیں تو کفار اس بات سے فائدہ اٹھا کر آیندہ کی پیشگوئیاں۔ گذشتہ انبیاء کے واقعات کے پردہ میں بیان کی گئی ہیں جھٹ کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی جانتے ہیں کہ یہ قرآن کسی دوسرے شخص کا سکھایا ہوا ہے۔ وہ دوسری کتب کی باتیں ان کو سکھا دیتا ہے۔ اب پھر ترقیات کے ذکر کی طرف بات کو پھرایا گیا ہے اور اس پر توجہ دلائی ہے کہ ترقیات کے ساتھ امن ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ بعض قسم کے فتنے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مخالفوں میں بھی مخالفت کا زیادہ جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اپنے ایمانوں کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ اور بتایا ہے کہ جو شخص کسی دنیوی غرض کی وجہ سے مرتد ہوگا وہ بڑے عذاب میں مبتلا کیا جائیگا۔

میرے نزدیک اس آیت میں عبداللہ بن ابی سرح کے ارتداد کی پیشگوئی ہے۔ اور پہلی آیات سے اس آیت کا جو ربط میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی ربط حاصل ہے کہ جبر کی وجہ سے جو اعتراض ہوا تھا اس میں بھی قرآن کریم کے انسانی کلام ثابت کرنے کی کوشش کا ذکر تھا۔ اور یہ مرتد جس کا یہاں ذکر ہے اس نے بھی ارتداد اسی دلیل پر کیا تھا کہ قرآن خدائی کلام نہیں۔ انسانوں کا بنایا ہوا کلام ہے۔

یہ پیشگوئی ایک زبردست پیشگوئی ہے۔ اور چونکہ مکہ میں کی گئی اور ان حالات میں کی گئی کہ عبداللہ کو ابھی کاتب وحی

مقرر نہ کیا گیا تھا۔ پھر اس میں اشارۃً وجہ ارتداد بھی بتائی گئی کہ اسے قرآن کریم کے الہامی ہونے کے بارہ میں شبہ ہوگا۔ اس لئے اس کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

یہ جو آگے فرمایا ہے کہ جو مجبوراً ارتداد کرے اس پر اتنا عذاب نہیں شاید یہ اشارہ جبر ہی کی طرف ہو۔ اور ممکن ہے کہ ظلم کی وجہ سے وہ دلیری سے اسلام کا اظہار نہ کر سکے ہوں۔ گو بعض روایات میں عمارؓ کے متعلق اس کو چسپاں کیا جاتا ہے مگر مضمون کی ترتیب کو دیکھتے ہوئے جبر پر یہ واقعہ زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔

مسیحیوں نے اس آیت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بزدلی کی تعلیم دیتا ہے اور ظلم کے موقعہ پر ارتداد کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض بھی ان کے دوسرے اعتراضوں کی طرح غلط ہے۔ کیونکہ اس جگہ یہ ہرگز نہیں نکلتا کہ اللہ تعالیٰ اس فعل کو معاف کر دے گا۔ اس جگہ تو صرف یہ کہا ہے کہ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ والے کے متعلق اس آیت میں حکم نہیں بیان کیا گیا۔ اور سزا سے مستثنیٰ نہیں بتایا گیا۔ بلکہ اس گروہ کو علیحدہ قرار دے کر یہ کہا ہے کہ اس کا ذکر بعد میں کیا جائیگا۔

حل لغات۔ اِسْتَحَبُّوْا: اِسْتَحَبَّ سے جمع کا صیغہ ہے اور اِسْتَحَبَّہٗ کے معنے اَحَبَّہٗ اس سے محبت کی۔ اِسْتَحْسَنَہٗ اس کو پسند کیا۔ اِسْتَحَبَّ الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ کفر کو ایمان پر ترجیح دی۔ (اقرب) پس اِسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ کے معنے ہوں گے کہ انہوں نے اس ورلی زندگی

وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ○

کانوں اور انکی آنکھوں پر اللہ (تعالیٰ) نے مُہر لگادی ہے اور یہ لوگ ہی ہیں جو کچھ غافل ہیں

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ○ ثُمَّ إِنَّ

(اور) اسمیں کوئی شک نہیں کہ وہی آخرت میں (سب سے) زیادہ نقصان اٹھانیوالے ہونگے فلہ اور تیرا

رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ

رب یقیناً ان لوگوں کے لئے جو دکھ میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کر گئے پھر انہوں

جَاهَدُوا وَصَبَرُوا ۙ إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ

نے جہاد کیا اور (اپنے عہد پر) ثابت قدم رہے (ہاں) تیرا رب یقیناً اس (شرط کو پورا کرنے) کے بعد (انکے لئے) بہت بخشنے

رَحِيمٌ ○ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا

ع ۱۴ / ۲۰

والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا (ثابت) ہوگا ۱۱۲ (اس جزا کا ظہور خصوصیت سے اُسدن ہوگا) جسدن ہر شخص اپنی جان کے متعلق

سے محبت کرکے اسے آخرت پر ترجیح دی۔

تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اسلام چونکہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ایک صداقت ہے۔ اس سے بیزار ہوکر کوئی مرتد نہیں ہوسکتا۔ جو ہوگا دنیوی اغراض سے ہوگا۔ اور ایسا آدمی خدا تعالیٰ سے کسی نیک سلوک کا کب امیدوار ہوسکتا ہے۔

اس آیت سے عبداللہ کے اس دعویٰ کو رد کیا ہے۔ کہ میں یہ دیکھ کر کہ قرآن انسانی کلام ہے مرتد ہوا ہوں۔ اور بتایا ہے کہ یہ شخص ظاہر کچھ اور کریگا مگر اصل وجہ دنیا ہی کی لالچ ہوگی ؞

۱۱۱ حل لغات۔ طَبَعَ عَلَيْهِ کے لئے دیکھو یونس ۷۵۔

تفسیر۔ یعنی جو لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوکر دین حق کو نہیں چھوڑتے بلکہ دوسری اغراض کے ماتحت ایسا کرتے ہیں۔ انکی آنکھوں۔ کانوں اور دلوں پر مُہر لگجاتی ہے کیونکہ وہ بدترین نمونہ اخلاق کا پیش کرتے ہیں۔ اور ایک بڑی نعمت کو محض چھوٹے سے فائدہ کے لئے قربان کر دیتے ہیں[1]

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ۔ الآیۃ جب ایسے شخصوں کو ہم اس دنیا میں ذلیل کریں گے تو اس میں تو کوئی شبہ رہتا ہی نہیں کہ وہ آخرت میں بھی عذاب پائیں گے۔ کیونکہ ایسے گناہوں کی سزا کا اصل مقام وہی ہے ؞

[1] اسلام سے بیزاری کسی دنیوی فائدہ کے لئے ہی ہوسکتی ہے۔

۱۱۲ حل لغات۔ فُتِنُوا : فَتَنَهُ سے مجہول کا صیغہ ہے۔ اور فَتَنَ (فتناً و فتوناً) زَيْدٌ عَمْرًا کے معنے ہیں أَوْقَعَهُ فِي الْفِتْنَةِ فَفَتَنَ هُوَ أَيْ وَقَعَ فِيهَا اس کو فتنہ میں ڈالا اور وہ فتنہ میں پڑ گیا۔ (لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے)۔

فَتَنَهُ کے معنے ہیں أَعْجَبَهُ۔ وہ اسکو پسند آیا۔ الْمَالُ النَّاسَ اِسْتَمَالَهُمْ۔ مال نے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرلیا۔ فَتَنَهُ فِتْنَةً خَبَرَهُ اسکو آزمایا۔ فُلَانًا أَضَلَّهُ اس کو گمراہ کیا۔ فَتَنَ فُلَانًا عَنْ رَأْيِهِ

وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَ

جھگڑتا ہوا آئیگا اور ہر شخص نے جو کچھ کیا ہوگا (اسکا اجر) اسے پورا پورا دیا جائیگا اور انپر (کسی رنگ میں بھی) ظلم نہ کیا جائیگا ۱۱۱ اور

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً

اللہ (تعالیٰ) نے (انہیں سمجھانے کیلئے) ایک بستی کا حال بیان کیا ہے جسے (ہر طرح سے) امن حاصل تھا (اور) اطمینان نصیب تھا

الامن اکرہ کے ماتحت توبہ قبول کئے جانے والوں کے لئے چار شرائط

صَدَّهٗ. اس کو اس کی رائے سے روکا. فَتَنَ الصَّائِغُ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ـ اَذَابَهٗ وَاَحْرَقَهٗ بِالنَّارِ لِيُبِينَ الْجَيِّدَ مِنَ الرَّدِيِّ وَيُعْلَمَ اَنَّهٗ خَالِصٌ اَوْ مَشُوْبٌ. سنار نے سونے کو آگ میں ڈال کر پگھلایا تاکہ اس کے کھرے اور کھوٹے کو معلوم کرے اور فُتِنَ الرَّجُلُ فِيْ دِيْنِهٖ کے معنے ہیں مَالَ عَنْهُ اپنے دین سے علیحدہ ہوگیا۔ فُتِنَ فُلَانٌ اَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ فَذَهَبَ مَالُهٗ اَوْ عَقْلُهٗ اس پر مصیبت نازل ہوئی اور اس کی وجہ سے اس کا مال یا عقل جاتی رہی۔ وَكَذَالِكَ اِذَا اخْتُبِرَ اور جب کسی کا امتحان لیا جائے تو فُتِنَ صیغہ مجہول اس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (اقرب) پس فُتِنُوْا کے ایک معنے یہ ہوں گے کہ انہیں دکھ میں ڈالا گیا۔

جاھدوا

جَاهَدُوْا : جَاهَدَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور جَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (مُجَاهَدَةً وَجِهَادًا) کے معنے ہیں۔ بَذَلَ وُسْعَهٗ اللہ کے دین کے لئے انتہائی کوشش کی۔ جَاهَدَ الْعَدُوَّ ـ قَاتَلَهٗ. دشمن سے لڑا۔ (اقرب)

پس جَاهَدُوْا کے معنے ہوں گے (۱) انہوں نے جہاد کیا۔ (۲) انہوں نے اللہ کے دین کے لئے کوشش کی۔

تجادل

توفی

تفسیر۔ اس آیت میں ان لوگوں کا حکم بتایا گیا ہے جن کو پہلے اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ کے الفاظ سے مستثنیٰ بتایا گیا تھا ان کا حکم یہ بتاتا ہے کہ اگر کسی سے ایسی غلطی ہو جائے کہ وہ ظلم کی برداشت نہ کر کے ظاہرًا ارتداد کرلے گو دل میں مطمئن ہو تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ اول وہ اس مقام کو چھوڑ دے جہاں اُسے لوگوں سے دب کر ارتداد کرنا پڑا۔

(۲) دوسرے وہ دین کی اشاعت میں لگ جائے اور اپنے آپ کو دین کے لئے گویا وقف کر دے۔

(۳) تیسرے یہ مجاہدہ بند نہ کرے بلکہ استقلال سے اس پر قائم رہے۔ اور اپنے ظاہری ارتداد کے بدلہ میں دوسرے لوگوں کو ہدایت دینے کی کوشش کرے۔

(۴) آیندہ اس سے پھر ایسی خطا ظاہر نہ ہو۔ اگر وہ اِن باتوں پر عمل کرے تو فرماتا ہے کہ ان سب کاموں کے کر لینے کے بعد تیرا رب اس شخص کو معاف فرما دے گا

اِن قربانیوں کے بعد توبہ قبول کرنے کا حکم ہوتے ہوئے مسیحی مصنفوں کا یہ لکھنا کہ اسلام نے ظلم کے وقت ظاہری انکار کی اجازت دی ہے اُن مظالم میں سے ایک ظلم ہے جو مسیحی پادری اسلام پر کرتے چلے آتے ہیں؛

۱۱۲ **حل لغات**۔ تُجَادِلُ : جَادَلَ سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور جَادَلَهٗ (مُجَادَلَةً وَجِدَالًا) کے معنے ہیں خَاصَمَهٗ شَدِيْدًا۔ اس نے اس سے سخت جھگڑا کیا۔ (اقرب)

پس يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا کے معنے ہوں گے جس دن ہر شخص اپنی جان کے متعلق جھگڑتا ہوا آئیگا

تُوَفّٰى : وَفّٰى (باب تفعیل) سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور وَفّٰى کے لئے دیکھو یونس ۵۵

يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ

ہر طرف سے اس کا رزق اسے بافراغت پہنچ رہا ہے۔ پھر (بھی) اس نے

بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ

اللہ (تعالیٰ) کی نعمتوں کی ناشکری کی جس (کی اس ناشکری) پر اللہ (تعالیٰ) نے اس (کے باشندوں) پر ان کے

بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ

اپنے (گھنونے) عمل کی وجہ سے بھوک اور خوف کا لباس نازل کیا اور اسکا مزہ چکھایا ؏ اور یقیناً ان کے پاس انہی میں سے

تفسیر۔ یَوْمَ۔ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کا ظرف ہے مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جب ہر شخص اپنے انجام کی اہمیت سمجھ کر پورا زور لگائے گا کہ کسی طرح میں گرفتاری سے بچ جاؤں اسوقت اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے جو کمزوری دکھا کر بعد میں ساری عمر اصلاح اور قربانی وغیرہ میں لگے رہیں گے غفور و رحیم کا سلوک کرے گا۔

جو لوگ آیت ارتداد سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس میں بزدلی کی تعلیم دی گئی ہے ان آیات پر غور کریں کہ کتنی بڑی قربانی ایسے لوگوں سے چاہی گئی ہے۔ جو شخص اس قربانی کی اہمیت کو سمجھیگا وہ امتحان کے موقعہ پر بزدلی دکھائیگا ہی کیوں۔ کیونکہ بزدل آدمی اسقدر قربانی کرنے کی طاقت کہاں رکھتا ہے کہ ترک وطن کرے۔ جہاد فی سبیل اللہ کرے اور اپنے نفس کو ساری عمر اس کام میں لگائے رکھے۔ ان کاموں کی توفیق تو وہی پائیگا جن سے کسی عارضی غفلت کیوجہ سے غلطی ہوگئی ہو یا جو بعد میں سچی توبہ کر چکا ہو۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک مرتد مدعی نبوت دوبارہ مسلمان ہوا۔ اس سے جو آپ نے سلوک کیا وہ گویا اس آیت کی تفسیر ہے۔ اس شخص کا نام طلیحہ ابن خویلد اسدی تھا۔ یہ مسلمانوں کے خلاف بعض جنگوں میں شامل ہوا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے اسلام میں داخل ہونا چاہا۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس کو معاف نہ کیا۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک صحابی شرجیل بن حسنہؓ (جو بظاہر بہت دبلے پتلے اور کمزور تھے مگر فن جنگ کے بڑے ماہر تھے) ایک لڑائی میں ایک کافر سردار کے ساتھ لڑ رہے تھے کہ اس سردار نے یہ دیکھ کر کہ تلوار کی جنگ میں میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جلدی سے آگے بڑھ کر ان کو کمر سے پکڑ لیا اور نیچے گرا کر چھاتی پر چڑھ گیا۔ قریب تھا کہ وہ آپ کو قتل کر دیتا کہ طلیحہ بن خویلد جو دل سے مسلمان ہو چکا تھا لیکن بوجہ حضرت عمرؓ کے توبہ قبول نہ کرنے کے اب تک کفار ہی میں شامل تھا۔ اس نظارہ کو دیکھ کر اپنے ایمان کو چھپا نہ سکا اور آگے بڑھ کر اس کافر سردار پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ اس کا سر تن سے جدا ہوگیا اور حضرت شرجیلؓ کی جان بچ گئی۔ اس واقعہ سے باقی مسلمان بہت متأثر ہوئے۔ اور انہوں نے حضرت عمرؓ کے پاس سفارش کی کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ کہ میں اس شرط پر معاف کرتا ہوں کہ یہ شخص اپنی ساری بقیہ زندگی جہاد میں گزارے اور اسلامی مملکت کی سرحدوں پر زندگی بسر کرے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ سرحد پر ہی رہتے تھے اور کفار سے لڑائی کرتے رہتے تھے آخر اسی حالت میں وفات پا گئے گو اس شخص نے جان بوجھ کر ارتداد کیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ نے اسی آیت سے استدلال کر کے اس کے مشابہ حکم اسکو دیدیا۔

آیت ارتداد سے بزدلی کی تعلیم کا استنباط کرنے والوں کو جواب

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مرتد کا دوبارہ مسلمان ہونا۔

۱۱۳ **حل لغات۔** ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کے معنوں

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

(حالانکہ) ایک رسول آچکا ہے مگر انہوں نے اسے جھٹلایا جس پر اس حالت میں کہ وہ ظلم کر رہے تھے (ہمارے) عذاب نے انہیں آپکڑا

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا

۱۱۳ - پس جو حلال (اور) طیّب (مال) اللہ (تعالیٰ) نے تمہیں دیا ہے تم انہیں سے کھاؤ اور اللہ (تعالیٰ) کی

نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ اِنَّمَا حَرَّمَ

نعمت کا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو شکر کرو ۱۱۴ - اس نے تم پر صرف

کے لئے دیکھو ابراہیم ۔

رغدًا — رَغَدًا: رَغُدَ عَيْشُهٗ رَغَدًا کے معنے ہیں طَابَ وَاتَّسَعَ اس کی زندگی خوشگوار اور کشادہ ہوگئی وَعِيْشَةٌ رَغَدٌ کے معنے ہیں وَاسِعَةٌ طَيِّبَةٌ آسودہ زندگی۔ (اقرب)

اذاق — اَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ ۔ اَذَاقَ: ذَاقَ سے بنا ہے۔ ذَاقَ الْعَذَابَ وَالْمَكْرُوْهَ کے معنے ہیں نَزَلَ بِهٖ فَقَاسَاهُ اس پر مصیبت نازل ہوئی اور اس نے سہی۔ اَذَاقَهٗ۔ صَيَّرَهٗ يَذُوْقُ اسے چکھایا۔ (اقرب) پس اَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ کے معنے ہوں گے۔ اللہ نے اس پر بھوک کا عذاب نازل کیا اور اسکو اس کا مزہ چکھایا۔

عذاب کے ساتھ لباس کا ذکر کرنے کی وجہ

تفسیر۔ اس آیت میں مکہ کے متعلق پیشگوئی فرمائی ہے اس سے پہلے کفر اور اسلام کا مقابلہ کیا گیا تھا۔ مگر کفار کے دل میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید مکہ بوجہ اس تقدس کے جو اسے حاصل ہے مغلوب ہونے سے محفوظ رہے کیونکہ قریب زمانہ میں ابرہہ کے لشکر کی شکست کے ذریعہ وہ مکہ کی حفاظت کا نظارہ دیکھ چکے تھے ان کے اس جھوٹے اطمینان کو بھی اس آیت میں رد کر دیا گیا ہے فرماتا ہے کہ مکہ بھی ایسے مجرموں کو نہیں بچا سکتا۔ مکہ کا امن بھی خوف اور قحط سے جاتا رہے گا۔ کیونکہ ساکنین مکہ کے اعمال انہیں فضل الٰہی سے محروم کر رہے ہیں۔

یہ دونوں عذاب ہجرت کے بعد مکہ والوں پر آئے۔ خوف تو جنگوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ بھوک کا عذاب بھی آیا جبکہ ان کے کئی قافلے مسلمانوں کے ہاتھ پڑے اور انکی ضرورتوں کے سامان جنگوں میں ان کے ہاتھوں سے چھین لئے گئے۔

لباس کا لفظ اس امر کے بتانے کے لئے استعمال فرمایا ہے کہ دونوں عذاب سخت ہوں گے اور ان کے بدن پر انکے آثار ظاہر ہونے لگیں گے۔ دبلے ہو جائیں گے زرد پڑ جائیں گے۔ گویا بھوک اور خوف کے اثرات انکے جسم کو اس طرح ڈھانپ لیں گے جس طرح لباس جسم کو ڈھانک لیتا ہے۔

۱۱۳ تفسیر۔ اس آیت میں وضاحت کر دی ہے کہ یہاں سے مکہ والے ہی مراد ہیں فرمایا اس بستی والوں پر حجت پوری ہو گئی انہیں سمجھانے کیلئے تو رسول آیا پھر وہ رسول بھی انہیں سے تھا باہر سے نہ تھا کہ کہہ دیتے ہم اس کے حالات سے واقف نہیں اسکے سچ اور جھوٹ کا اندازہ نہیں لگا سکتے مگر باوجود اسکی خیرخواہی کے اور اس کے اخلاق حمیدہ کے معلوم ہونے کے انہوں نے اس کی تکذیب کی جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کرنیکا فیصلہ کر دیا۔ یہاں دو الزام ان پر لگائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کے رسول کا انکار کیا۔ دوسرے اپنے مشاہدہ کا انکار کیا کہ باوجود رسول کریم صلعم کی صداقت سے واقف ہونے کے آپ کے دعوے کے منکر ہو گئے۔ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ میں بتایا کہ عذاب ان کے ظلم ہی کی حالت میں انکو پکڑ لیگا۔ یعنی یوں نہ ہوگا کہ ان کے اعمال کے بدلے انکی اولادوں سے لئے جائیں بلکہ ان کے اعمال کی سزا یہ ظالم خود ہی بھگتیں گے۔

۱۱۴ تفسیر۔ پہلی آیت میں کفار کے لئے بھوک اور

عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ

مردار کو اور خون کو اور سؤر کے گوشت کو، اور (ہر) اس چیز کو حرام کیا ہے جس پر اللہ

لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ

(تعالیٰ) کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو اور جو شخص (ان میں سے کسی چیز کے کھانے پر) مجبور کیا جائے بحالیکہ وہ نہ باغی ہو اور نہ حد سے

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ

بڑھنے والا ہو تو (یا حد سے بڑھ کر) اللہ (تعالیٰ) یقیناً بہت ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے ۱۱۵ اور اپنی زبانوں کے

خوف سے عذاب کی خبر دی تھی۔ اب اس آیت میں مومنوں کے لئے فراخی رزق اور فراغت بال کی خبر دی۔ اور فرمایا۔ کفار کا رزق چھینا جائیگا۔ مسلمانوں کا بڑھایا جائیگا۔ مگر ایک فرق بھی ہوگا کہ کفار تو جائز ناجائز سب ذرائع سے مال کماتے تھے۔ مسلمانوں کو حلال رزق ملیگا جو طیب بھی ہوگا یعنی معدتوں کو اچھا کرنے والا ہوگا۔ اس میں خوف کی بھی نفی کی کیونکہ کھانا جسم کو تبھی فائدہ پہنچاتا ہے جب غم اور خوف نہ ہو پس طیب رزق یعنی جسم اور دماغ اور دل کو تقویت اور صحت بخشنے والے کھانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ ان کے دل کو غم اور خوف سے اللہ تعالیٰ نجات دیگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو کے الفاظ میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ تم کو با فراغت کھانا اور مطمئن دل عطا فرمائے ہیں پس اس ظاہری باطنی نعمت کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

بعض لوگ شکر پر اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کو کسی کے شکر کی کیا احتیاج ہے؟

اول تو یہ اعتراض فضول ہے کیونکہ شکر ایک طبعی اظہار ہے۔ جو ہر احسان کے بعد شریف آدمی کا دل اپنی ممنونیت جتانے کے لئے کرتا ہے۔ اس کے پیدا ہونے میں ضرورت یا عدم ضرورت کا کوئی سوال ہی نہیں۔

دوسرے جیسا کہ اس آیت میں بتایا گیا ہے شکر سے توحید کا عقیدہ مضبوط ہوتا ہے جس طرح ظاہر جسم کو ایک ہی قسم کا

کام کرنے سے عادت پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح قلب اور دماغ کو بھی متواتر ہونے والے اعمال کی عادت پڑ جاتی ہے۔ پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بجا لاتے ہیں ان کے دماغ پر اور دل پر ایک مستقل اثر باقی رہ جاتا ہے۔ اور ہر نعمت کو اللہ تعالےٰ کیطرف منسوب کرنے کے وہ عادی ہو جاتے ہیں۔ اور شرکانہ خیال سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اُهِلَّ

۱۱۵ حل لغات۔ اُهِلَّ : اَهَلَّ سے مجہول کا صیغہ ہے اور اَهَلَّ الْقَوْمُ الْهِلَالَ کے معنے ہیں رَفَعُوْا اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رُؤْيَتِهٖ۔ لوگوں نے چاند کو دیکھ کر اپنی آوازوں کو بلند کیا۔ اَهَلَّ الصَّبِيُّ۔ رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالْبُكَاءِ۔ بچے نے روتے ہوئے آواز بلند کی۔ اَهَلَّ فُلَانٌ بِذِكْرِ اللّٰهِ۔ رَفَعَ صَوْتَهٗ بِهٖ عِنْدَ نِعْمَةٍ اَوْ رُؤْيَةِ شَيْءٍ يُعْجِبُهٗ۔ کسی نعمت کے ملنے پر یا کسی خوشکن چیز کے دیکھنے پر اللہ تعالیٰ کا نام اونچی آواز سے لیا۔ اَهَلَّ بِالتَّسْمِيَةِ عَلَى الذَّبِيْحَةِ اَيْ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ۔ جانور کے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا۔ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اَيْ نُوْدِيَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اسْمِ اللّٰهِ عِنْدَ ذَبْحِهٖ۔ جانور کو ذبح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا۔ (اقرب)

خدا تعالےٰ کے لئے شکر ادا کرنے پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

فمن اضطر

فَمَنِ اضْطُرَّ : یہ اِضْطَرَّ سے مجہول کا صیغہ ہے اِضْطَرَّهٗ اِلَيْهِ کے معنے ہیں اَحْوَجَهٗ وَاَلْجَاَهٗ

فَاضْطُرَّ۔ اس کو اس کا محتاج بنا کر اس کی طرف جانے کے لئے لاچار کیا اور وہ اس کی طرف لاچار اور مجبور ہو گیا۔ (اقرب)۔

تفسیر۔ پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ اے مسلمانوں تم کو اللہ تعالیٰ رزق کی فراخی دینے لگا ہے۔ اس وقت کے آنے سے پہلے ہی یہ سیکھ لو کہ حلال اشیاء کا استعمال جو طیب بھی ہوں تم کو جائز ہوگا۔

یاد رہے کہ مال کی حلت ذریعہ کسب کے صحیح ہونے پر مبنی ہوتی ہے مگر خوردنی اشیاء کے لئے اس کے علاوہ ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ اس قسم میں شامل نہ ہوں جسے حرام کیا گیا ہے۔ پس اس سوال کو کہ کونسی اشیاء حلال ہیں اور کونسی حرام اس آیت میں حل کیا گیا ہے۔

کیا بیان شدہ صرف چار چیزیں ہی حرام ہیں

الفاظ قرآنیہ بتاتے ہیں کہ اشیاء کی حلت و حرمت میں اصل حلت ہے اور حرمت ایک قید کے طور پر ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر شے حرام ہے سوائے اس کے جسے خدا تعالیٰ نے جائز کر دیا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ مالک ہے اور مالک کی اجازت کے بغیر کسی چیز کا استعمال جائز نہیں ہوتا۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ ہم نے ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی ہے اور اس کے لئے مسخر کر دی ہے پس اس عام حکم سے ہر چیز انسان کے لئے جائز ہوگی سوائے اس کے جس سے نصاً یا اشارۃً روک دیا گیا ہو۔

لحم خنزیر میں چربی کے شامل ہونے کے متعلق فقہا کا اختلاف

اس آیت میں جو لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ فرمایا اس کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے کہ لحم میں چربی بھی شامل ہے یا نہیں۔ جہاں تک لغت کا سوال ہے شَحْم یعنی چربی کو لَحْم سے الگ قسم کا خیال کیا جاتا ہے لیکن مفسرین کہتے ہیں کہ لحم کے نام میں شحم شامل ہے۔ گو مفسرین کی دلیل ذوقی ہے اور لغت والوں کی بات اس مسئلہ میں زیادہ قابل اعتبار ہے مگر اس کے باوجود میرے نزدیک سؤر کی شحم یعنی چربی جائز نہیں۔ اور اس کی دلیل میرے پاس یہ ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ مردہ جانور کی چربی حرام ہے۔ اور سؤر کی حرمت اور مردہ کی حرمت ایک ہی آیت میں اور ایک ہی الفاظ میں بیان کی گئی ہے پس دونوں کا حکم ایک قسم کا سمجھا جائیگا لیکن سؤر کی جلد کا استعمال جائز ہوگا کیونکہ وہ کھائی نہیں جاتی۔

احادیث میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا کی ایک بکری مر گئی۔ چند آدمی اس کو اٹھا کر باہر لئے جا رہے تھے۔ نبی کریم صلعم نے ان سے فرمایا کہ تم اس کا چمڑا کیوں نہیں اتار لیتے؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو مَیْتَہ ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے اسے کھانا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جس کا گوشت حرام ہو اس کے چمڑے کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ ہاں سؤر کے بالوں کے بنے ہوئے بُرشوں کو مکروہ کہا جائیگا۔ کیونکہ انکو منہ میں ڈالا جاتا ہے جو کھانے کا دروازہ ہے۔

اس آیت کے متعلق ایک بہت بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں چار چیزوں کی حرمت بیان فرمائی گئی ہے۔ کیا یہی چار چیزیں حرام ہیں اور ان کے سوا اور کوئی چیز حرام نہیں؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر جو حصر پایا جاتا ہے یہ حصر اضافی ہے۔ یعنی کفار کے حرام کو مدنظر رکھ کر اضافی طور پر ان چیزوں کو حرام کیا گیا ہے۔ چونکہ وہ سائبہ وغیرہ کو حرام کہا کرتے تھے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ حرام نہیں حرام تو یہ اشیاء ہیں جو ہم گنوا رہے ہیں۔ اس صورت بیان میں حصر تعداد کا نہیں ہوا کرتا بلکہ اقسام کا ہوا کرتا ہے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس قسم کی چیزیں حرام نہیں جو تم کہتے ہو۔ بلکہ اس قسم کی چیزیں حرام ہیں جو ہم بتاتے ہیں۔ اور حرمت کی نفی بقیہ اشیاء کے متعلق نہیں سمجھی جائے گی بلکہ ان اشیاء کے متعلق سمجھی جائے گی جن کا حرام ہونا کفار بیان کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت تک یہی چار چیزیں حرام تھیں باقی بعد میں ہوئیں۔ یہ جواب واقعات کے لحاظ سے بھی غلط ہے اور اس لئے بھی کہ اس سے آیت کے لفظ اِنَّمَا کو آیندہ کے لئے منسوخ ماننا

پڑتا ہے مگر قرآن کریم کا کوئی لفظ منسوخ نہیں بعض نے مجبور ہوکر کہدیا ہے کہ یہی چار چیزیں حرام ہیں۔ان کے سوا اور کوئی شے حرام نہیں۔

میرے نزدیک حصر اضافی بعض صورتوں میں جائز ہی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں جہاں بھی حرمت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں پر حصر انہی چار چیزوں پر کیا گیا ہے۔ یہ ذکر چار سورتوں میں ہے۔سورۃ نحل۔بقرہ۔انعام۔مائدہ۔سورۃ نحل اور انعام میں تو اس سے پہلے یہ ذکر موجود ہے کہ کفار اپنی مرضی سے مختلف اشیاء کو حلال و حرام کر لیتے تھے مگر سورۃ مائدہ اور بقرہ میں یہ ذکر بالکل نہیں۔سورۃ بقرہ میں تو اعمال خیر کے مسئلہ میں اس مسئلہ کو بیان کیا ہے اور سورۃ مائدہ میں کفار کے حلال و حرام کرنیکا ذکر کئے بغیر حلال و حرام کی ایک مستقل بحث کی گئی ہے اور اس جگہ حرام اشیاء کو بھی گنایا گیا ہے پس چونکہ دو سورتوں میں حصر تو موجود ہے مگر ان میں کفار کے حلال و حرام کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔اس لئے اس حصر کو اضافی قرار دینا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔

جنہوں نے کہا ہے کہ حصر زمانی لحاظ سے ہے ان کا قول بھی درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ مکہ کے زمانہ تک تو یہ تشریح درست ہو سکتی تھی۔مگر یہی آیات سورۃ بقرہ میں بھی نازل ہوئی ہیں جس کا زمانہ ہجرت کے تیسرے سال تک پہنچتا ہے۔ اور مائدہ میں بھی نازل ہوئی ہے۔جو سب سے آخری سورتوں میں شمار کیجاتی ہے پس جبکہ یہی آیت بعینہٖ مدنی سورتوں میں بھی ہے جس زمانہ میں کئی دوسری چیزوں کے استعمال سے روکا جا چکا تھا تو یہ تاویل بھی درست نہیں ہو سکتی۔

اب رہا ان لوگوں کا قول جنہوں نے کہا ہے کہ یہی چیزیں حرام ہیں کوئی اور چیز حرام نہیں۔سو میرے نزدیک ان کی بات درست ہے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی معنے نہیں بن سکتے۔جن لوگوں کا یہ مذہب ہے ان میں سے ایک ابن عباس رضؓ ہیں۔ان کے متعلق بخاری میں جابر بن عبداللہ سے ایک روایت آتی ہے کہ ان کا یہی مذہب تھا کہ یہی چار چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں بیان ہیں۔ (صحیح بخاری جلد ۳ و روح المعانی جلد ۸)۔

اور ابو داؤد کی روایت ہے کہ ابن عمرؓ کا بھی یہی مذہب تھا۔اسمیں آتا ہے کہ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنْ اَكْلِ الْقُنْفُذِ فَتَلَا قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ الآیۃ (سنن ابو داؤد جزو سوم کتاب الاطعمہ)۔

حرمت میں حصر زمانی یا حصر اضافی

اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ابن ابی حاتم نے اور بعض اور لوگوں نے سند صحیح سے بیان کیا ہے کہ اِنَّهَا كَانَتْ اِذَا سُئِلَتْ عَنْ اَكْلِ كُلِّ ذِيْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَ مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ قَالَتْ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ الآیۃ (روح المعانی جلد ۸)۔

اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ سے بھی روایت کی ہے کہ قَالَ لَيْسَ مِنَ الدَّوَابِّ شَيْءٌ حَرَامٌ اِلَّا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهٖ قُلْ لَّآ اَجِدُ۔ امام مالکؒ کا بھی یہی مذہب تھا۔ (روح المعانی جلد ۸ زیر آیت سورۃ انعام)۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا باقی سب چیزوں کا کھانا جائز ہے بعض ائمہ کا یہ مذہب ہے کہ ان کے سوا باقی سب اشیاء کا کھانا جائز ہے مگر میرے نزدیک باوجود اس کے بعض اشیاء کا کھانا ناجائز ہے مگر ہم انہیں شریعت کی اصطلاح میں حرام نہیں کہہ سکتے چنانچہ ابن ماجہ میں سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا اَلْحَلَالُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهٖ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهٖ (ابن کثیر جلد اول زیر آیت سورۃ بقرہ)

آیت میں حصر زمانی درست معلوم نہیں ہوتا

اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے جن اشیاء کو حلال کیا ہے انہی کو ہم حلال کہہ سکتے ہیں اور جن کو حرام کہا ہے انہی کو ہم حرام کہہ سکتے ہیں۔ باقی جو درمیانی چیزیں ہیں ان کے متعلق حکم حلال اور حرام کے تابع ہوگا۔ دلالۃ النص کے طور پر نہ ہوگا۔سورۃ مائدہ میں بھی اشارۃً اسی صداقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ وہاں فرمایا ہے۔ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ۔ چوپایوں میں سے تم پر انعام کی قسم کے بہائم حلال ہیں سوائے

جو خدا تعالیٰ نے حرام کیا صرف وہی حرام ہونگا باقی اس کے تابع ہوں گے

ان کے جن کا ذکر حراموں میں کیا گیا ہے۔

انعام کی کئی قسمیں ہیں۔ اونٹ۔ بکری۔ مینڈھا۔ دنبہ گائے۔ یہ حلال ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ یعنی ان حلال چیزوں کے مقابل پر کچھ حرام بھی ہیں۔ اوّل مردہ خواہ حلال جانور کا ہو۔ دوسرے خون وہ بھی خواہ حلال جانور کا ہو تیسرے خنزیر کا گوشت۔ چوتھے جس پر خدا تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا نام بلند کیا گیا ہو خواہ وہ جانور حلال ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر مردہ اور خون کی مزید تشریح کی گئی اور فرمایا ہے۔ کہ نَطِيحَة۔ مَوْقُوذَة وغیرہ حرام ہیں۔ یہ نئی حرمت نہیں بلکہ مَيْتَة اور دَم کی تشریح ہے۔ یہ سب کچھ بیان کر کے پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ أُحِلَّ لَهُمْ کہ مسلمان پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا کیا چیزیں حلال کی گئی ہیں؟ اب اگر اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ کے معنے یہ ہوتے کہ ان کے سوا باقی سب چیزیں کھانی جائز ہیں تو جب قرآن کریم نے ان چار چیزوں کو اس سوال سے پہلے بیان کر دیا تھا۔ یہ سوال دوبارہ کیوں کیا جاتا؟

حرام اور حلال چیزوں کے بیان کرنے کے بعد پھر اس سوال کو بیان کرنا اور اس کا جواب دینا بتاتا ہے کہ پہلی حلال چیزوں کی تشریح میں کچھ اغلاق ابھی باقی تھا جس کے متعلق صحابہ نے سوال کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے سوال کا یہ جواب نہیں دیا کہ ابھی تو ہم بتا چکے ہیں پھر کیوں پوچھتے ہو۔ بلکہ سوال کی ضرورت تسلیم کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ اور وہ جواب یہ دیا ہے کہ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ کہ باقی اشیاء میں سے جو طیبات ہیں وہ حلال ہیں اور جو طیبات نہیں وہ حلال نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ سب حلال چیزیں طیب نہیں ہیں۔ جو طیب ہیں فقط ان کا کھانا جائز ہے باقی کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن ان کا نام حرام نہیں رکھ سکتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی قسم کا مضمون بیان فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَالْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ۔ (بخاری جلد ۲ کتاب البیوع۔ باب الحلال بیّن والحرام بیّن)۔

یعنی حلال بھی بیان ہو چکے ہیں اور حرام بھی۔ پھر ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہوتے ہیں۔ جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس ان کے بارہ میں قیاس اور علم طب اور تجربہ وغیرہ سے کام لیکر فیصلہ کیا جائیگا۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دیکھو ہر بادشاہ کی رکھ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رکھ اسکی محرمات ہیں۔ جس طرح ہوشیار چرواہا رکھ کے پاس نہیں چراتا۔ تا ایسا نہ ہو کہ غفلت میں اس کے جانور اس میں چلے جائیں اور وہ سزا کا مستحق ہو جائے۔ اسی طرح مومن محرمات کے ساتھ کے علاقہ میں اپنے نفس کو نہیں چراتا تا بکڑا نہ جائے۔

اس روایت سے استنباط ہوتا ہے کہ حرام اشیاء سے ملتی جلتی اشیاء کو بھی گو حرام نہیں کہہ سکتے مگر ان سے بچنا تقوٰی کے لئے ضروری ہے۔

اس اصول کے مطابق جو نئی نئی اشیاء دنیا میں نکلتی رہتی ہیں ان کے متعلق یہی حکم ہوگا کہ ہم ان کا قیاس حرام اور حلال پر کریں۔ اگر حلال سے ان کی مشابہت زیادہ ہے تو انہیں استعمال کریں۔ اگر حرام سے مشابہت زیادہ ہے تو ان سے اجتناب کریں۔ چنانچہ تازہ مثال اس قسم کی چیزوں کی تمباکو ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ سے اس کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔ یہ چیز بعد میں نکلی ہے مگر اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر رسول کریم صلعم کے زمانہ میں اسکا رواج ہوتا تو حضور اس سے ضرور منع فرماتے۔

اصل بات یہ ہے کہ کھانے کی چیزوں کے متعلق اسلام نے کئی درجے بتائے ہیں۔ حرام۔ ممنوع۔ حلال۔ طیّب [illegible]

حرام وہ جسے قرآن نے حرام کیا۔ ممنوع جسے [illegible] قرآن کریم

حلال کے مقابل پر حرام اشیاء

نئی اشیاء کے حرام و حلال کے پرکھنے کا ذریعہ

اسلام کے نزدیک کھانے کی چیزوں کے کئی درجے

اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا

جھوٹے بیان کے سبب سے (یہ) مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے (تا ایسا نہ ہو) کہ تم

بتائے ہوئے اصول کے مطابق رسول کریم صلعم نے منع فرمایا یا بعد کی معلوم شدہ چیز جس کے متعلق تحقیقات کر کے مسلمان اسے ناپسندیدہ قرار دے دیں۔

حلال۔ وہ جو اپنی اصل وضع کے لحاظ سے طیب ہو۔

طیّب۔ وہ جو اپنی موجودہ حالت میں بھی طیب ہو۔

یعنی ہر وہ چیز جس کو کسی صورت میں بھی کھانا جائز ہے اس کو حلال کہیں گے۔ جیسے بکرا حلال ہے۔ مگر چونکہ کچے گوشت کی صور[ت میں] کھایا نہیں جا سکتا ہے اس لئے اس صورت میں طیب نہیں ہو گا۔ لیکن اس کو پکا کے کھانا طیب ہو گا۔

بہترین غذا طیب [اور] حلال ہے۔ اس کے بعد اور اشیاء ہیں جو ممنوع ہیں [ا]ن کا کھانا درست نہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ہیضہ کے دنوں میں کھیرے کا کھانا منع کر دے تو گو کھیرا عام دنوں میں حلال اور طیب ہے مگر ان دنوں میں حلال تو رہے گا طیب نہ رہے گا۔ جو چیزیں حرام کے بعد ہیں یعنی ممنوع ہیں ان کے متعلق بھی ہم کہیں گے کہ ان کا کھانا درست نہیں یعنی ان کے کھانے سے انسان نقصان اٹھائے گا۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے مختلف جانور مختلف کاموں کے لئے پیدا کئے ہیں۔ کوئی خوبصورتی کے لئے کہ دیکھنے میں خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ کوئی آواز کے لئے کہ اس کی آواز بہت عمدہ ہے۔ کوئی کھانے کے لئے کہ اس کا گوشت اچھا ہے۔ کوئی دوائی کے لئے کہ اس کے گوشت میں کسی مرض سے صحت دینے کی طاقت ہے۔ صرف جانور اور حلال دیکھکر اُسے نہیں کھانا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک جانور کا گوشت صحت کے لئے مضر نہ ہو مگر وہ مثلاً بعض فصلوں یا [انسا]ن میں بیما[ریاں] پیدا کرنے والے کیڑوں کو کھاتا ہو تو گوشت کے لحاظ سے اس کا گوشت حلال بھی ہو گا اور طیب بھی۔ مگر پھر بھی بنی نوع انسان کا عام فائدہ دیکھتے ہوئے اس کا گوشت طیب نہ رہے گا۔ کیونکہ اس کے کھانے کی وجہ سے انسان بعض اور فوائد سے محروم رہ جائیں گے۔

حلال اور طیب کے معنی

مجھے بچپن ہی میں یہ سبق سکھایا گیا تھا۔ میں بچہ [تھا] ایک دفعہ ایک طوطا شکار کر کے لایا۔ حضرت [مسیح موعود] علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے دیکھ کر کہا محمود [اس] کا گوشت حرام تو نہیں۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ہر جانور کھانے کے لئے ہی پیدا نہیں کیا۔ بعض خوبصورت جانور دیکھنے کے لئے ہیں کہ انہیں دیکھکر آنکھیں راحت پائیں۔ بعض جانوروں کو عمدہ آواز دی ہے کہ ان کی آواز سُن کر کان لذت حاصل کریں۔ پس اللہ تعالےٰ نے انسان کی ہر حس کے لئے نعمتیں پیدا کی ہیں وہ سب کی سب چھین کر زبان ہی کو نہ دے دینی چاہئیں۔ دیکھو یہ طوطا کیسا خوبصورت جانور ہے۔ درخت پر بیٹھا ہوا دیکھنے والوں کو کیسا بھلا معلوم ہوتا ہو گا۔

حلال اور حرام سمجھنے کے متعلق بچپن کا واقعہ

غرض طیب کیلئے جہاں صحت کے لحاظ سے اچھا ہونا شرط ہے وہاں اس کے کھانے میں یہ بھی شرط ہے کہ اس چیز کے کھانے سے انسان کے دوسرے حواس یا دوسرے بنی نوع انسان یا دوسری مخلوق کا حق نہ مارا جائے۔ بلکہ دوسروں کے جذبات کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَا اسْتَخْبَثَتْهُ الْعَرَبُ فَهُوَ حَرَامٌ (روح المعانی جلد ۲ زیر آیت تحریم سورۃ انعام) یعنی جسے عرب خراب کھانا سمجھیں وہ حرام ہے۔ یہاں حرام کے معنے یہ نہیں کہ خدا تعالےٰ کے نزدیک اس کا کھانے والا گنہگار ہوتا ہے۔ بلکہ مطلب

طیب میں یہ بھی شرط ہے کہ دوسری مخلوق کا حق نہ مارا جائے۔

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى

اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھنے والے بن جاؤ۔ جو لوگ اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ

اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ

ہرگز کامیاب نہیں ہوتے ۱۱۷ (یہ دنیا) تھوڑا سا عارضی سامان ہے ۔ اور (اس کے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا

نتیجہ میں) ان کے لئے دردناک عذاب ہے ۱۱۸ اور جن لوگوں نے یہودی مذہب اختیار کیا تھا ۔ ان پر (بھی) ہم نے اس سے

قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ

پہلے وہ (تمام) چیزیں حرام کی تھیں ۔ جنکا ذکر ہم نے تجھ سے کیا ہے ۔ اور ہم نے ان پر (یہ احکام دیکر) ظلم نہیں کیا تھا

صرف یہ ہے کہ ہر ملوں کے سامنے اسے نہیں کھانا چاہیئے کیونکہ اس طرح آپس کے تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں ۔ اسوقت ہندوستان میں گائے کا گوشت بھی ایسا ہی ہے

جملہ مسلمانوں کو نصیحت

مسلمانوں کو احتیاط چاہیئے کہ گائے کا گوشت ہندوؤں کے سامنے نہ کھایا کریں اور اس کا ذکر بھی ان کے سامنے نہ کیا کریں ۔ کیونکہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے ؀

۱۱۶ حل لغات ۔ تَصِفُ : وَصَفَ

تصف

سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے ۔ اور وَصَفَ کے لئے دیکھو نحل ۶۳

یفلحون

يُفْلِحُوْنَ : اَفْلَحَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے ۔ اور اَفْلَحَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں فَازَ وَظَفِرَ بِمَا طَلَبَ ۔ وہ اپنے مطلوب کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ۔ اَفْلَحَ زَيْدٌ ۔ نَجَحَ فِيْ سَعْيِهٖ وَاَصَابَ فِيْ عَمَلِهٖ ۔ اپنی کوشش

تصف کذا تام حاجت ہے ۔

میں کامیاب ہوگیا ۔ اور حسب خواہش مطلوب کو پالیا (اقرب) پس لَا يُفْلِحُوْنَ کے معنے ہوں گے وہ کامیاب نہیں ہوتے ؀

تفسیر ۔ لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمْ میں یا تو مَا مصدریہ ہے اور لَا تَقُوْلُوْا کا مفعول اَلْكَذِبَ ہے یعنی اپنی زبانوں کے بولے ہوئے جھوٹ کی بناء پر یہ نہ کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام ہے ۔ یا پھر مَا موصولہ ہے جس کے رو سے معنے یہ ہوں گے کہ جن چیزوں کو تمہاری زبانیں جھوٹ بول کر حلال حرام قرار دیتی ہیں ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ وہ حلال ہیں یا حرام

تمہاری زبان سے مراد دونوں صورتوں میں قوم کے سرداروں کی زبانوں سے ہے کیونکہ ساری قوم جھوٹ نہیں بنایا کرتی ۔ بعض لیڈر جھوٹ بولتے ہیں اور دوسرے لوگ ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں

لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۔ یہاں پر لام عاقبت کے معنے دیتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ کہو کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اللہ پر افترا کرنے لگ جاؤ گے یعنی اس طرح اپنے پاس سے حلال حرام قرار دینا اللہ تعالیٰ پر افتراء کے مترادف ہے کیونکہ حلال حرام مقرر کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ مفتری کامیاب نہیں ہوتے ۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے مگر مسلمانوں کو اس طرف توجہ نہیں ۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے مامورین کی سب سے بڑی نشانی ہی یہ ہے ؀

۱۱۷ تفسیر ۔ یعنی چند دن تک اگر عذاب سے

كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ

بلکہ وہ (ان احکام کو توڑ کر) اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے ۱۱۸ پھر (یاد رکھو کہ) جن لوگوں نے بیخبری کی حالت میں

بچ جائیں تو اور بات ہے مگر لمبی عمر نہیں پاتے یعنی اتنا عرصہ الہام شائع کرنے کے بعد نہیں پاتے جتنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ؛

۱۱۸ **حل لغات** ۔ قَصَصْنَا ۔ قَصَّ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے ۔ اور قَصَّ کے لئے دیکھو یوسف ع۱۔

تفسیر ۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ کفار کی طرح یہودیوں نے بھی ایسا کیا تھا جس کے بدلہ میں ان کو سزا ملی تھی ۔ اگر تم بھی کروگے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا

مِنْ قَبْلُ کے متعلق مفسرین میں بہت اختلاف ہوا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے ۔ بعضوں نے مِنْ قَبْلُ سے مراد سورۃ انعام لی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے سورۃ انعام میں ان محرمات کا ذکر آچکا ہے ۔ اسی کیطرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ غلط ہے ۔ وہاں بھی یہ الفاظ ہیں ۔ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ (انعام ع۱۸) یعنی کفار سے کہدے کہ میں تو اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی میں سوائے فلاں فلاں چیز کے اور کوئی چیز حرام نہیں پاتا ۔ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ سورۃ انعام سے بھی پہلے یہ حکم نازل ہوچکا تھا ۔

اب مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ان چار حرام چیزوں کا ذکر صرف چار سورتوں میں ہے ۔ بقرہ میں جو مدینہ میں نازل ہوئی ۔ مائدہ میں جو نہ صرف مدینہ میں نازل ہوئی بلکہ اس کے آخری ایام میں نازل ہوئی نحل میں کہ جہاں کہا ہے کہ یہ حکم مِنْ قَبْلُ نازل ہوچکا ہے ۔ اور انعام میں کہ وہاں بھی یہی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے یہ حکم نازل ہوچکا ہے پس آپس میں ایک دوسری کی طرف اشارہ سمجھا نہیں جاسکتا کیونکہ دونوں سورتیں ایک دوسرے سے پہلے نہیں ہوسکتیں اور ان دونوں کے علاوہ کسی اور مکی سورۃ میں یہ ذکر ہے نہیں ۔

مفسرین نے یا تو اس عقدہ کو حل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی یا اکثر ایسے جواب دئے ہیں جو معقول نہیں مثلاً بعض نے سورۃ مائدہ کی طرف اشارہ قرار دیا ہے ۔ جو درست نہیں ۔ کیونکہ سورۃ مائدہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے ۔ رازی نے یہ جواب دیا ہے کہ سورۃ انعام ہی سب سے پہلی سورۃ ہے جس میں یہ ذکر ہے ۔ اور اس کی آیت قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ میں اس کے بعد آنے والی آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا کی طرف اشارہ ہے ۔ اور اتنے تھوڑے فاصلہ کی بناء پر اگلی آیات کی طرف اشارہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔

امام رازی کا یہ جواب ہرگز درست نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ سے بعد کی آیت کی طرف تو اشارہ ہو یا نہ ہو مگر جس آیت کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں وہ بھی تو یہی کہتی ہے کہ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ جس کے معنے یہ ہیں کہ اس آیت سے بھی پہلے کوئی اور آیت موجود ہے جس میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے پس یہ جواب بھی مشکل کو حل نہیں کرتا ۔

مصنف فتح الباری نے اس کا ایک عجیب جواب دیا ہے جو میرے نزدیک قابل قدر ہے ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس مشکل کا کوئی اور حل موجود نہ ہوتا تو یقیناً یہی جواب صحیح ہوتا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کا اشارہ سورۃ مائدہ کی طرف ہے اور گو مائدہ نزول کے لحاظ سے انعام سے بعد کی ہے لیکن چونکہ علم الٰہی میں سورۃ مائدہ کو آخری

قصصنا

اس آیت میں من قبل کے لفظ سے مراد

چار حرام چیزوں کا ذکر چار سورتوں میں

عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

(کوئی) برائی کی ہو (اور) پھر اس کے بعد (اس سے) توبہ کر لیں اور (اپنی غلطی کی) اصلاح (بھی) کریں

ترتیب میں پہلے رکھنا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے نازل ہونیوالی سورۃ میں اس بعد میں رکھی جانیوالی سورۃ کی طرف اشارہ کر دیا اور اس طرح ایک ثبوت مہیا کر دیا کہ قرآن کریم کی ترتیب الہامی ہے۔ ان کا یہ جواب نہایت لطیف ہے اور بعض دوسرے مقامات کے حل کرنے کیوقت مدنظر رکھنے کے قابل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترتیب قرآن میں پہلے نازل ہونیوالی سورتوں میں بعد میں نازل ہونیوالی سورتوں کے مضامین کو واضح کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ نحل کے بعض مسائل کو سورۃ اسراء میں حل کیا گیا ہے حالانکہ سورۃ اسراء پہلے کی ہے اور سورۃ نحل بعد کی ہے اور یہ قرآن کے علمی کمالات میں سے معجزانہ کمال ہے۔

باوجود اس جواب کو لطیف سمجھنے کے میرے نزدیک اس موقعہ پر اس جواب کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا جواب ترتیب نزول کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی موجود ہے۔ قرآن کریم سے یہ تو ثابت ہے کہ سورۃ نحل سورۃ انعام سے پہلے نازل ہوئی ہے کیونکہ سورۃ انعام میں دو جگہ اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک انعام کے چودہویں رکوع میں جس میں فرمایا ہے قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ اور دوسرے آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (ع ۱۸) اور تاریخ سے بھی یہ امر ثابت ہے کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ اسراء کے واقعہ کے بعد جو ہجرت سے صرف چھ ماہ یا ایک سال پہلے ہوا تھا حرام حلال کے احکام نازل ہوئے ہیں اور یہ بھی احادیث سے ثابت ہے کہ سورۃ انعام ایک دفعہ سب کی سب نازل ہوئی تھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل نہیں ہوئی۔ پس معلوم ہوا کہ سورۃ نحل کے بعد ہی یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اور اسی کی آیت کی طرف اس میں اشارہ ہے۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ آیت

بنی اسرائیل کے اپنے نفسوں پر ظلم کرنے کی تشریح

زیر بحث میں جو مِنْ قَبْلُ کے الفاظ ہیں ان سے کیا مراد ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر بالکل سادہ ہے مگر نامعلوم مفسرین کا ذہن ادھر کیوں نہیں گیا۔ بات یہ ہے کہ مِنْ قَبْلُ سے مراد کوئی پہلی نازل شدہ سورۃ نہیں بلکہ اسی سورۃ کی پہلی نازل شدہ آیت ہے۔ چنانچہ اس آیت سے دو آیتیں پہلے اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ والی آیت موجود ہے اسی کی طرف مِنْ قَبْلُ کا اشارہ ہے مِنْ قَبْلُ میں سال یا دو سال کی شرط نہیں۔ ہم عام طور پر تصنیف میں جو بات پہلے لکھی گئی ہو اس کی نسبت کہتے ہیں کہ "میں پہلے لکھ چکا ہوں"۔ اس سے مراد کوئی دوسری کتاب نہیں ہوتی۔ بلکہ ان الفاظ سے پہلے کی کوئی عبارت مراد ہوتی ہے۔ اسی رنگ میں یہ الفاظ اس آیت میں مستعمل ہوئے ہیں۔

یہ جو فرمایا ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اس سے یہ مراد ہے کہ بعض اور چیزیں بھی یہود کیلئے ممنوع قرار دی گئی تھیں جیسے گائے اور بکری کی چربی۔ پس اس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ حرمت حقیقی نہ تھی بلکہ ان کے ظلموں کی وجہ سے تھی۔ چنانچہ سورۂ انعام میں اس مضمون کو وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے فرماتا ہے وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (انعام ع ۱۸) یعنی یہود پر گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کی گئی تھی سوائے اس چربی کے جو پیٹھ پر ہو یا انتڑیوں کے ساتھ لگی ہوئی ہو یا ہڈی کے اوپر لگی ہوئی ہو۔ مگر یہ حرمت ان کی سرکشیوں کی سزا کے طور پر جاری کی گئی تھی۔ مستقل حرمت نہ تھی۔

وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع ۱۵ ۹ ۲۱

ان کے حق میں تیرا رب ان (شرائط کے پورا کرنے) کے بعد بہت ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا (ثابت) ہوگا ۝۱۱۹

۝۱۱۹ حل لغات ۔ اَلسُّوْءُ کے لئے دیکھو یوسف ۲۴

جَهَالَةٌ : جَهِلَ کا مصدر ہے اور جَهِلَہٗ کے معنے ہیں ضِدُّ علمہ اس سے ناواقف اور بے خبر رہا۔ نیز الجَهَالَةُ کے معنی ہیں ضِدُّ الْعِلْمِ وَالْمَعْرِفَةِ ۔ بے علمی اور بے خبری (اقرب)

تفسیر: اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا تھا کہ یہود نے نافرمانی کی اس لئے ان پر تکالیف آئیں جیسے فرمایا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ کہ وہ ظلم کرتے تھے اس لئے اس کا نتیجہ انہیں دکھ ملا۔ اب فرمایا ہے گو یہود نے غلطیاں کیں لیکن اگر وہ اب بھی توبہ کریں تو خدا تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائیں گے۔ اس میں یہود کا کوئی خاص لحاظ نہیں بلکہ یہ عام قانون کے مطابق ہے

ظاہر ہے کہ اولاد کی تکالیف کا ماں باپ پر اثر پڑتا ہے جس طرح بچوں کے بیمار ہونے سے ماں باپ کو تکلیف ہوتی ہے اسی طرح ان کے دوزخ میں پڑنے سے ماں باپ کو تکلیف ہوگی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ قیامت کے دن بعض بظاہر میرے صحابی نظر آنے والے لوگوں کو دوزخ میں جلتے دیکھیں گے تو فرمائیں گے اُصَيْحَابِي۔ اُصَيْحَابِي (بخاری جلد ۲ کتاب التفسیر باب وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا) پس اس تکلیف سے بچانے کیلئے اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کی اولاد سے نیکی کا سلوک کرتا ہے اور ان بندوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے انکی اولاد کی حفاظت کیجاتی ہے جیسے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ کہ ہم مومنوں کی اولاد کو اگر وہ مومن ہوں گے جنت میں ان کے ساتھ ملا دیں گے خواہ اولاد کا درجہ کم ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے انبیاء و صلحاء کی امتوں اور جماعتوں کے لئے بار بار قرآن کریم میں وعدے ہیں کہ ان پر خاص فضل ہوگا تا ان کے دکھ پانے سے انبیاء اور صلحاء کو تکلیف نہ ہو۔ اور چونکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ سب قوموں کی طرف انبیاء آئے ہیں اس لئے ساری دنیا ہی اس فضل میں حصہ دار ہے یہود کی خصوصیت نہیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ۔ جہالت علم کے مقابل کا لفظ ہے اور اس کے معنے ناواقفیت کے ہیں لغت میں ہے اَلْجَهَالَةُ ضِدُّ الْعِلْمِ۔ اسی طرح لکھا ہے اَلْجَهَالَةُ ضِدُّ الْعِلْمِ وَالْمَعْرِفَةِ یعنی جہالت علم کی ضد ہے اور جہالت کے معنے عدم علم اور عدم معرفت کے ہیں۔ اس جگہ عدم علم کے معنے نہیں کیونکہ جسے علم نہ ہو اسے سزا نہیں ملتی بلکہ عدم معرفت کے ہیں یعنی علم تو کم کا ہو لیکن تقویٰ میں کمزوری کی وجہ سے یہ شخص وقت پر اپنے نفس کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ ایسا شخص سزا کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ علم کے بعد تقویٰ کے حصول کی کوشش نہ کرنا ایک دانستہ گناہ ہے۔

درحقیقت معرفت ہی ہے جو انسان کو گناہ سے بچاتی ہے۔ جو لوگ ظاہری علم کو کافی سمجھتے ہیں وہ آخر گناہ میں ملوث ہو کر رہتے ہیں پس انسان کو معرفت اور خشیت الٰہی میں ترقی کرنے کی ہمیشہ کوشش کرنی چاہیئے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جہالت دو قسم کی ہوتی ہے ایک دائمی جس کا شکار عرفان سے بالکل محروم ہوتا ہے اور گناہ میں ہی اُسے سب لذت ملتی ہے۔ دوسری وقتی۔ اس کا شکار ادنیٰ عارف بھی ہو جاتا ہے کیونکہ بعض وقت اس کے عرفان کا درجہ کم ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ نفسانی جذبات کا شکار ہو جاتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْاِيْمَانُ فَيَصِيْرُ عَلٰى رَأْسِهٖ كَالظُّلَّةِ الخ یعنی جب زانی زنا کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت اس کے قلب کی حالت مومنانہ نہیں ہوتی اور اس کا ایمان اس کے دل سے نکل کر اس کے سر پر چھاتے کی طرح منڈلاتا رہتا ہے (ترمذی باب الایمان) آخری فقرہ کے معنے بعض شراح احادیث نے یہ کئے ہیں کہ وہ ایمان اس وقت اس شخص کی سفارش کر رہا ہوتا ہے۔

وَاَصْلَحُوْا اپنی اصلاح کریں یا دوسروں کی اصلاح کریں دونوں ہی معنے ہو سکتے ہیں۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہ کے بعد انسان کو صرف قلبی توبہ ہی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ جن وجوہ سے وہ گناہ سرزد ہوا تھا ان کو بھی دور کرنا چاہیئے۔ تاکہ آئندہ گناہ سرزد نہ ہو سکے۔ اور "دوسروں کی اصلاح کریں" سے اس طرف اشارہ ہے کہ اپنے گناہ کے کفارہ کے طور پر انہیں دوسرے لوگوں کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ تاکہ ان کے ثواب میں جن کو وہ ہدایت کی طرف لائے ہوں شامل ہو جائیں۔ اور سابق گناہ کی وجہ سے جو اعمال میں کمی ہو جائے پوری ہو جائے۔

ا السُّوْء

جَهَالَة

جہالت کی دو اقسام

اَصْلَحُوْا کے دو معنے

إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۖ وَلَمْ

ابراہیم یقیناً ہر (اک) خیر کا جامع ۔ اللہ (تعالیٰ) کیلئے تذلل اختیار کرنیوالا (اور) ہمیشہ خدا کی کامل فرمانبرداری کرنیوالا تھا۔

يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهٖ ۖ اجْتَبٰهُ وَ

اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ ۱۲۲ (وہ) اس کے انعاموں کا شکرگذار تھا۔ اس (کے رب) نے اسے برگزیدہ

هَدٰىهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا

کیا۔ اور ایک سیدھی راہ کی طرف اس کی راہنمائی کی۔ ۱۲۳ اور ہم نے اسے دنیا میں (بھی بڑی) کامیابی بخشی تھی۔

۱۲۰ حل لغات ۔ اَلْاُمَّةُ کے معنے ہیں۔ الامام۔ امام الرجل الذی لا نظیر لہٗ۔ ایسا آدمی جس کا کوئی نظیر نہ ہو۔ معلم الخیر۔ نیکی کی تعلیم دینے والا نیز الجامع لِلْخَیْرِ۔ خیر کا جامع (تاج)۔ پس اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً کے معنی ہونگے کہ ابراہیم یقیناً ہر ایک خیر کا جامع، نیکی کی تعلیم دینے والا امام، اور بے نظیر شخص تھا۔ قَانِتًا۔ قانت۔ قَنَتَ سے اسم فاعل ہے۔ اور قَنَتَ (یقنت قنوتا) کے معنے ہیں اطاع اطاعت کی اور قنت اللہَ و قَنَت لِلّٰہِ کے معنے ہیں ذلّ اللہ تعالیٰ کے حضور تذلل اختیار کیا نیز اس کے معنے ہیں دعا اس نے دعا کی۔ قام فی الصلوٰۃِ نماز شروع کی۔ امسک عن الکلام کلام کرنے سے رکا رہا۔ نیز القانت کے معنے ہیں القائم بالطاعۃ الدائم علیھا پوری طرح اطاعت کرنیوالا۔ المصلی نمازگزار (اقرب)

الحنیف: الصحیح المیل الی الاسلام الثابت علیہ اسلام کی طرف صحیح میلان رکھنے والا اور اسپر قائم رہنے والا۔ المائل من دین الی دین۔ ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کی طرف جانے والا۔ المسلم کامل فرمانبردار اس کی جمع حنفاء آتی ہے۔ (اقرب)

(حاشیہ: الامۃ ؎ — حضرت ابراہیم کی صفات کا بیان ؎ — قانتاً ؎ — الحنیف ؎)

تفسیر ۔ اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کو اُمت کہا ہے۔ اس کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ وہ نیکی کی تعلیم دینے والا اور سب قسم کی خیر کا جامع تھا۔ دوسرے میرے نزدیک ادھر بھی اشارہ ہے کہ اس کے اندر وہ طاقتیں موجود تھیں جن سے امتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جتّٰی کہ ان طاقتوں کی وجہ سے اسے اُمت کہا جا سکتا ہے گویا وہ درخت اُمت کے لئے بطور بیج کے تھا۔

(حاشیہ: حضرت ابراہیم کو امت کہنے کی تشریح ؎)

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی صفات بیان فرمائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ معلّم خیر تھے۔ دنیا کو نیکی کی تعلیم دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ جامع الخیر تھے۔ سب قسم کے اخلاق فاضلہ ان میں پائے جاتے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ نہایت اعلیٰ فطرت رکھتے تھے جو زبردست نمو کی قوتیں پوشیدہ رکھتی تھی جس سے امتوں کا پیدا ہونا ممکن تھا۔ چوتھے یہ کہ وہ قانت تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے۔ دُعائیں کرنے والے تھے۔ پانچویں یہ کہ وہ حنیف تھے یعنی زبردست قوت مقاومت رکھتے تھے اور کبھی حق کے راستہ سے دوسری طرف مائل نہ ہوتے تھے۔ چھٹے یہ کہ وہ مشرک نہ تھے یعنی توحید پر کامل طور پر قائم تھے۔ یہ کامل توحید کے معنے اس سے نکلتے ہیں کہ قانتاً للہ اور حنیفاً کے بعد یہ فقرہ رکھا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسجگہ عام موحد مراد نہیں۔ بات یہ ہے کہ عام طور پر انسان جب اسکے اندر خوبیاں پیدا ہو جائیں اپنی ذات پر بھروسہ کرنے لگ جاتا ہے اور اسمیں کبر اور خودبینی خودرائی و خودستائی پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے آپکو بڑا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق یہ فرما کر لم یک من المشرکین یہ بتایا ہے کہ باوجود اتنی خوبیوں کے وہ خدا ہی کا بندہ رہا۔ اور اپنے نفس کی خوبیوں کو اپنی طرف منسوب کر کے شرک کا مرتکب کبھی نہیں ہوا۔

۱۲۱ حل لغات ۔ اِجْتَبَاہُ کے معنے ہیں: اختارہ و

حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ ثُمَّ

اور وہ آخرت میں (بھی) یقیناً صالح لوگوں میں سے ہوگا۔ ۱۲۲؎ اور

اصطفاہ اس کو چن لیا اور برگزیدہ کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی وہ اپنی ہر ایک خوبی کو نعمت الٰہی سمجھتا تھا اور وہ ان تمام صفات کو خداتعالیٰ کا دیا ہوا خزانہ قرار دیتا تھا۔ پس چونکہ وہ تمام نعمتوں کو خدا ہی کی عطاء سمجھتا تھا۔ اس لئے جس قدر زیادہ اس کی خوبیاں نکھرتی تھیں اسی قدر وہ اپنے شکر اور انابت الی اللہ میں بڑھتا تھا۔

جب انسان میں یہ باتیں ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ کی سُنّت ہے کہ اس کو اپنے فضل کے لئے چن لیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ ہم ان نیکیوں کے بدلے میں مَیں نے اس کو پسند کر لیا اور اس کو ہر خوبی سے متصف پاکر اپنا برگزیدہ بنالیا تھا۔ اور اسکو ایسے راہ پر ڈال دیا جو مستقیم تھی یعنی خدا تک پہنچانے والی تھی۔

مستقیم کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ خداتعالیٰ تک پہنچانے والی راہ تھی کیونکہ مستقیم راستہ وہی ہوتا ہے جو دو نقطوں کے درمیان ہو۔ اور دین کے معاملہ میں ایک نقطہ انسان ہے اور دوسرا نقطہ خدا ہے۔ پس جو راستہ خداتعالیٰ تک پہنچائے وہی صراط مستقیم ہوگا۔ اور جو راہ خداتعالیٰ تک نہیں پہنچاتا وہ مستقیم کہلا ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کا رخ اس نقطہ سے ہٹ گیا جس کی طرف پہنچنا مقصود تھا۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیات سے یہ ہے کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ تم کو بھی انعام ملیں گے تم مکہ والوں کی طرح نہ بن جانا جنہوں نے شریعت ہی کا انکار کر دیا۔ اور اپنے لئے خود ساختہ قانون کافی سمجھا۔ اور تم یہود کی طرح بھی نہ بننا جنہوں نے خدائی شریعت میں اختلافات شروع کر دیئے۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنے لگ گئے۔

اب بتاتا ہے کہ تم کیسے بننا۔ فرمایا تم ابراہیمؑ کی طرح بننا۔ جو اوصاف اس کے ہیں، وہ اپنے اندر پیدا کرنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ جو سلوک ہم نے ابراہیمؑ کے ساتھ کیا تھا وہی تمہارے ساتھ کریں گے۔ وہ سلوک کیا تھا؟ اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

۱۲۲؎ تفسیر۔ ان صفات کی وجہ سے ہم نے ابراہیمؑ کو دنیا میں بھی بڑی ترقیات دی تھیں۔ اور اس کو دنیا میں آرام کی زندگی عطاء کی تھی اور آخرت میں بھی وہ صالحین میں سے ہوگا۔

من الصالحین کا مطلب

من الصالحین سے مراد جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں (نحل رکوع ۱۳) یہ ہے کہ اس کی طاقتیں مرنے کے بعد اگلے جہان کی اعلیٰ ترقیات سے کامل مناسبت رکھنے والی ہوں گی۔ یعنی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات پانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت رکھتا ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دنیوی ترقی

اس آیت میں جہاں یہ بتایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ انعامات ہم نے دیئے تھے۔ وہاں اس سے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ابراہیمؑ کے لئے تو بگڑنے کا موقعہ ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ دنیاوی ترقیات سے محروم تھا۔ فرماتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے۔ تو یہ غلط ہوگا۔ ہم نے اسے دنیوی ترقیات بھی دی تھیں (چنانچہ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ باوجود دوسرے ملک سے ہجرت کرکے آنے کے حضرت ابراہیمؑ کی مالی حالت بھی بہت اعلیٰ ہوگئی تھی اور ملکیت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ پیدائش باب ۱۳ آیت ۲ ، ۱۴ تا ۱۶)

مگر باوجود اس کے وہ خداتعالیٰ ہی کی طرف متوجہ رہے۔ پس اے مسلمانو! جب تم کو بادشاہت ملے تو ابراہیم کی طرح تمام ترقیات کو خداتعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں اور امانتیں سمجھنا۔ اور مغرور نہ ہو جانا۔

أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَ

(اے رسول) ہم نے تجھے وحی کی (یعنی) حکم دیا ہے کہ (ہماری) کامل فرمانبرداری پر ہمیشہ قائم رہنے والے ابراہیم کے طریق کی پیروی

مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ

کر، اور (اے مکہ والو جانتے ہو کہ) وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا ۱۲۳ سبت (کا وبال) انہی لوگوں پر ڈالا گیا تھا۔

عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ

جنہوں نے اس میں اختلاف کیا تھا۔ اور تیرا رب اس امر کے متعلق جس میں وہ

بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○

اختلاف کرتے تھے یقیناً قیامت کے دن فیصلہ کرے گا ۱۲۴

مِلَّة

۱۲۳ حل لغات۔ مِلَّةَ: کے معنوں کے لئے دیکھو ابراہیم ۱۴

زمانہ ترقیات میں توکل اور ایمان رکھنے کی نصیحت

تفسیر:۔ اس آیت میں گویا اس مضمون کو جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں خود اللہ تعالیٰ نے کھول کر بیان فرما دیا ہے اور مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ تم ابراہیمؑ کے طریق پر چلنا۔ اور پھر ماکان من المشرکین کو دہرا کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تم بھی ترقیات کے موقعہ پر خدا تعالیٰ کا توکل اور اس پر ایمان نہ چھوڑنا۔

السَّبْت

اس آیت سے بعض مسیحی یہ غلط استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابراہیمی دین ہی کے تابع تھے۔ حالانکہ اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جیسے اس نے کمال پیدا کیا اور شکرگزاری دکھائی ویسے ہی تم بھی کرو۔ یعنی تفصیلات میں اطاعت مراد نہیں بلکہ ان امور میں نقش قدم پر چلنے کی ہدایت دی گئی ہے جن کا اوپر کی آیت میں ذکر ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ ان امور پر چلنے کی ہر شخص کو ضرورت ہے اور آدم سے لے کر آخری انسان تک کوئی ان صفات سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ ابراہیمؑ سے پہلے بھی جو لوگ خدا رسیدہ تھے انہی صفات کے حامل تھے اور ابراہیمؑ بھی۔ ابراہیمؑ کا نام خصوصاً اس لئے لیا ہے کہ مکہ کے لوگ ان کو اپنا باپ کہتے تھے اور باپ کی مثال دے کر غیرت دلانا اصلاح کا بہترین طریق ہے۔

سبت کے ذکر پر مفسرین کی حیرانگی

سر ولیم میور اس آیت پر لکھتا ہے کہ محمد صاحب پر اس حالت کے زمانہ میں یہ علم منکشف ہو گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کی رسالت اور نبوت تمام قوموں میں مسلسل طور پر جاری ہے۔ (اللہ تعالیٰ بعض دفعہ دشمن کے منہ سے بھی حق کہلوا دیتا ہے)

۱۲۴ حل لغات۔ السَّبْتُ: یہ سَبَتَ (يَسْبِتُ) کا مصدر ہے اور سبت الرّجل کے معنے ہیں استراح۔ اس نے آرام کیا۔ نیز اس کے معنے ہیں ہفتہ کا روز۔ (اقرب)

تفسیر:۔ اس جگہ مفسرین بہت حیران ہوئے ہیں کہ سورۃ النحل مکی ہے اس میں سبت کے ذکر کا کیا تعلق تھا انگریز مفسرین نے ایک شگوفہ چھوڑا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کا ذکر اس آیت سے پہلے تھا مگر وہ آیت قرآن سے ضائع ہو گئی ہے اور یہ آیت رہ گئی ہے جس کی وجہ سے عبارت کا ربط جاتا رہا ہے

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ

(اور اے رسول! تو (لوگوں کو) حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے اپنے رب کی راہ کی طرف بلا۔ اور اس طریق سے

الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ

جو سب سے اچھا ہو، ان سے (ان کے اختلافات کے متعلق) بحث کر تیرا رب ان کو (بھی)

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ چونکہ مسلمانوں کو بھی نیکیوں کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے ایک نیکی کے حکم اور نیکی خلاف ورزی کے انجام کا ذکر کر کے مسلمانوں کو ڈرایا ہے تا وہ احتیاط رکھیں بعض نے سبت کے لفظ سے سبت کے توڑنے کا عذاب مراد لیا ہے۔ یعنی وہ عذاب ان کے لئے تھا جنہوں نے اس میں اختلاف کیا تھا۔

ایک جدید مفسر نے اس جگہ سبت کے معنے قطع کے بھی کئے ہیں۔ مگر ایسے موقعوں پر ان معنوں میں عرب لوگ ہرگز اس لفظ کو استعمال نہیں کرتے۔

میرے نزدیک سبت کے وبال کے معنے ہی ٹھیک ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اور عربی زبان میں بھی اس بات کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ مضاف حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنا دیتے ہیں۔ پس جُعِلَ السَّبْتُ کے یہ معنے ہیں کہ سبت کا اثر صرف ان لوگوں پر ہوا تھا۔ (اور وہ یقیناً برا اثر تھا) جنہوں نے اس میں اختلاف کیا تھا۔ سورۃ بقرہ میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سبت کی حرمت کو توڑنے کی وجہ سے یہود کو سزا ملی تھی۔

اب یہ سوال بیشک پیدا ہوتا ہے کہ سبت کے ذکر کا پہلی آیات سے کیا ربط ہوا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہود میں نزول قرآن سے پہلے بھی یہ خیال تھا، اور آج تک ہے کہ ہماری ساری تباہی اور بربادی صرف سبت کے توڑنے کی وجہ سے ہے۔ اور یہ کہ انہیں ہرگز ترقی نہ ملیگی جب تک وہ پھر سبت کی عزت کو قائم نہ کریں گے۔ آج بیسویں صدی میں بھی جبکہ مسلمان جمعہ کی حرمت کو توڑ رہے ہیں۔ اور عیسائی اتوار کو چھوڑ رہے ہیں۔ یہودیوں میں ایسی سوسائٹیاں بن رہی ہیں جو سبت کی حرمت کو قائم کرنے کی تبلیغ کر رہی ہیں۔ فلسطین میں انہوں نے کئی گاؤں میں اس کو جبراً قائم کرنا چاہا۔ جس کی وجہ سے وہاں کئی فسادات بھی ہو چکے ہیں۔ پس جب یہود کو کہا گیا کہ اب تمہاری ترقی اسلام سے وابستہ ہے (دیکھو پچھلی آیات) تو ان کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ جس چیز یعنی سبت کے قائم کرنے پر ہماری عزت کا انحصار ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ملنے سے تو ہم اس سے اور بھی دور جا پڑتے ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں میں جمعہ کی عزت کی جاتی ہے، اور ہمارے لئے ہفتہ کے دن کی عزت کرنا واجب ہے۔ اور اس سوال کا جواب دینا ضروری تھا چنانچہ اس آیت میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ تباہی خدا کے کلام کی نافرمانی سے آتی ہے۔ سبت کے توڑنے پر تباہی بھی اسی وجہ سے آئی تھی۔ کہ خدا نے اس کی عزت کا حکم دیا تھا۔ اور اب جبکہ خدا کا یہ حکم ہے۔ کہ اسلام کے ذریعہ جو نیا عہد قائم کیا گیا ہے۔ اس میں داخل ہو جاؤ تو اب تباہی اس حکم کی خلاف ورزی سے آئے گی۔ اس لئے اب تم سبت کی حرمت کو قائم کر کے بھی عزت حاصل نہیں کر سکتے۔ اب عزت صرف اسلام میں داخل ہونے اور اس کی اتباع کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سبت[1] کے ذکر کے متعلق مختلف مفسرین کا خیال

سبت[1]

سبت[1] کے صحیح معنی وبال کے

سبت[1] کے ذکر کا پہلی آیات سے تعلق

هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ

جو اس کی راہ سے بھٹک گئے ہوں۔ (سب سے) بہتر جانتا ہے۔ اور وہ

بِالْمُهْتَدِيْنَ ○ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ

ہدایت پانیوالوں کو (بھی سب سے) بہتر جانتا ہے ۱۲۳؎ اگر تم (لوگ زیادتی کرنے والوں کو) سزا دو تو جتنی

۱۲۳؎ حل لغات ۔ الحکمۃ ۔ کے معنے ہیں

الحکمۃ[1]

العدل ۔ عدل ۔ العلم ۔ علم ۔ الحلم ۔ بردباری ۔ النبوۃ ۔ نبوت ۔ قِیلَ مَا یَمْنَعُ مِنَ الْجَھْلِ ۔ جو جہالت سے روکے ۔ وَقِیلَ کُلُّ کَلَامٍ مُوَافِقِ الْحَقِّ ہر وہ بات جو حق کے موافق ہو ۔ وَقِیلَ وَضْعُ الشَّیْئِ فِی مَوْضِعِہٖ وصواب الامرِ وسدادہ اور بعض نے کہا ہے کہ کسی چیز کو برمحل رکھنا اور کسی معاملہ کا درست اور صحیح ہونا حکمت کہلاتا ہے ۔ (اقرب)

عدل کے لفظ سے ایک نصیحت[2]

تفسیر ۔ چونکہ دین کی اشاعت اب وسیع ہونیوالی تھی ۔ اور یہود اور نصاریٰ میں جن کے پاس الٰہی کتابیں تھیں اسلام کی منادی ہونے والی تھی ۔ اس لئے فرمایا کہ ان کے مقابلہ میں زیادہ مضبوطی کی ضرورت ہے ۔ مشرکوں کے مقابلہ میں یہ آسانی تھی کہ شرک کا ردّ کر دینے سے ہی سب جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا تھا ۔ مگر یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں شریعت کی تفصیلی بحثوں میں بھی پڑنا لازمی تھا ۔ اس لئے پہلے سے تاکید کر دی کہ دعوۃ بالحکمۃ ہو ۔ حکمت کے معنی کئی ہیں ۔ مثلاً علم ، پختگی ، عدل ، نبوت ، حلم اور بردباری ، جو چیز جہالت سے روکے ۔ جو کلام حق کے موافق ہو ۔ محل و موقع کے مناسب حال بات ۔ یہ سب معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں ۔ فرمایا حکمت کے ساتھ بلاؤ ۔ یعنی علمی باتوں کو بیان کرو ۔ یعنی پہلے نبیوں کے صحیفوں پر مسائل کی بنیاد رکھ کر بات کرو ۔ افسوس کہ مسلمان مفسروں نے اس حکم کی طرف توجہ نہیں کی ۔ اور لوگوں سے سن سنا کر بائیبل کے متعلق ایسے حوالے اپنی کتب میں لکھ دیئے ہیں کہ یہود اور عیسائیوں کو آج تک ان کی وجہ سے اسلام پر حملہ کرنے کا موقعہ ملتا ہے ۔ دوسرے یہ فرمایا کہ پختہ باتیں بیان کرو ۔ کوئی بات بھی کچی نہ ہو ۔ بعض دفعہ انسان تائیدی دلائل کو مستقل دلائل کی صورت میں پیش کر دیتا ہے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن انہی کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے ۔ فرمایا ۔ پہلے ہر دلیل کو اچھی طرح سے جانچ لو ؛ جو پختہ اور مضبوط ہو اسی کو پیش کرو ۔

آریہ اور عیسائی صاحبان کا اسلام کے خلاف بے انصافی سے اعتراض کرنا[1]

عدل کے معنی کے رو سے یہ ہدایت فرمائی کہ کسی پر ایسا اعتراض نہ کرو جو تم پر بھی پڑتا ہو ۔ کیونکہ اول تو یہ انصاف سے بعید ہے ۔ دوسرے دشمن موقعہ پاکر بحث میں اس بات کو پیش کر دیتا ہے اور پھر شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے ۔

آجکل آریہ اور عیسائی اسلام کے خلاف اسی بے انصافی سے کام لے رہے ہیں ۔ یعنی وہ ایسے اعتراض اسلام پر کرتے ہیں جو ان کے مذہب پر زیادہ پڑتے ہیں ۔ حالانکہ وہ باتیں جن پر وہ اعتراض کرتے ہیں ۔ اگر عیب ہیں تو پھر وہ اپنے مذہب کو کیوں مانتے ہیں ۔ اسلام ایسے اعتراضوں سے منع کرتا ہے ۔ مگر افسوس کہ اس زمانہ کے مسلمان اس نصیحت سے بالکل غافل ہیں ۔ اور احمدیہ جماعت کے بانی کے خلاف ایسے امور کو اعتراض کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ جو سب انبیاء میں پائے جاتے ہیں ۔ اگر وہ امور قابل اعتراض ہیں تو ان کی وجہ سے سب ہی نبیوں کو چھوڑنا پڑتا ہے ۔

حکمت کے معنی علم کے[1]

حکمت[1] کے معنے حلم کے بھی ہوتے ہیں ۔ فرمایا کہ نرمی کے ساتھ اور عقل سے کام لیتے ہوئے بات کیا کرو ۔ کیونکہ

جو شخص ایسا نہیں کرتا بلکہ جلد تیز ہو کر غصے اور جوش میں آجاتا ہے وہ دوسرے کو ہرگز سمجھا نہیں سکتا۔

نوٹ کے معنوں کی رُو سے یہ مطلب ہوگا کہ الہیٰ کلام کی مدد سے لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ۔ جو دلائل خود قرآن کریم نے دیئے ہیں۔ انہی کو پیش کرو۔ اپنے پاس سے ڈھکوسلے نہ پیش کیا کرو۔ آہ! اگر اس گُر کو مسلمان سمجھتے تو یہودیت اور عیسائیت کو کھا جاتے۔ ہمارا ہتھیار قرآن کریم ہی ہے جسکی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ (فرقان ع۵) اس قرآن کی تلوار لے کر دنیا سے جہاد کے لئے نکل کھڑا ہو۔ پر افسوس کہ آج دنیا کی ہر چیز مسلمان کے ہاتھ میں ہے لیکن اگر نہیں تو یہی تلوار، جس کو لے کر نکل کھڑے ہونیکا حکم تھا۔

ما يمنع من الجهل کی رُو سے آیت کا یہ مطلب بنے گا کہ تم ایسے طریق سے کلام کیا کرو۔ جس کو دوسرا سمجھ سکے۔ اور اس سے اسکی غلط فہمی دور ہوسکے۔ یعنی وہ بات ہونی چاہیئے جو جہالت کا قلع قمع کرے۔ اور مخاطب کے فہم کے مطابق ہو۔ چنانچہ حدیث میں بھی آتا ہے "اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اَنْ نُكَلِّمَ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" (دیلمی) ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگوں سے ان کے فہم اور ادراک کے مطابق کلام کیا کرو۔ بعض لوگ لیکچر دیتے ہیں تو موٹے موٹے لفظ اور اصطلاحیں استعمال کر کے رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان تقریروں سے جاہلوں پر رعب تو ضرور پڑ جاتا ہوگا۔ مگر فائدہ ان کی تقریر سے کوئی نہیں اٹھاتا۔

موافق الحق کلام کو بھی حکمت کہتے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی بات کیا کرو۔ جو سچی اور واقعات کے مطابق ہو۔ بعض لوگ یہ سمجھکر کہ ہم سچے دین کی طرف ہی بلا رہے ہیں۔ بعض غلط باتوں کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ طریق غلط ہے۔ دشمن کے مقابلہ میں جو بات کہو سچی کہو۔ دوسروں کو ہدایت دیتے دیتے خود ہی گمراہ نہ ہو جاؤ۔ جیسے کہ فرمایا۔ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (مائدہ ع۱۴) اگر تم ہدایت پر قائم رہتے ہو۔ تو اس کی پرواہ نہ کرو۔ کہ دوسرا گمراہ ہوتا ہے۔ یعنی کوئی ایسی بات جو گناہ ہو۔ اس خیال سے نہ کرو کہ اس کے ذریعہ سے میں دوسرے کو ہدایت دُوں گا۔ جب تمہاری ہدایت اور دوسرے کی ہدایت ٹکرا جائے تو اس وقت تم اپنی ہدایت کی فکر کرو۔ اور دوسرے کی ہدایت کو خدا پر چھوڑ دو۔ کہ اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں کرتا کہ مومن کافر ہو جائے اور کافر مومن۔ وہ تو دوسروں کو ہدایت دینا چاہتا ہے۔

حکمت محل و موقع کے مناسب کلام کو بھی کہتے ہیں۔ ان معنوں کے رو سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تبلیغ میں برمحل بات کرنی چاہیئے۔ اگر بعض دلائل سے دشمن کے برانگیختہ ہونے کا اندیشہ ہو، اور خطرہ ہو کہ وہ اس طرح سے تمہاری بات نہ سنے گا۔ تو یہ مناسب نہیں کہ بلاوجہ اس کو چڑاؤ۔ تم اس کے سامنے دوسرے دلائل بیان کرو جن کو وہ ٹھنڈے دل سے سُن سکے۔ گویا بات کرتے وقت پہلے مزاج شناسی کرلو۔ اگر تم ان کو خواہ مخواہ بھڑکاؤ گے، تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

۲۰۱
حکمت کے مختلف معنوں کے رُو سے آیت کے معنی

اللہ اللہ کیا مختصر الفاظ میں تبلیغ کے سب گُر بیان کر دیئے ہیں۔ جو شخص بھی ان پر عمل کریگا کبھی اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہیگا۔

۲
الموعظة الحسنة

الموعظة الحسنة۔ موعظہ حسنہ کے معنے پہلے گزر چکے ہیں۔ (یعنی وہ کلام جو دلوں کو نرم کر دیتا ہو، اور ان پر گہرا اثر ڈالتا ہو) اس نصیحت سے مسلمانوں کو ادھر توجہ دلائی کہ خشک دلیلوں ہی سے کام نہ چلایا کرو۔ بلکہ جذبات کو ابھارنے والی بات بھی کیا کرو۔ اور حکمت کے ساتھ موعظہ حسنہ کو بھی شامل رکھا کرو۔ حسنہ کا لفظ رکھکر بتایا کہ جھوٹی خبریں نہ دلاؤ۔ جیسا کہ آجکل کے جاہل علماء لوگوں کو بلاوجہ راستبازوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ

تم پر زیادتی کی گئی ہو تم اتنی (ہی) سزا دو۔ اور (ہمیں اپنی ذات کی قسم ہے کہ) اگر تم صبر کرو گے تو صبر کرنیوالوں کے حق میں۔ وہ

لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ

(یعنی صبر کرنا) بہتر ہوگا۔ ۱۲۴۵ اور (اے رسول) تو صبر کر - اور تیرا صبر کرنا اللہ (تعالیٰ کی مدد) سے ہی (وابستہ) ہے

جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ کہکر یہ بتایا ہے کہ ان سے جھگڑا کرتے وقت یہ بھی مدنظر رکھا کرو۔ کہ مختلف دلائل میں سے جو سب سے اعلیٰ اور مضبوط دلیل ہو، اس کو بطور بنیاد اور مرکز کے قائم کیا کرو۔ اور باقی دلائل کو اس کے تابع۔ کیونکہ تائیدی دلیل کے ٹوٹ جانے سے اصل دلیل کو کوئی ضعف نہیں پہنچتا۔ برخلاف اسکے کہ اگر مرکزی نقطہ کمزور ہو تو مضبوط تائیدی دلائل بھی کوئی زیادہ فائدہ نہیں دیتے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ میں بتلایا ہے کہ تم اچھی طرح سے تبلیغ کرتے رہو۔ لیکن اگر لوگ نہ مانیں تو اس سے یہ نتیجہ نکال کر مایوس نہ ہو جانا کہ ہمیں تبلیغ کرنی ہی نہیں آتی۔ کیونکہ بہت ممکن ہے۔ کہ تمہاری تبلیغ میں کوئی نقص نہ ہو۔ مگر مخاطب کے دل پر اس کے گناہوں کا ایسا زنگ ہو کہ خدا تعالیٰ اس کیلئے ہدایت کی کھڑکی نہ کھولے۔

جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ سے مراد

غرض تبلیغ میں منہمک رہنا چاہیئے۔ نتیجہ نکالنا اور اثر پیدا کرنا خدا تعالیٰ کا کام ہے۔

۱۲۴۶ حل لغات - عَاقَبْتُمْ:- عَاقَبَ سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور عَاقَبَ فلانٌ بِذَنْبِهٖ (وعلی ذَنْبِهٖ معاقبةً وعقاباً) کے معنے ہیں، اَخَذَهٗ بِهٖ اس کے قصور پر گرفت کی اور سزا دی پس اِنْ عَاقَبْتُمْ کے معنے ہوں گے اگر تم سزا دو۔

عَاقَبْتُمْ

تفسیر - بعض مفسرین نے پہلی آیات کو اس آیت سے منسوخ قرار دیا ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ منسوخ ہونے والی ان میں کونسی بات ہے۔ کیا علم سے بحث کرنا حکمت اور پختہ بات اور سچی بات کا کہنا اور بردباری سے کلام کرنا منسوخ ہیں یا منسوخ ہونے والی باتیں ہیں؟ پس یہ آیتیں ہرگز منسوخ نہیں۔

اس آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارے دشمن تمہاری دعوۃ بالحکمۃ کو سنکر نہیں مانیں گے، بلکہ تمہارے قتل کرنے کے لئے تلواریں اٹھائیں گے۔ تو فرمایا کہ جب ایسا ہو تو تم کو بھی اپنے دفاع کے لئے تلوار اٹھانے کی اجازت ہوگی۔

یہ کتنا معجزانہ کلام ہے کہ ابھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں ہیں، یہود سے کوئی مقابلہ شروع نہیں ہوا نہ نصاریٰ سے۔ مگر مکہ ہی میں یہ خبر دے دی گئی کہ یہود بھی اور نصاریٰ بھی تم پر ظلم اور زیادتی کریں گے۔ اور اس وقت دفاع کے طور پر تم کو ان کے مقابلہ کی اجازت ہوگی۔ ہاں یہ نصیحت یاد رکھنا کہ جلد بازی نہ کرنا اور پہلے صبر کا نمونہ دکھانا پھر کوئی چارہ نہ رہے تو مقابلہ کرنا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی پوری تعمیل کی اور دیر تک اہل کتاب کے ظلم سہے اور آخر مجبوراً ان کے مقابلہ پر نکلے۔

جہاد کا حکم دیتے ہوئے قرآن مجید کی اخلاقی خوبی

قرآن کریم کی یہ کتنی بڑی اخلاقی خوبی ہے کہ جہاد کا حکم دینے سے پہلے اس نے اس کی حدود و قیود کو بیان کرنا شروع کر دیا ہے تا زیادتی کرنے کا احتمال ہی باقی نہ رہے۔

عقاب کے لفظ میں یہ اشارہ کیا ہے کہ ناجائز حملہ کا جواب ہی جہاد کہلاتا ہے، جارحانہ حملہ جہاد نہیں کہلا سکتا کیونکہ عقاب کا لفظ اس فعل کے متعلق بولا جاتا ہے جو دوسرے کے فعل کے جواب میں کیا جائے۔ پس اس لفظ

لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا

اور تو ان (لوگوں کی حالت) پر غم نہ کھا ۔ اور جو تدبیریں وہ کرتے ہیں ۔ ان کی وجہ سے تکلیف محسوس نہ کر

يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ

۱۲۵ اور یاد رکھ کہ اللہ (تعالیٰ) یقیناً ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے ۔ جنہوں نے تقویٰ (کا طریق) اختیار کیا ہو ۔

سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جب سزا دو ۔ جرم کے بعد دو بمثل ماعوقبتم کے الفاظ سے یہ ہدایت کی ہے کہ سزا دینی ہی پڑے تو بھی یہ خیال رہے کہ جتنی تم کو تکلیف پہنچائی گئی ہے ۔ اس سے زیادہ نہ ہو ۔

لئن صبرتم میں صبر کی ترغیب دی ہے اور بتایا ہے کہ صبر اپنے نتیجہ کے لحاظ سے نہایت ہی اعلیٰ ہوتا ہے ۔

جنگ احد میں حضرت حمزہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا) اور شہداء احد کے ساتھ کفار نے یہ سلوک کیا کہ ان کے ناک اور کان بھی کاٹ دیئے (یعنی مثلہ کیا) مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبر کیا ۔ اور موقعہ پانے پر بھی اس قبیح اور ننگِ انسانیت رسم کی اجازت نہ دی ۔

بعض اوقات کفار معاہدات توڑتے تھے ۔ مگر آپ صبر ہی فرماتے تھے ۔ صبر کا نتیجہ بہتر ہوتا ہے ۔ بدلہ لینے سے صرف انسان کا غصہ دُور ہو جاتا ہے ۔ مگر صبر کرنے کی صورت میں اس کی رُوحانیت ترقی کر جاتی ہے ۔

۱۲۵ حل لغات ۔ ضَيْقٌ ۔ ضَاقَ (يَضِيْقُ) کا مصدر ہے ۔ اور ضَاقَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں ضد اتَّسَعَ کوئی چیز تنگ ہوگئی ۔ ضَاقَ الرَّجُلُ اس نے بخل سے کام لیا ۔ نیز الضَّيْقُ کے معنے ہیں الشَّكُّ فِي الْقَلْبِ دل میں شک ہونا ۔ مَا ضَاقَ عَنْهُ صَدْرُكَ جس سے دل تنگ پڑے ۔ اور تکلیف ہو (اقرب) پس لَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ کے معنے ہوں گے کہ جو تدبیریں وہ کرتے ہیں ان سے تکلیف محسوس نہ کر ۔

تفسیر ۔ اس آیت میں صبر کا لفظ دوسرے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور مضمون میں تکرار نہیں ہے ۔ اس جگہ صبر کا مفہوم یہ ہے کہ جب کفار کے ساتھ جنگ کی اجازت ملی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سمجھ لیا کہ اب کفار پر عذاب آنیوالا ہے ۔ اس لئے آپؐ پر یہ حکم نہایت شاق گذرا اور آپؐ کا دل بھر آیا ۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔ کہ اے رسول اللہ کا یہی فیصلہ ہے تم صبر کرو ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے صدمہ میں ہمدردی کا اظہار فرمایا ہے ۔

لئن صبرتم میں صبر کی حقیقت

اس آیت سے آپؐ کے اخلاق کا کمال ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو دن رات تنگ کرتے تھے اور حضور کی جان کے درپے رہتے تھے انکی تباہی کی خبر پاکر بھی آپ بے چین ہوگئے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ "وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ" کہ تجھے اتنا رنج ہے کہ ہم ہی تجھے توفیق دیں تو تُو صبر کر سکیگا ۔ ورنہ یہ غم بہت زیادہ ہے ۔

آنحضرت کے اخلاق کا کمال

اس جملہ کے یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ تو صبر کر کیونکہ تیرا صبر کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہے ۔ اور ایسا صبر ہی اعلیٰ اخلاق میں سے ہوتا ہے ۔ جو صبر کمزوری اور ضعف کی وجہ سے ہوتا ہے وہ بیچارگی ہے اعلیٰ اخلاق میں سے نہیں ۔ طاقت رکھتے ہوئے خاموش رہنا ہی اعلیٰ اخلاق کو ظاہر کرتا ہے ۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ سے اوپر کے معنوں کی تائید ہو جاتی ہے ۔ حَزِنَ عَلَيْهِ دوسروں کی تکلیف پر غم کرنے پر بولا جاتا ہے ۔ پس ان الفاظ کی موجودگی میں اس آیت میں صبر کے معنے ذاتی تکلیف پر صبر کے کرنا بالکل بے جوڑ بات ہے ۔ ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں

ضیق

هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ○

اور جو نیکو کار ہوں۔ ۱۳۵

لاتک فی ضیق کا مطلب

صبر سے مراد دشمن کی تباہی پر غم نہ کرنا ہے۔

وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ۔ ان الفاظ کے یہ معنی نہیں کہ ان کی شرارتوں پر غصے نہ ہو۔ بلکہ اس جگہ یہ الفاظ اسی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں جو بعض دفعہ ماں کے دل میں اسوقت پیدا ہوتی ہے جب اس کی اولاد شرارت کرکے کسی عذاب میں مبتلا ہوتی ہے جس سے وہ ان کو بچا نہیں سکتی۔ اس وقت وہ ان کو خوب کوستی ہے۔ یہ کوسنا غصہ کا نہیں، غم اور رنج کا ہوتا ہے۔ اور اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ نہ تم ایسے کام کرتے اور نہ تم کو یہ دکھ پہنچتا۔ اور نہ تمہارے ساتھ میں دُکھ پاتی۔ محمد رسول اللہ کے ایسے ہی جذبات کی اس جگہ ترجمانی کی گئی ہے۔

محسن کے تین معنے

۱۳۶ تفسیر۔ متقی انسان وہ ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کرلے۔ اور اتنا بڑھالے کہ خدا تعالیٰ خود اس کی سپر بن جائے۔ اور اس کا محافظ ہوجائے اور محسن وہ ہے جو خود حفاظت میں آجانے کے بعد دنیا کو بھی خدا کی حفاظت میں لانے کی کوشش کرے۔ پس محسن کا درجہ متقی سے اعلیٰ ہے۔

بعض لوگ خود بہت نیک ہوتے ہیں مگر دوسروں کو بچانے کی فکر نہیں کرتے اور بعض دوسروں کی فکر تو کرتے ہیں مگر اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کامل معیت حاصل کرنے کے لئے دونوں باتیں ضروری ہیں یعنی متقی ہو اور محسن بھی۔

متقی کی تعریف

اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ متقی کے یہ معنے نہیں جسے دنیا کی ہوش ہی نہ ہو۔ قرآن میں ایسے شخص کا نام جاہل آیا ہے۔ متقی تو وہ ہوتا ہے جس کے ہر کام میں خشیت خدا نظر آرہی ہو۔ جو کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ اس میں خشیت کہاں سے پیدا ہوگی۔ متقی کا تو لفظ ہی بتاتا ہے۔ کہ وہ خطرات میں پڑتا ہے۔ مگر خدا اس کی حفاظت کرتا ہے۔ پس متقی وہ ہے، جو دنیا کے کاموں میں پڑے مگر اس کے بد اثر سے محفوظ رہے۔

محسن کے متعلق بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے معنے مسرف کے نہیں ہوتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ تو اگر اپنے وارثوں کے لئے مال چھوڑ جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں اس حالت میں چھوڑ جائے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

محسن کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ ایسے کام کرنیوالا ہو، جن سے دنیا میں حسن پیدا ہو۔ جس نے اپنا گھر ہی اجاڑ لیا۔ اس نے حسن کیا پیدا کرنا ہے۔ پس محسن وہ ہے جو اپنا گھر محفوظ رکھتا ہے۔ اور پھر دنیا کی خبر گیری کرتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے بھی نہیں کہ خود تو عیاشیوں میں پڑا ہے لیکن جب خرچ کرنے کا موقعہ آئے تو کہے کہ میرے پاس کچھ نہیں۔

اسی طرح محسن وہ ہے جس کے فعل کا نتیجہ اچھا نکلے۔ پس جس کے انفاق سے بد نتیجہ نکلے خواہ اخلاقی یا تمدنی وہ محسن نہیں ہے۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ سے جنگ کا نتیجہ بھی بتا دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا ساتھ دے گا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ جس کے ساتھ خدا ہو، اس پر کون فتح پا سکتا ہے +

سُوْرَةُ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّةٌ

سورۃ بنی اسرائیل [۱] یہ سورۃ مکی ہے

وَّمَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَةٌ وَّاثْنَتَا عَشْرَةَ اٰيَةً وَّاثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

اور بسم اللہ سمیت اسکی ایک سو بارہ آیات ہیں اور بارہ رکوع ہیں

[۱] اِس سورۃ کا **نام** بنی اسرائیل اسلئے رکھا گیا ہے کہ اسمیں وہ واقعات بیان کئے گئے ہیں جو بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے اور مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ تمہیں بھی یہ واقعات پیش آئیں گے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مثیل موسیٰ قرار دیکر مسلمانوں کو بنی اسرائیل قرار دیا گیا تھا۔ پس اس مشابہت کیوجہ سے مسلمانوں سے بھی یہود سے ملتے جلتے واقعات کا پیش آنا ضروری تھا۔ اور اسی کیطرف اِس سورت میں توجہ دلائی گئی ہے۔ اور بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو حصوں میں سے پہلے حصہ کو یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسےٰ علیہ السلام تک کے واقعات کو بیان کر کے مسلمانوں کی اس سے مشابہت بتائی گئی ہے۔ اس سورت کا دوسرا نام اسراء بھی ہے۔ کیونکہ اسے اسراء کے ذکر سے شروع کیا گیا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اسراء اس کا اہم مضمون ہے۔

یہ سورۃ بعض کے نزدیک باجماع مکی ہے (بحر محیط) مگر بعض نے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ دو سے آٹھ تک آیات مدنی ہیں۔ ابن عباسؓ اور زبیرؓ سے ابن مردویہؒ نے روایت کی ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور نہایت ابتدا میں نازل ہونیوالی سورتوں میں سے ہے یعنی بعثت کے تیسرے چوتھے سال نازل ہوئی ہے۔

بخاری میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ "قَالَ فِیْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَالْکَھْفِ وَمَرْیَمَ اِنَّھُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْاُوَلِ وَھُنَّ مِنْ تِلَادِیْ"۔ (بخاری جلد ثالث کتاب تفسیر القرآن) یعنی عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں بنی اسرائیل اور کہف اور مریم شروع میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے بھی پہلے حصہ کی ہیں اور یہ میرے پرانے مال میں سے ہیں یعنی جن سورتوں کو میں نے شروع میں یاد کیا ہے انمیں سے یہ سورتیں بھی ہیں۔

وجہ تسمیہ

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کی ساری سورۃ یا اس کا کچھ حصہ ابتدا میں نازل ہوا تھا۔ مگر یہ واضح نہیں کہ ابتدا سے انکی کیا مراد تھی۔ یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کے ذہن میں ابتدائی سالوں کی کیا تعیین تھی۔

میرے نزدیک یہ سورۃ بالکل ابتدائی سالوں کی نہیں ہے بلکہ چوتھے سال سے شروع ہوکر اس کا نزول دسویں گیارہویں سال تک جاکر ختم ہوا ہے بشرطیکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حافظہ نے غلطی نہ کی ہو۔ اگر ایسا ہو تو یہ ساری سورۃ غالباً دسویں اور گیارہویں سال میں نازل ہوئی ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ گیارہویں بارہویں سال میں نازل ہوئی ہو۔ مسیحی مفسرین قرآن نے بھی اس سورۃ کا زمانہ نزول سنہ ۶ بعد نبوت سے لیکر سنہ ۱۲ بعد نبوت بتایا ہے۔ (ویری) یہ الٰہی تصرف ہے کہ ان لوگوں کے منہ سے یہ صداقت نکلی ورنہ انکا فائدہ اسمیں تھا کہ وہ اسے بعد ہجرت بتاتے۔

یہ سورۃ مکی ہے

پہلی سورۃ سے اس سورۃ کا یہ تعلق ہے۔ کہ پہلی سورۃ میں مسلمانوں کی ترقی کی خبر دی تھی اور بتایا تھا کہ انہیں بڑی بڑی حکومتیں ملیں گی اور ساتھ ہی ہوشیار بھی کر دیا تھا کہ یہود نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی اور ترقی کے ایام میں خدا کی عبادت کو بھول گئے (اس امر کی طرف اشارہ سبت کے لفظ سے کیا گیا تھا۔ دیکھو سورۃ نحل ع ۱۶) اے مسلمانو! تم نہ بھولنا۔ بلکہ اس زمانہ میں پہلے سے زیادہ عبادت میں مشغول ہونا۔

اس سورت کا پہلی سورت سے تعلق

اِس سورۃ میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان ممالک کا بادشاہ بنا دیا جائیگا جن پر یہود کی حکومت تھی۔

اِس سورۃ کی ابتدا کو پہلی سورۃ کی انتہا سے یہ تعلق ہے

کہ پہلی سورۃ کے آخر میں یہ پیشگوئی تھی کہ اب عنقریب تمہارا مقابلہ اہل کتاب سے شروع ہوگا اور وہ بھی تم کو کفار کیطرح دکھ دیں گے لیکن ان کے مقابلہ پر بھی اسوقت تک صبر سے کام لینا جبتک کہ مجبوری نہ ہو۔ اور یاد رکھنا کہ ان کے مقابل پر اللہ تعالیٰ تم کو اسی طرح فتح دیگا جس طرح کفارِ مکہ پر فتح دینے کا وعدہ ہے۔ اب سورۃ اسراء میں اس مقابلہ کیطرف اشارہ فرمایا کہ وہ مقابلہ مدینہ میں جاکر شروع ہوگا۔ اور یہ کہ اس مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ انکے مقدس مقامات پر مسلمانوں کو قبضہ اور حکومت حاصل ہوجائے گی۔

کفار کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ اور فتح کی پیشگوئی

اس سورۃ میں خصوصیت کے ساتھ یہود کی دو تباہیوں کا ذکر فرمایا ہے کہ دو دفعہ خاص طور پر انہوں نے نافرمانی کی اور دونوں دفعہ ہی وہ خطرناک عذاب میں گرفتار ہوئے۔

یہودیوں کی دو تباہیوں کے ذکر سے مسلمانوں کی دو تباہیوں کی پیشگوئی

خلاصہ سورت

اس میں اسطرف بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں پر بھی ایسی تباہی کے دو زمانے آنے والے ہیں مگر ساتھ ہی امید بھی دلا دی کہ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اس لئے آپکا سلسلہ یہود کیطرح تباہ نہ ہوگا بلکہ ان ابتلاؤں کے بعد اور بھی شان سے چمک اٹھیگا۔

اسراء کے ذکر سے شروع کرنے کی حکمت

پہلی سورۃ میں جو بعض باتیں اشارۃً فرمائی تھیں اس سورۃ میں انکو واضح کیا گیا ہے مثلاً پہلی سورۃ میں شہد کے متعلق فرمایا تھا کہ "فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ" اور اس سے اشارہ کیا تھا کہ کلام الٰہی میں بھی شفا ہے۔ اس سورۃ میں اس مضمون کو وضاحت بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (ع ۹)

یہ سورۃ نزول میں سورۃ نحل سے پہلے ہے مگر مضمون کی ترتیب کے لحاظ سے بعد میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ اس لئے جمع قرآن کے وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے سورہ النحل کے بعد رکھا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ سورتوں کے نزول کی ترتیب اور تھی لیکن جمع قرآن کے وقت اس ترتیب کو بدلدیا گیا کیونکہ سارے قرآن کریم کو پڑھتے ہوئے اور بعد میں آنیوالوں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسری ترتیب کی ضرورت تھی۔ اور یہ امر قرآن کریم کے زبردست معجزات میں سے ہے۔ اسکی ہر سورۃ الگ الگ مضمون پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی اس کے اسکی سورتوں میں زبردست اتصال بھی پایا جاتا ہے۔ جب نزول قرآن کے وقت الگ الگ سورتیں نازل ہورہی تھیں اور اس وقت کی ضرورت کو مدنظر رکھا جاتا تھا تب بھی پڑھنے والوں کو کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی کیونکہ ہر سورۃ کا مضمون مکمل تھا مگر جب بعد میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دوسری ترتیب سے مرتب کیا تو پھر علاوہ اس مضمون کے جو الگ الگ سورتوں سے نکلتا تھا ایک اور سلسلہ مضمون پیدا ہوگیا جس نے قرآنی مضامین کو اور زیادہ وسعت دیدی۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

ترتیب نزول

وجہ تسمیہ

اسراء کے ذکر سے اسکو یہ بتانے کے لئے شروع کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰ علیہ السلام کا جانشین مقرر کیا گیا ہے۔ اس لئے ان مقامات پر بھی آپکو قبضہ دیا جائیگا جن کا حضرت موسیٰؑ اور انکے اتباع سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اور یہ بتانے کے لئے کہ موسیٰؑ کیطرح آپکو بھی ہجرت کرنی پڑے گی اور وہ ہجرت آپکی قوم کی ترقی کا موجب ہوگی۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا ذکر شروع کیا کہ کس طرح موسیٰؑ کو بھیجا اور انکی قوم کو انکے ذریعہ ترقی دی۔ کس طرح انہیں متنبہ کیا کہ ترقی کے زمانہ میں غافل نہ ہونا مگر انہوں نے اس نصیحت سے فائدہ نہ اٹھایا اور سخت سزا پائی۔ پھر فرماتا ہے کہ اس قرآن کو ہم نے تورات سے بھی زیادہ مؤثر بنایا ہے اس کے ذریعہ سے اس سے بھی بڑھ کر تبدیلی ہوگی مگر اس کے راستہ میں بھی وہی خطرہ ہے کہ جب دولت آجائیگی تو فسق و فجور بھی آجائے گا۔

دنیا کا کمانا تو بُرا نہیں مگر اس کے ساتھ خدا کا بھی خیال رکھنا چاہیئے اور نیکی کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ پھر نیکی کے اصول بتلائے ہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ منکرین قرآن جب ان اصول کو سُنتے ہیں تو بجائے غور کرنے کے اعراض اور تکبر سے کام لیتے ہیں اور اپنے انجام کا خیال نہیں کرتے۔ اگر انجام کی طرف توجہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الجزء ۱۵

پاک (ذات اور پاک صفات) ہے وہ (خدا) جو رات کیوقت اپنے بندہ کو (اس) حرمت والی مسجد سے (اس) دور والی

الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ

مسجد تک جس کے اردگرد کو (بھی) ہم نے برکت دی ہے (اس لئے) لے گیا کہ تا ہم اسے اپنے بعض نشان دکھلائیں

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○ وَ

یقیناً وہ (ہی خدا) ہے جو (اپنے بندوں کی پکار کو) خوب سننے والا (اور انکی حالتوں کو) خوب دیکھنے والا ہے ۲ اور

دلائی بھی جائے تو پروا نہیں کرتے لیکن قرآن کریم کے مخالف خواہ بیرونی ہوں یا اندرونی سخت سزا پائیں گے۔ چنانچہ قرب قیامت میں یعنی زمانہ مسیح موعود میں ایک سخت عذاب دنیا پر تکذیب قرآن کیوجہ سے نازل ہوگا اور اسوقت پھر ایک جنگ خدا کے فرشتوں اور ابلیس کے درمیان ہوگی۔ اس جنگ میں آدم کے متبعین کو غلبہ دیا جائیگا۔

لوگ چاہتے ہیں کہ تجھے تباہ کر دیں مگر ہم نے تو تیرے لئے ایک عظیم الشان مقصد تجویز کر رکھا ہے۔ ہم تیرے نام کو آخر زمانہ تک اور دنیا کے کناروں تک پھیلائیں گے اور تیری قابلیت کو دنیا پر ظاہر کیا جائیگا۔ ہم نے اس قرآن کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ابدالآباد تک کام آئیگا اور روحانی خزانے اس کے ذریعہ سے آہستگی کے ساتھ دنیا پر ظاہر کئے جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ بخیل نہیں ہے۔ پھر آخر میں آخری زمانہ کی علامت بیان فرمائی گئی ہے۔ اور اس کے شر سے بچنے کا ذریعہ دُعا کو بتایا ہے۔

۲ **حل لغات**۔ سُبْحٰنَ کے معنے کے لئے دیکھو یونس ۱۹۔

اَسْرٰى بِهٖ کے معنے ہیں۔ اسکو رات کے وقت لے گیا۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر ۵۵۔

(العبد) اَلْعَبْدُ : اَلْعُبُوْدِيَّةُ اِظْهَارُ التَّذَلُّلِ وَ الْعِبَادَةُ اَبْلَغُ مِنْهَا لِاَنَّهَا غَايَةُ التَّذَلُّلِ. عبودیت کے معنے عاجزی کے اظہار کے ہیں۔ اور لفظ عِبَادَة اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ اس کے معنے انتہائی عاجزی کرنے کے ہیں وَلَا يَسْتَحِقُّهَا اِلَّا مَنْ لَهٗ غَايَةُ الْاِفْضَالِ وَهُوَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ اور انتہائی عاجزی اسی کے سامنے کیجا سکتی ہے جس کے انعام و اکرام بہت زیادہ ہوں۔ اور ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ وَ الْعِبَادَةُ ضَرْبَانِ۔ عِبَادَةٌ بِالتَّسْخِيْرِ وَعِبَادَةٌ بِالْاِخْتِيَارِ۔ اور عبادت کی دو اقسام ہیں (۱) کسی چیز کا بلا ارادہ عبادت کرنا یعنی اسکا اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی کرنا۔ (۲) اختیاری عبادت اور یہ انسانوں کے ساتھ خاص ہے۔

(قرآن کریم ابدالآباد تک مسنے کا معجزہ)

(العبد) وَالْعَبْدُ يُقَالُ عَلٰى اَرْبَعَةِ اَضْرُبٍ۔ اور عبد کا لفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(اسریٰ) (۱) عَبْدٌ بِحُكْمِ الشَّرْعِ۔ شریعت کے رو سے غلام۔ جس کا بیچنا اور خریدنا جائز ہو۔ ان معنوں کے اعتبار

سے لفظ عبد کی جمع عَبِیْدٌ ہوگی۔ (۲) عَبْدٌ بِالْاِیْجَادِ وَ ذٰلِكَ لَيْسَ اِلَّا لِلّٰهِ۔ پیدا کئے جانے کے باعث عبد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے عَبْد کی اضافت اللہ تعالیٰ ہی کیطرف ہوگی۔ کیونکہ صرف خالق وہی ذات ہے۔ (۳) عَبْدٌ بِالْعِبَادَةِ وَالْخِدْمَةِ۔ عبادت اور خدمت کے باعث عبد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے لوگ دو حصوں میں منقسم ہو جائیں گے جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے عبادت کرنے والے ہیں۔ یعنی عَابِدٌ ان معنوں کے لحاظ سے اسکی جمع عِبَادٌ آتی ہے۔ (۴) دنیا کے غلام اور دنیا دار۔ (مفردات)

المسجد الحرام

اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ: اَلْكَعْبَةُ۔ مسجد حرام کعبہ کو کہتے ہیں۔

الاقصیٰ

اَلْاَقْصٰى۔ قصی کا اسم تفضیل ہے (قصی یقصو و قصی یقصی) اَلْمَكَانُ کے معنے ہیں۔ بَعُدَ کوئی جگہ دور ہوگئی۔ اور اَقْصٰى کے معنے ہیں اَبْعَدُ۔ بہت دور۔ اسکی جمع اَقَاصِی آتی ہے (اقرب) پس اَلْمَسْجِدُ الْاَقْصٰى کے معنے ہونگے۔ دور والی مسجد۔

تفسیر - یہ آیت اُن معرکۃ الآرا آیتوں میں سے ہے جن کے متعلق مفسرین میں بہت اختلاف رہا ہے۔ اس

آیت زیر بحث کی تفسیر میں اختلاف

آیت کے متعلق قریباً سب سابق مصنف مفسرین اور نیز اس زمانہ کے مفسر کہتے ہیں کہ اسمیں معراج کا واقعہ بیان کیا گیا ہے گو معراج کی تفاصیل میں شدید اختلاف ہے۔

یہ مسئلہ بوجہ اختلاف روایات اسقدر پیچیدہ ہوگیا ہے کہ مجھے اس کے سلجھانے کے لئے اس کے کئی حصے کرنے پڑیں گے۔ سب سے پہلے مَیں اس امر کو لیتا ہوں کہ اس آیت کے سوا قرآن کریم میں معراج کا واقعہ ایک اور جگہ

معراج کا ذکر سورۃ نجم میں

بھی بیان ہوا ہے اور وہ سورۂ نجم ہے۔ اس جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ ذُوْ مِرَّةٍ ۔ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۙ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۙ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ○ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ○ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۙ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ○ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ○ (النجم ع ۱)

یعنی قرآن کریم ایک وحی الٰہی ہے اللہ تعالیٰ نے جو بڑی طاقتوں والا ہے محمد رسول اللہ کو یہ علم سکھایا ہے۔ وہ بڑی طاقت ظاہر کرنے والا اور حکومت کرنیوالا خدا ہے۔ اور اسوقت اس نے یہ کلام نازل کیا جبکہ وہ (یعنی محمد رسول اللہ صلعم) اُفُقِ اَعْلٰى پر تھے (یعنی سب سے اعلیٰ مقام پر) محمد رسول اللہ خدا کے اور قریب ہوئے اور قریب ہوکر پھر نیچے کیطرف آئے یعنی بنی نوع انسان کے قریب ہوئے۔ حتیٰ کہ آپ دو قوسوں کے درمیان کی تروں کیطرح ہوگئے بلکہ اس سے بھی قریب۔ یعنی دو مشترک وتروں کی جگہ ایک ہی وتر ہوگیا۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ پر وحی نازل کی جو اس قرآن میں موجود ہے۔ دل نے جو کچھ دیکھا تھا اسمیں اسنے غلطی نہیں کی (بلکہ فی الواقع اس نے ایسا ہی دیکھا تھا) کیا تم لوگ اس بارہ میں اس سے جھگڑتے ہو جو اس نے دیکھا۔ حالانکہ اس نے یہ بات ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دفعہ دیکھی ہے۔ اور اس نظارہ کا مقام سِدرۃُ المنتہیٰ ہے۔ اِس سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہی جنت کا مقام ہے۔ اس نے اس وقت اس نظارہ کو دیکھا تھا جبکہ سدرہ کو ایک عجیب پُرشوکت جلوہ نے ڈھانک لیا تھا نظر نے بھی اس وقت غلطی نہیں کی نہ کوئی بات کم دیکھی اور نہ زیادہ (بلکہ جو کچھ دیکھا ٹھیک دیکھا) اس وقت (محمد رسول اللہ صلعم نے) اس (یعنی اللہ تعالیٰ) کی بہت بڑی آیات دیکھیں۔

یہ آیات معراج کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان آیات میں جن امور کا ذکر ہے وہ سب معراج سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً (۱) سِدرۃُ المنتہیٰ تک آپ کا جانا۔ (۲) اسوقت سدرۃ المنتہیٰ پر کسی چیز کا نازل ہونا۔ (۳) اس کے پاس جنت کا دیکھنا۔ (۴) قاب قوسین کی حالت کا پیدا ہونا۔ (۵) اللہ تعالیٰ کا دیکھنا۔ (۶) کلام الٰہی

کا ہاں نازل ہونا یہ سب امور وہ ہیں کہ جن کا ذکر معراج کی حدیثوں میں آتا ہے۔ چنانچہ سِدرۃ المنتہیٰ کا معراج میں دیکھنا حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت میں آتا ہے جسے ابن جریر۔ ابن ابی حاتم ابن مردویہ۔ البزار۔ ابویعلیٰ اور بیہقی جیسے جامعین حدیث نے اپنی اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔ اس کے یہ الفاظ ہیں کہ ثُمَّ انْتَهٰى اِلَى السِّدْرَةِ۔ پھر آپ معراج کی رات آسمان پر جانے اور انبیاء سے ملنے کے بعد آگے بڑھے۔ تو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے (الخصائص الکبریٰ جلد اول ص۱۶۴)

اسی طرح ابن جریر۔ ابن المنذر۔ ابن ابی حاتم۔ ابن مردویہ۔ البیہقی اور ابن عساکر نے ابوسعید خدری رضؓ سے معراج کے بارہ میں روایت کی ہے۔ اسمیں بھی آسمان پر جانے اور نبیوں سے ملنے کے بعد سدرۃ المنتہیٰ تک جانیکا ذکر ہے۔ (خصائص الکبریٰ جلد اول ص۱۶۷)

اسی طرح مسند احمد بن حنبل۔ بخاری۔ مسلم اور ابن جریر میں مالک ابن صعصعہ کی روایت معراج کے متعلق درج ہے۔ اس میں بھی لکھا ہے کہ ثُمَّ رُفِعْتُ اِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى۔ یعنی نبیوں سے مختلف آسمانوں پر ملنے کے بعد مجھے اٹھا کر سدرۃ المنتہیٰ تک لیجایا گیا (خصائص الکبریٰ جلد اول ص۱۶۵)

نیز بخاری نے انس رضؓ سے روایت کی ہے اسمیں بھی آسمان پر جانے اور نبیوں سے ملاقات کے بعد سدرۃ المنتہیٰ تک جانیکا ذکر ہے۔ (بخاری جلد دوم کتاب بدء الخلق باب المعراج - نیز الخصائص الکبریٰ جلد اول ص۱۵۳)

دوسرا امر آیات قرآنیہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے ہیں اسوقت اسے کسی چیز نے ڈھانپا ہے۔ جیسے کہ الفاظ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝ (النجم ۱۷) سے ظاہر ہے۔ اس کا ذکر بھی احادیث معراج میں آتا ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے بیان ہوا ہے کہ جب آپؐ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو فَغَشِيَهَا نُوْرُ الْخَلَّاقِ عَزَّ وَجَلَّ (الخصائص الکبریٰ جلد اول ص۱۶۴) یعنی اس وقت اللہ تعالےٰ کے نور نے سدرۃ کو ڈھانپ لیا۔ نیز مسلم نے انس رضؓ سے جو معراج کے متعلق روایت کی ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔ فَلَمَّا غَشِيَهَا مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ مَا غَشِيَ تَغَيَّرَتْ فَمَا اَحَدٌ مِنْ خَلْقِ اللّٰهِ يَسْتَطِيْعُ اَنْ يَنْعَتَهَا مِنْ حُسْنِهَا۔ یعنی جب آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو اللہ تعالےٰ کے ایک خاص فضل نے سدرہ کو ڈھانپ لیا اور اسمیں ایسا تغیر ہوا کہ کوئی شخص اس کے حسن کی تعریف نہیں کرسکتا (کتاب الایمان)

سورۂ نجم میں بیان شدہ امور معراج کے متعلق ہیں۔

تیسری بات آیاتِ قرآنیہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ سدرہ کے پاس جنت بھی آپ نے دیکھی۔ اس کا ذکر بھی معراج کی احادیث میں آتا ہے۔ چنانچہ نبیوں کی ملاقات کے بعد آتا ہے کہ ثُمَّ اِنِّيْ رُفِعْتُ اِلَى الْجَنَّةِ پھر مجھے جنت تک لیجایا گیا۔ اور پھر اس کے بعد ہے کہ ثُمَّ اِنِّيْ رُفِعْتُ اِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى یعنی جنت کے بعد مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک لیجایا گیا۔ یہ روایت ابوسعید خدری رضؓ کی ہے اور ابن جریر نے نقل کی ہے (ابن جریر جلد ۱۵ ص۱۱) اور انکے علاوہ اور کتب حدیث میں بھی آتی ہے۔

سورۂ نجم میں چوتھی بات یہ بیان کی ہے کہ ان نظاروں کے وقت میں ایک حالت پیدا ہوئی جس کا نام فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى رکھا گیا ہے۔ معراج کی روایات میں اس کا ذکر بھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید رضؓ کی مذکورہ بالا روایت میں سدرۃ المنتہیٰ کے ذکر کے بعد یہ الفاظ ہیں کہ فَكَانَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى یعنی میرے اور اس کے درمیان صرف قاب قوسین یا اس سے بھی کم فرق رہ گیا۔ (میں اس جگہ احادیث کے الفاظ کی تشریح نہیں کرتا کہ اسکا کیا مطلب ہے، صرف یہ بتاتا ہوں کہ حدیث معراج میں وہی حالات بیان ہوئے ہیں جو سورۂ نجم میں آئے ہیں)۔

معراج میں قاب قوسین کا مقام

پانچویں بات سورۂ نجم کی آیات میں یہ بتائی گئی ہے۔ کہ اس موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ کو دیکھا۔ جیسا کہ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى میں اشارہ

معراج میں رویت باری تعالےٰ

کیا گیا ہے۔ معراج کی احادیث میں بھی یہ امر کئی روایات میں بیان ہوا ہے چنانچہ ایک روایت حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی ابن مردویہ نے نقل کی ہے۔ اس میں آتا ہے کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر فرما رہے تھے کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ آپ نے وہاں کیا دیکھا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔ میں نے وہاں کچھ دیکھا۔ حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں آپکی مراد یہ تھی کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ (خصائص جلد اول صفحہ۱۷۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایت مسلم نے نقل کی ہے اس میں اوپر والی آیت کا ذکر کر کے بیان کیا ہے کہ رَاٰہُ بِفُؤَادِہٖ مَرَّتَیْنِ رسول کریم صلعم نے اپنے دل کی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کو دو دفعہ دیکھا۔ (مسلم جلد اوّل۔ کتاب الایمان باب معنے وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی)

تاریخ نزول سورۂ نجم

سورۂ نجم کا تعلق ہجرت سے

چھٹی بات سورۂ نجم کی آیات میں یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم سے کلام کیا۔ جیسا کہ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَاۤ اَوْحٰی کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ معراج کی احادیث میں اس امر کا بھی ذکر آتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث جو اوپر لکھی جا چکی ہے اس میں ذکر ہے کہ جب آپ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس پہنچے تو فَکَلَّمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عِنْدَ ذٰلِکَ۔ اللہ تعالیٰ نے سدرۃ کے پاس آپ سے کلام کیا۔ (خصائص جلد اوّل صفحہ۱۷۱) اسی طرح ابن ابی حاتم نے انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے۔ اور اسمیں بھی یہ الفاظ ہیں کہ جب میں اس سدرہ کے پاس پہنچا تو قَالَ اللّٰہُ لِیْ یَا مُحَمَّدُ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کلام کیا اور فرمایا کہ اے محمدؐ! (آگے لمبی بات بیان ہے)۔ (خصائص جلد اول صفحہ۱۵۵)۔

شب معراج آنحضرت صلعم کا اللہ تعالیٰ سے کلام

مذکورہ بالا مشابہتوں سے جو سورۂ نجم کی آیات اور واقعہ معراج میں پائی جاتی ہیں یہ امر قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ سورۂ نجم میں معراج ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

تلاوت سورۂ نجم اور سجدۂ کفار کی حقیقت

یہ ثابت کرنے کے بعد کہ سورۂ نجم میں رویت اور کلام اور سدرۃ المنتہیٰ کے دیکھنے کا ذکر ہے وہ معراج کا ہی واقعہ ہے۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سورہ نجم بالاتفاق ۵؁ بعد نبوت میں یا اس سے پہلے نازل ہوئی ہے اور اس کے نزول کے ساتھ ایک ایسے عظیم الشان واقعہ کا تعلق ہے کہ اس کے نزول کے متعلق کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ واقعہ یوں ہے۔

۵؁ بعد نبوت میں رجب کے مہینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ مکہ میں ظلم انتہا کو پہنچ گیا ہے اور مغرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرف ایک ملک ہے جس میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا تم وہاں چلے جاؤ آپ کے حکم پر بعض لوگ مذکورہ بالا مہینہ اور مذکورہ بالا سال میں مکہ سے حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انہیں آپکے داماد حضرت عثمانؓ اور آپکی صاحبزادی رقیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ (زرقانی شرح مواہب جلد اول صفحہ۱۷۰ و صفحہ۱۷۱)۔

کفار کو جب ان لوگوں کی ہجرت کا علم ہوا تو انہوں نے ان کا پیچھا کیا لیکن وہ انکو پکڑ نہ سکے اور ان کے پہنچنے سے پہلے یہ لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر حبشہ کو روانہ ہو گئے۔ اور وہاں امن سے رہنے لگے۔ کفار کو جب یہ خبر ملی تو انہوں نے عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو وفد بنا کر نجاشی کے پاس بھیجا کہ وہ انکو لوٹا دے مگر اس نے انکی بات نہ مانی اور یہ وفد ناکام لوٹا۔ اس وفد کی واپسی کے بعد ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کفار مکہ آئے اور قرآن کریم سنانے کے لئے کہا۔ آپ نے سورۂ نجم پڑھ کر انہیں سنائی۔ اسمیں سجدہ آتا ہے۔ آپ نے اسپر سجدہ کیا اور سب کفار نے بھی ساتھ ہی سجدہ کیا اور مشہور ہو گیا کہ مکے کے سب لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ یا کم سے کم بڑے بڑے عمائدین مسلمان ہو گئے ہیں۔ کفار نے بعد میں یہ توجیہ کی کہ اس سورۃ کو پڑھتے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے معبودوں کی بھی تعریف کی تھی۔ اس لئے انہوں نے سجدہ کیا تھا۔ مسلمان کہتے ہیں کہ شیطان نے

اس وقت یہ کلمات بلند آواز سے کہدیے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کہے۔ (میری تحقیق یہ ہے۔ کہ کفار نے مسلمانوں کے واپس لانے کی کوشش میں ناکام ہوکر حبشہ میں یہ جھوٹی خبر پہنچادی کہ مکہ کے لوگ مسلمان ہوگئے ہیں تاکہ مسلمان خود واپس آجائیں۔ جب بعض مسلمان واپس آگئے تو اس خوف سے کہ مکہ کے قریب پہنچکر جب ان کو اس خبر کا جھوٹ ہونا معلوم ہوگا وہ واپس چلے جائیں گے۔ انہوں نے یہ تدبیر کی کہ آپکی مجلس میں آکر قرآن سننے کی خواہش کی اور سجدہ کیا۔ تاکہ لوگوں میں یہ خبر مشہور ہوجائے اور مسلمان واپس نہ لوٹیں۔ اور جب یہ فائدہ اٹھا لیا تو بعد میں اپنے اتباع کے سامنے شرمندگی سے بچنے کے لئے یہ جھوٹ بولا کہ چونکہ رسول کریم صلعم نے مشرکانہ کلمات کہدئے تھے اس لئے ہم نے سجدہ کیا تھا۔ بہرحال اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ یہ مضمون سورۃ حج اور سورۃ نجم میں انشاء اللہ بیان کیا جائیگا۔) بہرحال پہلی ہجرت پر ابھی تین ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ بعض مسلمان مکہ کے لوگوں کے مسلمان ہونے کی خبر سنکر حبشہ سے مکہ واپس آگئے۔ اس واقعہ سے جو تمام کتب تاریخ اور احادیث میں مذکور ہے۔ ثابت ہے کہ سورۂ نجم شوال ۵ سنہ بعد نبوت سے یقیناً پہلے نازل ہوچکی تھی اور اسمیں چونکہ معراج کا واقعہ درج ہے اسلئے معراج کا واقعہ بھی یقیناً شوال ۵ سنہ بعد نبوت سے پہلے ہوچکا تھا۔

معراج کے واقعہ کی تاریخ بتانے کے بعد اب میں اس واقعہ کو لیتا ہوں جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ اور جس کے متعلق میں یہ نوٹ لکھ رہا ہوں۔ اس واقعہ کی نسبت زرقانی شرح مواہب میں لکھا ہے کہ ۱۱ سنہ بعد نبوت ربیع الاول یا ربیع الثانی یا رجب یا شعبان میں ہوا ہے (زرقانی جلد اول صہ ۳۰۹)

مسیحی مؤرخین نے اسے بارہویں سال بعد نبوت میں تسلیم کیا ہے۔ (میور لائف آف محمد صہ ۱۲۱)۔

احادیث میں اس کے متعلق جو روایات آتی ہیں وہ بھی اس زمانہ کی تصدیق کرتی ہیں۔ چنانچہ ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ قَالَ اُسْرِیَ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃَ سَبْعَۃَ عَشَرَ مِنْ شَھْرِ رَبِیْعِ الْاَوَّلِ قَبْلَ الْھِجْرَۃِ بِسَنَۃٍ۔ (خصائص جلد اول صہ ۱۶۲)۔ یعنی عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسراء کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے سترہ ربیع الاول کو پیش آیا۔ اسی طرح بیہقی نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ مدینہ تشریف لیجانے سے ایک سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ نیز بیہقی نے سدی سے روایت کی ہے کہ ہجرت سے کوئی چھ ماہ پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ (دونوں روایتیں خصائص جلد اول کے صفحہ ۱۶۲ پر مذکور ہیں۔) نیز ابن سعد نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ یہ واقعہ ایک سال ہجرت سے پہلے سترہ ربیع الاول کو پیش آیا تھا۔

ان سب روایات سے یہ امر یقین کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اسراء کا واقعہ ہجرت سے چھ ماہ یا ایک سال پہلے گزرا ہے

اس کے علاوہ اور ثبوت بھی اس امر کی تائید میں ہیں کہ یہ واقعہ شعب ابی طالب سے نکلنے کے بعد کا ہے اور شعب ابی طالب میں آپؐ اور آپکے ساتھی ساتویں سال بعد نبوت میں داخل ہوئے تھے اور دسویں سال میں وہاں سے نکلے تھے۔ اور وہ ثبوت یہ ہے کہ حدیث اسراء کے متعلق ایک ہی موقعہ کا گواہ ہے۔ اور وہ امّ ہانیؓ آپکی چچازاد بہن ہیں جو ابو طالب کی بیٹی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں۔ کہ جس رات یہ واقعہ ہوا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے۔ اور بہت سے صحابہؓ نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ آپ اس رات امّ ہانی کے مکان پر تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ

زمانہ واقعہ معراج

اسراء اور معراج دو مختلف وقتوں میں ہوئے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی یا ابو طالب کی زندگی میں آپ ام ہانی کے گھر نہیں رہ سکتے تھے۔ پس ام ہانی کے گھر میں آپ کا ان ایام میں رہنا بھی بتاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت خدیجہ اور ابو طالب کی وفات کے بعد کا ہے۔ اور ان دونوں کی وفات بھی سنہ ۱۰ بعد نبوت میں ہوئی ہے پس اس شہادت سے بھی یہی استنباط ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گیارہویں بارہویں سال بعد نبوت کا ہے۔

خلاصہ یہ کہ تاریخ، احادیث اور عقلی استدلال سب اس امر کی تائید میں ہیں کہ اسراء کا واقعہ گیارہویں بارہویں سال بعد نبوت کا ہے۔ اور پہلے میں یہ ثابت کرچکا ہوں کہ معراج کا واقعہ پانچویں سال بعد نبوت سے پہلے کا ہے پس جب ان دونوں واقعات کی تاریخوں میں چھ سات سال کا فرق ہے تو انہیں ایک واقعہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ اور حق یہی ہے کہ معراج کا واقعہ اور ہے اور بیت المقدس کیطرف جانیکا واقعہ بالکل اور ہے۔

واقعہ معراج نبوت کے پانچویں سال کا ہے اور اسراء گیارہویں کا ۔[1]

علاوہ تاریخی شواہد کے ایک اور امر بھی میرے اس استدلال کی تائید میں ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیث معراج سے ثابت ہے کہ پانچ نمازوں کی فرضیت معراج کے واقعہ میں ہوئی ہے۔ اب اگر ان دونوں واقعات کو ایک سمجھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ پانچوں نمازیں گیارہویں بارہویں سال بعد نبوت میں فرض ہوئی ہیں جو بالبداہت غلط ہے۔ پانچوں نمازوں کے فرض ہونے کا زمانہ شروع زمانہ نبوی سے ثابت ہے اور سب مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے۔ پس اس امر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ معراج نبوی نبوت کے ابتدائی ایام میں ہوا ہے جبکہ اسراء کا واقعہ گیارہویں بارہویں سال میں ہوا ہے۔

معراج اور اسراء کے الگ الگ ہونے کا ایک ثبوت ۔[2]

معراج اور اسراء دو الگ الگ واقعات ہیں ۔[3]

بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ قرآن کریم میں جو دو معراجوں کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کا ذکر اس امر کے بتانے کے لئے کیا گیا ہے کہ سورۂ نجم میں جس معراج کا ذکر ہے وہ دوسرا معراج ہے۔ ورنہ ایک معراج نبوت کے ملنے کے وقت یا اس کے ساتھ ہی ہوا تھا اور نمازیں اس میں فرض ہوگئی تھیں۔ چنانچہ بخاری نے انس رض سے روایت کیا ہے اور ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں اس روایت کو بیان کیا ہے کہ جَآءَهٗ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ قَبْلَ اَنْ يُّوْحٰۤى اِلَيْهِ۔ الخ۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تین فرشتے آئے۔ (بخاری جلد ۴ کتاب التوحید۔ باب کلّم اللہ موسیٰ تکلیماً۔ و ابن جریر جلد ۱۵ ص۲) اور یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔ آگے وہی معراج کا واقعہ مذکور ہے۔ اور اس میں بیت المقدس کیطرف جانے کا ذکر نہیں بلکہ سیدھا آسمان پر جانیکا ذکر ہے۔ اور آخر میں نمازوں کے فرض ہونیکا ذکر ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج کا واقعہ کم سے کم ایک دفعہ نبوت کے ملنے سے عین پہلے یا عین اس وقت ہوا ہے۔ اور یہی بات درست ہے۔ کیونکہ نمازیں فرض شروع اسلام سے ہیں اور ایک سال بھی نبوت کے بعد ایسا نہیں گذرا جس میں نمازیں فرض نہوں (اکثر محققین اس طرف گئے ہیں کہ نبوت سے پہلے کا نہیں اسوقت کا ہے۔ راوی کو زمانہ کے قرب کیوجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور میرے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔ کیونکہ نبوت سے پہلے نمازوں کا فرض ہونا عقل کے خلاف ہے)

خلاصہ یہ کہ معراج اور اسراء دو الگ الگ واقعات ہیں اور جیسا کہ سورۂ نجم کی آیات سے ظاہر ہے معراج دو ہیں۔ اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک معراج نبوت کے ابتدائی ایام میں ہوا ہے۔ بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ اسی معراج میں شرعی نبوت کی بنیاد پڑی ہے اور نمازیں فرض کی گئی ہیں۔ اور دوسرا معراج ۵ سنہ بعد نبوت میں ہوا ہے۔ یا یہ کہ وہ بھی اس سے پہلے ہو چکا تھا صرف اسکا ذکر سورۂ نجم میں کیا گیا ہے۔ اور اسراء

کا واقعہ بالکل جدا ہے اور گیارہویں بارہویں سال بعد نبوت ظہور میں آیا ہے جبکہ حضرت خدیجہؓ فوت ہو چکی تھیں اور آپ ام ہانی کے مکان میں رہتے تھے جیسا کہ متواتر احادیث اور روایاتِ تاریخیہ سے ثابت ہے۔

تاریخی شہادت کے درج کرنے کے بعد اب میں واقعاتی شواہد سے ثابت کرتا ہوں کہ یہ دونو واقعات الگ الگ ہیں :-

(۱) پہلی گواہی اس بارہ میں خود قرآن کریم کی ہے۔ قرآن کریم میں سورۂ نجم میں معراج کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے اور اسمیں کوئی ذکر بیت المقدس کیطرف جانیکا نہیں۔ اس کے مقابل پر سورۂ اسرائیل میں بیت المقدس تک جانیکا ذکر ہے اور آسمان پر جانے کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونو واقعات الگ الگ ہیں۔ اس لئے انکے اکٹھا بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ورنہ یہ نہایت قابلِ تعجب امر ہے کہ ایک ہی واقعہ کا آخری حصہ تو چھ سال پہلے قرآن کریم میں بیان کیا گیا۔ اور اسکا پہلا حصہ چھ سال بعد بیان کیا گیا۔

(۲) دوسرا گواہ واقعات میں سے ان دونوں امور کے الگ الگ ہونے کا یہ ہے کہ اس واقعہ کا موقعہ کا گواہ صرف ایک ہے اور وہ ام ہانی ہیں۔ آپ اس رات جب یہ واقعہ پیش آیا ہے ام ہانی کے ہاں ہی سوئے تھے۔ وہ فرماتی ہیں کہ سب سے پہلے مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراء الیٰ بیت المقدس کا واقعہ سُنایا تھا اور صبح کے وقت دوسرے لوگوں سے ذکر کرنے سے پہلے سُنایا تھا۔ اور میں نے اس خیال سے کہ لوگ اس واقعہ کے عجیب ہونے کے سبب اس کا انکار کریں گے اور مخالفت میں ترقی کر جائیں گے آپکو لوگوں کے سامنے اسکے بیان کرنے سے باز رکھنے کی بھی کوشش کی تھی مگر آپ نے میری یہ بات نہ مانی۔ یہ گواہ جو موقعہ کا گواہ ہے اور جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے یہ واقعہ بیان کیا ہے اس سے کم سے کم سات محدثین نے اپنی اپنی کتب میں اس واقعہ کے متعلق روایت کی ہے۔ اور چار مختلف راویوں کے ذریعہ روایت نقل کی ہے۔ مگر ان چاروں روایتوں میں صرف اتنا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بیت المقدس تک جاکر راتوں رات واپس آگیا ہوں۔ اگر آپ آسمان پر جانے کا ذکر بھی اس وقت فرماتے تو ام ہانی جو سب سے پہلی گواہ ہیں وہ کسی نہ کسی موقعہ پر تو بیت المقدس سے آسمان پر جانے کا ذکر کرتیں۔ مگر وہ جب ذکر کرتی ہیں اور جس کے پاس ذکر کرتی ہیں یہی کہتی ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بیت المقدس تک جاکر واپس آیا ہوں اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ بیت المقدس تک جانیکا واقعہ اَور ہے اور معراج الی السماء کا واقعہ اور ہے۔

واقعاتی شواہد کہ معراج اور اسراء الگ الگ واقعات ہیں۔

(۳) تیسری شہادت واقعات سے یہ ہے کہ وہ راوی جنہوں نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے انمیں سے بعض تو وہ ہیں کہ جنہوں نے سیدھا آسمان پر جانیکا ذکر کیا ہے بیت المقدس تک جانیکا ذکر نہیں کیا۔ اور بعض وہ ہیں کہ جنہوں نے بیت المقدس تک جاکر پھر آسمان پر جانیکا ذکر کیا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ جنہوں نے بیت المقدس تک جانیکا ذکر کیا ہے آگے آسمان تک جانیکا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے صاف کہا ہے کہ آپ بیت المقدس سے فارغ ہوکر مکہ واپس تشریف لے آئے

شبِ اسراء آنحضرت ام ہانی کے گھر تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ جنہوں نے سیدھا آسمان پر جانے کا ذکر کیا ہے انکی شہادت بھی یہی ہے کہ معراج کا واقعہ ایک الگ واقعہ ہے۔ کیونکہ اگر آپ گھر سے سیدھے آسمان کیطرف لیجائے گئے تھے تو بیت المقدس رستہ میں پڑ ہی نہیں سکتا۔ یہ راوی انس۔ مالک بن صعصعہ اور ابو ذر ہیں۔ ابو ذر اُن صحابہ میں سے تھا۔ جو

ابتدائی ایام میں اسلام لائے تھے اور اس واقعہ کے
شروع کے سننے والوں میں سے تھے۔

اسی طرح جنہوں نے بیت المقدس تک ہی جانیکا ذکر
کیا ہے آگے آسمان پر جانے کا ذکر نہیں کیا۔ انکی شہادت سے
بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کیطرف جب اسرأ
ہوا ہے اسوقت آنحضرت صلعم آسمان پر تشریف نہیں لیگئے
ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اسرا کا واقعہ تو وہ لوگ بیان
کرتے لیکن اس کے اہم ترین جزو کو یعنے آسمان پر جانے
اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے اور اس کا دیدار کرنے
کے حصہ کو چھوڑ دیتے۔ اس قسم کی روایت کرنیوالے
انس رض اور عبداللہ بن مسعود رض ہیں۔ اور عبداللہ بن
مسعودؓ بھی ان صحابہ میں سے ہیں جو شروع میں اسلام
لائے اور ہر وقت آپکے ساتھ رہے۔

۱ شب اسرا میں آنحضرت صرف بیت المقدس تک گئے

تیسری قسم کی روایتیں جن سے صاف معلوم ہوتا
ہے کہ آپ صرف بیت المقدس تک گئے اور پھر واپس
تشریف لے آئے۔ وہ تو ظاہر ہی ہے کہ اس امر کی بیّن
دلیل ہیں کہ بیت المقدس کے اسرا کے ساتھ آسمان کا معراج
نہیں ہوا۔ بلکہ اس بار آپ صرف بیت المقدس تک
لیجائے گئے تھے۔ ان احادیث کے راوی عبداللہ بن مسعود رض
ابن عباس رض۔ شداد بن اوس رض۔ ام ہانی رض۔ حضرت عائشہ رض
اور حضرت ام سلمہ رض ہیں انمیں سے عبداللہ بن مسعود کا
ذکر میں نے اوپر کر دیا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ حضرت عباس کے
لڑکے ہیں جو آنحضرت صلعم کے چچا تھے۔ اور بوجہ اس
کے کہ یہ واقعہ گھر میں پیش آیا تھا انکو اس کے صحیح حالات
جاننے کا سب سے بہتر موقعہ تھا۔ حضرت عائشہ رض اور ام سلمہ رض
آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات میں سے ہیں اور اس
واقعہ کی بہترین شاہد ہو سکتی ہیں۔ پھر ام ہانی رض ہیں جن
کے گھر میں یہ واقعہ گذرا۔ اور جن کے سامنے سب سے پہلے
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا ذکر کیا۔
اس بارہ میں سب راویوں کی روایات درج کرنا تو

۱ وہ روایات جن سے ثابت ہے کہ آپ صرف بیت المقدس تک گئے

مشکل ہے بعض روایات بیان کر دیتا ہوں۔ حضرت ام
ہانی رض کہتی ہیں کہ اسرا کی صبح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے مجھ سے فرمایا۔ ام ہانی میں نے عشا کی نماز تم لوگوں کے
ساتھ پڑھی۔ پھر میں بیت المقدس گیا اور وہاں نماز
پڑھی۔ اور پھر اب تم لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ رہا
ہوں۔

حضرت عائشہ رض کی روایت یہ ہے کہ جب اسراء کا
واقعہ ہوا۔ لوگ دوڑے دوڑے حضرت ابوبکر رض کے
پاس آئے اور ان سے کہا کہ آپکو معلوم ہے آپ کا دوست
کیا کہتا ہے۔ انہوں نے کہا کیا کہتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا
کہ وہ کہتا ہے کہ میں رات بیت المقدس تک ہو کر آیا ہوں
اگر معراج کا ذکر ساتھ ہی آپؐ نے کیا ہوتا تو کفار اس حصہ
پر زیادہ شور کرتے۔ مگر انہوں نے صرف یہ کہا کہ آنحضرت
صلعم فرماتے ہیں کہ میں رات کو بیت المقدس تک گیا تھا۔
پھر جب حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلعم کی تصدیق کی۔
تو لوگوں نے کہا۔ کیا آپ اس خلاف عقل بات کو بھی مان
لیں گے۔ تو حضرت ابوبکر رض نے کہا کہ میں تو اسکی یہ بات
بھی مان لیتا ہوں کہ صبح و شام اس پر آسمان سے کلام
اترتا ہے۔ اس جواب سے بھی صاف ظاہر ہے کہ اس
واقعہ کے ساتھ آسمان پر جانیکا کوئی ذکر نہ تھا۔ ورنہ آسمان
پر خود آنے جانے سے کلام کا آنا جانا کسی صورت میں بھی
زیادہ عجیب نہیں کہلا سکتا۔ اور اس صورت میں حضرت
ابوبکر رض کبھی بھی وہ دلیل نہ دے سکتے تھے جو انہوں
نے دی۔ اور نہ اس جواب کو سنکر معترض خاموش
ہو سکتے تھے۔ وہ ضرور جواب دیتے کہ تمہارے آقا تو خود
آسمان پر جانے کا دعویٰ کر رہے ہیں اور تم آسمان سے
الہام آنے کا اس خبر سے مقابلہ کر رہے ہو۔ مگر انہوں نے
بھی آگے سے ایسا نہیں کہا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ
اسوقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف بیت المقدس
تک جانیکا ذکر کیا تھا۔ آسمان پر جانیکا اس واقعہ کیساتھ

کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں بیت المقدس میں انبیاء کو نماز پڑھانے کے ذکر کے بعد یہ الفاظ ہیں ثُمَّ انْصَرَفْنَا فَاَقْبَلْنَا۔ پھر ہم وہاں سے آگئے۔ اور مکہ کی طرف چل پڑے۔ (خصائص صفحہ ١٦٢ جلد اوّل)

چوتھا شاہد واقعات سے اس امر کا کہ واقعۂ اسرار الگ واقعہ ہے یہ ہے کہ بعض روایتوں میں جنمیں بیت المقدس جانے کے بعد آسمان پر جانیکا ذکر کیا گیا ہے وہاں سے واپسی کے وقت بھی بیت المقدس میں اترنے کا ذکر آتا ہے اور وہاں سے پھر مکہ واپس آنے کا ذکر ہے۔ (اَخْرَجَہٗ ابن ابی حاتم عن انس منقول از خصائص الکبریٰ۔ جلد اول صفحہ ١٥٤)۔

اب ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ بیت المقدس ہوتے ہوئے آسمان پر جانا تو عقل میں آ بھی سکتا تھا کیونکہ اسمیں یہ مفید غرض تھی کہ آپ اس مقام پر نماز پڑھ لیں جہاں نبیوں کی ایک بڑی جماعت نے خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا تھا مگر جب آپ اس سے فارغ ہوگئے اور آسمان پر تشریف لے گئے تو پھر وہاں سے واپسی کیوں بیت المقدس کو ہوئی اور کیوں بیت المقدس لاکر آپکو واپس مکہ پہنچایا گیا۔ اگر واپسی کے وقت بھی کوئی ایسا کام بتایا جاتا جو آپنے بیت المقدس میں کیا تب تو بات سمجھ میں آ سکتی تھی کہ وہ کام رہ گیا تھا۔ اس لئے آپ کو پھر بیت المقدس لایا گیا لیکن کسی ایک روایت میں بھی آسمان سے واپسی پر بیت المقدس میں آپ کے کسی کام کے کرنیکا ذکر موجود نہیں۔ پھر اس تکلیف دہی کی غرض کیا تھی۔ اگر تو یہ تسلیم کیا جائے کہ آسمان کو راستہ ہی بیت المقدس سے جاتا ہے اور وہاں کوئی سیڑھی لگی ہوئی ہے تب تو یہ سمجھ میں آ سکتا تھا کہ مجبورًا آپکو وہاں اتارنا پڑا لیکن اگر یہ بات نہیں ہے اور ہر مسلمان کا عقیدہ یہی ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ آسمان کیطرف صعود سیڑھیوں کا محتاج نہیں ہے تو پھر واپسی کے وقت بغیر کام کے بیت المقدس میں آپکو اتارنا اور پھر مکہ کیطرف لانا بالکل خلاف عقل ہے۔ میرے نزدیک اس کی ایک ہی تاویل ہو سکتی ہے کہ حضرت انسؓ نے معراج کا اور اسرار الیٰ بیت المقدس کا واقعہ سنایا ہو راویوں میں سے کسی راوی کے ذہن میں دونوں مضمونوں کا خلط ہو کر ایک واقعہ بن گیا۔ ادھر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اسرار کی روایت میں حضرتؓ نے بیت المقدس جانے کا بھی اور وہاں سے آنے کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس وجہ سے اس نے مجبورًا یہ سمجھا کہ معراج میں آسمان سے واپسی کے وقت آپ بیت المقدس ہی میں اُترے تھے اور وہاں سے پھر مکہ تشریف لے گئے تھے۔

ٹ اسراء اور معراج کے واقعات میں خلط اور اس کی وجہ

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسقدر خلط ہوا کیونکر؟ اسکا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں خواہ آسمان پر جانے کا ذکر ہو یا زمین پر سفر کرنے کا اگر رات کو کوئی سفر ہو تو اسے اسرار کہیں گے۔ اسوجہ سے معراج کے متعلق بھی اسرار کا لفظ بولا جاتا تھا اور بیت المقدس کیطرف جانیکے واقعہ کے متعلق بھی اسرار کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ یہ دونوں واقعات رات کے وقت ہوئے تھے۔ اب ادھر دونوں کے لئے اسرار کا لفظ بولا جاتا تھا اور ادھر ان دونوں نظاروں کی کئی باتیں آپس میں ملتی جلتی تھیں مثلاً یہی کہ اسمیں بھی براق کا ذکر آتا ہے اور اسمیں بھی۔ اسرار بیت المقدس میں بھی انبیاء سے ملنے کا ذکر آتا ہے اور معراج میں بھی۔ اسرار بیت المقدس میں بھی نماز پڑھنے کا ذکر آتا ہے اور معراج میں بھی۔ اسرار کی بعض روایتوں میں بھی دوزخ جنت کے بعض نظارے دیکھنے کا ذکر آتا ہے اور معراج کے واقعہ میں بھی۔ غرض نام اور کام کی تفصیلات میں ایک حد تک اشتراک پایا جاتا تھا اور روحانی عالم کے عجیب و غریب نظاروں کا ذکر تھا۔ اس لئے بعض راویوں کے ذہنوں میں خلط ہوگیا اور انہوں نے دونوں واقعات کو ایک ہی سمجھ کر ملا کر بیان کرنا شروع کر دیا۔ لیکن جن کا حافظہ زیادہ مضبوط تھا انہوں نے

ٹ آسمان سے واپسی پر بیت المقدس ہو کر آنا خلاف عقل ہے۔

اگر معراج کا واقعہ صحابی سے سُنا تھا تو روایت شروع ہی اس طرح کی کہ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے اٹھا کر آسمان کیطرف لیجایا گیا۔ اور اگر انہوں نے صحابی سے اسرا ء بیت المقدس کا واقعہ سنا تھا تو انہوں نے بیت المقدس تک کا واقعہ بیان کیا۔ آگے آسمان پر جانے کا ذکر نہیں کیا۔

معراج اور اسراء دونوں کو صحابہ اسراء کے نام سے پکارتے تھے۔

اِس کا ثبوت کہ دونوں واقعات کو صحابہ میں اسراء کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ احادیث سے مل جاتا ہے۔ مسند احمدؒ بن حنبل۔ بخاری مسلم اور ابن جریر میں مالک بن صعصعہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ اَنَّ نبی اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَدَّثَھُمْ عَنْ لَیْلَۃِ اُسْرِیَ بِہٖ۔ قَالَ بَیْنَمَا اَنَا فِی الْحَطِیْمِ وَرُبَّمَا قَالَ قَتَادَۃُ فِی الْحِجْرِ مُضْطَجِعًا اِذْ اَتَانِیْ اٰتٍ فَجَعَلَ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ الْاَوْسَطُ بَیْنَ الثَّلَاثَۃِ فَاَتَانِیْ فَشَقَّ مَا بَیْنَ ھٰذِہٖ وَھٰذِہٖ یَعْنِیْ مِنْ ثُغْرَۃِ نَحْرِہٖ اِلٰی شِعْرَتِہٖ

واقعہ معراج کا ذکر حدیث میں۔

فَاسْتَخْرَجَ قَلْبِیْ فَاُتِیْتُ بِطَسْتٍ مِنْ ذَھَبٍ مَمْلُوْءَۃٍ اِیْمَانًا وَحِکْمَۃً فَغَسَلَ قَلْبِیْ ثُمَّ حُشِیَ ثُمَّ اُعِیْدَ ثُمَّ اُتِیْتُ بِدَآبَّۃٍ دُوْنَ الْبَغْلِ وَفَوْقَ الْحِمَارِ یَقَعُ خَطْوُہٗ عِنْدَ اَقْصٰی طَرْفِہٖ فَحُمِلْتُ عَلَیْہِ فَانْطَلَقَ بِیْ جِبْرِیْلُ حَتّٰی اَتٰی بِیْ اِلَی السَّمَآءِ الدُّنْیَا۔ الخ۔ (مسند احمد بن حنبل جزو رابع ص۲۰۸ نیز خصائص الکبریٰ جلد اول ص۱۶۵)

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراء کا واقعہ ایک دفعہ انہیں سُنایا۔ آپ نے فرمایا ایک دفعہ میں حطیم میں سو رہا تھا (خانہ کعبہ کا وہ حصہ جو عمارت سے باہر چھوڑا ہوا ہے مگر طواف کے وقت اسے بھی طواف میں شامل رکھا جاتا ہے)۔ قتادہ جو تیسرے راوی ہیں ان سے اگلا راوی کہتا ہے کہ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ قتادہ نے حطیم کا لفظ بولا تھا یا حِجر کا (یہ بھی اسی کا نام ہے) خیر تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں وہاں دو آدمیوں کے ساتھ سو رہا تھا کہ میرے پاس ایک شخص آیا اور اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگا کہ ان تین سونے والوں میں سے جو درمیان میں سو رہا ہے وہ ہے۔ اس پر وہ آگے بڑھا اور میرے اس حصۂ بدن سے اس حصہ بدن تک اس نے ایک شگاف دیا۔ آپ نے اس کے ساتھ جگہ بتلانے کے لئے دونوں ہنسلیوں کے درمیان کی نرم جگہ سے لیکر ناف کے نیچے تک ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس حد تک انہوں نے شگاف دیا۔ پھر فرمایا کہ شگاف دے کر اس نے میرے دل کو باہر نکالا۔ پھر ایک سونے کی سینی لائی گئی جس میں علم اور حکمت بھرے ہوئے تھے۔ پھر اس شخص نے پہلے میرا دل دھویا پھر میرے اندر وہ نور بھر دیا گیا پھر ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر رکھدی گئی۔ پھر ایک چوپایہ لایا گیا جو گدھے سے اونچا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ اس کے قدم اس کی حد نظر تک جا کر پڑتے تھے۔ مجھے اس جانور پر سوار کر دیا گیا اور جبرائیل مجھے لیکر چلے یہانتک کہ ہم پہلے آسمان پر پہنچ گئے۔

اسی قسم کی روایت بخاری اور ابن جریر میں بھی انسؓ سے بیان کی گئی ہے۔ اسمیں بھی کہا گیا ہے کہ اسراء کی رات کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کعبہ سے سیدھے آسمان کی طرف لیجائے گئے۔ (خصائص جلد اول ص۱۵۳)

اس روایت میں صرف یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے واقعہ اسراء ہم سے بیان کیا لیکن آگے بیت المقدس کا کوئی ذکر نہیں بلکہ سیدھا آسمان تک جانے کا ذکر ہے اور ساری حدیث میں معراج آسمانی ہی کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کبھی اسراء کا لفظ بولتے تھے اور انکی مراد صرف معراج ہوتی تھی۔ اس کے برخلاف اسکا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اسراء کا لفظ وہ صرف بیت المقدس کی طرف جانے کے لئے بولتے تھے۔ چنانچہ حدیث جابرؓ میں جو بخاری اور مسلم میں مروی ہے اسراء کا لفظ صرف بیت المقدس تک جانے کے لئے استعمال ہوا ہے (خصائص جلد اول ص۱۵۷)

اسی طرح شداد بن اوس کی روایت میں جو طبرانی۔

بیہقی اور کئی کتب حدیث نے بیان کی ہے یہ لفظ صرف بیت المقدس تک جانے اور وہاں سے مکہ واپس آنے کے متعلق بولا گیا ہے۔ (خصائص جلد اول ص ۱۵۷ و ص ۱۵۹)۔

ان دونوں قسم کی روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ صحابہ میں اسراء کا لفظ دونوں واقعات کی نسبت مستعمل تھا۔ پس اس لفظ کے استعمال اور بعض تفصیلات کے اشتراک کی وجہ سے بعض راویوں کو یہ دھوکا آسانی سے لگ سکتا تھا کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی ہیں اور اسکی وجہ سے انہوں نے دونوں قسم کی روایات کو ملا کر بیان کر دیا اور اس کے بعد میں آنیوالے لوگوں کو یہ دھوکا لگ گیا کہ شاید یہ ایک ہی واقعہ کی تفاصیل ہیں۔

علاوہ ازیں روایات پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے بھی یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ انہیں خلط ہوگیا ہے۔ کیونکہ جن روایات میں پہلے بیت المقدس جانے اور وہاں سے آسمان پر جانے کا ذکر ہے انہی میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ بیت المقدس میں آپکو دوسرے انبیاء سے ملایا گیا ان میں آدم بھی تھے اور حضرت موسیٰ بھی اور حضرت عیسیٰ بھی اور حضرت ابراہیم بھی لیکن آسمان پر جانے کے بعد پھر بیان ہوا ہے۔ کہ مختلف آسمانوں پر آپ نے انہی انبیاء کو دیکھا اور پہچانا نہیں۔ اگر ایک ہی وقت میں یہ دونوں واقعات ہوئے تھے تو اول تو آسمان پر یہ انبیاء رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کس طرح پہنچے۔ اور دوسرے انکو تھوڑی دیر پہلے دیکھنے کے بعد آپ نے کیوں نہ پہچانا۔ دو مختلف وقتوں کی رویتوں میں تو یہ امر سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک نظارہ دوسرے سے مختلف ہو۔ لیکن ایک ہی وقت میں دونوں نظاروں کی صورت میں یہ بات بعید از قیاس ہے پس یہ اندرونی شہادت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ دو الگ الگ واقعات کے بارہ میں راویوں کے ذہن میں خلط ہوگیا ہے۔

اس وقت تک میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ تاریخی شہادت سے جس سے دونوں واقعات مختلف زمانوں کے ثابت ہوتے ہیں۔ اور قرآن کریم کی شہادت سے کہ کہیں معراج کا واقعہ الگ اور خالی بیت المقدس تک جانیکا واقعہ الگ بیان کیا گیا ہے۔ اور احادیث کی اندرونی شہادتوں سے یہ امر ثابت ہے کہ یہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں اور نام اور تفاصیل کے اشتراک کی وجہ سے دھوکا کھا کر بعض راویان حدیث نے انکو ایک واقعہ سمجھ لیا ہے۔ اب میں اس اسراء کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرتا ہوں جس کا اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے۔

واقعہ اسراء کی تفصیل

میرے نزدیک اسراء بیت المقدس کا واقعہ اپنی تفاصیل کے ساتھ حدیث انسؓ میں جو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے نہایت صحیح طور پر بیان ہوا ہے اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

روایات میں خلط

عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ لَمَّا جَاءَ جِبْرَئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامِ بِالْبُرَاقِ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَاَنَّهَا ضَرَبَتْ بِذَنَبِهَا فَقَالَ لَهَا جِبْرَئِيْلُ مَهْ يَا بُرَاقُ فَوَاللّٰهِ اِنْ رَكِبَكَ مِثْلُهٗ فَسَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا هُوَ بِعَجُوْزٍ نَاءٍ عَنِ الطَّرِيْقِ اَىْ عَلٰى جَنْبِ الطَّرِيْقِ. فَقَالَ مَا هٰذِهِ يَا جِبْرِئِيْلُ قَالَ سِرْ يَا مُحَمَّدُ فَسَارَ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَسِيْرَ فَاِذَا شَيْءٌ يَدْعُوْهُ مُتَنَحِّيًا عَنِ الطَّرِيْقِ يَقُوْلُ هَلُمَّ يَا مُحَمَّدُ قَالَ جِبْرِئِيْلُ سِرْ يَا مُحَمَّدُ فَسَارَ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَسِيْرَ. قَالَ ثُمَّ لَقِيَهٗ خَلْقٌ مِنَ الْخَلَائِقِ فَقَالَ اَحَدُهُمْ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَوَّلُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اٰخِرُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَاشِرُ فَقَالَ لَهٗ جِبْرِئِيْلُ اُرْدُدِ السَّلَامَ يَا مُحَمَّدُ قَالَ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ لَقِيَهُ الثَّانِيْ فَقَالَ لَهٗ مِثْلَ مَقَالَةِ الْاَوَّلِيْنَ حَتّٰى انْتَهٰى اِلٰى بَيْتِ الْمَقْدِسِ فَعُرِضَ عَلَيْهِ الْمَاءُ وَاللَّبَنُ وَ

اسراء اور معراج کے واقعہ میں خلط کا ثبوت

میرے اس خیال کی تائید بعض پرانے علماء کی آراء سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ خصائص الکبریٰ جلد اول کے ص۱۶۳ پر لکھا ہے کہ ابو نصر قشیری ابن العربی اور بہت سے علماء کا خیال ہے کہ اسراء دو دفعہ ہوا ہے۔ اسکی وجہ سے احادیث میں اختلاف ہوگیا ہے۔

الْخَمْرُ فَتَنَاوَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّبَنَ ۔
فَقَالَ لَهُ جِبْرَئِيْلُ اَصَبْتَ يَا مُحَمَّدُ الْفِطْرَةَ
وَلَوْ شَرِبْتَ الْمَاءَ لَغَرِقْتَ وَغَرِقَتْ اُمَّتُكَ
وَلَوْ شَرِبْتَ الْخَمْرَ لَغَوَيْتَ وَغَوَتْ اُمَّتُكَ
ثُمَّ بُعِثَ لَهُ اٰدَمُ فَمَنْ دُوْنَهُ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ
فَاَمَّهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ اللَّيْلَةَ
ثُمَّ قَالَ لَهُ جِبْرَئِيْلُ اَمَّا الْعَجُوْزُ الَّتِيْ
رَاَيْتَ عَلٰى جَانِبِ الطَّرِيْقِ فَلَمْ يَبْقَ مِنَ
الدُّنْيَا اِلَّا بِقَدَرِ مَا بَقِيَ مِنْ عُمْرِ تِلْكَ
الْعَجُوْزِ وَاَمَّا الَّذِيْ اَرَادَ اَنْ تَمِيْلَ اِلَيْهِ
فَذٰلِكَ عَدُوُّ اللّٰهِ اِبْلِيْسُ اَرَادَ اَنْ تَمِيْلَ اِلَيْهِ
وَاَمَّا الَّذِيْنَ سَلَّمُوْا عَلَيْكَ فَذٰلِكَ اِبْرَاهِيْمُ
وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى ۔ (ابن جریر جلد ۱۵ صہ)

(حاشیہ: ۱ حدیث ابن جریر — ۱ اسراء بہ یا لِ دودھ اور شراب کا پیش کیا جانا۔)

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو نقل کر کے
لکھا ہے کہ وَهٰكَذَا رَوَاهُ الْحَافِظُ الْبَيْهَقِيُّ
فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ وَهْبٍ
وَفِيْ بَعْضِ اَلْفَاظِهٖ نَكَارَةٌ وَغَرَابَةٌ
طَرِيْقٌ اُخْرٰى عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ وَفِيْهَا
غَرَابَةٌ وَنَكَارَةٌ جِدًّا اَوْرَدَهَا فِيْ سُنَنِ
النَّسَائِيِّ الْمُجْتَبٰى وَلَمْ اَرَهَا فِي الْكَبِيْرِ ۔
(صہ ۹ جلد ششم)

(حاشیہ: ۲ اسراء میں دودھ سے مراد فطرت)

یعنی ابن جریر انس بن مالک سے روایت کرتے
ہیں کہ انہوں نے کہا۔ جب جبرائیلؑ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے پاس براق لائے تو اس نے اپنی دم ہلائی
یعنی کچھ انکار کیا۔ تو اسے جبرائیلؑ نے کہا آرام سے
کھڑا رہ۔ اے براق خدا کی قسم تجھ پر ایسا سوار کبھی
نہیں بیٹھا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر
چڑھ کر روانہ ہوئے۔ تو راستہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ
ایک بڑھیا راستہ کی ایک جانب کھڑی ہے۔ تو آپ نے
کہا اے جبرائیل یہ کون ہے۔ تو جبرائیل نے کہا۔ چلئے

(حاشیہ: ۲ اسراء میں بڑھیا دیکھنے سے مراد دنیا)

چلئے اے محمدؐ! (یعنی موسیٰ کیطرح سوال کرنے سے منع
کیا) راوی کہتا ہے پھر آپ چلے جتنا کہ اللہ تعالیٰ کا
منشا تھا۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص راستہ کی ایک
جانب سے آپکو بلا رہا ہے اور کہتا ہے کہ ادہر آیئے
اے محمدؐ! اس پر جبرائیل نے پھر آپکو بولنے سے منع
کیا اور کہا کہ اے محمدؐ چلئے چلئے اور کچھ جواب نہ دیجئے
پھر آپ آگے چلے جتنا کہ خدا کی مرضی تھی۔ راوی کہتا ہے
کہ پھر آپ کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کچھ لوگ ملے۔ تو
انہوں نے کہا۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَوَّلُ ۔ اَلسَّلَامُ
عَلَيْكَ يَا اٰخِرُ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَاشِرُ اسپر جبرائیل
نے کہا۔ اے محمدؐ انکو سلام کا جواب دیجئے۔ تو آپ
نے انکو سلام کا جواب دیا۔ پھر آپکو ایسی ہی ایک اور جماعت ملی
اسنے بھی پہلی جماعت کے الفاظ میں آپکو سلام کہا۔ (پھر
آپ آگے چلے) یہاں تک کہ آپ بیت المقدس تک پہنچے
تو آپکے سامنے حضرت جبرائیل نے تین پیالے پیش کئے
ایک پانی کا۔ ایک دودھ کا اور ایک شراب کا۔ آپ نے
دودھ لے کر پی لیا۔ تو آپکو جبرائیل نے کہا آپ نے
فطرت صحیحہ کو پا لیا۔ اگر آپ پانی پی لیتے تو آپ بھی غرق
ہوتے اور آپکی امت بھی غرق ہوتی۔ اور اگر آپ شراب
پی لیتے تو آپ بھی گمراہ ہوتے اور آپکی امت بھی گمراہ
ہو جاتی۔ پھر آپ کے سامنے آدم اور دیگر انبیاء لائے گئے
اور اس رات انکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز
پڑھائی۔ پھر آپکو جبرائیل نے کہا کہ جو بڑھیا آپنے رستہ
کے ایک جانب دیکھی تھی وہ دنیا تھی۔ اور اسکی عمر سے
اسیقدر باقی ہے جو کہ اس بڑھیا کی عمر سے باقی ہے۔
اور جو شخص رستہ سے ہٹ کر آپکو بلاتا تھا تا آپ اس
کیطرف مائل ہوں وہ خدا کا دشمن ابلیس تھا۔ اور وہ
لوگ جنہوں نے آپکو اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ کہا وہ ابراہیم
موسیٰ عیسیٰ وغیرہم تھے۔

یہاں تک ابن جریر کی روایت ختم ہوئی۔ اس کے بعد

ابن کثیر کے حوالے سے جو عبارت لکھی گئی ہے اس کا یہ ترجمہ ہے کہ حافظ بیہقی نے بھی دلائل النبوت میں ابن وہب سے یہی روایت بیان کی ہے مگر اس میں بعض الفاظ قابل اعتراض ہیں اور دوسرے اسناد سے انکی تصدیق نہیں ہوتی اور ایک اور سند کے ساتھ انہوں نے انس بن مالک سے بھی روایت کی ہے مگر اسمیں بعض ایسی باتیں بیان کی ہیں جن کی دوسری احادیث سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اور یہ روایت سنن نسائی کی ایک خلاصہ میں بھی میں نے دیکھی ہے مگر بڑی سنن نسائی میں وہ حدیث نہیں ملی۔

یہ وہ حدیث ہے جو ہمارے لئے معیار کے طور پر ہے کیونکہ میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ صحیح اور سچی ہے۔ اور اسمیں صرف ایک غلطی ہے۔ اور وہ یہ کہ جہاں پیالے پیش کرنے کا ذکر ہے وہاں پانی کے بعد دودھ اور پھر شراب کا ذکر کیا ہے مگر ابن کثیر نے اس روایت کو اپنی کتاب کی جلد ششم ص۹۰۸ پر جس طرح نقل کیا ہے اسمیں پانی کے بعد شراب اور پھر دودھ کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نسخوں میں اسی ترتیب سے پیالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اس معمولی تغیر کی اصلاح کیوں ضروری ہے۔ اسوقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بعض دوسری روایات میں زور سے اس امر کو بیان کیا گیا ہے کہ پہلے پانی کا پیالہ اور پھر شراب کا پیالہ اور پھر دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ الطبرانی اور ابن مردویہ نے صہیب بن سنان سے روایت کی ہے جس کے یہ الفاظ ہیں:-

قَالَ لَمَّا عُرِضَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ اُسْرِىَ بِهِ الْمَاءُ ثُمَّ الْخَمْرُ ثُمَّ اللَّبَنَ اَخَذَ اللَّبَنَ۔ (خصائص الکبریٰ جلد اول ص۱۵۹) ۔ یعنی صہیب روایت کرتے ہیں کہ جس رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسراء ہوا تھا۔ آپ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے تھے۔ پہلے پانی کا اس کے بعد شراب کا اور اس کے بعد دودھ کا۔

اس حدیث میں پانی کے بعد شراب اور اس کے بعد دودھ کے پیش ہونے کو بالجزم بیان کیا گیا ہے۔ پس اس حدیث کی بناء پر اور ابن کثیر نے انس کی روایت کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے۔ اسکی بناء پر یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس روایت میں بھی پہلے پانی۔ پھر شراب پھر دودھ کا ذکر ہے مگر بعض نسخوں میں الٹ لکھا گیا ہے۔

پس میں اس روایت کے جو معانی بیان کروں گا۔ انہیں اس امر کو مدنظر رکھوں گا کہ اس روایت میں بھی پہلے پانی۔ پھر شراب اور پھر دودھ کا ذکر ہے اور اس کے الٹ جو لکھا گیا ہے وہ کسی نسخہ میں کتابت کی غلطی کیوجہ سے سہواً لکھا گیا ہے۔

ابن کثیر کی تصدیق دُرِّ منثور سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں بھی اس روایت کو بیان کرتے ہوئے پہلے پانی پھر شراب پھر دودھ کے پیش کئے جانے کا ذکر ہے جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے یہ روایت نہایت صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے کی اندرونی شہادت موجود ہے۔ اور وہ شہادت یہ ہے کہ اسمیں ذکر ہے کہ پہلے آپ نے ایک بڑھیا دیکھی پھر شیطان دیکھا پھر انبیاء کی جماعتوں کو دیکھا اس کے بعد بیت المقدس پہنچے۔ پھر پانی اور شراب اور دودھ تین چیزیں آپکے سامنے پیش کی گئیں۔ رسول اللہ نے پانی اور شراب کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور دودھ کو لے لیا۔ اسپر جبرائیل نے کہا آپ نے صحیح فطرت کو پا لیا۔ اگر آپ پانی پیتے تو غرق ہو جاتے اور آپ کی امت بھی غرق ہو جاتی۔ اگر شراب پیتے تو آپ گمراہ ہو جاتے اور آپکی امت بھی گمراہ ہو جاتی۔ اور آپ نے جو دودھ لیا ہے گویا آپ فطرتِ صحیحہ کے راستہ پر چل پڑے۔ پھر وہ ان نظاروں کی تعبیر کرتے ہیں جو پہلے دیکھے تھے اور کہتے ہیں کہ وہ عورت دنیا تھی جس نے آپکو بلایا۔ اس کے بعد راستہ سے ہٹ کر

[حاشیہ: ۱ حدیث ابن روایت انس بطور معیار]

[حاشیہ: ۲ حدیث انس کی تصدیق دیگر روایات سے]

کھڑا ہوا شخص جس نے آپکو بلایا ابلیس تھا۔ اس کے بعد جنہوں نے سلام کیا وہ خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔

اسرار کے متعلق اپنی تحقیق[۲]

ان تعبیروں کو دیکھو کہ کیسی صحیح ہیں اور قرآن کریم کے مطابق ہیں۔ پانی دنیا کا قائم مقام ہے کیونکہ پانی سے حیات ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (انبیاء ع ۳) پانی جب لبن کے مقابل میں آئے تو اس سے مراد دنیا کی مال و دولت ہوتی ہے۔ اور شراب شیطانی کاموں پر دلالت کرتی ہے۔ جیسے فرمایا۔ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (مائدہ ع ۱۲)۔ دودھ ماں کی چھاتی سے بنتا ہے اس میں کسی غیر چیز کی ملونی نہیں ہوتی اس لئے وہ فطرتِ صحیحہ پر دلالت کرتا ہے۔

واقعہ اسرار کشف تھا جس کی تعبیر کی گئی[۲]

اب دیکھو اسمیں کیسی ترتیب نظر آتی ہے۔ پھر تعبیر نہایت صاف اور صحیح ہے۔ پہلے آپ نے عورت کو دیکھا تھا۔ اور اسکی تعبیر جبرائیل علیہ السلام نے دنیا بتائی تھی اس کے مقابل پر پہلے پانی کا پیالہ پیش کیا گیا۔ اور اسکی تعبیر بھی دنیا ہی کی گئی۔ قرآن کریم میں بھی پانی کو دنیا سے تشبیہ دی گئی ہے۔ فرماتا ہے۔ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ (کہف ع ۶) انہیں دنیوی زندگی کی مثال سنا کہ وہ پانی کیطرح ہے جسے ہم اُتارتے ہیں۔ عورت کے بعد آپ نے شیطان کو دیکھا تھا۔ اسی ترتیب سے پانی کے بعد شراب کا پیالہ پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ جس طرح شیطان غادی ہے اسی طرح شراب بھی غادی ہے۔

اس روایت کے واقعات میں بھی ترتیب ہے۔[۱]

اسراء میں پانی دودھ اور شراب کو پیش کئے جانے کی تعبیر[۲]

اس کے بعد کشف کے پہلے حصہ میں انبیاء کی جماعت کو دیکھا تھا اور انہوں نے سلام کیا تھا یعنی سلامتی کی دعا کی تھی۔ اس کے مقابل پر پیالوں میں سے دودھ کا پیالہ تیسرے نمبر پر پیش کیا گیا جس میں اس طرف اشارہ تھا کہ آپکی امت علوم الٰہیہ سے ہمیشہ حصہ لیتی رہے گی۔ اور تباہی سے بچی رہے گی پس یہ ترتیب اور تعبیر بتاتی ہیں کہ یہ خبر یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی گئی ہے۔

اب میں اسراء کے واقعہ کے متعلق جو کچھ قرآن کریم اور علومِ روحانیہ سے سمجھتا ہوں بیان کرتا ہوں۔ میرے نزدیک اسراء بیت المقدس ایک لطیف کشف تھا اور اس کے ثبوت مندرجہ ذیل ہیں:۔

اوّل۔ وہی حدیث انس کی جسے میں نے سب روایتوں میں سے تفصیل کے لحاظ سے بہتر قرار دیا ہے۔ اسمیں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ایک بڑھیا کو دیکھا اور پھر ایک اور شخص کو دیکھا۔ اور پانی شراب اور دودھ کے پیالے دیکھے اور انمیں سے دودھ کا پیالہ پیا۔ ان تمام امور کی حضرت جبرائیل تعبیر کرتے ہیں۔ اگر یہ کشف نہ تھا تو تعبیر کا کیا مطلب؟ اگر آپ کا سفر مادی جسم کے ساتھ تھا تو اوّل آپ نے دنیا کو عورت کی شکل میں کیونکر دیکھا؟ کیا قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا اصل میں ایک عورت ہے۔ دنیا کو عورت کی شکل میں دیکھنا صاف بتاتا ہے کہ یہ ایک لطیف کشف تھا۔ اگر وہ کشف نہ ہوتا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فوراً جبرائیل سے کہتے کہ اے جبرائیل کس بات کی تعبیر کرتے ہو۔ اس عورت کو تو میں نے ابھی ابھی اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھا ہے جسمانی آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز کی تم تعبیر کس طرح کرتے ہو مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بھی اسے کشف ہی سمجھتے تھے۔ پانی کو ردّ کرنے پر جبرائیل کا خوشی کا اظہار کرنا بھی اسی امر کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ جاگتے ہوئے تو آنحضرت صلعم ہمیشہ پانی پیتے تھے۔ اگر آپ جسدِ عنصری میں وہاں گئے تھے تو پانی پینے سے آپکی امت کیوں غرق ہوتی؟

دنیوی زندگی میں آپ نے ہزاروں دفعہ پانی پیا تھا۔ اگر اس عمل سے امت نے غرق ہونا تھا تو پھر اس کے بچاؤ کی کیا صورت رہجاتی ہے۔

(۲) دوسرا ثبوت اسکا یہ ہے کہ قرآن کریم نے بھی اسکا نام رؤیاء ہی رکھا ہے۔ جیسے اسی سورۃ کے چھٹے رکوع میں فرمایا۔ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ۔ کہ یہ رؤیاء لوگوں کے فتنے کے لئے تھی۔ چنانچہ اس آیت کیوجہ سے کئی صحابہ اور سابق علماء نے بھی اسے رؤیاء ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن اسحاق اور ابن جریر نے حضرت معاویہ رضؓ سے روایت کی ہے کہ اِذَا سُئِلَ عَنْ مَسْرٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتْ رُءْيَا مِنَ اللّٰهِ صَادِقَةً ۔ (درمنثور جلد ۴ صفحہ ۱۹۷)۔ یعنی جب حضرت معاویہ رضؓ سے اسراء کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رؤیا تھی جو پوری ہوگئی۔ حضرت عائشہؓ کا بھی یہی مذہب بتایا جاتا ہے۔ (ابن ہشام ذکر الاسراء و زاد المعاد جزء اول)

(۳) تیسرا ثبوت اسکا یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ بات لوگوں کو سنائی۔ تو لوگوں نے کہا کہ اگر آپ بیت المقدس سے ہو آئے ہیں تو اسکا نقشہ بتائیں۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میں بالکل بیت المقدس کو نہ جانتا تھا۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فی الحقیقت ظاہری طور پر بیت المقدس میں گئے تھے تو آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ نقشہ بتا دیتے۔ یہ نہ فرماتے کہ میں نہ جانتا تھا۔ پھر آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ انکے سوال کرنے کے بعد پھر مجھ پر کشف کی حالت طاری ہوئی۔ اور کشف میں بیت المقدس کا نقشہ سامنے کر دیا گیا۔ تو میں اسکو دیکھتا جاتا تھا اور پھر لوگوں کو بتاتا جاتا تھا۔ چنانچہ جابر بن عبداللہ کی روایت ہے آپ نے فرمایا۔ فَجَلَّى اللّٰهُ لِيَ الْبَيْتَ الْمُقَدَّسَ فَطَفِقْتُ اُخْبِرُهُمْ وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَيْهِ ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا۔ میں اسکو دیکھتا اور لوگوں کو بتاتا جاتا تھا۔ (ابن کثیر جلد ۶۔ صفحہ ۱۸)

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ چونکہ وہ کشف تھا آپ سمجھتے تھے کہ ممکن ہے جو میں نے دیکھا ہے اس طرح ظاہری طور پر نہو۔ پس آپ نے اس کے بیان کرنے سے ہچکچاہٹ کی۔ مگر چونکہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے لوگوں میں مخالفت اور استہزا کا ہیجان پیدا ہو گیا تھا اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ لو اب ہم تم کو اصل صورت میں بیت المقدس دکھا دیتے ہیں۔ چنانچہ دوبارہ کشف ہوا اور آپ نے اسکے مطابق لوگوں کو بیت المقدس کا نقشہ بتا دیا۔ جس کی کفار میں سے واقف کار لوگوں نے تصدیق کی۔

قرآن کریم نے بیت المقدس کی طرف جانے کا نام رؤیا ہی رکھا ہے۔

متعصب عیسائی مصنف اس موقعہ پر لکھتے ہیں کہ بیت المقدس کے نقشے اسوقت بن چکے تھے۔ ممکن ہے یہ درست ہو مگر ذرا یہ مصنف کسی ایسے شہر کے متعلق نقشہ دیکھ کر جو اُنپر سوال کئے جائیں ان کا جواب تو دے کر دیکھیں۔

اس جگہ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو قرآن کریم میں اس کے متعلق رؤیاء کا لفظ آیا ہے مگر اس لفظ سے دھوکا کھا کر اسے عام خوابوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ عربی میں رؤیاء کا مفہوم اَور ہے اور اردو میں اَور۔ اردو میں تو رؤیاء اس نظارہ کو کہتے ہیں جو انسان سوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ لیکن عربی میں کشف اور عام خواب دونوں کے لئے رؤیاء کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور کشف عام رؤیاء سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ سوتے میں نہیں دیکھا جاتا بلکہ بَيْنَ النَّوْمِ وَالْيَقْظَةِ کی حالت میں دیکھا جاتا ہے یعنی جبکہ ایک ربودگی کی سی حالت تو انسان پر طاری ہوتی ہے مگر وہ سو نہیں رہا ہوتا۔ بلکہ اس کے ظاہری حواس بھی اسوقت اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ دوسرے سے باتیں کرتے کرتے ایک نظارہ نظر آجاتا ہے۔ انبیاء کا کشف دوسرے لوگوں کے کشوف سے زیادہ لطیف ہوتا ہے اور وہ کشفی نگاہ سے دور دور کے مادی امور کو بعینہٖ معائنہ کر لیتے ہیں۔

کشف اور رؤیا کی تعریف میں فرق

کشف کی تین اقسام

کشف کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں :-

(۱) ایسا کشف جس میں دکھائی جانیوالے نظارے اسی شکل میں دکھائے جاتے ہیں جس شکل میں کہ وہ مادی دنیا میں موجود ہوتے ہیں اور وہ کشف بالکل ایسا ہوتا ہے جیسے دوربین سے دور کی چیز دیکھ لی جاتی ہے۔

(۲) ایسا کشف جس کا کچھ حصہ تو ایسا ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ اور کچھ حصہ تعبیر طلب ہوتا ہے۔

(۳) ایسا کشف جو سارا کا سارا تعبیر طلب ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کشف دوسری قسم کا تھا یعنی بعض حصے تو اسی طرح دکھائے گئے تھے جس طرح کہ مادی دنیا میں واقعہ ہو رہا تھا۔ اور بعض حصے تعبیر طلب تھے۔ تعبیر طلب حصوں کا ذکر تو میں اوپر کر آیا ہوں۔ ظاہری شکل میں دکھائے جانے والے حصہ کے بارہ میں احادیث میں آتا ہے کہ واپسی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک قافلہ مکہ کی طرف آرہا ہے اور اس قافلہ والوں کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے جس کی وہ تلاش کر رہے ہیں۔ اور چند دن بعد معلوم ہوا کہ بعینہٖ یہ واقعہ مکہ کے ایک قافلہ سے پیش آیا تھا۔ چنانچہ جب وہ قافلہ مکہ پہنچا تو انہوں نے اس امر کو تسلیم کیا۔ (الخصائص الکبریٰ جلد اول۔ صفحہ ۱۵۸ و ۱۵۹)

کشف کے متعلق ذاتی تجربہ

اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں کشوف کے متعلق خود صاحب تجربہ ہوں۔ اور یہ امور اپنے مشاہدہ کی تصدیق سے لکھ رہا ہوں۔

اسراء کے کشف سے غرض ہجرت تھی

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ اس کشف کا مقصد کیا تھا؟ میرے نزدیک اس کشف میں ہجرتِ مدینہ کی خبر دی گئی تھی۔ اور بیت المقدس جو آپ کو دکھایا گیا اس سے مراد مسجد نبوی کی تعبیر تھی جسکو اللہ تعالیٰ کے فضل سے بیت المقدس سے بھی زیادہ عزت دیجانے والی تھی اور یہ جو دکھایا گیا کہ آپ نے سب انبیاء کی امامت کرائی اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ آپ کا سلسلہ عربوں سے نکل کر دوسری اقوام میں بھی پھیلنے والا ہے اور سب انبیاء کی امتیں اسلام میں داخل ہونگی۔ اور یہ اشاعت مدینہ میں جانے کے بعد ہوگی۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس کے علاقہ کی حکومت دیجائے گی۔

مسجد کو دیکھنے کی تعبیر

چنانچہ تعبیر الرؤیاء کی کتب میں لکھا ہے کہ تَدُلُّ رُؤْيَةُ كُلِّ مَسْجِدٍ عَلٰى جِهَتِهٖ وَالتَّوَجُّهِ اِلَيْهَا كَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ دِمَشْقَ وَمَسْجِدِ مِصْرَ وَمَا شَاكَلَ ذٰلِكَ وَرُبَّمَا دَلَّتْ عَلٰى عُلَمَاءِ جِهَاتِهِمْ اَوْ مُلُوْكِهِمْ اَوْ نُوَّابِ مُلُوْكِهِمْ۔ (تعطیر الانام زیر لفظ مسجد۔ جلد دوم)۔

یعنی رؤیا میں مسجد دیکھنے سے مراد کبھی وہ جہت ہوتی ہے اور اس طرف جانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے مسجد اقصیٰ کو دیکھنا یا مسجد حرام کو دیکھنا یا مسجد دمشق یا مسجد مصر کو دیکھنا۔ اور ایسے ہی اور مساجد کو دیکھنا اور کبھی مسجد سے مراد وہاں کے علماء یا بادشاہ یا گورنر ہوتے ہیں۔

آنحضرت کے حق میں تعبیر کس طرح پوری ہوئی

اب میں ایک ایک کر کے ان معنوں کو لیتا ہوں کہ وہ کس طرح اور کس دلیل سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حق میں پورے ہوئے:-

پہلی تعبیر میں نے یہ کی تھی کہ مسجد اقصیٰ سے مراد اسجگہ مسجد نبوی ہے۔ اور یروشلم سے مراد مدینہ ہے۔ اور اُدھر جانے سے مراد آپ کی ہجرت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سُبۡحٰنَ کہہ کر اس رؤیاء کا ذکر کیا ہے جس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ ہجرت اللہ تعالیٰ کی سبوحیت کا اظہار کرنے والی ہوگی۔ یہ سبحان کا لفظ بھی بتاتا ہے کہ اس نظارہ میں ایک پیشگوئی تھی کیونکہ ظاہر میں بیت المقدس کو دیکھنے سے سبوحیت ثابت نہیں ہوتی لیکن مدینہ میں جاکر اسلامی حکومت کا قیام چونکہ بہت سی ان پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا تھا جو قرآن کریم میں بیان

ہو چکی تھیں۔ اس واقعہ سے بیشک اللہ تعالیٰ کی سُبوحیت ظاہر ہوئی تھی اور ابتک ہو رہی ہے۔

غرض سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی کہہ کر فرمایا کہ پاک ہے وہ جو لیجائے گا اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد اقصٰے یعنی اسی کے مشابہ ایک مسجد کیطرف "تا کہ وہ پیشگوئیاں پوری ہوں جن کے لئے ہجرت کرنی ضروری ہے! اور اللہ تعالیٰ دنیا کو دکھائے کہ کس طرح اسکی بات پوری ہوا کرتی ہے۔ مثلاً جنگ و جہاد وغیرہ کی خبریں جو ہجرت کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں۔ پھر اسلامی حکومت کی خبر وغیرہ وغیرہ۔

لِنُرِیَهٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا بھی اسی امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کوئی ایسا سفر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے خاص نشان ظاہر ہوں گے۔ اور وہ ہجرت ہی کا سفر تھا جس نے اسلام کا مستقبل جو دنیا کی نگاہ سے پوشیدہ تھا۔ ایسے شاندار طور پر ظاہر کر دیا۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ میں بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ بیت المقدس کو محض کشف میں دیکھ لینا خدا تعالیٰ کے سمیع و بصیر ہونے کا ثبوت پیش نہیں کرتا لیکن مدینہ کی ہجرت ان دونوں صفات کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ سَمِیۡعٌ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے بندوں کی دعائیں سننے والا ہے۔ اور بَصِیۡر اس طرح کہ جن کامیابیوں کی ہجرت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کیطرف سے خبر دی گئی تھی وہ بعینہٖ پوری ہو گئیں نیز اس طرح کہ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جس طرح نگہداشت کی وہ ایک بصیر ہستی کے وجود کی بین شہادت تھی۔

اور یہ جو مسجد نبوی کو مسجد اقصٰی کہا گیا اور مدینہ کو یروشلم کی شکل پر دکھایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو برکات اس شہر کو اور اس مسجد کو ملی تھیں۔ وہی مسجد نبوی اور مدینہ منورہ کو ملنے والی تھیں۔

اگر کہا جائے کہ کیوں مسجد نبوی کو مسجد حرام سے تشبیہ نہ دی گئی اور مسجد اقصٰی سے دی گئی؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ اول تو مسجد حرام کو بعض ایسی خصوصیات حاصل ہیں جو ارکان حج سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور یہ خصوصیات بیت المقدس یا مسجد نبوی کو حاصل نہیں۔ دوسرے بیت المقدس کو کشف میں دکھانے سے یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ آپکی امت ان علاقوں پر قابض ہو جائیگی۔ اور یہ مضمون مسجد حرام کے دکھانے سے ظاہر نہ ہوتا تھا۔ پس چونکہ ابھی بعض سیاسی وجوہ کی بناء پر وہ وقت نہ آیا تھا کہ اصل نام ظاہر کیا جاتا۔ اس لئے تشبیہاً مسجد نبوی کا نام مسجد اقصٰی رکھ دیا۔ اور مدینہ کو یروشلم کی شکل میں دکھایا۔ یہ پیشگوئی جس رنگ میں پوری ہو گئی وہ ذیل کی روایت سے ظاہر ہے۔

لنریه من آیتنا میں بھی ہجرت کی طرف اشارہ ہے

عَنۡ اَبِیۡ هُرَیۡرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ اَلۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَمَسۡجِدِ الرَّسُوۡلِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ وَالۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصٰی۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ سواری پر چڑھ کر کسی مسجد کیطرف نہ جانا چاہیئے۔ سوائے تین مساجد کے۔ ایک مسجد حرام۔ دوسری مسجد اقصٰے اور تیسری مسجد نبویؐ۔ (بخاری جلد ا باب فَضۡلِ الصَّلٰوةِ فِیۡ مَسۡجِدِ مَكَّةَ وَالۡمَدِیۡنَةِ)۔

اسجگہ مسجد نبویؐ اور مسجد اقصٰے کو آپس میں مشابہت دی ہے پس مسجد نبویؐ کی بنیاد سے مسجد اقصٰے میں نماز پڑھنے کی پیشگوئی پوری ہو گئی۔ اس مسجد کیطرف جانے کے علاوہ اس آیت میں ایک اور بات بھی بتائی گئی تھی۔ اور وہ یہ کہ مسجد اقصٰی وہ جگہ ہے جس کے اردگرد کو بھی برکت دی گئی ہے۔ یعنی جس شہر میں وہ ہے اسے بھی معزز و مکرم بنا دیا گیا ہے۔ اس خبر کے مطابق نہ صرف مسجد نبویؐ کو برکت دی گئی بلکہ اس کے اردگرد کے علاقہ یعنی مدینہ کو بھی برکت دیگئی۔

مسجد نبوی اور مسجد اقصٰی میں مشابہت

اس کے مندرجہ ذیل ثبوت ہیں:-

(۱) بخاری میں روایت ہے کہ عَنۡ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اجۡعَلۡ بِالۡمَدِیۡنَةِ ضِعۡفَیۡ مَا جَعَلۡتَ بِمَكَّةَ مِنَ الۡبَرَكَةِ۔ (بخاری کتاب الحج) یعنی حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ مکہ میں جو تو نے برکت رکھی ہے

آنحضرت کی مدینہ میں ترقی کے لئے دعا

اس سے بڑھ کر مدینہ میں برکت رکھ دے۔

(۲) اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَیْنَا الْمَدِیْنَۃَ کَحُبِّنَا مَکَّۃَ اَوْ اَشَدَّ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْ صَاعِنَا وَفِیْ مُدِّنَا۔ (بخاری کتاب الحج جلد اول) یعنی حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ الٰہی تو مدینہ بھی ہمیں ایسا ہی پیارا بنا دے جس طرح ہمیں مکہ پیارا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اے اللہ اس کے صاع اور مُد میں برکت ڈالدے یعنی اہل مدینہ کے گذارے کے لئے انکی زراعت اور تجارت میں برکت دے۔

اسریٰ کے لفظ میں بھی مجبوری سے سفر کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) عَنْ زَیْدِ بْنِ عَاصِمٍ اَنَّ اِبْرَاھِیْمَ حَرَّمَ مَکَّۃَ وَدَعَا لِاَھْلِھَا وَاِنِّیْ حَرَّمْتُ الْمَدِیْنَۃَ کَمَا حَرَّمَ اِبْرَاھِیْمُ مَکَّۃَ وَاِنِّیْ دَعَوْتُ فِیْ صَاعِھَا وَمُدِّھَا بِمِثْلَیْ مَا دَعَا اِبْرَاھِیْمُ بِمَکَّۃَ۔ (مسلم باب فضل المدینۃ)۔ یعنی زید بن عاصم کہتے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ ابراہیم نے مکہ کو محفوظ مقام قرار دیا تھا اور اس کے باشندوں کے لئے دعا کی تھی۔ اور میں نے مدینہ کو محفوظ مقام قرار دیا ہے اور میں نے دعا کی ہے کہ مدینہ کے صاع اور مُد میں اس سے دگنی برکت دے جتنی کہ ابراہیمؑ نے مکہ کے لئے طلب کی تھی۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کی فضیلت کے لئے جو دعا ہے وہ دنیوی ترقی کے لئے ہے ورنہ آسمانی برکت کے لحاظ سے مکہ ہی سب دنیا کے شہروں سے افضل ہے۔)

مدینہ کے پہلے نام یثرب کی وجہ تسمیہ

ان روایات سے ظاہر ہے کہ مسجد اقصےٰ جسکے اردگرد کا علاقہ بھی بابرکت کیا گیا۔ اس سے مراد رؤیا میں درحقیقت مسجد نبوی تھی۔ اور ہر عقلمند سوچ سکتا ہے کہ مدینہ کو جو برکت ملی ہے کیا اسکا دسواں حصہ بھی یروشلم کو نصیب ہوئی ہے؟

اسلامی حکومت کی ترقی کا راز مدینہ کو مرکز قرار دینا تھا۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ سے ظاہر ہوتا ہے کہ چلانے والا کوئی دوسرا تھا۔ اور اسمیں چلنے والے کا اپنا اختیار نہ تھا۔ ہجرت کا واقعہ بھی اسی طرح ہؤا۔ کہ آپ رات ہی کو نکلے۔ اور یہ نکلنا اپنی مرضی سے نہ تھا بلکہ اس وقت مجبور ہو کر آپ نکلے جبکہ کفار نے آپ کے قتل کرنے کے لئے آپ کے گھر کا محاصرہ کرلیا تھا پس اس سفر میں آپکی مرضی کا دخل نہ تھا۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی مشیت نے آپکو مجبور کیا۔ پھر جس طرح رؤیا میں جبریل بیت المقدس کے سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔ ہجرت میں ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے جو گویا اسی طرح آپ کے تابع تھے جس طرح جبریل خدا تعالیٰ کے تابع کام کرتا ہے۔ اور جبریل کے معنے خدا تعالیٰ کے پہلوان کے ہوتے ہیں حضرت ابوبکر بھی اللہ تعالےٰ کے خاص بندے تھے اور دین کے لئے ایک نڈر پہلوان کی حیثیت رکھتے تھے۔

مدینہ کو جو برکت دی گئی۔ اس کی ایک ظاہری صورت بھی تھی۔ اس کی حقیقت حضرت عائشہ رضؓ کی ایک روایت سے ظاہر ہوتی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ مدینہ میں آپ کی آمد سے پہلے بخار کی وبا سخت پھیلا کرتی تھی جب آپ وہاں تشریف لے گئے تو آپ کی دُعا کے طفیل سے وُہ وبا دُور ہوگئی۔ اسی وبا کی وجہ سے پہلے مدینہ کا نام یثرب تھا۔ کیونکہ یثرب کے معنے رونا پیٹنا ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کی وجہ سے وہ وبا دور ہوگئی اور آئندہ یثرب کی بجائے آپ نے اس کا نام مدینہ رکھا پھر کشف میں جو یہ دکھایا گیا تھا کہ مسجد اقصےٰ میں جاکر آپ نے تمام انبیاء کو نماز پڑھائی۔ یہ خبر بھی مدینہ میں جاکر پوری ہوئی اور اس مقام سے ہی اسلام کی اشاعت ساری دنیا میں ہوئی۔ بلکہ اس امر کو دیکھ کر حیرت آتی ہے کہ جب مدینہ سے اسلامی دارالخلافہ کو بدل دیا گیا، اسی وقت سے اسلام کی ترقی رک گئی۔ تیس سال کے عرصہ میں جس میں مدینہ اسلامی دارالخلافہ تھا اس قدر اسلام کو ترقی ہوئی اور اس قدر اس کی اشاعت ہوئی۔ کہ اس کے بعد تیرہ سَو سال میں اس قدر نہیں ہوئی۔

اگر کہو کہ یہ برکات تو خود رسول کریم صلعم نے دی تھیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی برکات کوئی انسان نہیں دے سکتا انسان میں کہاں طاقت ہے کہ ایسی پیشگوئی کرے اور

اس کو پورا کر دکھائے۔ آپ نے جو دعا کی وہ اللہ تعالیٰ کی اس پیشگوئی کی تائید میں تھی۔

(۲) دوسری صورت میں نے یہ بتائی تھی کہ مسجدِ اقصیٰ سے مراد بنی اسرائیلی والی مسجد اقصیٰ بھی ہے۔ اس صورت میں یہ تعبیر ہوگی کہ آپ کو اس ملک پر قبضہ دیا جائے گا۔ چنانچہ یہ تعبیر بھی پوری ہوئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے خلیفہ کے وقت میں اس جگہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور تیرہ صدیوں تک قبضہ رہا۔ اب عارضی طور پر یہ علاقہ عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔ مگر یہ بھی ایک پیشگوئی کے ماتحت ہے۔ اس کا زمانہ ختم ہونے پر پھر یہ ملک واپس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے ہاتھ میں آجائے گا۔ خواہ بہت جلد خواہ کچھ وقفہ کے بعد اس صورت میں راتوں رات وہاں جانے کے یہ معنے لئے جائیں گے کہ بیت المقدس کی فتح ظاہری جنگوں کے سبب سے نہ ہوگی بلکہ اس رات کے دیکھے ہوئے نظارہ کی وجہ سے ہوگی۔ چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے ورنہ عربوں کا ایک چھوٹا سا لشکر قیصر جیسے بڑے بادشاہ کا مقابلہ کب کر سکتا تھا۔ یہ تو الٰہی کلام جو سورۃ اسراء والی رات میں نازل ہوا تھا۔ اسی کا اثر تھا کہ بے سروسامان عربوں کے سامنے قیصر کا باسامان اور فنونِ حرب کی تعلیم پایا ہوا لشکر اس طرح بھاگتا جاتا تھا جیسے شیر کے سامنے ہوں۔ اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ ملک تو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہوا تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کے اتباع پیشگوئیوں میں اسی کے وجود میں شامل سمجھے جاتے ہیں اور اس کی مثالیں کثرت سے اسلام اور پہلے انبیاء کے لٹریچر میں پائی جاتی ہیں۔

(۳) چوتھی بات تعبیر الرؤیاء کے مطابق میں نے یہ بتائی تھی کہ علاقے کے علماء بھی مسجد کی شکل میں دکھائے جاتے ہیں۔ اس تعبیر کے مطابق ہم دیکھتے ہیں کہ اس ملک پر نہ صرف سیاسی قبضہ مسلمانوں کو حاصل ہوا بلکہ مذہباً بھی اکثر حصہ ملک کا مسلمان ہوگیا اور تیرہ سو سال میں یروشلم اسلامی علماء کا مرکز بنا رہا

ہے۔ یہ تغیر پیدا کرنا بھی کسی انسان کی طاقت میں نہ تھا اللہ تعالیٰ ہی ایسا کر سکتا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ موسےٰ کو بھی ایک نظارہ دکھایا گیا تھا اور اس کے متعلق جو الفاظ آتے ہیں وہ بھی اس واقعہ کے الفاظ سے ملتے جلتے ہیں۔ حضرت موسےٰ ایک سفر پر تھے کہ انہوں نے ایک جگہ آگ دیکھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (نمل ع ۱) کہ جو اس آگ میں پڑیگا وہ بھی بابرکت اور جو اسکے گرد آکر بیٹھیگا وہ بھی بابرکت ہوگا اور وہ آگ محبت الٰہی کی آگ تھی اور پھر جس طرح وہاں سبحان کا لفظ آیا تھا اسی طرح اس جگہ سبحان بھی آیا ہے۔ اور جس طرح وہاں حولہ آیا ہے اسی طرح یہاں بھی بارکنا حولہ فرمایا ہے بعض نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آگ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے مگر یہ غلط ہے۔ کیونکہ آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ جو آگ میں ہے اسے برکت دی گئی ہے۔ پس آگ سے مراد اللہ تعالےٰ نہیں بلکہ محبت الٰہی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جو محبت الٰہی کی آگ میں اپنے آپ کو ڈالدے اسے برکت دی جاتی ہے محبت کو دنیا کی کل زبانوں میں آگ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ جس جگہ اللہ تعالےٰ اپنا جلال دکھاتا ہے اس کو برکت دیتا ہے اور وہاں سے اس کی سبوحیت کا ظہور ہوتا ہے۔ اور ان دونوں نظاروں میں یعنی اس میں جو موسیٰ نے دیکھا اور اس میں جو آنحضرت صلعم نے دیکھا ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ ہے حضرت موسیٰ کا ایک اور واقعہ بھی اس واقعہ سے ملتا ہے اور وہ وہ واقعہ ہے جو اگلی سورۃ کہف میں بیان ہوا ہے اسکی ان دو واقعہ سے جو مشابہت ہے اس جگہ پر بیان کی جائے گی۔

میرے نزدیک اس کشف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روحانی سفر کی طرف بھی اشارہ ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب اسلام پر تاریکی کا زمانہ آئے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے تابع وجود کے واسطہ سے پھر دنیا کی ہدایت کے لئے مقرر کرے گا۔ اور اس تابع

اسراء بیت المقدس کے ملک شام پر قبضہ کرنے کی پیشگوئی

آنحضرت کے واقعہ اسراء اور موسیٰ کے سفر میں فرق

مسجد اقصیٰ کو دیکھنے سے بعثت اور بروزیت پر اقتدار کی طرف اشارہ

اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيٓ

ہم نے موسیٰ کو (بھی) کتاب دی تھی اور اس (کتاب) کو ہم نے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت (کا ذریعہ)

اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝ ذُرِّيَّةَ

بنایا تھا (اور اس میں انہیں حکم دیا تھا) کہ تم میرے سوا کسی کو (اپنا) کارساز نہ ٹھہراؤ ۵۳ (اور

مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝ وَ

یہ بھی کہا تھا کہ اے) ان لوگوں کی نسل جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا وہ یقیناً (ہمارا) نہایت شکرگزار بندہ تھا ۵۴

دُوْن

کے واسطہ سے وہی برکات مسلمانوں کو پھر ملینگی جو انبیاء بنی اسرائیل کو اور ان کے اتباع کو ملی تھیں اسی کی طرف سورۃ جمعہ میں بھی اشارہ ہے جہاں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (جمعہ ع۱)

(حاشیہ: اسراء میں بعثت ثانی کی پیشگوئی — لقد آتینا سے حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کا ذکر)

یعنی خدا ہی ہے جس نے امیوں میں ان میں سے ہی رسول بھیجا ہے جو ان سے اللہ تعالےٰ کے نشانات بیان کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اور جماعت کو بھی دین سکھائیں گے جو اب تک ان مسلمانوں سے نہیں ملی بلکہ آئندہ زمانہ میں ظاہر ہوگی اور یہ بات اللہ تعالےٰ سے بعید نہیں کیونکہ خدا تعالےٰ غالب ہے اور وہ حکمت والا ہے یعنے یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تباہ ہو اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی بعثت کر کے اس کی اصلاح نہ کرے۔

(حاشیہ: یہود کے عذاب سے بچنے کا ذریعہ اسلام سے وابستگی ہے)

هُدًى

۵۳ حل لغات

هُدًى۔ هدی کا مصدر ہے اور هدی کے لئے دیکھو رعد ۲۸

اسرائیل — ذُرِّيَّة — شکور

بنی اسرآءیل:۔ اسرائیل حضرت یعقوب کا لقب ہے (پیدائش باب ۳۲ آیت ۲۸) اور بنو اسرائیل حضرت یعقوب کی اولاد کو کہتے ہیں۔ دُوْن کے معنی ہیں سوا۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو نحل ۵۳ وکیلًا کے معنی کے لئے دیکھو یونس ۱۰۵

تفسیر۔ اس آیت سے حضرت موسیٰ اور انکی قوم کا ذکر شروع کیا ہے ان آیات کا گذشتہ آیت اور پہلی سورۃ سے کئی طرح تعلق ہے

(۱) پہلی آیت میں رسول کریم صلعم اور آپ کے اتباع کو بیت المقدس دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ شہر اور اس کے گرد کا ملک پہلے الٰہی وعدہ کے مطابق حضرت موسیٰ اور انکی قوم کو ملا تھا۔ مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہ کر کے اسے کھو دیا۔ پس انکے واقعہ کو یاد کرا کے مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ موسوی قوم کی اچھی میراث تم کو دی جا رہی ہے مگر ہوشیار رہنا۔ ایسا نہ ہو۔ بُری میراث بھی لے لو اور تباہ ہو جاؤ۔

(۲) سورۂ نحل کے آخر میں یہود سے تعلق پیدا ہونے کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ اور ہدایت کی تھی۔ کہ ان سے عمدہ رنگ میں بحث کرنا۔ یعنی نہ ایک اہل کتاب قوم ہے۔ ان سے مسلمہ اصول کے مطابق اور ان دلائل کے مطابق جو انکی کتب میں مذکور ہیں بحث کرنا۔ اب اس طریق بحث کی مثال پیش کرتا ہے۔ یعنی انکی کتاب سے ہی وہ پیشگوئیاں پیش کرتا ہے جن سے ان کے بگڑ جانے کی خبر اور عذاب الٰہی میں مبتلا ہونے کی خبر ملتی ہے۔ اور بتاتا ہے کہ ان حالات میں یہود کے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ اس نئے عہد کو قبول کر کے اس عذاب کو دُور کریں جو خدا تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اگر ارض مقدس بحیثیت یہود ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے تو بحیثیت مسلمان وہ اس میں پھر داخل ہو جائیں اس کے سوا ان کے لئے اور کوئی ترقی کی راہ کھلی نہیں ہے۔

۵۴ حل لغات

ذُرِّيَّة کے لئے دیکھو یونس ۸۴

شکور۔ شکر سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور شکر کے معنی کے

قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ

اور ہم نے اس کتاب میں بنی اسرائیل کو یہ بات (کھولکر) پہنچادی تھی کہ تم یقیناً

فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا

اس ملک میں دوبار فساد کروگے۔ اور یقیناً تم بہت بڑی سرکشی (اختیار) کروگے ۵۵ اور جب

لئے دیکھو ابراہیم ۶ء

تفسیر۔ یعنی اس کتاب کے نزول کے بعد ہم نے ان سے کہا کہ اے نوح کے ساتھیوں کی ذرّیت تمہارا دادا نوح تو بڑا شکرگذار بندہ تھا یعنی تم بھی اپنے باپ کے سپوت بنتا اور شکرگذار بننے کی کوشش کرنا۔

بعض نے اس قول کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر محمول کیا ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ موسیٰ کی قوم ہی کے متعلق ہے کیونکہ اس آیت کے بعد بھی پھر موسیٰ کی قوم کا ذکر شروع ہوجاتا ہے ان الفاظ میں بنی اسرائیل کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح نوح کو ہم نے طوفان سے بچایا تھا تم کو سمندر سے نجات دی ہے پس نوح اور ان کے ساتھیوں کی طرح تم بھی شکرگذار بنو۔

اس آیت میں مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ ایک مخالفت کے طوفان سے ہم تم کو نجات دینے والے ہیں۔ تم بھی اس کی قدر کرنا۔ امت محمدیہ اور موسوی میں یہ فرق ہے کہ موسیٰ کی امت نے شکرگذاری سے کام نہ لیا لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع نے شکرگذاری کا بے نظیر نمونہ دکھایا۔ گو کچھ عرصہ بعد میں مسلمانوں نے بھی ناشکری کا نمونہ دکھایا اور اسی کی طرف درحقیقت ان آیات میں توجہ دلائی گئی ہے۔

۵۵ حل لغات۔ قَضَيْنَآ: قضی (یقضی) سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور قَضَى الشَّیْءَ کے معنی ہیں اَعْلَمَهٗ وَبَيَّنَهٗ۔ کسی چیز کو خوب کھول کر بتایا۔ (اقرب) پس قَضَيْنَا کے معنے ہونگے۔ اعلمنا و اخبرنا۔ ہم نے یہ بات کھولکر بتادی۔ قضی کی مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر ۵۸ء

وَلَتَعْلُنَّ:۔ علا (یعلو) سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور علا الشیءُ کے معنے ہیں ارتفع۔ کوئی چیز بلند ہوئی۔ عَلَا فلان فِی الْاَرضِ۔ تکبّر و تجبّر۔ اس نے تکبر اور سرکشی کی۔ عَلَا فلانًا۔ غَلَبَهٗ وقَهَرَهٗ کسی پر غالب آیا۔ عَلَا فلانًا بالسیفِ:۔ ضَرَبَه۔ اسے تلوار ماری۔ علا المکان۔ صَعِدَہ۔ کسی جگہ پر چڑھا۔ علا فی المکارم۔ شرف۔ خوبیوں میں ممتاز ہوا (اقرب) پس ولتعلنّ کے معنے ہونگے۔ کہ تم سرکشی کروگے۔

ولتعلن[۲]

تفسیر۔ فرمایا کہ تمہارا نبی مثیل موسیٰ قرار دیا گیا ہے اور اس مشابہت کو پورا کرنے کے لئے اسے بیت المقدس اور اس کے گرد کا علاقہ دیا جانے والا ہے۔ پس تم کو اس امر میں احتیاط کرنی چاہیئے کہ جو کچھ بنی اسرائیل سے بعد میں معاملہ ہوا وہ تم سے نہ ہو اور وہ واقعہ یہ بیان فرماتا ہے کہ بنی اسرائیل کے متعلق ہم نے خبر دی تھی کہ دو دفعہ تم دنیا میں عظیم الشان فساد کے مرتکب ہوگے۔ اور سخت مظالم کروگے اور تم کو اسکی سزا میں تباہ کر دیا جائے گا گو سزا دینے کا یہاں لفظاً ذکر نہیں کیا گیا لیکن اگلی آیت سے یہ مضمون ظاہر ہے۔

[۱] مسلمانوں کو مخالفت کے طوفان سے نجات دینے کی پیشگوئی

[۲] مسلمانوں کے لئے یہود سے عبرت حاصل کرنے کا موقعہ

اس آیت سے مندرجہ ذیل امور نکلتے ہیں (۱) اس میں قَضَيْنَا فِى الْكِتٰبِ کے الفاظ ہیں۔ جن سے مراد حضرت موسیٰ کی کتاب ہے (۲) اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے دو دفعہ باغی ہوکر الٰہی عذاب میں مبتلا ہونے کی خبر اس کتاب میں پہلے سے دے دی گئی تھی۔ نئے اور پرانے مفسرین اس آیت

قضینا[۳]

کی تفسیر میں دو غلطیاں کی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ بنی اسرائیل کی تباہی کے بعض واقعات تو درج کر دئے ہیں لیکن قرآنی الفاظ کی صداقت کے اظہار کے لئے وہ پیشگوئی درج نہیں کی جس کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔ دوم جنہوں نے پیشگوئی بیان کرنے کی طرف توجہ کی ہے انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیشگوئی موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں بیان کی گئی تھی۔ میں نے ان دونوں امور کو مدنظر رکھا ہے اور موسیٰ کی کتب سے پیشگوئیاں بیان کی ہیں اور واقعات تاریخی جمع کر کے لکھے ہیں۔

اس آیت سے دو امور کا ثبوت

عُلُوًّا کے معنی

عُلُوًّا بمعنے ظلم ہے یعنی تم لوگوں کے اوپر ظلم کروگے جبر کرنے لگ جاؤگے اور تکبر کروگے اور ظلم سے کام لوگے کیونکہ عَلَا (یَعْلُوْ۔ عُلُوًّا) فلانٌ کے معنی ہوتے ہیں تکبّر و تجبّر یعنی تکبر کیا اور ظلم سے کام لیا۔ وَعَلَا فُلَانًا بِالسَّیْفِ ضربہ اسکو تلوار ماری۔

فِی الْکِتٰبِ۔ کہکر یہ بتایا ہے کہ اس کا ذکر موسیٰ کی کتاب میں ہے۔ چنانچہ موسیٰ کی کتاب میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے

یہود کی تباہی کا ذکر بائیبل میں۔

استثناء باب ۲۸۔ آیت ۱۵ میں لکھا ہے "لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوا نہ ہوگا کہ اس کے سارے شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھے بتاتا ہوں دھیان رکھ کے عمل کرے تو ایسا ہوگا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی اور تجھ تک پہنچیں گی۔" اس کے بعد ان لعنتوں کا ذکر کیا ہے جو نافرمانی کی وجہ سے ان پر اُتریں گی۔ چنانچہ فرماتا ہے "خداوند تجھ کو اور تیرے بادشاہ کو جسے تو اپنے اوپر قائم کرے گا ایک گروہ کے درمیان جس سے تو اور تیرے باپ دادے واقف نہ تھے لے جائے گا۔" آیت ۳۶۔ پھر لکھا ہے "خداوند ایک گروہ دُور سے زمین کی انتہا سے ایسا جلد بلکہ جیسا عقاب اُڑتا ہے تجھ پر چڑھا لائے گا وہ ایک گروہ ہوگی جسکی زبان تو نہ سمجھے گا وہ ترشرو گروہ ہوگی جو نہ بوڑھے کا ادب نہ جوان پر کرم کرے گی اور وہ تیری مواشی کا پھل اور تیری زمین کا پھل کھا جائے گی یہاں تک کہ تو ہلاک ہو جائے گا۔ اس لئے کہ غلّے اور مَے اور تیل اور تیری گائے بیل کی بڑھتی اور بھیڑ بکری کے گلوں سے تیرے لئے کچھ نہ چھوڑے گی یہاں تک کہ وہ تجھے فنا کر دے گی اور وہ تجھے تیرے سب پھاٹکوں میں آگھیریگی یہاں تک کہ تیری اونچی اور محکم دیواریں جن کا تجھے اپنے سارے ملک میں بھروسا تھا گر جائینگی اور وہ تجھے اس ساری زمین میں جسے خداوند تیرے خدا نے تجھے دیا ہے ہر ایک شہر کے سب پھاٹکوں میں آگھیرے گی۔ اور تو اپنے ہی بدن کا پھل ہاں اپنے بیٹوں اور اپنی بیٹیوں کا گوشت جنہیں خداوند تیرے خدا نے بخشا تھا اس محاصرہ کے وقت اور اس تنگی میں جو تیرے بیریوں کے سبب سے تجھ پر ہوگی کھائے گا وہ شخص جو تم میں نرم دل اور بہت ناز پروردہ ہوگا اسکی بھی نظر اپنے بھائی کی طرف اور اپنی ہمکنار جورو کی طرف اور اپنے باقی لڑکوں کی طرف جنہیں اُس نے چھوڑ دیا ہوگا بُری ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے بچوں کے گوشت میں سے جسے وہ کھائے گا انہیں ان میں سے کسی کو کچھ نہ دے گا کیونکہ اس محاصرے اور تنگی میں جو تیرے دشمنوں کے باعث سے تیرے سارے پھاٹکوں میں تجھ پر ہوگی اس کے لئے کچھ نہ باقی رہے گا وہ عورت بھی جو تمہارے درمیان نرم دل اور نہایت نازنین ہوگی۔ ایسی کہ نزاکت اور نرمی سے اپنے پاؤں کا تلوا زمین پر لگانے کی جرأت نہیں رکھتی اسکی نظر اپنے ہمکنار شوہر کی طرف اور اپنے بیٹے کی طرف اور اپنی بیٹی کی طرف بُری ہوگی۔" آیت ۴۹ تا ۵۶۔ پھر لکھا ہے:۔

"اور یوں ہوگا کہ جس طرح خداوند نے تم سے خوش ہو کر تمہارے ساتھ نیکی کی اور تمہیں بہت کر دیا اسی طرح خداوند تمہاری بابت خوش ہوگا کہ تمہیں ہلاک کرے اور نیست و نابود کر ڈالے اور تو اس سرزمین سے جس کا تو مالک ہونے جاتا ہے جڑھ سے اُکھاڑ ڈالا جائیگا۔ اور خداوند تجھ کو سب قوموں کے درمیان زمین کے اس سرے سے اس سرے تک تتر بتر کریگا اور وہاں تو غیر معبودوں کی جو لکڑیاں اور پتھر ہیں جس سے نہ تو نہ تیرے باپ دادے واقف تھے پرستش کریگا" آیت ۶۳و ۶۴

ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو خبردار کیا ہے کہ اگر وہ احکام الٰہی کو توڑ دینگے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ ایک غیر قوم دُور سے ان پر چڑھ

جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ

ان دُو (بار کے فسادوں) میں سے پہلی (بار) کا وعدہ (پورا ہونے کا وقت) آیا۔ تو ہم نے اپنے بعض ایسے بندوں کو

بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا

(تمہاری سرکوبی کے لئے) تم پر (مستولی کرکے) کھڑا کر دیا جو سخت جنگ جو تھے سو وہ (تمہارے) گھروں کے اندر جا گھسے اور یہ وعدہ

مَّفْعُوْلًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ

بہر حال) پورا ہو کر رہنے والا وعدہ تھا ؎۶ پھر ہم نے تمہاری طرف (دشمن پر) دوبارہ حملہ کی طاقت کو لوٹا دیا اور ہم نے کثی

آئے گی۔ اور ان کا محاصرہ کرے گی محاصرہ کے وقت قحط اور وباء پڑیں گے۔ آخر ان کے شہروں کی فصیلیں توڑ دی جائیں گی بادشاہ قید کر کے لے جایا جائے گا۔ اور قوم جلاوطن کر کے دُور علاقوں میں بھیج دی جائے گی۔ یہ پیشگوئی اُن دو فسادوں میں سے جن کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے پہلے فساد کی نسبت ہے۔

یہ جو فرمایا قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے ایک وحی کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو آئندہ آنے والی اس مصیبت سے خبر دے دی تھی مگر افسوس کہ وہ پھر بھی ہوشیار نہ ہوئے۔

دراصل پہلے بتانے سے غرض ہوشیار کرنا ہی ہوتا ہے اور ہوشیار کرنے کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ (۱) انسان کوشش کرے اور بچ جاوے۔ (۲) اگر نہ بچے تو اس پر حجت پوری ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کے متعلق فرمایا ہے لتتبعنّ سُنن من کان قبلکُم (بخاری جلد رابع کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) کہ تم پہلے لوگوں کے طریقہ پر عمل کرو گے۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چلو گے مگر افسوس کہ باوجود ہوشیار کر دینے کے مسلمان بھی اس آفت سے نہ بچے۔

؎۶ حل لغات۔ اولی باس:۔ اُولُو جمع ہے جس کے معنے ذوو کے ہیں (یعنی فلاں صفت والے) اس کا مفرد نہیں آتا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اسم جمع ہے۔ اور اس کا مفرد ذو ہے جیسے غنم اسم جمع ہے۔ اور شاۃٌ اس کا مفرد ہے (اقرب) الباس:۔ العذاب۔ عذاب۔ الشدۃ فی الحرب گھمسان کی لڑائی (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ نحل ؎۸۲ یس اُولی باس کے معنے ہونگے جنگجو۔

جاسوا۔ جَاسَ (يَجُوْسُ جَوْسًا) الشَّیْءَ کے معنی ہیں۔ طَلَبَهٗ بِالْاِسْتِقْصَاءِ کسی چیز کو حاصل کرنے میں انتہائی محنت و کاوش سے کام لیا۔ اور جَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ کے معنے ہیں۔ دارُوا فیھا بالعیث و الفسادِ علاقوں میں فساد اور تباہی مچاتے ہوئے گھس گئے وفسّرہ الجوھری بقولہ ای تخلّلوْا فطلبُوا ما فیمکما یجُوس الرّجلُ الاخبار ای یطلبھا۔ اور جوہری نے جاسُوْا خِلٰلَ الدِّیار کے معنے یہ کئے ہیں۔ وہ علاقہ میں گھس گئے۔ اور مال و دولت کو حاصل کرنا چاہا۔ (اقرب)

دیار:۔ دار کی جمع ہے۔ اور دار کے معنی المحلُّ مکان والعرصۃ صحن میدان۔ البلد شہر ملک۔ علاقہ (اقرب)

خِلٰلَ الدّیار:۔ ماحوالی حدودھا وما بین بیوتہا ملکوں کی حدوں اور ان کے گھروں کے درمیان (اقرب)

تفسیر۔ اب اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا حال بتاتا ہے اور فرماتا ہے کہ جب پہلے وعدہ کا وقت آگیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر ایسے لوگ غالب کر دیئے جو سخت

تفخاسے معنی

جاسوا

انسان کو ہوشیار کرنے کے دو مقصد

دیار

آنحضرت کا اپنی امت کو ہوشیار کرنا

اُولی باس

جنگ کرنے والے تھے۔ وہ آئے اور تمہارے گھروں میں گھس گھس کر انہوں نے تم کو ہلاک کر دیا۔

وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۔ وہ وعدہ ہمارا پورا ہو کر رہنے والا تھا۔ یا یہ کہ ہمارا وعدہ پورا ہو ہی گیا ہے۔

آیت میں یہود پر دو عذابوں کا ذکر

جن دو عذابوں کے متعلق اس آیت میں خبر دی گئی ہے اس کا ذکر قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ یوں کیا گیا ہے لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (مائدہ ع۱۱) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت داؤد کے بعد عذاب آیا۔ اور ایک دفعہ حضرت عیسیٰ کے بعد آیا۔

یہود پر پہلے عذاب کا ذکر بائبل میں

پہلے عذاب کا حال بائبل سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہود حضرت موسیٰ کے بعد طاقتور ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت داؤد کے زمانہ میں ایک زبردست حکومت کی بنیاد پڑ گئی جو ان کے بعد بھی ایک عرصہ تک قائم رہی اور آخر آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئی اور آخری زمانہ میں بابل کے شمال کے علاقہ میں بسنے والی اشوری قوموں نے ان کو شکست دی یہ قوم نینوا کی بادشاہ تھی۔ انہوں نے یہود کو اپنا باجگذار بنا لیا۔ اس کے بعد "نیکو" ایک مصر کا شہزادہ تھا۔ اس نے اسوریوں کو شکست دی اور وہ نینوا کی بجائے مصریوں کے باجگذار بن گئے۔ ۶۰۰ سال قبل مسیح کے قریب اور حضرت داؤد سے قریباً ۴۰۰ سال بعد یرمیاہ نبی کی معرفت ان کو انکی خرابیوں پر اللہ تعالیٰ نے پھر تنبیہ کیا۔ اور ان کے گناہوں پر انہیں پھر تنبیہ کی اور فرمایا کہ اگر اب بھی توبہ کر لو تو وہ جو تمہارے لئے جلا وطنی کی پیشگوئی تھی ٹلا دی جائے گی مگر وہ باز نہ آئے (یرمیاہ باب ۷)

آخر اللہ تعالیٰ نے بابلیوں کو ان کے عذاب کے لئے مسلط کیا۔ یہ واقعہ بائبل کی کتاب ۲ سلاطین باب ۲۵ میں یوں لکھا ہے "شاہ بابل نبوکدنصر نے اور اسکی ساری فوج نے یروشلم پر چڑھائی کی۔" آیت ۱۔ اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ بہت دیر تک رہا۔ اس وقت یروشلم کا بادشاہ صدقیاہ تھا۔ جب محاصرہ نے طول پکڑا تو شہر کے اندر غلہ کم ہو گیا لکھا ہے "تب شہر ٹوٹا" آیت ۴ یعنے بابل کی فوج نے فصیل توڑ دی۔ آخر لوگ ایک طرف کا دروازہ کھول کر بھاگ گئے صدقیاہ بادشاہ بھی بھاگا مگر پکڑا گیا اس کی آنکھیں نکالی گئیں اور آنکھیں نکالنے سے پہلے اس کے بیٹوں کو اس کے سامنے ہلاک کر دیا گیا پھر اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اسے بابل لے گئے آیت ۴ تا ۷۔ اس کے بعد شاہ بابل نے اپنے ایک افسر نبوزردان کو یروشلم بھجوایا۔ اس نے آکر "خداوند کا گھر اور بادشاہ کا قصر (محل) اور یروشلم کے سارے گھر یعنی ہر ایک بڑا گھر جلا دیا۔ اور کسدیوں کے سارے لشکر نے جو جلوداروں کے سردار کے ہمراہ تھا ان دیواروں کو جو یروشلم کے گرداگرد تھیں گرا دیا اور باقی لوگوں کو جو شہر میں چھوڑے گئے تھے اور ان کو جنہوں نے اپنوں کو چھوڑ کے شاہ بابل کی پناہ لی تھی تمام جماعت کے بقیہ کے ساتھ نبوزردان جلوداروں کا سردار پکڑ کر لے گیا" آیت ۹ تا ۱۱۔

نحمیاہ نبی کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تباہی کا ایک بڑا باعث سبت کی بے حرمتی تھی۔ چنانچہ لکھا ہے "تب میں نے یہوداہ کے شریف لوگوں سے تکرار کرکے کہا کہ یہ کیا بُرا کام ہے جو تم کرتے ہو کہ سبت کے دن کو مقدس نہیں جانتے ہو کیا تمہارے باپ دادوں نے ایسا نہیں کیا اور ہمارا خدا ہم پہ اور اس شہر پہ یہ سب آفتیں نہیں لایا؟ تب بھی تم سبت کے دن کو پاک نہ مان کے اسرائیل پہ زیادہ غضب بھڑکاتے ہو؟" باب ۱۳۔ آیت ۱۷-۱۸۔

اسی طرح حزقیل نبی نے بھی اس وقت یہود کو ڈرایا تھا۔ انہوں نے ان کے بہت سے گناہوں کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے ایک گناہ یہ گنایا ہے کہ "تُو نے میرے مقدسوں کو ناچیز جانا ہے اور میرے سبتوں کو ذلیل کیا ہے" حزقیل باب ۲۲ آیت ۸۔ پھر باب ۲۳ آیت ۳۸ میں ہے "اس کے سوا انہوں نے مجھ سے یہ کیا ہے کہ اسی دن انہوں نے میرے مقدس کو ناپاک کیا اور میرے سبتوں کو حرمت نہ دی۔"

میں نے سبت کی بے حرمتی کے حوالے اس لئے دیئے ہیں کہ اس

اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ

قسم کے مالوں اور (نیز) بیٹوں کے ذریعہ سے تمہاری مدد کی۔ اور ہم نے تمہیں جتھے کے لحاظ سے بھی (پہلے سے) زیادہ

نَفِیْرًا ۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ

کر دیا ۵ (اب) اگر تم نیکوکار بنو گے تو نیکوکار بن کر اپنی جانوں کو ہی فائدہ پہنچاؤ گے۔ اور

جگہ صرف سخت عذاب کی خبر بتائی گئی ہے مگر درحقیقت اشارہ سورہ نحل کی آیات کی طرف ہے جن میں کہا گیا تھا کہ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ (نحل ع ۱۶) یعنی سبت کا عذاب ان لوگوں پر نازل کیا گیا تھا جنہوں نے الٰہی کلام میں اختلاف کر کے دین کو نقصان پہنچایا تھا۔ قرآن کریم کے مضامین کی ترتیب کی اس آیت میں ایک زبردست شہادت ہے کہ سورہ نحل جو بعد میں اُتری ہے اس میں سبت کا ذکر ہے سورۂ بنی اسرائیل اس سے پہلے کی نازل شدہ ہے اور اس کے مضامین سورۂ نحل سے اس طرح چسپاں ہو جاتے ہیں گویا سورہ نحل پہلے کی ہے اور اسرا بعد کی۔ اور اس میں سورۂ نحل کے مضامین کے جواب دیئے گئے ہیں اور ان کی تکمیل کی گئی ہے۔

تاریخ سے بابلیوں کی اس چڑھائی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب یہود کمزور ہو گئے تو اسوریوں نے فلسطین کو فتح کر کے اپنا تابع کر لیا۔ لیکن اس کے بعد ایک مصری بادشاہ فرعون نیکو (PHARAOH NECHO) نامی نے اسورین حکومت کو تباہ کر دیا۔ اور فلسطین اسوریوں کی حکومت سے نکل کر مصر کی حکومت تلے آ گیا۔ فرعون مصر نے یوسیاہ کے بیٹے الیاقیم (اس کا نام یہویقیم کر دیا گیا) ELIAKIM کو وہاں کا بادشاہ بنا دیا۔ لیکن اس دوران میں اسورین حکومت کی تباہی کو دیکھ کر اس کے ہمسایہ کلدانی (CHALDEAN) بادشاہ نے اپنے بیٹے نبوکدنضر (NEBUCHADNEZZAR) کو نیکو کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ اور نبوکدنضر نے مصر کو فتح کر لیا۔ اور فلسطین بابلیوں کے زیر اثر آ گیا۔ مگر فلسطین کا بادشاہ یہویقیم مصر کی طرف مائل رہا۔ اس پر نبوکدنضر نے اس پر چڑھائی کی (یہ چڑھائی نبوکدنضر کے جرنیل نے کی ۵۸۷ ق م جس کا نام نبوزر آدم تھا) مگر اس کے لشکر پہنچنے سے پہلے بادشاہ یہویقیم مر گیا۔ اس کا بیٹا یہوکین (JEHOICHIN) تاب مقابلہ نہ لا کر معافی کا طلبگار ہوا۔ اسے بابل بلا لیا گیا۔ اور صدقیاہ (ZED CHIAH) (یہ یہویقیم کا بھائی تھا اور اس کا اصل نام متنیاہ (MATTANIAH) تھا) کو فلسطین کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ مگر اس نے بھی مصر کے بادشاہ حوفرا (HOPHRA) کی طرفداری کی۔ اس پر بابلیوں نے ۵۸۸ قبل المسیح میں فلسطین کے دارالخلافہ کا محاصرہ کر لیا۔ آخر ۵۸۶ قبل مسیح میں شہر کی دیوار توڑ دی گئی۔ صدقیاہ بھاگا۔ مگر گرفتار کر لیا گیا۔ اور بادشاہ کے حکم سے قید کر کے بابل پہنچایا گیا۔ بابلیوں نے یہود کی مقدس عمارات کو جلا دیا۔ اور فصیل کو گرا دیا۔ اور شہر برباد کر دیا۔

یہود پر تباہی سبت کی بےحرمتی کی وجہ سے آئی

۵۷ حل لغات

اَلْكَرَّةُ: اَلْكَرَّةُ: کرّ کے معنے ہیں فَرَّ لِلْجَوَلَانِ ثُمَّ عَادَ لِلْقِتَالِ یعنی گھوڑسوار نے پہلے میدان جنگ میں چکر لگایا۔ پھر لڑنے کے لئے لوٹا۔ الکرّۃ کے معنے ہیں۔ المرّۃ۔ باری۔ دفعہ۔ الحملۃ فی الحرب۔ لڑائی میں حملہ (اقرب) پس ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ کے معنے ہیں۔ تمہاری طرف دوبارہ حملہ کی طاقت کو لوٹا دیا۔

نفیرٌ: نفیر:۔ النفیر لما دون العشرۃ من الرجال

اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا

اگر تم بُرا کرو گے تو (بھی) ان (ہی) کے لئے (بُرا کرو گے) پھر جب دوسری بار والا وعدہ (پورا ہونے کا وقت) آگیا تاکہ وہ (یعنی تمہارے دشمن) تمہارے

وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ

معزز لوگوں سے ناپسندیدہ معاملہ کریں اور (اسی طرح) مسجد میں داخل ہوں جس طرح وہ اس میں پہلی بار داخل ہوئے تھے۔ اور جس چیز پر

مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ عَسٰى رَبُّكُمْ

غلبہ پائیں۔ اسے بالکل تباہ (و برباد) کر دیں۔ ۵ (اب بھی) کچھ بعید نہیں کہ تمہارا رب

دس سے کم لوگوں پر نفیر کا لفظ بولتے ہیں۔ القوم ینفرون معك و یتنافرون فی القتال۔ وہ لوگ جو لڑائی کے لئے گھروں سے اکٹھے نکلیں وقیل ھم الجماعة یتقدمون فی الامر۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ نفیر لوگوں کی اس جماعت کو کہتے ہیں جو کسی کام میں پیش قدمی کرے (اقرب)

تفسیر یعنی اس تباہی کے بعد پھر خدا تعالیٰ نے تم کو نجات دی اور طاقت عطا کی اور یہ اس طرح ہوا کہ یہود کی اس تباہی کے بعد میڈا اور فارس کا بادشاہ بابل پر چڑھ آیا اور بنی اسرائیل اپنے ایک نبی کے حکم کے ماتحت اس کے ساتھ مل گئے اور اس نے ان کو قید سے آزاد کر دیا۔ اس کا تفصیلی ذکر سورۃ بقرہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں گذر چکا ہے

یہود کی پہلی تباہی کے بعد نجات کی خبر بائیبل میں

اس واقعہ کی نسبت حضرت موسیٰؑ نے ان الفاظ میں پیشگوئی کی تھی " اور یوں ہوگا کہ جب یہ سب کچھ تجھ پر گذریگا۔ برکت اور لعنت جنہیں میں نے تیرے آگے رکھا اور تو ان سب گروہوں میں جہاں جہاں خداوند تیرا خدا تجھ کو بھگائے انہیں یاد کریگا اور تو خداوند اپنے خدا کی طرف پھرے گا۔ اور ان حکموں کے موافق جو آج میں نے تجھے کہے تو اپنے بال بچوں سمیت اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی سے اسکی آواز کو سُن لے گا۔ تب خداوند تیرا خدا تیری اسیری کو بدلے گا۔ اور تجھ پر رحم کریگا اور پھر کے تجھ کو اُن سب گروہوں میں سے جن میں خداوند تیرے خدا نے تجھے تتر بتر کیا تھا تجھے جمع کریگا۔ اگر تجھ میں سے کوئی آسمان کی اس انتہا تک بھگا یا گیا ہوگا تو خداوند تیرا خدا وہاں سے تجھے جمع کریگا اور وہاں سے تجھے پھیر لائے گا۔ اور خداوند تیرا خدا تجھ کو اس زمین جس پر تیرے باپ دادے قابض ہوئے تھے لائے گا اور تو اس کا مالک ہوگا۔ اور وہ تجھ سے نیکی کرے گا اور تیرے باپ دادوں سے زیادہ تجھے بڑھائے گا " استثنا باب ۳۰ آیت ۱ تا ۵۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے پہلی تباہی کے بعد بنی اسرائیل کی دوبارہ بحالی کی خبر دی تھی اور اسی کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے اور اس بحالی کا حال یہ ہے کہ ۵۴۴ قبل مسیح میڈا اور فارس کے بادشاہ نے جس نے بابل فتح کر لیا تھا۔ اس صلہ میں کہ یہود نے اسکی مدد کی تھی ان کو واپس یروشلم جانے کی اجازت دے دی۔ یہود کے ایک نبی نحمیاہ کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے بھیجا گیا تا وہ یروشلم اور دوسرے یہودی مقامات کو دوبارہ آباد کریں اس بادشاہ کا نام خورس تھا اور انگریزی میں اسے سائرس لکھتے ہیں۔ اس نے نہ صرف یہود کو ان کے وطن میں واپس جانے کی اجازت دی بلکہ وہ سامان جو وہاں سے نبوکدنضر لے گیا تھا وہ بھی ان کو واپس دے دیا (عزرا باب ۱ آیت ۲ و ۳ و ۷ و ۸) (یہ عزرا وہی عزیر ہیں جن کا قرآن کریم میں ذکر آتا ہے کہ یہود انہیں خدا کا بیٹا کہتے تھے۔)

۵۸ حل لغات ۔ لِيَسُوْۗءٗا :۔ سَاءَ سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور سَاءَهٗ (یسوءہ سَوْءً) کے

لِيَسُوْۗءٗا

اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ

تم پر رحم کردے اور اگر تم (پھر اپنے اسی رویہ کی طرف) لوٹے تو ہم بھی (اپنی اسی سنت کی طرف) لوٹیں گے. اور (یاد رکھو کہ) جہنم کو ہم نے

معنے ہیں۔ فعل به مایکرهه او احزنه. اس سے ایسا معاملہ کیا جس کو وہ ناپسند کرتا تھا یا اس کو غمگین کیا (اقرب)

وُجُوْہٌ:۔ وجہ کی جمع ہے۔ اور الوجه کے معنے ہیں نفس الشیءِ۔ کسی چیز کی ذات۔ سیّد القومِ۔ قوم کا سردار۔ الجاہُ عزت (اقرب)

وَلِيُتَبِّرُوْا:۔ تَبَّرَ سے مضارع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور تَبَّرَہٗ کے معنے ہیں۔ اهلكه ودمّره۔ اس کو ہلاک وتباہ کر دیا۔ تَبَّرَ كُلَّ شَیْءٍ:۔ کسّرہ وفتّتہ۔ کسی چیز کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

انتبار: الهلاك۔ ہلاکت (اقرب) وَلِيُتَبِّرُوْا کے معنے ہوں گے۔ کہ وہ ہلاک کر دیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں یہود کے دوسرے فساد کی خبر دی گئی ہے اور پھر اسکی سزا کا ذکر کیا گیا ہے۔ فساد ان کا حضرت عیسٰی کو دکھ دینا تھا۔ اور سزا ان کا رومیوں کے ہاتھوں سے تباہ ہونا تھا یہ واقعہ صلیب کے واقعہ کے ۳۷ سال بعد کا ہے۔ گویا حضرت عیسٰی کی زندگی میں ہی یہ واقعہ ہوا کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی عمر ۱۲۰ سال تھی۔ اور تینتیس سال کی عمر میں وہ صلیب پر لٹکائے گئے تھے

اس عذاب کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ویسپین نامی ایک رومی جرنیل تھا اسے بادشاہ روم نے یہود کی سرکشیوں کی وجہ سے انکی سرکوبی کا حکم دیا تھا۔ جب یہ اس حکم کے بجا لانے میں مشغول تھا۔ اسے ایک کشف نظر آیا۔ جسکی تعبیر اس نے یہ کی کہ مجھے روم واپس جانا چاہیئے۔ کیونکہ وہاں سے فسادات کی خبریں آرہی تھیں۔ اس کے واپس لوٹنے پر وہاں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اسے بادشاہ بنا دیا گیا اور اس نے اپنے بیٹے ٹائٹس کو فلسطینی مہم کا افسر مقرر کر دیا جس نے یروشلم کو ۷۰ء بعد مسیح فتح کرکے اس کے گرائے جانے کا حکم دیا۔ اور شہر کی دیواروں اور مسجد کو گرا دیا گیا اور یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ گو ۱۳۵ء میں یہود نے پھر ایک ناکام بغاوت کی مگر وہ صرف چراغ سحری کے آخری شعلہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ جیو اور ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ)

وُجُوْہٌ

وَلِيُتَبِّرُوْا

۸ یہود کا دوسرا فساد اور اسکی سزا

اس واقعہ کی نسبت بائبل میں ان الفاظ میں حضرت موسیٰ کی پیشگوئی درج ہے۔" انہوں نے اجنبی معبودوں کے سبب اُسے غیرت دلائی۔ اور وہ اُسے نفرتی کاموں سے غصے میں لائے۔ انہوں نے شیطانوں کے لئے قربانیاں گذرانیں نہ خدا کے لئے۔ بلکہ ایسے معبودوں کے لئے جنکو آگے وے نہ پہچانتے تھے۔ جو نئے تھے اور حال میں معلوم ہوئے اور ان سے تیرے باپ دادے نہ ڈرتے تھے۔ تو اس چٹان سے جس نے تجھے پیدا کیا غافل ہوا۔ اور اس خدا کو جس نے تجھے صورت بخشی بھول گیا۔ اور جب خداوند نے یہ دیکھا تو اُن سے نفرت کی اس لئے کہ اس کے بیٹوں اور اسکی بیٹیوں نے اسے غصہ دلایا۔ اور اس نے یہ فرمایا کہ میں اُن سے اپنا مُنہ چھپاؤں گا۔ تاکہ میں دیکھوں کہ انجام کیا ہوگا اس لئے کہ وہ کج نسل ہیں۔ ایسے لڑکے جن میں امانت نہیں۔ انہوں نے اس کے سبب سے جو خدا نہ تھا مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا۔ سو میں بھی انہیں اس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالوں گا اور ایک بے عقل قوم سے انہیں خفا کروں گا کیونکہ میرے غصے سے ایک آگ بھڑکی ہے جو اسفل جہنم تک جلے گی اور زمین کو اس کے پیداوار سمیت کھا جائیگی اور پہاڑوں کی نیو دوں کو جلا دیگی۔ میں ان کی بلاؤں کو ان کے اوپر بڑھاؤں گا اور ان پر اپنے تیروں کو خرچ کروں گا۔ وہ بھوک سے جل جائینگے اور سوزندہ گرمی اور کڑوی ہلاکت کے لقمے ہونگے۔ میں ان پر درندوں کے دانتوں اور زمین کے زہردار سانپوں کو

۲ بائیبل میں یہود کی دوسری تباہی کا ذکر

لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ

کافروں کے لئے قید خانہ بنایا ہے ۹۵ یہ قرآن یقیناً اس (راہ کی) طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے

هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ

زیادہ درست ہے اور مومنوں کو جو مناسب حال کام کرتے ہیں بشارت دیتا ہے

چھوڑوں گا۔ باہر سے تلوار اور اندر کے مکانوں سے خوف جوان کو اور کنواری کو بھی شیر خوار کو اور سر سفید کو بھی ہلاک کریں گے" استثناء باب ۳۲ آیت ۱۸ تا ۲۵۔ یہ پیشگوئی پہلی پیشگوئی کے بعد بلکہ اس پیشگوئی کے بھی بعد کہ پہلے فساد کے بعد اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو واپس یروشلم میں لے آئے گا۔ بیان ہوئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے عذاب کے بعد ایک دوسرے عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ اور یہ عذاب وہ دوسرا عذاب ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ کے الفاظ میں کیا ہے۔

آنحضرتؐ کے متعلق پیشگوئی بائبل میں

۹۵ حل لغات۔ الحصیر۔ السجن قید خانہ (اقرب)

اَلْحَصِيْر

تفسیر۔ بنی اسرائیل کی کامل تباہی کی خبر دینے کے بعد اب قرآن کریم انہیں امید کا پہلو دکھاتا ہے اور فرماتا ہے کہ بائبل کا جہاں تک تعلق ہے تم ہمیشہ کے لئے ہلاک کر دیئے گئے ہو مگر موسوی مذہب سے باہر ہو کر تمہاری ترقی کی راہ ابھی کھلی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ سے دوبارہ ترقی کرنے کا تمہاری قوم کو موقعہ دیا ہے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ تعالےٰ کے فضلوں کے وارث ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم نے اس موقعہ سے بھی فائدہ نہ اٹھایا تو اللہ تعالیٰ کی سزائیں دوبارہ تم کو آگھیریں گی اور تم بالکل تباہ ہو جاؤ گے۔

بنی اسرائیل کے لئے کامل تباہی کے بعد ترقی کی امید قرآن کریم کے ذریعہ

دیکھو ان آیات میں یہودی قوم کو سمجھانے کے لئے کیسا احسن طریق اختیار کیا ہے خود انکی کتب سے انکی تباہی کی خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ خود یہودی کتب کے مطابق اب کوئی مستقبل یہودیت کے لئے باقی نہیں پس جب خود انکی کتب انکی ہلاکت کا فتویٰ دے چکی ہیں تو ان کو اس متروک راستہ کو چھوڑنے میں جسے خدا تعالیٰ چھڑوا چکا ہے عذر نہیں ہونا چاہیئے اور اسلام کو قبول کر کے دینی و دنیوی انعامات حاصل کرنے چاہئیں۔ اس نئے راستہ کے متعلق بھی بائبل میں خبر موجود ہے۔ استثناء باب ۳۳ آیت ۱ تا ۳ میں فرماتا ہے "اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی۔ ہاں وہ اس قوم سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے نزدیک نزدیک بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے" یعنی اللہ تعالیٰ فاران سے جلوہ گر ہونے والے نبی کے ذریعہ سے پھر یہود کی برکت کا سامان پیدا کرے گا۔ اگر وہ چاہیں تو ہدایت پا کر ترقی کر سکتے ہیں۔ یہ پیشگوئی تباہی کی خبر کے معًا بعد دوسرے باب میں بیان ہوئی ہے۔

مسلمانوں پر دو دفعہ تباہی آنے کی پیشگوئی

یاد رکھنا چاہیئے کہ آیات مذکورہ بالا جہاں یہ بتا رہی ہیں کہ یہود کا مستقبل خود ان کی کتب کے رو سے بالکل تاریک ہے وہاں مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی ہے کہ مسلمانوں پر بھی اسی طرح دوبارہ انکی بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب آئے گا چنانچہ [illegible] عذاب خلافت عباسیہ کے خاتمہ پہ آیا۔ اس کا موجب [illegible] وہی تھا جو بائبل نے یہود کی تباہی کا موجب بتایا ہے

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ

کہ ان کے لئے (بہت) بڑا اجر (مقدر) ہے ۱۰ اور یہ کہ جو لوگ

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚ ع ۱

آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لئے ہم نے درد ناک عذاب تیار کیا ہے۔ ۱۱

یعنے فرغانہ کی فتح کے بعد مسلمانوں نے کثرت سے وہاں کی خوبصورت لڑکیوں سے شادیاں کریں۔ یہ علاقہ بہت مشرک تھا۔ ان عورتوں کے اثر سے مسلمانوں میں بھی مشرکانہ عقائد پیدا ہونے لگے۔ اور اسلامی غیرت کمزور ہونے لگ گئی۔ آخر ایک وحشی قوم نے بغداد پر حملہ کر دیا جو اپنی وحشت اور اجنبیت کے لحاظ سے اسلامی ممالک اور انکی تہذیب سے ویسی ہی بیگانہ تھی جیسی کہ بابل کی قوم جس نے فلسطین پر حملہ کیا تھا اٹھارہ لاکھ مسلمان صرف بغداد اور اس کے گرد و نواح میں قتل کیا گیا۔ شاہی خاندان کے تمام لوگوں کو انکی فہرستیں بنوا بنوا کر اور تلاش کر کر کے قتل کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ صرف ایک شخص بھاگ کر بچ سکا اور اسی کی نسل سے بہاولپور کے والیانِ ریاست ہیں ان کے علاوہ کوئی بھی خاندان ایسا نہیں جو اپنے آپ کو عباس کی طرف منسوب کرے (اس نوٹ لکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ یوپی میں عباسی خاندان کی بعض شاخیں موجود ہیں ان میں سے ایک نے مجھے اپنا شجرہ نسب بھی بھجوایا ہے)۔

دوسری تباہی آخری زمانہ کے وقت مقدر تھی جس کے آثار اب نمودار ہو رہے ہیں۔ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا العیاذ باللہ

۱۰ تفسیر: یہ قرآن کریم یقیناً اس مقصد کی طرف ہدایت کرتا ہے جو پہلے لوگوں کے مقاصد سے بہت اعلیٰ ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کے نتائج بھی ان کتابوں سے اعلیٰ ہی نکلیں اور وہ انعام جو اس کے نتیجہ میں ملیں گے وہ روحانی بھی ہونگے اور جسمانی بھی۔ پس اس پر عمل کرو۔ اور انعام حاصل کرو۔ اسی طرح اس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تم کو پہلے لوگوں سے بڑھ کر اور بہتر انعام ملنے والا ہے۔ پس تم کو ان لوگوں سے زیادہ ہوشیار رہنا چاہیئے۔ تا ایسا نہ ہو کہ کسی وقت تمہاری نسلیں انعام پر اترا کر خراب ہو جائیں اور الٰہی عذاب کی مستحق ہو جائیں۔

(حاشیہ: ۲ — مسلمانوں کے لئے ڈرنے کا مقام)

۱۱ تفسیر: اس آیت میں اس مضمون کی طرف جو پہلی آیت میں اشارہ بیان ہوا تھا واضح کیا گیا ہے اور فرماتا ہے کہ جو قوم بھی اپنے انجام سے غافل ہو جائے آخر عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

(حاشیہ: ۱ — مسلمانوں پر پہلی تباہی یعنی خوفناک پر خطرناک تباہی کے دن)

آخرت کے معنے بعد میں آنے والی چیز کے ہوتے ہیں قرآن کریم میں چونکہ یوم آخرت کا بار بار ذکر ہے لوگوں کے ذہن پر یہ امر متسلط ہو گیا ہے کہ آخرت کے معنے صرف یوم آخرۃ کے ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ آخرت کے اصل معنے بعد میں آنے والی شئے کے ہیں۔ پس جس موقعہ پر اس لفظ کا استعمال ہو اسی کے مطابق اس کے معنے کئے جانے چاہئیں اس جگہ موقعہ کے لحاظ سے قوموں کے انجام کے معنے نہایت مناسب ہیں اور معنے یہ ہیں کہ جو قومیں اس امر کو بھلا دیتی ہیں کہ ہر کمالے را زوالے۔ اور اپنے انجام کی اصلاح سے غافل ہو جاتی ہیں وہ اپنی ذمہ واریوں کی ادائیگی میں بھی سست ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مستحق ہو جاتی ہیں۔ پس ہر قوم کو اپنے انجام کو زیر نظر رکھنا چاہیئے اور ہر خرابی کے موقعہ پر اپنی قوم کی اصلاح کر لینی چاہئے تا کہ اسے ہمیشہ زندگی ملتی رہے اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے وہ بچ جائے۔

(حاشیہ: ۲ — آخرت کے معنی)

(حاشیہ: ۱ — مسلمانوں پر دوسری تباہی)

اس آیت سے پہلے جو واؤ عاطفہ ہے وہ انہی معنوں پر

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ

اور جس طرح انسان بھلائی کو اپنی طرف بُلاتا ہے اسی طرح وہ بُرائی کو بھی اپنی طرف بلاتا ہے۔ اور

الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ

انسان بڑا جلد باز (واقع ہوا) ہے ۱۲ــــه اور ہم نے رات اور دن (کے) دو نشان بنائے ہیں

دلالت کرتی ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کو ہے اور مسلمان یوم آخر پر ایمان رکھتے تھے اس کے منکر نہ تھے۔

یدع الانسان

۱۲ــــه حل لغات

یَدْعُ الْاِنْسَانُ:۔ یدعو دعا سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور دعاہٗ (یدعُوْ دُعَاءً ودعوًا) کے معنے ہیں۔ رَغِبَ اِلَیْہِ اسکی طرف متوجہ ہوا۔ دعا زیدًا:۔ استعانہ۔ زید سے مدد طلب کی۔ دعافلانًا۔ ناداہ وصاح بہ۔ اس کو پکارا دعاہ الی الامرِ۔ ساقہ الیہ۔ کسی کام کی طرف اسے لے گیا۔ دعافلانًا (دعوۃً۔ بدعاۃً) طلبہ لیاکل عندہٗ اسے کھانے کی دعوت دی (اقرب) دعابہ۔ استحضرہ۔ اسے آنے کی دعوت دی۔ (المنجد) وکل شیءٍ فی الارضِ اذ المحتاج الی شیءٍ فقد دعابہ۔ یقال لمن اخلقت ثیابہ فقد دعت ثیابك ای احتجن ان تلبس غیرھا۔ جب کسی طرح کسی چیز کی احتیاج دوسری چیز کی طرف معلوم ہو تو اس احتیاج کو ظاہر کرنے کے لئے بھی دعا کا فعل باء کے صلہ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی پُرانے کپڑوں والے کو جب دَعَتْ ثیابك کہیں تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اس کے کپڑے اس بات کی ضرورت کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اُتار کر انکی جگہ اور کپڑے تبدیل کئے جائیں دعا بالکتاب کے معنے ہیں۔ استحضرہ۔ کہ کسی کتاب کو حاصل کرنے کی خواہش کی (تاج)

یدع الانسان کا مطلب اور دعاء کے مختلف معنی

قوموں کو ترقی دینے سے اللہ تعالیٰ کی غرض

الخیر الخیر کے معنوں کے لئے دیکھو یونس ۱۲ــــه نحل ۷۱ــــه

العجول العجول۔ عجل سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور العجول کے معنی ہیں المسْرِع۔ ممتنی۔ الکثیر العجلۃ۔ جلدباز (اقرب) ۵ــــه قرآنی الفاظ میں انسان کا لفظ بُرائی کو پکارنے کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور دعاء کی ضمیر بھلائی کو پکارنے کے فقرہ میں استعمال ہوئی ہے۔ لیکن اُردو میں چونکہ بھلائی کا ذکر پہلے ہے اور بُرائی کا بعد میں کرنا پڑا۔ اس لئے انسان کا لفظ مجبورًا بھلائی کے ساتھ اور دعاء کی ضمیر برائی کے ساتھ لگانی پڑی۔

تفسیر۔ یہ آیت ان معنوں کی تصدیق کرتی ہے جو میں نے اُوپر کی آیت کے کئے ہیں۔ کیونکہ اس میں اسی مضمون کی تشریح کی گئی ہے۔ قیامت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ اگلی آیتوں میں بھی وہی مضمون بیان ہوا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اس آیت کا مفہوم بتاؤں۔ میں اس آیت کا ترجمہ سمجھا دیتا ہوں۔ دعاہ کے معنے اسے پکارنے اسکی طرف توجہ کرنے اور اس سے مدد مانگنے کے ہوتے ہیں لیکن دعابہ کے معنے اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دینے کے ہوتے ہیں۔ پس اس آیت کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ جبکہ انسان ظاہری طور پر خیر کو بُلا رہا ہوتا ہے وہ حقیقت میں شر کو بُلا رہا ہوتا ہے یا یہ نکلتا ہے کہ خیر کو بُلانے کا جو حق ہے اُسکی مانند وہ شر کو بُلاتا ہے۔ ان دونوں معنوں کے رُو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب قوموں کو ترقی ملتی ہے وہ اس امر کو بھول جاتی ہیں کہ یہ ترقی انہیں اس لئے ملی ہے کہ تا وہ دین و دیانت کو قائم کریں اور بنی نوع انسان کے لئے امن اور ترقی کے سامان پیدا کرکے خدا کے فضلوں کو حاصل کریں۔ اور وہ دنیاوی نعمتوں کو جمع کرنے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اور لوگوں کے حقوق کو نظرانداز کر دیتی ہیں۔ اور دنیوی عیش و آرام کے سامان جمع کرنے میں

فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً

اس طرح پر کہ رات والے نشان کے اثر کو تو ہم نے مٹا دیا اور دن والے نشان کو ہم نے بینائی بخشنے والا بنا دیا۔

لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ

تاکہ تم (آسانی سے) سالوں کی گنتی اور حساب

ہیں کہ وہ اپنے لئے اور اپنی اولادوں کے لئے خیر کے سامان جمع کر رہی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ اس ذمہ داری کو بھول کر جو ان کے کندھوں پر رکھی جاتی ہے اپنی تباہی کے سامان پیدا کر رہی ہوتی ہیں اور آخر تباہ ہو جاتی ہیں۔ پس کسی قوم کو ترقی ملنے کا وقت اس کے لئے بہت نازک ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد اصل خیر اسکی نظر سے پوشیدہ ہو جاتی ہے اور شر کو خیر سمجھ کر وہ اپنے راستہ سے بھٹک جاتی ہے وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مومن کو جو خیر ملتی ہے وہ تو مرنے کے بعد ملتی ہے۔ اس دُنیا کی فتوحات اس خیر کے حصہ کے لئے مواقع بہم پُہنچانے کے لئے دی جاتی ہیں لیکن بعض لوگ جلدی کرتے ہیں اور اس دُنیا کی ترقی کو اصل خیر سمجھ کر اس کے سمیٹنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور خود اپنے اعمال سے اپنی تباہی کے سامان جمع کر لیتے ہیں۔

غرض اس آیت میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر کسی قوم کو ترقی ملے مثلاً حکومت ملے۔ جاہ و ثروت ملے تو اسے ایسے کام کرنے چاہئیں۔ کہ وہ نعمت قائم رہے۔ اور اس کے ذریعہ سے اُخروی خیر کا ذخیرہ جمع ہوتا رہے۔ نہ کہ ایسے کام جس سے وہ جلدی زائل ہو جائے اور اُخروی انعامات کے حصول کے مواقع ہاتھ سے نکل جائیں دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ کے ایک معنی تو اوپر بتائے گئے ہیں۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ انسان شر کو اسی طرح بُلاتا ہے جس طرح وہ خیر کو بُلا رہا ہوتا ہے۔ یعنی انسان بھی عجیب ہے کہ مُنہ سے تو خیر مانگ رہا ہوتا ہے یعنی خواہش تو یہی رکھتا ہے کہ اُسے ہر قسم کی خیر مل جائے۔ مگر عمل کے لحاظ سے وہ شر کو بُلا رہا ہوتا ہے۔ گویا اپنی نادانی سے ایک ہی وقت میں دو متضاد باتیں طلب کرتا ہے۔ مُنہ سے خیر اور عمل سے شر۔

ان معنوں کے رُو سے اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل کامیابی تب ہوتی ہے جب انسان کا دل اور اس کا عمل متفق ہوں۔ یعنی اگر دل سے خیر مانگتا ہے تو اعمال سے بھی خیر ہی مانگے۔

قوم کی ترقی کا وقت ہی زیادہ نازک ہوتا ہے

(۳) تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہٗ کی ضمیر کو انسان کی طرف پھیرا جائے۔ اور اسے مفعول کی ضمیر قرار دیا جائے۔ اور دعا کا فاعل خدا تعالیٰ کو قرار دیا جائے۔ اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ انسان شر کو اسی جوش سے بلاتا ہے جس جوش سے اللہ تعالیٰ اس کو یعنی بندہ کو خیر کی طرف بُلا رہا ہوتا ہے۔ یعنی ہم پہنچے ہیں کہ اے انسان تو بھلائی کی طرف آ۔ مگر وہ کہتا ہے اے بلا تو میری طرف آ۔

ان معنوں کے رُو سے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم تو انسانوں کے لئے خیر کے سامان مہیا کر رہے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض اپنے اعمال سے شر کو بُلانے میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی تباہی کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔

عَجُوْلًا کے لفظ میں اس حقیقت کو ظاہر کیا۔ کہ انسان غور و فکر سے کام نہیں لیتا۔ اگر وہ غور و فکر سے کام لے تو ضرور اسے معلوم ہو جائے کہ میں غلطی کر رہا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غصے والا انسان اگر ذرا ٹھہر جائے تو اس کا غصہ ضرور کم ہو جائے۔ اور اُسے سوچنے کا موقعہ ملے۔ تمام بدیوں کی وجہ جلد بازی ہی ہوتی ہے۔ اگر ایک انسان بدی

تمام بدیوں کی وجہ جلد بازی ہوتی ہے

السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا

معلوم کر سکو اور ہم نے ہر ایک چیز کو خوب کھول کر بیان کر دیا ہے ۱۳؎

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ

اور ہم نے ذمہ وار بنایا ہے ہر انسان کو (اسطرح کہ) ہم نے اس کی گردن میں اس کے عمل کو باندھ دیا ہے

کے وقت دانائی سے کام لے اور پہلے سوچ لے کہ یہ کام میرے لئے مفید ہے یا مضر تو یقیناً وہ اس بدی سے بچ جائے۔

مُبْصِرَة — **۱۳؎ حل لغات** - مُبْصِرَةٌ : - اَبْصَرَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور اَبْصَرَہٗ (متعدی) کے معنے ہیں۔ جَعَلَہٗ بَصِیْرًا۔ اس کو دیکھنے والا بنا دیا۔ (یعنے دکھایا) اَبْصَرَہٗ :- رَاٰہٗ۔ اس کو دیکھا۔ اَخْبَرَہٗ بِمَا وَقَعَتْ عینہ علیہ۔ اس کو وہ بات بتائی جس پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اَبْصَرَ الطَّرِیْقُ (لازم) اِسْتَبَانَ وَوَضَحَ راستہ واضح ہو گیا۔ (اقرب) پس مُبْصِرَۃ کے معنے ہوئے۔ بینائی بخشنے والی۔

مَحَوْنَا — مَحَوْنَا : محی سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور محا الشیءُ (یمحو) کے معنے ہیں۔ اَزَالَہٗ وَاَذْھَبَ اَثَرَہٗ۔ کسی چیز کو مٹا دیا۔ اور اس کے اثر کو دُور کر دیا (اقرب) والمحو السواد فی القمر۔ اور محو چاند کے بے نور حصہ کو بھی کہتے ہیں (تاج) پس مَحَوْنَا اٰیَۃَ اللَّیْلِ کے معنے ہونگے کہ رات والے نشان کو ہم نے مٹا دیا (۲) بے نور کر دیا۔

فَصْلًا — فَضْلًا :- اَلْفَضْلُ (فَضَلَ الشیءُ یفضل) کا مصدر ہے۔ اور اس کے معنے ہیں۔ ضِدُّ النَّقْصِ۔ خوبی فضیلت۔ البقیۃ۔ بقیہ (حاصل تفریق کو بھی انہی معنوں میں فضل کہتے ہیں) الزیادۃ۔ زیادتی۔ الاحسان۔ احسان والفضل فی الخیر یستعمل لمطلق النفع نفع (اقرب)

سورج اور چاند کی گردش کا تعلق حساب سے

اَلْعَدَد — العدد :- اسم من عدّ بمعنی الاحصاء :- یہ عد کا اسم ہے۔ اور اس کے معنے ہیں۔ شمار۔ گنتی۔ المعدود شمار کیا ہوا۔ اسکی جمع اعداد آئی ہے (اقرب) پس لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ کے معنے ہونگے کہ تم سالوں کی گنتی کو معلوم کر سکو۔

تفسیر - فَمَحَوْنَا اٰیَۃَ الَّیْلِ میں فآء تعقیب کی نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ نے پہلے رات اور دن بنائے پھر ان میں سے ایک کو مٹا دیا۔ بلکہ یہ فآء تفسیری ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے رات اور دن کو اس صورت میں بنایا ہے کہ رات تو ایک مٹا ہوا نشان ہے۔ اور دن ایک روشن نشان ہے یعنی رات سے مخفی فائدہ پہنچتا ہے اور دن سے ظاہر۔ اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ نفع بخش ہیں۔ چنانچہ دونوں کے ذریعہ سے تم نفع حاصل کرتے ہو۔ اور تاریخوں کا علم ان کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہو۔ نیز حساب کا فائدہ بھی حاصل کرتے ہو۔ تاریخ کا فائدہ تو ظاہر ہی ہے۔ حساب کا علم اس طرح کہ لمبی تاریخ کو یاد رکھنے سے ہی حساب پیدا ہوتا ہے نیز اس طرح کہ سال کا وقت تجویز کرنے کا تعلق چاند اور سورج سے ہے اور صحیح جنتری سورج کی رفتار کے علم کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اسی طرح سورج اور چاند کی گردش کا تعلق بھی حساب سے ہے اس پر غور کرتے ہوئے انسان کو باریک در باریک حساب سے واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ آج تک شمسی حساب کو انسان مکمل نہیں کر سکا۔ اور شمسی سال کی تعیین میں غلطیاں کرتا چلا آیا ہے جسے علم حساب کی ترقی کے ساتھ ساتھ دُور کیا جا رہا ہے۔

اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نشان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ترقی کا نشان ہوتا ہے۔ اور ایک مٹنے کا نشان

لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ

اور ہم قیامت کے دن اس (کے اعمال) کی ایک کتاب نکال کر اس کے سامنے رکھ دینگے جسے وہ (بالکل) کھلی ہوئی پائیگا ۱۵

ہے۔ پس تم ایسے نشان طلب کرو۔ جن کے ذریعہ سے ترقی ہو۔ ایسا نشان نہ مانگو جس سے تم مٹ جاؤ۔ اور ترقی اور تنزل دونوں حالتوں کو رُوحانی کمالات کے حصول کا ذریعہ بناؤ جس طرح رات جو تاریکی کا نشان ہے۔ اور دن جو روشنی کا نشان ہے۔ دونوں کو اللہ تعالےٰ نے تمہاری جسمانی ترقی کا ذریعہ بنا دیا ہے نہ تکلیف کے وقتوں میں خدا کو بھولو نہ کامیابی کے وقتوں میں اس کو چھوڑو۔

۱۴ حل لغات۔

اَلْزَمْنٰهُ۔ اَلْزَمَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور اَلْزَمَ الشیءَ کے معنے ہیں۔ اَثْبَتَهٗ وَاَدَامَهٗ۔ کسی چیز کو ہمیشہ رکھا۔ اَلْزَمَ فلانًا المالَ وَالعملَ اَوْجَبَهٗ عَلَيْهِ۔ اس پر کسی کام کو کرنا یا کسی مال کو ادا کرنا واجب کر دیا۔ (اقرب)

طائر۔ اَلطَّائِرُ کُلُّ ذِی جَنَاحٍ مِنَ الْحَيَوَانِ۔ پرندہ۔ نیز اس کے معنے ہیں۔ اَلْحَظُّ۔ نصیب۔ رزق الانسان۔ انسان کی روزی۔ عمله الذی قلّده وطار عنه من خیرٍ او شرٍّ۔ انسانی اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے۔ کہتے ہیں۔ هو میمون الطائر۔ ای مبارك الطلعة۔ وہ مبارک چہرے والا ہے۔ نیز مسافر کو رخصت کرتے وقت دعا کے طور پر کہتے ہیں۔ سِرْ عَلَى الطَّائِرِ الْمَيْمُوْنِ کہ مبارک شگون پر چل۔ اور جب هو ساکن الطائر کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں حلیمٌ هادِئٌ کہ وہ بُردبار، متحمل اور سنجیدہ ہے (اقرب) پس اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ کے معنے ہونگے کہ ہم نے اس کے عمل کو اسکی گردن میں باندھ دیا ہے۔

مَنْشُوْرٌ۔ نَشَرَ سے اسم مفعول ہے اور نَشَرَ الْکِتَابَ کے معنے ہیں بَسَطَهٗ۔ اس کو کھولا (اقرب) پس منشور کے معنے ہونگے کھولا ہوا۔

تفسیر۔ اس آیت میں فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کا عمل اسکی گردن میں باندھ دیا ہے۔ یا گردن کے ساتھ چسپاں کر دیا ہے اور قیامت کے دن اُسے اس کے سامنے ایک کتاب کی صورت میں نکالیں گے جسے وہ کھلی ہوئی پائے گا یعنی اس کے مطابق اس سے سلوک ہوگا۔ کیونکہ کھاتہ کا رجسٹر یا حساب لکھنے کے لئے کھولا جاتا ہے یا حساب چکانے کے لئے۔

رات کی تاریکی اور دن کی روشنی انسان کی جسمانی ترقی کا ذریعہ ہیں

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا کوئی فعل ضائع نہیں ہوتا کیونکہ ہم نے اس کے ساتھ اس کا عمل گردن میں چسپاں کر دیا ہے۔ گردن میں چسپاں کرنے کے الفاظ یہ بتانے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ کہ اس کے ساتھ اس کا تعلق دائمی ہے جب تک وہ رہے گا اس کے اعمال کا اثر بھی رہے گا۔

اَلْزَمْنٰهُ — انسان کا کوئی فعل ضائع نہیں ہوتا۔

طٰٓئِرَہٗ

عمل کے لئے جو طائر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جیسے طائر اُڑ جاتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ ویسے ہی انسان اپنے عمل کو بھول جاتا ہے بلکہ دوسرے لوگ بھی بھول جاتے ہیں لیکن یہ طائر وہ ہے جو ایک رسّی سے انسان کی گردن سے بندھا ہوا ہے۔ اس لئے گو وہ اُڑ جائے اور نظر نہ آئے مگر اس سے تعلق انسان کا نہیں ٹوٹتا۔ ایک نہ ایک دن اسکے نتائج ظاہر ہو کر ہی رہتے ہیں۔

دوسرے یہ بتایا ہے کہ جیسے پرندے کے پاؤں میں لمبی رسّی باندھ کر اُسے چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ اس رسّی کی حد تک اُڑ کر چلا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی اعمال کا حال ہے کہ بعض دفعہ وہ معمولی نظر آتے ہیں لیکن ان کا اثر دُور تک جاتا ہے

اس آیت میں انسان کو بتایا ہے کہ انسان کو اپنے اعمال میں بہت ہوشیار اور محتاط رہنا چاہئے۔ کیونکہ جب کیا ہوا عمل اس کے اختیار میں نہیں رہتا۔ اور اس کا اثر بھی

مَنْشُوْرًا

بہت وسیع ہے۔ نظروں سے بھی غائب ہے۔ اور ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ تو ان سب باتوں سے معلوم ہوا۔ کہ اس کا سمجھنا بہت مشکل امر ہے۔ پس بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے عمل کا نتیجہ خواہ جلدی نکلے خواہ دیر سے۔ مگر نکلے گا ضرور۔

انسانی اعمال کا بندھے ہوئے پرندے سے مشابہت

کیونکہ گو بعض دفعہ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پرندہ کی طرح اُڑ گیا ہے مگر چونکہ یہ پرندہ گردن سے بندھا ہُوا ہے آخر ایک دن واپس آئے گا۔ اور انسان کو اپنے کئے کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (سورہ زلزال) کہ کوئی شخص اگر ایک چیونٹی کے برابر بھی نیک یا بدعمل کرے گا یا ہُوا کے ذرہ کے برابر بھی نیک یا بدعمل کرے تو وہ اس کا انجام ضرور دیکھ لے گا۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ توبہ قبول نہ ہوگی توبہ تو ضرور قبول ہوگی۔ مگر گناہ کرنے والا پیچھے ضرور رہ جائے گا مثلاً فرض کرلو کہ دو انسان ہیں جو نیکی میں برابر ہیں ان میں سے ایک نے ایک بدی کی۔ اور پھر توبہ کی۔ اس کے گناہ کو تو خدا تعالیٰ ضرور معاف کردے گا۔ مگر جب اس نے بدی کی۔ دوسرے شخص نے اس کے مقابل نیکی کی۔ تو یہ توبہ کرنے والا تو اسی پہلے درجے پر رہا۔ مگر دوسرا اس سے آگے نکل گیا پس اس غلطی کرنے والے شخص کو خدا تعالیٰ معاف تو کردے گا۔

دو شخصوں سے ایک سبق

لیکن یہ نہ ہوگا کہ اس کو اس دوسرے شخص کے ساتھ ملا دے جس نے بدی نہیں کی تھی۔ وہ تو بہرحال اس سے ایک درجہ بڑھا ہی رہے گا۔ پس ہر عمل کا ایک اثر ہے جو باقی رہتا ہے۔ اب تو اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو سمجھانے کے لئے انسان کو وائرلیس ٹیلیگرافی یا ٹیلیفون

ہر عمل بیج کی طرح بڑھتا رہتا ہے

کا علم بھی بخش دیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ باریک سے باریک حرکت بھی دور دور تک مرتعش ہوتی چلی جاتی ہے۔ پس انسان کو اپنے اعمال میں بہت محتاط ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ہر عمل ایک بیج کی طرح ایک نیا پودہ پیدا کرتا ہے۔ جو بغیر اس کے علم کے بڑھتا رہتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ہر عمل کا اثر انسان کے قلب پر ہوتا ہے۔ اگر نیکی کرے تو اس کے قلب پر نور کا ایک نشان پیدا ہوجاتا ہے۔ اور بدی کرے تو ایک سیاہ نشان پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح نیکی کرنے والے شخص کے دل پر نیکیوں کا نور بڑھتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا سارا دل روشن ہو جاتا ہے اور وہ نجات پا جاتا ہے اور بدی کرنے والے کے دل پر سیاہ دھبے بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک دن سارا دل سیاہ ہوجاتا ہے اور وہ شخص ہلاک ہوجاتا ہے۔ بعض لوگوں نے طائر کے معنے قسمت کے کئے ہیں مگر یہ معنے اس کے نہیں ہوسکتے کیونکہ طائرہ کہہ کر بتایا گیا ہے کہ اپنے عمل کا پیدا کرنے والا خود انسان ہی ہے خدا تعالیٰ نے جو مقرر کردیا۔ وہ تو پتھر کہلائے گا یا طوق۔ طائرہ نہیں کہلا سکتا۔

یہ معنے بھی اس کے ہوسکتے ہیں کہ ہر انسان کی نیک فالی اور بدفالی تو اسکی گردن میں بندھی ہوئی ہے اور وہ دوسری چیزوں میں جاکر فالیں تلاش کرتا پھرتا ہے۔ گردن کا لفظ اس لئے استعمال کیا۔ کہ انسان جب نیکی کرے تو سر اونچا کرلیتا ہے۔ اور جب بدی کرے تو ذلت کی وجہ سے گردن نیچی کرلیتا ہے۔ پس اس لفظ کے استعمال سے اس طرف توجہ دلائی کہ انسان اپنے اعمال کا جائزہ اپنی گردن سے کرلیا کرے یعنے دیکھے کہ وہ اپنے ہمرازوں اور ہم جلیسوں میں گردن اونچی کرسکتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کا دل اور اس کے ہمراز اُسے بے عیب قرار دیتے ہوں تو سمجھ لے کہ اس کا قدم نیکی پر ہے۔ لیکن اگر اس کا اپنا دل اور اس کے ہمراز اس میں سو سو گند پاتے ہوں تو لوگوں میں فخر کرنے سے اسے کیا نفع ہوسکتا ہے۔

وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا۔ یہاں کتاب سے مراد جزاء ہے کیونکہ عربی میں کتب علیہ کذا کے معنے قضیٰ علیہ کذا کے ہوتے ہیں۔ اور يَلْقٰهُ مَنْشُوْرًا سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ وہاں اس کے اعمال کی جزا ظاہر

كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝

(اور اسے کہا جائے گا کہ) اپنی کتاب (آپ ہی) پڑھ۔ آج تیرا نفس ہی تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے ۱۵

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ

(پس یاد رکھو کہ) جو ہدایت کو قبول کرے گا۔ تو اس کا ہدایت پانا اسی کی ذات کے لئے ہے۔ اور جو (اسے

ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ

رد کرکے) گمراہ ہوگا۔ اس کا گمراہ ہونا اسی کے خلاف پڑے گا۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والی جان کسی دوسری جان کا بوجھ

اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ وَ

نہیں اٹھائے گی اور ہم (کسی قوم پر) ہرگز عذاب نہیں بھیجتے جب تک (ان کی طرف) کوئی رسول نہ بھیج لیں ۱۶ اور

ہونے لگ جائے گی۔ وہ بیج کی طرح نہ رہے گی۔ بلکہ درخت کی طرح پھیل جائے گی۔ اور پھل پیدا کرنے لگے گی۔

۱۵ حل لغات

الحسیبُ والمحاسبُ من یحاسبك:۔ الحسیب کے معنے ہیں۔ حساب لینے والا (مفردات)

تفسیر "اپنی کتاب کو پڑھ" کے الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ اب اپنی سزا کو بھگتو۔ اور یہی سبق دہراتے رہو۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ تیرا نفس ہی آج تجھ پر کافی حساب لینے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سزا باہر سے نہ آئے گی۔ بلکہ انسان کے اندر سے ہی پیدا ہوگی۔ دوزخ میں جتنی چیزیں ہونگی وہ انسان کے اعمال سے ہی متمثل ہونگی۔ اور جنت کی چیزیں بھی اسی طرح نیکیوں سے ہی متمثل ہونگی۔ پس گویا کوئی دوسرا انسان کسی کو سزا یا جزاء نہ دے گا۔ بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو جزا دینے والا اور خود ہی سزا دینے والا ہوگا۔

۱۶ حل لغات

اِهْتَدٰى:۔ هَدٰى سے باب افتعال ہے۔ اور هدی کے لئے دیکھو رعد ۲۱ ضلّ کے لئے دیکھو یونس ۳۰

تزر:۔ وَزَرَ سے مضارع مونث غائب کا صیغہ ہے اور وَزَرَهٗ کے معنے ہیں حملہ۔ اس کو اٹھایا۔ وفی اللسان حمل ما یثقل ظهره من الاشیاء المثقلة:۔ اس نے بھاری بوجھ اٹھایا (اقرب) وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کے معنے ہونگے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔ الوزر کی تشریح کیلئے دیکھو نحل ۲۶

تفسیر اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ انسان کے نیک اعمال اس کے فائدہ کا موجب ہوتے ہیں۔ اور بد اس کے نقصان کا پس جو کچھ انسان کرتا ہے دوسرے کے لئے نہیں کرتا۔ اپنے لئے کرتا ہے قاتل دوسرے کو نہیں۔ اپنے آپ کو قتل کرتا ہے۔ ظالم دوسرے پر نہیں اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ چور دوسرے کا نہیں اپنا مال چراتا ہے۔ اسی طرح صدقہ کرنے والا دوسرے کو نہیں دیتا اپنے آپ کو دیتا ہے۔ دوسرے کو تعلیم دینے والا یا ہدایت دینے والا اسے تعلیم نہیں دیتا یا اسے ہدایت نہیں دیتا بلکہ اپنے آپ کو تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو ہدایت دیتا ہے۔

اس کے آگے فرماتا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ

الحسیب

قیامت میں سب بد و نیک اعمال سے متمثل ہونگی۔

اهتدی ص ۱

اُخْرٰی۔ کوئی بوجھ اُٹھانے والی جان کسی اور جان کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ عیسائی اس آیت سے بڑے خوش ہوتے ہیں کہ لو کفارہ ثابت ہو گیا۔ کیونکہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ گناہگار گناہگار کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ مگر جو نیک ہے وہ دوسرے کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔ پس مسیح جو نیک تھا۔ اس نے دوسروں کے بوجھ اُٹھا لئے اور دوسرا کوئی نیک نہیں۔ پس اور کوئی بوجھ نہیں اٹھا سکا۔

کفارہ کا رد

مَیں اس جگہ اس سوال میں نہیں پڑنا چاہتا کہ مسیحی عقیدہ کے رُو سے مسیح نیک تھا یا نہیں۔ نہ اس سوال میں پڑنا چاہتا ہوں کہ اسلامی عقیدہ کے رو سے مسیح کے سوا بھی کوئی نیک ہے یا نہیں۔ اسکی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ اس وقت انکے جواب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ خواہ انسانی اعمال بُرے ہوں یا اچھے۔ خود اس کے لئے ہوتے ہیں انہیں کوئی دوسرا نہیں اُٹھا سکتا۔ مطلب یہ کہ سزا جزاء کوئی بیرونی شے نہیں بلکہ ثمرۂ عمل کا نام ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس جگہ بیج بویا گیا ہے وہیں وہ پھل دیگا دوسری جگہ وہ پھل نہیں دے سکتا۔ ایک آم جو لاہور میں لگا ہوا ہو امرتسر میں پھل نہیں دے سکتا۔ پس جب جزاء سزاء خود عمل کرنے والے کے نفس سے پیدا ہوتی ہے تو اسے کوئی دوسرا نہیں بانٹ سکتا۔ یا اپنے ذمہ نہیں لے سکتا۔ پس اس مضمون میں تو کفارہ کا رد ہے نہ کہ اسکی تائید۔ کفارہ کی بُنیاد تو اس خیال پر ہے کہ سزا ایک بیرونی بوجھ کی طرح ہے۔ پس دوسرا شخص بھی اسے اُٹھا سکتا ہے۔ مگر اس آیت میں اس عقیدہ کو رد کیا گیا ہے۔

عیسائیوں کا دوزخ کو مادی قرار دینا حماقت ہے

اسی اعتراض سے بچنے کے لئے مسیحیوں نے دوزخ کو مادی قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ حماقت کی بات ہے کہ جنت تو رُوحانی ہو۔ اور دوزخ مادی ہو۔ یا دونوں روحانی ہونگی یا دونوں مادی۔ اگر رُوحانی ہونگی تو پھر کوئی شخص کسی دوسرے کی سزا نہیں اُٹھا سکتا۔ کیا کوئی شخص دوسرے کی ندامت حزن رنج غضب وغیرہ کو بانٹ سکتا ہے؟ اسی لئے نہیں بانٹ سکتا۔ کہ یہ چیزیں انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان کے پیدا کرنے میں خود اس کے نفس کا دخل ہوتا ہے اس قسم کی سزا اسی صورت میں مٹ سکتی ہے جب نفس حقیقتاً فنا ہو جائے یا معنوی طور پر فنا ہو جائے یعنی ندامت کے احساس کے ساتھ اس میں پاکیزگی پیدا ہو جائے۔ اس قسم کی فنا میں کوئی دوسرا شخص کسی طرح بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ کوئی معقول آدمی کسی دوسرے کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میاں بہت شرمندہ نہ ہو میں تمہاری جگہ شرمندہ ہو لیتا ہوں۔ ایک فاتر العقل ہی ایسا کہہ سکتا ہے پھر کیوں مسیحی خدا کے برگزیدہ مسیح کے مُنہ سے یہ الفاظ کہلا کر اسکی ہتک کرتے ہیں۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ اور ہم سزا نہیں دیا کرتے یہاں تک کہ ہم ایک رسول بھیج لیں۔ اسکے متعلق قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے۔ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ (سورۂ ملک ع ۱) کہ جب کبھی کوئی گروہ اور قوم جہنم میں ڈالی جائے گی۔ تو ان سے دریافت کیا جائے گا۔ کہ تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا آیا۔ تو وہ کہیں گے کہ ہاں۔ ہمارے پاس نبی آیا۔

اس سے پتہ لگتا ہے کہ ہر قوم میں نبی آئے۔ اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا ہے اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (زمر ع ۸) کہ کیا تمہارے پاس رسول نہ آتے رہے جو تم کو اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے۔ ایک اور جگہ فرماتا ہے اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ (فاطر ع ۴) کیا تم کو ہم نے اس قدر عمر نہیں دی کہ جسکی سمجھنے کی نیت ہوتی اس میں سمجھ سکتا تھا اور پھر اسی پر بس نہیں کی۔ بلکہ تمہارے پاس ہوشیار کرنے کے لئے رسول بھی بھیجے۔ اسی طرح قصص رکوع ۶ میں فرماتا ہے وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا۔ تیرے خدا کی شان کے خلاف ہے کہ وہ

اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کریں تو (پہلے) ہم اس کے خودسر لوگوں کو (کچھ) حکم دیتے ہیں

فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا

جس پر وہ اس (بستی) میں نافرمانی (کی راہ اختیار) کرتے ہیں۔ تب اس (بستی) کے متعلق ہمارا کلام پورا ہو جاتا ہے۔

تَدْمِيْرًا ○ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ

اور ہم اس کو پوری طرح تباہ کر دیتے ہیں ۱۷:۱۶ اور (اسی قانون کے مطابق) ہم نے نوح (کی قوم کو اور اس) کے بعد

اس کے مرکزی مقام میں نبی بھیجے بغیر کسی بستی کو ہلاک کرے۔

اور پھر سورہ قصص ع ۵ میں فرمایا وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ ان لوگوں کو اپنے اعمال کی وجہ سے کوئی عذاب پہنچا۔ تو یہ کہدیں گے کہ اے ہمارے رب کیوں نہ آپ نے ہماری طرف رسول بھیجا کہ ہم ذلیل و خوار ہونے سے پہلے آپ کے احکام کی تعمیل کرتے۔ تو ہم ان کو بغیر رسول بھیجے کے ہی عذاب دے دیتے مگر چونکہ یہ عذر ان کا معقول ہوتا۔ ہم نے اس عذر کو توڑ دیا ہے۔ اور ہمیشہ پہلے رسول بھیجتے ہیں۔ پھر اس کے انکار کے بعد عذاب لاتے ہیں۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سنتِ الٰہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر رسول بھیجنے کے کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا یعنی اتنے وسیع علاقہ پر جو نبیٔ وقت کا مخاطب ہو اس وقت تک عذاب نہیں آتا۔ جب تک پہلے ایک اور نبی خواہ وہ پہلے نبی کا تابع ہی کیوں نہ ہو ظاہر ہو کر لوگوں کو ہوشیار نہ کر دے۔

یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جن پر حجت تمام نہیں ہوئی ان کا کیا حال ہوگا۔ تو اس کا جواب مسند احمد بن حنبل کی روایت میں ہے جو ابوہریرہؓ نے بیان کی ہے انّ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم قال اربعۃٌ یحتجّون یوم القیامۃ رجل اصمّ لا یسمع شیئا ورجل احمقُ ورجل هرمٌ ورجل مات فی فترۃٍ فامّا الاصمّ فیقول ربّ لقد جآءَ الاسلامُ وما اسمع شیئًا وامّا الاحمق فیقول جاء الاسلام والصبیان یحذفوننی بالبعر واما الهرم فیقول ربّ لقد جاء الاسلام وما اعقل شیئًا واما الذی مات فی الفترۃ فیقول ربّ ما اتانی لك رسول فیاخذ سبحانہ مواثیقهم لیطیعنّه فیرسل الیهم رسولًا ان ادخلوا النار فمن دخلها کانت علیه بردًا وسلامًا ومن لم یدخلها سحب الیها (روح المعانی جلد ۹)

یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے پاس رسول بھیجے گا پھر اسکی اطاعت کرنے والوں اور اس کو نہ ماننے والوں کی فطرت ظاہر ہو جائے گی۔ اور اس کے مطابق ان کو بدلہ ملے گا۔

دنیا میں جن پر حجت تمام نہیں ہوئی ان کے لئے قیامت میں بعثت رسول

۱۷:۱۶ حل لغات۔

مُتْرَفِيْهَا :۔ المترفُ کے معنی ہیں۔ المتنعم لا یمنع من تنعمہ۔ عیاش۔ المتروك یصنع ما یشاء۔ شریعت سے آزاد شخص۔ الجبّار۔ خودسر (تاج) مترفون اسکی جمع ہے۔ — مترفیہا

فسقوا :۔ فسق سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ تشریح کے لئے دیکھو یونس ۱۰:۳۳۔ — فسقوا

دمّرنا۔ دمر سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور دَمَّرَهم (وعلیہم) کے معنے ہیں اَهْلَكَهُمْ یعنے دمر جیب بغرصۂ — دمّرنا

یا علیٰ کے صلہ کے ساتھ استعمال ہو۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ اس کو ہلاک کر دیا (اقرب) پس دمّرنا کے معنی ہونگے ہم نے ہلاک کر دیا۔

خدا کا عذاب قوموں کے خراب ہونے پر آتا ہے

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب قومیں خراب ہو جاتی ہیں اور ان کے عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو ان کی طرف ایک رسول بھیجا جاتا ہے جو ان کو ہوشیار کرتا ہے لیکن لوگ اسکی بات کو نہیں مانتے اور رسول سے ٹھٹھا ہنسی کرتے ہیں۔ اور اسکی نا فرمانی کرتے ہیں۔ تب خدا تعالیٰ کا عذاب انہیں آپکڑتا ہے۔

اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا۔ بعض مخالفین اسلام نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ خدا تعالیٰ بڑے بڑے لوگوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ بدکار ہو جاؤ۔ اور یہ غلط معنے کرکے اس پر اعتراض کیا ہے کہ آپ ہی پہلے گمراہ کیا پھر عذاب میں مبتلا کر دیا یہ تو انصاف کے خلاف ہے۔ حالانکہ فسق کے معنے حکم نہ ماننے کے ہیں اور ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو معنے انہوں نے کئے ہیں انکی بناء پر آیت کا ترجمہ یوں بنتا ہے کہ خدا تعالےٰ ان کو حکم دیتا ہے کہ تم بدکاری کرو فَفَسَقُوْا فِيْهَا تو وہ اس حکم کی نافرمانی کرنے لگ جاتے ہیں ظاہر ہے کہ اگر آیت کا مطلب یہ ہو تو اس میں تو ان لوگوں کی تعریف نکلتی ہے کہ باوجود خدا تعالیٰ کے کہنے کے کہ بدکار بن جاؤ وہ بدکار نہیں بنتے۔ بلکہ نیک ہو جاتے ہیں۔ اور یہ معنی بالبداہت غلط ہیں اور اگر یہ معنے کئے جائیں کہ خدا کے بدکار بنانے پر وہ بدکار ہو جاتے ہیں تو فَسَقُوْا کا لفظ درست نہیں رہتا کیونکہ اس صورت میں وہ فرمانبردار بن جاتے ہیں ان کو نافرمان نہیں کہا جا سکتا۔ غرض یہ معنے بالبداہت غلط ہیں اور عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے کئے گئے ہیں۔ اور اعتراض قرآن کریم پر نہیں پڑتا۔ بلکہ ان لوگوں کے علم پر پڑتا ہے۔ اصل مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ ہم ان کو حکم دیتے ہیں یعنی بعض خاص امور پر چلنے کا حکم دیتے ہیں جو حکم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونے کے سبب سے بہرحال نیکی کا حکم ہوتا ہے مگر وہ نافرمان ہو جاتے ہیں یعنے اس حکم کو نہیں مانتے۔ غرض اس جگہ اَمَرْنَا کا مفعول ثانی محذوف ہے کیونکہ وہ ایک ظاہر بات ہے اور ایسے مواقع پر عربی زبان میں ایک یا دونوں مفعولوں کو محذوف کر دینا جائز ہوتا ہے۔ مفعول ثانی کا مضمون ظاہر اس طرح ہے کہ قرآن کریم نے بار بار اس امر کو بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ جب حکم دیتا ہے نیکی کا حکم دیتا ہے چنانچہ سورۃ نحل رکوع ۱۳ میں ہی فرما چکا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ یعنے اللہ تعالےٰ عدل اور احسان اور اس نیکی کا جس میں بدلہ کا خیال تک بھی دل میں نہیں ہوتا حکم دیتا ہے اور باطنی بدی اور ظاہری بدی اور ظلم سے روکتا ہے۔ اسی طرح سورۃ اعراف میں ہے۔ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (اعراف ع ۳) تو کہدے اللہ تعالیٰ ہرگز بدی کا حکم نہیں دیتا۔ پس چونکہ یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کا ہی حکم دیتا ہے۔ مفعول ثانی کو محذوف کر دیا گیا ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس قوم کو ایک رسول کے ذریعے سے نیک احکام پر چلنے کا حکم دیتا ہے مگر بجائے اس حکم سے فائدہ اُٹھانے کے وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی میں بڑھ جاتے ہیں۔

مترف کے معنے

یہ جو فرمایا ہے کہ اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا کہ ہم اس بستی کے مترفوں کو حکم دیتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف مالداروں کو خدا کا حکم ملتا ہے بلکہ مترف کے معنے اس جگہ الذی یصنع مایشآءُ ولا یمنع کے ہیں یعنی ایسا شخص جو اپنی مرضی پر چلتا ہے اور نیک بات کو نہیں مانتا اور اس لفظ میں سب کے سب وہ لوگ شامل ہیں جو بدی میں مبتلا ہوتے ہیں خواہ غریب ہوں یا امیر۔

اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم عام حکم دیتے ہیں مگر مترف یعنی باغی لوگ اس کو نہیں مانتے نیک لوگ مان لیتے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شیطان کے بارہ میں فرمایا

نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا

(ان کے بعد دیکھے اور) بہت سی نسلوں کو ہلاک کیا اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں پر (اچھی طرح) آگاہی رکھنے والا (اور انہیں) خوب

بَصِيْرًا ۞ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا

دیکھتا ہے ۱۸؎ جو شخص (صرف) دنیا کا خواہاں ہو ہم اسے (یعنی ایسے لوگوں میں سے) جس کے متعلق ہم

مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا

(کچھ دینے کا) ارادہ کر لیتے ہیں اس (دنیا) میں جو کچھ چاہتے ہیں جلد (ہی) دے دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کے لئے جہنم کو مخصوص

مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۞ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى

کر دیتے ہیں جس میں وہ مذموم ہو کر (اور) دھتکارا جا کر داخل ہوگا ۱۹؎ اور جس شخص نے آخرت کی خواہش کی اور اس کے

ہے کہ مامنعك اَنْ تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (ص ع ۵) کہ تجھے کس چیز نے سجدہ سے روکا تھا جب میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ یہاں یہ مراد نہیں کہ خاص اسے ہی حکم تھا بلکہ حکم عام تھا۔ جس میں وہ بھی شامل تھا پس جب نبی آتا ہے تو وہ عام حکم لاتا ہے۔ ماننے والے مان جاتے ہیں اور انکار کرنے والے انکار کرتے ہیں۔

قریہ سے مراد یہاں ہر بستی نہیں بلکہ ام القریٰ مراد ہے یعنی جس بستی کو اس زمانہ کے لئے خدا تعالیٰ نے مرکز تجویز کیا ہو۔ جیسا کہ قرآن میں ایک اور جگہ فرمایا ہے حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا۔ کہ ہم عذاب نازل کرنے سے پہلے ام القریٰ میں رسول بھیج لیتے ہیں۔

۱۸؎ حل لغات۔ القرون کے لئے دیکھو یونس ۳۴؎

تفسیر۔ یعنی اس قسم کی مثالیں تم کو شروع سے دنیا میں نظر آئینگی نوح سے لے کر اس وقت تک نبی آتے رہے ہیں سب کے زمانہ میں اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو خبیر و بصیر ہے بندوں کو غلط راستہ پر چلتے دیکھ کر کس طرح خاموش رہ سکتا ہے۔ یہ فقرہ بھی ان

معنوں کو رد کرتا ہے جو اوپر کی آیت کے بعض نادانوں نے کئے ہیں کیونکہ اس میں بتایا ہے کہ معذب لوگ پہلے گنہ گار ہوتے ہیں یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ ان کو گنہ گار بناتا ہے۔

۱۹؎ حل لغات۔ العاجلة۔ العاجلةُ عاجل (اسم فاعل عَجَلَ) سے مؤنث ہے۔ اور عجل الرجلُ کے معنے ہیں۔ اَسْرَعَ۔ اس نے جلدی کی۔ نیز العاجلةُ کے معنے ہیں الدنیا۔ دُنیا (اقرب) قولہٗ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ ای الاعراض الدنیویة آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ العاجلة میں العاجلة سے مُراد دنیوی سامان ہیں (مفردات)

جہنم کے لئے دیکھو رعد ۱۹؎

مَدْحُوراً۔ دَحَرَ (یدحَرُ۔ دُحُوْرًا) سے اسم مفعول ہے۔ اور دَحَرَ کے معنے ہیں۔ طَرَدَهٗ۔ اس کو دھتکار۔ ا۔ ابعدهٗ۔ اس کو دُور کیا۔ دفعهٗ۔ اس کو ہٹایا (اقرب) پس مدحور کے معنے ہونگے (۱) دُور کیا ہوا (۲) دھتکارا ہوا۔ (۳) ہٹایا ہوا۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ قریب کے فائدہ کو مدنظر نہیں رکھنا چاہئے۔ بلکہ ایسے فائدے کو مدنظر رکھنا چاہئے جو بابرکت ہو۔ خواہ بعد میں ہی ملے۔ دوسرے یہ بتایا ہے کہ صرف دنیوی ترقیات کو خدا کا فضل نہیں قرار

۲ اَلْعَاجِلَة
قریہ سے مراد ام القریٰ
۲ مدحورا
۲ جهنم
۱ اَلْقُرُون

لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ

لیئے اس کے مطابق کوشش (بھی) کی تو (اس کے متعلق یاد رکھو کہ) ایسے ہی لوگ ہیں جنکی کوشش کی

مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ

قدر کی جائے گی ۲۰ ہم سب کو مدد دیتے ہیں۔ انکو بھی اور انکو بھی (اور یہ مدد) تیرے رب کی

رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ

عطاؤں میں سے ہے۔ اور تیرے رب کی عطا (کسی خاص گروہ کے لئے) محدود نہیں ہے ۲۱ دیکھ

دینا چاہیئے۔ کیونکہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ بعض اقوام کو دنیوی ترقیات دیتا ہے لیکن وہ ان پر خوش نہیں ہوتا فضل الٰہی وہی ترقیات کہلا سکتی ہیں جن کے ساتھ روحانیت میں ترقی ہو۔

سعی مشکور ہی کارگر ہوتی ہے

۲۰ تفسیر۔ سعیھا میں ھا کی ضمیر آخرت کی طرف پھرتی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ایسی کوشش کرتے ہیں جو آخرت کے حصول کے مناسب حال ہو۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ عام کوشش مفید نہ ہوگی بلکہ وہ کوشش فائدہ بخش اور نتیجہ خیز ہوگی جو اخروی کامیابی کے مناسب حال ہوگی۔

مَحْظُورًا [۲]

وَهُوَ مُؤْمِنٌ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ حیات آخرت کا مدار قلب کی صفائی پر ہے۔ دنیوی کام بعض دفعہ بغیر ایمان کے بھی نفع بخشتے ہیں لیکن آخرت کے لئے جو کوشش ہو۔ اس میں وہی کام نفع دیتا ہے جس کے ساتھ ایمان بھی ہو۔

سعی مشکور کے معنے [۱]

مَشْكُوْر کے معنے مقبول کے ہیں یعنی وہی خدا کے ہاں مقبول ہوگا۔ جس کے ساتھ ایمان شامل ہو۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ کا یہ مطلب نہیں کہ مومن کے سوا کسی کی نیکی قبول نہیں۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ اخروی جزا اس پر ایمان رکھتے ہوئے جو نیک عمل کرے اُسے اُخروی جزا ملے گی۔ جو اس پر ایمان لانے کے بغیر نیک عمل کرے اس کے عمل کا بدلہ اُسے اسی دنیا میں مل جائے گا۔

نُمِدُّ [۱]

۲۱ حل لغات۔ نُمِدُّ:۔ اَمَدَّ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور اَمَدَّهٗ کے معنے ہیں۔ امھلہ اسے مہلت دی۔ اَمَدَّ اَجَلَهٗ:۔ اَخَّرَهٗ۔ اسکی میعاد لمبی کی۔ اَمَدَّ الجُنْدَ:۔ نصرهم بجماعة۔ کمک بھیج کر انکی مدد کی۔ اَمَدَّ فلانًا بِمَالٍ۔ اعطاہ۔ اس کو مال دیا۔ اَعَانَهٗ واغاثه۔ اَمَدَّ کے ایک معنے مدد کرنے اور فریادرسی کرنے کے ہیں (اقرب) پس نُمِدُّ کے ایک معنے ہونگے ہم مدد دیتے ہیں۔

اَلْمَحْظُوْر:۔ الممنوع۔ محظور کے معنے ہیں روکا ہوا۔ المحرّم ومنه فی القرآن وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ای محرّمًا اور محظور کے ایک معنے حرام کئے ہوئے کے بھی ہیں۔ اور آیت مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا میں محظور کے معنے یہی لئے گئے ہیں۔ وقیل مقصورًا علٰی طائفة من دون اخرٰی مِنْ حَظَرَ الشیءَ اذا حازہ لنفسه۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ حظر کے ایک معنی کسی چیز کو اپنے نفس کے لئے مخصوص کرنے کے ہیں۔ اس لئے محظور کے معنے یہ ہونگے کہ ایک گروہ کے ساتھ مخصوص کی ہوئی (اقرب)

تفسیر۔ پہلی آیت سے جو شبہ پیدا ہوتا تھا۔ کہ شاید مومن کے بغیر کسی کو نیک جزا نہیں ملتی۔ اس کا ازالہ اس آیت میں کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ نصرت الٰہی دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جو مذہب کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی

كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ

کس طرح ہم نے (دنیوی سامانوں کی روسے بھی) ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی (ہوئی) ہے۔ اور آخرت (کی زندگی) تو

دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ

یقیناً (اور بھی) بڑے درجات والی اور زیادہ فضیلت والی[۵۲۲] (زندگی) ہوگی پس اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ

اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝ وَقَضٰى ع ۲ / ۲

کوئی دوسرا معبود نہ بنائیو ورنہ تو مذموم ہو کر (اور) نصرت (الٰہی) سے محروم ہو کر بیٹھ جائیگا[۵۲۳] تیرے رب نے

رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ

(اس بات کا) تاکیدی حکم دیا ہے۔ کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور (نیز اپنے) ماں باپ سے اچھا سلوک کرنے کا

بلکہ عام ہوتی ہے۔ جو کام کوئی کرتا ہے اور جس کسی کام کے لئے کوئی کوشش کرتا ہے اس کے مطابق اس کو پھل ملتا ہے۔ اس میں ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ موسائی وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ اور ایک ایسی نصرت ہوتی ہے جو مذہب کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ وہ صرف مومن کے شامل حال ہوتی ہے۔ اور کافر کو نہیں ملتی۔

۵۲۲ تفسیر۔ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا۔ فرمایا آخرت تو درجات اور فضیلت دینے میں بہت بڑی ہے۔ مسلم کی ایک حدیث ہے۔ عن ابی سعیدن الخدری اَنّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ان اھل الجنۃ لیتراء ون اھل الغرف من فوقھم کما تتراءون الکوکب الدرّی الغابر من الافق من المشرق او المغرب لتفاضل ما بینھم (مسلم جزء رابع کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا) کہ بڑے بڑے درجات والے اپنے اوپر والے جنتیوں کو اسی طرح دیکھیں گے جیسے تم اس ستارہ کو دیکھتے ہو جو دور افق میں ہوتا ہے۔ اور یہ انکے مدارج کے فرق کی وجہ سے ہوگا۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ دیکھو! دُنیا میں ہم نے بہت سے لوگوں کو جو مومن نہیں ترقیات دی ہیں یہ انکے اعمال کے قبول ہونے کے سبب سے ہی ہے انہوں نے دُنیا کے لئے محنت کی۔ دُنیا ہم نے ان کو دے دی۔ مگر اس سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کہ غیر مومن بھی اعلیٰ ترقیات حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ترقیات اُخروی ترقیات کے مقابل پر حقیر ہیں۔

اس آیت میں مومنوں کو نیکی میں بڑھنے کی تحریص بھی دلائی گئی ہے اور بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں بڑے بڑے انعامات ہیں۔ پس نیکی کے کسی مقام پر کھڑا انہیں ہو جانا چاہیئے۔

۵۲۳ تفسیر۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ کیوں اُخروی نعماء بغیر ایمان کے نہیں ملتیں۔ اور وہ دلیل یہ ہے کہ جو جس کے ساتھ وابستہ ہوگا اسی کے ساتھ جائے گا۔ پس جو خدا تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ آگے آگے بڑھتے جائینگے لیکن جو اللہ تعالیٰ سے وابستہ نہیں بلکہ جھوٹے معبودوں کے ساتھ وابستہ ہیں وہ وہیں بیٹھے رہینگے جہاں ان کے معبود ہیں۔ یاد رہے کہ شرک کے ساتھ انسان

جنت میں مدارج

مشرکوں کے ترقی نہ کر سکنے کی وجہ

اِمَّا یَبۡلُغَنَّ عِنۡدَکَ الۡکِبَرَ اَحَدُہُمَاۤ اَوۡ کِلٰہُمَا

اگر ان میں سے کسی ایک پر یا ان دونوں پر جب کہ وہ تیرے پاس ہوں بڑھاپا آ جائے

فَلَا تَقُلۡ لَّہُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنۡہَرۡہُمَا وَ قُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا

تو انہیں (ان کی کسی بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے) اف تک نہ کہہ اور نہ انہیں جھڑک اور ان سے شریفانہ طور پر نرمی سے

کَرِیۡمًا ۝ وَ اخۡفِضۡ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَۃِ

بات کر ۲۴ اور (ان پر) رحم کرتے ہوئے ان کے لئے خاکساری کا بازو جھکا دے

مشرک ترقی نہیں کرسکتا

نیچے ہی نیچے گر جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم ایسی نہ ملے گی جو شرک کو اختیار کرکے ترقی کر گئی ہو مشرک قوم جب ترقی کرے گی اپنے مذہب سے بیگانہ ہو کر ترقی کرے گی اس کے اُصول پر چلتے ہوئے کبھی ترقی نہ کرے گی۔

تقضی

۲۴ حل لغات۔ قضی: عَلَیۡہِ عہدًا اَوۡصَاہُ۔ اس کو تاکیدی حکم دیا۔ قضی العہد۔ انفذہ عہد و اقرار کو جاری کیا۔ الیہ الامرَ انہاہُ وابلغہٗ اس تک کسی امر کو پہنچایا۔ وفی الاساسِ قضیٰ الیہ امرًا وعہدًا وصّاہُ بہ وامرہ بہ۔ اور اساس میں قضیٰ الیہ امرًا کے معنے یہ کئے گئے ہیں کہ اسے تاکیدی حکم دیا (اقرب)

اُف

اُف: ناپسندیدگی۔ بے قراری اور حقارت کے اظہار کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے (اقرب)

تنہر

لَا تَنۡہَرۡہُمَا۔ نَہَرَ سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور نَہَرَ السائل کے معنی ہیں۔ زَجَرَہٗ۔ سائل کو جھڑکا (اقرب)

سب گناہ شرک کی شاخیں ہیں

پس لَا تَنۡہَرۡہُمَا کے معنے ہونگے کہ انہیں نہ جھڑک۔

قولاً کریمًا ای سھلًا لیّنًا۔ نرم پسندیدہ بات (اقرب)

تفسیر۔ اب اللہ تعالےٰ وہ ترکیب بتاتا ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے نظام کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تعلیم کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہدایت کے دنوں میں ان احکام کی پابندی کرنا اور ان کا خیال رکھنا تب ہی تم تنزل سے بچ سکو گے۔ ورنہ ترقیات قائم نہ رہ سکیں گی۔

قرآن مجید نے سب سے مقدم حکم توحید کے قیام اور شرک کے رد کا دیا ہے۔ جب دُنیا میں حکومتیں بنتی ہیں تو ساتھ ہی توہم پرستی اور شرک بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جہاں ترقیات کی پیشگوئی کی وہاں آیندہ کے خطرات سے بھی بچنے کا حکم دیا۔ اور ان سے آگاہ کر دیا۔ توحید کو اس لئے مقدم رکھا ہے کیونکہ کوئی گناہ بغیر شرک کے پیدا نہیں ہوتا۔

میرے نزدیک سب گناہ دراصل شرک ہی کی شاخیں ہیں۔ گناہ کا مرتکب انسان اسی لئے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات پر کامل ایمان اور توکل نہیں رکھتا۔ توحید کا مسئلہ نیکیوں کے لئے بطور ایک بیج کے ہے۔ تمام مذاہب اور تمام اخلاق اسی مرکز کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ اگر توحید کا عقیدہ نہ اختیار کیا جائے تو قانون قدرت اور قانونِ شریعت دونوں کی بنیاد ہل جاتی ہے۔ قانون شریعت کا تعلق تو واضح ہی ہے۔ مگر قانون قدرت کی تمام ترقیات اور سائنس کی تمام ترقیات بھی توحید پر ہی ہے۔ کیونکہ اگر مختلف خدا مانے جائیں تو ان کے مختلف قانون ہونے چاہئیں یا پھر کم از کم اس میں مختلف تبدیلیاں

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا ۞ رَبُّكُمْ

اور (ان کے لئے دعا کرتے وقت) کہا کر (کہ اے) میرے رب ان پر (اسی طرح) مہربانی کر کیونکہ انہوں نے (میری) بچپن کی حالت میں میری پرورش کی تھی ۲۵ تمہارا

ہوتی رہنی چاہئیں۔ اور اگر ایسا ہو یعنی ایک اٹل قانون اور ایک قائم سلسلہ قانون قدرت کا دُنیا میں جاری نہ ہو۔ تو تمام علمی ترقیات یکدم بند ہو جائینگی کیونکہ سائنس کی ترقی اور ایجادات کی وسعت کی بُنیاد اسی پر ہے کہ دُنیا میں ایک منظم اور نہ بدلنے والا قانون جاری رہے۔ اگر انسان کو یہ خیال ہو کہ عالم میں کوئی نظام نہیں۔ یا یہ کہ نظام بدلتا رہتا ہے تو وہ کبھی بھی قانون قدرت کی باریکیوں کے دریافت کرنے کی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔

توحید پر یقین رکھنے کا حکم دینے کے بعد والدین کے ساتھ حُسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف ہی توجہ دلاتے ہیں۔ وہ طبعی قانون کا ایک ایسا ظہور ہیں جو قانون شریعت کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مبدیٔ (پیدا کرنے والی ذات) پر دلالت کرتے ہیں۔ والدین کے ذریعہ سے پیدائش بتاتی ہے کہ انسان اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہو گیا۔ اس سے پہلے کوئی اور تھا۔ اور اس سے پہلے کوئی اور۔ غرض ایک لمبا سلسلہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ کے وجود پر شہادت ملتی ہے۔

بغیر تناسل کے اصول کے انسان کا ذہن مبدأ کی طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو انسان کو اس لمبی کڑی کی طرف کبھی توجہ ہی نہ ہوتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سلسلہ تناسل یہ بھی بتاتا ہے کہ انسانی پیدائش کی غرض اور اس کا مقصد بہت بڑا ہے۔ پس توحید کے حکم کے بعد والدین کے متعلق احسان کا حکم دیا کیونکہ ایک احسان کی قدر دوسرے احسان کی قدر کی طرف توجہ پھراتی ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ اس کا عطف اَنْ پر ہے پُورا جملہ یہ ہے ان احسنوا بالوالدین احسانًا یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ حکم دیا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو معبود نہ بناؤ۔ اور ایک یہ کہ والدین کے ساتھ حُسن سلوک کرو۔ اس جملہ میں کیا لطیف رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا انسان بدلہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے خدا تعالیٰ کے ذکر میں یہ بیان کیا کہ احسان تو تم کر نہیں سکتے پس ظلم سے تو بچو۔ لیکن والدین کے احسان کا بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ان کے بارہ میں مثبت حکم دیا۔

عِنْدَكَ۔ کے لفظ میں یہ بتایا ہے کہ اگر وہ تمہاری کفالت میں بھی ہوں تو بھی کچھ نہ کہنا بجائے یہ کہ وہ الگ رہتے ہوں۔ اور پھر بھی تمہارے ہاتھوں تکلیف پائیں۔

کفالت کی خصوصیت اس لئے فرمائی۔ کہ ہر وقت کے پاس رہنے سے اختلافات زیادہ رونما ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی قاعدہ ہے کہ انسان جس پر خرچ کرتا ہے اس پر اپنا حق بھی سمجھنے لگتا ہے۔

توحید کے بعد والدین سے حسن سلوک کے ذکر میں حکمت۔

اُفّ۔ کلمۂ ضجر ہے یعنی ناپسندیدگی کا کلام یعنی یہ کہنا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں اور نَهْر ناپسندیدگی کو عملی جامہ پہنانے کو کہتے ہیں۔ یعنی نہ مُنہ سے نہ عمل سے ان کو دُکھ دو۔

اسلام نے والدین کی خدمت کے لئے خاص ہدایات دی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ادرك احد والديه ثم لم يغفر له فابعده الله عز وجل۔ رواہ احمد (ابن کثیر جلد ۶ صلا) یعنی جس شخص کو اپنے والدین میں سے کسی کی خدمت کا موقع ملے اور پھر بھی اس کے گناہ نہ معاف کئے جائیں تو خدا اس پر لعنت کرے مطلب یہ کہ نیکی کا ایسا اعلیٰ موقعہ ملنے پر بھی اگر وہ خدا کا فضل حاصل نہیں کر سکا۔ تو جنت تک پہنچنے کے لئے ایسے شخص کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔

والدین کی خدمت کا موقع ملنے کے باوجود جنتی نہ بننا بدبختی ہے

۲۶ حل لغات۔

وَاخْفِضْ۔ خفض (۲) واخفض سے امر کا صیغہ ہے۔ اور خفض الشیءُ کے معنے ہیں

أَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۚ إِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَإِنَّهٗ

جو کچھ (بھی) تمہارے دلوں میں ہو اسے (سب سے) بہتر جانتا ہے اگر تم نیک ہو گے تو (یاد رکھو کہ) وہ

كَانَ لِلْأَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ

بار بار رجوع کرنے والوں کو بہت ہی بخشنے والا ہے ۵۲۷ اور قرابت والے کو

وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝

اور مسکین کو اور (مسافر) راہرو کو اس کا حق دے اور اسراف کسی رنگ میں (بھی) نہ کر ۵۲۸

ضدّ رفعهٗ۔ اس کو نیچا کیا۔ وفی القراٰن۔ واخفض جناحك للمؤمنين ای تواضع لهم۔ اور قرآن مجید کی آیت واخفض جناحك للمؤمنين میں واخفض کے معنے تواضع کرنے کے ہیں۔ خفض صوتہٗ کے معنے ہیں۔ اَخْفَاهُ وَغَضَّهٗ۔ آواز کو نیچا کیا۔ خفض الصوتُ لانَ وسهلَ۔ آواز نرم ہو گئی (اقرب)

الجناح — الجناح۔ مایطیر به الطائرُ۔ پرندے کا بازو۔ ید الانسانُ۔ انسان کا ہاتھ۔ العضد۔ بازو۔ الجانب جانب۔ الكنف۔ پناہ (اقرب)

الذل — الذلُّ۔ اللِّينُ والسهولة۔ ذل کے معنے نرمی اور آسانی کے ہیں۔ والتواضع۔ تواضع۔ الانقیاد۔ فرمانبرداری (اقرب)

تفسیر۔ اور ان کے لئے رحمت کے ساتھ اپنے انکسار کے بازو نیچے کر دے۔ اور یہ دعا کرتا رہ کہ اے میرے رب تو ان پر رحم کر۔ کیونکہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے۔ اس لطیف تشبیہ میں بتایا ہے کہ تیرا ہاتھ ہر وقت انکی خدمت میں لگا رہنا چاہیے۔

والدین کے لئے ہمیشہ دعا کرنی چاہیے۔ — اس آیت میں یہ بھی اشارہ کر دیا کہ انسان بالعموم والدین کی ویسی خدمت نہیں کر سکتا۔ جیسی کہ ماں باپ نے اس کی بچپن میں کی تھی۔ اس لئے فرمایا کہ ہمیشہ دعا کرتے رہنا کہ اے خدا تو ان پر رحم کر۔ تاکہ جو کسر عمل میں رہ جائے دعا سے پوری ہو جائے۔ لـ کے معنے تشبیہ کے بھی ہوتے ہیں۔ ان معنوں کی رو سے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ بڑھاپے میں ماں باپ کو ویسی ہی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے جیسے کہ بچہ کو بچپن میں۔

والدین کے لئے یہ دعا اس لئے بھی سکھائی گئی ہے کہ جو اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا رہے گا اسے خود بھی اپنا فرض ادا کرنے کا خیال رہے گا۔

۵۲۷ حل لغات

اوّابین۔ اَوّاب کی جمع اوّابون آتی ہے۔ اور اَوّاب آبَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ آب الی اللہ کے معنے ہیں۔ رَجَعَ عَنْ ذَنْبِهٖ وَتَابَ۔ اپنے گناہ سے لوٹ کر اللہ کی طرف رجوع کیا (اقرب) پس اوّاب کے معنے ہونگے بار بار رجوع کرنے والا۔

تفسیر۔ یعنی اگر ایسی نیک نیتی اپنے دل میں پیدا کرے جو اوپر بیان ہوئی ہے تو پھر خدا تعالیٰ بھی اس کے عیوب پر پردہ ڈال دیتا ہے یعنی اس کے عمل میں جو کمی رہ جائے اللہ تعالےٰ اسے پوری کر دیتا ہے۔ اس آیت کا مضمون اس حدیث سے بھی ملتا ہے جو اوپر گذر چکی ہے اور جس کا یہ مضمون ہے کہ والدین کی خدمت کا موقع پا کر بھی جسکے گناہ نہ بخشے جائیں اس پر لعنت ہو کیونکہ اس آیت کا مضمون یہی بتاتا ہے کہ جو صالح ہو گا یعنے اوپر کے احکام کے مطابق عمل کرے گا تو اس سے خدا تعالےٰ مغفرت کا معاملہ کرے گا۔

لاتبذر — **۵۲۸ حل لغات**۔ لاتبذر۔ بَذَّرَ سے نہی

مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور بَذَّرَ المال کے معنے ہیں فَرَّقَہٗ اسرافاً۔ مال کے خرچ کرنے میں فضول خرچی سے کام لیا۔ پس لَا تُبَذِّرْ کے معنے ہونگے۔ تو اسراف نہ کر۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہر شخص کے مال میں رشتہ داروں۔ مساکین اور مسافروں کا حق ہے رشتے دار انسان کی کمائی میں کئی طرح مدد کا موجب ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے مال میں ان سب کا حق ہوتا ہے مثلاً والدین نے ایک بیٹے کو پڑھا دیا، اور وہ کسی عہدہ پر پہنچ گیا اور باقی بھائی علم سے محروم رہے تو اس عہدہ دار کے مال میں باقی بھائیوں کا بھی حق ہے کیونکہ جس روپے سے اس کو تعلیم دلائی گئی تھی اس میں ان سب کا حق تھا۔

مساکین اور ابن السبیل کا بھی اللہ تعالیٰ نے حق قرار دیا ہے اور دوسری جگہ کھول کر بھی بتایا ہے وَفِیْٓ اَمْوَالِہِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات ع ۱) کہ انسان کے اموال میں سائل وغیرہ کا بھی حق ہوتا ہے۔ مساکین کا حق قرار دینے کی ایک تو یہ وجہ ہے کہ دُنیا میں امیر غریب بدلتے رہتے ہیں۔ جو آج غریب ہیں کبھی امیر تھے اور جو آج امیر ہیں کبھی غریب تھے اور اس وقت کے امیروں نے اُن سے حسن سلوک کیا تھا۔ پس ساری دنیا کو اگر مجموعی نگاہ سے دیکھا جائے تو کسی کا مال اس کا خالص مال نہیں بلکہ اس میں دوسروں کے حقوق شامل ہیں۔ دوسری وجہ اسکی یہ ہے کہ دُنیا کی سب اشیاء اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے بحیثیت جماعت پیدا کی ہیں نہ کہ زید یا بکر کے لئے۔ پس اگر زید اور بکر کسی وجہ سے زیادہ مالدار ہو گئے ہوں تو اس سے ان باقی لوگوں کا حق باطل نہیں ہو جاتا۔ جو دنیا کی چیزوں کی ملکیت میں زید اور بکر کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ بیشک بوجہ خاص محنت کے زید یا بکر کا زائد حق اسلام تسلیم کرتا ہے لیکن ان کو مالک بلا شرکت غیر نہیں تسلیم کرتا۔

مسافروں کا حق اس طرح کہ جب یہ دوسری جگہ کی طرف جاتا ہے تو وہ اس سے حسنِ سلوک کرتے ہیں۔ پس دوسرے مقام کے مسافر کی خدمت کرنا اس کا فرض ہے تا حق ضیافت ادا ہوتا رہے۔ ابن السبیل کے حق کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی بستی میں جاؤ تو تین دن تک کی ضیافت کا تم کو حق ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر بستی والے نہ دیں۔ فرمایا چھین کر بھی لے سکتے ہو۔ (ابو داؤد جلد ثالث کتاب الاطعمۃ باب ما جاء فی الضیافۃ)

ہر شخص کے مال میں رشتہ داروں اور مساکین کے حق ہونے کی دلیل۔

یہ حکم اس وقت کے لئے ہے جب اسلامی تمدن جاری ہو کیونکہ ان ایام میں دوسرے لوگ اس سے ضیافت کا حق لے سکیں گے۔ اس حکم کو اگر دنیا میں جاری کیا جائے تو بہت سی خرابیاں جو ہوٹلوں اور سراؤں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں دُنیا سے دُور ہو جائیں اور غرباء کے لئے بھی دُنیا کا سفر جو اعلیٰ تربیت کا ایک ذریعہ ہے آسان ہو جائے مگر افسوس کہ خود مسلمانوں نے بھی اس حکم کو بھلا رکھا ہے۔

مسافروں سے حسنِ سلوک کا یہ عام حکم دنیا سے بہت سے فتنے مٹانے کا موجب ہے کیونکہ لڑائی جھگڑا منافرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس طرح مہمان نوازی کا رواج ہو تو منافرت دُور ہو جائے۔ اور گاؤں اور مُلکوں کے جھگڑے مٹ جائیں۔ وہ لوگ جو کسی دوسرے مُلک کی مہمان نوازی سے فائدہ اُٹھا چکے ہوں کبھی بھی جلدی سے ان کے خلاف لڑنے پر آمادہ نہ ہونگے سوائے خبیث ارواح کے جو نسبتاً تھوڑی ہوتی ہیں۔ نیز اس حکم سے گاؤں اور قصبوں کے نظام کی بُنیاد بھی پڑتی ہے کیونکہ مہمان نوازی سارے گاؤں پر واجب کی گئی ہے۔ پس اس حکم کے پُورا کرنے کے لئے ہر گاؤں والے ایک ایسے نظام کی پابندی پر مجبور ہونگے جس کے ماتحت سارا گاؤں مہمانوں کی خدمت کر سکے اور یہ نظام ان کے دوسرے کاموں میں بھی مفید ثابت ہوگا۔

لَا تُبَذِّرْ۔ پھر فرمایا کہ اوپر کے احکام میں مال کو خرچ کرنے کی جو نصیحت کی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا کہ مال کو لٹا دینا چاہیئے۔ ہم نے انہی اخراجات کا حکم دیا ہے جو ضروری ہیں بے فائدہ مال لٹانے کا حکم نہیں دیا۔

ہر شخص کے مال میں مسافروں کے حق ہونے کی وجہ

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ

اسراف کرنے والے لوگ یقیناً شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں اور

الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ○ وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ

شیطان اپنے رب کا بہت ہی ناشکرگذار ہے ۲۹؎ اور اگر تو اپنے رب کی طرف سے کسی

ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا

رحمت کی جستجو میں جس کی تو امید رکھتا ہو ان سے اعراض کرے۔ تو (پھر بھی انہیں سختی سے رد نہ کر

مَّيْسُورًا ○ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ

بلکہ) انہیں کوئی نرم بات کہہ دو ۳۰؎ اور تو نہ (تو بخل سے) اپنے ہاتھ کو باندھ کر اپنی گردن میں ڈال لے۔

فضول خرچی کی تشریح۔

ابن مسعود کا قول ہے اَلتَّبْذِیْرُ اَلْاِنْفَاقُ فِیْ غَیْرِ حَقٍّ یعنی ناجائز خرچ کو تبذیر کہتے ہیں۔ پس اس حکم میں دینی انفاق شامل نہیں۔ دین کی کسی ضرورت کے لئے اگر کوئی اپنا سارا مال بھی خدا کی راہ میں دیدے تو وہ مبذر نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے بے جا خرچ نہیں کیا۔

قرآن مجید نے فضول خرچی کی دوسری جگہ تشریح یوں فرمائی ہے۔ وَالَّذِیْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (فرقان ع ۶ ۱) کہ نہ تو اسراف کرنا چاہیئے اور نہ کنجوسی سے کام لینا چاہیئے مگر میانہ روی اختیار کرنی چاہیئے۔

۲۹؎ **تفسیر**۔ فرمایا کہ اگر تم ایسا کروگے تو ناشکری ہوگی۔ ہم نے تمہیں یہ مال اسی لئے دیا ہے کہ تم اسکو برمحل خرچ کرو۔ اب جو تم اس کو یوں پھینکوگے تو اسکے یہ معنے ہونگے کہ مال کے ساتھ جو ذمہ واریاں اللہ تعالیٰ عائد فرماتا ہے ان سے بچنا چاہتے ہو۔ اور یہ ایک گناہ ہے۔

رہبانیت کا رد

اس آیت میں کس لطیف طریق سے رہبانیت وغیرہ کا رد کیا ہے۔ رہبانیت کیا ہے۔ ذمہ واریوں سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور یہ فعل نیکی نہیں کہلا سکتا بلکہ ایک کھلی بدی ہے۔ اور شیطانی فعل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احسان کی ناقدری ہے۔

۳۰؎ **حل لغات**۔ مَیْسُوْرًا کے معنے ہیں مَا یُسِّرَ۔ خلافُ المعسور وھو مصدر علی مفعول بمعنی الیسر۔ میسور اسم مفعول بھی ہے۔ اور مصدر بھی۔ اور اسکے معنی ہیں وہ چیز جو آسان کی گئی ہو۔ یا آسانی لیہل سولت۔ ومنہ فَقُلْ لَّھُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا۔ اور فَقُلْ لَّھُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا میں قول میسور کے معنی نرم بات کے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت کے دو معنے ہیں:- (۱) جب تم اقربار مساکین وغیرہ سے اعراض کرو یعنی انکی مدد نہ کرسکو۔ تو اس بات کی ضرور نیت کر لو کہ جب اللہ تعالےٰ دے گا تو ضرور دونگا۔ اور ساتھ ہی تم ان کو یہ بات نرمی سے سمجھا دو کہ توفیق ملنے پر تمہاری ضرور مدد کروں گا۔

(۲) دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے فضل کی امید میں یعنی یہ خیال کرتے ہوئے کہ میرا دینا انکی دینی یا اخلاقی حالت بگاڑ دے گا۔ غرباء کی مدد سے اعراض کرے۔ تو تو انکو نرمی سے سمجھا دے گویا اعراض ابتغاء رحمۃٍ ہونا چاہیئے نہ کہ بخل کی

وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝

اور نہ (اسراف میں پڑ کر) اسے بالکل کھول دے۔ ورنہ (یا تو) تو ملامت کا نشانہ بنکر (اور یا پھر) تھک کر بیٹھ جائیگا ۳۱؎

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ

تیرا رب یقیناً جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو وسیع کر دیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے۔ وہ یقیناً

كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ ع ۸ ۳

اپنے بندوں (کے حالات) کو جاننے والا (اور) دیکھنے والا ہے ۳۲؎ اور تم مفلسی کے خوف سے اپنی

وجہ سے۔ مثلاً کوئی ہٹا کٹا آدمی سوال کرے اور جس سے سوال کیا جائے وہ اس نیت سے اس کے سوال کو پورا نہ کرے کہ قوم میں سوال کی عادت نہ پیدا ہو جائے۔ تو یہ جائز ہے۔ مگر اس انکار کا باعث بخل اور کنجوسی نہ ہو۔ اسی طرح مثلاً سائل مسرف ہو یا نشہ شراب افیون کی بدعادت میں مبتلا ہو اسکی مالی مدد سے اگر یہ اس وجہ سے باز رہتا ہے کہ میرے اسکی امداد کی تو اسکی صحت خراب ہوگی ملک میں بدی ترقی کریگی اور نہ دینے سے اسکی نشہ کی عادت چھٹیگی اور ملک کو بھی فائدہ پہنچے گا تو یہ شخص گناہگار نہ ہوگا بلکہ نیکی کا مرتکب۔ حدیث میں آتا ہے بعض ایسے سائلوں کے آنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے یا انہیں سمجھا دیتے تھے

۳۱؎ **حل لغات**۔ مغلولۃً۔ غلّ سے اسم مفعول مؤنث کا صیغہ ہے اور غلّ فلاناً کے معنی ہیں وضع فی یدہٖ اَوعنقہٖ الْغُلَّ۔ اس کے ہاتھوں یا گردن میں طوق ڈالا (اقرب) پس لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً کے معنے ہونگے تو اپنے ہاتھوں کو باندھ کر اپنی گردن میں نہ ڈال لے۔

محسورا۔ حَسَرَ سے اسم مفعول ہے۔ اور حَسَرَ الشیءَ کے معنے ہیں کَشَفَہٗ کسی چیز سے پردہ کو ہٹایا حسر العود قشرہٗ ٹہنی کے چھلکے کو اتارا۔ حسر البعیرَ۔ ساقہٗ حتّٰی اَعیا۔ اونٹ کو اتنا چلایا کہ وہ تھک گیا۔ حَسَرَ البیتَ کَنَسَہٗ گھر میں جھاڑو دیا (اقرب) پس محسور کے معنے ہونگے۔ جھاڑو دیا ہوا۔ ننگا کیا ہوا۔ تھکایا ہوا۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ خرچ کے متعلق اس امر کو مدنظر رکھو کہ نہ تو ہاتھ گردن سے بندھا رہے یعنی ضرورت کے وقت بھی خرچ کرنے سے دریغ ہو اور نہ ہاتھ ہر وقت مال لٹانے کے لئے

دراز رہے۔ بلکہ چاہیئے کہ تم ضرورت کے مطابق خرچ کرو۔ تا بے ضرورت خرچ تم کو کہیں وقت کی نیکی سے محروم نہ کر دے جبکہ خرچ کرنیکی کوئی صحیح ضرورت پیدا ہو گئی ہو۔

سائل سے حسن سلوک کی تاکید

بے ضرورت خرچ کرنے کے دو نقصان بتائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو شخص بے ضرورت خرچ کرتا ہے ضرورت کے وقت جبکہ اس کے دوسرے ساتھی خرچ کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ نہ دیکھتا رہ جاتا ہے اور قوم اسے ملامت کرتی ہے کہ آج ملک یا قوم کو ضرورت تھی اور آج تم خاموش بیٹھے ہو اور دوسرا نقصان یہ کہ اس طرح انسان محسور یعنی ننگا ہو جاتا ہے یعنی جب ضرورت کے وقت یہ کام نہیں آسکتا تو قوم پر اس کا عیب ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ بیوقوف ہے۔ اپنے مال کی حفاظت نہیں کرسکا اور یہ بھی کہ یہ دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے

بے ضرورت خرچ کرنے کے نقصان

حسر البیت کے معنے گھر میں جھاڑو دے کر اسے صاف کر دیا کے بھی ہیں پس محسور کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تو اس حالت میں ہو جائے کہ گویا کہ تیرے گھر میں جھاڑو مل گیا۔

۳۲؎ **تفسیر**۔ اس میں یہ بتایا کہ خدا تعالیٰ کسی کو فراخی دیتا ہے اور کسی کے رزق میں تنگی کرتا ہے تا یہ دیکھے کہ جو مالدار ہیں وہ غرباء کی کس طرح مدد کرتے ہیں۔ پس اگر تم دنیا کے اموال کی اس نیت سے حفاظت کرو کہ ان کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کے بندوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکو تو یہ ایک بہت بڑی نیکی ہوگی۔

محسورا

قرآن کریم کی کیا ہی معجزانہ شان ہے کہ ابھی مسلمان مکہ میں تکلیف اٹھا رہے تھے کہ اس نے مسلمانوں کے لئے وہ احکام بیان کرنے شروع کر دیئے جو ان کے لئے ترقی کے زمانہ میں ضروری تھے۔ کیا اس کے سوا جو اپنی بات کو پورا کرنے پر کامل طور پر قادر ہو کوئی دوسرا اس طریق کو اختیار کر سکتا ہے۔ اگر یہ کلام انسان کا ہوتا تو مکہ میں اور ان حالات میں جن میں سے مسلمان گزر رہے تھے یہ الفاظ

خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ

اولاد کو قتل مت کرو انہیں (بھی) ہم ہی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی (ہم ہی دیتے ہیں) انہیں

قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْـًٔا كَبِيرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ إِنَّهُ

قتل کرنا یقیناً (بہت) بڑی خطا ہے ۵۳۳ اور زنا کے قریب (بھی) نہ جاؤ۔ وہ یقیناً

امعوّف نکالتے وقت اس کا حلق خشک ہو جاتا اور لفظ حلق میں ہی اٹک کر رہ جاتے۔

۳۳ حل لغات۔ اِملاق: اَملَقَ کے معنے ہیں اور املق الرجل کے معنے ہیں انفق مالہ حتی افتقر یعنی اتنا مال خرچ کیا کہ محتاج و مفلس ہو گیا (اقرب)۔ پس املاق کے معنے ہوں گے۔ مال ضائع ہو کر محتاج و مفلس ہو جانا۔

الخطاء: اَلْخِطْأُ: الذنب۔ قصور۔ ما تعمّد منه۔ جان بوجھ کر کی ہوئی غلطی (اقرب)

تفسیر۔ اس سے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ احسان تو لوگوں پر کرو لیکن یہ خیال رکھو کہ تمہارا احسان کرنا اس رنگ میں نہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں لوگ بدیوں میں بڑھ جائیں یا تم خود بدی میں پڑ جاؤ۔ اب فرماتا ہے کہ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ یعنی اس خوف سے کہ اولاد پر روپیہ خرچ ہوگا ان کو قتل نہ کرو۔ یہ حکم لڑکیوں کے قتل کرنے کے متعلق نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم میں لڑکیوں کے قتل کی کسی جگہ بھی یہ وجہ بیان نہیں فرمائی کہ لوگ خرچ کے ڈر سے ان کو قتل کر دیتے ہیں۔ بلکہ یہ وجہ بتائی ہے کہ ان کی پیدائش کو اپنے لئے ذلت کا موجب سمجھتے ہیں اس لئے ان کو مار ڈالتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت کے یہ معنے بھی نہیں ہو سکتے ہیں کہ بوجہ غربت اور تنگی کے اولاد کو قتل نہ کرو۔ کیونکہ املاق کے معنے غربت اور تنگی کے نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے معنے مال کے خرچ ہونے کے ہیں۔ اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ اس ڈر سے نہ مارو کہ روپیہ خرچ ہوگا۔

آیت لا تقتلوا اولادکم کا مطلب

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ڈر سے کہ روپیہ خرچ نہ ہو کوئی اولاد کو قتل کرتا بھی ہے؟ سو جہاں تک دنیا کا تجربہ ہے اس قسم کے واقعات صحیح الدماغ لوگوں میں تو ملتے نہیں۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جن کے پاس روپیہ نہیں ہوتا وہ بھی اولاد کو نہیں مارتے۔ پس معلوم ہوا کہ اس قتل کا کوئی اور مفہوم ہے۔ اور ہمیں انسانوں میں اس جرم کی تلاش کرنی چاہیئے۔ سو جب ہم مختلف انسانوں کی حالتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ بخل کی وجہ سے اولاد کی صحیح تربیت نہیں کرتے۔ پوری غذا نہیں دیتے یا ایسی غذا نہیں دیتے جو نشو و نما کے لئے ضروری ہو۔ ایسے بخیل تو بے شک فاتر العقلوں میں ہی ملتے ہیں جو زہر سے یا گلا گھونٹ کر اپنی اولاد کو اس خوف سے مارتے ہوں کہ ان پر ہماری دولت خرچ ہوگی۔ مگر ایسے بخیل عام صحیح الدماغ لوگوں میں کثرت سے ملتے ہیں کہ پاس روپیہ ہے لیکن بچوں کو بخل کی وجہ سے اچھی غذا نہیں دیتے۔ لباس مناسب نہیں دیتے۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ وہ خوراک کی کمی کی وجہ سے بیمار ہو جاتے ہیں بعض دفعہ لباس کی کمی کی وجہ سے نمونیہ وغیرہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ دنیا میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ملتے ہیں اور ہر ملک میں ملتے ہیں۔ اسی طرح قتل سے مراد اخلاقی روحانی قتل بھی ہو سکتا ہے۔ کہ روپیہ کے خرچ کے ڈر سے اچھی تعلیم نہیں دلاتے اور گویا بچہ کی اخلاقی یا روحانی موت کا موجب ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو نصیحت کرتا ہے کہ اس فعل سے اجتناب کریں اور وہ اخراجات جو بچوں کی

صحت اور اخلاق کی درستی کے لئے ضروری ہیں۔ اُن سے کبھی دریغ نہ کیا کریں۔ اور قتل کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ اولاد کو قتل کرنے سے انسان فطرتاً تنفر کرتا ہے۔ پس اس لفظ کے استعمال سے اس کی توجہ اس طرف پھیرائی ہے کہ تم کسی صورت میں بھی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ایک اور قسم کے قتل کے تم مرتکب ہو رہے ہو۔ یعنی اولاد کی خوراک اور لباس کا خیال نہیں رکھتے اور ان کی صحتوں کو برباد کر دیتے ہو۔ یا ان کی تربیت کا خیال نہیں رکھتے اور ان کے اخلاق کو برباد کر دیتے ہو۔

قتل کا لفظ استعمال کرنے کی میرے نزدیک یہ بھی وجہ ہے کہ اگر صرف یوں کہا جاتا کہ اولاد پر ضرور خرچ کیا کرو۔ تو ان الفاظ میں ان بالواسطہ اثرات کی طرف اشارہ نہ ہوتا جو اولاد کی زندگی پر پڑتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ کے استعمال نے تمام بالواسطہ تاثیرات کو بھی اپنے اندر شامل کر لیا ہے۔ مثلاً بیوی کی خوراک اور مناسب لباس کا خیال نہ رکھنا۔ یا دودھ پلانے یا ایام حمل میں اس پر کام کا بہت بوجھ ڈال دینا یہ سب امور ہیں جن سے اولاد پر بُرا اثر پڑتا ہے اور یا تو بچے ضائع ہو جاتے ہیں یا ان کی صحتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ لَا تَقْتُلُوْا کے الفاظ میں ان سب امور کی مناہی آ جاتی ہے اور یہ غرض دوسرے الفاظ سے پوری نہ ہو سکتی تھی۔

اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں جو بعض صوفیاء کرتے ہیں۔ کہ اولاد کی پیدائش کو صرف اس خطرہ سے روکنا منع ہے کہ اگر اولاد زیادہ ہو جائے گی تو پھر کھائے گی کہاں سے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اولاد کی پیدائش بند کرنا قتل اولاد کے حکم میں ہے اور قتل اولاد ہر حال میں منع ہے اور بُرا ہے۔ تو معنے یہ ہوئے کہ اِملاق کی وجہ سے قتل اولاد (یعنی اسکی پیدائش کو روکنا منع ہے۔ البتہ بعض اور صورتوں میں جائز بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً عورت بیمار ہو۔ اس وقت جائز ہوگا کہ اولاد پیدا کرنا بند کر دے۔ کیونکہ جس چیز کی وجہ سے قتل اولاد کو روکا گیا ہے وہ غیر محسوس ہے۔ اسی وجہ کی بناء پر اولاد کی پیدائش کو روکنا ناجائز ہے۔ لیکن کسی محسوس اور مشاہد نقصان کی وجہ سے اولاد کی پیدائش کو روکنا منع نہیں۔

۱ لَا تَقْتُلُوْا اولاد کو قتل کے لفظ کے استعمال کی وجہ

علاوہ پیدائش میں روک ڈالنے کے جو بچہ بن چکا ہو بعض حالات میں اس کا مارنا بھی جائز ہوتا ہے مثلاً کسی حاملہ عورت کے متعلق زچگی کے وقت یہ شبہ ہو کہ اگر بچہ کو طبعی طور پر پیدا ہونے دیا گیا تو والدہ فوت ہو جائے گی۔ اس صورت میں بچہ کو ضائع کر دینا جائز ہے۔ کیونکہ بچہ کے متعلق نہیں کہہ سکتے کہ وہ مردہ پیدا ہوگا یا زندہ۔ یا زندہ رہے گا یا نہیں۔ مگر ماں سوسائٹی کا ایک مفید وجود ہے۔ اس لئے وہمی نقصان سے حقیقی نقصان کو زیادہ اہمیت دی جائے گی اور بچہ کو تلف کر دیا جائیگا۔

غرض لَا تَقْتُلُوْا کے الفاظ استعمال کرنے کے بعد خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ کی شرط لگا کر قرآن کریم نے اولاد کی تربیت، اس کی پرورش، ماں کی پرورش اور اس کی زندگی کی قیمت کے متعلق ایک وسیع مضمون بیان کیا ہے اور ایسے مختصر الفاظ میں کہ اس کی مثال دوسری کتاب میں نہیں مل سکتی۔ بلکہ حق یہ ہے کہ یہ مضمون ایسا اچھوتا ہے کہ دوسری کسی مذہبی کتاب نے اسے چھوا تک نہیں۔

۲ لَا تَقْتُلُوْا کے بعد خشیۃ املاق کہنے کی وجہ

اس آیت میں جو خِطْأً کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ گو اس کا مادہ اور خَطَأً کا مادہ ایک ہی ہے۔ لیکن خِطْأً جو خ کی زیر کے ساتھ ہے اس کے معنوں اور خَطَأ جس میں خ پر زبر ہے اس کے معنوں میں فرق کیا جاتا ہے۔ خِطْأ کے معنے اَلْاِثْمُ مَا تُعُمِّدَ مِنْہُ کے ہیں۔ اور خَطَأ کے معنے مَا لَمْ یُتَعَمَّدْ مِنْہُ اَوْ

۳ خِطْأً کے معنے

كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ

ایک کھلی بے حیائی اور بہت بُرا راستہ ہے ۳۴ اور جس جان کو (مارنا) اللہ تعالیٰ

تحقد کے ہیں۔ یعنی اگر تو خ پر فتح یعنی زبر ہو تو دیدہ دانستہ گناہ اور نادانستہ قصور دونوں معنوں میں مستعمل ہوگا اور اگر خ کے نیچے کسرہ یعنی زیر ہو تو اس سے مراد صرف وہ گناہ ہوگا جس میں ارادہ پایا جائے۔ اس لفظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اولاد کا قتل ایک ایسا جرم ہے کہ جس کو فطرت بھی رد کرتی ہے۔ یعنی جس کے احساسات طبعی مر چکے ہوں وہی ایسا فعل کر سکتا ہے دوسرا نہیں کر سکتا۔ اِنَّهٗ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا کے الفاظ بھی بتلاتے ہیں کہ یہاں وہ قتل مراد نہیں جو زہر یا آلہ سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ قتل کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مگر اپنے ہاتھوں بچوں کا قتل ہرگز کسی ملک میں بھی ایسے رنگ میں نہیں پایا جاتا کہ اُسے قومی جرم قرار دیا جائے۔ اس امر کا ثبوت کہ یہ عام قتل سے جُدا قسم کا قتل ہے یہ بھی ہے کہ قتل کے خلاف حکم آگے چل کر بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بچوں کا قتل بھی شامل ہے پس ظاہر ہے کہ اس جگہ قتل سے مراد کچھ اور ہے۔

اس آیت میں نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ. فرما کر اس امر پر زور دیا ہے کہ انسان کے رزق میں اس کی اولاد کا رزق شامل ہے۔ پس اس سے محروم نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی وجہ سے نَرْزُقُهُمْ کو پہلے رکھا اور باپ کے رزق کو بعد میں بیان کیا ہے۔

لاتقربوا الزنٰی میں لفظ قرب کے استعمال میں حکمت۔

۳۴ حل لغات۔ فَاحِشَة : کے معنے ہیں ما اشتد قبحہٗ من الذنوب۔ ہر وہ غلطی جو بہت بُری ہو۔ وقیل کُلّ ما نھی اللہ عنہٗ۔ ہر وہ بات جس سے اللہ نے روکا ہے (اقرب)

فاحشہ

تفسیر: - اس آیت میں زنا سے بچنے کا حکم قتل اولاد کے ذکر کے بعد دیا ہے۔ اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ زنا سے بھی اولاد کا قتل ہوتا ہے۔ کیونکہ اول تو حرام کی اولاد کو عام طور پر ضائع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسرے اگر ضائع نہ بھی ہو تب بھی اس کی تربیت اور پرورش میں مرد کھل کر حصہ نہیں لے سکتا۔ اور وہ اولاد بالعموم بغیر والی وارث کے رہ کر تباہ ہو جاتی ہے۔

لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی کے الفاظ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مواقع زنا پیدا ہی نہ ہونے دو یعنی نامحرم عورتوں سے الگ نہ ملو۔ ان سے زیادہ خلا ملا نہ رکھو وغیرہ وغیرہ قرآن کریم کی یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ وہ نہ صرف گناہ سے روکتا ہے بلکہ گناہ سے رُکنے کے ذرائع بھی بتاتا ہے اور ایسی ہی تعلیم بنی نوع انسان کی حفاظت کر سکتی ہے۔ جو کتاب گناہ سے بچنے کے ذرائع نہیں بتاتی وہ انسان کو ایک پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اطمینان وہی کتاب پیدا کر سکتی ہے جو کسی بات سے منع کرنے کے ساتھ ہی اس سے بچنے کے ذرائع بھی بتا دے تا انسان کو تسلی ہو کہ میں اس حکم پر عمل کر سکوں گا۔ انجیل کہتی ہے کہ تو کسی عورت کو بد نظری سے نہ دیکھ۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ تو کسی نامحرم عورت کی طرف نظر اُٹھا کر ہی نہ دیکھ۔ کیونکہ وہ کشش جو انسان کے دل میں لغزش پیدا کرتی ہے۔ جب اس کے لئے رستہ کھول دیا جائے تو حفاظت ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور ہو جاتی ہے۔ اس حکمت کے ماتحت اس جگہ فرمایا ہے کہ تم گناہ کے مقام سے اتنی دُور کھڑے رہو کہ جہاں سے تم بدی کا مقابلہ کر سکو۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ تو بزدلی ہے۔ مگر یہ بُزدلی نہیں یہ تو احتیاط ہے اور احتیاط کو کوئی عقلمند بُزدلی نہیں کہتا۔

ظاہر ہے کہ انسان دو ہی قسم کے ہو سکتے ہیں۔

الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا

نے حرام ٹھہرایا ہے اسے (شرعی) حق کے سوا قتل نہ کرو اور جو شخص مظلوم مارا جائے اس کے

فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ

وارث کو ہم نے (قصاص کا) اختیار دیا ہے۔ پس (اس کیلئے یہ ہدایت ہے کہ) وہ (قاتل کو) قتل کرنے میں (ہماری مقرر کردہ) حد سے

اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا

آگے نہ بڑھے (اگر وہ حد کا اندر رہیگا تو یقیناً (ہماری) مدد اسکے شامل حال ہوگی ۳۵ اور تم اس طریق کے سوا جو (یتیم کے حق میں) زیادہ اچھا ہو

اوّل وُہ جو گناہ کے پاس جا کر بھی بچ سکتا ہے۔ ایسے شخص کو گناہ کے مقام سے دُور رہنے کی اس لئے تاکید کی۔ کہ گو یہ تو بچ سکتا ہے مگر ممکن ہے۔ کہ اس کی طرف دیکھ کر دُوسرے لوگ بھی اس مقام تک چلے جائیں۔ اور اپنی کمزوری کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جائیں پس ایسے شخص کو لوگوں کے لئے ٹھوکر کا موجب نہ بننا چاہیئے دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو گناہ کے مواقع پیدا ہونے کی صورت میں اس سے بچ ہی نہیں سکتے۔ ان کو اس سے قریب بھی نہ جانے دینے کی حکمت تو ظاہر ہی ہے۔

پس خواہ انسان گناہ کے قریب ہو کر بچ سکتا ہو۔ خواہ نہ بچ سکتا ہو۔ دونوں صورتوں میں اس کو گناہ کے قریب تک بھی نہیں جانا چاہیئے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس مقام کی طرف جانے میں کوئی خاص فائدہ مدنظر ہو اس کی طرف نہ جانا بزدلی کہلا سکتا ہے۔ مگر جس جگہ کی طرف جانا یا نہ جانا کوئی خاص فائدہ نہ رکھتا ہو اس سے الگ رہنا ہرگز بزدلی نہیں کہلا سکتا

سَآءَ سَبِیْلًا ۔ ان الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ علاوہ اخلاقی گناہ ہونے کے زنا میں اور بھی بہت سے نقصانات ہیں۔ جو انسان شادی کرتا ہے وہ ضرور احتیاط کر لیتا ہے کہ ایسی لڑکی سے شادی کرے جس کی صحت اچھی ہو۔ اُسے کوئی متعدی مرض نہ ہو۔ عادات و اخلاق اچھے ہوں۔ اسی طرح لڑکی کے رشتہ دار لڑکے کے متعلق سوچ سمجھ لیتے ہیں۔ مگر زنا میں یہ احتیاط نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ زنا ہوتا ہی شہوانی جذبات کے جوش میں آجانے کی صورت میں ہے۔ اور اس وقت انسان کسی قسم کی احتیاط نہیں کر سکتا جس کا نتیجہ کئی قسم کی امراض یا مالی تباہی کی صورت میں نکلتا ہے پس فرمایا شہوانی تقاضوں کے پورا کرنے کا یہ راستہ نہایت خطرناک ہے۔

یہ امر روزانہ تجربہ میں آرہا ہے کہ گو بیوی سے جو تعلق خاوند پیدا کرتا ہے اسی قسم کا تعلق زانی، زانیہ سے کرتا ہے لیکن باوجود اس کے زنا کے نتیجہ میں جس قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں وہ بیوی کی صورت میں نہیں پیدا ہوتیں یا بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ دنیا میں جس قدر لوگ آتشک یا سوزاک کی مرضوں میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں سے کس قدر بیویوں سے اس مرض کو قبول کرتے ہیں؟ شاید سو میں سے ایک بھی نہیں۔ بقیہ ننانوے فی صدی یا اس سے زیادہ حصہ ان مریضوں کا زنا سے مرض کو حاصل کرتا ہے اور جو مرض میاں یا بیوی کو ایک دوسرے سے لگتی ہے وہ بھی درحقیقت کسی پہلے زنا کے نتیجہ میں ہوتی ہے پس سَآءَ سَبِیْلًا کہہ کر ایک زبردست سچائی کی طرف انسان کو توجہ دلائی ہے جو ہے تو ہر ایک کے سامنے لیکن اس کی طرف توجہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔

ساء سبیلا کے الفاظ میں زنا کے نقصانات کی طرف اشارہ۔

۳۵ حل لغات: سلطان: کے لئے دیکھو ابراہیم ۹۵

وَلَا یُسْرِفْ : اَسْرَفَ سے نہی غائب کا صیغہ ہے اور اسرفَ فی کذا کے معنے ہیں۔ جاوزا لحدَّ فیہ وَاَفْرَطَ حد سے تجاوز کر گیا۔ (اقرب) پس فلا یسرف فی القتل کے معنے ہوں گے کہ وہ قتل کرنے میں مقررہ حد سے آگے نہ بڑھے۔

تفسیر :- اوپر کی دو آیتوں میں قتل کے دونوں مخفی ذرائع بیان کئے تھے۔ اب کھلے قتل کے بارہ میں حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ کسی جان کو جس کے قتل کو خدا تعالےٰ نے حرام کیا ہے قتل نہ کرنا چاہیئے۔ بالحق اس لئے فرمایا کہ نفس ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو سانس لیتی ہو اور اس لئے سب جاندار اس میں

دابّہ سے

شامل ہیں۔ بلکہ آج کل کی سائنس کی تحقیق کے رو سے تو نباتات کے بارہ میں بھی سانس کا لینا ثابت ہے۔ پس نفس کے

بغیر حق کسی کو قتل کرنا منع ہے

ساتھ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ رکھ دیا۔ کیونکہ دوسری چیزوں کا قتل اپنی ذات میں حرام نہیں گو بعض وجوہات سے حرام ہو جاتا ہے مثلاً حرم شریف میں کسی جانور کو قتل نہ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح اگر کوئی جانور کسی دوسرے کی ملکیت میں ہو تو اس کو بھی قتل کرنا حرام ہے۔ اسی طرح ذبح کے طریق کے سوا جو حلال جانوروں کے لئے جائز ہے اور بعض طریقوں سے جانوروں کا قتل بھی ناجائز ہے۔ پس اِلَّا بِالْحَقِّ کہہ کر ایک تو انسان کو اس حکم کے لئے مخصوص کر دیا۔ دوسرے انسانوں میں

سلطان سے مراد

سے ان کو حکم سے باہر نکال دیا جن کا بعض اسباب کے ماتحت مارنا جائز ہو مثلاً قاتل۔ یا جو لوگ دوسرے کو قتل کرنے کے لئے حملہ آور ہوں وغیرہ وغیرہ۔

حق کی شرح

بالحق کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جس وقت اللہ کی طرف سے حق ملے اس وقت قتل جائز ہے۔ گویا نہی بھی اللہ تعالےٰ کی طرف سے تھی اور اجازت بھی اسی کی طرف سے ہونی چاہیئے۔ اس شرط سے مواقع جنگ کو محدود کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح حکومت کے اختیارات جان لینے کے متعلق محدود کر دئے گئے ہیں۔

اس شرط کی وجہ سے اگر کوئی دایہ یہ کہے کہ چونکہ بچہ کی والدہ نے کہا تھا کہ بچہ کو مار ڈال اس لئے میں نے مار ڈالا یا کوئی حاکم کسی کو جبراً مروا دے تو وہ جرم سے بری نہیں سمجھے جائیں گے۔ کیونکہ قتل اسی صورت میں جائز ہے جبکہ اس جان کو پیدا کرنے والے کی طرف سے قتل کرنے کا حق کسی کو عطا ہوا ہو۔

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ۔ اور جو مظلوم قتل کیا جاوے ہم نے اس کے ولی کو غلبہ یا حجت دی ہے۔

ولی ہر وہ شخص ہے جو کسی کی وراثت کا حقدار ہو۔ اور ایسے شخص کو بھی ولی کہتے ہیں کہ جس کو وہ خود مقرر کر دے۔ جیسے کہ مروی ہے کہ جب دشمن حضرت عثمانؓ کے خلاف منصوبے کر رہے تھے حضرت معاویہؓ نے ان سے درخواست کی کہ آپ مجھے اپنا ولی بنا دیں تاکہ ان لوگوں پر رعب ہو اور وہ سمجھیں کہ عثمان کے قتل کا بدلہ لینے والا ایک شخص موجود ہے۔ تو اس کے جواب میں حضرت عثمان نے فرمایا کہ تمہارے متعلق احتمال ہے کہ تم مسلمانوں پر سختی کرو گے میں تم کو ولی نہیں مقرر کرتا۔ اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ ایسا ولی بنانا جائز ہے۔

سُلْطٰن سے مراد غلبہ یا حجت ہے یعنی ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا ہے کہ وہ گورنمنٹ کے پاس شکایت کرے اور اپنا حق لے لیوے اور پھر حاکم کے فیصلہ کر چکنے کے بعد خواہ قاتل کو قتل کرے خواہ معاف کرے۔ لیکن اگر گورنمنٹ سمجھے کہ مقتول کا ولی شرارت سے معافی دے رہا ہے تو پھر اسے بھی حق ہے کہ وہ قتل کی سزا جاری کر دے۔ کیونکہ اپنے حقوق کو جائز طور پر ادا نہ کرنے کی صورت میں یا بوجہ خوف ادا نہ کرا سکنے کی

بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوْا

(کسی اور طور پر) یتیم کے مال کے پاس (تک بھی) نہ پھٹکو یہاں تک کہ وہ اپنی مضبوطی کی عمر کو پہنچ جائے۔ اور (اپنے) عہد کو

صورت میں ولایت حکومت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

تمام قصاص کے مسائل میں یہ حکم جاری ہے اور اس کی ایک عمدہ مثال حضرت علیؓ کے عمل سے ملتی ہے آپ نے ایک دفعہ دیکھا کہ ایک شخص نے دوسرے کو پیٹا ہے حضرت علی نے اس کو روکا اور مضروب کو کہا کہ اب تم اس کو مارو۔ مگر مضروب نے کہا کہ میں اس کو معاف کرتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے سمجھ لیا کہ ڈر کے مارے اُس نے اُسے مارنے سے انکار کیا ہے کیونکہ وہ مارنے والا بڑا جبّار شخص تھا۔ اس لئے آپ نے فرمایا تم نے اپنا ذاتی حق معاف کر دیا ہے مگر میں اب قومی حق کو استعمال کرتا ہوں۔ اور اُسے اسی قدر پٹوا دیا جس قدر کہ اُس نے دوسرے کمزور شخص کو پیٹا تھا۔

یہ جو فرمایا کہ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اس میں قاتل کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ قصاص میں کئی قسم کی زیادتیاں ہوسکتی ہیں (۱) تکلیف سے قتل کیا جاوے مثلاً کسی کو جلاد مقرر کیا جائے اور وہ کند آلہ سے قتل کرے (۲) موقعہ معافی کا ہو مگر وہ زور دے کہ نہیں میں ضرور قتل ہی کروں گا۔ اسی طرح اور کئی طریقے اسراف کے ہوسکتے ہیں۔

لا یسرف کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ گو جان کے بدلہ میں جان کا عام قانون ہے۔ مگر وارثانِ مقتول کو ہمیشہ قتل کے بعد قتل پر عمل نہیں کرنا چاہیئے اور قتل کے فعل کو بڑھانا نہیں چاہیئے یعنی جہانتک ہوسکے تاکہ اگر کسی طرح بھی اسکی اصلاح کی امید کی جاسکتی ہو۔ معاف کر دینا چاہیئے اس حکم سے اسلام نے ملک کے امن کی بنیاد قائم کر دی ہے۔

دنیا کا امن دو غلطیوں میں سے ایک کی وجہ سے برباد ہوتا ہے۔ یا تو جب قاتلوں کو ان کے کئے کی سزا نہیں ملتی یا جب اندھا دھند سزا دی جاتی ہے۔ بعض دفعہ معاف کر دینا ہی آئندہ امن پیدا کرنے کا موجب ہوسکتا ہے۔ مگر موجودہ قانون وارثانِ مقتول کو ایسا کوئی اختیار نہیں دیتا اور ہر قتل کے بدلہ میں قتل ہی کرتا ہے۔ اس سے ملک کا امن برباد ہوتا ہے اور دشمنیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اگر اسلامی تعلیم پر عمل ہوتا تو قتل بہت کم ہو جاتا اور بغض کم ہو جاتے۔

ذاتی حق میں ڈالی حق کے علاوہ قومی حق بھی ہوتا ہے

یہ بھی یاد رہے کہ شرعاً یہ بھی منع ہے کہ کوئی شخص آپ ہی کسی کو مجرم قرار دے کر اُسے سزا دیدے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو یہ بھی اسراف فی القتل سمجھا جائے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ قال یارسول اللہ اِنْ وجدتُ مع امرأتی رجلاً امهله حتی اٰتی باربعة شهداء قال نعم (مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۴۶۵) ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ اگر میں کسی شخص کو اپنی بیوی کے پاس دیکھوں تو اُسے قتل کروں یا انتظار کروں اور چار گواہ لاکر ثبوت بہم پہنچاؤں۔ آپؐ نے فرمایا چار گواہ لاؤ۔ ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ اگر تم خود ہی قتل کروگے تو قتل کے مرتکب سمجھے جاؤ گے۔ اِنَّهٗ كَانَ منصورًا میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ اس کے معنے ہیں کہ مقتول کے ولی کو حکومت کی طرف سے مدد دی جائیگی اس لئے خود ہی فیصلہ اور خود ہی اجراء نہ کرے بلکہ حکومت کے ذریعہ فیصلہ کرائے۔

شرعاً کسی کو آپ ہی مجرم قرار دے دینا منع ہے

قاتل کے حقوق کی حفاظت.

اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا کے الفاظ میں لا یسرف فی القتل کی دلیل بھی بیان کی گئی ہے۔ یعنی وارث کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں امن قائم رکھنے کا فرض اس کے ذمہ بھی ہے۔ پس چاہیئے کہ وہ بھی ظلم نہ کرے اور یاد رکھے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ پس اُسے بھی دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیئے

مقتول کے ورثاء کو معاف کرنے کی تلقین.

بِالۡعَهۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ۝ وَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ

پورا کرو (کیونکہ) ہر عہد کی نسبت یقیناً (ایک نہ ایک دن) باز پُرس ہوگی ۳۶ اور جب تم (کسی کو کچھ) ماپ کر

اور جس حکومت نے اس کے حقوق کی حفاظت کی ہے ظلم کرکے اس کے نظام میں خلل نہیں ڈالنا چاہیئے۔

العہد

۳۶ حل لغات ۔ العہد کیلئے دیکھو رعد ۲۱

تفسیر:- بچے زیادہ طور پر اتفاقی حادثات کے نتیجہ میں یتیم ہوتے ہیں جن میں قتل، وبائیں وغیرہ شامل ہیں۔ پس قتل کے حکم کے بعد جس سے دو گھروں میں بچے یتیم رہ جائینگے مقتول کے گھر میں بھی اور قاتل کے گھر میں بھی۔ جب وہ قتل کی سزا میں قتل کیا جائے گا۔ یتامیٰ کے حقوق کو بیان گیا۔

یتیم کی حد جوانی سے مراد

یتامیٰ کے مال کی حفاظت کا طریق۔

اس بارہ میں فرماتا ہے کہ یتامیٰ کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ اِلَّا بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ یعنی صرف ایک طریق ایک کے مال پر تصرّف کرنے کا ہے کہ اس سے بہتر سے بہتر نتیجہ پیدا کیا جائے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ ان کے مال کو ناجائز طور پر استعمال نہ کرو بلکہ ان کو اس طرح استعمال کرو کہ وہ مال بڑھیں اور یتیموں کا فائدہ ہو اس آیت میں اسلامی نظام کا ایک اور ایسا حکم بیان کیا گیا ہے جس میں اسلام دوسرے مذاہب سے ممتاز اور منفرد ہے یتیموں سے حسنِ سلوک کا حکم تو سب مذاہب میں ملتا ہے۔ لیکن یہ حکم کہ ان کے اموال کی حفاظت کرو اور انکو بڑھانے کی کوشش کرو کسی اور مذہب میں نہیں ملتا۔ گویا اس آیت میں ایک عام کورٹ آف وارڈز مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی نابالغوں کی جائداد کی حفاظت کرنے والا محکمہ۔ آج کل مغربی حکومتوں کے ماتحت اس حکم پر عمل ہو رہا ہے۔ مگر اس خیال کی بنیاد اسلام نے آج سے تیرہ سو سال پہلے قائم کی ہے۔

حتّٰی یبلغ اشدہ سے یہ مراد نہیں کہ جب وہ جوان ہو جائیں تو ان کے اموال کھانے جائز ہیں۔ کیونکہ اول تو یتیم جب بڑا ہو جائے گا تو وُہ اپنا مال کھانے ہی کیوں دے گا۔ دوسرے یہ خلاف عقل ہے کہ جب تک یتیم اپنے مال کو استعمال نہ کرسکتا تھا۔ اس وقت تک تو اس کے مال کو بڑھایا جائے اور جب اس کے استعمال کرنے کا موقع آئے تو اس کو کھانا شروع کر دیا جائے۔ اسلام کسی کا مال کھانے کی اجازت نہیں دیتا خواہ وہ یتیم ہو یا غیر یتیم۔ پس اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ جب تک وہ عقل کی اس حد کو نہ پہنچ جائے کہ وہ خود اپنے مال کو سنبھال سکے اس وقت تک حفاظت کرنی چاہیئے اور درمیان میں ہی اس کی حفاظت نہ چھوڑ دینی چاہیئے۔ مثلاً جب دس بارہ سال کا ہوگیا تو کہہ دیا کہ اب بڑا ہو گیا ہے خود مال سنبھال لیگا۔ غرض جوانی تک پہنچنے کی قید اس لئے نہیں کہ اس کے بعد بے شک اس کا مال کھاؤ۔ بلکہ یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ پوری جوانی سے پہلے جبکہ وہ مال کی حفاظت کے قابل ہو جائے۔ رشتہ داروں یا حکومت کو اس کی امداد چھوڑ نہ دینی چاہیئے۔ دوسرے ان الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب وہ اپنی بلوغت کو پہنچ جاوے اور اپنی اس عقل کو پہونچ جاوے کہ جس میں وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکتا ہو تو اس وقت اس کے مال کو یہ کہہ کر کہ ابھی چھوٹا ہے دبا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ غرض حتّٰی یبلغ اشدہٗ نے دونوں صورتوں سے جو یتیم کو نقصان پہنچانے والی ہیں اس کے رشتہ داروں اور حکومت کو روک دیا ہے ایسے بہت سے نظارے دنیا میں ملتے ہیں کہ رشتہ دار ایک مدت تک یتامیٰ کا کام کرنے کے بعد تھک کر کام چھوڑ بیٹھتے ہیں اور یتامیٰ کا نقصان ہو جاتا ہے یا وہ جوان ہو جاتے ہیں لیکن ان کا حق ان کو نہیں دیا جاتا۔ ریاستوں

إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۚ ذَٰلِكَ

دینے لگو تو ماپ پورا دیا کرو اور (جب تول کر دو تو) سیدھے ترازو کے ساتھ تول کر دو یہ بات سب سے

خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ

بہتر اور انجام کے لحاظ سے سب سے اچھی ہے ۳۷؎ اور (اے مخاطب) جس بات کا تجھے علم نہ ہو اس کی

میں ایسے نظارے بہت دیکھنے میں آتے ہیں کہ زمیں جوان ہو جاتا ہے مگر جو افسر ریاست کے انتظام کے لئے مقرر ہوتے ہیں اپنے ذاتی اغراض کو پورا کرنے کے لئے انہیں نابالغ یا غیر عاقل ہی قرار دیتے جاتے ہیں۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ۔ اپنے عہد کو پورا کرو۔ بظاہر تو یہ فقرہ یتامیٰ کے ذکر میں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یتیم کا عہد سے کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں کیونکہ (۱) عہد کے معنے ذمہ داری کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ فلانٌ ولی العہد یعنی حکومت کی ذمہ داری کا ولی۔ ان معنوں کے رُو سے اس جملہ کے معنی ہونگے۔ کہ یتامیٰ کے متعلق اپنی ذمہ داری کو پورا کرو۔ جب ان کے مال کے انتظام کی ضرورت ہے۔ انتظام کرو۔ اور جب ان کا مال انکے سپرد کرنے کا وقت آئے تو ان کا مال انہیں دے دو دوسرے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یتامیٰ کے اموال کی حفاظت کوئی احسان نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کا حکم اور اسلامی نظام کا ایک حصہ ہے اس لئے احسان سمجھ کر اس کام کو نہ کرو بلکہ فرض سمجھ کر کرو۔ (۲) چونکہ یتیم اپنے مال کی کمی بیشی کے متعلق کچھ دریافت نہیں کرسکتا اس لئے خدا تعالےٰ نے یتیم کے مال کو اپنے عہد میں شامل کرلیا ہے تاکہ کوئی یہ سمجھ کر مال کو کھا نہ جاوے کہ اگر ہم کھا جائیں گے تو کون پوچھے گا۔ اس لئے فرمایا کہ اگر کوئی ایسا کرے گا تو ہم پوچھیں گے یہ ہمارا عہد ہے۔

(۳) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یتیم کا ذکر کر کے ان لوگوں کا ذکر بھی ساتھ کر دیا جو یتامیٰ تو نہیں ہوتے مگر یتامیٰ سے مشابہ ہوتے ہیں۔ مثلاً کمزور اقوام جو اپنے آپ کو طاقتور اقوام کی حفاظت میں دے دیتی ہیں۔ پس یتامیٰ کے ذکر کے ساتھ ان کے حقوق کی طرف بھی توجہ دلائی کہ بعض اقوام بمنزلہ یتامیٰ ہوتی ہیں اور ان کے حقوق تمہارے قبضہ میں آجاتے ہیں۔ بے شک تمہارا فرض ہے کہ اس وقت تم ان کے حقوق کی نگہداشت کرو لیکن ہمیشہ کے لئے ان پر تصرف قائم نہ رکھو بلکہ جب ان میں اہلیت پیدا ہو جائے انہیں اُن کے مال سپرد کر دو۔ اگر دنیا اس حکم پر عمل کرے تو یہ قومی منافرت جو آج پیدا ہو رہا ہے یکدم دور ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض وقت ایک زبردست قوم کمزور قوم کے حقوق کی حفاظت کے لئے اس کی نگرانی کا کام اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہو جاتی ہے مگر اس کا فرض ہونا چاہیئے کہ اس ماتحت قوم کے اندر صلاحیت پیدا ہو جانے پر جلد سے جلد اُسے اپنے اموال میں تصرف دیدے اور اس کی بلوغت قومی کے بعد اس کے ملک اور مال پر قبضہ نہ رکھے۔

اوفوا بالعہد کا یتامیٰ کے ذکر سے تعلق

۳۷؎ حل لغات۔ الکیل کیلئے دیکھو یوسف ۶۰؎

الکیل

قِسْطَاس : کے معنے ہیں۔ المیزان۔ ترازو۔ واقوم الموازین وقیل ھو میزان العدل۔ سیدھا اور درست ترازو (اقرب)

قسطاس

تفسیر:۔ چونکہ پچھلی آیت میں حقوق کی واپسی کا حکم دیا تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ ملتا ہُوا حکم اس کے بعد بیان کر دیا اور فرمایا کہ جس طرح یتیم کو اس کا مال ادا کرنے کا حکم ہے اسی طرح آپس کے کاروبار میں ایک دوسرے کا حق پورا ادا کرنے کا بھی ہم حکم دیتے ہیں۔

بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ

اتباع نہ کیا کر۔ (دیکھو) کان اور آنکھ اور دل ان سب کے

كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ

متعلق پوچھا جائے گا ۳۸ اور زمین پر اکڑ کر مت چل۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ عمل دینی لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے اور دُنیوی انجام کے لحاظ سے بھی۔ کیونکہ جس تاجر کے متعلق لوگوں کو علم ہو جائے کہ وہ کم تولتا ہے یا جس قوم کے متعلق یہ یقین ہو جائے کہ اس کا لین دین اچھا نہیں اس کی تجارت کو آخر نقصان پہنچ جاتا ہے۔

(حاشیہ: بدظنی کے موجبات)

۳۸ حل لغات۔ لَا تَقْفُ: قفا سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور قفاہ اثرہٗ (یقفو) کے معنے ہیں۔ تبعہٗ۔ اس کی پیروی کی۔ قفا فلانًا بامرٍ اثرہ بہ کسی چیز کے متعلق اُسے ترجیح دی (اقرب) پس لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کے معنے ہوں گے اے مخاطب تو اس کی پیروی نہ کر جس کا تجھے علم نہیں۔

(حاشیہ: لا تقف)

تفسیر:۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ کوئی نیا علم نہ سیکھو اور نئی نئی تحقیقاتیں نہ کرو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بدظنی نہ کرو اور بغیر تحقیق کے دوسروں پر الزام نہ لگاؤ۔ چنانچہ اس کے آگے وہ اسباب جن سے بدظنی پیدا ہوتی ہے بیان کئے ہیں۔ یعنی کان آنکھ اور دل۔ بعض دفعہ انسان دوسرے کے متعلق بات سُن کر اس بات کو پلّے باندھ لیتا ہے اور بغیر تحقیق دشمنی شروع کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ ایک واقعہ دیکھتا ہے اور اس سے غلط نتیجہ نکال لیتا ہے اور یہ تحقیق نہیں کرتا کہ ممکن ہے کہ اس فعل کی کوئی جائز وجہ ہو جسے دیکھ کر اس نے بُرا سمجھ لیا۔ اور بعض آپ ہی آپ اپنے دل میں ایک بات پیدا کر لیتے ہیں۔ ان سب باتوں سے روکا اور فرمایا کہ ظنی باتوں کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیئے۔

(حاشیہ: بدظنی کی تشریح)

بدظنی کے موجبات میں کان سب سے بڑا موجب ہے۔ زیادہ تر لوگوں سے باتیں سُن کر لوگ بدظنی کرتے ہیں۔ اس لئے اس کا ذکر پہلے کیا۔ اس کے بعد دوسرا بڑا ذریعہ آنکھ ہے اسے دوسرے نمبر پر بیان کیا۔ اس کے بعد انتہاء کی بدظنی کرنے والا شخص وہ ہوتا ہے کہ نہ شکایت سنتا ہے نہ کوئی مشتبہ بات دیکھتا ہے بلکہ آپ ہی آپ دل میں ایک وجہ بنا کر دوسروں کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ اس کو سب سے آخر میں رکھا کہ یہ موجب سب سے کم ہے۔ کیونکہ خطرناک مریض عام مریضوں سے ہمیشہ کم ہوتے ہیں۔

اِنَّ السَّمْعَ الخ ۔ اس جملہ سے یہ بھی اشارہ کیا کیا گیا ہے کہ یہ مت خیال کرو کہ صرف مال و جان کے معاملہ میں ظلم میں گرفت ہوگی۔ بلکہ انسانی عزّت پر حملہ کے متعلق بھی پرسش کی جائے گی۔ اگر کوئی کان دوسرے کی نسبت وہ بات سنے گا جس کے سننے کا اس کو حق نہ تھا تو اس پر بھی پرسش ہوگی۔ اگر آنکھ اس بات کو دیکھنے کی کوشش کرے گی جس کے دیکھنے کا اس کو حق نہیں تو اس کے بارہ میں بھی پرسش ہوگی۔ اگر کوئی دل ایسے خیالات رکھے گا جن کے رکھنے کا اُسے حق نہیں تو اس کے متعلق بھی پرسش ہوگی۔ یہ ایسی اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی کی تعلیم ہے کہ اس پر عمل کر کے کسی قسم کا گند انسان میں باقی نہیں رہ سکتا۔

اس تعلیم میں اخلاق کے متعلق نہایت اعلیٰ تعلیم

اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝

تو نہ (تو) زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پا سکتا ہے ۳۹

دی گئی ہے انسان کو اپنے فیصلوں کی بنیاد ظن پر نہیں رکھنی چاہیئے بلکہ علم پر رکھنی چاہیئے۔ محض کان کی شہادت یا آنکھ کی شہادت یا دل کی شہادت کافی نہیں۔ بلکہ تمام ذرائع سے تحقیق کرکے پھر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رح کا ایک مشہور قول ہے کہ "اگر کسی میں ننانوے وجوہ کفر کے ہوں اور ایک وجہ ایمان کی تو اس کو کافر مت کہو۔" اس پرحکمت ارشاد کا یہی مطلب ہے کہ اگر ننانوے دلائل اس کے کفر کے ہوں اور ایک دلیل ایمان کی ہو تو بھی اُسے کافر نہ کہو۔ یہ مطلب ہرگز نہیں جیسا کہ بعض احمق خیال کرتے ہیں کہ ننانوے شرعی وجوہ کفر کے ہوں تب بھی اُسے کافر نہ کہو۔ کفر کے اسباب تو یہی سات آٹھ۔ اللہ کا انکار۔ ملائکہ کا انکار۔ کتب سماویہ کا انکار۔ انبیاء کا انکار۔ دعا کا انکار۔ قضا و قدر کا انکار اور حشر بعد الموت کا انکار۔ پس اگر اس کے یہ معنے لئے جائیں کہ ننانوے اسباب کفر کے ہوں پھر بھی کافر نہ کہو تو کسی دہریہ کو بھی کافر نہیں کہا جا سکتا۔

۳۹ حل لغات۔ مَرَحًا: مَرِحَ الرَّجُلُ (یمرح) مَرَحًا کے معنے ہیں۔ اشتدّ فرحہٗ ونشاطہ حتّٰی جاوز القدر وتبختر۔ حد درجہ کا خوش ہو کر متکبرانہ چال چلا۔ واختال۔ اکڑ کر چلا (اقرب) پس لا تمش فی الارض مَرَحًا کے معنے ہوں گے زمین پر اکڑ کر نہ چل۔

لَنْ تَخْرِقَ: خرق سے مضارع واحد مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور خرق الثوبَ کے معنے ہیں مزّقہٗ فتمزّق۔ کپڑے کو پھاڑا تو وہ پھٹ گیا۔ خرق المفازۃ۔ قطعھا حتّٰی بلغ اقصاھا۔ جنگل کو طے کیا اور اس کے آخر تک پہنچا (اقرب) پس لن تخرق الارض کے معنے ہوں گے۔ تو زمین کے سفر کو طے کرکے اس کے باہر نہیں نکل سکتا۔

کسی فیصلہ کی بنیاد سوء ظن پر نہ ہو۔

تفسیر:۔ پہلے اس وقت تک تو ان اخلاق کا ذکر فرمایا گیا تھا جن کا تعلق خدا تعالیٰ سے یا دوسرے انسانوں سے ہے۔ اب ان اخلاق کے متعلق ارشاد فرماتا ہے جو اس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ اگر تمہارے اندر کوئی خوبی کی بات ہو تو اس کو تکبر کا ذریعہ نہ بناؤ کیونکہ اس طرح تم نیکیوں سے محروم ہو جاؤ گے اور آئندہ ترقی کی طرف قدم نہ اٹھا سکو گے۔ کیونکہ جو متکبر ہو جاتا ہے وہ یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ میں نے انتہائی عروج پا لیا ہے اور اس طرح وہ مزید ترقی سے محروم ہو جاتا ہے۔

دوسرے اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اے انسان تیری کامیابی آخر انسانی کامیابی ہے اس لئے اتنی ہی خوشی کر جو انسانوں کے لئے مقدر ہے اور یہ یاد رکھ کر تو اپنے کمالات کے باوجود زمین کو نہیں پھاڑ سکتا یعنی اس کے باہر نہیں جا سکتا۔

مرحًا

عربی محاورہ ہے خرق المفازۃ۔ جنگل کو طے کرکے نکل گیا۔ یہی معنے اس جگہ لگتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ آخر تو نے اسی دنیا میں رہنا ہے تیری ترقیاں محدود ہیں پس اپنے آپ کو ایسا نہ بنا کہ دوسرے انسانوں سے تیرا گذارہ مشکل ہو جائے۔ جن لوگوں کو متکبر لوگوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ متکبر آدمی کی زندگی سخت تلخ گذرتی ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ اپنے آپ کو کوئی عجیب چیز سمجھنے لگتا ہے دوسری طرف اُسے اپنے ابناء وطن کے ساتھ مل کر رہنا پڑتا ہے۔ پس عجیب متضاد جذبات میں اس کی زندگی بسر ہوتی ہے۔

تخرق

متکبر انسان کا مرتبہ زندگی

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝

ان میں سے ہر ایک (فعل) کی بُری صورت تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے ۴۰

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا

یہ (تعلیم) اس (علم اور) حکمت میں سے (ایک حصہ) ہے جو تیرے رب نے وحی کے ذریعہ سے تیری طرف بھیجی ہے - اور

آج کل کا انگریزی خوان طبقہ جو اپنے آپ کو دوسرے ہندوستانیوں سے اعلیٰ سمجھتا ہے اور یورپین اُن کو منہ نہیں لگاتے اسی عذاب میں مبتلا ہے - جو اُس کے ہیں وہ ان میں رہنا پسند نہیں کرتا اور جن میں وہ رہنا چاہتا ہے وہ اسے حقیر سمجھتے ہیں - پس فرمایا کہ آخر اپنے لوگوں میں تو نے رہنا ہے پس دل کی ایسی کیفیت نہ بنا کہ تیری زندگی تجھ پر وبال ہو جائے۔

لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا — جبل کے معنے پہاڑ بھی ہوتے ہیں اور سیدالقوم اور عالِم قوم کے بھی - یعنی قوم کا سردار اور قوم کا عالم - اس جگہ جبال سے مراد دوسرے معنے ہیں یعنی سرداران قوم اور علماء قوم - اور یہ جو فرمایا کہ تو سردارانِ قوم اور علماء قوم کے برابر نہیں ہو سکتا اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قوم میں بڑائی خدمت سے ملتی ہے یا علم سے اور یہ دونوں قسم کے لوگ انکسار کا نمونہ ہوتے ہیں جیسے کہ عرب کا محاورہ ہے سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ یعنی قوم کا سردار درحقیقت قوم کا خادم ہوتا ہے - اسی طرح فرماتا ہے اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر) اللہ تعالےٰ سے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں یعنی جس قدر انسان علم میں ترقی کرتا جاتا ہے اس کی خشیت بڑھتی جاتی ہے - پس اس جملہ سے یہ بتایا ہے کہ تکبر کر کے تو قوم کا سردار نہیں بن سکتا نہ قوم کے علماء میں شامل ہو سکتا ہے کیونکہ تکبر تو تجھ کو اپنی قوم سے دُور کر دیتا ہے اور اسی طرح خدا سے بھی دُور کر دیتا ہے پس اگر تو بڑائی کا ہی طالب ہے تو بھی تو تکبر سے اپنا نقصان کرتا ہے کیونکہ اس فعل سے تُو اپنے آپ کو اسی چیز سے محروم کرتا ہے جس چیز کی تیرے دل میں خواہش ہے - پس تکبر نہ کر اگر تیرے اندر کوئی دنیوی خوبی ہے تو اس کی مدد سے قوم کو فائدہ پہنچا تاکہ تو قوم کا سردار بن جائے اور اگر کوئی دینی خوبی ہے تو اس کے ذریعہ سے قوم کو فائدہ پہنچا تاکہ تو خدا تعالےٰ کی نظر میں پسندیدہ ہو جائے۔

کس لطیف پیرایہ میں یہاں تکبر کو رد کیا گیا ہے! اس کی نظیر بھی دنیا کی کوئی کتاب پیش نہیں کر سکتی۔

جبال سے مراد قوم کے سردار اور عالم

السَّیِّئُ

ہر حکم کی تعمیل میں اعتدال کو مدنظر رکھنے کی تلقین -

۴۰ حل لغات - السَّیِّئُ کے معنے ہیں القَبِیْحُ - بُری صورت (اقرب)

تفسیر :- اس چھوٹے سے فقرہ میں گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے - فرماتا ہے جس قدر احکام اوپر بیان ہوئے ہیں ان کے بُرے پہلو بھی ہیں اور اچھے بھی - جو بُرے پہلو ہیں ان کو اللہ تعالےٰ ناپسند کرتا ہے اچھوں کو نہیں یعنی کوئی فعل بھی دنیا کا ایسا نہیں جسے ہر حال میں بُرا کہا جا سکے - توحید اچھی بات ہے لیکن اگر انسان توحید کو فساد کا موجب بنا لے اور دوسری اقوام کے معبودوں پر آوازے کسے تو یہی توحید بُری ہو جائے گی ماں باپ کا ادب اچھا فعل ہے لیکن ان کے کہنے پر شرک یا ظلم کرنے لگ جائے تو یہ بُرا ہو جائے گا قتل بُرا فعل ہے لیکن دفاع قوم سے یا ضروری قصاص سے جی چرائے تو یہ بُرا ہو گا - یتیموں کے مال کو ہاتھ نہ لگانا اچھا ہے لیکن اگر گناہ کے ڈر سے ان کے مال کی حفاظت چھوڑ دے

تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِیْ جَهَنَّمَ

تو اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ کوئی اور معبود مت بنا ورنہ تو ملامت کا نشانہ بن کر (اور) دھتکارا جاکر۔

مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِیْنَ

دوزخ میں ڈال دیا جائے گا ؁ کیا تمہارے رب نے تم کو لڑکوں (کی نعمت) سے مخصوص کر دیا

وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ

اور (خود) اس نے بعض فرشتوں کو (اپنی) لڑکیاں بنایا ہے۔ تم یقیناً (یہ) بڑی (خطرناک) بات

تو یہ بھی بُرا ہوگا۔ سودے میں دیانت اچھی چیز ہے مگر بددیانتی سے ڈر کر کسب حلال بھی چھوڑ دے تو بُرا ہوگا۔ شہوانی قوتوں کو ان کے دائرہ میں رکھنا اچھا ہے لیکن ان کو بالکل نظر انداز کر دینا اور رہبانیت اختیار کر لینا یا ان کو ناجائز طور پر استعمال کرنا بُرا فعل ہوگا۔ بدظنی نہ کرنا اچھا فعل ہے لیکن ایک پہرہ دار حُسن ظنی سے کام لیتے ہوئے دوسروں کو اپنی حفاظت کی اشیاء کے پاس جانے دے تو یہ بُرا ہوگا۔ تکبر نہ کرنا اچھا فعل ہے لیکن بہادری اور جرأت دکھلانے کے موقع پر انکسار دکھائے تو یہ بھی بُرا ہوگا۔ پس فرمایا کہ احکام کی حکمتوں کو سمجھو اور موقع اور محل پر ہر قوت کو استعمال کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی قوتوں کے استعمال سے نہیں روکتا بلکہ ان کے غلط استعمال سے روکتا ہے۔ انسانی اعمال کی یہ تشریح ایسی کامل ہے کہ اس کو نہ سمجھنے سے ہی سب خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر کتنے لوگ ہیں جو اس میانہ روی پر کاربند ہیں۔

۴۱ تفسیر:۔ سبحان اللہ! کیا عجیب ترتیب ہے۔ پہلے سورۂ نحل میں فرمایا تھا کہ حکمت آنے والی ہے اب اس میں بتایا کہ ان حکمت کی باتوں میں سے چند ایک ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ اب لاؤ ان کتابوں کو جو اس قرآن کریم سے پہلے تھیں اور دکھاؤ کہ ان میں ایسی تعلیم کہاں ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چند ایک امور ایسے بیان فرمائے ہیں کہ جن کو لے کر ہم اہل کتاب سے مباحثہ کر کے ان کو شکست دے سکتے ہیں۔

ؒ دیانتداری کے غلط مفہوم سے بچنے کی تلقین

پہلے رکوع میں فرمایا تھا وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ۔ اس کے بعد توحید کے عملی پہلو کو پہلے بیان کیا اور بتایا کہ اسلام کی توحید نے دنیا کو عملی طور پر کیا فائدہ پہنچایا ہے۔ اب توحید کا دوسرا پہلو بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ صرف دوسرے معبود کی عبادت سے انسان مشرک نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی شخص اپنے ذہن میں بھی کسی کو خدا کا شریک خیال کرتا ہو تو وہ بھی مشرک ہے۔

تُلْقٰى فِیْ جَهَنَّمَ ۔۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں کہ آخرت کو جہنم میں ڈالا جائے گا بلکہ شرک کرنا خود ایک جہنم ہے کیونکہ جب کئی ایک کو معبود بنائے گا تو کس کس کو خوش رکھیگا اور کس کو ناراض کرے گا۔

ؒ موحد کے سامنے مشرک ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے

دوسرے اسطرح بھی یہ جہنم ہو جاتا ہے کہ شرک کی کوئی دلیل نہیں ہوتی اور مشرک ہمیشہ موحدوں کے سامنے ذلیل ہوتا ہے۔ آج عیسائیوں کو ہی دیکھ لو کہ ان کیلئے تثلیث کا مسئلہ کس طرح ایک جہنم بن رہا ہے۔ کسی سے پوچھ کر دیکھ لو خواہ کتنا بڑا پادری ہو وہ اسکی کوئی دلیل نہ دے سکیگا۔ صرف اور صرف توحید ہی ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کو مان کر انسان آرام میں آجاتا ہے اور اسی سے ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے۔

مَلُوْمًا میں بتایا کہ مشرک کے سر پر ہمیشہ ملامت ہی رہتی ہے۔ ایک معبود کو مانا تو دوسرے کی ملامت سر پر آگئی۔ اسکو مانا تو

ع۵ قَوۡلًا عَظِیۡمًا ۝ وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ

کہتے ہو ۵۴۲ اور ہم نے اس قرآن میں (ہر ایک بات کو) اس لئے بار بار بیان کیا ہے

تیسرے کی ملامت کا ہار گلے میں۔ پھر مدحورًا کہکر بتایا کہ ادھر تو ہر وقت کے دکھ میں مبتلا ہوتا ہے ادھر تو علم و راحت کے سرچشمہ یعنی خدا تعالیٰ سے بھی دور پھینکا جاتا ہے گویا نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کی سی حالت اس کی ہو جاتی ہے۔

افاصفکم

۵۴۲ حل لغات۔ اَفَاَصۡفٰکُمۡ: اصفا فلانًا بکذا کے معنے ہیں اٰثرہٗ بہ و اختصّہٗ کسی چیز کے متعلق اُسے ترجیح دی۔ اور اسکو اس کیلئے خاص کیا (اقرب) پس اَفَاَصۡفٰکُمۡ بِالۡبَنِیۡنَ کے معنے ہونگے کہ کیا تمکو خدا تعالےٰ نے بیٹوں کے ساتھ مخصوص کیا۔

تفسیر:۔ اس آیت میں اس ذہنی کش مکش اور شرمندگی کی ایک مثال بیان کی گئی ہے فرماتا ہے کہ مشرکوں کے عقیدوں کو دیکھو کیسے عجیب ہیں۔ مثلاً یہ کہ بعض خدا تعالےٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں اور اپنے لئے لڑکے۔ پھر ان ہی لڑکیوں کی پوجا کرتے ہیں جن کو وہ ذلیل قرار دیتے ہیں گویا خدا تعالےٰ کو چھوڑ کر انہیں وجودوں کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ جن کو ان کے دل ذلیل سمجھتے ہیں۔

قَوۡلًا عَظِیۡمًا سے مراد بیوقوفی کی بات ہے۔ عظیم بُری چیز کیلئے آئے تو اس کے معنے بُرائی میں زیادتی کے ہوتے ہیں اور اچھے معنوں میں آئے تو اچھی بات میں بڑائی مراد ہوتی ہے۔ اس جگہ اس لفظ سے یہ بتایا ہے کہ مشرک کی عقل بھی ماری جاتی ہے وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو کوئی سمجھدار آدمی نہیں کرسکتا۔

مشرک کی ذہنیت کو ظاہر کرنے والا مہاراجہ کا واقعہ

اس موقعہ پر ایک لطیف واقعہ مجھے یاد آگیا وہ مشرک کی ذہنیت کو خوب منکشف کرتا ہے۔ جموں کے ایک سابق مہاراجہ صاحب کے پاس استاذی المکرم حضرت مولوی نور الدین صاحب (اللہ تعالیٰ انکے مدارج بلند کرے قرآن انہوں نے ہی مجھے پڑھایا تھا اللہ تعالےٰ نے اب مجھے بہت علم بخشا ہے بلکہ وہ خود فرماتے تھے کہ میں نے تم کو ایسے ایسے معارف قرآن کے سنے ہیں جو نہ مجھے معلوم تھے اور نہ پہلی کتب میں درج ہیں۔ لیکن اس کتاب کی چاٹ انہوں نے ہی مجھے لگائی اور اس کی تفسیر کے متعلق صحیح راستہ پر ڈالا اور وہ بنیاد ڈالی جس پر میں عمارت تعمیر کرسکا۔ اس لئے دل ہمیشہ ان کیلئے دعاگو رہتا ہے) بطور طبیب ملازم تھے اور شاہی طبیب کے عہدہ پر فائز تھے بعد میں مہاراجہ صاحب کے فوت ہونے پر ان کے بیٹے مہاراجہ پرتاپ سنگھ صاحب نے انکو جموں سے اس الزام پر نکال دیا کہ موجودہ مہاراجہ صاحب کے والد اور چچا راجہ امر سنگھ صاحب اور راجہ رام سنگھ صاحب سے ان کے گہرے تعلقات ہیں ایسا نہ ہو کہ انکی خاطر مجھے زہر دے دیں۔ اس کے بعد وہ قادیان ہجرت کرکے آگئے اور آخر اپنے تقویٰ اور علم کیوجہ سے جماعت احمدیہ کے پہلے خلیفہ ہوئے۔ دوران ملازمت کا وہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دن مہاراجہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ مولوی صاحب آپ بھی کوئی بُت اپنے گھر رکھتے ہیں کہ نہیں فرماتے تھے میں نے کہا مہاراجہ صاحب نہیں ہم بُت نہیں رکھتے ہمارے مذہب میں یہ منع ہے۔ اس پر کچھ حیران سے ہوکر کہنے لگے کہ ایک نصیحت آپکو کرتا ہوں کہ کالی دیوی کا بُت ضرور رکھ لیں یہ بڑی سخت دیوی ہے اور بڑا نقصان پہنچادیتی ہے۔ فرماتے تھے میں نے کہا۔ مہاراجہ صاحب ہم تو کالی کو بھی نہیں رکھ سکتے اس پر وہ کہنے لگے کہ پھر آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ میں نے کہا نہیں مہاراج کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ یہ سُن کر وہ کچھ تردد میں پڑگئے۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد بولے مولوی صاحب میں سمجھ گیا آپ کو میں جموں کی ریاست میں سزا دینی چاہوں تو دے سکتا ہوں لیکن آپ سیالکوٹ چلے جائیں تو پھر کچھ نہیں کرسکتا۔ یہی معاملہ یہاں ہے۔ ہم تو کالی دیوی کو مان کر اس کے اختیار میں آگئے ہیں وہ ہمیں سزا دے لیتی ہے لیکن آپ لوگ سرے سے انکار کرکے اس کی حکومت سے نکل گئے ہیں اس لئے وہ آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ فرماتے تھے میں نے اس پر کہا مہاراج آپ خوب سمجھے ہم ایک خداوند کو مان کر ان بُتوں کے قبضے سے نکل چکے ہیں۔ اس پر مہاراجہ صاحب تو اپنی جگہ خوش کہ میں نے صحیح بات دریافت کرلی اور میں اپنی جگہ خوش کہ توحید نے ہم کو کیسی کیسی لغویات سے بچالیا ہے ؛

لِيَذَّكَّرُوْا ۖ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ

کہ وہ (اس سے) نصیحت حاصل کریں اور (باوجود اس کے) وہ انہیں (مجنّب و) نفرت ہی میں بڑھا رہا ہے ۳۲۵ تو کہہ کہ اگر

۳۲۴ **حل لغات**۔ صَرَّفْنَا: صَرَّفَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے جو صَرَفَ سے مزید ثلاثی ہے اور صَرَفَهٗ (صَرْفًا) کے معنے ہیں رَدَّهٗ عَنْ وَجْهِهٖ اس کے ارادہ سے اسے پھیرا۔ اور صَرَّفَ الْكَلَامَ کے معنے ہیں اِشْتَقَّ بَعْضَهٗ مِنْ بَعْضٍ کلام کے ایک حصہ کو دوسرے سے مشتق کیا۔ صَرَّفَ اللّٰهُ الرِّيَاحَ۔ حَوَّلَهَا مِنْ وَجْهٍ اِلٰى وَجْهٍ۔ اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کا رُخ ادھر سے ادھر پھیرایا۔ صَرَّفَ فُلَانًا فِي الْاَمْرِ۔ قَلَّبَهٗ فِيْهِ وَ فَوَّضَهٗ اِلَيْهِ کسی کام میں کسی کو لگایا اور وہ کام اس کے سپرد کیا۔ (اقرب)۔ پس وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ کے معنے ہوں گے۔ ہم نے قرآن مجید میں ہر بات کو بار بار بیان کیا ہے۔

نُفُوْرًا: نُفُوْر۔ نَفَرَ کا مصدر ہے۔ اور نفرت (تَنْفِرُ) الدَّابَّةُ كَذَا۔ کے معنے ہیں جَزَعَتْ و تَبَاعَدَتْ۔ جانور ڈر کر دُور بھاگا نَفَرَ الْقَوْمُ نَفَرًا۔ تَفَرَّقُوْا۔ لوگ پراگندہ ہوگئے نَفَرَ الْقَوْمُ عَنْ كَذَا۔ اَعْرَضُوْا وَصَدُّوْا لوگوں نے کسی بات سے اعراض کیا اور اس سے رُکے۔ نَفَرَ الْقَوْمُ مِنْ كَذَا۔ انفوا وكَرِهُوْهُ لوگوں نے اس سے ناک چڑھایا اور اس کو ناپسند کیا۔ (اقرب) پس نُفُوْر کے معنے ہوں گے دور ہونا۔ پراگندہ ہونا۔ اعراض کرنا۔ ناپسند کرنا۔

تفسیر۔ نُفُوْرًا کے معنے اوپر بتلائے جاچکے ہیں کہ دُور ہونے، پراگندہ ہونے، ناپسند کرنے، اعراض کرنے کے ہوتے ہیں۔ ان معنوں کے لحاظ سے وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا کے یہ معنے ہوئے کہ نہیں زیادہ کرتا انکو مگر دور ہونے میں۔ پراگندہ ہونے میں۔ ناپسند کرنے میں یا اعراض کرنے میں۔ یعنی ہم نے قرآن کریم میں قسم قسم کے دلائل بیان کئے ہیں مگر لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے نفرت ہی کرتے ہیں۔ اس سے اعراض ہی کرتے ہیں۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں تکرار ہے۔ مگر دیکھو قرآن کریم نے خود ہی اس کا جواب دیا ہے فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ ہم نے اس قرآن میں ہر پہلو سے مسائل کی بحث کی ہے تاکہ کسی پہلو سے ہی لوگ سمجھیں تب بھی لوگ اعراض کرتے ہیں۔ صَرَّفَ کے معنے کسی چیز کو اچھی طرح رد کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور ادھر سے ادھر پھرانے کے بھی۔ چنانچہ عربی کا محاورہ ہے صَرَّفَ اللّٰهُ الرِّيَاحَ جسکے معنے ہیں حَوَّلَهَا مِنْ وَجْهٍ اِلٰى وَجْهٍ یعنی ہواؤں کا رُخ اِدھر سے اُدھر پھرا دیا۔ ان دونوں معنوں کو ملحوظ رکھ کر آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ خوب اچھی طرح تمام اعتراضات کو دور کرتا ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ ہر مضمون کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتا ہے۔ یہ دونوں باتیں قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ تمام اعتراضات جو قرآن پر وارد ہوتے ہیں ان کو اس میں خوب اچھی طرح رد کیا گیا ہے۔ اور تمام ضروری امور کو مختلف پہلوؤں سے کھولا گیا ہے۔ پس جس کلام نے ہر مسئلہ پر بالاستیعاب بحث کرنی ہو لازماً اس میں وہ امور متعدد بار بیان ہوں گے۔ اور اسے کوئی عقلمند تکرار نہیں کہہ سکتا۔ تکرار تو یہ ہے کہ بے وجہ ایک بات کو دُہرایا جائے۔ مگر جب ہر دفعہ دوسرے پہلو سے یا دوسری ضرورت سے بات بیان کیجائے تو یہ تکرار کس طرح کہلا سکتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ غور کرکے قرآن

صرفنا

قرآن کریم میں بظاہر تکرار نظر آنے کی وجہ

نفوراً

يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ

(یعنی مشرکین) کہتے ہیں پاک اور بہت ہی بالا ہے ۴۵ ساتوں آسمان اور زمین اور جو انمیں (بسنے والے) ہیں اُسکی

السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ

تسبیح کرتے ہیں. اور جو بھی چیز ہے وہ اسکی تعریف کرتی ہوئی (اُس

اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ

کی) تسبیح کرتی ہے. لیکن (انوس) تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے وہ

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ

یقیناً پردہ پوشی کرنے والا (اور) بہت (ہی) بخشنے والا ہے ۴۶ اور جب تو قرآن کو پڑھتا ہے تو (اسوقت)

اور اکا بتوں کی پرستش کرنے اور ان کی مدد حاصل کرنے کے باوجود گھٹنا اس امر کی علامت ہے کہ شرک کا عقیدہ صحیح نہیں اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہے۔

توحید شرک کی واضح دلیل بتوں کا اُدُر نہ کرنا ہے۔

یہ دلیل بعض بڑے بڑے مشرکوں کے لئے ہدایت کا موجب ہوئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر نبی کریم صلعم نے عورتوں کی بیعت لیتے وقت فرمایا کہ اس امر کا اقرار کرو کہ ہم شرک نہیں کریں گی۔ اس موقعہ پر ہند ابو سفیان کی بیوی بھی موجود تھی۔ وہ بے اختیار بول اُٹھی کہ یا رسول اللہ! کیا اب بھی ہم شرک کریں گی۔ اگر ان بتوں میں کچھ طاقت ہوتی اور اگر یہ ہماری مدد کر سکتے تو آپ اکیلے ہو کر بھلا ہم پر غالب آ سکتے تھے؟

انبیاء کی آمد کی غرض بندے اور خدا کی درمیانی روک کو دور کرنا ہے

۴۵ حل لغات۔ تَعٰلٰی: اِرْتَفَعَ۔ تعالیٰ کے معنے ہیں بلند ہوا (اقرب) پس تَعٰلٰی عَمَّا يَقُوْلُوْنَ کے معنے ہوں گے وہ اس بات سے بلند و بالا ہے جو وہ کہتے ہیں۔

عُلُوًّا: عَلَا کا مصدر ہے۔ اور علا کے معنے کے لئے دیکھو سورۃ ہذا ۵ء

لا تفقھون ۱۲

تفسیر۔ اس آیت میں تَعٰلٰی کی تاکید غیر باب سے یعنی عُلُوًّا سے کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں اس کی اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً فرماتا ہے اَنْبَتَكُمْ نَبَاتًا حَسَنًا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسا کرنے سے تاکید میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں دو چیزیں ایک فعل اور ایک مصدر نکالنی پڑتے ہیں۔ گویا عبارت یوں ہوگی تَعَالٰی تَعَالِيًا وَعَلَا عُلُوًّا وہ پاک ہے اور بہت ہی بڑا ہے اس بات سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ یعنی خدا کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اپنا قرب کسی کی معرفت دے۔ خود پیدا کر کے پھر اپنی معرفت کے لئے روکیں پیدا کرنا دانائی کے خلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نبی کیوں بھیجتا ہے اور ان کا ماننا کیوں فرض کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی تو صرف اس کام کے لئے آتے ہیں کہ جو روکیں خدا تعالیٰ کی راہ میں ہوں انکو دور کیا جائے اور خدا تعالیٰ کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔ نبی خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان روک بن کر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ نبی کے باوجود ہر بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے براہ راست ہوتا ہے۔

۴۶ حل لغات۔ لَا تَفْقَهُوْنَ: فقہ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور فَقِهَ الشَّيْءَ يَفْقَهُهٗ

شر سے بھی محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور ہر ایک شخص دوسرے کی سلامتی تلاش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بھی اسے سلامتی ملتی ہے۔ یہ معیار بھی ایسا نہیں کہ کوئی مشرک اس کا انکار کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے قریب ہوگا لغو باتوں سے اور گناہ سے بچیگا۔ اور خدا کا بندہ ہو کر اس کے دوسرے بندوں کی بھلائی میں لگا رہیگا فساد نہیں کرے گا۔

یہ علامتیں بھی کسی مشرک میں نہیں پائی جا سکتیں پہلی بات لغو باتوں سے محفوظ ہونا ہے مشرک میں یہ بات کہاں پائی جا سکتی ہے۔ وہ تو شرک کی وجہ سے مضحکہ خیز باتیں کرتا ہے۔ ایک بیخبر اور بے شر چیز کے سامنے سجدے کرتا ہے۔ اس کی عظمت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ عقلمند اس کی حرکات کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ بھلا یہ غوغا جو گائے کے تقدس کا ہندوستان میں برپا ہے کونسا معقول شخص اسے جائز قرار دے سکتا ہے گائے کے پرستار اس کا دودھ اس کے بچہ سے چھڑا لیتے ہیں۔ آپ غلہ کھاتے ہیں اسے گھاس کھلاتے ہیں۔ اسے باندھ کر رکھتے ہیں۔ نر پر بوجھ لادتے ہیں۔ سواری کا کام لیتے ہیں۔ مارتے پیٹتے ہیں۔ اور پھر وہ ماتا کی ماتا ہے۔ پھر لطیفہ یہ کہ ہندو عیسائیوں پر تمسخر اڑاتے ہیں کہ وہ ایک کمزور بندہ کو خدا بنا رہے ہیں اور وہ ان پر ہنستے رہتے ہیں کہ ایک کمزور جانور کو دیوی سمجھ رہے ہیں۔ ان لغو باتوں کو دیکھ کر ایک موحد بے ساختہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ کہہ اٹھتا ہے۔ دوسری علامت گناہ سے بچنا ہے۔ مشرک شرک کرتے ہوئے گناہ سے بچ ہی نہیں سکتا۔ بیشک مشرکوں میں سے بھی بعض نیک ہیں لیکن ان کی نیکی شرک کی وجہ سے نہیں بلکہ شرک کے باوجود ہے ایسے لوگوں کی فطرت اچھی ہوتی ہے۔ پس شرک ان کے اندر جڑ نہیں پکڑتا۔ مثلاً گائے ہی کو لے لو۔ جو لوگ گائے کو پوجتے ہیں اس کو طرح طرح سے دکھ بھی دیتے ہیں۔ اور اس پر مجبور ہیں۔ کیونکہ گائے خدا تعالیٰ نے انسان کے کام کے لئے بنائی ہے۔ انہیں اس سے کام لینے کے بغیر کوئی چارہ نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گائے سے کام بھی لیتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی دل میں احساس گناہ بھی بڑھتا جاتا ہے اور ضمیر ناپاک ہو جاتی ہے۔ پھر دیکھو مشرک ہندو دسہرہ مناتے ہیں مگر پھر اس خیال سے کہ راون برہمن تھا اور رام کھتری۔ دسہرہ منا کر ایک دن توبہ کا رکھتے ہیں تا برہمن کی ہتک کا ازالہ ہو جائے۔ عیسائیوں کا بھی یہی حال ہے مسیح کو ایک طرف خدا بناتے ہیں دوسری طرف اپنے گناہ اس پر لادتے ہیں۔ اور شرک کا عقیدہ ان کے لئے ہر بدی کا رستہ کھولتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ خداوند یسوع نے ہمارے گناہ اٹھا لئے ہیں۔

(قربِ الٰہی کا دوسرا معیار لغو امور اور گناہ سے بچنا ہے۔)

تیسری علامت قرب کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرب کو حفاظت ملتی ہے۔ یہ علامت بھی مشرک کو حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ جو ان چیزوں کے تابع ہو جاتا ہے جن کو خدا تعالیٰ نے اس کے تابع بنایا تھا اس کے لئے حفاظت کا کونسا ذریعہ باقی رہ جاتا ہے۔

(تیسری علامت قربِ الٰہی کی بندہ کی حفاظت ہے۔)

چوتھی علامت یہ ہے کہ خدا کا ہو کر اس کے بندوں سے نیک سلوک کرنے اور آپس میں صلح صفائی پیدا ہو۔ یہ علامت بھی مشرک میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ توحید ہی دنیا میں امن قائم کر سکتی ہے۔ مختلف خداؤں کی موجودگی میں تو تفرقہ اور فساد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ قومی دیوتاؤں ہی کی وجہ سے اقوام میں جنگیں ہوتی ہیں۔ ہندو مسیح کو نہیں مان سکتا مسیحی گائے کی پوجا نہیں کر سکتا۔ مگر یہ سب ایک خدا کی پوجا کر سکتے ہیں اور دنیا کا امن اس ذریعہ سے محفوظ ہو سکتا ہے۔

(چوتھی علامت قربِ الٰہی کی باہمی صلح صفائی ہے۔)

اِذًا لَّا بْتَغَوْا اِلٰی ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا کے یہ بھی معنے ہیں کہ اگر دوسرے معبود سچے ہوتے تو یہ لوگ ان کے ساتھ تعلق پیدا کر کے کوئی کامیابی کی راہ میرے خلاف ڈھونڈھ لیتے اور مجھے نقصان پہنچانے اور تباہ کرنے کا راستہ نکال لیتے اور انکی معرفت میرے خلاف کوئی تدبیر ہی ذی العرش سے پوچھ لیتے جس سے انہیں کامیابی حاصل ہو جاتی۔ مطلب یہ کہ کمزوری کے باوجود میرا دن بدن بڑھنا

يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ

یعنی مشرکین) کہتے ہیں پاک اور بہت ہی بالا ہے ۴۵ ساتوں آسمان اور زمین اور جو انہیں (بسنے والے) ہیں اُسکی

السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ

تسبیح کرتے ہیں۔ اور جو بھی چیز ہے وہ اسکی تعریف کرتی ہوئی (اُس

اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ

کی) تسبیح کرتی ہے۔ لیکن (اے لوگو) تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے وہ

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ

یقیناً پردہ پوشی کرنے والا (اور) بہت (ہی) بخشنے والا ہے ۴۶ اور جب تو قرآن کو پڑھتا ہے تو (اسوقت)

اور انکا بتوں کی پرستش کرنے اور ان کی مدد حاصل کرنے کے باوجود گھٹنا اس امر کی علامت ہے کہ شرک کا عقیدہ صحیح نہیں اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہے۔

توحید شرک کی واضح دلیل بتوں کا اُڈ ذکر نا ہے۔

یہ دلیل بعض بڑے بڑے مشرکوں کے لئے ہدایت کا موجب ہوئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر نبی کریم صلعم نے عورتوں کی بیعت لیتے وقت فرمایا کہ اس امر کا اقرار کرو کہ ہم شرک نہیں کریں گی۔ اس موقعہ پر ہند ابوسفیان کی بیوی بھی موجود تھی۔ وہ بے اختیار بول اٹھی کہ یا رسول اللہ! کیا اب بھی ہم شرک کریں گی۔ اگر ان بتوں میں کچھ طاقت ہوتی اور اگر یہ ہماری مدد کر سکتے تو آپ اکیلے ہو کر بھلا ہم پر غالب آسکتے تھے؟

انبیاء کی آمد کی غرض بندہ اور خدا کی درمیانی روک کو دور کرنا ہے

۴۵ حل لغات۔ تَعٰلٰی: اِرْتَفَعَ۔ تعالیٰ کے معنے ہیں بلند ہوا (اقرب) پس تَعٰلٰی عَمَّا يَقُوْلُوْنَ کے معنے ہوں گے وہ اس بات سے بلند و بالا ہے جو وہ کہتے ہیں۔

عُلُوًّا: عَلَا کا مصدر ہے۔ اور علا کے معنے کیلئے دیکھو سورۃ ہذا ۵۰۔

لاتفقھون

تفسیر۔ اس آیت میں تَعٰلٰی کی تاکید غیر باب سے یعنی عُلُوًّا سے کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں اس کی اور مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً فرماتا ہے اَنْۢبَتَكُمْ نَبَاتًا حَسَنًا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسا کرنے سے تاکید میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں دو چیزیں ایک فعل اور ایک مصدر کی پڑتے ہیں۔ گویا عبارت یوں ہوگی تَعَالٰی تَعَالِیًا وَّعَلَا عُلُوًّا وہ پاک ہے اور بہت ہی بڑا ہے اس بات سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ یعنی خدا کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اپنا قرب کسی کی معرفت دے۔ خود پیدا کر کے پھر اپنی معرفت کے لئے روکیں پیدا کرنا دانائی کے خلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نبی کیوں بھیجتا ہے اور ان کا ماننا کیوں فرض کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی تو صرف اس کام کے لئے آتے ہیں کہ جو روکیں خدا تعالیٰ کی راہ میں ہوں انکو دور کیا جائے اور خدا تعالیٰ کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔ نبی خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان روک بن کر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ نبی کے باوجود ہر بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے براہ راست ہوتا ہے۔

۴۶ حل لغات۔ لَا تَفْقَهُوْنَ: فقہ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور فَقِهَ الشَّيْءَ (يفقهه

جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

ہم تیرے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک مخفی (اور عام

بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَّجَعَلْنَا عَلٰى

نظروں سے پوشیدہ) پردہ پیدا کر دیتے ہیں ؎ اور ہم ان کے دلوں پر (بھی)

فقہا) کے معنے ہیں فَہِمَہٗ اسکو سمجھا۔ وَفَقِہَ الرَّجُلُ (یَفْقَہُ) فَقَہًا کے معنے ہیں عَلِمَ کَانَ فَقِیْہًا فلاں شخص عالم ہو گیا (اقرب)۔ پس لَا تَفْقَہُوْنَ تَسْبِیْحَہُمْ کے معنے ہوں گے کہ تم انکی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

حَلِیْمٌ: حَلُمَ (یَحْلُمُ حِلْمًا) سے صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے۔ اور حَلُمَ کے معنے ہیں صَفَحَ وَسَتَرَ درگذر کیا اور پردہ پوشی کی۔ (اقرب) پس حَلِیْمٌ کے معنے ہوں گے۔ درگذر کرنے والا اور پردہ پوشی کرنے والا۔

تفسیر۔ اس آیت میں فرمایا کہ دنیا کو اگر مجموعی نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھی خدا کے واحد ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اسکی ایک ایک چیز کو دیکھا جائے تو وہ علیحدہ علیحدہ بھی اسبات پر دلالت کرتی ہے کہ خدا واحد ہے۔ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ میں اس کے فرداً فرداً تسبیح کرنے کا ذکر ہے اور پہلے جملے میں مجموعی طور پر توحید ظاہر کرنے کا اشارہ ہے۔ ورنہ اگر تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْہِنَّ میں بھی فرداً فرداً توحید پر دلالت کرنا مقصود ہوتا تو بعد میں یہ جملہ نہ آتا۔ پس اس جملے کا دوبارہ بیان کرنا بتاتا ہے کہ پہلے جملے میں دنیا کی تمام چیزوں کا مجموعی طور پر توحید ثابت کرنا ظاہر کیا گیا ہے۔ اور دوسرے جملے میں دنیا کی ہر ایک چیز کا علیحدہ علیحدہ توحید کی دلیل ہونا بتایا گیا ہے۔ دنیا کی اشیاء کو دیکھ لو ایک دوسرے سے کیسی وابستہ ہیں بعض چیزیں آپس میں ہزاروں لاکھوں کروڑوں میل پر ہوتی ہیں لیکن سب کا وجود ایک دوسرے سے وابستہ ہوتا ہے اور سب آپس میں ایک نظام میں منسلک ہوتی ہیں۔ پس ان کا ایک ہی قانون سے وابستہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی دوسرا قانون نہیں ورنہ ضرور خلل ہوتا۔ اور جب دوسرا قانون ہی نہیں تو دوسرے مقنن کا وجود کس طرح ممکن ہوگا؟

دنیا کی سب چیزیں فرداً فرداً بھی تسبیح کرتی ہیں۔ اس طرح کہ ہر چیز میں خدا کی صفات کی جھلک ہے۔ خدا کی ستاری، غفاری۔ اسکی خلق، اس کی ربوبیت وغیرہ تمام صفات ہر ایک چیز میں پائی جاتی ہیں یعنی وہ چیز ان باتوں پر عمل کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دنیا کا کوئی ذرہ بھی لے لو۔ اس میں یہ سب صفات کام کرتی نظر آئیں گی۔ پس جب ہر چیز خدائے واحد کی صفات کو ظاہر کر رہی ہے تو اسے کسی اور خدا کی طرف کس طرح منسوب کیا جا سکتا ہے۔

حلیم

اشیاء کی تسبیح سے مراد توحید کا اقرار ہے

وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَہُوْنَ تَسْبِیْحَہُمْ سے بعض لوگوں نے یہ مراد لی ہے کہ انکی علیحدہ علیحدہ بولیاں ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں۔ مگر ہر چیز کی علیحدہ بولی ہوتی تو ہم سمجھ نہ سکتے تو ہمارے لئے یہ امر دلیل کیسے بن سکتا۔ دلیل تو وہ ہوتی ہے جسے ہم سمجھ بھی سکیں۔ پس یہاں تَفْقَہُوْنَ سے متعلق اشیاء کی بولی سمجھنا مراد نہیں بلکہ یہ بتایا ہے کہ تم یہ نہیں سمجھتے کہ وہ تسبیح کر رہی ہیں۔ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا وہ حلیم و غفور ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اسکے علم کی وجہ سے تم بجائے فائدہ اٹھانے کے شرارتوں میں بڑھ رہے ہو کیا تم خیال نہیں کرتے کہ ایسے نظام اور دلائل کے ہوتے ہوئے تمہارا ان سے فائدہ نہ اٹھانا بلکہ شرارتوں میں بڑھتے جانا اور فوراً نہ پکڑے جانا خدا تعالےٰ کے علم کی وجہ سے ہی ہے۔ پس شرافت کا جذبہ ظاہر کرو اور اللہ تعالیٰ کے اس علم کی قدر کرو۔

؎ حل لغات۔ حِجَابًا اَلْحِجَابُ: (حَجَبَہٗ یَحْجُبُہٗ) الحجابُ

قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ

کئی پردے ڈال دیئے ہیں تا وہ اس (سچائی کے انکار کی حقیقت) کو سمجھیں اور انکے کانوں میں بہرہ پن

وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى

ہے - اور جب تو قرآن میں اپنے رب کو جو ایک ہی ہے یاد کرتا ہے تو وہ نفرت سے (تیری طرف) اپنی

کا مصدر ہے۔ اور نیز اس کے معنے ہیں۔ پردہ۔ وَكُلُّ مَا احْتُجِبَ بِهٖ ہر وہ چیز جسکے ذریعہ پردہ کیا جائے (اقرب)۔

آنحضرتؐ اور مخالفین کے درمیان حجاب کی تشریح

تفسیر۔ اس آیت کے دو معنے ہیں۔ (۱) کہ جب تو قرآن شریف پڑھتا ہے تو ہم تیرے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ایک ایسا پردہ ڈالدیتے ہیں کہ وہ پردہ خود بھی چھپا ہوا ہوتا ہے یعنی وہ حجاب بھی انکی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ اس لئے فرمایا تا کوئی بے سمجھ حجاب کے لفظ سے ظاہری پردہ نہ سمجھ لے۔

بعض لوگوں نے پردہ سے ایسا پردہ مراد لیا ہے۔ کہ جس سے نبی کریم صلعم چھپ جاتے تھے اور انہوں نے زوجہ ابولہب کا قصہ لکھا ہے۔ کہ جب سورۃ اللہب اتری کہ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ سن کر وہ غصہ میں بھری ہوئی نبی کریم صلعم کو تکلیف پہنچانے کی نیت سے نکلی۔ نبی کریم صلعم نے دعا کی کہ الٰہی! تو مجھے اس کے شر سے بچالے۔ تو خدا تعالےٰ نے آپ کے آگے پردہ حائل کر دیا اور اس وجہ سے وہ آپ کو دیکھ نہ سکی۔ یہ محض خرافات ہیں۔ خدا کا وہ رسولؐ جو ساری دنیا سے نہ ڈرا اس کمزور عورت سے اس قدر خائف ہو گیا کہ اللہ تعالےٰ کو اسے غائب کرنا پڑا۔ اس غیر معقول بات کو کوئی عقلمند تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس روایت کو پیش کرنے والے یہ بھی نہیں سوچتے۔ کہ خدا تعالیٰ تو اس حجاب کو مَسْتُوْرًا قرار دیتا ہے یعنی وہ پردہ نظر نہیں آتا۔ مگر یہ لوگ پردے کو ظاہر کر کے نبی کریم صلعم کو مستور قرار دیتے ہیں۔

(۲) دوسرے معنے اس جملہ کے یہ ہو سکتے ہیں۔ کہ وہ پردہ بھی آگے ایک اور پردے کے پیچھے ہوتا ہے۔ یعنی ایک پردہ ہی تیرے اور انکے درمیان نہیں ہوتا بلکہ کئی پردے حائل ہوتے ہیں۔ کوئی پردہ قومی غیرت کا۔ کوئی مال کا۔ کوئی اخلاق کا وغیرہا۔ وغیرہا۔ یعنی کبھی لوگ اس خیال سے ایمان نہیں لاتے کہ اس کو مانا تو قوم چھوڑنی پڑے گی۔ کبھی یہ خیال حائل ہو جاتا ہے۔ کہ مال جاتا رہے گا۔ کبھی یہ بات راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ کہ کئی قسم کے بد اخلاق جن کی عادت پڑی ہوئی ہے چھوڑنے پڑیں گے۔ پس اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ جب تک یہ لوگ ان پردوں کو نہ ہٹائیں گے تجھ تک نہ پہنچ سکیں گے مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ پردے ایسے ہیں کہ انکو نظر نہیں آتے۔ ان کی نظروں سے پوشیدہ ہیں وہ اپنے خیال میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ قرآن کریم ہی بُری چیز ہے۔ اگر وہ اچھی چیز ہوتی تو جلدی ہی ہمارے دلوں پر اس کی قبولیت کا اثر ہو جاتا۔ گویا ان کے دلوں پر ایسے زنگ ہیں کہ انکو اچھی چیز بُری لگتی ہے۔ اور بُری چیز اچھی لگتی ہے۔ اس لئے ایمان کا نصیب ہونا مشکل ہو رہا ہے۔ ان معنوں کی تصدیق اگلی آیت وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً

اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ○ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ

پیٹھیں پھیر کر چلے جاتے ہیں ۴۸ (اور) جب وہ (بظاہر) تیری باتیں سُن رہے ہوتے ہیں تو جس غرض سے وہ

اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ

سُن رہے ہوتے ہیں اس (کی حقیقت) کو ہم (سب سے) زیادہ جانتے ہیں اور (نیز اس کی حقیقت کو بھی) جب وہ باہم سرگوشیاں

الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ○ ۴۹

کر رہے ہوتے ہیں (اور) جب وہ ظالم (ایک دوسرے سے) کہہ رہے ہوتے ہیں (کہ) تم ایک فریب خوردہ شخص ہی کی پیروی کر رہے ہو

ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر ایک پردہ نہیں بلکہ کئی پردے ہیں ؛

۴۸ حل لغات۔ اَكِنَّةً : اَلْاَكِنَّةُ۔ اَلْكِنُّ کی جمع ہے۔ اور اَلْكِنُّ کے معنے ہیں وِقَاءُ كُلِّ شَیْءٍ وَ سِتْرُهٗ ہر چیز کے اوپر کا پردہ جو اس کے جسم کی حفاظت کرتا ہے۔ (اقرب)

وَقْرًا : وَقَرَ (يَقِرُ) سے ہے اور وَقَرَتْهُ اُذُنُهٗ کے معنے ہیں ثَقُلَتْ اَوْ ذَهَبَ سَمْعُهٗ كُلُّهٗ وَ صَمَّتْ اس کے کان بوجھل ہو گئے یا اس کی شنوائی جاتی رہی اور کان بہرے ہو گئے۔ (اقرب) پس وَقْر کے معنے ہوں گے۔ بہراپن۔ کان کا بوجھ۔

وَلَّوْا : وَلّٰی سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور وَلّٰی هَارِبًا کے معنے ہیں اَدْبَرَ پیٹھ دے کر بھاگ گیا۔ وَلَّى الشَّیْءَ وَ عَنِ الشَّیْءِ۔ اَعْرَضَ وَ نَاٰی۔ اس نے کسی سے اعراض کیا اور پہلو تہی کی (اقرب)۔ پس وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ کے معنے ہوں گے کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں۔

تفسیر۔ اَنْ يَّفْقَهُوْهُ محذوف مفعولٌ لہ کا متعلق ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اس کراہت کی وجہ سے ہم نے پردے ڈال دئے ہیں کہ ایسے گندے لوگ جنہوں نے اپنے دلوں کو مختلف ظلمتوں میں چھپا رکھا ہے۔ اسلام میں داخل ہو کر اس کی بدنامی کا موجب نہ ہوں۔

اَكِنَّة

اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے ہی پردے ڈال دئے ہیں تو وہ کیسے سمجھیں اور ان پر الزام کیسا؟ تو اس کا جواب دوسری جگہ بطور اصول کے بیان فرما دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (بقرہ ع ۳) کہ اس قسم کے پردے انسان کے اپنے نفس سے ہی پیدا ہوتے ہیں کوئی باہر سے نہیں آتے۔ تیسری جگہ فرمایا۔ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (سورۃ محمدؐ ع ۳) کہ ان کے دلوں پر قفل بھی ان کے دلوں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پس انسان ہی اپنے لئے پردے اور قفل تجویز کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے اپنے تجویز کئے ہوئے پردوں کو اس کے دل پر ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ جب تک دل صاف نہ ہو الٰہی سلسلہ میں داخل ہونے والے کو تو کوئی نفع ہوتا نہیں۔ الٰہی سلسلہ مفت میں بدنام ہو جاتا ہے۔

وَقْر

وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا اس میں وَحْدَهٗ کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ مشرک لوگ خدا تعالیٰ کو تو مانتے ہیں لیکن توحید سے انہیں چڑ ہوتی ہے۔ یہی پردوں میں سے ایک پردہ ہے ؛

۴۹ حل لغات۔ يَسْتَمِعُوْنَ : اِسْتَمَعَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِسْتَمَعَ لَهٗ وَ اِلَيْهِ کے معنے ہیں اَصْغٰی اس نے اس کی طرف

اس اعتراض کا جواب کہ جب پردے خدا نے ڈالے پھر توبندوں کا کیا قصور۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا

دیکھ انہوں نے تیرے متعلق کس طرح باتیں بنائی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ گمراہ ہو گئے ہیں اور (اب) وہ

يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ

(اس گناہ سے بچنے کی) کوئی راہ نہیں پا سکتے ۝۵۰ اور انہوں نے (یہ بھی) کہا ہے (کہ) کیا جب ہم (مر کر) ہڈیاں اور

کان لگا کر بات سنی (اقرب)۔

نجوٰی نَجْوٰی کے معنے ہیں اَلسِّرُّ بھید۔ اَلْمُتَسَارُّوْنَ راز کی باتیں کرنیوالے۔ وَهُوَ وَصْفٌ بِالْمَصْدَرِ يَسْتَوِيْ فِيْهِ الْمُفْرَدُ وَالْجَمْعُ۔ نجوٰی مصدر ہے جو بطور صفت بیان ہوا ہے اس لئے مفرد اور جمع دونوں طرح استعمال ہو سکتا ہے۔ (اقرب)۔ پس اِذْ هُمْ نَجْوٰی کے معنے ہیں کہ جب وہ باہم سرگوشی کر رہے ہوتے ہیں۔

مسحور مَسْحُوْرٌ کے معنے جس کو دھوکہ دیا گیا جسکو کسی چیز سے روکا گیا جسکی عقل ماری گئی یا مسلول۔ ان سب معنوں کے لحاظ سے اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا کے یہ معنے ہوں گے کہ تم نہیں اتباع کرتے مگر اس کی جو دھوکہ خوردہ ہے یا سچائی سے پھیرا گیا ہے یا جس کی عقل ماری گئی ہے یا لاعلاج بیماری میں مبتلا ہے۔ قوم کی حالت کے غم میں انبیاء کی صحت عموماً اچھی نہیں رہتی۔ اس لئے وہ کہہ دیتے ہوں گے کہ یہ کمزور اور بیمار ہے یونہی چند یوم کا شور ہے۔ تھوڑے ہی دن میں مر جائے گا۔

تفسیر۔ اس آیت میں بِہٖ کی باء لام کے معنوں میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم اس امر کو خوب جانتے ہیں جس کی خاطر یہ تیری باتیں سنتے ہیں یعنی یہ صرف انکار و الزام کی خاطر سنتے ہیں۔ ان الفاظ میں وَقْرًا کی تشریح کی گئی ہے۔

بِہٖ میں باء مصاحبت کی بھی ہو سکتی ہے کہ جس چیز کے ساتھ وہ سنتے ہیں اسکو ہم جانتے ہیں۔ یعنی سنتے وقت جو حالت ان کے دل کی ہوتی ہے ہم اس سے واقف ہیں۔ وہ قلبی حالت کیا ہے؟ وہ استہزاء اور مخالفت کے خیالات ہیں جو سنتے وقت ان کے دلوں میں پیدا ہو رہے ہوتے ہیں۔

اس آیت میں چند اور پردوں کا ذکر کیا گیا ہے فرماتا ہے کہ ایک تو شرک ان کے رستہ میں روک ہے۔ دوسرا پردہ یہ ہے کہ یہ غور سے بات سنتے ہی نہیں۔ الزام لگانے اور تمسخر کرنے کے خیال سے سنتے ہیں۔ جب دل کی یہ حالت ہو تو بات سمجھ کس طرح آئے۔ تیسرا پردہ ان کے دل پر یہ پڑا ہوا ہے کہ محمد رسول اللہ کو کمزور سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ زیادہ دن تک یہ بات نہیں چلا سکتا۔ پھر اسے مان کر کیوں ذلیل ہوں۔ چوتھا پردہ یہ ہے کہ بعض نادان محمد رسول اللہؐ کو دیوانہ خیال کرتے ہیں۔ اس لئے آپکی بات سن کر توجہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ پانچواں پردہ یہ ہے کہ بعض خیال کرتے ہیں کہ اسے دھوکا لگ گیا ہے اور وہ اس خیال میں خوش ہیں کہ ہم نے اسکی حقیقت معلوم کر لی ہے اور غور اور فکر سے آزاد ہو گئے ہیں۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ مسلمانوں پر ظلم کرتے کرتے تھک گئے اور اس طرح کامیابی نہ ہوئی تو وہ چھپ چھپ کر لوگوں کو سمجھانے لگے اور نرمی کا پہلو اختیار کر کے لوگوں کو اسلام سے برگشتہ ہونیکی تلقین کرنی شروع کر دی۔

۵۰ تفسیر۔ اس آیت میں اَمْثَال (جمع کا لفظ) کہہ کر بتا دیا کہ اوپر کی آیت میں مَسْحُوْرًا کے

رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۞ قُلْ كُوْنُوْا

چُورا چُورا ہو جائیں گے (تو ہمیں از سرِ نو زندہ کیا جائیگا اور) کیا واقعی ہمیں ایک نئی مخلوق کی صورت میں اٹھایا جائیگا ۱۵ہ

حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۞ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ

تو (انہیں) کہہ (کہ) تم (خواہ) پتھر بنجاؤ یا لوہا یا کوئی اور ایسی مخلوق جو تمہارے دلوں میں عظمت

صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ

رکھتی ہو (تب بھی تم کو دوبارہ زندہ کیا جائیگا) اس پر وہ ضرور کہیں گے (کہ) کون ہمیں دوبارہ (زندہ کرکے وجود

الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ

میں لائیگا تو (انہیں) کہہ (کہ) وہی جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اس پر وہ ازراہِ تعجب سے تمہاری طرف

رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ

(دیکھتے ہوئے) اپنے سر ہلائیں گے اور کہیں گے (کہ) وہ (از سرِ نو زندہ کیا جانا) کب ہوگا (جب وہ ایسا کہیں تو) تو (ان

قَرِيْبًا ۞ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ

سے) کہہ (کہ) بالکل ممکن ہے کہ وہ (وقت اب) قریب (آچکا) ہو ۲۵ہ (یہ وعدہ اس دن پورا ہوگا) جس دن وہ تمہیں بلائیگا

سارے ہی معنے مراد تھے ورنہ مَثَل کا لفظ چاہیئے تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کے جو الفاظ کئی معنے رکھتے ہیں جب وہ سیاق و سباق سے مناسبت رکھتے ہوں تو سب کے سب معنے بیک وقت مراد ہوتے ہیں۔

۱۵ہ حل لغات ۔ عِظَامًا : اَلْعِظَامُ اَلْعَظْمُ کی جمع ہے اور اَلْعَظْمُ کے معنے ہیں۔ ہڈی (اقرب)۔

رُفَاتًا : اَلرُّفَاتُ کے معنے ہیں اَلْحُطَامُ سوکھی ہوئی چیز کے ٹکڑے۔ کُلُّ مَا تَکَسَّرَ وَ بَلِیَ ۔ بوسیدہ ور چورا چیز۔ (اقرب)۔

تفسیر ۔ پیچھے ذکر ترقیات کا تھا اور پھر کفار کے جہنم میں گرائے جانے کا ذکر تھا۔ اس کے متعلق جو کفار کو شبہ پیدا ہو سکتا تھا اس آیت میں اس کا ذکر کیا گیا۔ فرماتا ہے کفار ان باتوں کو سنکر اعتراض کرتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا پھر ہماری کوئی نئی پیدائش ہوگی؟

۵۲ہ حل لغات ۔ فَسَيُنْغِضُوْنَ : عظاماً اَنْغَضَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور فسینغضون اَنْغَضَ فُلَانٌ رَأْسَهٗ کے معنے ہیں حَرَّكَهٗ كَالْمُتَعَجِّبِ مِنَ الشَّيْءِ اپنے سر کو حرکت دی رفات جیسے کوئی متعجب سر کو حرکت دیتا ہے۔ (اقرب) پس فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ کے معنے ہونگے کہ وہ تمہاری طرف اپنے سر کو ہلائیں گے۔

تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۠ وَقُلْ لِّعِبَادِيْ ۵ ع

تو تم اسکی تعریف کرتے ہوئے اسکا حکم مانو گے (اور فوراً حاضر ہوگے) اور تم سمجھ رہے ہوگے کہ تم (دنیا میں) تھوڑا ہی ٹھیرے تھے ۵۳

يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ

اور تو میرے بندوں کو کہہ (کہ) وہ وہی بات کہا کریں جو (سب سے) زیادہ اچھی ہو کیونکہ شیطان یقیناً ان کے

تفسیر - پہلی آیت میں جو اعتراض پیش کیا گیا تھا اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ تمہارے اندر کتنا ہی تغیر آجائے۔ پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا اس سے بھی بڑی کوئی چیز تو بھی تم خدا کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔ یا اس کے یہ معنے ہیں کہ تم اپنے دلوں کو کتنا ہی سخت بنا لو۔ پھر بھی ہمارے رسول کی ترقی ضرور ہوگی۔ تم میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں حشر برپا کر دے گا۔

میں اس آیت سے نتیجہ نکالتا ہوں کہ ممکن ہے انسانی جسم میں لمبے عرصہ کے بعد ایسا تغیر پیدا ہو جاتا ہو کہ وہ کسی دیگر مادہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہو۔ سائنس کی تحقیقات سے تو ثابت ہے کہ کئی درخت جو کسی وقت زمین میں دب گئے تھے۔ تغیرات زمانہ کے بعد پتھر کا کوئلہ بن گئے۔ اسی طرح یہ کہ ہیرا کوئلہ سے ہی بنا ہے پس یہ تعجب کی بات نہیں۔ کہ انسانی جسم مرنے کے بعد زمین میں ایک لمبا عرصہ دفن رہنے پر پتھر بنجائے گو ابھی تک آثار قدیمہ سے ایسا کوئی نشان نہیں ملا مگر یہ عقل کے خلاف نہیں پس میرے نزدیک اس جملہ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خواہ انسانی دور حیات پر لاکھوں کروڑوں سال کا عرصہ گزر جائے جس سے انسانی اجزاء کی جو زمین میں دفن ہیں شکل ہی تبدیل ہو جائے تب بھی انسان دوبارہ بعث سے نہیں بچ سکتا بعث ضرور ہوگا۔

مَنْ يُّعِيْدُنَا سے یہ مراد نہیں کہ وہ سنجیدگی سے سوال کرتے ہیں کہ انہیں کون پیدا کرے گا بلکہ یہ تمسخر ہے کہ دکھلاؤ تو سہی جو کہتا ہے کہ ایسا ہوگا۔ جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ذرا اس کا منہ تو دکھلاؤ جو ایسا کرنے کا دعویدار ہے مطلب اس سے صرف انکار ہوتا ہے۔

فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ۔ اَنْغَضَ فُلَانٌ رَاْسَهٗ۔ حَرَّكَهٗ كَالْمُتَعَجِّبِ مِنَ الشَّيْءِ - یعنی سر کو ہلایا ایسے انسان کی طرح جو کسی بات سے تعجب کر رہا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سر ہلا کر تمسخر کے رنگ میں باتیں کریں گے۔ اور کہیں گے اچھا یہ بات ہے؟ اب ہم سمجھے۔

عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا۔ اسمیں یہ بتایا ہے کہ جس حشر کا ہم اس سورۃ میں ذکر کر رہے ہیں وہ وہ نہیں جس پر تم اعتراض کرتے ہو۔ ہماری مراد اس سورۃ میں اس حشر سے ہے جو مسلمانوں کے ذریعہ سے اس دنیا میں ہونیوالا ہے اور بتایا ہے کہ وہ حشر جس کا ہم نے یہاں ذکر کیا ہے وہ تو بس قریب ہی ہے۔ چنانچہ اس کے کچھ عرصہ بعد عرب کے لوگ مسلمان ہو گئے۔ اور اس سورۃ میں جس حشر کی خبر تھی وہ ظاہر ہو گیا ؏

۵۳ تفسیر - اس آیت نے ظاہر کر دیا کہ وہ حشر جس کا یہاں ذکر ہے۔ اسی دنیا میں ہوگا۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ حشر اسدن مقرر ہے جب تم کو خدا تعالیٰ یا اس کا رسول ؐ بلائے گا اور تم مردوں کی طرح خاموش نہیں ہوگے جس طرح آج خاموش ہو۔ بلکہ اسدن تم میں سے اکثر محمد رسول اللہ کی بات پر لبیک کہتے ہوئے دوڑ پڑیں گے اور تسبیح کرنے لگیں گے اور اسوقت تم حیران ہوگے کہ خواہ مخواہ ہم اسلامی

حشر سے مراد تمام عرب کا مسلمان ہونا ہے۔

ممکن ہے کہ انسانی جسم زمین میں ایک لمبا عرصہ تک مدفون ہو کر پتھر بن جائے۔

بَیْنَہُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝

درمیان فساد ڈالتا ہے۔ شیطان انسان کا کھلا (کھلا) دشمن ہے ۵۴

رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِکُمْ ؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْکُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ

تمہارا رب تمہیں (سب سے) زیادہ جانتا ہے اگر وہ چاہے گا تو تم پر رحم کرے گا اور اگر وہ چاہے گا

ترقی کے ظہور کے زمانہ کو لمبا سمجھتے رہے۔ اسلامی ترقی کا زمانہ تو بڑی جلدی آگیا۔

یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ جب لوگ ایمان لائیں گے اپنی کفر کی زندگی کو بہت حقیر سمجھیں گے اور سمجھیں گے کہ اصل پیدائش تو ہماری اب ہوئی ہے۔ اسی طرح مومن بھی تکالیف کے ایام کو بھول جائیں گے۔ اور سمجھیں گے کہ یہ دن تو آنکھ جھپکنے گذر گئے۔ غرض آیت میں زمانہ کی لمبائی کا ذکر نہیں بلکہ ان احساسات کا ذکر ہے جو اس وقت پیدا ہوں گے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ لَیْسَ عَلٰی اَھْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْشَۃٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ وَلَا فِیْ مَنْشَرِھِمْ وَکَاَنِّیْ بِاَھْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یَنْفُضُوْنَ التُّرَابَ عَنْ رُءُوْسِھِمْ وَیَقُوْلُوْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (روح المعانی بحوالہ ترمذی و طبری)۔ کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے والوں کو قبر میں اور حشر میں بھی آرام ہی رہے گا۔ اور انکی وہ حالت گویا میں اب دیکھ رہا ہوں جبکہ وہ حشر کے دن اٹھیں گے اور اپنے سر سے مٹی جھاڑ رہے ہوں گے اور یہ کہتے جاتے ہوں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہر قسم کے غم ہم سے دور کر دیئے۔ گویا راحت اور ترقی کے ملتے ہی سب غم و حزن دور ہو جائیں گے اور اس زمانہ کو وہ نہایت مختصر خیال کرنے لگیں گے۔

۵۴ حل لغات۔ یَنْزَغُ: نَزَغَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور نَزَغَ کے لئے دیکھو یوسف ۹۷۔

۵۴ تفسیر۔ قرآن کریم کو پڑھ کر کیا ہی لطف آتا ہے ایک سورۃ پہلے نازل ہوئی ہے اور دوسری سورۃ بعد میں پھر پہلی کو ترتیب میں بعد میں رکھ دیا گیا ہے اور بعد والی کو پہلے۔ لیکن ان کے مضمون اس طرح ایک جان ہو جاتے ہیں جیسے کہ ایک وقت میں لکھی ہوئی کتاب کے دو باب سورۃ النحل میں فرمایا تھا۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ اسی ترتیب کے مطابق سورۃ بنی اسرائیل کو شروع کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کی تعلیمی خوبیوں کے بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ (رکوع ۴) کہ یہ حکمت کی باتیں ہیں۔ اس کے بعد وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ سے کلام شروع کیا اور اَلْمَوْعِظَۃُ الْحَسَنَۃُ والی شق کو پورا کیا۔

تیسری بات یہ فرمائی تھی وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ اس کا جواب اب قُلْ لِّعِبَادِیْ کو شروع فرمایا۔ اس ترتیب کو دیکھ کر کوئی شخص کیونکر کہہ سکتا ہے کہ قرآن کریم میں کوئی ربط نہیں ہے۔ اس آیت میں نصیحت کی گئی ہے کہ نہایت سوچ سمجھ کر کلام کیا کرو اور دوسرے لوگوں سے ایسے رنگ میں گفتگو کرو جس سے ان کے دلوں پر اچھا اثر ہو۔

اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ اس آیت میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کو تو اپنے دوستوں سے بھی اچھی بات کرنی چاہیئے۔ لیکن جبکہ دشمن دوسرے

باوجود سورتوں کے آگے پیچھے نازل ہونے کے پھر بھی مضامین میں ترتیب ہے

حشر کے دن اس لا الٰہ الا اللہ کہنے کا مطلب ہے کہ بہت تھوڑا عرصہ دنیا میں ٹھہرے

یَنْزَغُ

يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝ وَرَبُّكَ

تو تمہیں عذاب دے گا اور (اے رسول) ہم نے تجھے ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ ۵۵ اور جو (کوئی بھی)

اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا

آسمانوں اور زمین میں (بسنے والے) ہیں انہیں تمہارا رب (سب سے) زیادہ جانتا ہے اور ہم نے یقیناً انبیاء میں

بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝

سے بعض کو بعض (دوسرے انبیاء) پر فضیلت دی ہے اور داؤد کو (بھی) ہم نے ایک زبور دی تھی ۵۶

لوگوں کے دلوں میں نفرت اور عداوت پیدا کر رہا ہو۔ تب تو اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے پس ایسے طریق سے کلام کرو اور گفتگو میں ایسی راہ اختیار کرو جو دوسروں کو بھی نرم کرلے۔

طریق گفتگو کے متعلق زور کا تاکید

شیطان سے بدکردار انسان بھی مراد ہو سکتے ہیں اور وہ مخصوص ہستی بھی کیونکہ وسوسہ اندازی اسکا کام ہے۔

اس آیت میں یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ والی بعثت اسلامی جلد ظہور پذیر ہو تو ایسا طریق اختیار کرو کہ یہ لوگ جلد مسلمان ہوں۔ اس سے یہ بھی پتہ لگ گیا کہ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ سے اسلام قبول کرنا ہی مراد ہے ؛

۵۵ تفسیر۔ فرمایا ہم ہی انسان کی دونوں حالتوں کو جاننے والے ہیں۔ نیکی کی حالت کو بھی اور بدی کی حالت کو بھی اور دل کا حال ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے ہم نے جزا سزا کا معاملہ اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ حتیٰ کہ رسول ؐ کے سپرد بھی نہیں کیا۔ پس جیسے جیسے تمہاری حالتیں بدلتی جائیں گی ہمارا معاملہ بھی بدلتا جائے گا ؛

۵۶ تفسیر۔ پہلی آیت میں انبیاء کے مخاطبین کو جاننے کا ذکر فرمایا تھا اب اس آیت میں فرماتا ہے جس طرح ہم انکو جانتے ہیں اسی طرح انبیاء کو بھی جانتے ہیں خواہ آسمان پر ہوں یعنی وفات یافتہ ہوں یا زمین پر ہوں یعنی زندہ ہوں۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی خوب جانتے ہیں اور اس سے پہلے کے نبیوں کو بھی۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کس زمانہ میں کیسے نبی کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی خیال سے ہم نے انبیاء کے بھی مدارج مقرر فرمائے ہیں تاکہ ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق نبی آئے۔

ان انبیاء میں سے داؤد علیہ السلام کا ذکر الگ بھی بیان فرمایا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہود کے ذکر میں ان کے دو عذابوں کا ذکر فرمایا تھا۔ ایک حضرت داؤد ؑ کے بعد جب کہ یہود میں دولت بہت ہو گئی اور تعیش پیدا ہو گیا۔ اور دوسرے حضرت مسیح ؑ کے بعد انکے انکار کی وجہ سے۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ مثیلِ موسیٰ ہیں جیسا کہ فرمایا۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل ع ۱)، ہم نے تم پر گواہ بنا کر تمہارے اندر اپنا رسول بھجوایا ہے اور یہ بعثت ویسی ہی ہے جیسا کہ فرعون کی طرف موسیٰ ؑ کی بعثت تھی۔ اور تورات میں ایک مثیلِ موسیٰ کی خبر دی گئی تھی۔ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ اور اس کے مقابل پر امتِ محمدیہ کے مثیلِ بنی اسرائیل ہونے کی خبر سورۃ فاتحہ میں

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا

تو (انہیں) کہہ (کہ) اس کے سوا جن لوگوں کے متعلق تمہارا دعویٰ ہے (کہ وہ الوہیت رکھتے ہیں) انہیں (اپنی

يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝

مدد کے لئے بھلا) پکارو (تو) بس (تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ) نہ وہ (تمہاری کسی) تکلیف کو تم سے دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ (تمہاری حالت میں) کوئی تبدیلی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی دی گئی تھی۔ پس اسی مشابہت کی بنا پر حضرت داؤد کا نام مسلمانوں کو نصیحت کرتے وقت خاص طور پر لیا۔ تا انہیں توجہ دلائی جائے کہ اے مسلمانو! ترقی اور کامیابی کے وقت داؤد کا واقعہ یاد رکھنا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح داؤد کے زمانہ میں یہود نے دنیوی ترقیات سے فائدہ کی بجائے نقصان اٹھایا۔ اور دین سے غافل ہو گئے۔ تم بھی کہیں ایسا نہ کرنا اور اس وقت کو خوف اور خشیت سے گذارنا۔

باوجود اس انذار کے مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے ہی عرصہ کے بعد بگڑے جتنے عرصہ کے بعد بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے بعد بگڑے تھے۔ اور گو اس وقت انہیں داؤد کی طرح نبی نہیں آیا لیکن ایسے نیک بادشاہ ضرور پیدا ہوئے جنہوں نے حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی طرح نیکی کا نمونہ دکھایا۔ مگر اس وقت دولت کے نشہ میں سرشار تھے اور اسلام کی خدمت سے غافل ہو رہے تھے۔ چنانچہ قریباً اتنا ہی زمانہ گذرنے پر جتنا حضرت موسیٰ اور یروشلم کی تباہی پر گذرا تھا۔ بغداد ہلاکو خان کے ہاتھ سے تباہ ہو گیا۔ اور اسلامی شوکت مٹ گئی۔ جس کے بعد اسے کبھی پوری شان کے ساتھ قائم ہونے کا موقعہ نہیں ملا۔

۵۷ حل لغات۔ زَعَمْتُمْ : زَعَمَ سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور زَعَمَ الرَّجُلُ (یَزْعُمُ) کے معنے ہیں قَالَ قَوْلًا حَقًّا اس نے سچی بات کہی وَكَذِبًا بَاطِلًا وَكِذْبًا (ضد) چونکہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ اس لئے اس کے معنے جھوٹی بات کرنے کے بھی ہیں۔ وَاَكْثَرُ مَا يُقَالُ فِيْ مَا يُشَكُّ فِيْهِ اَوْ يُعْتَقَدُ كَذِبُهٗ اور اس کا اکثر استعمال ان باتوں میں ہوتا ہے جن میں شک و شبہ ہو یا اس کے جھوٹ ہونے پر یقین ہو (اقرب)۔

فَلَا يَمْلِكُوْنَ : مِلْكٌ سے مضارع جمع کا صیغہ ہے۔ اور ملک کے لئے دیکھو رعد ۱۷۔

کشف

كَشْفَ : كَشَفَ (يَكْشِفُ) کا مصدر ہے۔ اور كَشَفَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں اَظْهَرَهٗ وَرَفَعَ عَنْهُ مَا يُوَارِيْهِ وَيُغَطِّيْهِ کسی چیز سے پردہ ہٹا کر اسے ظاہر و ننگا کر دیا۔ كَشَفَ اللّٰهُ غَمَّهٗ۔ اَزَالَهٗ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے غم کو دور کر دیا۔ (اقرب)

امت محمدیہ کی مماثلت بنی اسرائیل سے

الضر

اَلضُّرُّ کے لئے دیکھو یوسف ۸۹۔

تَحْوِيْلًا : تَحْوِيْل حَوَّلَ کا مصدر ہے یہ لفظ لازم اور متعدی دونوں طور پر استعمال ہوتا ہے۔

حولہ

حَوَّلَهٗ (متعدی) نَقَلَهٗ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰى اٰخَرَ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا۔ حَوَّلَ الشَّيْءَ اِلَيْهِ : قَلَبَهٗ وَاَزَالَهٗ کسی چیز کو کسی اور صورت میں تبدیل کر دیا۔ حَوَّلَ هُوَ۔ (لازم) اِنْتَقَلَ کوئی چیز اپنی جگہ سے دوسری جگہ چلی گئی (اقرب)

زعمتم

تفسیر۔ پچھلی تین چار سورتوں میں یہ مضمون بیان ہوا تھا کہ کفار حضرت اسلام کی آیات سن کر یہ دھوکا کھا جاتے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ

وہ لوگ جنہیں وہ پکارتے ہیں یعنی انھیں سے جو (خدا تعالیٰ کے) زیادہ قریب ہیں وہ (بھی) اپنے رب کا

الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَ

(مزید) قرب چاہتے ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور

يَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ۝

اسکے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ تیرے رب کا عذاب یقیناً ایسا ہے جس سے خوف کیا جاتا ہے ۵۵۸

ہیں کہ شاید اس سے حشر اجساد مراد ہے اور اسپر اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن وہ بھی مراد ہو تب بھی ان کا اعتراض درست نہیں لیکن اس موقعہ پر حشر اجساد کا ذکر نہیں بلکہ حشر ارواح کا ذکر ہے۔ اور یہ ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایک خاص وقت پر اپنے بندوں کو آواز دے گا تو آئمۂ کفار کے بنے ہوئے جال ٹوٹ کر تاگر تاگر ہو جائیں گے اور ان کے شکار انہیں سے نکل کر محمد رسول اللہ صلعم کیطرف چلے جائیں گے۔ پھر مسلمانوں کو اس ترقی کے زمانہ میں ہوشیار رہنے کا حکم دیا تھا۔

الوسیلۃ

حشر ارواح

اب پھر پہلے مضمون کی طرف رجوع فرماتا ہے اور کفار سے خطاب فرماتا ہے کہ یہ جو مسلمانوں کی ترقی اور تمہاری ہلاکت کی پیشگوئی کی گئی ہے اسی سے اپنی دین کی سچائی اور شرک کی حقیقت کا پتہ لگا لو۔ ہم کہتے ہیں کہ تم پر عذاب آئیگا تم اپنے معبودوں سے دعائیں کرکے دیکھو کہ کیا وہ تمہاری دعائیں سن سکتے ہیں اور عذاب کو ہٹانا تو الگ رہا کیا اسے کچھ کے لئے ملتوی کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں

محذور

چونکہ آیندہ تباہی شرک سے ہونے والی تھی اس لئے اس کی تفصیل بتائی ہے مسلمانوں میں بھی بغداد کی تباہی کے وقت شرک ہی پیدا ہو گیا تھا مسلمانوں نے فتوحات کے زمانہ میں ایرانی اور ترکی عورتوں سے شادیاں کیں جو کہ خوبصورت تو تھیں مگر ساتھ ہی متعصب مشرکہ بھی تھیں آخر اولاد میں اس کا اثر ظاہر ہو گیا ابن مقنع۔ عبداللہ بن صباح اسی زمانہ میں ہوئے تھے۔

۵۵۸ حل لغات۔ اَلْوَسِيلَةُ: وَسَلَ (يَسِلُ) کا مصدر ہے اور وَسَلَ إِلَى اللهِ بِالْعَمَلِ کے معنے ہیں رَغِبَ وَتَقَرَّبَ متوجہ ہوا اور قرب چاہا وَسَّلَ وَتَوَسَّلَ إِلَى اللهِ بِوَسِيلَةٍ کے معنے ہیں عَمِلَ عَمَلًا تَقَرَّبَ بِهِ إِلَيْهِ تَعَالَىٰ نیک عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب چاہا۔ تَوَسَّلَ إِلَىٰ فُلَانٍ بِكَذَا کے معنے ہیں تَقَرَّبَ إِلَيْهِ بِحُرْمَةِ آصِرَةٍ تَعْطِفُهُ کسی شخص تک ایسے مضبوط ذریعے رسائی کی کوشش کی جس سے وہ مہربان ہو جائے۔ اَلْوَسِيلَةُ مَا يُتَقَرَّبُ بِهِ إِلَى الْغَيْرِ: ذریعہ قرب۔ اس کی جمع وَسَائِل آتی ہے۔

مَحْذُورًا: حَذِرَ سے اسم مفعول ہے اس کے معنے ہیں مَا يُحْتَرَزُ مِنْهُ جس سے ڈرا اور بچا جائے۔

تفسیر۔ أُولَٰئِكَ کا اشارہ اَلنَّبِيِّين کی طرف ہے۔ یعنی وہ (انبیاء) ایسے لوگ تھے جو بنی نوع انسان کو خدا کی طرف پکارتے تھے یا یہ کہ وہ خود خدا تعالیٰ کے حضور عجز و انکسار سے دعا کیا کرتے تھے ؛

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ

اور دروئے زمین پر) کوئی ایسی بستی نہیں (ہوگی) جسے ہم قیامت کے دن سے پہلے ہلاک نہ کر دیں

الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ

یا اسے بہت سخت عذاب نہ دیں - یہ بات تقدیر

ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ○ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ

(الٰہی) میں (پہلے سے) لکھی ہوئی ہے ۵۵۹ اور پہلے لوگوں کی تکذیب

يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ خبر ہے اُولٰٓئِكَ کی۔ اور مطلب یہ ہے کہ انبیاء جن کی صفت یہ ہے کہ وُہ تبلیغ میں لگے رہتے ہیں یا یہ کہ دعاؤں میں لگے رہتے ہیں وُہ بھی باوجود اتقاء نیک اور عاشق الٰہی ہونے کے صرف اپنے رب کا قرب تلاش کرتے ہیں۔ دوسرے کسی وجود کو معبود بنا کر اس کا قرب تلاش نہیں کرتے۔

اَيُّهُمْ اَقْرَبُ - علامہ زمخشری کا قول ہے اور اکثر مفسرین نے اسی کی تائید کی ہے کہ اَیُّ موصولہ ہے اور اَیُّهُمْ اَقْرَبُ کے معنے مَنْ هُمْ اَقْرَبُ کے ہیں اور یہ جملہ يَبْتَغُوْنَ کی ضمیر فاعل کا بدل ہے۔ یعنی یہ قرب حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ جب زیادہ قرب والے لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے مزید قرب کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں تو جن کو قرب حاصل نہیں انکو تو بہت ہی زیادہ کوشش کرنی چاہیئے۔

خلاصہ یہ کہ خدا کا قرب ایسی چیز نہیں ہے۔ جو دوسروں کی پرستش کے ذریعہ سے حاصل ہو سکے۔ اور پھر جب بڑے سے بڑا نبی بھی خدا کے قرب کی تلاش میں ہے اور ابھی وہ قرب الٰہی میں ترقی کی جستجو کر رہا ہے تو وہ تمہارے لئے زعیم اور ٹھیکیدار کیسے بن سکتا ہے۔ فرمایا جو اقرب ترین نبی ہے وہ بھی ابھی اور قرب حاصل کرنا چاہتا ہے دوسرا تو الگ رہے۔ جب نبیوں تک کی یہ بات ہے تو تمہاری تو ہستی ہی کیا ہے۔

ایک اور معنے بھی آیت کے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اُولٰٓئِكَ کا اشارہ معبودین کی طرف سمجھا جائے اور يَدْعُوْنَ کا فاعل مشرکوں کو۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ معبود جن کو مشرک بلاتے ہیں۔ وہ تو اپنے رب کے قرب کی تلاش کر رہے ہیں اور اس کا خیال رکھتے ہیں کہ کون خدا تعالیٰ کا زیادہ مقرب ہوتا ہے۔ ان معنوں میں اَیُّ استفہامیہ سمجھا جائیگا اور اس کا عامل فعل محذوف۔ یا مصدر محذوف سمجھا جائیگا۔ جیسے يَحْرِصُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ یا یہ کہ بغیتهم اَيُّهُمْ اَقْرَبُ۔

مقربین کے اشتیاق قرب الٰہی میں دوسروں کے لئے سبق۔

۵۵۹ حل لغات

مَسْطُوْرًا: سَطَرَ سے مسطور اسم مفعول ہے۔ اور سَطَرَ الْكَاتِبُ کے معنے ہیں كَتَبَ۔ کاتب نے لکھا۔ (اقرب) پس مَسْطُوْر کے معنے ہوں گے لکھی ہوئی۔

تفسیر۔ پہلے فرمایا تھا کہ اپنے معبودوں کو پکار۔ وہ تمہاری تکلیف کو نہ تو دور کر سکتے ہیں اور نہ اسے ہٹا سکتے ہیں۔ اب اس کی ایک مثال بیان فرماتا ہے اور وہ یہ کہ ایک زمانہ ایسا آنیوالا ہے کہ دنیا کے پردہ پر مشرک قوموں کا غلبہ ہو جائے گا اور توحید قریباً مٹ جائے گی۔ اسوقت جب شرک اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا

نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَ

کے سوا ہمیں نشانات کے بھیجنے سے کسی امر نے نہیں روکا (کہ ایسے نشان بھیجنے سے کسلی تحلک سکتے تھے) اور (جب) ہم نے ثمود

اٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَ مَا

کو (صالح کی) اونٹنی ایک روشن نشان کے طور پر دی۔ تو انہوں نے اس پر ظلم (ہی) کیا۔ اور

نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا ۝ وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ

ہم نشانوں کو (بد انجام سے) ڈرانے کے لئے ہی بھیجا کرتے ہیں[۶۰] اور جب ہم نے تجھے کہا تھا۔ (کہ)

ہم ساری دنیا پر عذاب لائیں گے۔ کیونکہ شرک تمام دنیا پر غالب ہوگا۔ اس کو مٹانے کے لئے ساری دنیا کو عذاب میں مبتلا کرنا ہوگا۔ اس قسم ہمارے اس دعوے کی صداقت نہایت واضح ہو جائے گی کیونکہ اس پیشگوئی کے ماتحت ساری دنیا پر عذاب آئیگا۔ لوگ جھوٹے معبودوں کو پکاریں گے مگر کچھ نہ بنے گا۔ اس کی تفصیل آگے سورۂ کہف میں بیان ہوگی۔

جب شرک ساری دنیا میں پھیلے گا تو عذاب بھی ساری دنیا پر آئے گا۔

اس آیت میں مسلمانوں کو بھی اس دوسرے عذاب سے ہوشیار کیا گیا ہے جس سے بوجہ محمدیؐ سلسلہ اور موسوی سلسلہ میں مشابہت تامہ پائے جانے کے انہیں خطرہ ہو سکتا تھا۔

آسمانی معجزات کا سلسلہ کسی وقت بھی بند نہ ہوگا

۶۰ حل لغات۔ ظَلَمُوْا بِهَا: ظَلَمَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَلظُّلْمُ کے معنے ہیں۔ اَلتَّصَرُّفُ فِیْ مِلْكِ الْغَیْرِ وَ مُجَاوَزَةُ الْحَدِّ حد سے بڑھ جانا اور دوسرے کی ملکیت پر دست درازی کرنا۔ انہی معنوں کے پیش نظر لفظ ظلم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاتی۔ نیز اس کے معنے ہیں وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَوْضِعِهٖ کسی بات یا کام کو بیجا اور بے محل کرنا۔ وَ ظَلَمَ الْبَعِیْرَ ظُلْمًا اِذَا نَحَرَهٗ مِنْ غَیْرِ دَآءٍ۔ اور ظلم البعیر کے معنے ہیں کہ اونٹ کو بغیر کسی بیماری کے ذبح کر دیا۔ (تاج)

دلائل اس بارہ میں کہ نشانات ہمیشہ جاری رہیں گے

تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں بھی آسمانی معجزات کے متعلق یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اب ان کا سلسلہ بند ہوگیا ہے۔ یہ مسلمانوں کو نصیحت ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے لئے بھی خطرہ تھا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جائیں اور اس کے تازہ نشانات دیکھنے سے محروم ہو جائیں تو یہ سمجھنے لگیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانات کا آنا بند ہوگیا ہے۔ پس انہیں ہوشیار کر دیا گیا کہ ایسا کبھی خیال نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ نشانات دکھاتا رہتا ہے تاکہ اس کے بندوں کے ایمان تازہ ہوتے رہیں۔

نشانات کے ہمیشہ جاری رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل دلائل بیان کئے گئے ہیں :-

(۱) نشانات دکھانے کے خلاف صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان نشانوں سے پہلوں نے کیا فائدہ اٹھایا کہ اب اٹھائیں گے۔ فرماتا ہے کہ اگر یہ وجہ نشان بھیجنے کے خلاف ہوتی تو پہلے نبی کے بعد پھر کوئی نشان ہی ظاہر نہ ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ انبیاء کے دشمن نشانات کا انکار کرتے ہی چلے گئے ہیں اور ہم بھی نشانات بھیجتے چلے گئے ہیں پس کسی وقت بھی اس وجہ سے نشانات کا بھیجنا بند نہیں ہو سکتا۔ آدمؑ کے وقت میں بھی نشانات دکھائے گئے۔ نوحؑ کے وقت میں بھی نشان دکھائے گئے۔ اور پھر باوجود

رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ

تمہارا رب ضرور ان لوگوں کو ہلاک (کرنے کا فیصلہ) کر چکا ہے۔ (تب انہوں نے کیا فائدہ اٹھایا)

اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ

اور جو رؤیا ہم نے تجھے دکھائی تھی۔ (اسے بھی) اور اس درخت کو (بھی) جسے قرآن میں ملعون قرار دیا گیا

فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا

ہے۔ ہم نے لوگوں کے لئے صرف امتحان کا ذریعہ بنایا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ ہم انہیں ڈراتے (چلے جاتے) ہیں۔ پھر (بھی)

طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ع ۸

(ہمارا ڈرانا) انہیں ایک بہت بڑی سرکشی میں ہی بڑھا رہا ہے ۶۶ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو کہا تھا (کہ) تم آدم کیساتھ (ساتھ) سجدہ کرو

تکذیب ثمود کی قوم کو بھی نشان دکھائے گئے جو آدمؑ اور نوحؑ کے بعد گذری ہے۔

ثمود کی مثال اس لئے دی گئی ہے کہ ثمود عرب قوموں میں سے تھے اور ان کے مٹے ہوئے آثار عرب کے کفار یہود اور نصارٰی سب کے سامنے موجود تھے۔ اور تینوں قومیں ان کے حالات سے عبرت حاصل کر سکتی تھیں۔

اس کے بعد دوسری دلیل یہ دی کہ جب عذاب آئے اس سے پہلے نشانات کا بھیجنا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ جو لوگ عذاب سے بچ سکیں بچا لئے جائیں پس جب ہم یہ خبر دے رہے ہیں کہ آئندہ زمانہ میں شدید عذاب آئیں گے حتیٰ کہ دنیا کی کوئی بستی ان عذابوں سے محفوظ نہ رہیگی تو مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس وقت آسمانی نشانات بھی ضرور دکھائے جائیں گے کیونکہ بغیر تخویف کے عذاب کا بھیجنا ہماری سنت کے خلاف ہے۔

۶۱ حل لغات۔ اَحَاطَ بِالنَّاسِ: اَحَاطَ بِالْاَمْرِ کے معنے ہیں اَحْدَقَ بِهٖ مِنْ جَوَانِبِهٖ کسی امر پر پورے طور پر قابو پا لیا۔ اُحِيْطَ بِهٖ۔ دَنَا هَلَاكُهٗ اسکی ہلاکت قریب ہو گئی (اقرب) پس اِنَّ رَبَّكَ

اَحَاطَ بِالنَّاسِ کے معنے ہوں گے کہ (۱) تمہارا رب ان لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے۔ (۲) لوگ ہر رنگ میں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

فِتْنَةٌ: فَتَنَ سے مصدر ہے اور اس کے معنے فتنہ ہیں اَلْخِبْرَةُ وَالْاِبْتِلَاءُ۔ آزمائش اور امتحان اَلضَّلَالُ وَالْاِثْمُ وَالْكُفْرُ۔ گمراہی گناہ۔ کفر۔ اَلْفَضِيْحَةُ۔ رسوائی۔ ذلت۔ اَلْعَذَابُ عذاب۔ اَلْمَرَضُ۔ مرض۔ اَلْعِبْرَةُ عبرت۔ اِخْتِلَافُ النَّاسِ فِي الْاٰرَاءِ وَمَا يَقَعُ بَيْنَهُمْ مِنَ الْقِتَالِ۔ اختلاف آراء اور اس کی وجہ سے لڑائی جھگڑا۔ (اقرب)

عذاب سے پہلے نشانات کا بھیجنا ضروری ہوتا ہے

طُغْيَان: طَغٰى يَطْغٰى اور طَغِيَ يَطْغٰى کا مصدر طغیان ہے۔ اور طَغٰى کے معنے ہیں جَاوَزَ الْقَدْرَ وَالْحَدَّ۔ اندازہ اور حد سے بڑھ گیا۔ طَغٰى فُلَانٌ اَسْرَفَ فِي الْمَعَاصِيْ وَالظُّلْمِ گناہوں اور ظلم میں بڑھ جانا۔ (اقرب)۔

احاطہ بالناس

تفسیر۔ اَحَاطَ بِهٖ۔ کے معنے کسی چیز کا احاطہ کر لینے کے بھی ہوتے ہیں یعنی اس کے سب اجزاء کو قبضہ میں کر لیا جائے اور اس کے معنے عذاب کامل کے بھی ہوتے

ہیں۔ کیونکہ کسی قوم کا احاطہ کرلیا جاوے تو وہ بھاگ کر بچ نہیں سکتی اس جگہ اَحَاطَ کے معنے سب کو گھیر لینے یا ایک حلقہ میں لے آنے کے ہیں۔ فرماتا ہے کہ یاد کرو جب ہم نے تم کو کہا تھا کہ ہم سب دنیا کا احاطہ کرنے والے ہیں یا یہ کہ سب کو ایک حلقہ میں لانے والے ہیں۔

آنحضرتؐ کے سب انبیاء کو نماز پڑھانے کی تعبیر

شجرہ ملعونہ سے کیا مراد ہے

اس سے اشارہ اسی سورۃ کی پہلی آیت کیطرف ہے جسمیں اسراء والا کشف بیان کیا گیا ہے۔ اس کشف میں آپکو دکھایا گیا تھا کہ آپؐ نے سب نبیوں کو نماز پڑھائی ہے جس کی تعبیر یہ تھی کہ سب نبیوں کی امتیں آپکے دین میں داخل ہونگی۔ سو اَحَاطَ بِالنَّاسِ کہہ کر اس کشف کے مضمون کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے ذکر کا موقعہ یہ ہے کہ پہلی آیتوں میں بتایا گیا تھا کہ سب دنیا پر عذاب آنیوالا ہے اب اسکی وجہ بیان فرماتا ہے کہ اس عذاب کی وجہ یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس کشف کو پورا کرے جو اسراء کی صورت میں تجھے دکھایا گیا تھا اور اس پیشگوئی کو پورا کرے کہ سب انبیاء کی جماعتیں اسلام میں داخل ہو جائینگی۔ اس عالمگیر عذاب کے بعد تبلیغ اسلام کا راستہ کھل جائیگا اور سب اقوام کو مذہب کیطرف توجہ ہو جائیگی اور مادیت سے لوگ مایوس ہو جائیں گے تب اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور احسان سے ان کے دل سچائی کے قبول کرنیکے لئے کھولدیگا اور وہ محمد رسول اللہ صلعم کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے اس موعود عذاب کے آثار اس وقت دنیا میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اور اسکے بعد انشاء اللہ اسلام کے پھیلنے کے سامان بہت کثرت سے پیدا ہو جائیں گے۔

آیت کے اگلے حصہ میں اس مضمون کو واضح کر دیا گیا ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ یہ نظارہ جو ہم نے دکھایا تھا یہ لوگوں کے لئے امتحان کا ذریعہ تھا یعنی ہم پیشگوئی تو صاف لفظوں میں بھی کر سکتے تھے مگر ہم نے اس نظارہ کو تمثیلی زبان میں اس لئے بیان کیا۔ لوگوں کا امتحان بھی لے لیا جائے۔ جو ابوبکری صفات کے تھے انہوں نے اس نظارہ کا ذکر سنا اور ایمان لے آئے اور جن کے دل تقویٰ سے خالی تھے انہوں نے اس پر اعتراض کرنا شروع کر دیا۔

شجرہ ملعونہ ... ایک پہلو ... کا بھی ...

اس آیت سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نشان ایک پہلو امتحان کا بھی رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود آج مسلمان بھی اس خیال میں مبتلا ہیں

کہ پیشگوئیاں جبتک ایسے واضح الفاظ میں نہوں کہ احمق سے احمق بھی ان کا انکار نہ کرسکے انہیں سچا نہیں کہا جا سکتا۔

اَلشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ۔ فرمایا وہ رؤیا جو ہم نے تجھکو دکھائی ہے اسے بھی ہم نے لوگوں کیلئے فتنہ یعنی آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے اور اس شجرہ کو بھی ہم نے لوگوں کیلئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے جسکے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے کہ وہ ملعون ہے۔

یہ شجرہ ملعونہ کیا شے ہے؟ اس بارہ میں مفسرین میں بہت اختلاف ہوا ہے بعض کہتے ہیں اس سے مراد شجرۃ الزقوم ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں تین جگہ آیا ہے یعنی سورۂ واقعہ، سورۃ صافات اور سورۃ دخان میں۔ اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم میں جب یہ بیان ہوا کہ دوزخیوں کا کھانا زقوم ہے تو کفار نے اس پر ہنسی اڑائی۔ کیونکہ یمن کی لغت میں زقوم اس کھانے کو کہتے ہیں جو مکھن اور کھجور ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ کفار نے اس لفظ کو سن کر خوب شور مچایا کہ محمد صلعم ہمیں زقوم کی خبر دیتا ہے یہ تو اعلیٰ درجہ کا کھانا ہے۔ ہمیں اور کیا چاہیئے۔ ان معنوں کے حق میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شجرۃ زقوم کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ٥ (صافات ع ۲) ہم نے زقوم کو ظالموں کے لئے فتنہ کا موجب بنایا ہے۔ اور یہی الفاظ فتنہ کے شجرۂ ملعونہ کی نسبت آتے ہیں۔ مگر انہیں یہ مشکل پیش آئی ہے کہ قرآن میں اس کے ملعون ہونے کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کا جواب انہوں نے یوں دیا ہے۔ کہ زقوم کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے کہ وہ جہنم میں ہوگا۔ اور جو چیز جہنم میں ہو وہ ملعون ہے۔ کیونکہ جہنم خدا کے غضب کا مقام ہے۔ پھر اس توجیہہ پر خود ہی انہوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ شجرہ کیونکر ملعون ہو سکتا ہے۔ ملعون تو نافرمان وجود کہلا سکتا ہے اور شجرہ تو بے جان چیز ہے۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ چونکہ اس کے کھانے والے ملعون ہوگئے۔ اس لئے وہ شجرہ بھی ملعون کہلائیگا۔

بعض نے کہا ہے کہ شجرۂ ملعونہ سے مراد شجرۂ کشوث ہے۔ یعنی وہ بیل جو درختوں پر چڑھتی ہے تو درخت سوکھ

جاتا ہے۔ اکشوث افتیمون کے بیجوں کو کہتے ہیں۔ افتیمون ایک بیل ہوتی ہے جس کی باریک روشاخیں ہوتی ہیں جس درخت کے گرد لپٹ جائے۔ وہ درخت خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی جو قسم ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ اسے اکاس بیل یا امر بیل یا امرلتہ کہتے ہیں۔ پنجاب میں غالباً اسی کا نام کوڑی ویل ہے یعنی کڑوی بیل پنجابی میں ایک دعا ہے۔ "تو کوڑی ویل دی طرح ودھیں"۔ یعنی اکاس بیل کی طرح جو بہت جلد پھیل جاتی ہے۔ تیری ترقی ہو۔ اور جس کے تو مخالف ہو وہ تباہ ہو جائے۔ کیونکہ یہ بوٹی جس درخت سے لپٹ جاتی ہے۔ اسے خشک کر دیتی ہے) لیکن ان معنوں کا اتنا بھی ثبوت قرآن کریم سے نہیں ملتا جتنا ثبوت کہ شجرۂ زقوم کا ملتا ہے۔

بعض روایات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے۔ کہ آپؓ نے مروان بن الحکم سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے تیرے باپ اور دادا سے کہا کہ اِنَّکُمُ الشَّجَرَةُ الْمَلْعُوْنَةُ فِي الْقُرْاٰنِ۔ یعنی قرآن کریم میں جو شجرۂ ملعونہ کا لفظ آتا ہے اس سے مراد تمہارا خاندان ہے۔ بعض نے اس سے مراد وہ شجرۂ خبیثہ لیا ہے جس کا ذکر سورۂ ابراہیم ع۴ میں گذر چکا ہے۔ میں خود بھی اس وقت تک یہی معنے کرتا رہا ہوں۔ کیونکہ اس کے سوا باقی جسقدر معنے کئے گئے ہیں ان کا کوئی تعلق آیت قرآنی کے الفاظ سے نہیں معلوم ہوتا۔ میں اس کی تشریح یہ کیا کرتا ہوں کہ خبیث اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی خیر نہ ہو۔ اور جس چیز میں کوئی خیر نہ ہو اس کی نسبت قرآن کریم فرماتا ہے کہ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً۔ یعنی جو چیز جھاگ کی طرح بیکار ہو اسے پھینک دیا جاتا ہے۔ اور لعنت بھی دور کرنے کو کہتے ہیں۔ پس جس چیز کی نسبت يَذْهَبُ جُفَآءً کہا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اسے ملعون بھی کہہ سکتے ہیں۔

مگر اس وقت کہ میں یہ نوٹ لکھنے بیٹھا ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک اور معنے بھی سکھائے ہیں اور میں وہ معنے بھی لکھدیتا ہوں کیونکہ ان معنوں کا آیت کے سیاق وسباق سے زیادہ گہرا ربط معلوم ہوتا ہے۔ ان معنوں کو سمجھنے کے لئے پہلے شَجَرَة کے معنے سمجھ لینے چاہئیں۔ شَجَرَة کے معنے درخت کے بھی ہوتے ہیں اور شجرہ کے معنے خاندان یا قبیلہ کے بھی ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے شَجَرَةُ النَّسَبِ مَا يُبَيِّنُهُ فِيْهَا مِنَ الْجَدِّ الْاَعْلٰى اِلَى اَوْلَادِهٖ ثُمَّ اِلٰى اَوْلَادِهِمْ وَهَلُمَّ جَرًّا (اقرب) یعنے شجرۂ نسب اسے کہتے ہیں کہ کسی جدّ اعلیٰ سے لیکر اس کی اولاد اور پھر اسکی اولاد اور پھر انکی اولاد کا ذکر کیا جائے۔ ان معنوں کے رو سے شجرۂ ملعونہ کے معنے ایسے خاندان کے ہو سکتے ہیں جو کئی پشت تک خدائی لعنت کے ماتحت رہا ہو یا رہنے والا ہو۔ ان معنوں کی سند حضرت عائشہ رضؓ کیطرف منسوب ہونے والی اس روایت سے بھی ملجاتی ہے جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ یہ روایت تو میرے نزدیک غلط ہے لیکن اس سے ہم عربی کے محاورہ کی سند لے سکتے ہیں کیونکہ بہرحال راوی اور جامع حدیث عرب ہیں اور عربی کے محاورہ کو سمجھتے ہیں۔

اس تشریح کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ کیا قرآن کریم میں کسی خاندان کو ایک لمبے عرصہ تک خدائی لعنت کے نیچے آنے والا بتایا گیا ہے کہ نہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہی خاندان شجرۂ ملعونہ ہے۔

قرآن کریم کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قوم اور خاندان کے لوگ ایسے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ایک لمبے عرصہ کے لئے ملعون قرار دیا ہے۔ اور وہ حوالہ یہ ہے

بعض کے نزدیک شجرۂ ملعونہ سے مراد اکاس بیل۔

شجرۂ آنحضرتؐ نے مروان بن الحکم کے خاندان کو ان معنوں میں شجرۂ ملعونہ کہا

شجرۂ ملعونہ سے مراد وہ قوم ہے جس پر خدا کی لعنت ہوگی یعنی بنی اسرائیل۔

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ (مائدہ ع۱۱) بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم نے لعنت کی ہے۔ اسی طرح سورۃ نساء میں یہود کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ اے اہل کتاب محمد رسول اللہ پر اس دن سے پہلے ایمان لے آؤ کہ تمہاری قوم پر عذاب آ جائے یا ہم ان پر لعنت ڈالیں جس طرح کہ ان کے باپ دادوں پر سبت کے انکار کی وجہ سے لعنت نازل کی گئی تھی۔ اسی طرح یہود کی نسبت آتا ہے فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ (مائدہ ع۳) یعنی یہود سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ محمد رسول اللہ صلعم پر جب وہ ظاہر ہوں ایمان لائیں گے لیکن انہوں نے چونکہ اس عہد کو پورا نہیں کیا اس لئے ہم نے ان پر لعنت بھیجی ہے۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیت سے ہے

اسی طرح سورۃ مائدہ میں یہود کی نسبت آتا ہے مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَیْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِیْرَ (مائدہ ع۹) یعنی اے اہل کتاب تم تو وہ قوم ہو جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور غضب نازل کیا اور بندر اور سور بنا دیا۔ اس سے کچھ آیات آگے چل کر پھر آتا ہے وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا (ع۹) یعنی یہودی چندہ اور زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل پر تمسخر کر کے کہتے ہیں خدا انکو مال نہیں دیتا اسکے ہاتھ بند ہو گئے ہیں۔ ان کے اس گستاخانہ کلام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس قوم میں بخل پیدا ہو جائیگا اور مال کی محبت بڑھ جائیگی اور ان پر خدا تعالیٰ کی لعنت پڑتی رہیگی۔

آخری زمانہ کے مصائب کے بعد اسلام کی عالمگیر اشاعت

اس کے علاوہ اور متعدد مقامات پر یہود کے ملعون ہونے کا ذکر آتا ہے۔ پس بنی اسرائیل جو ایک نسل کے لوگ تھے ان پر متواتر لعنت پڑتی رہی اور قرآن کریم نے بھی انکی قوم پر لعنت ڈالی اور فرمایا کہ اس قوم کو صرف دو طرح امن ملیگا یا تو یہ دوسری زبردست قوموں کی پناہ میں چلی جائیگی یا پھر مسلمان ہو جائے۔ ان دونوں طریقوں کے سوا انکو کبھی امن نہ ملیگا۔ پس میرے نزدیک آیت زیر بحث میں شجرۂ ملعونہ سے مراد بنی اسرائیل کی قوم ہے اور چونکہ یہ سورۃ بھی خصوصاً سورۃ بنی اسرائیل کے متعلق ہے۔ حتیٰ کہ اس کا ایک نام رسول کریم صلعم نے سورۃ بنی اسرائیل بتایا ہے اور چونکہ اس آیت میں بنی اسرائیل ہی کا ذکر ہے کیونکہ

موجودہ اور سابقہ جنگ یہود کی چالوں کا نتیجہ ہے

اس آیت میں اسراء کا ذکر کیا گیا ہے جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپکو بنی اسرائیل کے مرکز میں دیکھا اور وہاں نماز پڑھائی۔ پس اسراء والی رؤیا کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا کہ یہ رؤیا بھی لوگوں کے امتحان کا ذریعہ ہے اور بنی اسرائیل جن کا اس رؤیا میں خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے وہ بھی ایک امتحان ہیں یعنی وہ ہمیشہ اسلام کی بلاوجہ مخالفت کرتے رہیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ یہود کو سب سے زیادہ امن اسلامی ممالک میں ملتا ہے اور پھر بھی یہ لوگ اسلام سے دشمنی ہی کرتے چلے جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان کے امن کا واحد ذریعہ اسلام ہی ہے ورنہ وہ دنیا کے ظلموں کا تختہ مشق ہی بنے رہیں گے۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہم تو اس قوم کو ان کا انجام بتا بتا کر ڈراتے ہیں لیکن یہ سرکشی میں اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔

اس آیت کا تعلق پہلی آیات سے یہ ہے کہ ان میں آخری زمانہ کے خطرناک عذاب کو بطور مثال پیش کیا گیا تھا۔ اب اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ عذاب اسراء والے کشف کا طبعی نتیجہ ہے کیونکہ اس عذاب سے اسلام کی ترقی وابستہ ہے اور اس کے بعد اسلام کی وسیع اور عالمگیر اشاعت مقدر ہے۔ اور ساتھ ہی یہود کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ یہ قوم بھی فتنہ ہے یعنی وہ دوسرا فتنہ اس فتنہ گر قوم کے ذریعہ سے پیدا ہوگا چنانچہ دیکھ لو کہ گذشتہ جنگ عظیم بھی یہود کی دخل اندازی کی وجہ سے ہوئی تھی اور موجودہ جنگ بھی انہی کی وجہ سے ہے۔ پہلی جنگ میں یہود نے منظم طور پر جرمن قوم کے خلاف کام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جرمنوں نے یہود پر ظلم کرنا شروع کیا اور بدلہ لیا۔ انہوں نے پھر ان کے خلاف پروپیگنڈا کیا اور موجودہ جنگ شروع ہوئی۔ روس کے انقلاب میں بھی کہ وہ اس عذاب کا ایک حصہ ہے یہود کا سب سے بڑا دخل ہے اور روس کے کئی بڑے بڑے لیڈر یہودی النسل ہیں۔

پہلی جنگ عظیم سے پہلے بعض اخبارات نے یہود کی بعض تحریرات شائع کی تھیں کہ یہود سازش کر رہے ہیں کہ ایک بڑی جنگ کرا کے فلسطین واپس لینے کے سامان پیدا کریں۔ آئندہ واقعات نے اس کی تصدیق کر دی مگر جیسا کہ قرآن کریم نے بتایا ہے یہود کا فلسطین میں آنا عارضی ہوگا ان کو یہ ملک دائمی طور پر نہیں مل سکتا کیونکہ دائمی طور پر تو یہ مسلمانوں کے لئے مقدر ہو چکا ہے ٭

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ

تو انہوں نے (تو اس حکم کے مطابق) سجدہ کیا۔ مگر ابلیس (نے نہ کیا)

طِيْنًا ۝ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ؗ

۶۲؎ اسنے کہا کہ کیا میں اسکے ساتھ سجدہ کروں جسے تونے کیچڑ سے پیدا کیا ہے (اور نیز) اسنے کہا کہ تو ہی مجھے) بتا (کہ کیا) یہ (میرا مطاع ہو سکتا)

لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ

ہے جسے تونے مجھ پر شرف دیدیا ہے۔ اگر تونے مجھے قیامت کے دن تک مہلت دی تو (مجھے تیری ہی ذات کی قسم ہے کہ) میں اسکی (تمام) اولاد کو

اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ

قابو میں کرونگا سوائے تھوڑے سے لوگوں کے (جنہیں تو بچالے) ۶۳؎ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا چل (دور ہو) کیونکہ (تیری اور) ان میں سے

۶۲؎ حل لغات۔ لِاٰدَمَ۔ ل جارہ کے بائیس معنے ہیں۔ ان میں سے ایک معنے مع کے ہیں چنانچہ ایک شاعر کا شعر ہے۔

فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا كَاَنِّيْ وَمَالِكًا
لِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَيْلَةً مَعًا

یہاں لطول میں ل کے معنے مع کے گئے ہیں (مغنی اللبیب) پس وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے معنے ہوں گے۔ کہ جب ہم نے فرشتوں کو کہا کہ تم آدم کے ساتھ سجدہ کرو۔ ابلیس کے معنے دیکھو حجر ۳۱؎

الطین: ۔ تراب و رمل و کلس یجبل بالماء ویطلی بہ۔ مٹی یا ریت اور چونہ جس میں پانی ملایا گیا ہو۔ اور اس کے ساتھ لپائی کی جائے (اقرب)

تفسیر۔ چونکہ پہلی آیات میں یہود کی سرکشیوں کا ذکر کیا تھا۔ اب اس پر روشنی ڈالنے کے لئے آدم کے واقعہ کو بطور تمثیل پیش کیا ہے کہ انبیاء کی مخالفت ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے۔ ابوالبشر آدم جو سب سے پہلے نبی تھا۔ اس کی بھی ایک ابلیس نے مخالفت کی اور کہا کہ یہ ہلائی ہے۔ میں اس سے اچھا ہوں۔ پھر اس کی اطاعت کیونکر کروں۔ یہی اعتراض یہود کے سامنے ہے۔ وہ بھی اپنے آپکو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ان کی قوم سے افضل سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہے کہ بنو اسحٰق سب ابراہیمی برکات کے وارث ہیں۔ اور بنو اسماعیل گویا محروم الارث کئے ہوئے ہیں۔ پس یہ تکبر ان کے راستہ میں روک بننے والا ہے۔

۶۳؎ حل لغات۔ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۔ کرّمہ (تکریما و تکرمۃ) کے معنے ہیں عظمہ و نزھہ۔ اسکو معزز و شرف دیا اور اس کو پاک ٹھیرایا (اقرب) پس هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ کے معنے ہوں گے کہ (کیا) یہ (میرا مطاع ہو سکتا) ہے جسے تونے مجھ پر شرف دیدیا۔ لَاَحْتَنِكَنَّ۔ احتنک سے مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہے اور احتنک الفرس کے معنے ہیں جعل الرسن فی فیہ۔ گھوڑے کے منہ میں لگام دیا۔ اور اسکو قابو میں کرلیا) احتنکہ۔ استولی علیہ۔ اس پر غالب آگیا۔ اس پر قابو پالیا۔ احتنک زیدًا اخذ مالہ کلہ۔ زید کا سارا مال لے لیا۔ احتنک الجراد الارض کے معنے ہیں اکل ما علیھا واتی علی

جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ○ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ

جو بھی تیری پیروی کریں تو جہنم یقیناً تمہاری (اور ان کی) سب کی جزاء (ہے) پورا پورا بدلہ ہے۔ اور (ہم نے کہا جا) ان میں سے

اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ

جس پر تیرا بس چلے۔ اُسے اپنی آواز سے فریب دیکر (اپنی طرف) بُلا۔ اور اپنے سواروں اور پیادوں کو ان پر چڑھا لا۔ اور

وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ

(ان کے) مالوں اور اولادوں میں ان کا حصہ دار بن۔ اور ان سے (جھوٹے) وعدے کر (اور پھر اپنی کوششوں کا نتیجہ دیکھ)

نبا تہ: ٹڈیوں نے زمین کی سب چیزوں کو ختم کر دیا (اقرب)

پس لاحتنکن کے معنے ہوں گے کہ میں ضرور ان پر قابو پا لوں گا۔

تفسیر۔ یعنی شیطان نے زبان حال سے مطالبہ کیا کہ مجھے اس وقت تک موقعہ مل جائے جو انکی ترقی کے لئے مقدر ہے۔ تو میں ان کے مُنہ میں لگام دیکر جدھر چاہونگا لئے پھرونگا (آدم اور شیطان کے واقعہ کیلئے دیکھو سُورۃ حِجر) اس آیت میں قیامت سے مراد مومنوں کی ترقی کا وقت ہے کیونکہ اسوقت کافروں کی قیامت بذریعہ تباہی کے۔ اور مومنوں کی قیامت بذریعہ کامیابی کے آجاتی ہے۔

اِلَّا قَلِيْلًا کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ تھوڑے سے آدمی میرے تصرف سے بچیں گے۔ اور یہ بھی کہ ان کے اعمال اکثر میری فرمانبرداری میں ہوں گے۔ تھوڑے اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں گے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیطان نے ایک دعویٰ کیا اور اُسے پُورا کر دکھایا۔ اسنے کہا تھا لاحتنکن ذُرِّيَّتَهٗ چنانچہ دنیا میں بدی بہت ہے اور نیکی کم۔ اس کے مقابل خدا تعالیٰ نے ایک دعویٰ کیا مگر اس کو پورا نہ کر سکا۔ اس نے فرمایا تھا۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ مگر اکثر انسان خدا کے بندے نہیں شیطان کے بندے ہیں۔

یہ اعتراض قلت تدبّر کا نتیجہ ہے کیونکہ حقیقتاً بدی نیکی کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔ بڑے سے بڑے جھوٹ بولنے والے کو ہی لے لو۔ اس کی ساری عمر کے کلام کو جمع کرو تو ضرور اس کے سچ زیادہ ہونگے اور جھوٹ بہت تھوڑے۔ یہی حال دُوسری بدیوں کا ہے۔ دنیا میں اکثر انسان نیک نیت ہیں اور اپنی طرف سے نیکی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گو بعض حالات میں جذبات سے دب بھی جاتے ہوں۔ پس یہ غلط ہے کہ شیطان کامیاب ہو گیا میں تو کہتا ہوں کہ تھوڑی سی بدی کا زیادہ مشہور ہو جانا یہ بھی شیطان کی ناکامی کا ثبوت ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فطرت نیک ہے اور وہ تھوڑے سے گناہ کی بھی برداشت نہیں کرسکتی۔

۶۴ حل لغات۔ موفورًا۔ وَفَرَ (يَفِرُ) سے اسم مفعول ہے اور اس کے معنے ہیں الشئُ التام مکمل چیز جَزَاءٌ مَوْفُوْرٌ۔ لم ينقص منه شئٌ پورا پورا بدلہ (اقرب)

تفسیر۔ شئٌ موفورٌ: پوری چیز اور وہ چیز جسمیں کسی قسم کی کمی نہ ہو۔ یعنی ہر ایک کے لئے اس مقام میں جزاء تام ہوگی۔ یہ مراد نہیں کہ سزا کم نہ ہوگی۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ سزا ایسی چیز ہے کہ انسان اسکی نسبت یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اور چاہیئے۔ پس ہر شخص جہنم میں اپنی سزا میں مشغول ہوگا اور طرف توجہ نہ ہوسکیگی ورنہ جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے،

وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِيْ

اور شیطان جو وعدے بھی کرتا ہے فریب کی نیت سے ہی کرتا ہے۔ ۹۶۵ جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا

اللہ تعالیٰ سزا کے معاملہ میں ہمیشہ عفو اور رحمت کو مدِّنظر رکھتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سزا قلبی ہوگی اور ہر ایک اپنے اپنے قلب کی کیفیت کے مطابق سزا پائیگا جیسے درخت زمین سے اپنی حالت کے مطابق غذا حاصل کرلیتا ہے۔ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ دو انسانوں کے دل بھی پوری طرح مشابہ نہیں حالانکہ کروڑہا انسان پیدا ہوئے اور ہوں گے۔ مگر ہر ایک کے دل کی کیفیت وحالت الگ الگ ہے۔ اسی طرح ہر اک کی سزا بھی الگ الگ ہونی ضروری ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ سزا قلبی ہو۔ اور ہر اک اپنے اعمال کے طبعی نتائج کو بھگتے۔

۹۶۵ حل لغات ۔ اِسْتَفْزِزْ :- اِستفزّ سے امر کا صیغہ ہے۔ اور استفزہ (الخوفُ) کے معنے ہیں۔ اِستخفّہٗ خوف نے اسے حواس باختہ کردیا۔ استدعاہ اسے بلند آواز سے بلایا۔ اخرجہ من دارہ۔ اس کو گھر سے نکال دیا۔ ازعجہٗ اسے بنیاد سے اکھیڑ دیا۔.... ویقال ختلہٗ حتی القاہ فی مھلکۃ ۔ بعض کہتے ہیں کہ استفز کے معنے کسی کو دھوکا دے کر ہلاکت میں ڈالنے کے ہیں۔ قتلہ۔ نیز اس کے معنے ہیں اس کو قتل کردیا (اقرب)

وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ :- اَجْلَبَ سے امر کا صیغہ ہے اور اجلب القوم کے معنے ہیں اِختلطت اصواتھم وضجّوا۔ لوگوں کی آوازیں مختلط ہوگئیں اور انہوں نے شور برپا کیا۔ تجمعوا من کل وجہ للحرب۔ ہر طرف سے لڑائی کے لئے جمع ہوگئے۔ وفی القرآن واجلب علیھم بخیلک ورجلک ای صِحْ۔ اور قرآن مجید کی آیت واجلب علیھم میں اجلب کے معنے آواز بلند کرنے کے ہیں (اقرب)

الخیل :- جماعۃ الافراس۔ گھوڑوں کی جماعت۔ اس کا مفرد نہیں آتا۔ والفرسان علی المجاز ای رکاب الخیل اور خیل بولکر سوار مراد لینے مجازی معنے ہیں ومنہ فی القرآن واجلب علیھم بخیلک ورجلک ای بفرسانک ومشاتک اور آیت واجلب علیھم میں خیل سے مراد سوار اور رَجِل سے مراد پیدل چلنے والے کے ہیں (اقرب) رَجِلٌ ۔ رَاجِلٌ کی جمع ہے اور راجل اس شخص کے لئے بولتے ہیں جس کے پاس سواری نہ ہو (اقرب)

تفسیر ۔ استفزز کے معنے ہیں اپنی جگہ سے ہٹالے اس سے معلوم ہوا کہ انسان پہلے نیکی کے مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔ پھر اگر اس پر شیطان کا اثر ہوجائے۔ تو اپنے اصل مقام کو چھوڑ کر بدی کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس بارہ میں عیسائی تعلیم اور اسلام کی تعلیم میں کتنا بڑا فرق ہے۔ عیسائیت تو کہتی ہے کہ انسان کی فطرت میں بدی اصل ہے۔ اور کفارہ کے ذریعہ اُسے بدی کے مقام سے ہٹاکر نیکی کی طرف لایا گیا ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ اصل مقام نیکی ہے۔ مگر شیطان اس سے ہٹا کر لے جاتا ہے۔

بصوتک میں اس طرف اشارہ ہے کہ بعض طبائع اس قدر کمزور ہوتی ہیں کہ وہ صرف دھمکیاں سنکر ہی ڈر جاتی ہیں یا اعتراض سنکر ہی شک میں پڑ جاتی ہیں۔ انہیں مقابلہ کی جرأت نہیں ہوتی اور نہ تحقیق کی ہمت۔

اس آیت میں شیطانی حملوں کی اقسام بیان فرمائی ہیں۔ بعض کو وہ دھمکاکر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی شیطانی لوگ غرباء اور بیکس لوگوں کو ڈرا ڈرا کر نبیوں کے ساتھ شامل ہونے سے روکتے ہیں۔ بعض کو سواروں اور پیادوں کے ذریعے سے نیکی سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یعنی انہیں قسم قسم کے دُکھ دیئے

استفزز

اسلام کے نزدیک فطرت نیکی ہے

الخیل

لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ○

ہرگز کچھ تسلط نہیں (ہو سکتا)، اور (اے میرے بندے) تیرا رب کارساز ہوکر (تیرے لئے) کافی ہے۔ ٦٥

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا

(اور اے میرے بندو) تمہارا رب وہ (کریم ذات) ہے۔ جو تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں چلاتا ہے۔ تاکہ

مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ○ وَاِذَا مَسَّكُمُ

تم اس کے فضل کو ڈھونڈو۔ وہ یقیناً تم پر بار بار رحم کرنے والا ہے۔ ٦٦ اور جب سمندر میں

جاتے ہیں۔ اور بعض کو بد رسوم اور صحبت کے ذریعہ سے تباہ کیا جاتا ہے۔ اور بعض کو مال اور دولت کی لالچ دیکر حق کے ماننے سے روکا جاتا ہے۔ مگر جن کے دل میں ایمان ہوتا ہے وہ ان باتوں سے قابو میں نہیں آتے، وہی لوگ متاثر ہوتے ہیں جن کے دل میں مرض ہوتی ہے۔

شیطانی حملوں سے بچنے کا گُر

یہ جو فرمایا ہے شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ اس کا یہ مطلب ہے کہ شیطانی لوگ انبیاء کے خلاف جتھے بھی بناتے ہیں اور اپنے مالوں اور اولاد کو جمع کرکے متفقہ طور پر نبیوں پر حملہ کرتے ہیں۔ گویا اپنی سب طاقتوں کو جمع کر لیتے ہیں۔

یزجی

انبیاء کے خلاف کفار کی چالوں کی اقسام

ان اقسام پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ کفار تین قسم کی چالیں انبیاء کے خلاف چلتے ہیں۔ جو لوگ کمزور ہوں۔ ان کے لئے ڈرانے اور تکلیف دینے کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ جو برابر والے ہوں، اُن سے جتھہ بازی کے اصول پر اتحاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جو طاقتور ہوں انہیں غنائم کے وعدے دیکر یا لیڈری کی امیدیں دلا کر پھنساتے ہیں۔ نبیوں کے مقابلہ پر ان تینوں گروہوں کو ان تینوں طریق سے پھنسانے کی مثالیں اسقدر کثرت اور تواتر سے ملتی ہیں کہ اس کے متعلق مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

٦٥ **تفسیر** - اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے۔ اس پر شیطان کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا کیونکہ شیطان کو صرف یوم قیامت تک کی مہلت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جب تک انسان روحانیت میں کمزور ہو۔ شیطان کے حملے سے دبتا ہے۔ جب اس میں رُوحانی طاقت پیدا ہو جائے اس میں دلیری آجاتی ہے۔ اور وُہ دھمکیوں، تکلیفوں اور لالچوں سے نہیں ڈرتا۔

دوسرے اس آیت میں شیطانی حملوں سے بچنے کا گُر بھی بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کا عبد بن جائے یعنی اپنے آپکو اس کے سپرد کردے اور اپنی طاقتوں کی بجائے اسپر توکّل کرے۔ جس کا خدا تعالیٰ وکیل ہو جائے شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

٦٦ **حل لغات** - یُزْجِیْ :- ازجی سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ازجاہ (ازجاءً) کے معنی ہیں زجاہ یعنی اس کو چلایا اور آہستگی سے آگے کیا ومنه فی القرآن ربکم الذی یزجی لکم الفلک ۔ ای یجریه ویسوقه اور آیت یزجی الفلک الخ میں یزجی کے معنے چلانے کے ہیں (اقرب) پس ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر کے معنے ہوئے۔ تمہارا رب وہ ہے جو تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں چلاتا ہے۔

تفسیر - اس میں بتایا ہے کہ حقیقی انعامات تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں۔ مگر لوگ ان کی قدر نہیں کرتے خشکی پر تو

الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا

(طغیانی پیدا ہونے کی وجہ سے) تمہیں تکلیف پہنچے۔ تو اس کے سوا (دوسرے دیوتا) جن کو تم پکارتے ہو (تمہارے ذہنوں سے)

نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ

غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی پر لاتا ہے۔ تو تم (اس کی طرف سے) اعراض کر لیتے ہو۔ اور انسان بہت ہی

كَفُوْرًا ۝ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ

ناشکر گذار ہے۔ ۶۶۵ تو کیا تم اس بات سے بے خوف (اور محفوظ) ہو کہ وہ تمہیں خشکی کے کنارہ پر ہی زمین میں

اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ

دھنسا دے یا تم پر سنگریزے نازل کرے۔ (اور) پھر تم اپنا کوئی کارساز (اور چارہ گر)

وَكِيْلًا ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى

نہ پاؤ۔ ۶۶۹ یا تم اس بات سے بے خوف ہو کہ وہ تمہیں (پھر) دوسری بار اس (یعنی سمندر) میں

سامان ہیں ہی سمندر میں کشتیاں بنا کر اسنے باہمی تعلقات کو وسیع کر دیا ہے۔ ورنہ جزائر میں بسنے والے لوگ براعظموں کے لوگوں سے اور براعظموں کے لوگ جزائر والوں سے غافل رہتے۔

میرے نزدیک یہ مثال اس جگہ اس امر کیطرف اشارہ کرنے کیلئے دی ہے کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے اور سب دنیا میں پھیلیگا۔ اور یہ امر چونکہ جہازوں کیساتھ وابستہ ہے جن کے بغیر سمندروں کا سفر طے نہیں کیا جا سکتا۔ اسلئے اس جگہ خصوصاً سمندر اور جہازوں کی نعمت کا ذکر فرمایا کہ یہ نعمت مسلمانوں کو خاص طور پر ملنے والی ہے۔ چنانچہ مسلمان گو آجکل جہازرانی میں کمزور ہیں لیکن ایک زمانہ ایسا تھا کہ سب دنیا میں مسلمانوں کے جہاز چلتے تھے، بحری نقشے اور راستے سب مسلمانوں کے تیار کئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی طرف یورپ کے لوگوں کا بحری سفر بھی ایک عرب مسلمان کا ممنون احسان ہے۔ جو بھٹکتے ہوئے پرتگیزی جہازوں کو افریقہ کے اوپر سے لا کر ہندوستان تک پہنچا گیا۔

۶۶۸ تفسیر واذا مسّکم الضر۔ الآیۃ اور اگر سمندر میں کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے تو سارے معبودانِ باطلہ تمہیں بھول جاتے ہیں۔ صرف اسوقت خدا تعالیٰ ہی یاد آتا ہے مگر جب تم کو نجات دیکر خشکی پر پہنچاتا ہے۔ تو پھر اعراض کرنے لگ جاتے ہو۔ یعنی انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ہمیشہ اپنی حالت کو بھول جاتا ہے۔ جب مصیبت میں ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ اگر اس سے نجات پا جاؤنگا تو ضرور نیکی کرونگا۔ مگر جب وہ تکلیف کی حالت گذر جاتی ہے تو پھر سب قول و قرار بھول جاتا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو ہوشیار کیا ہے کہ کفار کے طریق کو اختیار نہ کرنا اور ترقی کے زمانہ میں بھی خدا تعالیٰ کو یاد رکھنا تا مصیبت کے وقت وہ تمہاری مدد کا خیال رکھے۔

مصیبت میں خدا کا خیال آنا ضروری ہے

سمندر کی حالت دیکر مسلمانوں کو جہازرانی کی طرف توجہ دلائی۔

۶۶۹ حل لغات۔ یَخْسِفُ: خسف سے مضارع ہے۔ اور اس کے لئے دیکھو حل لغات ۶۶ حاصبًا: حَصَبَ سے اسم فاعل ہے اور حَصَبَہٗ (یحصب) کے معنے ہیں رماہ بالحصباء: اس کو کنکر مارا۔ حاصب کے معنے ہیں ریحٌ شدیدۃٌ

یخسف

حاصبًا

فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ

لوٹا لائے۔ اور تم پر ایک تند ہوا چھوڑ دے۔ اور تمہارے کفر کی وجہ سے تمہیں غرق

بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ○

کر دے۔ (اور) پھر اس (عذاب) پر تم ہمارے خلاف اپنا کوئی مددگار نہ پاؤ ۷۰

تحمل التراب والحصباء سخت ہوا جو مٹی اور کنکر اٹھا کر پھینکے۔ وقیل ہوما تناثر من دقاق الثلج والبرد۔ بعض کہتے ہیں۔ وہ اولے جو ہوا کے ساتھ گرتے ہیں۔ السحاب لانہ یرمی بالثلج والبرد بادل کیونکہ وہ بھی اولے برساتے ہیں۔ (اقرب)

قاصف

تفسیر۔ فرماتا ہے خشکی میں دلیر ہوتے ہو مگر کیا خدا تعالیٰ تم پر خشکی میں عذاب نہیں بھیج سکتا۔ کیا وہ تم کو زمین میں غائب نہیں کر سکتا، یا پتھروں کا مینہ تم پر نہیں برسا سکتا۔ پھر سمندر اور خشکی میں فرق کرنے سے تم کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہو۔

جنگ بدر کی پیشگوئی۔ تبیعًا

میرے نزدیک اس آیت میں جنگ بدر کی پیشگوئی ہے۔ جنگ بدر کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مٹھی میں کنکر پکڑ کر پھینکے تھے۔ اسی وقت ایک تیز ہوا چل پڑی جسکے ساتھ کنکر اڑ اڑ کر کفار کی آنکھوں میں پڑنے لگے۔ نیز چونکہ کفار کے سامنے کیطرف سے ہوا آتی تھی۔ کفار کے تیروں کا زور اس ہوا کی وجہ سے کم ہو جاتا تھا۔ اور مسلمانوں کے تیروں کا زور بوجہ باد موافق کے بڑھ جاتا تھا۔ عرب کے بسنے والے کیا مسلمان، کیا یہودی، کیا مسیحی سمندر سے سخت ڈرتے تھے۔ اسلئے سمندر کی مثال سے انہیں سمجھایا ہے کہ سمندر میں جاتے ہو تو ذرا سے طوفان سے گھبرا جاتے ہو کہ شائد بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب آنے لگا ہے لیکن خشکی پر دلیر ہوتے ہو۔ مگر یاد رکھو ہم تم کو خشکی میں تباہ کر دیں گے۔

فتح مکہ کی پیشگوئی

اس جگہ مسلمانوں کو سمندری سفروں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ جب خشکی تری دونوں میں خطرات ہیں تو تم اس حماقت میں مبتلا نہ ہونا کہ خشکی پر بیٹھے رہو، اور سمندر کے سفر کو نظر انداز کر دو۔

۷۰ حل لغات۔ قاصفًا:۔ قَصَفَ (یقصف) سے اسم فاعل ہے۔ اور قصف الشیء کے معنے ہیں۔ کسرہ فانکسر کسی چیز و توڑا تو وہ ٹوٹ گئی۔ قصف الرَّعْدُ: اشتد صوتہ بجلی کی کڑک کی آواز سخت ہوگئی اور رَعْدٌ قاصِفٌ کے معنے ہیں ای صیّتٌ خوب گرجنے والی بجلی۔ ریحٌ قاصفٌ ای شدیدۃ تکسر مامرت بہ من الشجر وغیرہ اور ریح قاصف اس ہوا کو کہینگے کہ جس درخت یا اور کسی چیز پر وہ گزرے تو اس کو توڑ دے۔ (اقرب)

تَبِیْعًا:۔ التبیع کے معنے ہیں الناصر مددگار۔ التابع۔ تابع (اقرب)

تفسیر۔ ان یعیدکم فیہ تارۃ اخرٰی۔ اس میں میرے نزدیک فتح مکہ کے وقت کی خبر دی ہے۔ اسوقت بہت سے کفار مکہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اور کشتیوں میں سوار ہو کر یمن یا حبشہ کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ مگر سمندر میں طوفان آ گیا۔ اور بہت سے غرق ہو گئے۔ عکرمہ بن ابی جہل بھی بھاگنے والوں میں سے تھے۔ مگر ان کو جہاز نہ ملا اور پیچھے رہ گئے۔ اتنے میں ان کی بیوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے لئے معافی حاصل کر لی۔ اور ساحل پر جا کر واپس لے آئی۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

اور ہم نے بنی آدم کو (بہت) شرف بخشا ہے۔ اور ان (کو اور ان کے سامانوں) کو خشکی اور تری میں اٹھایا ہے۔ اور انہیں

وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ

پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا ہے۔ اور جن (اقسام کی مخلوقات) کو ہم نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے بہتوں پر ہم نے

مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ ع

انہیں بڑی فضیلت دی ہے۔ ۱۷۱ اور (اس دن کو بھی یاد کرو) جس دن ہم ہر ایک گروہ کو

بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ

ان کے پیشوا سمیت بلائیں گے۔ پھر جن کے دائیں ہاتھ میں ان (کے اعمال) کی کتاب دی جائے گی۔

۱۷۱ تفسیر۔ اس میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو عزت بخشی ہے۔ نہ کہ خاص اقوام کو پس قوموں کو ایک دوسرے پر تفاخر نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے یہود اور قریش کو نصیحت کی ہے جو اپنے آپکو دوسروں سے معزز سمجھتے تھے۔ اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اک قوم کو عزت دی ہے۔ مگر بعض اقوام اس عزت سے فائدہ نہیں اٹھاتیں اور خدا تعالیٰ کے کھولے ہوئے راستوں کو اپنے لئے بند کرلیتی ہیں۔ وحملنا ھم فی البحر کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ سمندر اور خشکی کو یکساں طور پر اللہ تعالیٰ نے انسانی ترقی کے لئے مقرر کیا ہے۔ پس اگر کوئی قوم عزت حاصل کرنا چاہے تو اسے یکساں طور پر دونوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بنایا ہوا ہے۔ کیا یہ باتیں جو اس جگہ بیان ہوئی ہیں۔ ایک عرب کے رہنے والے کے منہ سے نکل سکتی ہیں۔ خصوصاً اس کے منہ سے جس نے کبھی کشتی میں سفر تک نہیں کیا۔

افسوس کہ مسلمانوں نے چند گذشتہ صدیوں سے اس نصیحت کو بھلا دیا۔ اور ان کی طاقت کمزور ہو گئی۔ اگر وہ سمندری بیڑوں کا خیال رکھتے تو اسلام کبھی اس قدر کمزور نہ ہوتا جس قدر کہ اب ہے۔

قوموں کو ایک دوسرے پر تفاخر نہیں کرنا چاہیئے۔ ۱۷۱

فضلنا ھم علیٰ کثیرٍ ممن خلقنا سے بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ انسان بعض قسم کی مخلوق سے افضل ہے۔ سب قسم کی مخلوق سے نہیں۔ مگر یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس جگہ بنی آدم کا ذکر بہ حیثیت جماعت ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ سب انسان تو سب مخلوق سے افضل نہیں ہیں انسانوں میں سے بعض تو نہایت گندے ہیں اور جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ بعض معمولی بھلے مانس ہیں۔ اور جانوروں سے اچھے ہیں۔ بعض بہت اچھے ہیں۔ اور عام فرشتوں سے بھی اچھے ہیں۔ بعض اعلیٰ مقام پر ہیں اور اعلیٰ فرشتوں سے بھی اعلیٰ ہیں۔ غرض سب انسان سب مخلوق سے افضل نہیں۔ بلکہ بعض انسان سب مخلوقات سے اچھے ہیں۔ اور انسان بحیثیت انسان کے اکثر مخلوق سے اچھا ہے۔ کیونکہ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ گھوڑے بیل۔ اونٹ بکریاں۔ کاؤ دم من سب ہی کے کام کررہی ہیں اور

سمندر اور خشکی یکساں طرف پر انسانی ترقی کے لیے مقدر ہے ۱۷۱

يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ وَمَنْ

وہ (بڑے شوق سے) اپنی کتاب کو پڑھیں گے ۔ اور ان پر ذرہ بھر (بھی) ظلم نہیں کیا جائیگا ۔ ۷۵ اور جو اس (دنیا)

سب ہی کی خدمت پر لگائی گئی ہیں۔پس انسان بلحاظ جنس کے اکثر مخلوق سے افضل ہے ۔ اور انسان بلحاظ کامل فرد کے سب مخلوق سے افضل ہے ۔

۷۵ حل لغات ۔ فتیلاً :۔ الفتیل ۔ المفتول بٹی ہوئی چیز ۔ حبل دقیق من خزمر او لیف کھجور کے پتوں کی باریک بٹی ہوئی رسی ۔ السحاة التی فی شق النواة گٹھلی کے شگاف کا پردہ ۔ ما فتلته بین اصابعك من الوسخ ۔ وہ قلیل سی میل جو ہاتھوں کے درمیان بٹی جائے (اقرب) آیت کا مطلب یہ ہے ۔ کہ ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائیگا

تفسیر ۔ مفسرین نے بامامهم کے معنے کتابهم کے لئے ہیں ۔ یعنی ہر ایک کو اس کے نامۂ اعمال کے ساتھ بلایا جائیگا ۔ مگر ہم کہتے ہیں ۔ جب ہر امت میں امام گذرا ہے تو پھر امام کے لفظ کے وہی معروف معنے کرنے چاہئیں جن معنوں میں یہ لفظ اکثر استعمال ہوتا ہے ۔ اور آیت کا مفہوم یہی ہے کہ ہر قوم کو اس کے نبی کے نام سے بلایا جائیگا کہ فلاں نبی کی قوم آئے ۔ فلاں فلاں کی امت آئے ۔ کیونکہ انہیں شہادت دینی ہوگی کہ ہم نے تبلیغ وغیرہ کردی ۔ جیسے قرآن کی دوسری جگہ سے ثابت ہوتا ہے اور حدیثوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ نبی کے نام سے بلایا جائیگا ۔

قیامت کے دن ہر ایک امت کو اپنے امام کے ساتھ بلائے جانے کا مطلب

فمن اوتی کتابه بیمینه ۔ اس میں کتابه سے مراد اعمال نامہ ہے ۔ جیسے دوسری جگہ بھی فرمایا ۔ یالیتنی لم اوت کتابیه ولم ادر ما حسابیه (الحاقہ ع ۱) یعنی کاش مجھے میری کتاب نہ دیجاتی اور مجھے یہ علوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے ۔

دائیں ہاتھ میں کتاب دیئے جانے میں حکمت

دائیں ہاتھ کو اسلام نے برکت کا نشان قرار دیا ہے اور بائیں کو سزا کا نشان ۔ انسانی خلقت میں بھی دائیں کو بائیں پر فوقیت معلوم ہوتی ہے ۔ کیونکہ دائیں طرف کے اعضاء میں بالعموم کام کی طاقت زیادہ ہوتی ہے ۔ پس دائیں ہاتھ میں حساب کی نقل دینے سے یہ مراد ہے کہ ایسے لوگوں کا حساب بابرکت ہوگا ۔

دائیں ہاتھ کے استعمال کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی شہادت یا الاجماع موجود ہے یہ کوئی مذہبی حکم نہیں کہ اسے مصنوعی فعل سمجھا جائے ۔ بلکہ ہر مذہب و ملت کے آدمی مہذب یا غیر مہذب دائیں ہاتھ کا استعمال خاص طور پر کرتے چلے آئے ہیں ۔ ایشیاء کے لوگ ہوں یا یورپ کے یا افریقہ کے یا امریکہ کے جاہل ہوں یا تعلیم یافتہ کسی مذہب کے پابند ہوں یا ہر مذہب سے آزاد ۔ سب ہی آدمی جو بیمار نہیں یا کسی غیر طبعی اثر کے نیچے نہیں ۔ دائیں ہاتھ سے کام کرتے ہیں ۔ اسی طرح تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ دائیں آنکھ بائیں سے بالعموم زیادہ مضبوط ہوتی ہے ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عادت کی وجہ سے دائیں کو انسان ترجیح دیتا ہے ۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ عادت کیوں پڑی ۔ شروع میں انسان کو اس عادت کے ڈالنے پر کس نے مجبور کیا ۔ آخر پہلے انسانوں نے طبعاً دائیں ہاتھ سے کام لینا شروع کیا تو تبھی آئندہ نسلوں کو عادت پڑی ۔ پھر کیوں نہ کہا جائے کہ جس طرح ابتدائی انسانوں کو طبعی تقاضے کے تحت دائیں ہاتھ سے کام کرنے کا خیال پیدا ہوا ۔ اسی طرح آئندہ نسلوں کو ہوا ۔

بعض ڈاکٹر دائیں ہاتھ کے استعمال کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ دل بائیں طرف ہے بائیں طرف کے حصۂ دماغ کی طرف خون نسبتاً زیادہ جاتا ہے ۔ اور وہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے ۔ اور چونکہ دائیں طرف کا دماغ بائیں طرف کے اعصاب سے کام لیتا ہے ۔ اور بائیں طرف کا دماغ دائیں طرف کے اعصاب سے ۔ پس بائیں طرف کے دماغ کی زیادتی

كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى

میں اندھا رہیگا۔ وہ آخرت میں (بھی) اندھا (ہوگا) اور (اسی طرح وہ) اپنے (طریق میں سب سے

کی وجہ سے دائیں طرف کے اعصاب مضبوط ہوتے ہیں اور اس وجہ سے انسان دائیں طرف کے اعضاء سے کام لینے کی طرف طبعاً راغب ہوتا ہے۔ یہ توجیہہ درست ہو یا غلط ہمیں اس سے تعلق نہیں۔ ہمیں تو بس اتنی بات سے تعلق ہے کہ دائیں کو بائیں پر سب دُنیا ترجیح دیتی آئی ہے۔ اور دائیں بازو سے کام لینا ایک طبعی تقاضا ہے۔

دائیں بائیں کے فرق کے متعلق ایک اور عجیب بات بھی قابل غور ہے۔ علم اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح الدماغ لوگوں میں سے صرف چار سے آٹھ فیصدی تک بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے لوگ ہیں۔ باقی سب دائیں ہاتھ سے کام لیتے ہیں۔ لیکن مجنونوں میں یہ نسبت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ قانون قدرت نے دائیں کو بائیں پر فضیلت دی ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا جلد گیارہ زیر لفظ ہینڈ ڈنس)

اُوپر کے حوالہ جات سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ دایاں ہاتھ کام کرنے کے لئے زیادہ موزون ہے اور اکثر افراد عالم اسی ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ پس دایاں بازو قوت عملیہ کا نشان قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور قرآن کریم میں نیک لوگوں کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینے کا جہاں جہاں ذکر ہے درحقیقت اس سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وہ لوگ کام کرنے والے، محنت کرنے والے اور قربانی کرنے والے تھے۔ اور بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینے کا جہاں جہاں ذکر ہے۔ اس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ لوگ نکمے قربانی سے بچنے والے اور سست تھے۔ کیونکہ بایاں ہاتھ بہت کم کام کرتا ہے۔

ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ دایاں ہاتھ اسلامی شریعت نے پاکیزہ کاموں کے لئے، اور بایاں ہاتھ گندگی کی صفائی وغیرہ کے لئے تجویز کیا ہے۔ پس دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینے سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ تم لوگ پاکیزہ کام کرتے تھے اور بائیں میں اعمال نامہ دینے سے مراد ہے کہ تم ناپاک کام کرتے تھے

دائیں کے لفظ سے ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں خدا تعالےٰ کے متعلق فاخذناہ بالیمین آتا ہے (الحاقۃ) جس کے معنے مفسرین نے کئے ہیں بالقدرۃ والطاقۃ۔ یعنی ہم اس کو مضبوطی سے پکڑ لینگے۔ پس دائیں ہاتھ سے اعمال نامہ دینے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مضبوطی سے نیکی کو پکڑا تھا اسلئے نجات پا گئے۔ اور جن کے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا، انہیں یہ بتایا جائیگا کہ تم نے نیکی اور تقویٰ کے لئے پورے زور سے کوشش نہ کی تھی۔ اور گویا بایاں ہاتھ جو کمزور ہوتا ہے استعمال کیا تھا۔ اس لئے آج تمہارا انجام خراب ہوا ہے۔ علاوہ ازیں یُمن برکت کو بھی کہتے ہیں۔ حدیث میں خدا تعالیٰ کے متعلق آتا ہے، کِلْتَا یَدَیْ رَبِّیْ یَمِین کہ میرے رب کے دونوں ہاتھ برکت والے ہیں۔ اس کا کوئی شمال نہیں پس دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دینے سے اس طرف اشارہ ہوگا کہ تمہارا انجام بابرکت ہوگا۔

اولٰئک یقرؤن کتابھم سے مراد یہ ہے کہ جسے انعام ملتا ہے وہ خوب شوق سے اپنے فیصلہ کو پڑھتا ہے لیکن جسے سزا ملتی ہے وہ اپنے فیصلہ کو پڑھنے کی تاب نہیں لاتا۔ اور حتی الوسع اس کے پڑھنے سے گریز کرتا ہے۔

ولا یظلمون فتیلا۔ فتیل تاگے کو بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بٹا جاتا ہے۔ اور کھجور کی گٹھلی کے سوراخ میں جو تیلی ہوتی ہے اس کو بھی کہتے ہیں۔ استعارۃً تھوڑی سی چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ذرہ بھر ظلم بھی نہ کیا جائے گا۔

وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ○ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ

بڑھ کر بھٹکا ہوا ہوگا۔ ۱۲۴ اور قریب تھا کہ وہ اس (کلام) کیوجہ سے جو ہم نے تجھ پر وحی سے نازل کیا ہے تجھے (سخت سے سخت

الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَ

عذاب میں مبتلا کرتے، تاکہ تو ان سے ڈر کر) اس (کلام) کے سوا کچھ اور (اپنے پاس سے گھڑ کر) ہماری طرف منسوب کرے۔ اور (اگر تم ایسا کرتے تو)

اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ

اس صورت میں) یقیناً تجھے (اپنا) گہرا دوست بنا لیتے ۱۲۵ اور (تیرا تو یہ حال ہے کہ) اگر ہم تجھے (قرآن دیکر) ثبات نہ بخشتے (اور وحی بھی تجھ پر نازل

۱۲۳ تفسیر ۔ جو اس جگہ اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ یعنی جس شخص نے یہاں پر روحانی آنکھوں سے کام نہیں لیا وہاں پر بھی اسے رُوحانی آنکھیں نہیں ملینگی اور دیدار الٰہی سے محروم ہوگا۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (انعام ع۱۳) کہ تمہارے پاس دلائل تمہارے رب کی طرف سے آگئے ہیں جو دیکھے گا فائدہ پائیگا۔ اور جو نہ دیکھیگا وہ نقصان اٹھائیگا۔ پھر فرمایا وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (فرقان ع۶) یعنی مومن وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات کا ذکر کیا جائے تو وہ ان کی طرف بہرے اور اندھے ہوکر توجہ نہیں کرتے بلکہ کان اور آنکھیں کھول کر اللہ تعالیٰ کی آیات کو سنتے ہیں۔ اس آیت میں انکو بھی اندھا کہا ہے جو کسی بات کو بغیر تحقیق کے مان لیتے ہیں۔ پھر فرمایا ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ رکوع ۷) یعنی کسی شخص کا آیات سے منہ پھیرنا ہی اس کا اندھا ہونا ہے۔

غرض اعمیٰ وہ ہے جو حقیقت اور ان بصائر کو جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ نہ دیکھے تو ایسا شخص وہاں بھی خدا تعالیٰ کا دیدار نہ کر سکیگا اور اندھا رہیگا۔ کیونکہ اس نے دنیا میں اپنی مرضی سے اپنے لئے اندھا ہونا پسند کیا تھا۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ دنیاوی اندھے اگلے جہان میں بھی اندھے ہونگے۔ جسمانی نقص تو بعث بعد الموت کے وقت سب کے سب دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ پہلا جسم ہی یہاں رہ جائے گا۔ پس اس سے مراد روحانی اندھاپن ہے

خلیل

دل کے اندھے قیامت کے دن دیدار الٰہی سے محروم رہیں گے

۱۲۵ حل لغات ۔ خلیل کے معنی ہیں الصدیق المختص خاص کیا ہوا دوست۔ وَقِيْلَ هُوَ الَّذِيْ صَادَقْتَهٗ بَعْدَ اِذْ جَرَّبْتَهٗ اور بعض کہتے ہیں کہ خلیل اس دوست پر بولتے ہیں کہ جس کا تجربہ کر لینے کے بعد اس سے دوستی ڈالی جائے (اقرب)

تفسیر ۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین بعض روایات لکھتے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ کفار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خواہش ظاہر کی کہ اگر آپ ہمارے بتوں کو ادب سے چھو لیں تو ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اسپر نعوذ باللہ من ذالک رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں خیال گذرا کہ اللہ تعالیٰ کو تو میرے توحید کے عقیدہ کا علم ہے۔ اگر میں اس طرح کر لوں اور قوم کو ہدایت ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ (فتح البیان جلد ۵)

یہ معنے اس آیت سے ہرگز نہیں نکلتے اور نہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے مطابق یہ معنے ہیں اور

علاوہ ازیں اگلی آیات اس مضمون کے بالکل الٹ مضمون بیان کر رہی ہیں۔

اس آیت میں کاد کا لفظ آیا ہے۔ کاد کا لفظ جب استعمال کیا جائے تو اگر وہ مثبت ہو تو معنے یہ ہوتے ہیں کہ کاد کے بعد کا فعل نہیں ہوا۔ اور اگر کاد سے پہلے نفی کا حرف آئے تو کاد کے بعد کے فعل کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ فعل ہو گیا۔ اس آیت میں کاد مثبت استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کاد کے بعد کے فعل کے متعلق یہ سمجھا جائیگا کہ وہ فعل صادر نہیں ہوا۔

اس آیت میں کاد کے بعد لیفتنونک کے الفاظ ہیں۔ پس کاد کے استعمال کے مطابق اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ فتنہ کا فعل صادر نہیں ہوا۔ فتنہ کے معنے ابتلا میں ڈالنے کے بھی ہوتے ہیں اور اس کے معنے عذاب میں مبتلا کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اگر اس کے معنے ابتلاء میں ڈالنے کے لئے جاویں تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قریب تھا کہ کفار تجھے ابتلاء میں ڈال دیتے ۔ مگر وہ ڈال نہ سکے اور اگر فتنہ کے معنے عذاب کے کئے جائیں تو معنے یہ ہونگے کہ قریب تھا کہ یہ لوگ تجھ کو عذاب میں ڈال دیتے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ابتلاء کے معنوں سے اس طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ گویا قریب تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے دباؤ کو مان کر قرآن میں تبدیلی کرنے پر تیار ہو جاتے۔ گو آپ نے ایسا کیا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معنے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ہیں۔ کسی شریف آدمی کی نسبت یہ کہنا کہ قریب تھا کہ وہ چوری کر لیتا۔ قریب تھا کہ وہ ظلم کرتا۔ قریب تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو پیٹتا یقیناً اس کی ہتک کرنے والا فقرہ ہے پس خدا کے رسول کی نسبت یہ کہنا کہ قریب تھا کہ وہ خدا پر افتراء کر لیتا بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے مفسرین کا اس امر پر خوش ہو جانا کہ آپ نے ایسا کیا تو نہیں کافی نہیں۔ کیونکہ خدا کے نبی بدی کے قریب بھی نہیں جاتے۔ اور خدا تعالیٰ پر افتراء تو ایسا فعل ہے کہ ایک ادنیٰ مومن کے متعلق بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا ارتکاب تو الگ رہا اس کے قریب بھی جائے گا۔ پس میرے نزدیک اس قسم کے معنے کرنے میں قدیم و جدید مفسرین نے سخت غلطی کی ہے۔

کاد کے بعد لا کا استعمال

میرے نزدیک اس آیت میں فتنہ کے معنے عذاب کے ہیں اور عن کا لفظ تعلیل کے معنوں میں آیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ پر بھی ان معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے فرماتا ہے کفار نے کہا کہ مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ (ھود ع ۵) ہم تیرے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ عن کے یہ معنے لیکر آیت کا یہ مطلب بنے گا کہ قریب تھا کہ کفار تجھ کو اس کلام کیوجہ سے جو تجھ پر وحی کیا گیا ہے عذاب میں مبتلا کرتے۔ اور ان کی غرض ایسا کرنے کی یہ ہوتی۔ کہ تو ہم پر افترا کر کے قرآن کی تعلیم کے خلاف کوئی اور تعلیم بیان کرے۔ ان معنوں کے رو سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار کے ارادے تیرے متعلق بڑے بڑے سخت تھے وہ چاہتے تھے کہ تجھے پکڑ کر سخت عذابوں میں مبتلاء کریں اور ان عذابوں سے تجھے مجبور کریں کہ تو قرآن کو چھوڑ کر ان کے مطلب کی بات بیان کرے۔ اس سارے مضمون میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل یا ارادہ فعل کا ذکر نہیں بلکہ سارا کا سارا فعل کفار کا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کلام سے پھرانا تو ان کی طاقت میں نہ تھا۔ اس غرض سے عذاب دینے کے ارادہ سے بھی وہ رو کے گئے۔ اور اس ارادہ میں بھی خدا تعالیٰ نے انکو ناکام رکھا قرآن کریم میں کفار کے ان ارادوں کا ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں ذکر آیا ہے۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (انفال ع ۴) یعنی یاد کر اس وقت کو کہ کفار تیرے متعلق یہ ارادے کر رہے تھے کہ

یہ آیت کے معنی آنحضرت کی شان کے مطابق

تجھے قید کر دیں یا تجھے قتل کر دیں یا تجھے نکال دیں۔ وہ تیرے ذلیل کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیروں میں لگا ہوا تھا اور اللہ ہی بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ یعنی آخر خدا تعالیٰ کی تدبیر کامیاب ہوئی اور کفار کے ارادے باطل ہوتے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دباؤ ڈالنے کے لئے قید، قتل اور جلاوطنی کے ارادے کر رہے تھے۔ مگر خدا تعالیٰ نے ان کو ناکام رکھا۔ اسی مضمون کی طرف یہاں اشارہ ہے اور یہاں بھی یہی بتایا گیا ہے کہ کفار عذاب دینے کے ارادہ میں ناکام رہے۔

کفار مکہ اپنے سب ارادوں میں ناکام رہے

اس جگہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قید اور قتل کے ارادوں میں تو وہ ناکام ہوئے مگر اخراج کے ارادہ میں تو کامیاب ہوگئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ارادہ میں بھی وہ ناکام رہے کیونکہ کفار کا ارادہ یہ نہ تھا کہ آپ کو صرف وہاں سے نکال دیں۔ کیونکہ اس سے ان کی غرض پوری نہ ہوتی تھی۔ ان کا ارادہ تو یہ تھا کہ ذلیل کر کے نکالیں تا دنیا میں آپ کی بدنامی ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو قبل از وقت خبر دیدی اور آپ خود ہجرت کر گئے اور یہ امر ان کی سازش کے مطابق نہ تھا۔ بلکہ خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جب معلوم کیا کہ آپ عزت کے ساتھ ہجرت کر گئے ہیں تو آپ کا تعاقب کیا اور جب خود پکڑنے میں کامیاب نہ ہوئے تو آپ کو پکڑ کر لانے والے کے لئے سَو اونٹ کا انعام مقرر کیا۔ (بخاری الجزء الثانی باب ہجرۃ النبی صلعم) اگر صرف نکال دینا انکے ارادوں میں شامل ہوتا تو آپ کے جانے پر وہ لوگ خوش ہوتے۔ نہ یہ کہ آپ کا تعاقب کرتے اور پھر آپ کے پکڑ لانے والے کے لئے انعام مقرر کرتے۔ پس کفار کا آپ کی ہجرت کے بعد کا فعل بتاتا ہے کہ وہ آپ کے نکل جانے کو کافی نہ سمجھتے تھے بلکہ چاہتے تھے کہ آپ کو اس طرح ذلیل کر کے نکالیں کہ یا تو آپ نعوذ باللہ اپنی تعلیم سے باز آجائیں یا آپ کی ایسی سُبکی ہو کہ جس جگہ جائیں وہ داغ آپ کے ساتھ جائے۔ اور اس ارادہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ناکام رکھا۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہ سورۃ ہجرت کے قریب کی ہے جس وقت کفار مقابلہ سے ہر طرح عاجز آکر مایوسی کے جوش میں اس بات پر تُل گئے تھے کہ قید کر کے، قتل کی دھمکی دے کر یا ذلیل کر کے نکالنے کا ڈراوا دیکر آپ کو قرآن کی تعلیم سے پھرائیں اور اگر اس کا اثر نہ ہو تو پھر اپنے بد ارادوں کو مکمل کر کے آپکی جسمانی یا اخلاقی زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس ارادہ میں بری طرح ناکام رکھا اور اسی ناکامی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے نہ اس امر کی طرف کہ نعوذ باللہ من ذالک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں کوئی کمزوری آسکتی تھی یا آنیکا امکان تھا۔

وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا میں یہ بتایا کہ اگر یہ عذاب دیکر تجھے سچائی سے پھرانے میں کامیاب ہو جاتے تو تجھے اپنا دوست بنا لیتے۔ اس میں بھی کفار کی ہی اخلاقی حالت کو بیان کیا گیا ہے نہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کمزوری کو۔ کفار بار بار کہتے تھے کہ اگر محمد رسول اللہ صلعم اپنی تعلیم میں کفار کی خاطر کچھ بھی نرمی کر لیں تو وہ انہیں اپنا سردار بنا لیں گے۔ چنانچہ ایک دفعہ ان کا وفد آپ کے چچا ابو طالب کے پاس آیا اور یہ تجویز کی کہ ہم اب یہ بھی نہیں کہتے کہ محمد (صلعم) شرک کرے بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں کو بُرا نہ کہے۔ اگر یہ اتنا ہی کر دے تو ہم اسے اپنا سردار بنا لیں گے۔

انہی واقعات کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ جب لالچ دے کر کامیاب نہ ہو سکے۔ تو انہوں نے ظلم کر کے تجھے مجبور کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے اس میں بھی انہیں ناکام رکھا۔ اور ناکام رکھیگا۔ مگر ان کے یہ ارادے خود ان کے اخلاق پر جو روشنی ڈالتے ہیں وہ ان کے لئے کیسی شرمناک ہے۔ ان کی یہ کوششیں بتاتی ہیں۔ کہ انہیں تیری عظمت کا اقرار ہے۔ تبھی تو کسی نہ کسی صورت سے تیری تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس قسم کی تائید پر خوش ہونا نہایت پست اخلاق پر دلالت کرتا ہے۔

لِكِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ

نہ ہوتی) تو تُو (اس صورت میں بھی اپنی فطرت کی پاکیزگی کی وجہ سے) قریب ہوتا کہ انکی طرف کچھ (چھوٹی چھوٹی) باتوں میں جھک جاتا اگر عملاً ایسی بھی اشکال ہوتا تو ہم اور اگر

ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ

(جیسا کہ انکا خیال ہے قوم پر افترا باندھنے والا ہوتا) تو اس صورت میں ہم تجھے زندگی کا بڑا عذاب اور موت کا بڑا عذاب چکھاتے (اور) پھر تو ہمارے مقابل پر

لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ

اپنا کوئی (بھی) مددگار نہ پاتا۔ ۵۸۰ اور وہ یقیناً تجھے اس ملک سے نکالنے پر تُلے ہوئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ تجھے

۵۷۸ حل لغات۔ ثبتناك:۔ ثبت سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ ثبت کے لئے دیکھو ابراہیم ۵۲ع

ترکن:۔ رکن سے واحد مخاطب کا صیغہ ہے اور رکن الیہ کے معنے ہیں مال الیہ اس کی طرف مائل ہوا اقرب پس لِكِدْتَّ تَرْكَنُ کے معنے ہوں گے کہ تو مائل ہو جاتا۔

تفسیر۔ یہ آیت اس تشریح کی تائید کرتی ہے۔ جو میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم نے تجھے ثبات نہ بخشا ہوتا تو پھر ممکن تھا کہ تو تھوڑا سا ان کی طرف مائل ہو جاتا۔ یعنی ثبات اگر حاصل نہ ہوتا تب بھی تو ان لوگوں کے ساتھ پوری طرح نہ مل سکتا تھا بلکہ ایک خفیف سا اشتراک تیرے اور ان کے خیالات کا ہو سکتا تھا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے رو سے ثبتناك کے کیا معنے ہیں۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرماتا ہے۔ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (ابراہیم ع) یعنی اللہ تعالیٰ مومنوں کو قول ثابت یعنی وحی کے ذریعہ سے اس دنیا کی زندگی اور آخری زندگی کے اعمال پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ اسی طرح سورۃ فرقان میں فرماتا ہے كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (ع) یعنی کفار اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن یکدم کیوں نازل نہ ہوا۔ فرمایا ٹھیک ہے قرآن یک دم نازل نہیں ہوا اور اس کی غرض یہ ہے کہ ہم اپنے رسول کے دل کو مضبوط کریں اور قرآن کریم کو آہستہ آہستہ نازل کر کے اس کے دل کے گوشوں میں رچا دیں۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تثبیت کا ذریعہ کلام الٰہی کا نزول ہے۔ پس لو لا ان ثبتناك کے معنے یہ ہوں گے کہ اگر قرآن نازل کر کے ہم نے تیرے دل کو ایمان پر ثبات نہ بخشا ہوتا تو ممکن تھا کہ تو کچھ تھوڑا سا ان کی طرف جھکتا۔

ثبتناك

اس تشریح کے بعد یہ امر آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے، کہ اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کے بعد آپ کفار کی طرف مائل ہو سکتے تھے۔ بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ قرآن کے نزول کے بعد تو تیرا ان کی کوئی بات ماننا ناممکن ہے۔ اگر قرآن نہ بھی نازل ہوا ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے منشاء کا کامل علم تجھے نہ ہوتا تب بھی تیری فطرت اتنی پاک تھی کہ مشرکانہ باتوں میں تو ان کے ساتھ شریک نہ ہو سکتا تھا۔ ہاں ممکن تھا کہ وحی کی روشنی کے نہ ہونے کے سبب سے بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں تو انکے طریق پر عمل کر لیتا۔ پس یہ آیت تو انتہائی مدح کے مقام پر ہے اور اس میں یہ بتایا ہے کہ بغیر قرآن کے بھی کفار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ساتھ کامل اتفاق کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ پھر قرآن کے نزول کے بعد وہ ایسی امید کیونکر رکھتے ہیں۔

آنحضرت کسی وقت بھی کفار کی طرف مائل نہیں ہو سکتے

۵۷۹ حل لغات۔ ضعف الحیٰوۃ وضعف الممات عربی میں کبھی درمیانی مضاف الیہ کو حذف کر کے دوسرے مضاف الیہ کی طرف مضاف کی اضافت پھیر دیتے ہیں امرؤ القیس

ضعف الحیوٰۃ

مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ

نکال ہی دیں گے۔ اور اس صورت میں وہ تیرے بعد (خود بھی) تھوڑا (عرصہ) ہی

خِلٰفَكَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ

(یہاں) رہیں گے۔ ۷۷ (اور تجھ سے بھی) ان (گذشتہ انبیاء) کی طرح (سلوک ہوتا)

مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ۝ أَقِمِ

جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے (رسول بناکر) بھیجا تھا۔ اور تو ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا ۷۸

ع ۸

کیمطابق یہاں ضعف عذاب الحیٰوۃ اور ضعف عذاب الممات کے جملوں کو درمیانی مضاف الیہ کو محذوف کرکے ضعف الحیٰوۃ اور ضعف الممات کی صورت میں بدل دیا گیا ہے نیز ضعف کسی چیز کی مثل یا اس سے دگنی یا کئی گنی وغیرہ کو کہتے ہیں کم سے کم ایک مثل اور زیادہ خواہ کتنے گنے ہوں۔ چونکہ اردو میں اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے زیادتی پر دلالت کرنے کیلئے بڑے کے لفظ سے ضعف کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اگر تو رسول نہ ہوتا اور بعض چھوٹی باتوں میں اپنی قوم کے ساتھ شامل ہو جاتا تو پھر انکو کیا فائدہ ہوتا۔ اسوقت تو انکی نجات کا موجب تو نہیں ہو سکتا تھا بلکہ خود عذاب کا مستحق ہوتا۔ پھر انکو تیری تائید سے کیا فائدہ تھا مطلب یہ کہ نبی کی سب عظمت کلام الٰہی کیوجہ سے ہوتی ہے۔ کفار اس امر کو محسوس نہیں کرتے۔ اور سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی خاص لیاقت کا آدمی ہے۔ اگر اپنی تعلیم میں تبدیلی کرے اور ہمارے ساتھ مل جائے تو ہماری قوم شاندار ترقی کر جائے حالانکہ انکا یہ خیال باطل ہے۔ نبی کو کمال وحی سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ وحی جاتی رہے تو وہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح ہو جائے پس ایسی خواہشات محض لغو اور بے فائدہ ہیں۔

مخالفین ہتک آمیز سلوک سے ان پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

یہاں پر ضعف کے معنے مثل کے ہیں اور مضاف حذف کر دیا گیا ہے گویا اصل یوں ہے۔ مثل عذاب الحیٰوۃ و مثل عذاب الممات یعنی جس طرح دوسروں کو دنیا کا عذاب اور آخرت کا عذاب ملتا ہے، ویسا ہی اگر نبی خدا تعالیٰ کی وحی سے ہدایت پاکر خدا تعالےٰ کی رضا حاصل نہ کرے۔ تو وہ بھی باقی قوم کی طرح عذاب میں پکڑا جائے۔

۷۷ تفسیر۔ استفزہ من الارض کے معنے زمین سے نکال دینے کے ہیں۔ پس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ قریب تھا کہ یہ لوگ تجھے اس زمین سے نکال دیتے مگر اسکے آگے فرماتا ہے "تاکہ یہ تجھے نکال دیں"۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ استفزاز کے معنے کچھ اور ہیں ورنہ تکرار فضول لازم آتی ہے لیکن اگر لیخرجوک کے معنے معنوی اخراج کے لئے جائیں تو تکرار نہیں رہتا۔ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہونگے کہ یہ لوگ قریب تھا کہ تجھے ملک سے اسطرح نکال دیتے کہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ تو انکی قومی زندگی سے نکل جاتا یعنی تجھے ذلیل کرکے نکال دیتے جس کی وجہ سے تیرا لوگوں سے تعلق ٹوٹ جاتا اور گویا تیرا معنوی طور پر خاتمہ ہو جاتا۔ یہ معنے پہلی آیات کے بالکل مطابق آتے ہیں اور میرے نزدیک یہی مراد ہے اور بتایا یہ گیا ہے کہ اگر یہ اس ارادے میں کامیاب ہو جاتے کہ ہتک کرکے تجھے ملک سے نکالتے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ تیرے بعد جلد ہی عذاب میں مبتلا کرکے انکو تباہ کر دیا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے فضل کرکے تجھے آپ ہی ہجرت کا حکم دیدیا اور انکو تیری ہتک کے گناہ سے بچاکر شدید سزا سے محفوظ کر دیا اور تیری عزت کو قائم رکھکر اپنی محبت کا ثبوت دیا۔

۷۸ تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ ہماری یہ قدیم سے سنت ہے کہ جب کسی نبی کو اسکی قوم ہتک آمیز سلوک کرکے نکالتی ہے تو اسپر توبہ کا دروازہ قریباً بند ہو جاتا ہے اور سخت تباہ کر دینے والے قومی عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسکی مثال قوم صالح ہے جنہوں نے صالح کی اونٹنی کو مار کر انکے تبلیغی سفروں کو بند کر دیا یا پھر یہود ہیں کہ انہوں نے مسیح کو صلیب پر لٹکایا اور اسکے بعد حضرت مسیح کو ملک چھوڑنا پڑا۔ یہ دونوں قومیں بالکل برباد کر دی گئیں قوم صالح تو ظاہری طور پر تباہ ہوگئی اور یہود اخلاقی اور سیاسی موت میں مبتلا ہوگئے۔ اللہ تعالےٰ نے چونکہ عربوں کو ایسی موت سے بچانے کا فیصلہ کیا تھا ان کو اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہونے دیا اور اس طرح اس عذاب سے بچالیا۔

الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ

(سورج کے ڈھلنے (کے وقت) سے لیکر رات کے خوب تاریک ہوجانے (کے وقت) تک (کی مختلف گھڑیوں میں) نماز کو عمدگی سے ادا

قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝

کیا کر۔ اور صبح کے وقت (قرآن) کے پڑھنے کو (بھی لازم سمجھ) صبح کے وقت (قرآن) کا پڑھنا یقیناً (اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایک) مقبول (عمل) ہے۔

حل لغات دُلُوك۔ دلکت الشمس دُلوکاً۔ غربت۔ سورج غروب ہوگیا۔ صفرت۔ سورج زرد ہوگیا۔ وقیل مالت وزالت عن کبد السماء بعض نے کہا ہے کہ دلکت الشمس کے معنی سورج ڈھلنے کے ہیں (اقرب)

غَسَق۔ غَسَقَتْ عینُہ غسوقاً۔ دمعت وقیل انصبّت۔ وقیل اظلمت۔ اسکی آنکھ ڈبڈبا آئی بعض محققین لغت کے نزدیک اس کے معنی آنکھ کے بہنے یا آنکھ پر تاریکی چھا جانے کے ہوتے ہیں۔ غسق اللیلُ غَسَقاً اشتدّ ظلمتُہ یعنی رات سخت تاریک ہوگئی۔ الغسقُ۔ ظلمۃُ اوّل اللیل او دخول اوّلہ حین یختلط الظلامُ۔ غسق رات کے پہلے حصے کی تاریکی کو کہتے ہیں یا رات کی ابتداء میں تاریکی شروع ہونے کو غسق کہتے ہیں۔ (اقرب)

مشہودا۔ یہ شہد سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ شہد کا لفظ کسی جگہ پر حاضر ہونے اور اس پر اطلاع پانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں شہد المجلسَ شہوداً حضرہٗ واطلع علیہ کہ وہ مجلس میں حاضر ہوا۔ اور اس نے اسے دیکھا۔ شہدَ اللہُ ای علمَ اللہُ وقبلَ اللہُ جب اللہ تعالیٰ کے لئے شہد کا لفظ استعمال ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جانا اور اسے قبول فرمایا وقیل کتبَ اللہُ۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے عمل کو لکھ لیا (اقرب)

تفسیر۔ ان آیات میں مسلمانوں کو آنے والی خطرناک مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ ایک طرف ہجرت کے بعد ان قوموں سے مقابلہ ہونے والا تھا۔ جو ظاہر میں عبادت گزار تھیں۔ اور مسلمانوں کی سستی انہیں اعتراض کا موقعہ دے سکتی تھی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو جلد فتوحات ملنے والی تھیں جس سے عبادات میں سستی پیدا ہوجاتی ہے پس دونوں امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو ہوشیار کیا۔ کہ دشمن کے طعن کا نشانہ اسلام کو نہ بنانا۔ اور نہ سست ہوکر خدا تعالیٰ کے فضلوں کو کھو دینا۔

دلوک

غسق

اس آیت میں پانچوں نمازوں کے اوقات بتائے گئے ہیں۔ دلوک کے تین معنی ہیں۔ اور ہر ایک معنی کے لحاظ سے ایک ایک نماز کا وقت ظاہر کر دیا گیا۔

پانچوں نمازوں کے اوقات کا ذکر اس آیت میں

(۱) مالت وزالت عن کبد السماء یعنی زوال کو دلوک کہتے ہیں۔ اس میں ظہر کی نماز آگئی (۲) صفرت۔ جب سورج زرد پڑ جائے تو اس کو بھی دلوک کہتے ہیں۔ اس میں نماز عصر کا وقت بتا دیا گیا۔ (۳) تیسرے معنی غربت یعنی غروب شمس کے ہیں۔ اس میں نماز مغرب کا وقت بتایا گیا ہے (۴) غسق اللیل کے معنی ظلمۃ اول اللیل کے ہیں۔ یعنی رات کے ابتدائی حصہ کی تاریکی۔ اس میں نماز عشاء کا وقت مقرر کر دیا گیا۔ (۵) قرآن الفجر کہہ کر صبح کی نماز کا ارشاد فرمایا۔ اس کے سوا کوئی اور تلاوت صبح کے وقت فرض نہیں ہے۔

مشہوداً

ان قرآن الفجر کان مشہودا۔ احادیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ صبح کی نماز کے وقت دن کے فرشتے آتے ہیں۔ اور رات کے فرشتے چلے جاتے ہیں۔ وہ فرشتے جب خدا کے پاس جاتے ہیں۔ تو دریافت

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ

اور رات کو بھی تو اس (یعنی قرآن) کے ذریعہ سے کچھ سو لینے کے بعد شب بیداری کیا کر۔ جو تجھ پر ایک زائد انعام ہے

يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ وَقُلْ رَّبِّ

(اس طرح پر) بالکل متوقع ہے۔ کہ تیرا رب تجھے حمد والے مقام پر کھڑا کردے ۳۵ اور کہہ (کر) اے میرے رب

کرنے پر رکھتے ہیں۔ کہ ہم جب دنیا میں گئے۔ تو تیرے بندوں کو نماز پڑھتے ہی دیکھا۔ اور واپس آئے ہیں تو نماز پڑھتے ہی چھوڑ کر آئے ہیں عن ابی هريرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال تشهده ملائكة الليل و ملائكة النهار۔ (الحدیث) اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح کی نماز خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اور خاص ہی طور سے مقبول ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت انسان میٹھی نیند کو چھوڑ کر اٹھتا ہے۔ صبح کی نماز دراصل عام مسلمان کی تہجد ہی کی نماز ہے۔ بلاشبہ جو انسان صبح کی نماز پڑھے گا۔ اگر اس نے وہ نماز ایمانداری سے پڑھی ہوگی تو باقی نمازیں بھی اس کے لئے آسان ہو جائیں گی۔

۳۵ حل لغات۔ تَهَجَّد۔ هَجَدَ۔ يهجد۔ هجودًا سے باب تفعّل کا واحد مذکر امر کا صیغہ ہے۔ هجد الرجلُ نام بالليل آدمی رات کو سویا۔ و سَهِرَ رات کو بیدار رہا (فی اللسان تهجد القومُ ا ستيقظوا للصّلوة او غيرها۔ لسان العرب میں لکھا ہے۔ کہ تهجد القوم کے معنی لوگوں کے سونے کے بعد نماز وغیرہ کے لئے بیدار ہونے کے ہیں۔ (اقرب)

نماز محبوب کی زیارت ہے۔

نافلة۔ نفل (ينفل۔ نفلاً) الرجلُ فلاناً۔ اعطاه نافلةً من المعروف مما لا يريدُ ثوابه منه یعنی ایک شخص نے دوسرے پر ایسی بخشش کی جس کے بدلے کا اس سے خواہشمند نہیں۔ نفل الامامُ الجندَ جعل لهم ما غنموا۔ امام نے لشکر کو مال غنیمت دے دیا۔ لفظ نافلة نفل سے اسم فاعل مؤنث بمعنی مفعول ہے۔ یعنی دی ہوئی

نافلة

چیز۔ دیا ہوا انعام النافلة کے معنی الغنيمة غنیمت العطية بخشش۔ ما تفعله مما لا يجبُ۔ فرض سے زائد عمل کرنا۔ ولد الولد پوتا۔ اس کی جمع نوافل آتی ہے (اقرب)

تفسیر۔ تهجد به میں ہ کی ضمیر قرآن کریم کی طرف پھرتی ہے۔ اور مراد یہ ہے۔ کہ اس نماز میں تلاوت قرآن پر خاص زور ہونا چاہیئے۔

تہجد کے معنی سو کر اٹھنے کے ہوتے ہیں۔ اس لئے تہجد کی نماز سے پہلے سونا ضروری ہے۔ جو لوگ ساری رات جاگنے کے چلے کھینچتے ہیں۔ وہ عبادت نہیں کرتے بلکہ شریعت کے منشاء کو باطل کرتے ہیں۔ ایسی عبادت قرآن کریم کے منشاء کے خلاف ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ پہلی رات سوتے تھے۔ اور آخر رات میں اٹھ کر تہجد پڑھتے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے۔ کہ عبادت کا موقعہ دینا ایک احسان الٰہی ہے۔ مگر افسوس ان لوگوں پر جو نماز کو چٹی سمجھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز اپنے رب کی زیارت ہے۔ اور زیارت الٰہی ایک انعام ہے۔ اور کوئی عقلمند انسان اپنے محبوب کی زیارت کو چٹی نہیں سمجھے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو عبادت کی شان ہی یہ بتائی ہے کانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك (مسلم جلد اول کتاب الایمان) یعنی صحیح نماز یہ ہے کہ تو خدا تعالےٰ کو دیکھ لے۔ یا کم سے کم نماز کے وقت یہ یقین ہو کہ خدا تعالےٰ مجھے دیکھ

رہا ہے۔ پس اتنے بڑے انعام کو چٹی سمجھنا سخت ظلم ہے نماز اللہ تعالیٰ کے بڑے انعامات میں سے ہے میرا تو یہ عقیدہ ہے۔ کہ انسان ایک نماز بھی چھوڑے تو وُہ نمازی نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ حکم اقامۃ الصلوٰۃ کا ہے۔ اور وُہ دوام کو چاہتا ہے۔ جب ایک بھی نماز چھوڑ دی گئی تو دوام نہ رہا۔

نَافِلَةً لَّكَ سے اس بات کا اظہار کیا گیا ہے۔ کہ عبادت کا تعہّد بجائے خود ایک احسان ہے۔ یا ممکن ہے۔ کہ تہجد کی نماز پہلے انبیاء پر واجب نہ کی گئی ہو۔ اس صورت میں اس کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ یہ عبادت کا موقعہ خاص تیرے لئے انعام ہے۔

مقاماً محموداً میں عظیم الشان پیشگوئی

مَقَامًا مَّحْمُودًا۔ مقاماً محموداً میں ایک بہت بڑی پیشگوئی کی گئی ہے۔ دُنیا میں کسی شخص کو بھی اتنی گالیاں نہیں دی گئیں جتنی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئیں ہیں۔ ڈاکو۔ بدکار۔ بدمعاش۔ فاسق سے فاسق انسان کو ان گالیوں کے کروڑویں حصہ کے برابر بھی گالیاں نہیں دی جاتیں جتنی کہ آج تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی ہیں۔ مقام محمود عطا فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان گالیوں کا آپ کو صلہ دیا ہے۔ فرماتا ہے جس طرح دشمن گالیاں دیتا ہے۔ ہم مومنوں سے تیرے حق میں درود پڑھوائینگے اسی طرح عرش سے خود بھی تیری تعریف کریں گے۔ اس کے مقابل پر دشمن کی گالیاں کیا حیثیت رکھتی ہیں۔

مقام محمود سے مراد شفاعت بھی ہے۔

مقام محمود سے مراد مقام شفاعت بھی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے۔ سب اقوام کے لوگ سب نبیوں کے پاس سے مایوس ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس شفاعت کی غرض سے آئیں گے۔ اور آپ شفاعت کریں گے۔ اس طرح گویا ان سب اقوام کے مونہہ سے آپ کے لئے اظہار عقیدت کروا دیا جائیگا۔ جو اس دنیا میں آپ کو گالیاں دیتی تھیں۔ اور یہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا مقام محمود ہے۔

مقام محمود سے مراد ظہور مہدی بھی ہے

مقام محمود سے مراد میرے نزدیک قرب ظہور مہدی بھی ہے۔ کیونکہ اس کے ظہور کا وقت وہی بیان ہوا ہے۔ جب مسلمانوں کے اسلام سے روگردان ہو جانے کی اور ان کے کفر میں ترقی کر جانے کی خبر دی گئی ہے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کے اس پہلوان کا ظہور جو ان گالیوں کی رو کو تعریف سے بدلوا دے۔ مقام محمود کا ہی ایک کرشمہ ہے ہم نے اسی خدمت میں حصہ لینے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات بیان کرنے کے لئے سال میں ایک دن مقرر کیا ہوا ہے جس میں ہر مذہب وملت کے لوگ اپنے ان تاثرات کو بیان کرتے ہیں۔ جو آپ کے حالات پڑھنے سے ان کے دلوں پر پڑتے ہیں۔ اقم الصلوٰۃ الآیتین۔ نماز پنجگانہ اور تہجد کے ذکر کے بعد جو مقام محمود کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ جس شخص کے دشمن زیادہ ہوں۔ اور بدگو لوگوں کی تعداد بڑھ جائے اس کا علاج یہ نہیں۔ کہ وُہ ان سے الجھتا پھرے۔ بلکہ ایسے وقت میں انابت الی اللہ اور بارگاہ الٰہی میں فریاد کرنا ہی ان فتنوں کو دُور کرتا ہے۔ بلکہ اگر انابت بہت بڑھ جائے تو مذمت تعریف سے اور گالیاں دُعاؤں سے بدل جاتی ہیں چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا ہی ہوا۔ کہ جو لوگ آپ کو گالیاں دیتے تھے ایک دن عاشق صادق ہو گئے عمرو بن عاص۔ خالد۔ عکرمہ۔ مردوں میں سے اور ہندہ عورتوں میں سے اس کی زبردست مثالیں ہیں۔ یہ لوگ آپ کی دعاؤں سے ہی کھنچ کر آگئے۔ ورنہ جس قدر عداوت ان کے دل میں تھی۔ اس کا دور کرنا انسانی بس کی بات نہ تھی۔

بعض نادان کہتے ہیں۔ کہ معلوم ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں (نعوذ باللہ من ذالک) کوئی نقص تھا۔ تب ہی تو آپ کو اتنی گالیاں دی جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بات نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالیاں کسی عیب کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ حضور کی خوبیوں کی وجہ سے دی جاتی ہیں۔ دنیا کے کسی اور نبی کو تمام انسانوں کے

اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ

مجھے ظاہراً و باطناً اچھے طور پر (ہی) داخل کر اور ظاہراً و باطناً اچھے طور پر (ہی) اس

صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ؀

سے باہر لا۔ اور مجھے اپنے حضور سے کامل نصرت والا غلبہ عطا کر۔

لئے اسوۂ حسنہ نہیں بنایا گیا تھا۔ اس لئے کسی نبی کی زندگی کے مکمل سوانح محفوظ نہیں کئے گئے۔ اگر دنیا کے مذہبی پیشواؤں میں سے کسی پیشوا کی زندگی کے حالات تفصیلاً موجود ہیں۔ تو وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر واقعہ تاریخ میں موجود ہے۔ آپ کا کھانا۔ آپ کا پینا۔ آپ کا چلنا پھرنا اور بولنا اور بیٹھنا غرض ہر حرکت و سکون آپ کا محفوظ کر لیا گیا ہے۔ گویا جس طرح سے کسی شخص کی تلاشی لی جاتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور کے اعمال و خیالات کو اکٹھا کر کے دُنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس کے باوجود آپ کا دشمنوں کے سامنے میدان میں جیتے رہنا اور عقل سے کام لینے والوں کی نگاہ میں عزت پا جانا کوئی معمولی معجزہ نہیں۔ اور اگر یہ عزت جو پورے امتحان کے بعد حاصل ہوئی ہے مقام محمود نہیں کہلا سکتی تو پھر کوئی اور عزت مقام محمود نہیں کہلا سکتی۔ حق یہ ہے کہ آپ کی زندگی کے صرف ایک دن کے واقعات کے برابر بھی دوسری نبیوں کی عمر بھر کے واقعات محفوظ نہیں۔ پس ایسے مخفی وجودوں کی زندگی پر کوئی جرح کرے تو کیا کرے پس کسی قوم کا اس پر خوش ہونا کہ اس کے نبی پر اس قدر اعتراض نہیں ہوتے کوئی معقول خوشی نہیں۔

میرے نزدیک آپ کے لئے جو مختلف مقامات محمودہ مقرر ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا مقام محمود جو اس آیت کے نزول کے بعد آپ کو ملا۔ مدینہ منورہ تھا۔ وہاں کی زندگی سے آپکی حمد و ستائش دنیا میں پھیل گئی۔ چنانچہ دعا مندرجہ آیت ہذا میں اسی طرف اشارہ ہے

صدق[2]

آنحضرتؐ کی زندگی کا ہر واقعہ تاریخ میں موجود ہے[1]

پہلا مقام محمود آنحضرتؐ کا مدینہ شریف لے جانا ہے[1]

مدخل[1]

۸۱ حل لغات۔ مُدْخَلَ صِدْقٍ۔ لفظ مدخل دَخَلَ سے باب افعال کا مصدر میمی، اسم مفعول اور ظرف زمان و مکان ہے۔ اس کے معنی داخل ہونا۔ داخل کیا ہوا۔ داخل ہونے کا وقت اور داخل ہونے کی جگہ کے ہیں (اقرب) صدق کے معنی ہیں نقیض الکذب۔ سچائی۔ الفضل فضیلت۔ الصلاح خوبی اور اچھائی۔ الجد سنجیدگی۔ الشدۃ والصلابۃ سختی اور مضبوطی غاذا اضفت الیہ قلت رجل صدق ای نعم الرجل اگر لفظ صدق مضاف الیہ واقع ہو تو مضاف کی ہر رنگ کی خوبی پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ رجل صدق کے معنی ہوں گے۔ ہر لحاظ سے خوبیوں والا شخص (اقرب) ویعبّر عن کل فعل فاضل ظاہراً و باطناً بصدق فیضاف الیہ ذالک الفعل الذی یوصف بہ کسی فعل کی ظاہری و باطنی خوبی کا اظہار کرنے کے لئے اسے لفظ صدق کی طرف مضاف کیا جاتا ہے۔ (مفردات) مزید تشریح کے لئے دیکھیں یونس ع۱ پس مدخل صدق کے معنی ہوں گے ظاہراً و باطناً اچھے طور پر داخل کرنا۔

تفسیر۔ صدق کے معنی بتائے جا چکے ہیں یعنی اندرونی و بیرونی دونوں حالتیں یکساں طور سے اچھی ہوں۔ اس آیت میں دعا اور انابت کے جواب میں جو مقام محمود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ملنے والے تھے۔ ان میں سے پہلے مقام محمود کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اب تجھے اسراء کی خبر کے ماتحت مکہ سے نکال کر ہم ایک اور جگہ کی طرف جو مقام محمود ہے لے جائیں گے۔ اس لئے اس کے متعلق ابھی سے دعائیں شروع کر دے۔ اور کہہ کہ اے خدا

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ

اور (سب لوگوں سے) کہہ دے۔ (کہ بس اب) حق آگیا ہے۔ اور باطل بھاگ گیا ہے اور باطل تو ہے ہی

كَانَ زَهُوْقًا ۝ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ

بھاگ جانے والا ۸۲ اور ہم قرآن میں سے آہستہ آہستہ وہ (تعلیم) اتار رہے ہیں جو

جبکہ اس شہر میں ظاہری اور باطنی خوبیوں کے ساتھ داخل کر اور اس مقام سے بھی جس میں اس وقت ہوں یعنی مکہ سے ظاہری و باطنی خوبیوں کے ساتھ نکال یعنی کفار جو ارادہ کر رہے ہیں۔ کہ مجھے ذلت سے نکالیں جس سے میرا رعب اور اثر جاتا رہے۔ اس میں وہ کامیاب نہ ہوں۔ چنانچہ یہ دونوں دعائیں قبول ہوئیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار اپنی مرضی کے مطابق نہ نکال سکے بلکہ خدا تعالےٰ کے علم دینے سے آپ خود ہی مناسب موقعہ پر مکہ سے ہجرت کر گئے۔ اسی طرح آپ کا دخول مقام محمود میں بھی نہایت اعلیٰ ہؤا۔ اللہ تعالےٰ نے وہاں آپ کی شمع رُخ کے ہزاروں پروانے پیدا کر دیئے۔ جو آپ کے مونہہ کی طرف ہر وقت دیکھتے رہتے تھے۔ اور جن کو آپ سے وہ عشق تھا۔ کہ اس عشق کی نظیر دُنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔

ان معنوں پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ خروج مکہ پہلے ہؤا ہے۔ اور دخول مدینہ بعد میں۔ پھر قرآن کریم نے دخول کو پہلے کیوں بیان فرمایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خروج کی خبر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لازماً تکلیف ہوتی تھی۔ اور یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ مکہ سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی محبت کی وجہ سے اس امر کا پہلے ذکر فرمایا کہ عنقریب تجھ کو ایک مبارک مقام ملنے والا ہے اور مکہ سے نکلنے کے ذکر کو اس کے بعد رکھا۔ تا کہ تسلی پہلے مل جائے اور غم کی خبر بعد میں ملے۔

دوسرے معنی اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ دخول سے مراد آپ کا دوبارہ مکہ میں واپس آنا ہے۔ اور خروج سے مراد آپ کی ہجرت ہے۔ اس صورت میں بھی ترتیب کے متعلق اعتراض پڑے گا۔ کہ ہجرت پہلے تھی۔ اور فتح مکہ بعد میں۔ لیکن اس کا بھی وہی جواب ہے۔ جو پہلے بیان ہؤا۔ کہ مکہ سے نکلنے کے صدمہ کو اس خبر سے کم کر دیا۔ کہ آپ پھر مکہ میں آنے والے ہیں۔ اور اس کے بعد مکہ سے نکلنے کا ذکر کیا۔ تا تسلی پہلے ہو جائے۔ اور غم کی خبر بعد میں بتائی جائے۔ اس صورت میں مقام محمود کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ فتح مکہ کے بعد دشمنوں کے سب اعتراضات دور ہو جائیں گے۔ اور عربوں پر آپ کی سچائی ظاہر ہو جائیگی چنانچہ ایسا ہی ہؤا۔ سلطاناً نصیراً مجھے اپنے پاس سے ایسا غلبہ دے۔ جو کہ نصیر ہو۔ یعنی وہ میرے کاموں میں میرا ممد و معاون ہو مضر نہ ہو کیونکہ بعض غلبے انسان کے لئے بجائے فائدہ پہنچانے کے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ یعنی مجھے غلبہ تو ملے۔ مگر ایسا نہ ہو جس کا انجام میرے کاموں کی تباہی ہو۔

یہ دُعا اسرائ کے ان معنوں کی تائید کرتی ہے جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسرائ کے کشف کی ایک تعبیر مدینہ کی طرف ہجرت کرنا تھی۔

۸۲ حل لغات۔ زھق۔ زھق الباطل کے معنے ہیں اضمحل۔ باطل کمزور ہو گیا۔ الشیئُ بطل وھلک کوئی چیز بے اثر ہو گئی مٹ گئی۔ (اقرب)

تفسیر۔ یہاں اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ مدنی زندگی کے شروع ہونے کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ

مومنوں کے لئے تو شفاء اور رحمت (کا موجب) ہے۔ اور جو ظالموں کو صرف خسارہ میں بڑھاتی

اِلَّا خَسَارًا ۝ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ

ہے ۸۳ اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ روگرداں ہو جاتا ہے

طاقت مضبوط ہوتی ۔ اور بڑھتی جائے گی۔ اور دشمن کی کمزوری اور ضعف و ناتوانی کے سامان پیدا ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ آخر باطل کمزور پڑتے پڑتے فنا ہو جائیگا۔ اور مکہ کی فتح کے وقت عرب سے بت پرستی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائیگا۔ قرآن کریم کا یہ بےنظیر کمال ہے۔ کہ وہ ہر موقعہ کے لئے ایسے الفاظ چنتا ہے جو ایک لمبے مضمون پر دلالت کرتے ہیں۔ اس آیت میں جو زھق کا لفظ رکھا ہے۔ اس کی جگہ ھلک اور بطل وغیرہ الفاظ بھی رکھے جا سکتے تھے مگر ان سے باطل کی تباہی کی اس تدریج کا علم نہ ہوتا۔ جو زھوق کے الفاظ سے بتائی گئی ہے۔ زھوق کے معنی کمزور ہو جانے اور ہلاک ہو جانے کے ہیں۔ اور اسی طرح مکہ والوں سے گزری یہ نہیں کہ وہ یکدم تباہ ہو گئے۔ بلکہ کمزور ہونے شروع ہوئے۔ آہستہ آہستہ وہ وقت آیا۔ کہ بالکل فنا ہو گئے پس زھوق کے لفظ نے ہلاکت کی تفصیل بھی بتا دی۔

زھوق کا لفظ استعمال کرنے میں حکمت

جب مکہ فتح ہوا اور خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو توڑ توڑ کر پھینکا گیا۔ اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی آیت پڑھتے جاتے تھے۔ ایک ایک بُت پر ضرب لگاتے اور فرماتے جاتے تھے۔ قل جاء الحقُّ وزھق الباطلُ ان الباطل کان زھوقا۔ یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے۔ کہ اس نے کعبہ سے بتوں کے دور کئے جانے کے موقعہ کے لئے جو آیت رکھی ہے۔ وہ شعر کی طرح موزوں ہے۔ اس قسم کی خوشی کا موقعہ انسانی طبیعت کو شعر کی طرف راغب کرتا ہے قرآن شعر نہیں مگر اس کی آیات کے بعض ٹکڑے شعر کی سی موزونیت رکھتے ہیں۔ یہ آیت بھی اگر اس کے شروع سے قُلْ کا لفظ اڑا دیا جائے تو شعر کی طرح موزوں ہو جاتی ہے۔ جاء الحق وزھق الباطل ایک مصرعہ اور ان الباطل کان زھوقا۔ دوسرا مصرعہ ہوتا ہے۔ قل نے اس کو شعر کی تعریف سے نکال دیا۔ لیکن جب اس کے پڑھنے کا موقعہ آیا تو چونکہ اس آیت کو قل کے بغیر پڑھنا تھا اس وقت یہ آیت اپنے شاندار معانی کے علاوہ ایک موزوں کلام کا بھی کام دیتی تھی۔ اور اس خوشی کے موقعہ کے عین مناسب حال تھی۔ جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے دیکھ کر صحابہ کس طرح لہریں لے لے کر اس آیت کو پڑھتے ہوں گے۔ اور کس طرح ان کے ایمان ہر لحظہ اور ہر منٹ بڑھتے ہوں گے۔ اس کا اندازہ اصحاب ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔

خساراً

۸۳ حل لغات

خساراً خسِرَ کا مصدر ہے خَسِرَ التاجر فی بیعہ کے معنی ہیں تاجر کو اپنی تجارت میں گھاٹا ہوا خسر الرجل۔ ضلّ گمراہ ہو گیا۔ ھلک ہلاک ہو گیا (اقرب)

تفسیر۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ایک ہی چیز مختلف نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ اور جیسی کسی کی فطرت ہوتی ہے۔ ایسا ہی وہ دوسری چیزوں کو سمجھتا ہے۔ کتنا ہی اعلیٰ اور پاک کلام کیوں نہ ہو۔ لیکن گندے دل والے انسان کو اس میں گند ہی نظر آتے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں۔ کہ پنڈت دیانند صاحب کو قرآن مجید کے ابتدا سے لے کر آخر تک اعتراض ہی اعتراض نظر آئے۔ اور انہیں کوئی

وَنَا بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ۝ قُلْ

اور اپنے پہلو کو (اس سے) دور کر لیتا ہے۔ اور جب اسے تکلیف پہونچے تو وہ بہت ہی مایوس ہو جاتا ہے ۸۴ تو (انہیں)

كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ

کہہ (کہ ہم میں سے) ہر ایک (فریق) اپنے (اپنے) طریق پر عمل کر رہا ہے۔ پس (اپنے رب پر ہی فیصلہ چھوڑ دو۔ کیونکہ)

هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ

ع ۹/۹

تمہارا رب اسے جو زیادہ صحیح راستہ پر ہے بہتر جانتا ہے۔ (اس لئے اس کا فیصلہ سچے کی سچائی کو ضرور روشن کر دیگا) ۸۵ اور وہ تجھ

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ

سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں تو (انہیں) کہہ (کہ) روح میرے رب کے حکم سے (پیدا ہوئی) ہے۔ اور تمہیں (اس کے متعلق) علم سے کم ہی

خوبی اس میں دکھائی نہ دی یہی معنی اس آیت کے ہیں۔ کہ ظالم اس پر نکتہ چینیاں کر کے اور بھی بدگمانیوں کو بڑھاتے ہیں۔

ان عام معنوں کے علاوہ میرے نزدیک اس آیت کے یہ معنی بھی ہیں۔ کہ اس جگہ قرآن سے مراد وہ خاص حصہ ہے جو پہلے اتر چکا ہے۔ یعنی مومنوں کی ترقی اور کامیابی کی پیشگوئیاں اور دشمنوں کی بربادی اور تباہی کی خبریں۔ فرمایا کہ ان خبروں کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ ان پیشگوئیوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کے زخمی دلوں کو شفا حاصل ہوگی۔ اور ان کے زخم مندمل ہوں گے۔ ان کے ترقی کے سامان پیدا ہونگے مگر یہی پیشگوئیاں کافروں کے حق میں نقصان اور تباہی کے سامان ساتھ لائیں گی۔

۸۴ حل لغات۔ نأبجانبہ۔ نأی کے معنی ہیں بَعُدَ دور ہوا۔ ب لازم فعل کو متعدی بنانے کے لئے ہے پس نأبجانبہ کے معنی ہوں گے اس نے اپنے پہلو کو دور کر لیا (اقرب)

نابجانبہ

یؤُساً۔ یئِسَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یؤُوس کے معنی ہیں بہت مایوس ہونے والا (اقرب)

یؤساً

تفسیر۔ اس میں بتایا کہ مومن اور کافر میں بڑا فرق ہے۔ مسلمانوں نے متواتر تیرہ سال تک مشکلات اور مصائب برداشت کئے۔ ماریں کھائیں اور عذاب سہے مگر اف تک نہ کی۔ لیکن ان کافروں پر جب عذاب شروع ہوگا اور مومنوں کی ترقی کے سامان ہوں گے تو یہ کفار اسی دن ہتھیار ڈال دیں گے۔ اور نا امید ہو جائیں گے۔ چونکہ کافر کو خدا پر ایمان نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ ذراسی تکلیف سے بھی گھبرا جاتا ہے مگر مومن خدا کے لئے سب کچھ دلیری اور جرأت سے برداشت کرتا ہے

۸۵ حل لغات۔ شاکلۃ اس کا مادہ شکل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں الشکل صورت۔ شکل الناحیۃ طرف۔ النیۃ نیت۔ الطریقۃ طریق المذہب راستہ۔ مذہب الحاجۃ ضرورت (اقرب)

شاکلتہ

تفسیر۔ فرماتا ہے منکرین سے کہہ دے کہ ہر شخص اپنے اپنے طریق پر اور اپنی اپنی شکل و صورت یعنی اپنی قابلیت۔ اپنے اپنے دین اور اپنی اپنی نیت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ مومن کی نیت چونکہ خدا تعالےٰ کا حصول ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دنیا کے چلے جانے پر گھبراتا نہیں۔ بلکہ سب ابتلاؤں کا دلیری سے مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن کافر چونکہ دنیا پرست

اِلَّا قَلِيْلًا ○ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ

(ترجمہ) دیا گیا ہے ۸۶؎ اور اگر ہم چاہیں تو یقیناً جو (کلام الٰہی) ہم نے تجھ پر وحی (کے ذریعہ سے نازل)

ہوتی ہے۔ اور اس کا سارا عمل دنیا کی خاطر ہوتا ہے جب وہ دنیا کو جاتے دیکھتا ہے تو گھبرا کر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ فرمایا تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت کی راہ پر عمل کر رہا ہے۔ یعنی خدا تعالےٰ بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا ہے جیسی کہ اس شخص کی نیت ہوتی ہے۔ فرمایا ہم عمل کو بھی دیکھیں گے۔ اور نیت کو بھی۔ اور پھر دونوں کے مطابق معاملہ کریں گے۔ جو خدا تعالےٰ کی رضا کو مد نظر رکھیں گے اور اس کے دین کے لئے قربانیاں کریں گے۔ ان کی تائید و نصرت کی جائیگی۔

میں نے پچھلی آیات کی تفسیر میں کفار مکہ کو مد نظر رکھا ہے۔ لیکن یہی مضمون یہود کے متعلق بھی چسپاں ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ انہوں نے بھی مدینہ کے ہجرت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا۔ اور آخر تباہ و برباد ہوئے۔ اور خیبر کی جنگ کے بعد ان کا عرب سے صفایا ہو گیا۔ اور انہوں نے بھی دعوے تو بڑے کئے مگر جب مسلمان مجبور ہو کر دفاع کے لئے کھڑے ہو گئے تو اس طرح بزدلی سے ہتھیار ڈالدیئے۔ کہ ہمیشہ تاریخ ان کی بزدلی کی داستان بطور مثال قائم رکھے گی۔

حضرت مسیح موعودؑ کے نزدیک اس جگہ روح سے مراد روح انسانی ہے

۸۶؎ حل لغات۔ الروح کے لئے دیکھو حجر ۳۰ ع

تفسیر۔ یہ رُوح جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے کیا چیز ہے؟ مفسرین نے اس کی مختلف تاویلیں کی ہیں بعض نے اس سے جبرائیل مراد لیا۔ اور بعض نے اس سے مراد قرآن کریم کو لیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی قرآن کریم کا ذکر ہے (بحر محیط) بعض نے وُہ فرشتہ مراد لیا ہے جس کے سپرد دُنیا کی پیدائش ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر ایک فرشتہ کو رُوح کہتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک ایک خاص فرشتہ ہے

روح کے متعلق مفسرین کے اقوال

جس کو اللہ تعالےٰ نے صرف اپنی تسبیح کے لئے پیدا کیا ہے بعض نے تو اس روایت کو صحابہ رضوان اللہ علیہم تک پہونچایا ہے کہ اس کے سو سر ہیں۔ ہر ایک سر میں سو منہ ہیں۔ اور ہر ایک مونہہ میں سو زبان ہے۔ اور ہر ایک زبان سو سو بولی میں خدا تعالےٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ انہوں نے غالباً اس روایت کو بیان کر کے سمجھ لیا ہے۔ کہ شاید اس طرح خدا کی تسبیح کا حق پُورا ہوجائیگا۔ حالانکہ اس تسبیح سے زیادہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہی اللہ تعالےٰ کی تعریف کر رہی ہے۔ ساری دنیا میں مسلمان پھیلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں بولیاں بولتے ہیں۔ اور ہر زبان میں آپ کی تعریف کر رہے ہیں۔ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ اس جگہ رُوح کے معنی کلام الٰہی کیا کرتے تھے۔ اور یہ معنی دوسرے تمام معنوں سے اچھے ہیں۔ اور زیادہ صحیح ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے اور اس آیت کے بعد بھی قرآن کریم کا ہی ذکر ہے۔ مگر حضرت مسیح موعودؑ بانی سلسلہ احمدیہ نے نہایت وضاحت سے اس آیت پر بحث کی ہے۔ اور اس کے معنی انسانی رُوح ہی کے لئے ہیں۔ اور فرمایا ہے کہ اس آیت میں رُوح کے متعلق بہت بڑے معارف بیان کئے گئے ہیں۔

اس آیت میں جو یہ فرمایا ہے کہ لوگ سوال کرتے ہیں کہ رُوح کیا ہے۔ اس کے متعلق احادیث میں مختلف روایات آتی ہیں۔ بعض میں تو لکھا ہے۔ کہ یہ سوال یہود نے مدینہ میں کیا تھا۔ مگر اس کے خلاف یہ بات پیش کی جاتی ہے۔ کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ اس کا جواب وہ لوگ یہ دیتے ہیں۔ کہ اس سورۃ کی بعض آیتیں مدنی ہیں (مگر جیسا کہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ یہ درست نہیں)

بعض نے کہا ہے کہ یہ سوال پہلے مکہ میں ہوا تھا۔ اور پھر دوبارہ مدینہ میں ہوا۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے۔ کہ یہ

سوال مدینہ میں ہوا تھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ وہی اس بات کے راوی ہیں۔ کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ اس کا جواب بعض علماء نے یہ دیاہے۔ کہ یہی سوال دوبارہ پھر مدینہ میں ہوا ہوگا جو لوگ اس کو مکہ کی روایت قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ مکہ کے بعض لوگ مدینہ گئے تھے۔ اور وہاں جاکر انہوں نے یہود سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کیا اور کہا کہ اس طرح پر ایک مدعی نبوت ہم میں کھڑا ہوا ہے ہم اس سے کیا سوال کریں جس سے اس کا جھوٹ کھل جائے انہوں نے جواب دیا کہ رُوح اور اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق اس سے سوال کرو۔ اس پر ان لوگوں نے مکہ میں واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سوال کیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

میرے نزدیک پہلی دفعہ سوال مکہ میں ہی ہوا ہے۔ اور وہیں اس کا جواب ملا ہے۔ ممکن ہے مدینہ میں بھی یہود نے سوال کیا ہو۔ بلکہ اغلب ہے کیونکہ جب یہود کی انگیخت سے یہ سوال ہوا تھا تو انہوں نے بھی ضرور یہ سوال کیا ہوگا۔ مگر یہ درست نہیں۔ کہ دوبارہ یہ آیت اتری۔ بلکہ جب مدینہ میں یہ سوال ہوا ہوگا۔ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت جواب میں پڑھ دی ہوگی۔ اس واقعہ کو کسی راوی نے بیان کیا۔ اور بعد کے راویوں میں سے کسی نے سمجھ لیا۔ کہ شائد اس سوال کے جواب میں یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی تھی:

سوال کی حقیقت بیان کرنے کے بعد میں جواب کو لیتا ہوں مفسرین لکھتے ہیں۔ کہ اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوال کے جواب تو اللہ تعالےٰ نے تفصیلاً دیئے۔ اور اس سوال کا جواب یہ دیا ہے۔ کہ رُوح خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ اور تم کو اس بارہ میں بہت ناقص علم دیا گیا ہے۔ اس لئے تم اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے ہم تفصیل سے جواب نہیں دیتے اس پر یہود شرمندہ اور خاموش ہوگئے۔

اس جواب پر آریہ مصنفین نے بہت اعتراض کئے ہیں۔ اور لکھا ہے۔ کہ اس جواب سے یہود کو شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کونسا مدلل ومسکت جواب دیا گیا تھا کہ وہ شرمندہ ہوجاتے

جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب اس کے یہ معنی کرتے تھے۔ کہ رُوح سے مراد اس جگہ کلام الہٰی ہے۔ اور جواب یہ دیا گیا ہے۔ کہ کلام الہٰی حکم الہٰی سے نازل ہوتا ہے۔ اور اس کی ضرورت یہ ہے کہ تم کو بہت کم علم دیا گیا ہے۔ پس انسانی علم کے ناقص ہونے کی صورت میں ضروری تھا کہ اللہ تعالےٰ انسان کے علم کو روحانیات کے بارہ میں مکمل کرتا۔ سو اس ضرورت کے ماتحت اس نے اپنا کلام نازل کیا ہے۔ جیسا کہ میں بحر محیط کے حوالہ سے اوپر لکھ آیا ہوں۔ پرانے مفسروں میں سے بھی بعض نے روح سے قرآن کریم مراد لیا ہے۔ اور ان کی تفسیر حضرت استاذی المکرم کی تفسیر سے ملتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ظاہر ہے روح سے صرف قرآن کریم مراد لینا اس قدر واضح نہیں جس قدر کہ کلام الہٰی کا مراد لینا۔ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ حضرت استاذی المکرم کا قول زیادہ واضح اور موقعہ کے مناسب ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح اول کے نزدیک روح سے مراد [کلام الہٰی ہے]

یہ آیت مکی ہے۔

میں ایک عرصہ تک انہی معنوں پر حصر کیا کرتا تھا۔ مگر جب میں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ کی بعض تحریرات کو غور سے پڑھا۔ تو مجھے اپنے خیال میں کچھ تبدیلی کرنی پڑی۔ اور تسلیم کرنا پڑا۔ کہ رُوح انسانی کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔ اور ان معنوں سے آیت کا مضمون بہت وسیع اور بہت لطیف ہوجاتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ کی خلق دو طرح کی ہے (۱) ابتدائی خلق جو بغیر مادہ کے ہوتی ہے (۲) بعد کی خلق جو پہلے سے پیدا کئے ہوئے مادہ سے ہوتی ہے۔ جس خلق میں اللہ تعالےٰ دنیوی اسباب سے کام لیتا ہے۔ یعنی ایسے ذرائع کو استعمال کرتا ہے۔ جو کسی چیز کی پیدائش سے پہلے موجود ہوں۔ اس کا نام خلق رکھا جاتا ہے اور جس چیز کو اللہ تعالےٰ بغیر ان ذرائع کے جو پہلے موجود ہوں پیدا کرتا ہے۔ اس کا نام امر رکھا جاتا ہے۔ جس کی طرف کُنْ فَیَکُوْنُ کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں کہا

حضرت مسیح موعود کے نزدیک اس میں روح انسانی کی طرف اشارہ ہے۔

قسم کی تخلیق کے متعلق جواب دیا گیا ہے۔ جو اذن الٰہی سے ہوتی ہے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی آریہ اس پر اعتراض کریگا اور میرے مقابل آئیگا تو میں ایک رسالہ لکھونگا۔ جس میں بتاؤنگا کہ قرآن کریم نے رُوح کے اندر کیا کیا قوتیں اور طاقتیں بیان فرمائی ہیں۔ مگر افسوس کہ کوئی آریہ مقابل پر نہ آیا۔ اور ہم اس قیمتی خزانہ سے محروم رہ گئے۔ جو ہم کو مفت میں ملنے والا تھا۔ مگر پھر بھی آپ کی بعض کتب سے رہنمائی حاصل کر کے ہم ایک کافی علم اس بارہ میں حاصل کرتے ہیں۔ اور شائد اللہ تعالےٰ نے بقیہ علم کو کسی حکمت کے ماتحت کسی اور زمانہ کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہو۔

یہود نے تصوف کی طرف رجحان کلام الٰہی کے بند ہونے کی وجہ سے ہوا

اب میں ان معنوں کی بناء پر جو بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے کئے ہیں۔ اس آیت کی تشریح اپنی سمجھ کے مطابق کرتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ جو شخص بھی تعصب سے خالی ہو کر ان معنوں پر غور کرے گا۔ وہ محسوس کرے گا۔ کہ اس آیت میں یہود کے سوال کو بے جواب نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کا نہایت لطیف اور مسکت جواب دیا گیا ہے۔ اس جواب سے یہ بھی معلوم ہو جائیگا۔ کہ جن لوگوں نے اس جگہ رُوح کے معنی کلام الٰہی کے کئے ہیں۔ یا قرآن کریم کے کئے ہیں۔ انہوں نے بھی غلطی نہیں کی۔ بلکہ صداقت ہی کو بیان کیا ہے۔

یہود کے نزدیک روح کی دو قسمیں اسم اعظم اور بعل سے تعلق

بات یہ ہے کہ پہلی آیات میں قرآن کریم کی فضیلت اور اس کی ضرورت کو بیان کیا گیا تھا۔ بلکہ پہلی دو سورتوں میں تو اسی مضمون پر سارا زور تھا۔ سورۃ حجر اور سورۃ نحل جیسا کہ میں ثابت کر آیا ہوں۔ قرآن کریم کی طاقت اور اس کی قوت کے متعلق ہی دلائل بیان کرتی ہیں۔ اس سورۃ میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ کہ جب تک یہود کلام الٰہی سے وابستہ رہے ترقی کرتے رہے جب انہوں نے کلام الٰہی کو چھوڑ دیا۔ تو ان پر عذاب نازل ہوا۔ یہود چونکہ اپنے خیال میں یہ سمجھ رہے تھے۔ کہ ہم پر سبت کی بے حرمتی کی وجہ سے عذاب آیا ہے انہیں یہ مسئلہ عجیب معلوم ہوا بلکہ بُرا بھی لگا۔ خصوصاً اس لئے کہ عیسائی لوگ مسیح کو کلمۃ اللہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ پس یہ الفاظ کہ خدائی کلام کے انکار کی وجہ سے ان پر عذاب آیا ہے۔ انہیں بہت دکھ دیتے تھے۔ ادھر یہود میں ایک اور نقص بھی پیدا ہو گیا تھا۔ جو مایوس اقوام میں عام طور پر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب وہ کلام الٰہی سے محروم ہو گئے۔ اور نبوت کا سلسلہ ان میں بند ہو گیا۔ تو وہ جھوٹے تصوف کی طرف راغب ہو گئے۔ اور خاص خاص شغلوں کے ذریعہ سے بزعم خود اپنی روحانی قوتوں کے بڑھانے میں مشغول ہو گئے کوئی تو ذکر اذکار کے ذریعہ سے اپنی قوتوں کو بڑھاتا۔ اور کوئی اسم اعظم کو قابو میں لا کر اپنی روحانیت کو ترقی دیتا تھا۔ اور یہ سب لوگ خیال کرتے تھے۔ کہ جو کمی وحی الٰہی کے نہ آنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس طرح انہوں نے دور کر لی ہے۔ یہ مرض حضرت داؤد کے زمانہ سے پیدا ہوئی اور حضرت مسیح کے نزول کے وقت تک بہت ترقی کر گئی۔ ان کا خیال تھا کہ ارواح کو قابو میں لا کر یا اپنی روح کو جلا دیکر انسان بہت بڑے بڑے معجزات دکھا سکتا ہے۔ اور علوم غیبیہ کو پا سکتا ہے۔ اور وہ اس علم کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے ایک جائز علم جسے وہ اسم اعظم سے وابستہ کرتے تھے۔ اور ایک ناجائز جسے وہ بعل سے تعلق کا نتیجہ بتلاتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت مسیح علیہ السلام نے دعوےٰ کیا۔ اور معجزات دکھلائے تو انہوں نے ان کے معجزات کی یہی تشریح کی۔ کہ اس کا بعل کے ساتھ تعلق ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر انجیل میں ان الفاظ میں آتا ہے۔ "فقیہہ جو یروشلم سے آئے تھے یہ کہتے تھے۔ کہ اس کے ساتھ بعلزبول ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ بدروحوں کے سردار کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے۔ وہ انہیں پاس بلا کر تمثیلوں میں ان سے کہنے لگا۔ شیطان کو شیطان کس طرح نکال سکتا ہے۔" (مرقس باب ۳ آیت ۲۲-۲۳)

(یہی ذکر متی باب ۹ آیت ۳۴ و باب ۱۰-۲۵۔ لوقا باب ۱۱-۱۵۔ اور یوحنا باب ۷-۲۰ اور باب ۸-۴۸ و ۵۲ و باب ۱۰-۲۰ میں بھی آتا ہے) بعل زبو یا بعل زبول یا بعل زبوب

درحقیقت ایک ہمسایہ قوم کا دیوتا تھا۔ چونکہ اس کی نسبت لوگوں میں معجزات مشہور تھے۔ یہود میں جب جادو کا خیال پیدا ہوا۔ تو وہ اس کے متعلق یہ خیال کرنے لگے۔ کہ یہ بعل سفلی دنیا کا سردار ہے۔ اور اس سے تعلق پیدا کرکے کفار لوگ معجزات دکھاتے ہیں۔ (انجیل کے مذکورہ بالا حوالہ جات نیز انسائیکلو پیڈیا ببلیکا نیز جوئش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ بیل زبول) اس کے برخلاف جو روحانی طاقتیں بزعم خود وہ آپ حاصل کرتے تھے۔ انہیں اسم اعظم کا نتیجہ بتاتے تھے۔ اور اس جادو کو جائز جانتے سمجھتے تھے۔ جوئش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے۔ کہ مسیح سے کم سے کم تین سو سال پہلے سے اسم اعظم کا رواج یہود میں پایا جاتا ہے (میں بتا چکا ہوں۔ کہ میری تحقیق میں حضرت داؤد کے زمانہ سے ان میں یہ خیال پیدا ہو چکا تھا۔ حضرت سلیمان کے زمانہ میں اور ترقی کر گیا۔) وہ اسم اعظم کی نسبت یہ مشہور کرتے تھے۔ کہ وہ نہ بولا جا سکنے والا نام ہے (جوئش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ NAMES) یہود میں جو جادوگر تھے۔ وہ اس کا نام خاص طور پر اشاروں میں لکھتے تھے۔ یہ لوگ خصوصاً مصر میں پائے جاتے تھے۔ (حوالہ متذکرہ بالا) یہود کا خیال تھا کہ سیاہ جادو اور سفید جادو دونوں حق ہیں۔ سیاہ جادو شیطانوں سے تعلق کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور سفید جادو اسماء الٰہی سے تعلق کی وجہ سے۔ سیاہ جادو منع ہے۔ اور سفید جادو جائز ہے لکھا ہے کہ علماء یہود سیاہ جادو کے مخالف تھے۔ مگر سیاہ جادو کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ سفید جادو کے استعمال میں ہرج نہ دیکھتے تھے۔ علماء یہود میں (بقول ان کے) اس جادو کے ذریعہ سے اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی تھی۔ کہ وہ ایک نظر ڈالکر دشمن کو بھسم کر دیتے تھے۔ یا اسے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بنا دیتے تھے۔ بیماروں کو اچھا کرتے تھے۔ ان امور کا ان میں اس قدر رواج تھا۔ کہ یونانی اور رومی لوگ یہود کو جادوگر کہا کرتے تھے۔ (جوئش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ میجک یعنی جادو جلد ۸)

اس کے علاوہ یہود کا یہ بھی عقیدہ تھا۔ کہ مُردہ ارواح سے تعلق پیدا کرکے غیب کے علوم معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ توراۃ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ استثناء باب ۱۸ - ۱۱ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ اور اور بہت سی آیات میں بھی۔ اسی طرح یسعیاہ باب ۸ - ۱۹ میں بھی ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو ارواح سے تعلق پیدا کرکے غیب کا حال معلوم کرتے تھے۔ اور ان سے تعلق پیدا کرنا منع کیا گیا ہے۔ یسعیاہ لکھتے ہیں کہ جب لوگ تجھے ایسے لوگوں سے تعلق پیدا کرنے کو کہیں تو ان سے کہہ کہ "کیا زندوں کی نسبت مُردوں سے سوال کریں"۔ جوئش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے بنی اسرائیل نے غالباً یہ فن ایرانیوں سے سیکھا تھا۔ اور ان میں کثرت سے اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ (جلد ۹ زیر لفظ نیکرومنسی یعنی علم الارواح) خلاصہ یہ کہ یہود کا عقیدہ تھا۔ کہ ارواح سے تعلق پیدا کرکے غیب کے علوم دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ اور گو ان کو اس سے منع کیا گیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ کثرت سے اس علم کو سیکھتے۔ اور اس پر عمل کرتے تھے۔

اسم اعظم کی طرف توجہ حضرت داؤد کے زمانہ سے ہوئی

موجودہ زمانہ میں بھی اس کا بہت رواج ہے۔ یورپ میں اس علم والوں کو سپر چولسٹ کہتے ہیں یعنی روحانیین تھیاسوفیکل سوسائٹی کی بنا ہی اس علم پر ہے۔ موجودہ تھیاسوفی کی بانی مسز اینی بسنٹ کا یہ عقیدہ تھا۔ کہ ارواح سے وہ بہت کچھ سیکھتی ہیں۔ اور وہ اس کے ماتحت غیب کی خبریں بھی بتاتی تھیں۔ چنانچہ بزعم خود انہوں نے اس علم سے کام لے کر ایک بڑے اوتار کے آنے کی خبر دی تھی جس کی نسبت ان کا خیال تھا کہ کرشنا مورتی اس کا مصداق ہے۔ اب یہ نوجوان جو تعلیم دیتا ہے۔ وہ قریباً دہریت کی تعلیم ہے۔

سیاہ جادو اور سفید جادو کی تشریح

گزشتہ جنگ یورپ میں جب بہت سے گھرانوں کے نوجوان مارے گئے۔ اس کی طرف خاص توجہ ہوگئی۔ اول

سرکینن ڈائل مشہور مصنف نے اپنی آخری عمر اپنے ایک لڑکے کی یاد میں اس علم میں گزار دی۔ مشہور ادیب اور سیاستدان ڈبلیو ٹی سسٹڈ بھی اسی خیال کے تھے۔ اور انہوں نے اپنے تجربوں کی کتاب بھی شائع کی ہے۔ مشہور سائنسدان سر آلیور لاج بھی آخری عمر میں اس عقیدہ کے ہو گئے تھے۔ کہ ارواح سے تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے علاوہ انہوں نے بھی کئی کتب اس بارہ میں لکھی ہیں۔ ہندوؤں میں یوگا کے نام سے یہ علم رائج ہے۔ اور ان کے ایک شاستر میں جسے پتنجلی کا یوگ شاستر کہتے ہیں اس مضمون پر خاص بحث کی گئی ہے۔ مسلمان صوفیاء نے بھی تنزل کے زمانہ میں اس علم کی طرف توجہ کی۔ اور علم اشراق اور حاضرات وغیرہ کے نام سے بہت کچھ رطب و یابس اس پر لکھا ہے۔ اور کہا ہے اور اس نام نہاد علم کو استعمال کیا ہے۔

ہندوؤں کا یوگا علم الارواح

خلاصہ یہ کہ علم الارواح ایک قدیم علم ہے۔ اور یہود میں اس کا خاص رواج تھا۔ خصوصاً جب ان کا تعلق دین سے کم ہوا اور الہام کا دروازہ بند ہوا تو وہ اس کی طرف بہت متوجہ ہو گئے۔ حضرت مسیح ناصری کے وقت میں ان میں اس کا رواج بہت بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت مسیح کے وقت میں ایک فرقہ ہوا اسینیوں کے نام سے تھا جن کی نسبت انجیل میں فریسیوں کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ حضرت مسیح اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک پرانا نسخہ کتاب کا جرمنی میں ملا ہے جس میں ایک اسینی نے دعوے کیا ہے کہ مسیح ہمارے فرقہ کے ایک آدمی تھے۔ اور مسیح کی زندگی کے حالات عجیب پیرایہ میں اس میں لکھے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ صلیب پر سے زندہ اتر آئے تھے۔ دیکھو THE CRUCIFIXION BY AN EYE WITNESS یہ کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس فرقہ کی نسبت انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے۔ کہ یہ لوگ روزے رکھتے۔ اور بڑی پاک زندگی بسر کرتے تھے۔ اور غیب کی خبریں بتاتے تھے۔ اور معجزے دکھاتے تھے۔ چنانچہ فائلو Philo ان کی نسبت لکھتا ہے۔ کہ غیر قوموں کے جادوگروں سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے اندر بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ اور اس نے مثال کے طور پر اسینیوں کو پیش کیا ہے جوزیفس مشہور یہودی مصنف بھی ان کے ذکر میں لکھتا ہے کہ وہ پیشگوئیاں کرتے تھے۔ اور غیب کی خبریں بتاتے تھے ان کی نسبت لکھا ہے کہ عبادت کے وقت مراقبہ کرتے تھے۔ تا ان کی ارواح کا تعلق آسمانی باپ سے پیدا ہو جائے اور ان کے لیڈر اسم اعظم کے جاننے کا دعوےٰ کرتے تھے جو بقول ان کے بیالیس حرفوں کا ہے۔ یہ لوگ عورتوں سے الگ رہنے کو پسند کرتے تھے۔ تاکہ "مزید الہام ان پر نازل ہو" (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا جلد ۸ صفحہ ۱۸ ۷ تا ۲۰ ۷)

عبد اللہ بن صیاد ارواح سے تعلق کی وجہ سے غیب کا دعویدار تھا۔

عیسائیوں کے فرقہ ایسینیز کے حالات

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مدینہ کے یہود اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے۔ کہ مدینہ کے یہود میں سے ایک شخص عبد اللہ بن صیاد پیشگوئیاں کیا کرتا تھا جب اس کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ اس کا امتحان کرنے کے لئے گئے۔ اور چونکہ وہ غیب کے علم کا دعویٰ کرتا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ کہ میں نے اپنے ذہن میں ایک لفظ رکھا ہے۔ تم بتاؤ کہ وہ کیا ہے آپ نے سورہ دخان کی آیت فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ۔ ذہن میں رکھی تھی۔ اس نے سوچ کر جواب دیا دخ۔ دخ اور آگے خاموش ہو گیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لن تعدو قدرك تو جس حیثیت کا ہے۔ اس سے آگے نہ بڑھے گا۔ یعنی تیرا علم دماغی ہے۔ تو الہی اخبار کو نہیں بتا سکتا۔ اس شخص کے متعلق صحابہ کو خیال تھا۔ کہ یہ دجال ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آپ کو یہ کہکر منع فرمایا۔ کہ اگر یہ دجال ہے تو تم اس کو مار نہیں

سکتے۔ اور اگر یہ دجال نہیں تو پھر اس کا مارنا جائز ہے بہرحال اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مدینہ کے یہود میں اس قسم کے لوگ موجود تھے۔ جو ارواح سے تعلق رکھنے کے مدعی تھے۔ اور یہ اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ وہ اپنی فرقہ کے لوگوں سے تعلق رکھتے تھے۔

اس تمہید کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ جب قرآن کریم نے غیب کی خبریں بتائیں۔ اور کفار نے جواب سے عاجز آکر یہود سے اس بارہ میں مدد چاہی تو انہوں نے ان سے کہا کہ اس شخص سے رُوح کے متعلق سوال کرو یعنی روح میں کیا کیا قوتیں ہیں۔ اس سوال کے جواب سے وہ پکڑا جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر تو آپ یہ جواب دیں گے۔ کہ رُوح میں بڑی بڑی طاقتیں ہیں۔ جن سے وہ علم غیب معلوم کرلیتی ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ پھر قرآنی علوم کو ہم خداتعالےٰ کی طرف سے کیوں سمجھیں۔ کیوں نہ اسے آپ کی بعض روحانی مشقوں کا نتیجہ قرار دیں۔ اور اگر آپ یہ جواب دیں گے۔ کہ رُوح میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے۔ تو ہم آپ کے اس جواب پر آپ کی جہالت کو ثابت کریں گے۔ گویا ان کے نزدیک قرآنی علوم محض ایک دماغی مشق کا نتیجہ تھے۔

اس امر کا ثبوت کہ یہود میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں ارواح سے تعلق پیدا کرنے کا خیال پایا جاتا تھا۔ قرآن کریم سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ سورۂ جن میں ایک ایسی جماعت کا ذکر کرکے جو موسےٰ پر ایمان لائی تھی۔ اور جن کی نسبت میں پہلے ثابت کر آیا ہوں۔ کہ وُہ انسان ہی تھے۔ ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ انا کنا نقعد منھا مقاعد للسمع (سورہ جن رکوع ۱) کہ ہم آسمانی خبروں کے معلوم کرنے کے لئے آسمان کی طرف توجہ کرکے بیٹھا کرتے تھے۔ یعنی مراقبہ کیا کرتے تھے۔

اگر یہود ایسا سوال نہ کرتے تب بھی قرآن کریم میں اس سوال پر روشنی ڈالنی ضروری تھی۔ کیونکہ یہ عقیدہ درحقیقت سب سچے مذہبوں پر حملہ ہے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خداتعالےٰ کے بتائے بغیر بھی انسان ارواح کی مدد سے ہدایت کے اصول دریافت کرسکتا ہے۔ جیسا کہ تھیاسوفی والے ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس عقیدہ کے رو سے ہر شخص جو بعض نام نہاد روحانی مشقیں کرے علوم غیبیہ سے آگاہ ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہو تو مذہب کے بارہ میں امن بالکل اٹھ جاتا ہے۔

۱ کفار کے آنحضرتؐ سے روح کے متعلق سوال کرنے کی وجہ

قرآن کریم اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ اے محمد رسول اللہ تو ان سے کہہ دے کہ رُوح کامل یعنی جو رُوح خداتعالےٰ سے صحیح تعلق رکھتی ہے اور بعض علوم غیبیہ سے آگاہ کی جاتی ہے من امر ربی ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے حکم سے تیار ہوتی ہے۔ بغیر امر رب کے کوئی رُوح کامل نہیں ہوسکتی۔ اور جس قسم کی مشقوں اور جادوؤں اور یوگا کو تم روح کے کامل کرنے کا ذریعہ بتاتے ہو۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ رُوح صرف اور صرف اللہ تعالےٰ کے حکم سے کامل ہوتی ہے گویا اس جگہ الروح سے مراد کامل رُوح ہے جو سب روحانی صفات کو اپنے اندر رکھتی ہو۔ جیسے کہ قرآن کریم کے شروع میں ہی آتا ہے۔ الحمد للہ کامل حمد جس میں حمد کی سب ضروری صفات پائی جائیں اللہ تعالےٰ ہی کو حاصل ہے۔ انہی معنوں میں الروح کا لفظ اس جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے۔ کہ روح کو کامل کرنے کا کام اللہ تعالےٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ بغیر اذن الٰہی کے کوئی روح کامل نہیں ہوسکتی۔ خواہ اس کے کامل کرنے کے لئے کتنے ہی یوگ استعمال کئے جائیں۔ اور کتنی ہی مشقیں کی جائیں۔ اس دعوے کی ایک تازہ مثال کرشنا مورتی کا وجود ہے۔ مسز اینی بیسنٹ نے اس نوجوان کو اور ان کے ایک اور بھائی کو خاص طور پر یوگا کے اصول کے ماتحت پالا تھا۔ اور بڑے بڑے ماہر فن ان کی تربیت پر مقرر کئے تھے۔ کہ روزانہ توجہ سے ان کے خیالا

۲ روح کے امر ربی ہونے کی تشریح

أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝

کیا ہے۔ اسے (دنیا سے) اٹھالیں۔ پھر تو اس امر میں اپنے لئے ہمارے خلاف کوئی کارساز نہیں پا سکیگا ۔

کو درست رکھیں۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ جو بڑا بھائی تھا وہ تو ہر وقت شکائت کرتا تھا۔ کہ ہم قیدیوں کی طرح ہیں۔ اور خواہ مخواہ ہم پر جبر کیا جاتا ہے۔ اور چھوٹا بھائی جسے بے سکھ بغاوت کی تو بچ چنا گیا۔ اب علی الاعلان مسز اینی بسنٹ کے خیالات کی تردید کر رہا ہے۔

اگر کہا جائے کہ قرآن کریم کا یہ جواب تو ایک دعویٰ ہے جواب کہلانیکا مستحق نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حد تک تو صرف اصل بتایا گیا ہے۔ سوال کا جواب آیت کے اگلے حصہ سے شروع ہوتا ہے وما اوتیتم من العلم الا قلیلا کہہ کر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ روح کی قوتوں کو نشو ونما دینے کے لئے جو مشقیں انسانوں نے بنائی ہیں۔ گو ان کے نتیجہ میں بعض قوتیں روح کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ حقیقی قوتوں کے مقابلہ میں بالکل ناقص اور تھوڑی ہیں۔ پس ان کی بناء پر کلام الہٰی کا انکار عقل کے خلاف ہے۔ ناقص شیٔ کامل کی قائم مقام کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔

علم الارواح کے ناقص ہونے کا ثبوت اس سے حاصل شدہ خبروں میں شدید اختلاف

اس امر کا ثبوت کہ یہ علم بالکل ناقص ہے میں ہمیشہ یہ دیا کرتا ہوں۔ کہ مختلف مذاہب کے لوگ جو اس علم کی مدد سے روحانی باتیں دریافت کرتے ہیں۔ ان کی معلوم ہوئی خبروں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر روحانی مشغلوں سے سابق ارواح سے حقیقی طور پر علوم دریافت کئے جا سکتے۔ تو یہ اختلاف کبھی نہ ہوتا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح ایک ہندو یوگی کو کچھ اور بتا جاتی ہے۔ اور ایک مسیحی روحانی کو کچھ اور بتا جاتی ہے۔ اور ایک یہودی کو کچھ اور بتا جاتی ہے۔

جو لوگ اس علم کے ماہر ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب مسٹر انکنس امریکن جو بہت سی کتب کے مصنف ہیں صاف

سمجھتے ہیں کہ ہم کو بری اور منذر باتوں کا علم ہو جاتا ہے اور آئندہ کی اچھی خبریں نہیں ملتیں۔ یہ گویا اپنے مونہہ سے اقرار ہے کہ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ حالانکہ انبیاء کی نسبت قرآن شریف یہ فرماتا ہے وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (کہف) رسول کا پہلا کام اخبار غیبیہ بتانا ہے۔ جو بشارتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور دوسرا کام انذاری خبروں کا بتانا ہے۔

۸۷ تفسیر۔ اس آیت میں گو خطاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ مگر مراد انسان ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو نہ کوئی اعتراض تھا نہ سوال۔ جن کا سوال تھا انہی کو جواب دیا گیا ہے پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب صرف مضمون پر زور دینے کے لئے ہے

فرماتا ہے کہ رُوح بغیر امر الہٰی کے ایسی ناقص شے ہے۔ کہ علوم روحانیہ کا براہ راست لے آنا تو بڑی بات ہے جو علوم اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہو چکے ہیں۔ وہ اگر مٹ جائیں تو ان کو بھی روحانی لوگ واپس نہیں لا سکتے خواہ کتنے لوگ مل کر کوشش کریں۔ مثلاً قرآن کریم ہی ہے اس کے علوم کو اگر ہم مخفی کر دیں۔ تو کوئی ان علوم کو واپس نہیں لا سکتا۔ شائد کوئی کہے کہ یہ ایک دعویٰ ہے تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ دعویٰ نہیں بلکہ زبردست ثبوت ہے۔ کیونکہ قرآن کریم آسمان پر تو جائیگا نہیں۔ مگر جن کے دماغوں میں قرآنی برکات نہیں۔ ان کے لئے قرآنی علوم ویسے ہی ہیں جیسے کہ دنیا سے چلے گئے۔ وہ لوگ اگر چاہیں کہ قرآنی تعلیم جیسی کوئی تعلیم پیش کر دیں۔ تو وہ ایسا نہیں کر سکتے چنانچہ اگلی ہی آیت میں اس شبہ کا بھی ازالہ کر دیا گیا ہے۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ قرآن کریم

إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ

اپنے رب کی (خاص) رحمت کے سوا (کہ وہی اسے واپس لا سکتی ہے) مگر یہ قرآن مٹ نہیں سکتا کیونکہ تجھ پر تیرے رب کا یقیناً (بہت) بڑا فضل

كَبِيرًا ۝ قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ

ہے۔ ۵۸ تو (انہیں) کہہ (کہ) اگر تمام انسان (بھی) اور جن (بھی) اس کی نظیر لانے کے لئے) جمع ہو جائیں۔

عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ

(تو بھی) وہ اس کی مثل نہیں لا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے

بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ۝ وَلَقَدْ

کے مددگار (ہی کیوں نہ) بن جائیں ۵۹ اور ہم نے

زمین سے اٹھ جائیگا۔ اور احادیث میں بھی یہ ذکر آتا ہے۔ ابن مسعود اور ابن عمر سے ابن مردویہ نے روایت کی ہے کہ قرآن کریم دُنیا سے اٹھ جائیگا۔ اور صرف لا الٰہ الا اللہ رہ جائیگا۔ اسی طرح بیہقی اور ابن ماجہ نے حذیفہ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام اور قرآن دُنیا سے اٹھ جائیں گے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس آیت میں ایک پیشگوئی بھی کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ایک وقت میں صرف قرآن کریم کے الفاظ رہ جائیں گے۔ مگر حقیقت مٹ جائیگی۔ اور جھوٹے صوفی جو ارواح سے تعلقات کے دعوے کرتے ہیں قرآن کے معارف کو واپس نہ لا سکیں گے۔

میرا ہمیشہ یہ طریق ہے کہ ان جھوٹے صوفیوں کے بارہ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کی مشکل آیات میں ان کے سامنے رکھتا ہوں وہ اپنی ارواح سے ان کے مطالب حل کر کے ہمیں بتا دیں۔ اگر قرآنی علوم انہوں نے معلوم کر لئے تو سچے ورنہ جھوٹے مگر یہ کام نہ آج تک کوئی کر سکا نہ کر سکتا ہے۔

۵۸ تفسیر۔ تیرے رب کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔ جب قرآن کریم دنیا سے اٹھ جائیگا تو پھر تیرا رب ہی اسکو لائیگا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسکی مثل لانا تو الگ رہا اس کے علوم کے مخفی ہونے پر کوئی شخص بغیر الٰہی مدد کے ان کو ظاہر بھی نہیں کر سکتا۔

۵۹ حل لغات۔ ظہیر: ظَهُرَ سے صفت مشبہ ہے۔ اور ظَهَرَ ظُهْرًا علیٰ کے معنی ہیں اَعَانَهُ اس نے اس کی مدد کی ظَهَرَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ وَعَلَيْهِ۔ غَلَبَهُ۔ اس پر غالب آیا۔ ظَهَرَ بِزَيْدٍ عَلَيْهِ رَفَعَ مَرْتَبَتَهُ۔ زید کو ترقی دی اور اس کا مرتبہ بلند کیا۔ الظَّهِيرُ الْمُعِينُ مددگار معاون (اقرب)

قرآن کی حقیقت کے مٹنے کی پیشگوئی

تفسیر۔ اس آیت سے روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ جو معنی میں نے اوپر کی آیات کے کئے ہیں وہی صحیح ہیں۔ کیونکہ اس آگے اسی دلیل کو جو میں نے اوپر دی تھی مکمل کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے کہ تم کہتے ہو کہ بعض روحانی شغلوں سے ترقی کر کے انسان سابق ارواح سے روحانی تعلیمات حاصل کر سکتا ہے۔ اگر تمہارا یہ خوے سچا ہے تو اے انسانو تم سب کے سب اکٹھے ہو جاؤ۔ اور ان مخفی ارواح کو بھی اپنی مدد کے لئے بلا لو۔ جن کی نسبت تمہارا خیال ہے کہ تم کو علوم آسمانی سے خبردار کرتی ہیں۔ اور سب ملکر قرآن کی مثل کوئی کتاب پیش کر دو۔ اور اگر تم نے اسکی مثل پیش کر دی تب تو بے شک تمہارا دعویٰ سچا ہوگا۔ ورنہ صاف ظاہر ہے۔ کہ تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہو۔ جب تم سب کے سب ملکر اور تمہاری ساری مخفی ہستیاں ملکر بھی قرآن کی مثل نہیں لا سکتیں۔ تو یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ نے

قرآن کی مثل لانے سے عجز دعویٰ کی سچائی کا ثبوت ہے۔

صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰى

اس قرآن میں یقیناً ہر ایک (ضروری) بات کو مختلف پیرایوں سے بیان کیا ہے۔ پھر (بھی) اکثر لوگوں نے (اس کے متعلق) کفر (کی راہ)

اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ

اختیار کرنے) کے سوا ہر بات سے انکار کر دیا ہے۔ ۹۰؎ اور انہوں نے (یہ بھی) کہا ہے (کہ) ہم ہرگز تیری (کوئی) بات نہیں

حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ

مانیں گے۔ جب تک (ایسا نہ ہو کہ) تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کرے یا تیرا کھجوروں

لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ

اور انگوروں کا کوئی باغ ہو اور تو اس کے اندر خوب (کثرت سے)

خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ

نہریں جاری کرے ۹۱؎ یا جیسا کہ تیرا دعوےٰ ہے تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرائے

بعض روحانی ہستیوں سے ان علوم کو حاصل کر لیا ہے۔ کتنا جھوٹا دعوےٰ ہے۔

الجن سے اس جگہ مراد وہ ارواح ہیں جن کی مدد سے علوم روحانی سیکھنے کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ چونکہ وہ ارواح بقول ان کے نظروں سے غائب ہیں۔ انکو جنات کے نام سے آگے یاد کیا گیا ہے

اس آیت میں جن سے مراد ارواح ہیں

ینبوعاً

۹۰؎ **تفسیر**۔ فرمایا یہ لوگ مثال لائینگے کہاں سے انکے دماغ محدود ہیں جس قسم کی یہ تربیت پائینگے اسی قسم کی باتیں پیش کر سکیں گے اور باقی باتیں ان سے رہ جائینگی۔ لیکن اس قرآن کریم میں سیاسیات کے متعلق سائنس کے متعلق، اخلاق، تمدن اور اقتصادیات کے متعلق سیر کن بحثیں ہیں پھر مختلف مذاہب کے اختلافات کا فیصلہ کیا گیا ہے ان کو تو ان باتوں کو سمجھنے کی بھی قابلیت نہیں یہ مثل کس طرح لا سکتے ہیں۔ ہاں اپنی ضد کی وجہ سے انکار کرنا خوب جانتے ہیں۔ سو مختلف بہانے اور اعتراض بنا بنا کر انکار کرتے چلے جائیں۔ آخر ایک دن تو بھگتنا پڑیگا۔

۹۱؎ **حل لغات**۔ تفجر۔ فجر سے مضارع واحد مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اسکا مادہ فجر ہے۔ فجر الماء کے معنی ہیں بجسہ وفتح له

تفجر

طریقاً نجری۔ پانی کو کھود کر نکالا۔ اور اس کے بہنے کیلئے رستہ بنایا فجر میں عربی زبان کے قاعدے کے مطابق ان معنوں میں تشدید کے ساتھ زیادہ زور پیدا ہو گیا۔

ینبوعاً کے معنی ہیں عین الماء پانی کا چشمہ ہے الجدول الکثیر الماء بہت پانی والی نہر۔ اسکی جمع ینابیع آتی ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ جب یہود کے بتائے ہوئے اعتراض کا ایسا دندان شکن جواب دیا گیا۔ تو اب انہوں نے پہلو بدلا۔ اور یہ اعتراض کیا کہ اچھا قرآن میں ہر علم موجود ہے؟ اگر ایسا ہے تو زمین میں چشمہ پھوڑ کر دکھا دو یا باغ اگا کر دکھا دو جس میں نہریں چلتی ہوں۔ اپنی طرف سے کفار نے یہ بہت بڑا اعتراض سوچا۔ حالانکہ یہ اعتراض اعتراض کرنے والے کی عقل کی کوتاہی کا ثبوت ہے، اس اعتراض کی وجہ جیسا کہ میں اوپر بتا آیا ہوں۔ یہود اور دوسرے جاہل لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ ارواح سے تعلق رکھنے والے یا اسم اعظم جاننے والے جادو یا اسم کے زور سے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

اس زمانہ میں بھی بعض علماء نے یہ طریق اختیار کر رکھا تھا۔ کہ بانی سلسلہ احمدیہ کے پاس آدمی بھجواتے کہ جا کر دو چار لاکھ روپے مانگو۔ اور جب وہ انکار کریں تو کہنا کہ مسیح کی نسبت آتا ہے کہ دولت لٹائیں گے۔ آپ کا دعوےٰ بھی

عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ

یا اللہ (تعالیٰ) اور فرشتوں کو (ہمارے) آمنے سامنے لا کھڑا کرے۔ ۱۹۲ یا تیرا

يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ

سونے کا کوئی گھر ہو۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اور ہم تیرے

وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا

(آسمان پر) چڑھ جانے پر بھی نہیں مانیں گے۔ جب تک کہ تو (اوپر جاکر) ہم پر کوئی کتاب (نہ)

نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا

اتارے۔ جسے ہم (خود) پڑھیں۔ تو (انہیں کہہ دے کہ) میرا رب (ایسی بیہودہ باتوں کے اختیار کرنے سے) پاک ہے

رَّسُوْلًا ۠ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ ع ۱۰ ۱۰

میں (تو) صرف بشر رسول ہوں۔ ۱۹۴ اور ان لوگوں کو جو ان کے پاس ہدایت

مسیح لانے کا ہے۔ کہ آپ چند لاکھ روپیہ بھی نہیں دے سکتے۔

۱۹۲ حل لغات۔ کِسَفًا۔ کِسْفَةٌ کی جمع ہے۔ اسکے معنے ہیں۔ القطعة من الشیء۔ کسی چیز کا ٹکڑا۔ (اقرب) قَبِیْلًا القبیلُ کے معنی ہیں الجماعة من الثلاثة فصاعدًا تین یا تین سے زیادہ آدمیوں کی جماعت اور رأیتہ قبیلا کے معنے ہیں رأیتہ عیانا و مقابلة کہ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے آمنے سامنے دیکھا (اقرب)

تفسیر۔ یعنی انعامات نہیں لا سکتے چلو عذاب ہی سہی آسمان ہم پر گرادو، خدا اور فرشتوں کو سامنے لاؤ کہ آکر ہمیں تباہ کردیں۔

استاذی المکرم حضرت خلیفہ اولؓ فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب قرآن کریم میں موجود ہیں اسلئے وہ انکا مطالبہ کرتے ہیں مگر یہ کہ بغیر سمجھے مطالبہ نہیں کرتے بلکہ تمسخر کے رنگ میں یہ باتیں پیش کرتے ہیں کیونکہ ان معنوں میں سے اکثر مدنی سورتوں میں بیان ہوئے ہیں اور یہ مکی سورۃ ہے۔ دراصل کفار تمسخر کے رنگ میں کہتے ہیں کہ جب سب کچھ قرآن میں موجود ہے تو اسکے زور سے چشمے چھوڑ دو اور باغ لگاؤ یا عذاب ہی لاؤ۔ کیونکہ ان کے ذہن میں یہ وہم سمایا ہوا تھا کہ جادو اور کلام کے زور سے ان باتوں کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ کا بھی یہی خیال تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔

۱۹۳ حل لغات۔ الزخرف۔ الذھبُ سونا کمال حسن الشیءِ انتہائی خوبصورتی (اقرب) ترقیٰ۔ رقی سے مضارع واحد مذکر مخاطب ہے۔ رَقِیَ کے معنے ہیں صعِد اوپر چڑھا مصدر رقی اور رُقِیّ آتا ہے لیکن رقِیَ یرقی کا مصدر بھی ہے جس کے معنے منتر اور جھاڑ پھونک کرنا ہے۔ (اقرب)

کسفا

تفسیر۔ یعنی ہم کو کچھ نہیں دیتے تو چلو اپنے لئے ہی کچھ کرو۔ فرعون نے بھی کہا تھا کہ موسیٰ کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے نہیں ہیں اسلئے سچا نہیں۔ انہوں نے ترقی کرکے کہدیا کہ سونے کا گھر ہوتب سچا ہو سکتا ہے۔

قبیل

اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ اسمیں انہوں نے معراج کے واقعہ پر اعتراض کیا ہے کہ اس قسم کا قصہ نہ سنا دینا ہم تو تب مانیں گے کہ تو آسمان پر چڑھ جائے اور تو وہیں سے اور کتاب ہماری طرف پھینکدے تاکہ ہمیں تسلی ہو جائے کہ تو واقعہ میں آسمان پر چڑھا ہے فرماتا ہے قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ تو انکو جواب دے کہ میرا رب اس قسم کے تماشوں اور لغو باتوں سے پاک ہے۔ خدا کا کلام جس طرح رسولوں پر نازل ہوتا رہا ہے اسی طرح مجھ پر نازل ہوتا رہا ہے اور جو معاملہ رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کرتا رہا ہے وہی میرے ساتھ بھی کریگا مگر جن باتوں کا تم مطالبہ کرتے ہو وہ اسکی شان کے بھی خلاف ہیں اور میری رسالت اور بشریت کے بھی خلاف ہیں دوسرے اسکے یہ معنے ہیں کہ جو باتیں تم پیش کرتے ہو انہیں سے بعض تو تماشے کے طور پر ہیں جو خدا کی شان کے خلاف ہیں اس قسم کی باتوں سے اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ تو روحانیت کی ترقی کیلئے کلام نازل کرتا ہے اور بعض باتیں بشریت اور رسالت کے خلاف ہیں مثلاً آسمان پر جانا اور وہاں سے کتاب کا پھینکنا۔ باوجود اس آیت کے مسلمان مانتے ہیں کہ عیسیٰؑ آسمان پر ہیں حالانکہ وہ بشر رسول تھے نہ کہ ملائکہ میں سے

کفار کے مطالبات متعلقہ آیت بطور تمسخر ہیں۔

الزخرف

الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝

پہنچی ایمان لانے سے صرف اس بات نے روکا کہ انہوں نے (اپنے دلوں میں) کہا (کہ) کیا اللہ (تعالیٰ) نے ایک

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ

بشر کو رسول بنا کر بھیجدیا ہے ۹۴؎ تو (انہیں) کہہ (کہ) اگر زمین پر فرشتے (بستے) ہوتے جو زمین پر اطمینان سے چلتے پھرتے تو

لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ

(اس صورت میں) ہم ضرور ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو (ہی) رسول بنا کر اتارتے۔ ۹۵؎ تو (انہیں) کہہ

انبیاء کے بشر رسول ہونے کے اعتراض کا جواب

۹۴؎ تفسیر۔ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ میں تو بشر رسول ہوں۔ اس سے زیادہ میرا کوئی دعویٰ نہیں۔ اب اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انبیاء پر جو بڑے بڑے اعتراض ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بشر رسول ہیں۔ یہ اعتراض ایک نہیں بلکہ ان الفاظ میں کئی قسم کے اعتراض آجاتے ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو بڑی شان کا ہے بشر کو رسول بنا ہی کیونکر سکتا ہے یہ لوگ کلام الٰہی کے نزول ہی کے منکر ہوتے ہیں۔ بعض لوگ بشر رسول کے منکر تکبر اور ضد کی وجہ سے ہوتے ہیں یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی ایسے ہی انسان ہیں جیسا کہ یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ نے کلام بھیجنا تھا۔ تو ہم سب پر نازل کرتا۔ اسے کیوں مخصوص کیا گیا اس لئے ہم اسے نہیں مان سکتے یہ لوگ کلام الٰہی کے نزول کو ناممکن قرار نہیں دیتے بلکہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے یہ نہیں تسلیم کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ ان جیسے بڑے آدمیوں کی طرف بقول ان کے ایک گھٹیا درجے کے انسان کو پیغام دے کر بھجوائے گا۔ ایک تیسرا گروہ بشر رسول کا انکار اس وجہ سے کرتا ہے کہ اس کے نزدیک بشر اپنی ذات میں کامل ہے۔ اور کسی بشر کو الہام کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی جبلی طاقتوں کی وجہ سے وہ اپنے لئے خود صحیح راستہ تلاش کر سکتا ہے۔ ایک چوتھا گروہ بشر رسول پر اس لحاظ سے معترض ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک رسول کیلئے بشریت سے زیادہ طاقتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے سامنے ایک کمزور سے کمزور وجود کو یہ کہہ کر پیش کرو کہ یہ مافوق الانسانیت طاقتیں رکھتا ہے۔ تو فوراً اس کے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں گے لیکن قوت قدسیہ اور قوت عملیہ کا عملی نمونہ دکھانے والا انسان جو جھوٹے فخر اور جھوٹے دعووں سے بچتا ہو۔ ان کے نزدیک ہرگز قابل اعتنا نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی طبائع عجوبہ پسندی کا شکار ہوتی ہیں۔

ایسے لوگ بعض دفعہ بعض پہلے نبیوں کو بھی مانتے ہیں لیکن نئے نبی کے آنے پر ان کی طبیعت کے اس نقص کا ظہور بتا دیتا ہے کہ پہلے نبی پر بھی ان کا ایمان محض رسمی اور ورثہ کا ایمان تھا۔

ملائکہ سے مراد فرشتہ خصلت انسان ہیں۔

۹۵؎ تفسیر۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ سے مراد فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ ورنہ فرشتے پر دوسرا فرشتہ آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس آیت میں اس قسم کے لوگوں کے خیال کا جواب دیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے لوگ ہیں۔ اور ان کو براہ راست الہام ہونا چاہیئے تھا۔ فرماتا ہے کہ فرشتہ فرشتہ خصلت پر اترتا ہے غیر جنس پر نہیں۔ تم فرشتے بنجاتے تو تم پر بھی فرشتے اترتے تم تو شیطان بن گئے ہو۔ تم پر فرشتے کس طرح اتریں۔ دوسرے ان لوگوں کو جواب دیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ بشر سے بڑی

كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ

(کہ) میرے درمیان اور تمہارے درمیان گواہ کے طور پر اللہ ہی کافی ہے۔ وہ اپنے بندوں کو

خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ

جاننے والا (اور) دیکھنے والا ہے ۵۹۶ اور جسے اللہ (تعالیٰ) ہدایت دے وہی ہدایت پر ہوتا ہے۔ اور

مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ

جنہیں وہ گمراہ کرے تو تُو اس کے (یعنی اللہ کے) مقابل پر ان کا کوئی بھی مددگار نہیں پائے گا۔ اور

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ

قیامت کے دن ہم انہیں ان کے مقاصد کے مطابق اندھے اور گونگے اور بہرے ہونے کی حالت میں جمع

بُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ

کریں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ جب بھی وہ (ذرا) ٹھنڈی ہوگی تو ہم ان پر آگ (کا عذاب

سَعِيْرًا ۝ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا   النّصف

اور بھی) بڑھا دینگے ۵۹۷ یہ (آگ) ان (ہی کے اعمال) کی جزا ہوگی کیونکہ انہوں نے ہمارے نشانوں کا انکار کیا۔

طاقتوں والے وجود کی ضرورت تھی۔ بشر کام نہیں دے سکتا۔ انہیں یہ بتایا ہے۔ کہ ہر جنس کے لوگوں کو ان کا ہم جنس ہی نجات دے سکتا ہے۔ کیونکہ نمونہ وہی ہو سکتا ہے جو ان میں سے ہو۔ پس بشر کے سوا دوسری جنس بطور رسول انسانوں میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ وہ ان کیلئے نمونہ نہیں بن سکتی۔ ان معنوں کے رُو سے رسول کے معنی صرف وحی لانیوالے کے نہیں ہونگے بلکہ رسالت کی وہ سب شرائط جن کے ساتھ بشر رسول آتے ہیں مُراد لی جائیں گی۔

۵۹۶ تفسیر۔ یہیں اس اعتراض کے دوسرے پہلوؤں کا جواب دیا ہے۔ یعنی ان کو بھی جو انسان کو حقیر سمجھتے ہیں اور الہام کے ناقابل۔ اور ان کو بھی جو انسان کو کامل سمجھتے ہیں اور الہام سے مستغنی۔ اور جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب سمجھتا ہے کہ وہ کتنے کمزور ہیں یا کتنے طاقتور ہیں۔ پس جب اسنے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے تو تمہارا یہ تو حق ہے کہ اس امر کی تحقیق کرو کہ مَیں نبی ہوں یا نہیں۔ اور اس کے لئے میں خدا تعالیٰ کی عملی گواہی پیش کرتا ہوں جب قول کے ساتھ اس کا عمل شامل ہے تو تم میرے دعویٰ کو جھوٹا کس طرح کہہ سکتے ہو۔ مگر بہرحال تم یہ دو اعتراض معقولیت کو چھوڑے بغیر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے۔ کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے۔ تو ماننا پڑے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہ تو انسان اس قدر حقیر ہے کہ اسے وہ مکالمہ مخاطبہ کا فخر نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس قدر کامل کہ اُسے الٰہی کلام کی احتیاج ہی نہیں۔

انسان کو حقیر ناقابل الہام سمجھنے والے معترضین کو جواب

۵۹۷ حل لغات۔ وجوھھم:۔ وُجُوْہٌ

وجوھھم

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ

اور کہا کہ کیا جب ہم (مرکر) ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے (تو ہمیں) از سرِ نو زندہ کیا جائے گا اور

قیامت کے دن مونہوں کے بل گھسیٹے جانے سے مراد

وَجْہٌ کی جمع ہے۔ اور وجہ کے معنے ہیں اَلْمَقْصُوْدُ مقصد۔ اَلطَّرِیْقُ الْمَرْضِیُّ پسندیدہ طریق۔

خبت

خَبَتْ: خَبَتِ النَّارُ وَالْحَرْبُ وَالْحِدَّۃُ کے معنے ہیں سَکَنَتْ وَخَمَدَتْ وَطَفِئَتْ۔ آگ۔ جنگ یا تیزی دھیمی یا ٹھنڈی پڑ گئی۔ کمزور ہوگئی۔ بجھ گئی۔ (اقرب)

سعیرا

سعیرا: اَلسَّعِیْرُ کے معنے ہیں النَّارُ وَلَھَبُھَا آگ۔ شعلہ۔ (اقرب)

اولیاء

اولیاء جمع ولی کی ہے جس کے ایک معنی مددگار کے ہیں لیکن ترجمہ میں جمع کی جگہ مفرد ترجمہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اردو میں ایسے موقعہ پر مفرد ہی بولا جاتا ہے۔

تفسیر: چونکہ پچھلے سوالوں اور جوابوں سے کفار کی کج بحثی کا ثبوت ملتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو تسلی دلائی کہ ان باتوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ہدایت اور گمراہی کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ جو مستحقِ ہدایت ہو اُسے ہدایت مل جاتی ہے خواہ درمیان میں کتنی روکیں پیدا ہوں۔ اور جو مستحقِ ہدایت نہ ہو وہ گمراہ ہی رہتا ہے یا آخر گمراہ ہو جاتا ہے خواہ بظاہر اسکے لئے سہولتیں میسر ہوں پس ان ظاہری حالات سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ بعض دفعہ شدید مخالف اور بظاہر کج بحث لوگ آخر میں ایمان لے آتے ہیں۔ اور اخلاص کا نہایت اعلیٰ نمونہ دکھاتے ہیں

انجام ہی فیصلہ کن ہوتا ہے

اصل تو انجام کو دیکھنا چاہیئے۔ جس کا انجام خراب ہو خطرہ تو اس کے لئے ہے۔

منہ کے بل چلنے کے معنے دوڑنے کے بھی ہیں

خَبَتِ النَّارُ وَالْحَرْبُ وَالْحِدَّۃُ: سَکَنَتْ وَخَمَدَتْ وَطَفِئَتْ۔ یعنی آگ۔ لڑائی اور تیزی کے متعلق خبت آتا ہے۔ جس کے معنے ہیں جوش جاتا رہا۔ کم ہوگیا۔ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔

علیٰ وجوھھم کے متعلق قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ (القمر ع ۳) جس دن وہ مونہوں کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈالے جائیں گے۔ اس آیت کا بھی یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ کفار مونہوں کے بل گھسیٹ کر ڈالے جائیں گے۔

بخاری اور مسلم میں انسؓ سے روایت ہے کہ اِنَّ الَّذِیْ اَمْشَاھُمْ عَلٰی اَرْجُلِھِمْ قَادِرٌ عَلٰی اَنْ یُمْشِیَھُمْ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ کہ جس خدا نے ان کو پاؤں کے بل چلایا ہے۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان کو مونہوں کے بل چلائے پھر ایک روایت میں ہے کہ تین طرح حشر ہوگا۔ کچھ سوار ہونگے۔ کچھ پیدل اور بعض مونہوں کے بل (روح المعانی جلد ۱۵) ایک اور روایت میں ہے تُجَرُّوْنَ عَلٰی وُجُوْھِکُمْ۔ دوزخیوں کو ان کے مونہوں کے بل گھسیٹا جائے گا۔ (روح المعانی جلد ۱۵)

معلوم ہوتا ہے کہ سوار تو انبیاء ہیں اور پیدل چلنے والے مومن ہیں اور مونہوں کے بل گھسیٹے جانے والے کافر ہیں۔

چونکہ آخرت میں ہر چیز ایک انعکاسی رنگ رکھے گی۔ اس لئے ان کے وہ اعمال جن کو وہ دنیا میں کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی طرف نظر نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ سفلی اور ارضی اغراض پر ان کی نظر ہوتی تھی۔ قیامت کے دن ان پر اس رنگ میں متمثل ہونگے کہ اوندھے منہ زمین پر چلیں گے۔

(۲) عربی کا ایک اور محاورہ ہے۔ مَرَّ الْقَوْمُ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ اَیْ اَسْرَعُوْا۔ یعنی وہ قوم دوڑ کر چلی گئی۔ اس محاورہ کے رُو سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ قیامت کے دن جب ہم ان کا حشر کریں گے تو وہ دوڑ رہے ہونگے جیسے دوسری جگہ فرماتا ہے مُھْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِھِمْ کہ کفار سر اٹھائے ہوئے دوڑے چلے آئیں گے۔ اس میں

خَلْقًا جَدِيْدًا ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ

کیا ہم (پھر) نئی مخلوق کی صورت میں اٹھایا جائیں گے ۹۸ کیا وہ (ابھی تک) سمجھ نہیں سکے کہ وہ (ہستی) جس نے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ

آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اس بات پر (بھی) قادر ہے کہ وہ ان جیسے (اور لوگ) پیدا کرے اور

جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ان کے لئے ایک میعاد مقرر کر دی ہے۔ پھر (بھی) ان ظالموں نے کفر (کی راہ اختیار کرنے)

اِلَّا كُفُوْرًا ○ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ

کے سوا ہر بات سے انکار کر دیا ہے ۹۹ تو (نہیں) کہہ (کہ) اگر تم میرے رب کی رحمت کے (غیر متناہی) خزانوں کے (بھی) مالک ہوتے

گھبراہٹ کی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ یعنی اس وقت ان میں بے اطمینانی اور گھبراہٹ پائی جائے گی۔

(۳) الوجہ کے معنے عربی زبان میں مَا يَتَوَجَّهُ اِلَيْهِ الْاِنْسَانُ مِنْ عَمَلٍ وَغَيْرِهٖ۔ القصد والنیۃ کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کام جن کی طرف انسان توجہ کرتے ہیں اور قصد اور نیت کو بھی وجہ کہتے ہیں۔ ان معنوں کی رُو سے آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ ان کے مقاصد اور نیتوں کے مطابق ہم ان کا حشر کریں گے۔ اگر ان کا مقصد الٰہی سلسلوں سے دشمنی کرنا تھا تو وہاں بھی وہ خدا تعالیٰ سے دُور اور اس کے دشمنوں کے ساتھ رکھے جائیں گے۔ گویا ہر انسان اپنی اپنی نیت کے مطابق جزاء پائیگا۔ چونکہ اگلے جہان کے متعلق کفار کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اس لئے فرمایا کہ وہ وہاں اندھے گونگے اور بہرے ہونگے۔

خَبَتْ سے یہ مُراد نہیں کہ آگ بجھ جائے گی۔ بلکہ بعض دفعہ کوئی مصیبت زیادہ دیر رہے تو حِس مٹ جاتی ہے۔ اسی جگہ ایسی ہی کیفیت کی طرف اشارہ ہے فرماتا ہے کہ جب عذاب محسوس کرنے کی حِس کمزور ہو جائے گی۔ ہم ان کی حس کو تیز کر دینگے۔ جیسے فرمایا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ (نساء ع) جب انکے چمڑے پک جائینگے اور عذاب کی حِس کم ہو جائے گی تو ہم ان کی جلدیں بدل دینگے تاکہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ تو آگ کا ٹھنڈا ہونا کفار کی حِس کے لحاظ سے ہے نہ کہ خود آگ کی تیزی یا کمی کے لحاظ سے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہتے ہیں کہ پرنالہ چلتا ہے۔ حالانکہ پرنالہ نہیں چلتا۔ بلکہ پرنالہ میں سے پانی بہہ رہا ہوتا ہے۔

نوٹ: توجہ

نوٹ: انسان کو نیت کے مطابق اجر

۹۸ تفسیر۔ یعنی یہ عذاب کلام الٰہی کے انکار کے سبب سے ہوگا۔ اور یہ کلام الٰہی کا انکار درحقیقت بعد الموت زندگی پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

قرآن کریم نے اس امر پر بہت ہی زور دیا ہے کہ مذہب کے انکار یا اسکی تخفیف کی اصل وجہ بعد الموت زندگی کا انکار ہے۔ اس میں واعظوں اور استادوں اور اماموں اور مربیوں کیلئے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ بچپن سے بعث بعد الموت کے دلائل نوجوانوں کے ذہن نشین کرنے چاہئیں۔ اس کے بغیر کبھی صحیح اور عمدہ تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہ آیات یہود پر بھی چسپاں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر بعث بعد الموت کے منکر تھے۔

۹۹ تفسیر۔ ان کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ تم کو

رَبِّيْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ

تو (بھی) تم (ان کے) خرچ ہوجانے کے ڈر سے (انہیں) روک ہی رکھتے۔ اور

الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا۠ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ ع ۱۱/۱۱

انسان بڑا ہی کنجوس ہے شالہ اور ہم نے موسیٰ یقیناً نو روشن نشان دیئے تھے۔

اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کر سکتا ہے کیونکہ یہ صرف دعویٰ ہوتا جس کے پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پس جواب میں یہ فرمایا کہ کیا تم اس پر یقین رکھتے ہو کہ تم کو ہلاک کر کے خداتعالیٰ تمہاری شان و شوکت کسی دوسری قوم کو دیدے۔ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ کفار اس بات پر کبھی یقین نہ کرینگے بلکہ بڑی شدت سے اس کا انکار کرینگے پس یہی دلیل ہم انکے سامنے بعث بعدالموت کی پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم جو بعث بعدالموت کی خبر دیتا ہے۔ اسنے یہ خبر بھی دی ہے کہ دشمنان اسلام کی حکومت مٹا دیجائیگی۔ اور انکی جگہ مسلمانوں کو دے دیجائیگی۔ اگر یہ بات پوری ہوجائے تو انکو سمجھ لینا چاہیئے کہ دوسری بات بھی عالم الغیب اور قادر خدا کی طرف سے ہے یہ بات کس شان سے پوری ہوئی؟ عرب ایران، روم اور مصر چند سالوں میں یکے بعد دیگرے اسلامی ضرب کی تاب نہ لا کر سرنگوں ہوگئے۔ اور فاقہ کش مزدور دنیا کے بادشاہ ہوگئے۔ اس حشر کا پیدا کرنیوالا کیا دوسرے حشر سے عاجز ہو سکتا ہے بعث بعدالموت کو عجیب سمجھنے والے وقوع سے پہلے کیا اس خبر کو بھی ویسا ہی عجیب نہ سمجھتے تھے۔

(حاشیہ: مسلمانوں کی ترقی قیامت کا ثبوت ہے۔ — انفاق)

شالہ حل لغات۔ اَمْسَكْتُمْ یہ اَمْسَكَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اَمْسَكَ الشَّيْءَ بِيَدِهٖ۔ قَبَضَهٗ کسی چیز کو ہاتھ سے پکڑا۔ اَمْسَكَ الْمَتَاعَ عَلٰى نفسه مال اپنے لئے روک رکھا۔ اَمْسَكَ عَنِ الْاَمْرِ۔ كَفَّ عنه وَامْتَنَعَ۔ کسی امر سے رک گیا۔ (اقرب)

(حاشیہ: امسکتم)

قَتُوْرًا:۔ یہ قتر سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قَتَرَ عَلٰى عَيَالِهٖ۔ ضَيَّقَ عليهم فى النفقة۔ اہل وعیال کے خرچ میں تنگی کی۔ قَتَرَ الشَّيْءَ۔ ضَمَّ بعضه الى بعض۔ کسی چیز کو اکٹھا کیا اور جوڑ جوڑ کر رکھا۔ القتور المضيق على عياله فى النفقة۔ اپنے خانگی خرچ میں بخل کرنے والا۔ البخیل۔ کنجوس (اقرب)

(حاشیہ: قتورا)

اَلْاِنْفَاقُ:۔ اَنْفَقَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں اِفْتَقَرَ فَنِيَ زَادُهٗ وہ مفلس ہوگیا۔ اور اس کا خرچ ختم ہوگیا۔ انفق مالَهٗ:۔ صَرَفَهٗ وَاَنْفَدَهٗ۔ اس نے اپنا مال خرچ کر کے ختم کر دیا (اقرب) پس اَلْاِنْفَاقُ کے معنے ہوں گے (۱) مفلس ہو جانا (۲) مال خرچ کر دینا (۳) مال کا خرچ ہو جانا۔

تفسیر۔ یہاں پھر قبل الرّوحُ والے مضمون کی طرف رجوع کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ خدائی الہام اور روحانیوں میں یہ فرق ہے کہ خدا کا کلام لانے والے تو بے دریغ آسمانی خزانے لٹاتے ہیں۔ اور انہیں حکم ہوتا ہے بَلِّغْ بَلِّغْ۔ لیکن یہ رُوحانی کہلانے والے اسرار اور اشاروں میں عمر بسر کرتے ہیں قسمیں لے لے کر اپنے شاگردوں کو گر بتاتے ہیں یہ لوگ دنیا کیلئے ہادی اور راہنما کس طرح ہو سکتے ہیں۔ یہ مرض آجکل کے صوفیاء میں بھی پیدا ہوگیا ہے۔ ایکدفعہ میں نے ذکر الٰہی کے متعلق تقریر کی۔ اور اسکے بہت سے طریقے اور فائدے بیان کئے۔ ایک صاحب نے دوران تقریر میں رقعہ لکھا کہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک نکتہ صوفیاء دس دس سال خدمت لے کر بتایا کرتے تھے۔ آپ ایک ہی مجلس میں سب راز کھولنے لگ گئے ہیں۔

بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ

چنانچہ تو بنی اسرائیل سے (ان حالات کو) پوچھ) جب وہ ان (یعنی اہل مصر) کی طرف آیا تھا۔ تو فرعون نے اس سے کہا تھا

فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ

(کہ) اے موسیٰ میں یقیناً تجھے فریب خوردہ سمجھتا ہوں۔ ۱۰۲ اس نے کہا (کہ)

حق یہ ہے کہ مذہب میں کوئی راز نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے متعلق یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے قرب کے اعلیٰ درجوں کو حاصل کریں اور اسے بندوں کی ترقیات میں روک ڈالنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں کیونکہ وہ غیر محدود ہے۔ اور اس تک پہنچنے کی منازل بھی غیر محدود ہیں اسے یہ ڈر نہیں کہ ایک دن علم ختم ہو جائیگا۔ اور پھر میرے پاس بتانے کو کچھ نہ رہے گا۔ اور میں اور میرے بندے برابر ہو جائیں گے لیکن یہ نام نہاد روحانی ایک محدود علم رکھتے ہیں جس کا اکثر حصہ جھوٹا ہوتا ہے۔ وہ اگر اپنی سب باتیں بتا دیں تو دوسرے ہی دن انکو پوچھنے والا کوئی نہ رہے۔ چنانچہ آئے دن یہ نظارے نظر آتے ہیں کہ ایک پیر نے دوسرے کو خلیفہ بنایا اور اس نے جھٹ جاکر الگ گدی بنالی۔ مگر خدا رسیدہ شخص کا کوئی شاگرد اس پر ایمان رکھتے ہوئے جدا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا علم جو خدا سے آتا ہے کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس سے جدائی اپنے علم کی ترقی روکنے کے مترادف ہے۔ غرض نام نہاد روحانی لوگ سالہا سال خدمت لیکر ایک اسم یا نقش اسی لئے بتلاتے ہیں کہ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے جلد ختم ہو جائیگا مگر اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علوم اول تو ختم نہیں ہوتے اور اگر ہو جائیں تو وہ اور پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ جسمانی کسب الہام کا قائم مقام کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔

۱۰۲ حل لغات۔ مَسْحُوْرًا:۔ یہ سحر سے اسم مفعول ہے۔ سَحَرَہٗ:۔ عمل له السحر و خدعه سحرہ کے معنے ہیں اس پر جادو کیا۔ اُسے فریب دیا۔ سَحَرَهٗ عَنِ الْاَمْرِ: صَرَفَه۔ اس کو کسی بات سے ہٹا دیا سحر بکلامه والحاظه: استماله وسلب لبّه اُسے باتوں اور نظروں سے اپنی طرف مائل کر لیا۔ اور اس کی عقل کو لبھا لیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ تِسْعُ اٰيٰتٍ۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ان نشانوں کی تفصیل موجود ہے اور وہ یہ ہیں۔

بنی اسرائیل کے ۹ نشانوں کی تفصیل

(۱) عصا۔ جیسا کہ فرماتا ہے فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (اعراف ع ۱۳) (۲) ید بیضاء جیسے کہ فرماتا ہے۔ وَنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (اعراف ع ۱۳) (۳) قحط جیسا کہ فرماتا ہے وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ (اعراف ع ۱۶) (۴) پلوٹھوں کی موت۔ جیسے فرماتا ہے وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔ (اعراف ۱۶) اس جگہ ثمرات سے مراد ثمرۃ قلب یا ثمرۃ فؤاد ہے جس نام سے بیٹوں کو پکارا جاتا ہے۔

(۵) طوفان (۶) ٹڈی (۷) جوئیں یا کھٹمل کا عذاب (۸) مینڈکوں کا عذاب (۹) خون کا عذاب۔ یعنی ایسی امراض کا عذاب جن سے انسان کا خون ضائع یا خراب ہو۔ جیسے نکسیروں کا پھوٹنا۔ اور ایک خاص مرض بھی اس وقت پیدا ہوا تھا۔ یعنی ایک قسم کے پھوڑے نکلتے تھے جن میں سے کثرت سے خون بہتا تھا۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ (اعراف ع ۱۶) بائیبل میں ان نو عذابوں کی عجیب و غریب تشریح لکھی ہے۔

مسحورا

عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

تجھے یقیناً علم ہوچکا ہے کہ ان (نشانات) کو آسمانوں اور زمین کے رب نے ہی بصیرت بخشنے والا بنا کر

بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ فَاَرَادَ

اُتارا ہے اور اے فرعون میں تیری نسبت یقین رکھتا ہوں کہ تو ہلاک ہوچکا ہے ۱۰۳؎ اس پر اُسنے ان

اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ

(کی بنیادوں) کو اس ملک سے اکھاڑ دینے کا ارادہ کرلیا۔ تو ہم نے اُسے اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق

جَمِيْعًا ۝ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا

کردیا۔ ۱۰۴؎ اور اسکے (ڈوب مرنے کے) بعد بنی اسرائیل کو ہم نے کہدیا (کہ) تم اس (موعود) ملک میں (جاکر آرام)

جس کے ماننے اور جاننے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ ہمیں تو اس امر سے تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو نشان عطا فرمائے جو وقفہ وقفہ کے بعد ظاہر ہوئے جیسا کہ مفصلات کے لفظ سے ظاہر ہے۔

حضرت موسیٰ اور انکے نشانات کا ذکر کرکے یہود کو توجہ دلائی ہے کہ جس طرح فرعون کو نشان دکھائے گئے تھے یہود کو بھی نشان دکھائے جائیں گے۔ مگر جس طرح فرعون نے فائدہ نہ اٹھایا وہ بھی نہ اٹھائینگے اور آخر معنوی طور پر غرق کئے جائینگے۔

اس آیت سے اس امر کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہود پر بھی نو قسم کے عذاب نازل ہونگے یا نو نشان دکھائے جائینگے مگر مجھے اب تک تاریخ پر اس بارہ میں غور کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔

۱۰۳؎ حل لغات۔ بَصَآئِرَ:۔ یہ بَصِیْرَۃٌ کی جمع ہے البصیرۃ کے معنے ہیں العقل عقل۔ الفطنۃ ذہانت۔ مَا یُسْتَدَلُّ بِہٖ جس سے راہنمائی اور بصیرت حاصل ہو۔ الحُجَّۃ۔ دلیل۔ العبرۃ عبرت۔ الشاھد گواہ (اقرب)

مَثْبُوْرًا:۔ یہ ثَبَرَ سے اسم مفعول ہے ثَبَرَہٗ کے معنے ہیں۔ خَیَّبَہٗ۔ اسے نامراد و ناکام کیا۔ لَعَنَہٗ۔ اس پر لعنت کی۔ طَرَدَہٗ۔ اُسے دھتکارا۔ ثَبَرَہٗ عَنِ الْاَمْرِ:۔ مَنَعَہٗ وَصَرَفَہٗ اُسے روک دیا۔ ہٹا دیا۔ ثَبَرَ اللّٰہُ زَیْدًا:۔ اَھْلَکَہٗ اِھْلَاکًا دَائِمًا لَا یَنْتَعِشُ بَعْدَہٗ۔ اللہ نے اُسے ایسا تباہ کیا کہ پھر وہ سنبھلنے کے قابل نہ رہا۔ (اقرب)

تفسیر۔ موسیٰ نے کہا اے فرعون تیرا دل جانتا ہے کہ ان نشانات کو آسمان و زمین کے خدا نے بصیرت کے طور پر نازل کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تُو ہلاک کیا جائیگا۔ یا یہ کہ تُو نے جو مجھے مسحور کہکر بدنام اور کمزور کرنے کی تدبیر سوچی ہے خدا تجھے اس میں کامیاب نہ کریگا بلکہ تُو اس ارادہ میں خائب و خاسر ہوگا۔ کیونکہ مثبور کے ایک معنے ناکام و نامراد کے بھی ہیں۔ اس ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس طرح تم نشان پر نشان دیکھتے ہو مگر فریبی اور دھوکا باز کہتے جاتے ہو۔ ایسا ہی اس سے پیشتر فرعون نے موسیٰؑ کو کہا تھا۔ مگر جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوا تھا؟

۱۰۴؎ تفسیر۔ یعنی اس نے بھی چاہا تھا کہ انکو ملک سے ذلیل کرکے نکال دے۔ مگر خود غرق ہوگیا۔ اہل کتاب نے بھی کفار سے سازش کرکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیصر کی فوج سے لڑانے کے لئے بھجوا دیا تھا مگر خدا نے

الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝ وَ

رہو۔ پھر جب پچھلی بار کا وعدہ (پورا ہونے کا وقت) آئے گا۔ تو ہم تم (سب) کو جمع کرکے لے آئیں گے ۱۰۴ اور

بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا

اس (قرآن) کو ہم نے حق (وحکمت) کے ساتھ ہی اُتارا ہے اور حق (وحکمت) کے ساتھ ہی یہ اُترا ہے۔ اور ہم نے تجھے صرف

ان کی تدبیر کو ناکام کیا۔ اور آپ تبوک سے بغیر کسی نقصان کے باعزت واپس آئے۔

۱۰۴ حل لغات۔ لَفِيْفًا۔ یہ لفّ سے فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول ہے۔ لَفَّهٗ کے معنے ہیں۔ ضَمَّهٗ سمیٹا جَمَعَهٗ۔ اس کو جمع کیا۔ لَفَّ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ ضَمَّهٗ اِلَیْهِ وَوَصَلَهٗ۔ ایک چیز کو دوسری سے ملا دیا۔ لَفَّ الْکَتِیْبَتَیْنِ خَلَطَ بَیْنَهُمَا فِی الْحَرْبِ۔ جنگ میں دو دستوں کو آپس میں ملا دیا۔ اللفیف۔ المجموع۔ جمع کیا ہوا۔ مَا اجْتَمَعَ مِنَ النَّاسِ مِنْ قَبَائِلَ شَتّٰی۔ مختلف قوموں کے آدمیوں کی جماعت (اقرب)

تفسیر۔ اسکنوا الارض۔ اس سے مراد مصر کی سرزمین نہیں۔ کیونکہ مصر میں تو وہ نہیں آباد ہوئے اس سے مراد ملک کنعان ہے یعنی وہ ملک جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے گویا الارض سے مراد معہود ذہنی ہے۔ رسول کریم صلعم کو موسیٰ علیہ السلام پر یہ فضیلت ہے کہ ان کو جو جگہ ملی وہ مصر کے قائم مقام تھی مصر نہیں ملا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عین وہ جگہ ملی جو آپ کا وطن تھا اور پھر دشمنوں کے ملک بھی ہاتھ آئے فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ۔ یعنی اب تم کنعان میں جاؤ لیکن ایک وقت کے بعد تم کو وہاں سے نکلنا پڑے گا پھر خدا تعالیٰ تم کو واپس لائے گا پھر تم نافرمانی کروگے اور دوسری دفعہ عذاب آئے گا اس کے بعد تم جلا وطن رہوگے یہاں تک کہ تمہاری مثیل قوم کے متعلق جو دوسری تباہی کی خبر ہے اس کا وقت آجائے اس وقت پھر تم کو مختلف ملکوں سے اکٹھا کرکے ارض مقدس میں واپس لایا جائے گا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کے لئے دو تباہیوں کی خبر اس سورۃ کے شروع میں دی گئی تھی ویسی ہی خبر مسلمانوں کے لئے بھی دی گئی ہے کیونکہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل کا مثیل قرار دیا گیا ہے جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰؑ کا مثیل قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سورۃ کے شروع میں دو وعدوں کا ذکر ہے اور دونوں عذاب کے وعدے ہیں۔ ایک بخت نصر شاہ بابل کے ہاتھوں پورا ہوا۔ اور دوسرا ٹائیٹس شاہ روم کے ہاتھ سے پورا ہوا (دیکھو رکوع اوّل) ان دونوں وعدوں میں بنی اسرائیل کے اکٹھا کرنے کا ذکر نہیں بلکہ ان کے پراگندہ کرنے کا ذکر ہے۔ اس کے برخلاف اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ دوسرے وعدے کے وقت بنی اسرائیل کو پھر ارض مقدس میں لایا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دوسرا وعدہ کوئی اور ہے اور دوسرے وعدے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دوسرے وعدے کے ساتھ کوئی پہلا وعدہ بھی ہے۔ اب ہم غور کرتے ہیں تو ان دو وعدوں کا ذکر قرآن کریم میں صرف اس طرح ملتا ہے کہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیل موسیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور سورۃ فاتحہ میں مسلمانوں کے ایک حصہ کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ وہ اہل کتاب کے نقش پر چلیں گے پس ان دونوں باتوں کو ملا کر ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ بنی اسرائیل کی طرح دو عذاب کے وعدے مسلمانوں کے لئے بھی کئے گئے ہیں۔ اور اس جگہ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ سے مراد مسلمانوں کے دوسرے عذاب کا وعدہ ہے۔ اور بتایا ہے کہ مسلمانوں پر جب یہ عذاب

لفیفا

مسلمانوں کی مماثلت بنی اسرائیل سے ترقی اور تنزل کے لحاظ سے

آنحضرتؐ کی فضیلت موسیٰ پر وطن واپس ملنے کے ذریعہ سے

وقف لازم مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى

بشارت دینے والا اور (عذاب سے) آگاہ کرنیوالا بنا کر بھیجا ہے ۱۰۵ اور (اسے) قرآن بنا کر (اتارا ہے) اس حال میں کہ ہم نے اسے (کئی)

النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ قُلْ اٰمِنُوْا

ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ تو اسے (سہولت اور) آہستگی کے ساتھ لوگوں کو پڑھ کر سُنا سکے اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے ۱۰۶

آئے گا۔ کہ دوسری دفعہ ارض مقدس کچھ عرصہ کے لئے ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی تو اس وقت اللہ تعالیٰ پھر تم کو اس ملک میں واپس لے آئے گا۔ چنانچہ دیکھ لو اسی طرح واقعہ ہوا ہے جس طرح بخت نصر کے وقت میں پہلی دفعہ ارض مقدس یہود کے ہاتھ سے نکلی۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کے وقت میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلی۔ پھر جس طرح موسیٰ سے تیرہ سو سال بعد حضرت مسیح کے صلیب کے واقعہ کے بعد جبکہ گویا وہ بظاہر اس ملک کے لوگوں کے لئے مر گئے تھے۔ بنی اسرائیل کو ارض مقدس سے دوبارہ بیدخل کر دیا گیا۔ اسی طرح اس زمانہ میں جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اتنا ہی عرصہ گذرا ہے مسلمانوں کی حکومت پھر ارض مقدس سے جاتی رہی ہے۔ اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا تھا مسلمانوں کا یہ دوسرا عذاب یہود کے لئے ارضِ مقدس میں واپس آنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

تفسیر فتح البیان کے مصنف اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک وعد الاٰخرۃ سے اس جگہ مسیح موعود کا نزول مُراد ہے ان علماء کا یہ قول میری تفسیر کی تائید کرتا ہے۔

آنحضرت کی وحی میں دخل شیطان کی تردید

فرقنٰہ

مکث

۱۰۵ تفسیر۔ یعنی یہ خبر ضرور پوری ہو کر رہے گی چونکہ موسیٰ کی پیشگوئی کے سلسلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشگوئی کا بھی ذکر آگیا کہ مسلمانوں پر بھی دو کٹھن زمانے آنے والے ہیں۔ اس لئے اس آیت سے اس مضمون کی تاکید کی گئی ہے۔

اس آیت سے ضمناً اس خیال کی بھی تردید ہوتی ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں شیطان دخل دے دیتا تھا۔ کیونکہ فرماتا ہے کہ ہم نے قرآن کو حق سے اُتارا ہے۔ اور وہ محمد رسول اللہ تک حق سے ہی اُترا ہے۔ پس جبکہ قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک حق سے اُتر آیا تو شیطان کو دخل دینے کا موقعہ کب ملا۔

آخر میں فرمایا کہ تجھے بھی موسیٰ کی طرح بشیر و نذیر بنا کر ہم نے بھجوایا ہے۔ پس جس طرح اس کی قوم نے ترقی کی۔ اسی طرح تیری قوم ترقی کرے گی۔ اور جس طرح اس کے دشمن ہلاک ہوئے تیرے دشمن ہلاک ہونگے۔

۱۰۶ حل لغات

فَرَقْنٰهُ: فَرَقَ بَيْنَهُمَا: فَصَلَ اَبْعَاضَهُمَا۔ دو چیزوں کے ٹکڑوں کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ فَرَقَ لَهٗ عَنِ الشَّيْءِ: بَيَّنَهٗ۔ اسے کھول کر بات بتائی (اقرب) وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ اَيْ بَيَّنَّا فِيْهِ الْاَحْكَامَ وَ فَصَّلْنٰهُ۔ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ کے معنے ہیں ہم نے اس میں احکام بیان کئے ہیں۔ اور اس کے جُدا جُدا حصے بنائے ہیں۔ وَقِيْلَ اَنْزَلْنٰهُ مُفَرَّقًا۔ اور فَرَقْنٰهُ کے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ ہم نے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُتارا ہے (مفردات)

مُكْثٍ: مَكَثَ يَمْكُثُ کا مصدر ہے۔ مَكَثَ کے معنی ہیں لَبِثَ۔ رُکا۔ ٹھہرا۔ تَرَزَّنَ: آہستہ و باوقار ہوا۔ (اقرب) المكث: ثباتٌ مع الانتظار۔ ایسا توقف جس میں انتظار بھی ہو۔ (مفردات)

تفسیر۔ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ۔ کے معنے ہیں کہ ٹکڑے

بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ

لاؤ یا نہ لاؤ۔ جن لوگوں کو اس (کے نزول) سے پہلے (الہامی صحیفوں یا فطرتِ صحیحہ کے ذریعہ سے) علم دیا جا چکا ہے

قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ

جب ان کے سامنے اسے پڑھا جاتا ہے تو وہ (اسے سن کر) کامل فرمانبرداری اختیار کرتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں

وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا

اور وہ کہتے ہیں (کہ) ہمارا رب (ہر ایک عیب سے) پاک ہے (اور یہ کہ) ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہو کر

ٹکڑے کرکے نازل فرمایا ہے یعنی ایک ہی وقت میں کئی کئی سورتوں کی آیات اُترتی رہتی ہیں۔ اور پھر پہلی اُتری ہوئی سورۃ پیچھے کر دی جاتی ہے اور بعد کی پہلے۔ اس پر جو اعتراض پڑتا تھا اس کا جواب دیا ہے کہ ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ تو اسے اپنی جگہ ٹھہر کر پڑھ سکے یعنی تیرے اندر بے اطمینانی اور گھبراہٹ پیدا نہ ہو۔ یہ جواب دیکھو اعتراض کرنے والوں کے لئے کیسا مُسکت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب دو قسم کے تھے۔ ایک عارضی یعنی اس وقت کے کفّار اور ایک مستقل یعنی مومن اور بعد میں آنے والے لوگ۔ مستقل ضرورت کے لئے قرآن کریم کی اَور ترتیب چاہیئے تھی اور عارضی ضرورت کے لئے اَور۔ مستقل ضرورت کے لئے جن سورتوں کو آخر میں نازل کرنا چاہئے تھا، عارضی ضرورت کے لئے ان کی فوری ضرورت تھی۔ اسی طرح ایک سورۃ کے بعض مضامین کی ضرورت آخر میں تھی، بعض کی شروع میں۔ اگر عارضی ضرورت کو مدِّنظر نہ رکھا جاتا تو سالہا سال تک مسلمان کفّار کو صحیح جواب نہ دے سکتے۔ اور اگر مستقل ضرورت کو نظرانداز کیا جاتا۔ تو قرآن آئندہ زمانہ میں ایسا مفید نہ ہوتا جیسا اب ہے۔ پس فرمایا ہم نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اُتارا۔ جُوں جُوں ضرورت تھی اُتارتے گئے۔ بعد والے مضمون کو پہلے۔ پہلے کے مضمون کو بعد میں۔ تاکہ وقتی ضرورت پوری ہو جائے۔ اور بعد میں حکم دے کر مستقل ضرورت کے مطابق اسکی ترتیب کر دی جیسے دوسری جگہ فرماتا ہے اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیامۃ ع ۱) کہ اسکی آخری ترتیب ابھی نہیں ہوئی جب یہ وحی کے متفرق ٹکڑے اُتر چکیں گے تو ہم از سرِ نو اس کتاب کو ترتیب دیں گے۔ اور پھر وہ اس ترتیب کے مطابق پڑھی جائے گی۔

اس آیت میں اس شبہ کا جواب دیا گیا ہے کہ اس سورۃ میں بعض ایسے مضامین کا جواب ہے جو بعد میں نازل ہونے والی سورتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۰۸ حل لغات۔ الاذقان:۔ ذقن کی جمع ہے۔ اور ذقن کے معنے ٹھوڑی کے ہیں۔ ذقن کا لفظ عربی محاورہ کے رُو سے تذلّل پر دلالت کرنے کے لئے بولا جاتا ہے کہتے ہیں۔ مثقل استعان بذقنه:۔ یضرب لمن استعان باذلّ منه۔ کہ فلاں نے اپنے سے بھی ذلیل انسان سے مدد چاہی (اقرب)۔ بس یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ میں انتہائی تذلّل کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں۔

الاذقان

تنزیلِ قرآن میں عارضی اور مستقل ضرورت دونوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے

تفسیر۔ اُوتوا العلم من قبله سے مراد اس جگہ مسلمان ہیں جن کو پہلے سے یعنی اس آیت کے نزول سے

لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ

رہنے والا ہے ۵۰۸ اور وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں۔ اور وہ (یعنی قرآن) انکی فروتنی کو (اور بھی)

خُشُوْعًا ۝ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا

بڑھاتا ہے ۵۰۹ تو (انہیں) کہہ (کہ) تم (خدا تعالیٰ کو) اللہ (کہہ کر) پکارو یا رحمٰن (کہہ کر) جو (نام بھی)

تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ

تم (اسے) پکارو (پکار سکتے ہو) کیونکہ تمام (بہترے) بہتر صفات اسی کی ہیں۔ اور تو اپنے دعائیہ الفاظ اونچی آواز سے نہ کہا کر

وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ وَ

اور نہ نہیں بہت آہستہ کہا کر۔ اور اس کے درمیان (درمیان) کوئی راہ اختیار (کیا) کر ۵۱۰ اور

قبل علم مل چکا تھا اور وہ اسلام کی سچائی کے قائل ہو چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آیندہ دنیا کی ترقی قرآن مجید سے ہوگی۔ اس جگہ اوتوا العلم سے اہل کتاب مراد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہی تو اس سورۃ میں سب سے اہم مخاطب ہیں۔

يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ۔ ذقن۔ ٹھوڑی کو کہتے ہیں۔ اور ٹھوڑی نیچے کی طرف ہوتی ہے پس ٹھوڑی کے سہارے گرنے یا ٹھوڑی پر گرنے سے مراد نیچے کی طرف جھکنے یا سجدہ کرنے کے ہوتے ہیں۔

اظہار خشوع کے لئے اسلامی طریق کا فرق عیسائیوں سے

اس آیت میں خشوع و خضوع کے اظہار کا اسلامی طریق بتایا گیا ہے۔ بعض قومیں مثلاً عیسائی وغیرہ سجدہ کے موقعہ پر نیچے کو جھکتے ہیں۔ مگر منہ کو اوپر کی طرف اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ عیسائیوں کی تصویروں میں جہاں حضرت مسیحؑ یا حضرت مریم کو عبادت کی حالت میں دکھایا ہے وہاں پر ان کا منہ آسمان کی طرف دکھایا گیا ہے۔

لَا تَجْهَرْ

۵۰۸ تفسیر۔ اس آیت میں صاف ظاہر کر دیا کہ اس سے پہلے مومنوں کے لئے ترقیات کے وعدے دیئے گئے ہیں اور "اسراء" کا ذکر صرف ایک خبر ہی نہ تھا بلکہ مومنوں کی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ترقی کا وعدہ تھا۔

سورۃ کے شروع میں بھی اسراء کے ذکر پر "سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی" رکھا اور یہاں بھی "سُبْحَانَ رَبِّنَآ" فرما کر بتایا کہ اس مقام پر مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ پھر سُبْحَان کے لفظ سے یہ اشارہ کرنا بھی مقصود ہے کہ مسلمان ضرور کامیاب ہونگے اور تم ضرور تباہ و برباد کئے جاؤگے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو خدا تعالیٰ کی قدوسیت پر حرف آتا ہے۔

۵۰۹ تفسیر۔ اس میں مومن کے سجدہ کے وقت کی قلبی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ وہ انابت کے اعلیٰ مقام پر ہوتا ہے اس کا سجدہ دکھاوے کا نہیں ہوتا۔ بلکہ جب وہ سجدہ کر رہا ہوتا ہے اس کے آنسو آپ ہی آپ بہنے لگ جاتے ہیں۔ پھر اس میں یہ صفت بھی پائی جاتی ہے کہ عبادت اسے متکبر نہیں بناتی۔ بلکہ اس کا سجدہ کرنا اسے خشوع و خضوع میں اور بڑھا دیتا ہے۔

۵۱۰ حل لغات۔ لَا تَجْهَرْ۔ جَهَرَ سے نہی کا صیغہ ہے۔ اور جَهَرَ الْكَلَامَ وَبِالْكَلَامِ کے معنے ہیں اَعْلَنَهٗ۔ کسی بات کا اعلان کیا۔ جَهَرَ الصَّوْتَ۔

اَعْلاہ. آواز کو اونچا کیا۔ (اقرب) پس لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا کے معنے ہونگے کہ تو اپنے دُعائیہ الفاظ اونچی آواز سے نہ کہا کر اور نہ آہستہ۔

لَا تُخَافِتْ: ۔ خَافَتَ سے فعل نہی ہے۔ اور خَفَتَ سے نکلا ہے۔ خفت او خَافَتَ بِكَلَامِهِ کے معنے ہیں۔ اَسَرَّ منلقَہٗ۔ پوشیدہ بات کی خَفَتَ بِصَوْتِهِ۔ خَفَضَہٗ وَخَفَضَا ہٗ ولم یَرْفَعہٗ بہت ہی آہستہ بولا۔ آواز کو نیچا کیا۔ اور بلند نہ ہونے دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلی آیات میں چونکہ سجدہ اور عبادت کا ذکر کیا گیا تھا (جس کی مسلمانوں سے ترقیات کے زمانہ میں امید کی جاتی تھی۔) اب سجدہ میں دُعا کا طریق بیان فرماتا ہے کہ ان سجدوں میں اللہ تعالےٰ سے اس کے وعدوں کے پورا ہونے کے متعلق اور اپنی اصلاح کے متعلق اس طریق پر دُعا کرو۔ جو ہم بتاتے ہیں۔ اس حکم کی تفصیل یہ ہے۔

قرآن مجید میں اور حدیث میں مختلف دُعائیں اور ان کے مواقع کا ذکر ہے اس لئے فرماتا ہے کہ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ہر کام کے لئے اس کے مناسب حال اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہوتا ہے۔ اس کے مطابق دُعا کیا کرو۔ جب تمہیں رحمانیت کی صفت کو جوش دلانے کی ضرورت ہو تو صفتِ اَلرَّحْمٰن کو پیش کر کے دُعا کرو۔ جب تمہیں رحیمیت۔ رزاقیت اور ربوبیت کے متعلق کوئی مشکل درپیش ہو تو اللہ تعالےٰ کو اس وقت اسی نام سے پکارو۔ کیونکہ سارے اچھے نام اسی کے ہیں جیسا موقعہ ہو ویسی ہی قسم کی صفت کے ساتھ دعا کرنی چاہیئے۔ میرا تجربہ ہے کہ اس طریق پر دُعا نہایت مؤثر ہوتی ہے۔ بعید نہیں کہ اس آیت میں یہود کے اسم اعظم والے دعویٰ کا بھی جواب دیا گیا ہو۔ اور بتایا ہو کہ کسی ایک نام کو اسم اعظم کہنا غلطی ہے۔ حصول مقاصد کے لئے خدا تعالےٰ کے اس نام کو لینا چاہیئے۔ جو موقعہ کے مناسب ہو اور اگر وہ نام ذہن میں نہ آئے تو اللہ تعالےٰ کے سب نام ہی بڑے ہیں کسی نام کو لے کر دعا کر لو۔ اللہ تعالےٰ تمہارے دل کی کیفیت کو دیکھ کر دُعا سُن لے گا۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا۔ صلوٰۃ کے معنے نماز کے بھی ہوتے ہیں۔ اور دُعا کے بھی۔ اس جگہ چونکہ دُعا کا ذکر ہے اس لئے دُعا ہی کے معنے زیادہ مناسب ہیں۔

فرمایا اپنی دُعا بہت بلند آواز سے نہ مانگا کرو اور نہ ہی بالکل دھیمی بلکہ درمیان کا راستہ اختیار کرو۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند صحابہ کے پاس سے گذرے تو آپؐ نے دیکھا کہ وہ پکار پکار کر دُعا کر رہے تھے۔ آپؐ نے اُن کو منع فرمایا اور کہا کہ تمہارا خدا بہرہ نہیں اس قدر اونچے پکارتے ہو وہ تو چیونٹی کے چلنے کی آواز کو بھی سُنتا ہے قرآن مجید نے بالکل آہستہ دُعا کرنے سے بھی منع کیا ہے کیونکہ اس سے توجہ قائم نہیں رہتی۔ دعا اس طرح کرنی چاہیئے کہ انسان کو کلمات زبان سے نکلتے ہوئے محسوس ہوں تاکہ اس کی توجہ بھی قائم رہے۔

غرض دُعا بہت بلند آواز سے مانگنے سے تو خدا تعالےٰ کی شان کو مدنظر رکھتے ہوئے منع فرمایا ہے اور نہایت آہستہ دُعا مانگنے سے انسان کی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے منع فرمایا ہے۔

لا تخافت

سجدہ میں دُعا کا طریق

مختلف مقاصد کے لئے اللہ کا مختلف دعاسے۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ

(سب دُنیا کو سُنا کر) کہہ (کہ) کامل تعریف اللہ (تعالیٰ) کے لئے (ہی) مخصوص ہے۔ جو نہ (تو) اولاد رکھتا ہے اور نہ حکومت

لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ

میں اس کا کوئی شریک ہے۔ اور نہ (اس کے) عجز کی وجہ سے اس کا کوئی دوست (بنا) ہے (بلکہ جو بھی اس کا دوست ہوتا ہے اس سے

وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝

مدد لینے کے لئے ہوتا ہے) اور اس کی خوب (اچھی طرح) بڑائی بیان کر۔ ۱۱۱

ع ۱۲ | ۱۲

تفسیر: اس میں اسراء کے انجام کی خبر دی ہے یعنی وہ خدا اپنے اس وعدہ کو ضرور پورا کرے گا۔ اور اسی واحد لاشریک خدا کی تعریف کے گیت گائے جائیں گے اگر اس کا کوئی بیٹا ہوتا جیسا کہ بیت المقدس والوں کا خیال ہے تو مسلمانوں کو کس نے پوچھنا تھا ایسا ہی اگر اس کے شریک ہوتے جیسا کہ مکے والے کہتے ہیں تو مسلمانوں کو حکومت کون دیتا یعنی یہ دونوں قومیں جو مشرک ہیں مسلمانوں کی دشمن تھیں اگر شرک صحیح ہوتا تو مسلمان دُنیا میں ہرگز کامیاب نہ ہوسکتے لیکن جب اس خدا نے باوجود انتہائی کمزوریوں کے مسلمانوں کو ان سب پر غالب کر دیا تو یقیناً سمجھا جائے گا کہ وہ خدا واحد اور لا شریک ہے۔

مسلمانوں کی ترقی شرک کی تردید ہے

مِنَ الذُّلِّ :۔ دوست دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک دوست جو رحم کی وجہ سے اور احسان کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے ایسے دوست اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں یہ اس کی شان کے خلاف نہیں دوسرے وہ دوست جو امداد اور موقعہ پر کام آنے کے لئے بنائے جاتے ہیں ایسے دوست اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہیں۔

كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا کہہ کر سورۃ کو ختم کیا گیا ہے۔ اور اس میں گویا پھر اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمانوں کو اہل کتاب پر غلبہ ملے گا اور جس طرح اہل مکہ پر غلبہ بتوں کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوگا اہل کتاب پر غلبہ ان لوگوں کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہوگا جو مسیح ابن اللہ یا عزیر ابن اللہ کہتے ہیں اور اس غلبہ کے ذریعہ سے خدائے واحد کی توحید تمام مُلک میں پھیلا دی جائیگی۔ اور خدا کا بیٹا ماننے والے یا اس کا شریک قرار دینے والے سب کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی میں داخل کردیا جائیگا اور اس کمزور اور ناتوان انسان کو طاقت بڑائی اور غلبہ دے کر ظاہر کیا جائے گا کہ وہ خدا تمام طاقتوں سے بڑا اور بلند ہے۔ اسی وجہ سے آخر میں فرمایا كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا۔

آؤ ہم بھی امتثال امر کے طور پر کہیں اَللہُ اَکْبَر اللہُ اَکْبَر! اللہُ اَکْبَر!

سُوْرَۃُ الْکَھْفِ مَکِّیَّۃٌ

سورہ کہف ۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَھِیَ مَعَ الْبَسْمَلَۃِ مِائَۃٌ وَّاِحْدٰی عَشْرَۃَ اٰیَۃً وَّاثْنَا عَشَرَ رُکُوْعًا

اور بسم اللہ سمیت اس کی ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اور بارہ رکوع ہیں

یہ سورۃ مکی ہے

۱ ابن عباسؓ اور ابن زبیر کے نزدیک یہ سورۃ سب کی سب مکی ہے (درمنثور) تمام مفسرین کا بھی اس امر پر اتفاق معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف مکی ہے بلکہ ابتدائی ایام کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کہف اور مریم ابتدائی سورتوں سے ہیں اور میرے پرانے مال میں سے ہیں۔ (بخاری جلد ۳ صفحہ ۲۰)

یہ سورۃ یکدم نازل ہوئی

بعض کے نزدیک یہ سورۃ ان سورتوں میں سے ہے جو یکدم نازل ہوئی ہیں۔ دیلمی نے انسؓ سے بھی روایت کی ہے کہ یہ سورۃ یکدم نازل ہوئی تھی اور ستر ہزار فرشتہ ساتھ تھا اور اس کی خاص طور پر حفاظت کی گئی تھی۔

سورۃ کے یکدم نازل ہونے اور اس کے ساتھ فرشتوں کے نزول کا مطلب

ان روایات کا یہ مطلب نہیں کہ بعض سورتوں کی حفاظت کم ہوتی ہے اور بعض کی زیادہ۔ کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بعض سورتوں کا محفوظ ہونا زیادہ یقینی ہے اور بعض کا کم۔ لیکن یہ امر بالبداہت غلط ہے پس جہاں جہاں حدیثوں میں آتا ہے کہ فلاں سورۃ کی حفاظت کے لئے اتنے فرشتے اُترے۔ اس سے نزول کے وقت کی حفاظت مُراد نہیں بلکہ نزول کے بعد کی حفاظت مُراد ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ ہر سورۃ کسی خاص مضمون کے بارہ میں ہوتی ہے اور بعض دفعہ اس میں پیشگوئیاں ہوتی ہیں جن کے پورا ہونے پر اس سورۃ کی سچائی کا انحصار ہوتا ہے یہ پیشگوئیاں بعض دفعہ طبعی تغیرات کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض دفعہ انسانی اعمال کے متعلق۔ انسانی اعمال کے متعلق جو پیشگوئیاں ہوتی ہیں وہ اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں کہ جنکے عذاب کی ان پیشگوئیوں میں خبر ہو۔ وہ اس عذاب کو ٹالنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور چونکہ پیشگوئیاں بالعموم غیر معمولی طور پر مخالف حالات میں کی جاتی ہیں۔ اس لئے دنیوی سامانوں کے لحاظ سے ان کا پُورا ہونا بظاہر ناممکن یا غیر اغلب نظر آتا ہے اور اسی وقت ان کے پورا ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی امداد کا انتظام کیا جائے پس جس سورۃ میں اس قسم کی پیشگوئیاں ہوں جن کے باطل جانے کے متعلق زبردست قوموں نے زور لگانا ہو ان کے بارہ میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان ملائکہ کو جو دنیا کے مختلف کاموں پر بطور مدبّر مقرر ہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ایسے سامان پیدا کریں کہ وہ پیشگوئیاں بغیر روک کے پُوری ہو جائیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جس قدر وسیع الاثر پیشگوئی ہوگی اسی قدر وسیع اس کے مخالفوں کی تعداد ہوگی اور اسی قدر وسیع ذرائع اس کے باطل کرنے کے لئے دشمن استعمال کرے گا۔ اور اسکے مقابل پر اسی قدر وسیع ذرائع اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکی تائید میں استعمال کئے جائیں گے۔ پس چونکہ دُنیا کے تمام اسباب ملائکہ کے سپرد ہیں اور وہ خدا تعالےٰ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ان کے لئے بطور مدبّر ہیں اس لئے جب کوئی ایسی پیشگوئی کی جاتی ہے۔ اسی قدر ملائکہ کو جن کے زیر تدبیر وہ سامان ہوں جو اس کے پورا ہونے کا تعلق ہو حکم دیا جاتا ہے کہ تم اس سورۃ کے مضمون کی حفاظت کرو یعنی ان تدابیر میں لگ جاؤ جو اس پیشگوئی کے پورا کرنے کے لئے ضروری ہیں پس حفاظت آسمان سے زمین کے نزول تک نہیں ہوتی بلکہ حفاظت کا اصل کام نزول کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ اس سورۃ میں بیان کردہ پیشگوئیاں

پوری نہ ہو جائیں ورنہ شیطانی یا انسانی دخل اندازی کے لحاظ سے ہر سورۃ ہر آیت ہر لفظ بلکہ ہر حرف اور حرکت قرآن کریم کی یکساں محفوظ ہے اور اسکی یکساں حفاظت کی جاتی ہے اور کسی سورۃ یا کسی آیت یا کسی حرف یا حرکت کو دوسری سورتوں یا دوسری آیتوں یا دوسرے حرفوں اور حرکات سے امتیاز حاصل نہیں۔

غرض اس سورۃ کے ساتھ ستر ہزار فرشتے اتارنے کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ اس میں یاجوج ماجوج جیسی طاقتور قوموں اور آخری مسیحی فتنہ کے استیصال کی خبر دی گئی ہے اس لئے ہزاروں فرشتوں کو اس پیشگوئی کے پورا کرنے کے لئے نزول قرآن کے زمانہ سے لگا دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

زمانۂ نزول | مسیحی مصنف اس کے نزول کا زمانہ قریباً نبوت کے چھٹے سال میں قرار دیتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ چوتھے یا پانچویں سال کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی مذکورہ بالا روایت سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔

مفسرین کے نزدیک اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق

اس سورۃ کا اسراء سے تعلق | اس کا تعلق پہلی سورۃ سے مفسرین یہ قرار دیتے ہیں کہ یہود نے تین سوال کئے تھے۔

(۱) رُوح کے متعلق۔ (۲) اصحاب کہف کے متعلق (۳) ذوالقرنین کے متعلق۔ ان تین سوالوں میں سے ایک کا جواب دیر سے آیا (یعنی روح القدس کے متعلق) اور وُہ سورۃ اسراء میں درج ہُوا۔

دوسرے دو سوالوں کا جواب جلدی اور اکٹھا آگیا۔ اس لئے ان دونوں کو ایک ہی سورۃ یعنے کہف میں اکٹھا بیان کر دیا (بحر محیط) لیکن یہ جواب کافی نہیں۔ کیونکہ اس سورۃ میں اور بھی کئی واقعات ہیں۔ مثلاً دو باغ والوں کی تمثیل

مفسرین کے بیان کردہ تعلق پر بحث

موسیٰ کا سفر وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ ان واقعات کو یہاں کیوں بیان کیا گیا ہے۔ مفسرین اس کے جواب میں خاموش ہیں۔ پادری ویری اپنی تفسیر میں اس سورۃ کے واقعات کی بناء پر لکھتے ہیں کہ اس سورۃ کو سورۃ العجائب کہنا چاہیئے

میرے نزدیک نہ مفسرین کی توجیہہ صحیح ہے اور نہ ویری کا اعتراض معقول۔ یہ توجیہہ بھی اور یہ اعتراض بھی سورۃ کا مضمون اور اسکی غرض نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ چونکہ بعض نامکمل یا کمزور روایات کی وجہ سے مفسرین کے دماغوں میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ یہود نے آنحضرت صلعم سے تین عجیب سوال کئے تھے اور یہاں ان کا جواب دیا گیا ہے اس لئے انہوں نے کسی اور پہلو پر غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اور ان کا خیال اِن کمزور روایات میں ہی الجھا رہا۔ حالانکہ یہ امر بالکل ماننے کے قابل نہیں کہ قرآن کریم میں کوئی واقعہ یہود کے سوال کی وجہ سے نازل ہُوا ہو۔ قرآن کریم تو ایک مکمل ہدایت نامہ ہے اسے اس سے کیا تعلق کہ کوئی سوال کرتا ہے یا نہیں۔ اس نے تو بہر حال ہر وہ علم جو اخلاق عبادت۔ روحانیت۔ تقویٰ۔ تمدن۔ اقتصاد اور سیاست وغیرہا کے متعلق ہو بیان کرنا ہی تھا۔ پس اگر ان واقعات کا دین اور دیانت سے کوئی تعلق ہے تو انہوں نے بہرحال بیان ہونا تھا۔ اور اگر نہیں تو یہودی لاکھ سوال کرتے ان کے بیان کرنے کی قرآن کریم کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ امر بھی ناقابل تسلیم ہے کہ ان واقعات کو اس لئے اکٹھا بیان کیا گیا ہے کہ یہود نے اکٹھا سوال کیا تھا۔ ایک وقت میں انسان مختلف مضامین کے متعلق سوال کر دیتا ہے اس مجلس میں اس ترتیب سے ان کا جواب دینا تو معقول ہو سکتا ہے لیکن ایک مستقل کتاب میں جس کا تعلق کسی خاص قوم یا زمانہ سے نہیں۔ ان سوالوں کا جواب اکٹھا دینا قطع نظر اس کے کہ ان کا آپس میں کوئی جوڑ بھی ہو یا نہ ہو ہرگز پسندیدہ امر نہیں کہلا سکتا۔ پس میرے نزدیک یہ خیالات قلت تدبر سے پیدا ہوئے ہیں یا شائد اس وقت ابھی ان سوالات کے حل ہونے کا زمانہ نہ آیا تھا۔

میرے نزدیک یہ امر بھی بالکل خلاف عقل ہے اور قرآن کریم کی شان کے خلاف ہے کہ دو سوالوں کا جواب

جلدی آگیا اس لئے اسے کہف میں رکھ دیا اور ایک کا جواب
بعد میں آیا اس لئے اسے سورۃ اسرا میں بیان کر دیا کیونکہ
اس جواب پر یہ معقول اعتراض ہوتا ہے کہ کیوں دو سوالوں
کے جواب پہلے آگئے۔ بعض مفسرین نے اس فرق کی وجہ
یہ بیان کی ہے کہ دو سوالوں کا جواب چونکہ دیا گیا ہے اور
ایک کے جواب سے لاعلمی ظاہر کی گئی ہے اس لئے جن کا جواب
دیا گیا تھا انہیں ایک سورۃ میں بیان کر دیا۔ اور جس سوال
کے جواب سے معذوری ظاہر کی اسے سورۂ اسرا کے ساتھ شامل
کر دیا۔ اول تو یہ جواب جواب دینے والے کی لاعلمی پر دلالت
کرتا ہے۔ قرآن کریم نے ہرگز کسی معذوری یا لاعلمی کا اظہار
نہیں کیا بلکہ رُوح کے متعلق جو سوال تھا اس کا مکمل جواب
دیا ہے دوسرے یہ جواب بھی اس خیال پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ
اپنی آخری اور جامع کتاب کے مضامین کے لئے یہود کے سوالوں
کا محتاج تھا۔ یا مجبور تھا کہ وہ سوال کریں تو ان کا جواب دے
قرآن کریم میں یہود و مشرکین کے سارے ہی شبہات کا جواب
ہے مگر اس طرح نہیں کہ انہوں نے سوال کیا اور قرآن نے جواب
دیا۔ بلکہ جو مضمون قرآن میں بیان ہوتا ہے اس کے متعلق جو
شبہات اور وسوسے پیدا کئے جا سکتے ہیں وہ ان کا جواب اس
جگہ دے دیتا ہے خواہ عملاً کفار و مشرکین نے وہ وسوسے پیش کئے
ہوں یا نہ کئے ہوں اور کسی اور وقت پیش کئے ہوں یا اس وقت
پیش کئے ہوں۔ درحقیقت قرآن ان عارضی موجبات کی
ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ تو اپنے مضمون سے کام رکھتا
ہے کیونکہ وہ صرف اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نہیں اُترا تھا
بلکہ ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے اُترا تھا۔ پس اس کے جوابات
صرف اس مضمون پر پڑنے والے اعتراضات کے متعلق ہوتے
ہیں جو وہ بیان کر رہا ہوتا ہے۔

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ مفسرین نے اپنے خیالات کی
بنا جن روایتوں پر رکھی ہے وہ خود عقلاً اور نقلاً مجروح
معلوم ہوتی ہیں وہ روایتیں یہ ہیں۔ (۱) مکہ والوں نے
ایک وفد مدینہ کے یہود کی طرف بھجوایا کہ مکہ میں ایک مدعی
پیدا ہوا ہے اس کے بارہ میں ہمیں مشورہ دو کہ ہم کیا کریں انہوں
نے جواب دیا کہ اس سے تین سوال کرو اگر وہ جواب دے دے
تو سچا ہے ورنہ جھوٹا ہے ان لوگوں نے واپس آکر وہ تین
سوال رسول کریم صلعم پر کئے (الف) اصحاب کہف کون
تھے (ب) ذوالقرنین کے واقعات کیا ہیں (ج) رُوح
کیا چیز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کل
جواب دوں گا۔ مگر دس پندرہ دن تک وحی نہ آئی آپؐ
بہت گھبرائے اور کفار بہت خوش ہوئے۔ آخر جبریل وحی
لائے اور آپؐ نے ان سے شکایت کی کہ اس قدر دیر کیوں
کی۔ انہوں نے کہا کہ آپؐ نے چونکہ انشاء اللہ نہ کہا تھا اللہ تعالیٰ
نے سزا دی ہے اور تینوں سوالوں کے جواب بتا دیئے جن میں
سے دو سورہ کہف میں بیان ہوئے ہیں اور ایک سورۃ اسرا
میں بیان کیا گیا ہے یہ روایت ابن عباسؓ کی طرف منسوب
کر کے بیان کی گئی ہے (درمنثور بحوالہ ابن اسحاق ابن
جریر وغیرہما) دوسری روایت بھی حضرت ابن عباسؓ کی
طرف منسوب ہے اور وہ یہ ہے کہ کفار نے ایک وفد مدینہ
کے یہود کی طرف بھجوایا اور ان سے آپؐ کے بارہ میں مشورہ
کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس سے تین سوال پوچھو کہ اصحاب
کہف۔ ذوالقرنین اور رُوح کیا ہیں۔ ان میں سے پہلے دو
کا جواب اگر وہ دے دے اور تیسرے کے جواب سے معذوری
ظاہر کرے تو وہ سچا ہے اور اگر تینوں کا جواب وہ نہ دے
یا رُوح کے متعلق بھی وہ کوئی جواب دے دے تو وہ جھوٹا
ہے اور یہ بھی کہا کہ ہم نے مسیلمہ کذاب سے بھی یہ سوال کیا
تھا مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ آگے پہلی روایت کی طرح
کی روایت ہے سوائے اسکے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کی بابت سوالوں کا جواب
تو دے دیا لیکن رُوح کے بارہ میں یہ کہا کہ قُلِ الرُّوحُ
مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (اسراء ع) اور اس طرح معذوری
ظاہر کر دی (درمنثور بحوالہ دلائل النبوۃ ابونعیم)
اول تو یہ روایتیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب

ہیں جو اس واقعہ کے تین چار سال بعد پیدا ہوئے تھے
مگر یہ واقعہ اہم نہ ہوتا تو ہم کہتے کہ باقی صحابہؓ نے اس کا
ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی یا کوئی گھر کا معاملہ ہوتا تو بھی
ہم سمجھتے کہ گھر کے کسی فرد کو اس کا بہتر علم ہو سکتا تھا لیکن اہم
تو وہ اس قدر ہے کہ مکہ کے لوگ ایک وفد تین سو میل مدینہ کی
طرف بھجواتے ہیں پھر وہ لوگ آکر رسول کریم صلعم پر سوال
کرتے ہیں پھر کئی دن تک جواب نہ آنے کے سبب سے
مکہ کے لوگ خوش اور رسول کریم صلعم غمگین ہوتے ہیں لیکن
اس زمانہ کے صحابہ میں سے ایک بھی اس واقعہ کو بیان
نہیں کرتا اگر کرتا ہے تو وہ شخص جو اس وقت پیدا بھی نہ ہوا تھا

دوسرا اعتراض ان روایات پر یہ ہے کہ دونوں
ہی روایات حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں اور
دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ ایک روایت تو
کہتی ہے کہ اگر ان تین سوالوں کا جواب اس شخص نے نہ دیا
تو وہ جھوٹا۔ دوسری یہ کہتی ہے کہ اگر ان تین سوالوں میں سے
دو کا جواب اس نے دیا تو سچا۔ اور اگر تیسرے سوال کا جواب
بھی دے دیا تو جھوٹا۔ اب ہم کس روایت کو مانیں جو روایت
یہ کہتی ہے کہ تینوں کا جواب دیں تو سچے ہیں یا جو یہ کہتی ہے
کہ تینوں کا جواب دیں تو جھوٹے ہیں۔ اگر اس روایت کو مانا
جائے جو کہتی ہے کہ تینوں کا جواب دیں تو سچے ہیں تو جو لوگ
کہتے ہیں کہ تیسرے سوال کا جواب نہیں ملا وہ کیا کریں کیا اس
حدیث کو جھوٹا کہیں یا (نعوذ باللہ من ذالک) رسول کریم
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو۔ اور اگر اس حدیث کو سچا کہا جائے
جو یہ بتاتی ہے کہ اگر روح کے متعلق سوال کا جواب محمدؐ
(رسول اللہ صلعم) دے دیں تو وہ جھوٹے ہیں تو بتاؤ کہ جو
شخص قرآن کریم کے اس جواب کو کہ قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ
رَبِّیْ کو ایک مکمل اور شافی جواب سمجھتا ہے وہ اس حدیث
کو جھوٹا کہے یا نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلعم کو۔ میرے نزدیک
تو چونکہ دونوں حدیثوں میں جو دعویٰ پیش کیا گیا ہے وہ
خلاف عقل ہے اس لئے دونوں ہی جھوٹی ہیں خدا کا رسول
بہر حال سچا ہے۔

یہ روایات خلافِ عقل اس طرح ہیں کہ جن سوالات
کا ان میں ذکر ہے سوال یہ ہے کہ ان کے جواب یہود جانتے تھے
یا نہیں۔ اگر وہ جانتے تھے تو کیا اس سے احمقانہ طریق بھی کسی
نبی کے پرکھنے کا ہو سکتا ہے کہ اس سے ایک ایسے امر کے متعلق
سوال کیا جائے جسے سینکڑوں ہزاروں لوگ جانتے تھے
فرض کرو کسی کذاب کو بھی ان باتوں کا یہود سے سن کر علم
ہوتا۔ تو کیا ان سوالوں کا جواب دیکر وہ سچا نبی ہو جاتا۔ اگر
مذکورہ بالا سوال کا جواب یہ ہے کہ یہود ان سوالوں کا جواب
نہیں جانتے تھے تو پھر بھی اس سے زیادہ احمقانہ طریق کسی
مدعی کے پرکھنے کا کیا ہو سکتا ہے جب وہ جواب جانتے ہی نہ
تھے تو انہیں کس طرح معلوم ہوتا کہ جو جواب دیئے گئے ہیں
وہ غلط ہیں یا صحیح اور کیا محض جواب دے دینے سے مدعی
کی سچائی ثابت ہو سکتی تھی۔ یہی اعتراضات کم سے کم دوسری
روایت کے دو سوالوں کے بارہ میں بھی پیدا ہوتے ہیں
اور چونکہ ان سوالات کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جا سکتا
اس لئے ظاہر ہے کہ یہ روایات بعض وضاعین کی بنائی
ہوئی ہیں۔

تیسرا اعتراض دوسری روایت پر یہ پڑتا ہے کہ اس
میں لکھا ہے کہ ہم نے مسیلمہ کذاب سے بھی پوچھا ہے وہ بھی
جواب نہیں دے سکا۔ یہ حصہ روایت کا روایت کو جھوٹا
ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کیونکہ گو مسیلمہ بنو حنیفہ میں
معزز آدمی تھا مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ بنو حنیفہ اسلام
لانے سے پہلے عیسائی تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے ہاتھ پر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے اور مسلمان ہونے
کے بعد مسیلمہ مرتد ہو کر مدعی نبوۃ بنا۔ اور یہ خود مدینہ آیا
اسلام لایا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قوم کو
حکم دیا کہ واپس جاکر اپنے گرجا کو مسجد بناؤ اور نمازوں کے
پابند رہو (زرقانی جلد ۴۔ اور لائف آف محمد مصنفہ سر میور)
اب یہ ظاہر ہے کہ جس شخص نے نبوۃ کا دعویٰ رسول کریم صلعم

کی مدنی زندگی کے آخری سالوں میں کیا۔ اس سے مدینہ کے یہود اس وقت یہ سوال کہاں سے کرنے گئے تھے جبکہ رسول کریم صلعم ابھی مکہ میں تھے اور اس شخص نے نبوت کا دعویٰ ہی اس وقت تک نہ کیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ یہ روایات بالکل غلط اور باطل ہیں۔ اور ان پر کسی صورت میں بھی تفسیر کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

جب یہ روایات غلط ثابت ہو گئیں تو اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم سے اس سورۃ کے مضامین کی ترتیب کی کیا وجوہ معلوم ہوتی ہیں اور ایسی روایات کی طرف ہمیں توجہ ہی نہیں کرنی چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم کے مطابق اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق

اب میں بتاتا ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں کیا علم دیا ہے اور اس کے مطابق سورۃ کہف کا جوڑ پہلی سورۃ سے کیا ہے اور جو واقعات اس میں بیان ہیں ان کا سورۃ بنی اسرائیل سے کیا تعلق ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا کہ سورۃ نحل میں ثابت کیا جا چکا ہے۔ سورۃ نحل میں یہود و نصاری سے مقابلہ کی پیشگوئی کی گئی تھی اور سورۃ اسراء میں اسکی مزید تشریح اس طرح کی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلعم کو ایک ایسے علاقہ میں لے جائے گا جہاں ان کا تعلق یہود و نصاریٰ سے پیدا ہوگا اور وہ بھی آپؐ کی مخالفت کریں گے اور شکست کھائیں گے اور ساتھ ہی ایک کشف کا ذکر کیا گیا تھا جس میں خبر دی گئی تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان علاقوں پر قابض ہو جائیں گے جو یہود کے لئے موعود تھے اور یہ کہ یہود کے لئے مقدر ہو چکا ہے کہ وہ دو بغاوتیں کریں گے۔ ایک بغاوت حضرت داؤد کے بعد جس کے نتیجہ میں وہ اپنے ملک سے نکالے جائیں گے لیکن اس کے بعد توبہ کر کے اپنے ملک میں واپس آنے کی توفیق پائیں گے۔ دوسری بغاوت وہ مسیح کے زمانہ میں کریں گے جس کے نتیجہ میں پھر انکے معبد گرائے جائیں گے اور انہیں اپنے موعود وطن سے نکال دیا جائے گا۔ ان پیشگوئیوں میں موسوی سلسلہ کی پہلی کڑی کے حالات بتلائے گئے تھے اب ایک سوال تو یہ رہ جاتا تھا کہ موسوی سلسلہ کی دوسری کڑی تو موجود ہے جو ان عذابوں میں پہلی کڑی یعنے یہود کے شریک حال نہیں پس کیوں نہ سمجھا جائے کہ یہود کی تباہی کے بعد وہ ان پیشگوئیوں کے مصداق بنیں گے جو موسوی سلسلہ کی ترقی کی نسبت پہلی کتب میں بیان ہو چکی ہیں۔ اور دوسرا سوال یہ رہ جاتا تھا کہ مسلمانوں کو جو ہوشیار کیا گیا ہے کہ تم یہود کے نقش قدم پر چلکر اپنے آپ کو یہود کی طرح ان دو عذابوں میں مبتلا نہ کر لینا۔ اس کے متعلق آیندہ کیا ہونے والا ہے؟ ان دونوں سوالوں کا جواب سورۂ کہف میں دیا گیا ہے اور موسوی سلسلہ کی دوسری کڑی کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ مسلمان جو یہود کے نقش قدم پر چلیں گے انکے ساتھ کیا معاملہ گذرے گا اور کس طرح گذرے گا۔

رہا یہ سوال کہ اصحاب کہف اور دو باغوں کی تمثیل سے اور موسیٰ کے اسراء کے واقعہ اور پھر ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کے ذکر کا ان امور سے کیا تعلق ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ان واقعات میں مسیحی قوم کی ابتداء اور انتہاء کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے جو مسلمانوں پر ان کی بے دینی کی وجہ سے مسیحی اقوام کی طرف سے پیش آنے والی تھیں۔

اصحاب کہف وہ ابتدائی مسیحی ہیں جنہوں نے دین کی خاطر بڑی بڑی تکالیف اٹھائیں اور آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکی قربانیوں کا بدلا ملا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر فضل کر کے دینی اور دنیوی ترقیات انہیں دیں۔ یہ واقعات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے گذر چکے تھے کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت نصاریٰ بھی سیدھے رستہ کو چھوڑ چکے تھے ان کے ذکر سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب یہود نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے لئے اصحاب کہف یا دوسرے لفظوں میں ابتدائی مسیحیوں کو جو راستی پر قائم تھے اپنے فضلوں کے لئے چن لیا۔ اس کے بعد مضمون کا گریز اس طرف ہونا چاہیئے تھا کہ پھر ان پر سے فضل کو کیوں ہٹایا گیا تو اس کا جواب دو باغوں والے کی تمثیل سے دیا کہ موسوی سلسلہ کو ہم نے دو باغ دیئے تھے یعنے یہود کی

کی ترقی کا باغ۔ اور مسیح کی امت کی ترقی کا باغ۔ جن دونوں میں سے ایک کا ذکر سورۃ اسراء میں کیا گیا۔ اور دوسرے کا ذکر اصحاب کہف کے ذکر سے کیا گیا ہے پھر یہ بتایا کہ ان دو باغوں کی ملکیت سے یہ قوم منکر ہوگئی اور خدا تعالیٰ کو بھول گئی اور اپنے بھائیوں یعنے بنو اسمٰعیل کو حقیر سمجھنے لگ گئی اور یہ سمجھ بیٹھی کہ گویا اس پر یہ فضل کسی ذاتی حق کی بناء پر نازل ہو رہے ہیں تب اللہ تعالیٰ نے مظلوموں اور ان کی جو حقیر سمجھے گئے تھے فریاد کو سُنا۔ اور موسوی سلسلہ کے باغوں کو جلا دیا یعنے دونوں قوموں کی شان و شوکت کو توڑ دیا اور اسمٰعیلی نسل پر جو حقیر سمجھی گئی تھی فضل کر کے ان سے اچھے باغ ان کو دے دیئے

سورۃ کا خلاصہ مضمون

اس تمثیل کے بعد مضمون کو اور واضح کرنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک اسراء کا ذکر فرمایا جس میں انہیں موسوی سلسلہ کی ترقیات اسی طرح دکھائی گئی تھیں جس طرح محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ اسراء میں بیان شدہ اسراء میں محمدی سلسلہ کی ترقیات دکھائی گئی تھیں اور اس اسراء کے ذکر سے وضاحت سے اس مضمون کو بیان کیا کہ موسوی سلسلہ کی ترقی جسے اسراء کی شکل میں دکھایا گیا تھا کس طرح ہوگی اور کس مقام پر پہنچ کر وہ ترقی رُک جائے گی اور اسمٰعیلی نسل کی طرف برکات منتقل ہو جائینگی۔ اس امر کے بیان کرنے کے بعد اس ذکر کو شروع کیا کہ اسمٰعیلی نسل کی طرف برکات سماوی کے منتقل ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ ان نافرمانوں کو جو محمدی سلسلہ میں سے دین سے غافل ہو جائینگے موسوی سلسلہ کی بگڑی ہوئی دوسری کڑی کے ہاتھوں سے سزا دلوائے گا اور یہ سزا یاجوج ماجوج کے ذریعہ سے ہوگی جو نصرانی دین کے پابند ہونگے اور ایک دن سب دُنیا پر چھا جائینگے۔ اور یہ سمجھانے کے لئے کہ یہ اقوام اب بھی موجود ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے ابھی ان کو پھیلنے اور ترقی کرنے سے روکا ہوا ہے ان وجوہ کو بیان کیا جو ان اقوام کو روک رہی ہیں اور یاجوج ماجوج کے ایک عرصہ تک باقی دُنیا سے الگ رہنے کا سبب ایک وجود کو بنایا جس کا نام ذوالقرنین بیان فرمایا ہے اور اس طرح نصرانی قوم کے دونوں حصوں کے واقعات بیان کر دیئے ایک وہ جو اصحاب کہف کی شکل میں سچے اور اصل نصرانی تھے اور ایک وہ جو اصحاب کہف کی رُوح کے کچلے جانے کے بعد مسیحیت کو قبول کرینگے اور وہ نصرانی دین پر صرف ظاہر میں قائم ہونگے درحقیقت وہ اس دین کی رُوح سے بالکل بے خبر ہوں گے۔

آخر میں بتایا کہ آخر اللہ تعالیٰ اپنے عذاب بھیج کر اس یاجوج ماجوج فتنہ کو کُچل دے گا۔ اور ایک ذوالقرنین ثانی کے ذریعہ سے مسلمانوں کی نجات کے سامان پیدا کرے گا۔

خلاصہ یہ کہ اس سورۃ میں مسیحی سلسلہ کے دو دَوروں کا ذکر کیا گیا ہے اس دَور کا بھی جو نیکی کا دَور تھا اور اس کا بھی جو بدی کا دَور تھا۔ اور بتایا ہے کہ ان دونوں دَوروں کے درمیان محمدی سلسلہ کا قیام مقدر ہے اور محمدی سلسلہ کے نافرمانوں کی سزا کے لئے اللہ تعالیٰ نے عیسوی سلسلہ کے بے دین لوگوں کو چھپا رکھا ہے ایک دن وہ ظاہر ہونگے اور اسلامی شوکت کو توڑ دیں گے مگر پھر اللہ تعالیٰ فضل کر کے اسلام کو فتنہ سے محفوظ کرے گا۔

یہ خلاصہ ہے۔ باقی تفصیلات سورۃ کے مختلف حصوں میں ساتھ کے ساتھ بیان کی جائینگی۔

یہ ترتیب تو وہ ہے جو اس سورۃ کے دوسری سورتوں سے تعلق کو مدنظر رکھ کر بیان کی گئی ہے۔ باقی رہا اس سورۃ کی ابتداء کا تعلق پہلی سورۃ کے آخر سے سو وہ بھی ظاہر ہے۔ اسراء کے آخر میں فرمایا تھا وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا اور اس سورۃ کے شروع میں فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم پر قرآن ہم نے جن اغراض سے نازل کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ پس پہلی سورۃ کو ختم اس ذکر سے کیا تھا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں اور اس سورۃ کو شروع اس ذکر سے کیا ہے کہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قوم کی تباہی کی خبر دیتے ہیں جو خدا کا بیٹا تجویز کرتی ہے۔ اسی طرح پہلی سورۃ کے آخر میں فرمایا تھا کہ علم والے لوگ وہ ہوتے ہیں جو خدا تعالےٰ کی عبادتیں کرتے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں اور کہف کے شروع میں یہ بتایا ہے کہ جو خدا تعالیٰ کا بیٹا تجویز کرتے ہیں وہ علم والے نہیں کہلا سکتے۔ گویا پہلی سورۃ میں علم کی تشریح کی۔ اور دوسری میں جہالت کی۔ تیسرا تعلق سورۂ اسرا کے آخری حصہ اور سورۂ کہف کے ابتدائی حصہ میں یہ ہے کہ سورۂ اسراء کے آخر میں تو یہ بیان فرمایا ہے کہ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ اللہ تعالیٰ کا حکومت میں کوئی شریک نہیں۔ اور سورۂ کہف کے شروع میں یہ بیان فرمایا ہے کہ لِیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ قرآن محمد رسول اللہ صلعم کو اس لئے ملا ہے تا کہ لوگوں کو اس عذاب سے ڈرائیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے یعنے جو لوگ اپنی حکومتوں پر گھمنڈ کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ دنیوی سامان کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے والا اور انہیں تباہ کرنے والا کوئی نہیں ان کو بتادے کہ تباہیاں ایسے ذرائع سے بھی ہوا کرتی ہیں جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ پس اس خدا کے عذاب سے مطمئن نہ ہو جو اس دُنیا کا اصل بادشاہ ہے چوتھا تعلق دونوں سورتوں کے آخری اور ابتدائی حصوں میں یہ ہے کہ سورہ اسراء کے آخری الفاظ یہ تھے کہ کَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا خدا تعالیٰ ہی کی بڑائی بیان کرو اور اس سورۃ کی شروع کی آیات میں خدا کا بیٹا بنانے والوں کا ذکر کرکے فرماتا ہے کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ۔ یہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے موہنوں سے نکل رہی ہے یعنے بڑائی تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور یہ ظلماً وہ حق اسکی ناچیز مخلوق کو دے رہے ہیں

نصاریٰ کے متعلق اس سورۃ کے ہونے کا ثبوت احادیث سے

اب مَیں بعض احادیث درج کرتا ہوں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سورۃ کو نصاریٰ کے متعلق ہی کہا ہے اور انہی پر چسپاں کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل ابوالدرداءؓ سے روایت کرتے ہیں کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلعم مَنْ حَفِظَ عَشْرَ اٰیَاتٍ مِّنْ اَوَّلِ سُوْرَةِ الْکَهْفِ عُصِمَ مِنَ الدَّجَّالِ۔ یعنی جس شخص نے دس آیتیں سورۂ کہف کی ابتداء سے یاد کرلیں وہ دجّال کے فتنہ سے بچایا جائے گا۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۴۹)

اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ دجّال کے فتنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور احمدؒ اور مسلم اور نسائی نے ابوالدرداء سے روایت کی ہے کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ مَنْ قَرَأَ عَشْرَ الْاَوَاخِرِ مِنْ سُوْرَةِ الْکَهْفِ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ۔ کہ جس شخص نے سورہ کہف کی آخری دس آیتیں یاد کرلیں وہ دجّال کے فتنہ سے محفوظ ہو جائے گا (مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۴۶)

سورہ اسراء کے آخر اور کہف کے ابتدائی مضمون کا تعلق۔

ان احادیث سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورۃ کو دجّال کے فتنہ کے متعلق سمجھا ہے لیکن دجّال کا نام اس سورۃ میں نہیں آیا۔ ہاں پہلی آیات میں خدا کا بیٹا بنانے کا ذکر ہے جو عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور آخری آیات میں اسی قوم کا ذکر ہے جو رات اور دن دُنیا کی ترقیات کی سعی میں خرچ کردیں گے اور ایجادات اور اختراعات میں اس طرح لگ جائیں گے کہ انہیں خیال ہو جائے گا کہ شائد اب کائنات کا راز ہم دریافت کر لینگے لیکن جس قدر ایجادات وہ کریں گے اسی قدر یہ بات کھلتی جائے گی کہ ہر رازِ قدرت کے بعد ایک اور رازِ قدرت موجود ہے اور اللہ تعالےٰ کے کاموں کی کوئی حدبندی نہیں کرسکتا۔ اور یہ نقشہ بھی مسیحی اقوام کا ہے پس جب پہلی اور پچھلی سورتوں میں مسیحی مذہب اور مسیحی ترقیات کا ذکر ہے۔ تو یہ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بھی پہلی دس اور آخری دس آیتیں سورہ کہف کی پڑھے گا دجّال کے فتنہ سے محفوظ ہو جائے گا اس کے یہی معنے بنتے ہیں کہ آپؐ نے بگڑی ہوئی مسیحیت کا نام ہی دجّال رکھا ہے اور اگر یہ نہ سمجھا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نعوذ باللہ من ذالک۔ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آپؐ نے

سورۃ کہف میں نصاریٰ کا ذکر ہے

دجال کے فتنہ سے بچنے کے لئے بالکل بے جوڑ آیتیں ہیں لیکن آپ کی شان اپنے فضل سے بلند و بالا ہے۔

خلاصہ سورۃ

اس سورۃ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اس لئے اتاری ہے کہ پہلی کتب کی غلطیوں کو دُور کرے۔ اور خدا کا بیٹا بنانے والوں کو ڈرا دے ان لوگوں کو بہت کچھ ترقی ملے گی اور وہ اسلام سے بہت کچھ تنفر کریں گے لیکن انکی ابتداء اس قسم کی نہ تھی جس قسم کی انتہاء ہوگی۔ ابتداء میں یہ لوگ نہایت کمزور تھے اور ان کو بہت سخت تکالیف دی جاتی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور ان کو مصائب سے بچایا۔ اور ترقی کا راستہ دکھایا مگر وہ ترقی حاصل کر کے شرک میں مبتلا ہو گئے اور بجائے دین کی طرف جھکنے کے دُنیا کی طرف جھک گئے اور اسی میں مشغول ہو گئے۔ پس مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ اس قوم کے حالات سے عبرت حاصل کرتے ہوئے اپنی ترقی کے زمانے میں تین مفاسد سے بچیں۔ (۱) عبادت میں سستی نہ ہو (۲) دنیوی اموال کی طرف حد سے زیادہ رغبت نہ ہو (۳) عیش و عشرت کو اختیار نہ کریں۔

سورۃ کہف سورۃ اسراء کا تتمہ ہے

پھر فرمایا اس وقت مسلمانوں اور ان کے اہل کتاب بھائیوں کی مثال ایک دولتمند اور غریب بھائی کی طرح ہوگی۔ ایک بھائی تو دولت پر غرور کرے گا اور دوسرا خدا کی طرف توجہ کرے گا۔ آخر تکبر کا سر نیچا ہوگا اور بغیر انسانی ذرائع کے ایسے سامان پیدا ہوں گے کہ دولتمند کی قوت زائل ہو جائے گی۔

پھر ان تفصیلات کو بیان کیا جو ان تغیرات کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے سے بتا دی گئی تھیں اور اس سلسلہ میں یہ بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسراء میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان کے سلسلہ کی ترقی ایک اور شخص کی ترقی کے بالمقابل بہت کم اور ادنیٰ ہوگی۔ اور وہ آنے والا ان تمام امور کی تکمیل کرے گا جن کو موسیٰ نہ کر سکیں گے پس اسراء کی تعبیر کے مطابق مسیحی قوم کے زوال کے وقت اسلام کو فتح ہوگی۔ اور پھر اس فتح کے بعد کے حالات بیان فرماتا ہے کہ آخر ایک وقت مسلمان بھی دین کو بھول جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینے کے لئے پھر مسیحیوں کو ترقی دے گا۔ اور یہ ان اقوام کے ذریعہ سے ہوگا۔ جن کو کچھ زمانہ پہلے جنوبی اور مشرقی علاقوں کی طرف بڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔ اس وقت دُنیا پر سخت تباہی آئے گی۔ اور سب اقوام دو بڑی نسلوں یا دو بڑے اصولوں کے تابع ہو جائیں گی۔ اور ظلم بڑھ جائے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ پھر ایسے سامان پیدا کرے گا۔ کہ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا جائے گا۔ اور اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس سیلاب کو روکنے میں پھر اس قوم کا حصہ ہوگا۔ جس نے ایک دفعہ پہلے یاجوج ماجوج کے سیاسی زور کو توڑا تھا۔

غرض یہ سورۃ سورہ اسراء کا تتمہ ہے اور اس کے واقعات بے جوڑ نہیں ہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے بلکہ یہ سورۃ نہایت اعلیٰ ترتیب پر مشتمل ہے اور پہلی سورتوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لیکر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ

کامل تعریف اللہ (تعالیٰ) کے لئے (ہی) ہے۔ جس نے یہ کتاب اپنے (اس) بندہ پر اتاری ہے اور اس میں

يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ○ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ

کوئی کجی نہیں رکھی (اور اس نے اسے) اس حال میں (اتارا ہے) کہ وہ کجی سے پاک ہے اور صحیح راہنمائی کرنیوالی ہے تاکہ وہ (لوگوں کو)

لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ

اسکی (یعنی اللہ تعالیٰ کی) طرف سے (آنے والے) ایک سخت عذاب سے آگاہ کرے اور ایمان لانیوالوں کو جو نیک (اور مناسب حال)

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ○ مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ○

کام کرتے ہیں بشارت دے کہ ان کے لئے (خدا تعالیٰ کی طرف سے) اچھا اجر (مقدر) ہے وہ اس (اجر کے مقام) میں ہمیشہ رہینگے

۲ حل لغات۔ اَلْعَبْدُ:۔ کے لئے دیکھو سورۃ بنی اسرائیل ۱ح

عِوَجًا:۔ العِوَجُ مصدر عَوِجَ (یعوج عِوَجًا) سے اسم ہے اور اس کے معنے ہیں ٹیڑھا ہونا۔ کجی۔ جسموں کے ٹیڑھا ہونے کیلئے عَوَج کا لفظ استعمال ہوتا ہے معانی وصفات کی کجی اور نادرستی کے لئے عِوَج کا لفظ استعمال ہوتا ہے (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو ہود ۲۰ عِوَجُ الطریقِ:۔ زیغہ۔ راستے کا ٹیڑھا پن۔ عِوَجُ الدِّیْنِ والخُلُقِ:۔ فسادُہ۔ دین اور اخلاق کی خرابی (تاج)

قَیِّمًا:۔ قَیِّم الامرِ کے معنے ہیں مُقِیْمُہٗ کسی کام کو سنبھالنے والا۔ وَ اَمْرٌ قَیِّمٌ مستقیم درست امر۔ وخُلُقٌ قَیِّمٌ۔ اچھے اخلاق۔ وَدِیْنٌ قَیِّمٌ مستقیم لا زیغ فیہ ایسا درست مذہب جس میں کوئی کجی نہ ہو۔ وَکُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ای مستقیمۃ۔ تبیّن الحقَّ مِنَ البَاطِلِ صحیح کتب جو حق کو باطل سے واضح اور جُدا کردیں۔ القیّم السیّدُ وسائسُ الاَمْرِ سردار اور کسی کام کا متولی (تاج) دِیْنًا قَیِّمًا کے معنے ہیں ثابتًا مقوّمًا لامور معاشھم ومعادھم۔ دائم رہنے والا۔ اور دنیا و آخرت کے امور کو درست کرنے والا دین (مفردات)

لِیُنْذِرَ:۔ اَنْذَرَ سے مضارع کا صیغہ ہے اَنْذَرَہٗ کے معنے ہیں کسی امر کی حقیقت سے اسے آگاہ کیا (۲) اس امر کے نتائج[1] ظاہر ہونے سے پہلے اسے ہوشیار کردیا (۳) خبر دیتے ہوئے اچھی طرح ہوشیار کرنے کو بھی انذار کہتے ہیں (اقرب) تفصیل کے لئے دیکھو یونس ۱۴ع

البأسُ:۔ کے معنے ہیں العذاب۔ عذاب والبأسُ۔ الشّدۃ فی الحرب۔ گھمسان کی جنگ۔ وقال ابن سیدہ اَلبأس۔ الحربُ ثمّ

اَلْعَبْد
عِوَجًا
لِیُنْذِر
قَیِّمًا
اَلْبَاْس

كُنْتَ حَتّٰى قيل لاباْس عليكَ اى لاخوفَ ابن سیدہ نے کہا ہے کہ باْس کے اصل معنے تو لڑائی کے ہیں لیکن اس کا استعمال اس کے علاوہ دوسرے معنوں میں بھی بکثرت ہوتا ہے چنانچہ لاباْسَ عليكَ بول کر یہ معنے مراد لیتے ہیں کہ لاخوف عليكَ یعنی کوئی خوف نہیں۔ (تاج)

یُبَشِّر

یُبَشِّرُ:۔ بَشَّرَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور بشر کے لئے دیکھیں نحل ۵۹ع

اَجر

اجر:۔ کے لئے دیکھو سورۃ یوسف ۵۷ع

ماکثین

مَاكِثِيْنَ:۔ مَكَثَ سے اسم فاعل ماكِثٌ آتا ہے اور ماكِثُونَ اس کی جمع ہے مَكَثَ بالمكان (يَمْكُثُ مَكْثًا) کے معنے ہیں لَبِثَ واَقَامَ کسی جگہ ٹھہرا (اقرب)

اَبَدًا

اَبَدًا:۔ الاَبَدُ کے معنے ہیں الدَّهْرُ لمبا زمانہ الدَّائم ہمیشہ رہنے والا۔ القَدِيْمُ۔ قدیم۔ الازليُّ ازلی (اقرب) الاَبَدُ عبارةٌ عَنْ مدة الزمان۔ الممتدّ الذی لايتجزء غیرمعين زمانہ (مفردات)

تفسیر۔ قَيِّمًا ......: لخ وہ بطور دارو غہ کے ہے (۱) پچھلی کتابوں پر تاکہ ان کی غلطیوں کو دور کرے (۲) نیز دارو غہ ہے آئندہ زمانے کے لوگوں پر کیونکہ انہیں ان اعمال کی اطلاع دیتی ہے جو انہیں کرنے چاہئیں یہی وجہ ہے کہ قَيِّمًا کا حال نہیں بیان کیا تاکہ دونوں زمانوں کے متعلق حکم سمجھا جائے۔

اس کتاب کا پہلا کام

لغت میں قَيِّمُ الاَمر کے معنے متولی کے لکھے ہیں یعنی قیّم الامر وہ ہے جس کے سپرد نگرانی اور تربیت ہو۔ ان معنوں کے رُو سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ یہ کتاب آنے والے لوگوں کے لئے مربی ہے اور پہلوں کے لئے نگران۔

لِیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيدًا کا مطلب

لِيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا۔ عربی زبان میں بُؤس کے معنے تنگی اور فقر کے ہوتے ہیں اور باْس کے معنے بہادری اور طاقت کے یا خوف۔ عذاب اور جنگ کے ہوتے ہیں۔ اس جگہ خوف اور عذاب کے معنے ہیں۔

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا۔ اس آیت میں مومنوں سے اجرِ حسن کا وعدہ کیا گیا ہے اجرِ حسن سے مُراد صرف یہ نہیں کہ انہیں انعامات ملیں گے کیونکہ یہ معنے خالی اجر سے بھی نکل آتے ہیں۔ چنانچہ کئی جگہ قرآن کریم میں صرف اجر کا لفظ مومنوں کے لئے استعمال ہوا ہے مثلاً اس سورۃ میں آگے چل کر فرماتا ہے اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا۔ ہم نیکوں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے یہاں موقعہ کے لحاظ سے اجر کے معنے اچھے اجر کے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں بھی خالی اجر کا لفظ استعمال کیا جاتا تو اس کے معنی موقعہ کے مطابق اچھے اجر کے ہی ہوتے۔ پس اَجْرًا حَسَنًا کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ اجر نیک نتیجہ پیدا کرنے والا ہوگا۔ اس کے ملنے سے مومن بگڑیں گے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اچھے طور پر استعمال کر کے مزید ثواب اپنے لئے جمع کریں گے۔

مَاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یعنی ان کا وہ اجر کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس سے یہ مُراد نہیں کہ کسی صورت میں بھی ختم نہ ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ مومن رہیں گے اجر ملتا رہے گا۔ یہ معنے اس صورت میں ہیں کہ اس آیت کو ان انعامات کے متعلق سمجھا جائے جو مومنوں کو دُنیا میں ملنے والے ہیں۔ لیکن اگر اُخروی انعامات لئے جائیں تو پھر یہی معنے ہوں گے کہ وہ ہمیشہ اس اجر سے فائدہ اُٹھاتے رہیں گے کبھی بھی ان کا اجر ختم نہ ہوگا اس آیت میں اشارہ کیا ہے کہ اگر دائمی فضل چاہتے ہو تو ایمان کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝

اور (نیز اس نے اس لئے اسے اُتارا ہے کہ) تا وہ ان لوگوں کو آگاہ کرے جو کہتے ہیں (کہ) اللہ (تعالیٰ) نے (فلاں شخص کو) بیٹا بنا لیا ہے

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً

انہیں اس بارہ میں کچھ بھی تو علم (حاصل) نہیں اور نہ ان کے بڑوں کو (اس بارہ میں کوئی علم تھا) یہ بہت بڑی (خطرناک) بات

تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝

ہے۔ جو ان کے موہنوں سے نکل رہی ہے (بلکہ) وہ محض جھوٹ بول رہے ہیں ؎۵

؎ **حل لغات**۔ الولد۔ ولد کے اصل معنے اولاد کے ہیں۔ خواہ نر ہو یا مادہ۔ لیکن چونکہ اس جگہ بیٹا مُراد ہے۔ ترجمہ میں بیٹے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

الکلمۃ۔ کے معنے ہیں لفظ یا جو کچھ بولیں خواہ مفرد ہو یا مرکب۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس ؎۳۴ و ؎۹۵

الکَذِب:۔ کذب کا مصدر ہے۔ اور کذب الرجلُ کے معنے ہیں۔ اَخْبَرَ عَنِ الشَّیْءِ بِخِلَافِ مَا ھُوَ مَعَ العِلْمِ بِہٖ ضد صدق کسی چیز کے متعلق باوجود علم کے خلاف واقعہ خبر دینا کذب کہلاتا ہے اور یہ لفظ صدق کے مخالف معنوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ وَسَوَاءٌ فِیْہِ الْعَمدُ وَالْخَطَأُ اور اس صورت میں جان بوجھ کر خلاف حقیقت بات کہنا یا غلطی سے کہنا دونوں کذب میں شامل ہوتے ہیں (اقرب)

تفسیر:۔ دوسرا کام اس کتاب کا یہ ہے کہ ان لوگوں کو ڈراوے جنہوں نے کہا ہے کہ خدا نے بیٹا بنا لیا ہے (العیاذ باللہ)

عجیب بات ہے کہ پہلے کتاب کا کام انذار بتایا پھر مومنوں کو بشارت دینا اس کا کام بتایا۔ اس کے بعد پھر انذار کا ذکر کیا۔ اور یہ انذار خاص اس قوم کے متعلق بتایا جو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بناتے ہیں۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں انذار کا ذکر اکٹھا نہ رکھا اور بشارت کا ذکر بعد میں نہ رکھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ترتیب سے قرآن کریم نے ان زمانوں کا بھی اظہار کر دیا ہے جن میں قرآن کریم کا انذار تبشیر اور پھر دوسرا انذار ظاہر ہوگا۔ پہلے انذار سے مکے والوں اور دوسری تمام ان اقوام کا انذار مراد ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام کی مخالف تھیں چنانچہ قرآن کریم کے اس انذار کے نتیجے میں وہ اقوام تباہ کی گئیں۔ اس کے بعد مومنوں کی بشارت کا ذکر کیا چنانچہ مخالفین اسلام کی تباہی کے بعد مسلمانوں کو انعام ملے اور مَاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا کے حکم کے ماتحت مسلمانوں نے صدیوں تک دنیا میں حکومت کی۔ اس کے بعد صرف مسیحی قوم کے انذار کا ذکر کیا جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ اسلامی ترقی کے بعد پھر مسیحیت زور پکڑے گی اور دنیا پر اس طرح چھا جائے گی کہ گویا وہی ایک قوم اسلام کے مخالف رہ جائے گی اس وقت قرآن کا انذار خصوصیت سے مسیحی اقوام کے لئے ہوگا اگر اس طرح انذار کو دو ٹکڑوں میں تقسیم نہ کیا جاتا اور مسلمانوں کے انعامات کو درمیان میں بیان نہ کیا جاتا تو یہ لطیف معنے جو عذاب کے اوقات اور آئندہ زمانے کے سیاسی تغیرات کو بھی ظاہر کر رہے ہیں پیدا نہ ہو سکتے تھے۔

(حاشیہ: الوَلد — الکذب — ماکثین فیہ ابداً کے ماتحت مسلمانوں کی حکومت — اس کتاب کا دوسرا کام — مسیحیت)

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا

تو کیا اگر وہ اس عظیم الشان کلام پر ایمان نہ لائیں تو تُو اُن کے پیچھے شدت غم سے اپنی

بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ○ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ

جان کو ہلاکت میں ڈال دے گا [۴] جو کچھ (روئے) زمین پر (موجود) ہے اسے یقیناً ہم نے اسکی

كَبُرَتْ كَلِمَةً وہ بڑی بات ہے جو ان کے مُنہ سے نکلتی ہے یکلمہ تمیز واقعہ ہُوا ہے یعنی كَبُرَتْ هِيَ كَلِمَةً یعنی یہ بات کہنے کے لحاظ سے بہت ہی بڑی ہے یا دوسرے لفظوں میں اس بات کا تو مُنہ پر لانا بھی بڑا خطرناک ہے اور نیز خلاف عقل ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ نہایت گستاخی کا عقیدہ ہونے کے علاوہ اس عقیدے کو تو انسانی عقل بھی رد کرتی ہے یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک انسان پھانسی پر چڑھایا جائے اور پھر وہ خدا کا بیٹا کہلائے۔

باخع

انذار کی خبر دیتے ہوئے مسیحیت پر کاری ضرب

انذار کی خبر دیتے ہوئے مسیحیت پر ایک کاری ضرب بھی لگا دی فرماتا ہے کہ بیٹا تو خدا کا بناتے ہیں لیکن بیٹا بنانے کی کوئی دلیل ان کے پاس موجود نہیں نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی یعنی باپ دادوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مسیح کے حواری اور ان کے شاگرد موحد تھے شرک بعد میں پیدا ہُوا ہے اسے خدا کا بیٹا بنا دیا اور ان کے پاس اعلیٰ توحید کی تعلیم اسلام نے پیش کر دی ہے اور مشرکانہ خیالات کا پوری طرح قلع قمع کر دیا ہے مگر نہ پہلوں نے اپنی آنکھوں دیکھی باتوں سے فائدہ اُٹھایا۔ اور نہ بعد میں آنے والوں نے اسلام کے دلائل سے نفع حاصل کیا۔ دونوں گروہوں نے بغیر دلیل اور بغیر ثبوت کے اپنے رب کو چھوڑ کر ایک انسان کو خدا بنا لیا۔

آثار

اسفا

اِلَّا كَذِبًا کہکر بتایا۔ کہ خود مسیح بھی اس قسم کی ابنیت سے منکر ہے چنانچہ موجودہ اناجیل سے بھی مسیح کے خدا کا بیٹا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں [۵] بیشک مسیح علیہ السلام کی نسبت بیٹے کے الفاظ آتے ہیں لیکن یہ الفاظ دوسرے انسانوں کیلئے بھی آتے ہیں چنانچہ خروج باب ۴ آیت ۲۲ میں لکھا ہے کہ "خداوند نے یُوں فرمایا ہے۔ کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا بیٹا ہے"۔

[۴] حل لغات متعلق کے لئے دیکھو سورہ ہود [۱۲]

بَاخِعٌ: بَخَعَ سے اسم فاعل ہے۔ اور بَخَعَ نَفْسَهٗ کے معنے ہیں قَتَلَهَا من وَجْدٍ او غيظٍ کہ اپنے نفس کو غم یا غصہ سے ہلاک کر دیا (اقرب) نیز تاج العروس میں ہے بَخَعَ نَفْسَهٗ قَتَلَهَا غَمًّا۔ اپنے نفس کو غم کی وجہ سے ہلاک کر دیا۔ بَخَعَ بالحق بخوعًا: اَقَرَّ بِهٖ وخَضَعَ لَهٗ۔ صداقت کا اقرار کیا اور اس کے لئے سر تسلیم خم کیا۔ بَخَعَ له نُصْحَهٗ ای اَخْلَصَهٗ وبالغ۔ اس کے لئے اپنی نصیحت کو خالص کیا اور نصیحت میں کوئی کمی نہ رہنے دی اور فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ کے معنی ہیں مهلكها مبالغا فيها حرصا على اسلامهم۔ کہ شائد تو اپنے نفس کو اُن کے اسلام میں داخل ہونے کی شدید خواہش سے ہلاکت میں ڈال دے گا۔ (تاج)

اٰثار۔ اثر کی جمع ہے۔ اور الاثر کے معنے ہیں۔ ما بقى من رسم الشیء: کسی چیز کا باقیماندہ نشان۔

الحدیث:۔ حدیث السنۃ۔ سنت (اقرب)

اَسَفًا۔ اسِف سے مصدر ہے اور اسِف علیہ کے معنے ہیں۔ حزن اشد الحزن وتلهف: وہ سخت رنجیدہ اور غمزدہ ہُوا (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ جس طرح یہود کی تباہی کی خبر پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں درد

زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ○ وَاِنَّا

زینت (کا موجب) بنایا ہے۔ تاکہ ہم ان کا امتحان لیں (کہ) ان میں سے سب سے اچھے کام کرنے والا کون ہے اور

اُٹھاتا تھا (نحل ع ۱۶) . . . .

اسی طرح اس قوم کی تباہی کی خبر پر بھی آپؐ کو سخت صدمہ ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ نے صدمہ پہنچنے سے پہلے ہی آپ سے اظہار ہمدردی فرماتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتا ہے کہ اب اس خبر کو سن کر بھی تیرے دل کو ایسا صدمہ ہوگا کہ گویا تُو اپنی جان کو ہلاک کرنے لگا ہے لیکن تُو صبر سے کام لے کر یہ تیرے رب کی مشیت ہے دیکھو اس جگہ دوسرے مشرکین کا کوئی ذکر نہیں صرف عیسائیوں کا ذکر ہے پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جس غم کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے وہ عیسائیوں کی تباہی پر ہی ہوسکتا تھا۔ لیکن کیسے افسوس کی بات ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس عذاب پر جو مسیحیوں پر تیرہ سو سال بعد آنا تھا ایسا غم محسوس کرتے ہیں کہ گویا اپنی جان کو ہلاک کر دیتے ہیں مگر مسیحیوں کے بعض مصنف اپنے محسن کو رات دن گالیاں نکالتے رہتے ہیں۔

بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کریم تو اپنی صداقت کی آپ ہی دلیل ہے اور مسیحی اقوام کو جو مشکلات پیش آنے والی ہیں ان کا حل اس میں موجود ہے۔ پس تجھے اس کا سخت صدمہ ہوگا کہ اس علاج کی موجودگی کے باوجود یہ قوم جو دُنیوی شان و شوکت میں خاص طور پر ترقی کر چکی ہوگی اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے گی اور اس کا انکار کر کے تباہ ہو جائے گی۔

۵ تفسیر۔ فرماتا ہے ہم نے دنیا میں ہزاروں چیزیں پیدا کی ہیں اور غرض یہ ہے کہ انسان کے لئے ایک شغل پیدا کریں تا وہ ان اشیاء کو دریافت کرنے

پھر ان سے کام لے اور زِیْنَةً کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کوئی نہ کوئی فائدہ رکھتی ہے۔ کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس میں کوئی فائدہ نہ ہو اسی ایک لفظ سے کس طرح اس نکتہ کو واضح کر دیا گیا ہے کہ دُنیا کی کوئی چیز لغو نہیں اگر بعضھا زینۃً ہوتا تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ بعض اشیاء مفید ہیں اور بعض غیر مفید۔ مگر اللہ تعالیٰ سب اشیاء کو جو دنیا پر ہیں دُنیا کے لئے زینت کا موجب قرار دیتا ہے پس معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک دنیا کی ہر شے میں فوائد ہیں اور وہ ایک حُسن یعنی خوبی اپنے اندر رکھتی ہے اور کوئی چیز بھی نہیں کہ جو دُنیا کا حُسن بڑھانے والی نہ ہو افسوس کہ اس حکم سے مسلمانوں نے فائدہ اُٹھانا چھوڑ دیا اور تحقیق اور ایجاد کے کام کو نظر انداز کر دیا۔ اور یورپ والوں نے باوجود قرآن کریم کو نہ ماننے کے اس حکم پر عمل کیا اور علوم میں اس قدر ترقی کی کہ ساری دنیا پر غالب آ گئے۔

مسیحیت کی ترقی کے بعد زوال کی پیشگوئی

مسیحی قوم کی تباہی پر آنحضرتؐ کو غم

لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی اشیاء اس لئے پیدا کی گئی ہیں تا کہ لوگ ان کے متعلق تحقیق کریں دنیا کی حالت کو سدھاریں۔ اس حصے کے متعلق مسیحیوں سے کوتاہی ہوئی ہے انہوں نے دنیا کے راز تو دریافت کئے مگر اچھے عمل کا نمونہ نہ دکھایا یعنی اس تحقیق اور تدقیق کے نتیجہ میں انہوں نے دُنیا میں ظلم اور فساد کی بُنیاد رکھ دی اور غالباً اس طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

لنبلوھم ایھم الخ سے دُنیا کی اشیاء کی تحقیقات کرنے کی طرف اشارہ

يَجْعَلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝ اَمْ حَسِبْتَ

جو کچھ اس (زمین) پر (موجود) ہے اسے ہم یقیناً (ایک دن مٹا کر) ویران سطح بنا دینگے ۹ کیا تو سمجھتا ہے کہ

اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا

کہف اور رقیم والے (لوگ) ہمارے نشانوں میں سے کوئی اچنبھا (نشان) تھے (جن کی نظیر پھر کبھی نہ پائی جاسکتی ہو)

صَعِيْدًا

جُرُزًا

۹ حل لغات :۔ صَعِيْدًا :۔ صعید کے معنے ہیں۔ التراب مٹی۔ وقیل وجه الارض ترابًا کان او غیرہ :۔ زمین کی سطح خواہ مٹی کی ہو یا کسی اور چیز کی۔ المرتفع من الارض۔ بلند زمین۔ وقیل ھو مالا یخالطه رمل ولا سبخة اور بعض نے صعید اس مٹی کو قرار دیا ہے جس میں ریت اور کلّر نہ ہو۔ الطریق رستہ۔ القبر قبر (اقرب) کہتے ہیں صارت الحدیقة صعیدًا۔ باغ چٹیل میدان ہوگیا یعنی اس میں کھیتی نہ رہی (تاج)

جُرُزًا :۔ جرزہ (یجرُزُ) کے معنے ہیں قطعہ سے کاٹا۔ جَرَزَ الزمانُ زیدًا :۔ اجتاحہٗ۔ زمانے نے اس کو تباہ کر دیا۔ ارضٌ جَرَزٌ و جُرُزٌ کے معنی ہیں التی لا تنبت او اکل نبتھا او قطع وہ زمین جس میں کوئی چیز نہ اُگے۔ یا اسکی نباتات کاٹ کر استعمال کر لی گئی ہو۔ اور پھر وہ چٹیل رہ جائے (اقرب) نیز صعیدًا جُرُزًا کے معنے ہیں ای منقطع النبات چٹیل میدان جس میں کوئی سبزی نہ ہو (مفردات)

تفسیر۔ فرمایا وہ دنیا کا سامان تو ایک عارضی چیز اور عارضی سامان ہے حقیقی نہیں۔ صرف قومی مقابلہ کا ایک ذریعہ خدا تعالیٰ نے بنایا ہے تا بنی نوع انسان کی خدمت کر کے ثواب حاصل کریں لیکن مسیحی لوگ اس غرض کو پوری نہ کرینگے خدا کے پیدا کئے ہوئے سامانوں کی جستجو تو کریں گے لیکن ان کو حسن عمل کا ذریعہ نہ بنائیں گے۔ اور لڑائی جھگڑے کا ذریعہ بنا لینگے۔ پس چونکہ ہمارا مقصد تو ان اشیاء کے پیدا کرنے سے دُنیا کو زینت دینا ہے چونکہ وہ مقصد انکی تحقیقاتوں اور ایجادوں سے پورا نہ ہوگا ہم ان کے کام کو مٹا دیں گے غرض اس جگہ سب دُنیا کی تباہی مراد نہیں بلکہ ان کاموں کی تباہی مراد ہے جو اللہ کا بیٹا بنانے والی قوم کرے گی۔

اس آیت کے الفاظ میں نہایت لطیف طور پر ایک تمثیل کی طرف جو اس سورۃ میں آگے چل کر بیان ہوئی ہے اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہ اشارہ صَعِيْدًا جُرُزًا کے الفاظ میں ہے۔

صعید کے معنے اس زمین کے ہوتے ہیں جس میں سے درخت وغیرہ کٹ جائیں۔ چنانچہ عرب کا محاورہ ہے صارت الحدیقة صعیدًا (تاج) باغ اُجڑ گیا اس کے درخت فنا ہوگئے۔ اور جُرُز کے معنے بھی اس زمین کے ہوتے ہیں جس کی سبزی تباہ ہوگئی ہو آگے چل کر جہاں دو باغوں کی تمثیل دی گئی ہے (کہف ع ۵) وہاں بھی متکبر باغوں والے کو اس کا ناصح بھائی کہتا ہے کہ تو تکبر نہ کر ایسا نہ ہو کہ آسمانی عذاب نازل ہو کر تیرے باغوں کو صعیدًا زلقًا بنا دے۔ صعیدًا کا لفظ تو وہی ہے جو یہاں استعمال ہوا ہے۔ جُرُزًا کی جگہ وہاں زلقا کا لفظ رکھا گیا ہے اور اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ جہاں کوئی کھیتی نہ ہو۔ عرب کہتے ہیں ارض زلقٌ ایسی زمین جس پر کوئی کھیتی نہ ہو پس اس آیت سے اس طرف اشارہ ہے کہ آگے جو تمثیل بیان کی گئی ہے مسیحی قوم بھی اس میں شامل ہے اور اللہ تعالے ان کے لگائے ہوئے باغوں کو تباہ کر دے گا۔

عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ

۸ جب وہ (چند) نوجوان وسیع غار میں پناہ گزین ہوئے اور (دعا کرتے ہوئے) انہوں نے کہا

اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ م

(کہ) اے ہمارے رب ہمیں اپنے حضور سے (خاص) رحمت عطا کر۔ اور ہمارے لئے ہمارے (اس) معاملہ میں درستی (کا سامان) مہیا کر

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝

جس پر ہم نے اس وسیع غار میں چند گنتی کے سالوں کے لئے انہیں (بیرونی حالات کے) سننے سے محروم کر دیا ۹

۷ حل لغات۔ الکہف۔ کالبیت المنقور فی الجبل گھر کی شکل پر پہاڑ میں کھود کر بنایا ہوا مکان۔ اس کی جمع کھوف آتی ہے۔ غار اور کہف میں یہ فرق ہے کہ کہف وسیع ہوتی ہے اور غار تنگ۔ الکہف ایضًا الوزر۔ حفاظت کی جگہ۔ الملجاء۔ پناہ کی جگہ۔ (اقرب)

رقیم:۔ رقم (یرقم رقما) کے معنے ہیں کتبۂ اس کو لکھا۔ رقم الکتاب۔ اعجمہ وبیّنہٗ۔ کسی کتاب یا خط کے الفاظ کو واضح طور پر لکھا۔ رقم الثوب: خطّطہٗ و اعلمہ۔ اس پر لکیریں ڈالیں اور شاندار کیا۔ کسی چیز پر تصویر بنانا۔ لکھنا۔ نقش بنانا۔

الرقیم:۔ الکتاب۔ المرقوم۔ لکھی ہوئی چیز اصحاب الرقیم کے معنے ہونگے۔ نقش یا تصویریں بنانے والے لوگ۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ پتھر یا لوہے پر کھودنے والے لوگ۔ تو اس لحاظ سے یہ معنی ہونگے کہ پتھروں پر یا کاغذوں پر لکھنے والے یا نقش ونگار کرنے والے یا تصویریں بنانیوالے یا کھودنے والے۔ رقیم بمعنے مرقوم بھی ہوسکتا ہے اس لحاظ سے اصحاب الرقیم کے معنے ہونگے جن کے پاس لکھی ہوئی چیزیں ہوں یعنی کتابیں یا سامان جن پر نام لکھا ہوا ہو یا کتبوں والے وغیرہ وغیرہ۔

العجب (۱) جب کوئی ایسا امر پیش آئے کہ اس کے ملنے میں طبیعت کو انقباض اور انکار ہو۔ تو اس انکار کی حالت کو عجب کہتے ہیں (۲) پیش آمدہ امر کے پسند کرنے کو بھی عجب کہتے ہیں۔ (۳) اس حالتِ رعب کو بھی عجب کہتے ہیں جو انسان پر کسی چیز کو بہت ہی بڑا سمجھنے کے وقت طاری ہوتی ہے (اقرب) تفصیل کے لئے دیکھو سورہ یونس ۳

تفسیر۔ کیا عجیب ہے بلکہ رونے کا مقام ہے کہ خدا تعالیٰ تو کہتا ہے کہ اصحاب کہف کوئی عجوبہ چیز نہ تھے بلکہ اور آیتوں کی طرح یہ بھی ایک آیت ہی تھے۔ مگر ہمارے مسلمان اس کو ایک عجوبہ بنا رہے ہیں۔ (اصحاب کہف کی تفصیل کے لئے دیکھو اگلی آیات)

۸ حل لغات۔ آوَی الی منزلہ ومنزلہٗ کے معنے ہیں نزل بہ لیلاً او نہارًا وہ اپنے مقام میں رات کو یا دن کو اُترا۔ (اقرب) آوَی

الفتیۃ: الفتی کی جمع ہے اور الفتی کے معنے ہیں الشاب الحدث۔ نوجوان۔ السخی الکریم۔ فیاض اور سخی (اقرب) الفتیۃ

الرّحمۃ: رقّۃ القلب والانعطاف یقتضی التفضّل والاحسان۔ والمغفرۃ: رقتِ قلب جو ترس احسان اور بخشش کی مقتضی ہوتی ہے۔ نیز رحمت کے معنے مغفرت کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) الرحمۃ

تفسیر۔ رشد کے معنی ہدایت کے ہیں مگر رَشد زیادہ تر دینی امور میں اور رُشد دینی اور دنیوی امور کی ہدایت کے لئے آتا ہے۔ پس دعا کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ ہمارے لئے اس معاملہ میں آزادی اور کامیابی کا رستہ نکال۔ الرقیم

۹ حل لغات۔ ضرب علی اذنہ: منع ان یسمع اس کو سننے سے روک دیا۔ (اقرب) ضرب علی اذنہ

تفسیر۔ ضربنا علیٰ اٰذانھم کے معنے ہیں ہم نے ان کو سننے سے روک دیا یعنی کچھ سال تک ان کو کہف میں رکھ کر باقی لوگوں کے حال سے ناواقف رکھا۔ ان کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ زمانہ کا کیا حال ہے۔ (اصحاب کہف کون تھے اس کے لئے دیکھو اگلی آیت)

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا

پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ ہم جان لیں کہ جتنی مدت وہ (وہاں) ٹھہرے رہے تھے اسے دو لڑنے والے گروہوں میں سے

لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۟ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ

ع ۱۳

زیادہ محفوظ رکھنے والا کونسا گروہ ہے۔ سلے ہم انکی اہم خبر بالکل صحیح طور پر تیرے پاس بیان کرتے ہیں۔

بعثنا

سلے حل لغات۔ بَعَثْنَا : بَعَثَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور بَعَثَ کے لئے دیکھو حجر ۳۲ ع

اَلْحِزْبَيْنِ : اَلْحِزْب سے تثنیہ کا صیغہ ہے اور اَلْحِزْب کے لئے دیکھو رعد ۳۷ ع

الامد

اَلْاَمَد کے معنے ہیں اَلْغَايَةُ الْمَدٰى۔ آخری حد غایت و انتہاء۔ اَلْاَمَد وَالْاَبَدُ يَتَقَارَبَانِ لٰكِنِ الْاَبَد عِبَارَةٌ عَنْ مُدَّةِ الزَّمَانِ الَّتِي لَيْسَ لَهَا حَدٌّ مَحْدُوْدٌ وَلَا يَتَقَيَّدُ۔ وَ الْاَمَدُ مُدَّةٌ لَهَا حَدٌّ مَجْهُوْلٌ۔ اَمَد اور اَبَد تقریبًا ایک جیسے ہی معنے رکھتے ہیں لیکن ابد اس زمانہ کو کہتے ہیں جو غیر محدود ہو۔ اور اَمَد اس مدت کو کہتے ہیں جس کی انتہاء معلوم نہ ہو وَالْفَرْقُ بَيْنَ الزَّمَانِ وَالْاَمَدِ۔ اَنَّ الْاَمَدَ يُقَالُ بِاعْتِبَارِ الْغَايَةِ وَالزَّمَانُ فِي الْمَبْدَءِ وَالْغَايَةِ۔ وَ لِذٰلِكَ قَالَ بَعْضُهُمُ الْمَدٰى وَالْاَمَدُ يَتَقَارَبَانِ۔ اور زمان اور اَمَد کے لفظ کے درمیان یہ فرق ہے کہ اَمَد کا لفظ انتہاء کا اعتبار کرتے ہوئے بولا جاتا ہے اور زمانہ عام ہے۔ وہ مبداء پر بھی اور انتہاء پر بھی بولا جاتا ہے اس فرق کے پیش نظر بعض نے مدیٰ اور امد کو متقارب المعنیٰ قرار دیا ہے۔ (مفردات)

اصحاب کہف کے حالات

اصحاب کہف کون تھے۔ کہاں تھے

تفسیر۔ اصحاب کہف کون تھے؟ کہاں تھے اور ان کے حالات کیا ہیں؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جو صدیوں سے مفسرین کے دلوں میں ہیجان پیدا کرتا چلا آیا ہے۔

میں اس سوال کو حل کرنے کے لئے سب سے پہلے بعض روایات بیان کرتا ہوں جو اصحاب کہف کے متعلق پرانے مفسروں نے بیان کی ہیں۔

(۱) مشہور مؤرخ ابن اسحاق اور بعض دوسرے مصنفوں نے یہ لکھا ہے کہ جب مسیحیوں میں شرک پیدا ہوگیا۔ بتوں کی پوجا اور ان کے لئے قربانی شروع ہوگئی تو ان میں سے کچھ لوگوں کو جو موحد تھے۔ یہ امر بُرا لگا اس زمانہ میں دقیانوس نامی مسیحی بادشاہ تھا۔ بعض روایات میں اس کا نام دقیوس آیا ہے۔ یہ بادشاہ موحد نصاریٰ کو قتل کرتا تھا۔ انہی ایام میں موحد نصاریٰ میں سے کچھ امراء نوجوانوں کو۔ جو افیوس یا بعض روایات میں لکھا ہے کہ طرسوس کے رہنے والے تھے شاہی سپاہیوں نے پکڑ لیا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے انہیں بتوں کو سجدہ نہ کرنے پر ڈانٹا مگر وہ توحید پر قائم رہے۔ اس پر بادشاہ نے انکو کچھ مہلت دی کہ اس عرصہ میں سوچ لو۔ انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور وہاں سے بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے جس کا نام منجلوس تھا۔ باقی تو عبادت میں مشغول ہوگئے اور اپنے میں سے ایک کو جس کا نام یملیخا تھا۔ سودا سلف لانے پر مقرر کر دیا۔ وہ بھیس بدلکر شہر میں جاتا اور سودا لے آتا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ جو باہر کسی مہم پر گیا ہوا تھا واپس آگیا ہے اور اس نے ان نوجوانوں کو پھر طلب کیا ہے۔ وہ روتا ہوا آیا اور سب کو اس کی خبر دی۔ انہوں نے خوب رو رو کر دعائیں کرنی شروع کیں۔ جب دعائیں ختم ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے

ان کو سُلا دیا۔ ان کا سامان ان کے سرہانے پڑا تھا اور کتا دہلیز پر تھا۔ بادشاہ نے ان کا پتہ لے کر ان کا پیچھا کیا مگر جب غار میں بعض لوگوں کو بھیجا تو کوئی غار میں نہ جا سکا۔ اس پر ایک مصاحب نے کہا کہ اے بادشاہ آپکی غرض ان کو مارنا ہی تو ہے۔ آپ اس غار کے دروازہ پر دیوار کھنچوا دیں آپ ہی بھوک پیاسے مر جائینگے۔ بادشاہ نے اسکے مشورہ کے مطابق دیوار کھنچوا دی۔ اس کے بعد وہ کچھ گذرا جو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیات میں بیان فرمایا ہے۔ (روح المعانی جلد ۵ صـ۲۱ بحوالہ ابن اسحاق)۔

(۲) بعض نے لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے ایک حواری تھے وہ سفر کرتے ہوئے ایک ایسے شہر میں پہنچے جس کا بادشاہ بُت پرست تھا۔ اور اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جو شہر میں داخل ہو پہلے دروازہ پر نصب کئے ہوئے بُت کو سجدہ کرے انہوں نے ایسا نہ کیا۔ اور شہر کے باہر ایک حمام میں ٹھیر گئے اور وہیں تبلیغ شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے کئی لوگ ان کے ہمخیال ہو گئے۔ ایک دن بادشاہ کا لڑکا ایک فاحشہ کو لے کر حمام کرنے کے لئے آیا۔ اس حواری نے اسے نصیحت کی وہ اس دن رک گیا۔ دوسری دفعہ پھر آیا تو انہوں نے اسے ڈانٹا اس نے بات نہ مانی اور اس فاحشہ سمیت حمام میں چلا گیا۔ صبح کے وقت وہ مردہ پایا گیا۔ بادشاہ کو لوگوں نے کہا کہ حمام والے نے مار دیا ہے۔ بادشاہ نے تحقیق شروع کی۔ حمام والا بھاگ گیا اور اس کے سب دوست بھی۔ کچھ نوجوان جو مسیحی ہو چکے تھے وہ بھی ڈر کر بھاگے اور ایک زمیندار کے پاس جو ان کا دوست تھا گئے وہ بھی ان کا ہم خیال تھا۔ وہ ان کو لے کر ایک غار میں جا چھپا۔ بادشاہ کو علم ہوا۔ تو وہ پیچھے گیا۔ اس سے آگے وہی لوگوں کے مرنے اور بادشاہ کے دیوار بنانے کا واقعہ ہے۔ (أخرجہ عبدالرزاق وابن المنذر عن وھب بن منبہ۔ روح المعانی جلد ۵۔ صـ۲۱۹)۔

ابن المنذر اور ابن ابی شیبہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ رومیوں کے مقابلہ پر جہاد کے لئے گیا تھا۔ اس سفر میں ہم نے اصحاب کہف کی غار دیکھی۔ معاویہؓ نے کچھ لوگ اس غار کو دیکھنے کے لئے بھیجے مگر آندھی آگئی اور وہ لوگ اندر نہ جا سکے۔ (درمنثور جلد ۴ صـ۲۱۳)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے اصحاب کہف کی ہڈیاں دیکھیں۔ وہ تین سو سال کی پرانی تھیں۔ (درمنثور جلد ۴ صـ۲۱۳)۔

ان کے انجام کے متعلق مندرجہ ذیل روایات کتب تفسیر میں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) ایک لمبے عرصہ تک اللہ تعالیٰ نے انکو سُلائے رکھا پھر جگا دیا۔ انہوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو کھانا لینے بھیجا۔ اسنے دوکاندار کو جو سکہ دیا۔ اسے دیکھ کر وہ حیران سا ہو گیا کیونکہ وہ سکہ پرانا تھا۔ اس نے اور دوکانداروں کو دکھایا۔ سب اس سکہ کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ کس ملک کا سکہ ہے۔ آخر بادشاہ تک معاملہ پہنچا جس کا نام تندوسیس تھا۔ بادشاہ نے اس نوجوان سے سب واقعہ سُنا اور اس کے ساتھ غار تک آیا۔ وہاں سب اصحاب کہف سے ملا اور ان سے بغلگیر ہوا۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ پھر اصحاب کہف نے اسکو نصائح کیں اور لیٹ گئے اور اسی وقت مر گئے۔ (روح المعانی و ابن کثیر)۔

(۲) بعض دوسری روایات میں آتا ہے کہ جب لوگ غار پر پہنچے تو وہ لوگ اسیوقت مر گئے اور وہ انکو زندہ نہ دیکھ سکے۔ اور جو کھانا لینے گیا تھا وہ بھی وہاں پہنچ کر مر گیا۔ (عبدالرزاق و ابن ابی حاتم عن عکرمہؓ درمنثور جلد ۴۔ صـ۲۱۴)

دقیس والا واقعہ مسیحی کتب میں بھی لکھا ہوا ہے۔ مشہور انگریز مؤرخ گبن اپنی کتاب "رومن حکومت کی ترقی اور تباہی" میں لکھتا ہے کہ ایک کہانی سات سونے والوں کے متعلق طدوس کے پادری گریگوری نے لکھی ہے جسے میں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ کہانی شامی مسیحیوں میں مشہور تھی۔

اصحاب کہف کے متعلق تفاسیر کے واقعات

اور ان کی کتب سے گریگوری نے نقل کی ہے۔ گبن نے آگے جو کہانی نقل کی ہے وہ ابن اسحٰق کی روایت سے بہت ملتی ہے اس میں لکھا ہے کہ دقیس بادشاہ کے وقت میں افیس شہر کے چند امراء نوجوان جو مسیحی تھے انہوں نے مسیحیوں پر بادشاہ کا ظلم دیکھ کر اپنے آپکو ایک غار میں چھپا دیا۔ بادشاہ نے غار کا منہ بند کروا دیا۔ ایک سو اسی سال تک اللہ تعالیٰ نے انکو سلائے رکھا۔ ایڈولیئس جس کے پاس وہ علاقہ تھا اس کے غلاموں نے کسی ضرورت کے لئے غار کے منہ پر سے پتھر ہٹائے اور سورج کی شعاع اندر جانے پر اللہ تعالیٰ نے انکو زندہ کر دیا۔ وہ جاگے تو سمجھے کہ چند گھنٹے ہم سوئے ہیں انکو بھوک لگی تو انہوں نے اپنے ایک ساتھی جمبلیکس کو خوراک لینے بھجوایا۔ اس نے شہر کو بدلا ہوا پایا اور دروازہ پر صلیب دیکھی تو اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ نان پز کو جب اس نے سکہ دیا تو اس کے لباس اور عجیب سکہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اور یہ سمجھ کر کہ اسے کوئی خزانہ ملا ہے اسے قاضی کے سامنے پیش کیا۔ جب انہوں نے واقعہ سنا بادشاہ تھیوڈوسیس اور سب امراء مل کر غار پر گئے جہاں اصحاب کہف نے انہیں برکت دی۔ اپنا قصہ سنایا اور فوت ہو گئے۔ (جلد اول صفحہ ۱۹)۔

علامہ ابو حیان بحر محیط میں لکھتے ہیں کہ سپین میں ایک جگہ لوشا ہے اس میں ایک غار ہے وہاں اصحاب کہف کی لاشیں بتائی جاتی ہیں اور اس میں ان کا کتا بھی ہے ابن ابی عطیہ کہتے ہیں کہ میں نے وہ جگہ دیکھی ہے۔ چار پانچ سو سال سے وہاں انکی لاشیں پڑی ہیں۔ (بحر محیط جلد ۲۔ صفحہ ۱۰۲) اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ غرناطہ کے پاس ایک اجڑا ہوا شہر ہے جسے دقیوس کا شہر کہتے ہیں جو بڑے بڑے پتھروں سے بنا ہوا ہے اس میں عجیب عجیب قبریں ہیں۔

مفسرین نے اصحاب کہف کے نام بھی لکھے ہیں۔ چنانچہ ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ وہ یہ نام بتاتے ہیں میکسلمینا۔ تملیخا۔ مرطونس۔ کشطونس۔ بیرونس۔ دینموس۔ بطونس اور قالوس (ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۷۳)

اصحاب کہف کے متعلق تفاسیر کے واقعات

رقیم کے متعلق بھی مختلف روایات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ تانبے اور پتھر کی لوح پر ان کے نام لکھے تھے اس لئے ان کا نام رقیم ہو گیا۔ بعض کے نزدیک ان کے شہر کا نام رقیم تھا۔ بعض کے نزدیک درہموں کا نام تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان کے کتے کا نام تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان کی شریعت کا نام تھا۔ اور بعض کے نزدیک ان کی وادی کا نام تھا۔ اور بعض کے نزدیک پہاڑ کا نام تھا جس پر وہ غار تھی۔

ان روایات سے جو مسلمانوں کی کتب اور مسیحیوں کی کتب میں آئی ہیں یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے اصحاب کہف کے قصے سے ملتے ہوئے واقعات لوگوں میں مشہور تھے لیکن ان میں اس قدر اختلاف تھا کہ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جھوٹ سچ ان میں ملا ہوا تھا۔

ان روایات کے علاوہ مفسرین نے ایسی بہت سی روایات بھی لکھی ہیں جن میں کتے کے حالات بیان کئے گئے ہیں یہاں تک کہ کہا گیا ہے کہ جنت میں صرف دو حیوان ہوں گے۔ ایک اصحاب کہف کا کتا اور ایک بلعم کا گدھا۔

صاحب فتح البیان اس قسم کی بعض روایات نقل کر کے لکھتے ہیں۔ لَا اَدْرِیْ اَیَّ تَعَلُّقٍ لِهٰذَا التَّدْقِيْقِ وَالتَّحْقِيْقِ بِتَفْسِيْرِ الْكِتَابِ الْعَزِيْزِ وَمَا الَّذِيْ حَمَلَهُمْ عَلٰى هٰذَا الْفُضُوْلِ الَّذِيْ لَا مُسْتَنَدَ لَهٗ فِي السَّمْعِ وَلَا فِي الْعَقْلِ۔ (جلد ۵) یعنی میں نہیں سمجھتا کہ اس تمام تدقیق اور تحقیق کا تعلق قرآن کریم کی تفسیر کے ساتھ کیا ہے۔ اور ان مفسرین کو ان لغویات کے نقل کی طرف جن کا نہ کوئی عقلی ثبوت ہے نہ نقلی۔ کیوں رغبت ہوئی ہے۔

سابق مفسرین کے خیالات لکھنے کے بعد میں استاذی المکرم

حضرت مولوی نورالدین رضؓ خلیفہ اوّل جماعتِ احمدیہ کی تحقیق اس بارہ میں لکھتا ہوں۔ آپ کا خیال تھا کہ اصحاب کہف ابتدائی زمانہ کے مسیحیوں میں سے ایک موحد جماعت تھی۔ ان لوگوں نے شرک کی اشاعت سے ڈر کر کسی دوسرے ملک کا سفر کیا۔ اور وہاں مدتوں تک گمنامی میں پڑے رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں ترقی دی اور سب دنیا میں پھیلا دیا۔ آپ کا خیال تھا کہ اس واقعہ میں یوسف آرمیتیا کے ایک سفر کی طرف اشارہ ہے جب کہ وہ اپنے بعض ساتھیوں کو لے کر انگلستان چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے پہلے مسیحی گرجا کی بنیاد رکھی۔ آپ کا اشارہ اس روایت کی طرف ہے جو انگلستان میں صدیوں سے مشہور چلی آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ فلپ حواری نے یوسف آرمیتیا اور چند اور لوگوں کو انگلستان تبلیغ کے لئے بھجوایا تھا۔ وہاں انہوں نے GLOSTONBURY کے مقام پر ایک گرجا بنایا اور عیسائیت کی تبلیغ شروع کی۔ یہ قصہ "گلاسٹنبری کے گرجا کی قدامت" نامی کتاب میں مذکور ہے جو ولیم نامی ایک شخص نے جو مالمس بری (MALMES BURY) کا باشندہ تھا گیارہ سو پچیس ۱۱۲۵ عیسوی میں لکھا تھا۔ لیکن اس کے اس نسخہ میں جو اس نے خود لکھا اس واقعہ کا ذکر نہیں بلکہ یہ لکھا ہے کہ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے ایک بادشاہ لوسیئس (LUCUIS) کے کہنے پر پوپ نے ۱۶۶ء میں ایک تبلیغی مشن انگلستان بھجوایا تھا جس نے یہ گرجا بنایا۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک روایت اس گرجے کو اس سے بھی پہلے کا بتاتی ہے مگر میں اس روایت کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ ولیم کے مرنے کے بعد اس کی ایک کتاب کو دوبارہ لکھوایا گیا۔ تو اس میں اوپر والا واقعہ درج کر دیا گیا۔ گویا یہ واقعہ ولیم کے بعد اس کتاب میں کسی اور نے لکھ دیا ہے اور اس کی سند اس نے کوئی نہیں دی۔

یہ جو کہف کا لفظ قرآن کریم میں آتا ہے اس کے متعلق حضرت مولوی صاحبؓ کا خیال تھا کہ اس سے مراد وہ (CAPE) ہے جو گلاسٹنبری کے پاس ساحل پر ہے جہاں تک کیپ کے لفظ کا تعلق ہے میرے نزدیک آپ کی رائے درست نہیں کیونکہ کیپ انگریزی کا لفظ فرانسیسی لفظ CAP اور لاطینی CAPUT سے بنا ہے۔ جن کے معنے سر کے ہیں۔ اور خشکی کا ایک حصہ جس کی نوک سمندر میں آگے نکلی ہوئی ہو اسے کیپ (CAPE) کہتے ہیں۔ لیکن عربی لفظ کہف کے معنے وسیع غار کے ہیں جو پہاڑی جگہ پر ہو یا پتھریلی زمین میں ہو اور اسے کیپ جسے عربی جغرافیہ نویس راس کے لفظ سے یاد کرتے ہیں (جیسے ہندوستان کی ایک کیپ کا نام راس کماری ہے) دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ میرے نزدیک جس حد تک اصحاب کہف کے واقعہ کا تعلق یوسف آرمیتیا کے سفر سے ہے۔ میں اس کے متعلق بھی آپ کی تحقیق سے متفق نہیں۔ کیونکہ یوسف آرمیتیا کا یہ سفر محض کہانی کے طور پر انگلستان میں مشہور رہا ہے۔ اور سوا گیارہ سو سال بعد مسیح اس کا ذکر پہلی دفعہ ولیم کی کتاب میں ملتا ہے اور وہ بھی ایک نامعلوم شخص نے اس کی موت کے بعد اس کتاب میں لکھا ہے۔ ایسے اہم امر کے متعلق تو ایک صدی کی خاموشی بھی شبہ ڈال دیتی ہے۔ کجا یہ کہ ایک ہزار سال تک دنیا میں اس بارہ میں کوئی روایت نہ ہو اور ہزار سال کے بعد جا کر یہ روایت لکھی جائے۔ اگر آج کوئی شخص ایک نئی روایت جو کتب احادیث اور تاریخ میں موجود نہ ہو۔ لوگوں کی زبانی روایات پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرے تو ایک شخص بھی اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا جب تک کہ کوئی ایسے تاریخی شواہد اس کی تائید میں نہ ملیں جو اس واقعہ کو دوسرے ثابت شدہ واقعات کی کڑی میں اسی طرح پرو دیں کہ انکار کی گنجائش نہ رہے۔

نیز اہل انگلستان جن کو اس قسم کی روایات پر فخر ہونا چاہیئے اور ایسی جھوٹی روایتوں کو بھی سچا بنانا ان کے

حضرت خلیفۃ المسیح اول کی تحقیقات اصحاب کہف کے متعلق

فائدہ کا موجب ہے۔ وہ بھی تحقیق کر کے ان امور کو غلط قرار دے چکے ہیں۔ چنانچہ ولیم آف مالمسبری کے بعد اس گرجا کے قدیم کاغذات ملے ہیں۔ جن کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہ گرجا اس وقت سے زیادہ سے زیادہ تین ساڑھے تین سو سال پہلے بنا تھا یعنی اس کی تعمیر کا وقت زیادہ سے زیادہ آٹھویں صدی مسیحی کے آخر میں تجویز کیا جاسکتا ہے۔ اور ان کاغذات میں بھی اس روایت کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے تحقیقات کے بعد انگریز مؤرخوں نے لکھا ہے کہ "بہر حال یہ تاریخی واقعہ نہیں ہاں ایک شاعرانہ خیال ضرور ہے۔"

(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۱۵۲)

اصحاب کہف کے متعلق اپنی تحقیق

ان معمولی اختلافات کے اظہار کے بعد جو صرف افراد اور ابتدائی مقام کے ساتھ رکھتے ہیں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہاں تک اصحاب کہف کا تعلق گزرے ہوئے واقعات سے ہے۔ ان کے بارہ میں حضرت مولوی صاحب رضی اللہ عنہ کی تحقیق ایک ایسی شمع ہدایت ہے جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اور بغیر اس روشنی کے جو انہوں نے اس مضمون پر ڈالی ہے یہ حصہ قرآن کریم کا تاریخی طور پر حل نہیں ہوسکتا تھا۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔

میں جو تشریح آگے بیان کروں گا وہ جزئی اختلاف کو چھوڑ کر مقام اور قوم اور زمانہ کے سوا ایک حد تک حضرت مولوی صاحب کی تحقیق پر مبنی ہوگی۔ ہاں ایک حصہ جو ان آیات کے اصل مقصد کے ساتھ وابستہ ہے آپ کی تحقیق سے باہر رہ گیا تھا۔ اس کی طرف ہم کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانی سلسلہ احمدیہ نے توجہ دلائی ہے

اصحاب کہف کے واقعات میں حضرت مسیح موعود کی بتائی ہوئی حکمت

اور وہ یہ کہ اس پیشگوئی میں مسیح موعود کے دوبارہ نزول کے متعلق خبریں ہیں۔ اور مسلمانوں کو بتایا ہے کہ ویسے ہی حالات آئندہ زمانہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو بھی پیش آنے والے ہیں۔

ان تمہیدوں کے بعد میں اب اصحاب کہف کے بارہ میں اپنی تحقیق بیان کرتا ہوں۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ یوسف آرمیتیا کا واقعہ ایک قصہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تو میں نے اصحاب کہف کے بارہ میں مزید تحقیق شروع کی۔ اس تحقیق کے دوران میں میرے خسر ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب مرحوم ایک کتاب میرے پاس لائے اور کہا کہ اس کتاب میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ اصحاب کہف کے واقعات سے ملتے ہیں۔ اس کتاب کا نام روم کے کیٹا کومبز CATACOMBS OF ROME تھا میں نے وہ کتاب لیکر پڑھی اور میری بھی یہ رائے ہوئی۔ کہ اس میں بیان کردہ روایات پر اصحاب کہف کی تحقیق کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیحی ابتدائی زمانہ میں مشرک نہ تھے اور اس کا ثبوت اس نے یہ پیش کیا ہے کہ روم کے پاس ایسے غار ملے ہیں جنہیں ابتدائی زمانہ میں مسیحی لوگ رومی حکومت کے ظلم سے بچنے کے لئے چھپ جایا کرتے تھے۔ وہاں بہت سے کتبے پائے گئے ہیں جن میں اس وقت کے حالات ہیں۔ اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع عیسائیت میں شرک کا نام نہ تھا اور وہ لوگ مسیح علیہ السلام کو صرف ایک نجات دہندہ نبی سمجھتے تھے یہ ظلم اس کتاب کے بیان کے مطابق صدیوں تک ہوتا رہا۔ اور جب ظلم زیادہ ہوتا وہ لوگ ان مقامات میں جاکر چھپ جاتے۔ اور خفیہ طور پر رسد جمع کر کے وہاں رہتے۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ انہیں کئی کئی سال تک وہاں چھپنا پڑا۔ آخر تین سو سال کے بعد جب روم کا ایک بادشاہ عیسائی ہوگیا تو عیسائیوں کی تکلیف دور ہوئی۔ اس کے بعد گاتھ قوم نے روم پر حملہ کیا اور ان تہ خانوں کو لوٹ لیا۔ اور توڑ دیا۔ جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان کا ذکر مٹ گیا۔ مگر آثار قدیمہ کے بعض محققین نے روم کے کھنڈرات کی تلاش کرتے ہوئے ان کو معلوم کیا۔ اور ایک ہزار سال بعد پھر یہ چھپا ہوا تاریخی مواد دنیا کو معلوم ہوا۔

میں نے جب یہ کتاب پڑھی۔ تو میں نے یہ سمجھا کہ

ہماری تفسیروں میں جو امور بیان کئے گئے ہیں۔ گو وہ بہت کچھ رطب و یابس پر مشتمل ہیں۔ مگر ان واقعات کی موجودگی میں انہیں اصل واقعہ سے کلی طور پر مختلف نہیں کہا جا سکتا۔ اور میں نے نئے سرے سے تفسیروں کے بیان کردہ واقعات پر غور کیا۔ چنانچہ میں نے اوپر جو تین روایات بیان کی ہیں ایک ابن اسحاق کی اور دو کتب احادیث کی۔ انکو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ صداقت کا بیج ان روایات میں موجود ہے۔

اگر اس تفسیر کو پڑھنے والے ایک دفعہ پھر ان روایات کو پڑھ کر دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان روایات میں یہ امور بیان ہوئے ہیں۔ (۱) یہ واقعہ مسیحیوں کی ایک قوم سے گزرا ہے۔ (۲) یہ مظالم رومیوں کے ہاتھ سے ہوئے ہیں۔ (۳) ایک روایت کہتی ہے کہ ایک حواری رومی بادشاہ کے دارالحکومت میں گیا تھا اس وقت وہاں یہ واقعہ گزرا ہے۔ (۴) دوسری روایت کہتی ہے کہ دقیوس جس کا دوسرا نام عربوں اور ہندوستانیوں میں دقیانوس بھی مشہور ہے اور جسے لاطینی میں ڈیسیس DECUIS کہتے ہیں اس کے زمانہ میں اصحاب کہف کا واقعہ ہوا ہے۔ اور اس سے ڈر کر کچھ مسیحی غار میں چلے گئے تھے۔ (۵) سب روایات متفق ہیں کہ وہ قوم جس نے مظالم کئے تھے بت پرست تھی۔ (۶) ایک روایت جسے میں نے لکھا نہیں یہ بھی کہتی ہے کہ اس ملک کے بادشاہ اپنے بتوں کے آگے سجدہ کرنے اور ان پر قربانیاں چڑھانے کے لئے مجبور کرتے تھے (۷) حضرت ابن عباسؓ کی روایت بتاتی ہے کہ ان کے زمانہ سے تین سو سال پہلے یہ واقعہ گذرا ہے۔ (۸) ایک روایت بتاتی ہے کہ تندوسیس کے زمانہ میں اصحاب کہف غار سے باہر نکلے تھے۔ یہ تندوسیس بھی ایک رومی بادشاہ تھا اور اس کا نام لاطینی میں THEODOSIS لکھتے ہیں۔

کیٹا کومبز کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ روایات بجائے ہمارا دماغ پریشان کرنے کے ہماری تسلی کا موجب ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ کیٹا کومبز اور کلیسیا کی تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فرداً فرداً مسیحیوں پر ظلم تو حضرت مسیح کے واقعہ صلیب سے شروع ہوا تھا مگر بحیثیت جماعت نیرو کے زمانہ سے روم میں مسیحیوں پر ظلم شروع ہوئے ہیں۔ اور نیرو بادشاہ حواریوں کا ہم عصر ہے اس کا زمانہ حکومت ۵۴ء بعد مسیح سے ۶۸ء بعد مسیح تک ہے۔ پرانے عیسائیوں میں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ پطرس کو اس کے زمانہ میں پھانسی دیا گیا۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ جدید ناقدین تاریخ جو ہر تاریخی واقعہ میں شک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہوں نے اس بارہ میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن پوری تنقید کے بعد بھی وہ اسے رد نہیں کر سکے کہ پطرس روم گیا اور وہاں ہی مرا۔ پرانے مسیحی لٹریچر سے قریباً ۱۷۰ بعد صلیب کی ایک تحریر بشپ ڈایونیسیس کی ملتی ہے جو پیٹر کے روم جانے کی خبر دیتی ہے۔ چونکہ پطرس واقعہ صلیب کے بعد ۳۰، ۴۰ سے ساٹھ ستر سال تک زندہ رہا ہے۔ یہ تحریر کوئی اسی سے سو سال تک پطرس کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے اور اتنے قریب کے زمانہ کی شہادت معمولی شہادت نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جب کہ اس کا لکھنے والا گرجے کا بڑا پادری ہو۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ سائمن پیٹر)۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے کہ یہ امر تاریخ سے ثابت ہے کہ واقعہ صلیب کے دو سو سال بعد کے زمانہ میں روم میں پیٹر کی قبر زائروں کو دکھائی جاتی تھی اور یہ کہ ۲۵۸ء میں اس کی ہڈیاں کیٹا کومبز میں منتقل کی گئی تھیں۔ یہ کہ واقعہ میں وہ قبر اور ہڈیاں پیٹر کی تھیں یا نہیں انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا اس بارہ میں لکھتا ہے کہ اس کی تحقیق کا سامان ہمارے پاس موجود نہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جو سامان اور باتوں کی تحقیقات کے ہیں وہ یہاں بھی ہیں۔ قریب زمانہ کے لوگ اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں اور اس کی وفات کے

صرف سوا سو سال بعد کے زمانہ کا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ روم میں اس کی قبر دکھائی جاتی تھی۔ غرض یہ امر کہ اسے نیرو نے قتل کیا یا نہ کیا۔ اگر ثابت بھی نہ ہو تب بھی یہ امر ثابت ہے کہ پطرس روم میں گیا اور وہیں مرا اور یہ کہ اس زمانہ میں مسیحیوں پر سختیاں ہوتی تھیں اور انکو ادھر ادھر بھاگ کر جانیں بچانی پڑتی تھیں۔ (سٹوری آف روم مصنفہ مسٹر نارہ ڈ بنگ)۔

پھر ہم کو تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈیسس یا دقیانوس کے زمانہ میں مسیحیوں پر سختیاں بہت بڑھ گئی تھیں اور قانون بنا کر انہیں سزا دی جاتی تھی۔ اور جو بتوں کو سجدہ نہ کرتے تھے انکو مسیحی سمجھ کر قید یا قتل کیا جاتا تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ ڈیسس نیز زیر لفظ تاریخ کلیسیا) ڈیسس کا زمانہ حکومت سنہ ۲۴۹ء تا ۲۵۱ء تھا۔ اور اس نے سنہ ۲۵۰ء تا ۲۵۱ء میں مسیحیوں کے خلاف سختی کے قانون پاس کئے تھے۔

پھر تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۳۱۱ء میں گالیئس بادشاہ روم نے مرتے وقت مسیحیوں کے خلاف جو قانون تھا اسے منسوخ کیا۔ قسطنطین شاہ روم ۳۲۳ء میں عیسائی ہوا۔ اور تھیوڈیسس مشرقی رومی حکومت کے وقت میں مسیحیت بہت پھیل گئی اور پبلک کی طرف سے بھی اسے امن حاصل ہو گیا۔

ان تاریخی شواہد سے ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہیرو ڈیس کے واقعہ سے فلسطین میں اور نیرو کے زمانہ سے لیکر ۳۱۱ء تک روم میں مسیحیوں پر سخت ظلم ہوئے اور یہ کہ مظالم کے زمانہ میں وہ وہاں سے بھاگ کر ادھر ادھر غاروں میں پناہ لیا کرتے تھے۔

اصحابِ کہف ابتدائی زمانہ کے رومی مسیحی تھے

ان واقعات پر نظر ڈال کر ہم کو آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اصحاب کہف ابتدائی زمانہ کے رومی مسیحی تھے نیز سینکڑوں سال تک ان پر ظلم ہوتا رہا۔ جس کی ابتدا ایک مسیح کے حواری کے زمانہ میں ہوئی۔ ڈیسس کے زمانہ میں ظلم انتہا کو پہنچا اور گالیئس کے زمانہ میں انکو معاف کیا گیا۔ قسطنطین کے زمانہ میں ان کے مظالم قانونی طور پر روکے گئے۔ اور تھیوڈیسس کے زمانہ میں انہیں عام ترقی حاصل ہو گئی۔

اب اگر ان واقعات کی روشنی میں مفسرین کی روایات کو دیکھیں تو اس مبالغہ کو نظر انداز کر کے جو مسیحی اور یہودی راویوں نے کئے ہوں گے۔ وہ روایات اصحاب کہف کا صحیح پتہ ہمیں دے دیتی ہیں۔ اور ان میں اختلاف بھی کوئی نہیں۔ اختلاف صرف اس وجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اصحاب کہف کے واقعہ کو کسی ایک جماعت کا واقعہ سمجھتے تھے لیکن یہ واقعہ درحقیقت ایک جماعت سے یا ایک زمانہ میں نہیں گزرا۔ بلکہ کئی جماعتوں سے مختلف زمانوں میں گذرا ہے۔ یہ واقعہ نیرو کے وقت میں بھی ہوا جبکہ پطرس روم میں موجود تھے۔ اور ابن اسحٰق کی روایت اسی وقت کے متعلق ہے۔ اور یہ واقعہ ڈسیس کے وقت میں بھی ہوا۔ اور ابن المنذر کی روایت اس کے متعلق ہے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تین سو سال تک مسیحیوں پر ظلم ہوتا رہا۔ اور وہ ظلم کے خاص ایام میں غاروں میں چھپ کر گذارہ کیا کرتے تھے۔ انکی قربانیوں کے کئی واقعات لوگوں میں مشہور ہو گئے تھے کسی کو پطرس کے زمانہ کا واقعہ معلوم ہوا تو اس نے سمجھ لیا کہ اصحاب کہف کا واقعہ بس اتنا ہی ہے کسی کو ڈسیس کے وقت کا کوئی واقعہ معلوم ہوا تو اس نے سمجھ لیا کہ یہی واقعہ اصحاب کہف کا ہے۔ غرض مختلف زمانوں کے مظالم اور مسیحیوں کی قربانیوں کی داستانوں کو مظالم کی ساری تاریخ قرار دینے سے اختلاف پیدا ہوا ہے۔ جب روایات کو مختلف واقعات سمجھا جائے تو پھر عام مبالغہ کو خارج کر کے جو ایسی روایات میں ہو جایا کرتا ہے۔ وہ سب ہی روایات درست معلوم ہوتی ہیں اور ابتدائی مسیحیوں کی پُر درد داستان کا ایک مختصر نقشہ ہیں۔

اب میں کہف کے بارے میں مختصراً بعض واقعات

بتاتا ہوں۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہف سے مراد کیٹا کومبز ہیں جو زمین دوز تہ خانوں کا نام ہے۔ رومیوں اور یہود میں رواج تھا کہ وہ مُردوں کو کمروں میں رکھتے تھے۔ رومی حکومت کے بڑے بڑے شہروں میں شہروں سے باہر ایسی جگہیں بنی ہوئی تھیں اور کیٹا کومبز کہلاتی تھیں۔ جب مسیحیوں پر ظلم ہوئے تو انہوں نے جان بچانے کے لئے ان قبرستانوں میں پناہ لینی شروع کی جس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زمین دوز کمروں میں وہ آسانی سے چھپ سکتے تھے۔ اور بیٹھنے۔ سونے اور موسم کی شدت سے محفوظ رہنے کا بھی سامان ہوتا تھا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ عام طور پر لوگ قبرستانوں سے ڈرتے ہیں اور اس طرح لوگوں کی نظروں سے بچنے کا وہاں امکان زیادہ تھا۔ یہ کیٹا کومبز روم کے پاس۔ اسکندریہ جو مصر کا شہر ہے اس کے پاس۔ سسلی میں۔ مالٹا میں۔ نیپلز کے پاس اس وقت تک محفوظ ہوئے ہیں۔ مسٹر بنجمن سکاٹ اپنی کتاب "دی کیٹا کومبز آف روم" میں لکھتے ہیں۔ کہ "میری رائے ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں بھی (جب پولوس روم گیا ہے) عیسائی اپنی حفاظت کے خیال سے لوگوں کے غصہ اور یہودیوں کے ظلموں اور رومی حکومت کے مظالم سے بچنے کے لئے ان تہ خانوں میں پناہ لیا کرتے تھے۔" (صفحہ ۶۲) پھر وہ ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "وہ یقیناً مجبور تھے کہ ان گڑھوں اور زمین دوز غاروں میں پناہ لیتے۔" اس جگہ مصنف نے ان تہ خانوں کے لئے کیو CAVE کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو عربی زبان کے لفظ کہف کا ہی بگڑا ہوا ہے۔ گویا اس طرح اس انگریز مصنف نے عین وہی لفظ استعمال کر دیا ہے جو قرآن کریم نے کیا ہے۔ یہ کہ انکو ایسا کرنے کی ضرورت تھی رومی مؤرخ ٹیسیٹس (TACITUS) کی شہادت سے ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیرو نے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے مسیحیوں کو زندہ جلانے۔ کتوں سے پھڑوانے اور صلیب دینے کے مختلف طریق اختیار کر رکھے تھے۔ اور اس غرض سے اس نے اپنا شاہی باغ دیا ہوا تھا۔ جس قوم پر اسقدر اور ایسا ظلم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ ادھر اُدھر بچ کر پناہ لے گی۔

مسیحیوں کے کیٹا کومبز کے تاریخی حالات

جب مسیحیوں نے ان جگہوں پر پناہ لینی شروع کی تو پناہ کے دنوں میں انہوں نے زیادہ حفاظت کی خاطر ان کے اندر اور کمرے بنانے شروع کر دئے۔ اسی طرح جو لوگ شہید ہوتے تھے انکی لاشوں کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے بھی وہ ان تہ خانوں میں لاکر دفن کرتے تھے۔ اور چونکہ یہ سلسلہ تین سو سال تک چلا گیا۔ اس لئے یہ تہ خانے اس کثرت سے ہو گئے کہ بعض لوگوں کے اندازے کے مطابق وہ پندرہ میل کی لمبائی تک چلے گئے ہیں۔

چونکہ ظلم یکساں نہیں چلتا۔ درمیان میں بعض بادشاہ نرمی کرنے لگ جاتے تھے اور مسیحی پھر واپس شہر میں آجاتے تھے۔ پھر جب سختی کا دور آتا تو بھاگ کر ان جگہوں میں چھپ جاتے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ انہیں وہاں مہینوں یا سالوں رہنا پڑتا تھا کیونکہ ان کے اندر سکولوں اور گرجوں کے کمرے بھی پائے گئے ہیں۔

کیٹا کومبز کے چشم دید حالات

یہ تہ خانے تین منزل میں بنے ہوئے ہیں۔ اور ۱۹۲۴ء میں انگلستان جاتے ہوئے روم میں میں نے خود ان کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ پہلی منزل کے کمروں کو تو انسان بغیر زیادہ تکلیف کے دیکھ سکتا ہے۔ دوسری منزل میں بہت دم گھٹتا ہے۔ اور تیسری منزل یعنی سب سے نیچے کے تہ خانہ میں جانا تو تنگی اور تاریکی کی وجہ سے قریباً ناممکن ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان تہ خانوں کو مسیحیوں نے اپنی ضرورت کے مطابق اس طرح بنا لیا تھا جیسے بھول بھلیاں ہوتی ہے۔ اور حفاظت کے مندرجہ ذیل طریق ان میں استعمال کئے گئے ہیں:۔

(۱) وہ لوگ دروازوں پر کتے رکھتے تھے تا اجنبی آدمی کے آتے ہی انکو اس کے بھونکنے سے علم ہو جائے۔ (۲) زمین دوز کمرے جن میں وہ رہتے تھے جہاں سے انہیں

زمین کی سطح سے نیچے داخل ہونے کا راستہ تھا۔ وہاں مٹی کی سیڑھیاں نہ ہوتی تھی۔ بلکہ لکڑی کی سیڑھی رکھتے تھے تاکہ اپنا آدمی اتر نے کے بعد وہاں سے سیڑھی ہٹا دیجا سکے۔ اور تاکہ دشمن آئیں تو فوراً کمروں میں نہ پہنچ سکیں۔ (۳) لیکن اگر وہ کود کر یا سیڑھیاں اپنے ساتھ لاکر اتر ہی آئیں۔ تو اس کے آگے حفاظت کا یہ علاج کیا گیا تھا کہ ہر کمرہ سے چار راستے بنائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک راستہ تو اگلے کمرہ کی طرف جاتا تھا اور باقی راستے کچھ دور جاکر بند ہوجاتے تھے۔ اس کا یہ فائدہ تھا کہ عیسائی تو واقف ہونے کی وجہ سے جھٹ اگلے کمرہ کی طرف دوڑ جاتے تھے اور تعاقب کرنے والے غلط راستہ کی طرف چلے جاتے، اور آگے راستہ بند دیکھ کر پھر دوسرے راستہ کی طرف لوٹتے۔ اس طرح بار بار غلط راستوں کی طرف جانے کی وجہ سے بھاگنے والے عیسائیوں سے بہت پیچھے رہ جاتے۔ اوّل تو یہ تعاقب ہی پولیس کو پریشان کر دیتا تھا۔ لیکن اگر آخری حد تک تعاقب کر ہی لیتے تو (۴) مسیحی دوسری منزل یعنی نچلے تہ خانوں میں چلے جاتے جو پہلوں سے زیادہ تنگ زیادہ تاریک اور زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اگر بالفرض یہاں تک بھی کامیاب تعاقب کیا جاتا تو (۵) ان سے نیچے تیسرے تہ خانے موجود تھے۔ جن میں ہم لوگ تو دو چار منٹ بھی نہیں ٹھیر سکے۔ گو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ گر کر بہت زیادہ تنگ ہوگئے ہیں۔ مگر بہرحال وہ بھیانک جگہیں ہیں جہاں غالباً صرف تعاقب کے وقت میں تھوڑی دیر کے لئے مسیحی پناہ لیتے تھے۔ چونکہ سارے راستوں کی لمبائی کئی سو میل تک جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان جگہوں میں عیسائیوں کا پکڑنا آسان کام نہ ہوتا تھا۔ مگر گورنمنٹ آخر گورنمنٹ ہوتی ہے کئی دفعہ پولیس پکڑ بھی لیتی تھی اور وہیں ان لوگوں کو قتل کر دیتی تھی۔ ہم نے

ایسے شہداء کی بہت سی قبریں وہاں دیکھی ہیں۔ ہم نے بعض کتبے پادری سے پڑھوا کر معلوم کیا۔ کہ ان میں وہ دردناک واقعات بیان کئے گئے ہیں جو شہادت کے وقت انکو پیش آتے تھے۔

قریب زمانہ میں جو نئی قبریں اور کتبے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں ان لوگوں کی قبریں بھی ملی ہیں جن کے پاس پطرس ٹھیرے تھے یا جن کا بائبل میں ذکر ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ کیٹاکومبز)۔

ڈیسیس کے وقت میں چونکہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ مسیحی بتوں کو سجدہ کرنے پر مجبور کئے جائیں اور بہت سختی سے مسیحیوں کو مارا جاتا تھا۔ یہ زمانہ قریباً سارا کا سارا عیسائیوں نے کیٹاکومبز میں گذارا۔ سوائے ان کے جنہوں نے ڈر کر مذہب کو خیرباد کہدیا۔ اس لئے اس زمانہ میں اصحاب کہف نے ایک نہایت شاندار مثال قربانی کی پیش کی تھی۔

ان کتبوں سے جو کیٹاکومبز میں لگے ہوئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسیحیوں میں شرک نہ تھا۔ ان کتبوں میں کوئی لفظ شرک کا نہیں۔ مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں بلکہ محض ایک گڈریئے کی شکل میں دکھایا جاتا ہے۔ انکی والدہ کے لئے کوئی غیر معمولی عزت کا نشان نہیں ملتا۔ زیادہ تر یونس نبی کے واقعہ کو اور حضرت نوح کے طوفان کے آخر میں جو کبوتر اس بات کی خبر لایا تھا کہ پانی ہٹ کر زمین خشکی ہوگئی ہے اس واقعہ کو تصویروں میں دکھایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نامہ قدیم کو ان لوگوں نے نہیں چھوڑا تھا اور مسیح کو صرف ایک نبی اور روحانی گڈریا خیال کرتے تھے۔ (کیٹاکومبز کے واقعات کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا۔ دی کیٹاکومبز آف روم۔ مصنفہ بنجمن سکاٹ اور ڈاکٹر میٹ لینڈ کی کتاب وغیرہ)۔

خلاصہ یہ کہ اصحاب کہف کے واقعہ میں مسیحیوں کے

۲ کیٹاکومبز کے کتبوں سے بہت کچھ پتہ لگتا ہے

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝

وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر (حقیقی) ایمان لائے تھے اور انہیں ہم نے ہدایت میں (اور بھی) بڑھایا تھا

وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ

اور جب وہ (اپنے وطن سے نکلنے کے لئے) اٹھے تو ہم نے انکے دلوں کو مضبوط کر دیا تب انہوں نے (ایکدوسر

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا

ے) کہا (کہ) ہمارا رب (وہ ہے جو) آسمانوں اور زمین کا (بھی) رب ہے، ہم اسکے سوا کسی معبود کو ہرگز (کبھی) نہیں پکاریں گے

ابتدائی زمانہ کے حالات کو پیش کیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ مسیحی قوم کی ابتداء تو اس طرح ہوئی تھی کہ وہ بُت پرستی کے خلاف جہاد کرتے تھے اور شرک سے بچنے کے لئے انہوں نے صدیوں تک بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ لیکن انتہا اس طرح ہوئی ہے۔ کہ اصلی دین کا کوئی نشان بھی اب مسیحیوں میں نہیں پایا جاتا۔

۱۱ حل لغات۔ نَقُصُّ: قَصَّ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کے لئے دیکھو یوسف ۴ ۔

نَبَأ کے لئے دیکھو یوسف ۲۸ ۔

اَلْحَقّ کے لئے دیکھو رعد ۱۵ ۔

تفسیر۔ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۔ یعنی ہم تیرے سامنے ان کے واقعات جس طرح ہوئے ہیں اسی طرح بیان کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو پرانے قصے تھے وہ صحیح نہ تھے۔ اور یہ بھی پتہ لگا کہ اس وقت کچھ قصے ان کے متعلق ضرور مشہور تھے۔

اس امر کا ثبوت کہ ان کے بارہ میں کچھ قصے ضرور مشہور تھے پہلی آیات سے بھی ملتا ہے۔ کیونکہ قرآنی واقعہ تو اس آیت سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے جو بیان کیا گیا تھا معلوم ہوتا ہے وہ اس وقت کی مشہور روایتوں کا صحیح خلاصہ تھا۔

فتیٰ کے معنی

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ ۔ وہ نوجوان یا شریف اور سخی لوگوں کی ایک جماعت تھی جو اپنے رب پر ایمان لائی۔ فَتًى کے معنے سخی۔ شریف۔ لوگوں کے لئے مال خرچ کرنے والا۔ یا نوجوان کے ہیں۔ کیونکہ دینی کاموں میں نوجوان ہی زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے سوائے چند کے باقی سب آپ سے عمر میں کم تھے۔

نقص

وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۔ اور ہم نے ہدایت میں ان کو زیادہ کر دیا تھا۔ یعنی ان کی قربانیوں کی وجہ سے ہم نے ان کے ایمانوں کو بہت بڑھا دیا تھا۔

انہم فتیة میں خاص پارٹی کا ذکر۔

فِتْيَةٌ سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ مختلف پناہ لینے والی پارٹیوں میں سے کسی خاص پارٹی کا جو سب سے زیادہ قربانی کرنے والی تھی۔ اس جگہ ذکر کیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اس آیت میں کسی خاص جماعت کا ذکر نہ ہو بلکہ یہ مراد ہو کہ شریف مسیحی جو اپنے دین میں پکے ہوتے تھے۔ ایسا کیا کرتے تھے۔ اور اس طرح اس آیت میں تین سو سال کے عرصہ میں جسقدر لوگوں نے قربانیاں کی تھیں۔ سب ہی کا ذکر ہو۔ میں ذاتی طور پر ان آخری معنوں کو ترجیح دیتا ہوں ؎

لَقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ○ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا

ورنہ ہم ایک حق سے دور بات کہنے والے ہونگے ۱۲؎ ان لوگوں نے یعنی ہماری قوم نے اس (معبود برحق) کو

مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ

چھوڑ کر (اپنے لئے) اور (اور) معبود بنالئے ہیں وہ انکے ثبوت میں کیوں کوئی روشن دلیل نہیں

بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ

لاتے پھر (وہ کیوں نہیں سمجھتے کہ) جو شخص اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھے اس سے بڑھ کر ظالم کون (ہوسکتا) ہے ۱۳؎

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا

اور (اب سوقت) جب (کہ) تم نے ان سے اور (نیز) اللہ (تعالیٰ) کے سوا جس چیز کی (بھی) وہ پرستش کرتے ہیں

اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ

اس سے کنارہ کشی کرلی ہے تو (اب) تم اُس وسیع پہاڑی پناہ گاہ میں پناہ لو (ایسا کروگے تو) تمہارا رب اپنی رحمت (کی کئی راہ) تمہارے لئے کھولدیگا

ربط علیٰ قلبہ

۱۲؎ حل لغات ۔ رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِہِمْ: رَبَطَ الشَّیْءَ (یَرْبِطُ وَیَرْبُطُ) کے معنے ہیں اَوْثَقَہٗ وَشَدَّہٗ کسی چیز کو مضبوط طور پر باندھ دیا۔ رَبَطَ جَاْشُہٗ (رِبَاطَۃً) کے معنے ہیں اِشْتَدَّ قَلْبُہٗ اس کا دل مضبوط ہوگیا۔ رَبَطَ اللّٰہُ عَلٰی قَلْبِہٖ، صَبَّرَہٗ۔ اللہ نے مصائب کے برداشت کی اسے طاقت دی اور قدم نہ لڑکھڑانے دیا۔ (اقرب)

شططا

شَطَطًا: شَطَّ (شَطَطًا) کے معنے ہیں۔ جَارَ۔ ظلم کیا۔ اَفْرَطَ۔ زیادتی کی۔ شَطَطَ فِیْ سَلْعَتِہٖ شَطَطًا: جَاوَزَ الْقَدْرَ الْمَحْدُوْدَ اپنے سامان میں مقرر اندازہ سے بڑھ گیا۔ تَبَاعَدَ عَنِ الْحَقِّ حق سے دور ہوگیا۔ شَطَّ فِی السَّوْمِ۔ غَالٰی فِی الثَّمَنِ قیمت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ نیز شَطَطٌ کے معنے ہیں مُجَاوَزَۃُ الْقَدْرِ الْحَدِّ۔ حد اور اندازہ سے آگے گذر جانا۔ (اقرب)

تفسیر ۔ باوجود اس کے کہ بادشاہ اور رعایا سب ہی ان کے مخالف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو طاقت دی اور صبر بخشا۔ اور وہ سب کے مقابل پر کھڑے ہوکر اپنے عقیدہ کا اظہار کرتے رہے۔

۱۳؎ حل لغات ۔ سُلْطٰن کے لئے دیکھو ابراہیم ۱۱؎۔

بَیِّن: اَلْبَیِّنُ۔ اَلْوَاضِحُ۔ اَلْجَلِیُّ۔ بالکل واضح۔ (اقرب)۔

تفسیر ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک جس قوم میں سے اصحاب کہف نکلے تھے وہ بت پرست تھی اور کئی معبود انہوں نے بنائے ہوئے تھے۔ یہی حال رومیوں کا تھا۔ ان میں بھی کئی بت پوجے جاتے تھے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ موحدوں کی جماعت کوئی پراگندہ نوجوان نہ تھے۔ بلکہ ایک مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور آپس میں ملتے رہتے تھے۔ کیونکہ اس آیت کا مضمون بتاتا ہے کہ وہ لوگ یہ باتیں باہم علیحدگی میں کیا کرتے تھے۔

يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿١٧﴾ وَتَرَى الشَّمْسَ

اور تمہارے لئے تمہارے (اس) معاملہ میں کوئی سہولت کا سامان مہیا کردے گا۔ اور (اے مخاطب) تو سورج کو

اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ

دیکھتا ہے کہ جب وہ چڑھتا ہے تو ان کی وسیع جائے پناہ سے دائیں طرف کو ہٹ کر گزرتا ہے۔ اور جب

وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ

وہ ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو ہٹ کر گزرتا ہے اور وہ اس (کہف) کے اندر ایک

فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ

فراخ جگہ میں (رہتے) ہیں۔ یہ بات اللہ (تعالیٰ کی نصرت) کے نشانوں میں سے ایک نشان) ہے جسے اللہ (تعالیٰ ہدایت) کا راستہ

فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا

دکھائے وہی ہدایت پر ہوتا ہے اور جسے وہ گمراہ کرے اس کا تو (کبھی) کوئی دوست (اور) راہ نما

حل لغات۔ يَنْشُرْ: نَشَرَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور نَشَرَ الثَّوْبَ وَ الْكِتَابَ کے معنے ہیں بَسَطَهٗ خِلَافَ طَوَاهُ کسی کتاب کو کھولا اور کپڑے کو پھیلایا۔ نَشَرَتْ اَوْرَاقُ الشَّجَرِ اِمْتَدَّتْ وَانْبَسَطَتْ۔ درخت کے پتے پھیل گئے۔ نَشَرَ الْخَبَرَ نَشْرًا۔ اَذَاعَهٗ۔ کسی خبر کو پھیلایا۔ (اقرب)

مِرْفَقًا: رَفَقَ بِهٖ وَعَلَيْهِ وَلَهٗ (يَرْفِقُ مِرْفَقًا)۔ کے معنے ہیں لَطُفَ وَلَمْ يَعْنُفْ۔ اس پر نرمی کی اور سختی سے کام نہ لیا (اقرب) پس مِرْفَق کے معنے ہوئے نرمی۔

تفسیر۔ یہاں جو اَلْكَهْف کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں کوئی خاص جگہ تھی۔ ورنہ وہ اِلٰى كَهْفٍ کہتے کہ کسی غار کی طرف چلے جانا۔ مگر وہ اِلٰى كَهْفٍ نہیں کہتے۔ بلکہ اِلَى الْكَهْفِ کہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاقہ میں کوئی خاص کہف (غار) تھی۔ جو مشہور تھی۔ اور اس کی طرف اشارہ کرنے سے ہر ایک شخص اس مقام کو پہچان جاتا تھا۔

دوسرے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کہف میں جانے سے پہلے دیر سے ان پر ظلم ہو رہا تھا اور انہوں نے آپس میں یہ سکیم کر رکھی تھی کہ جب ظلم حد سے بڑھ جائے اور باہر رہنا مشکل ہو تو اس کہف میں چلے جائیں گے کیونکہ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ بتاتا ہے کہ ان کا بائیکاٹ ہو چکا تھا اور وہ اپنی قوم سے الگ اپنے جتھے میں رہتے تھے۔

اس کہف (غار) کی شہرت پہلے سے اس وجہ سے تھی کہ رومی غلاموں پر جب ان کے آقا بہت ظلم کیا کرتے تھے تو وہ بھاگ کر وہاں چلے جایا کرتے تھے۔ وہ بھی ان کی مثال پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ پس انہوں نے باہم مشورہ کر کے فیصلہ کر لیا کہ اگر ظلم بڑھ جائے اور باہر رہنا دین کے لئے مضر ہو تو اس غار میں چلے جائیں جہاں غلام بھاگ کر جایا کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ غار انہی لوگوں نے بہت کچھ بڑھائی لیکن وہ پہلے بھی وسیع تھی۔

يَنْشُرْ [1]

مِرْفَقًا [1]

اَلْكَهْف [2] سے خاص جگہ کی طرف اشارہ۔

مُّرْشِدًا ﴿۱۸﴾ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ

ع ۲ ۵ ۱۴

نہیں پائے گا ۱۵؎ اور (اے مخاطب) تو انہیں بیدار سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ سوتے ہیں۔

تزاور

۱۵؎ حل لغات۔ تَزٰوَرُ: اصل میں تَتَزَاوَرُ ہے اور تَزَاوَرَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور تَزَاوَرَ عَنْهُ کے معنے ہیں عَدَلَ وَانْحَرَفَ منحرف ہو گیا اور علیحدہ ہو گیا (اقرب) باب تفاعل سے پہلے جو مضارع کی تاء آتی ہے بوجہ دو ت جمع ہو جانے کے۔ ان میں سے پہلی ت کو حذف کر دینے کی عربی میں اجازت ہے۔

تقرضهم

تَقْرِضُهُمْ: قَرَضَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ قَرَضَ الشَّیْءَ (یَقْرِضُ قَرْضًا) کے معنے ہیں قَطَعَهٗ کسی چیز کو کاٹا۔ قَرَضَ الْوَادِیَ: جَازَهٗ۔ وادی کو طے کیا قَرَضَ الْمَكَانَ عَدَلَ عَنْهُ وَتَنَكَّبَهٗ کسی چیز سے علیحدہ اور ایک طرف ہو گیا۔ (اقرب)

اَلْفَجْوَةُ: اَلْفُرْجَةُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ دو چیزوں کے درمیان کشادہ جگہ۔ مَا اتَّسَعَ مِنَ الْاَرْضِ وسیع زمین سَاحَةُ الدَّارِ گھر کا صحن (اقرب)

مرشدا

مُرْشِدًا: اَرْشَدَ سے اسم فاعل ہے اور اَرْشَدَ کے معنے ہیں ۱۔ هَدَاهُ اسے راستہ دکھایا۔ ۲۔ بتایا اور واضح کیا۔ ۳۔ اور اس کے آگے چل کر منزل مقصود تک لے گیا۔ ۴۔ ایمان کی طرف راہ نمائی کی۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں غار کا مقام بتایا گیا ہے آیت میں

اصحاب الکہف کے غار کا جائے وقوع

جو علامات بتائی گئی ہیں ان سے ظاہر ہے کہ یہ قوم اونچے شمالی علاقوں میں بسنے والی تھی۔ کیونکہ جب شمال کی طرف جائیں یا مشرق کی طرف منہ کئے کھڑے ہوں تو سورج دائیں طرف رہتا ہے اور جب جنوب میں آئیں اور مشرق کی طرف منہ کریں تو بائیں طرف رہتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس غار کا منہ شمال مغرب کی طرف تھا۔ جو عمارت شمالی رخ ہو گی اس سے سورج دائیں سے بائیں کو ہی گزرے گا۔

فَجْوَةٍ سے پتہ لگتا ہے کہ اندر وسیع علاقہ تھا۔ چنانچہ ان غاروں کے دیکھنے سے تصدیق ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ بہت ہی وسیع جگہ ہے۔ بعض نے اس کی گلیوں اور اوپر نیچے کے تہ خانوں کا مجموعی اندازہ ۷۰، ۸۰ میل تک کا لگایا ہے (یعنی اگر سب گلیوں اور کمروں کو ایک دوسرے کے آگے رکھتے چلے جائیں)۔ اور یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ وہاں روشنی بہت کم پڑتی تھی۔ ورنہ لوگ پکڑے جاتے۔ انہوں نے غار کو ایسی طرز پر بنایا کہ ہوا بھی آئے اور ان کا پتہ بھی نہ لگے چنانچہ سینٹ جیروم چوتھی صدی میں لکھتا ہے کہ وہ کمرے اس قدر تاریک ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ کہیں سے عمارت پھٹی ہوئی ہو تو سورج کی کوئی شعاع پڑ سکتی ہے ورنہ نہیں۔

اس کی جائے وقوع بتانے سے یہ مقصد تھا کہ شمال میں کوئی مسلمانوں کا دشمن ہے مسلمان اس سے ہوشیار رہیں مگر مسلمانوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ اور پھر مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ میں یہ بتایا ہے کہ ہم نے اشارہ تو کر دیا ہے مگر سمجھ وہی سکتا ہے جو ہدایت پر ہو۔ یعنی ان قوموں سے جو دوستانہ سلوک کرے گا وہ ہلاک ہوگا اور جو آپس میں اتفاق کریں گے کامیاب ہوں گے مگر مسلمانوں نے آپس میں لڑائیاں کیں لیکن روم کے بادشاہوں سے صلح رکھی۔ سوائے ابتدائی زمانہ کے کہ جب رومی بادشاہ نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ کی خبر معلوم کر کے اسلامی مملکت پر حملہ کرنا چاہا تو حضرت معاویہؓ نے اسے لکھا کہ ہوشیار رہنا ہمارے آپس کے اختلاف سے دھوکا نہ کھانا اگر تم نے حملہ کیا تو حضرت علیؓ کی طرف سے جو پہلا جرنیل تمہارے مقابلہ کے لئے نکلے گا وہ میں ہوں گا۔

اس کے برخلاف جب مسلمان اسلام سے دور جا پڑے تو بغداد کے بادشاہوں نے سپین کو نقصان پہنچانے کیلئے مشرقی رومی حکومت سے جو بازنطینی حکومت کہلاتی تھی صلح کی۔ اور سپین کے مسلمان بادشاہوں نے بغداد کی حکومت کے خلاف مدد لینے کے لئے پاپائے روم کو تحفے بھیجے۔ اور اس سے صلح کی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اس نکتہ کی طرف مجھے قرآنی حروف مقطعات الٓمٓ نے توجہ دلائی اور مسلمانوں کی یہ دردناک اور عبرتناک غلطی مجھے معلوم ہوئی۔

وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَ

اور ہم انہیں دائیں طرف (بھی) پھرائیں گے اور بائیں طرف (بھی) اور

كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ لَوِ اطَّلَعْتَ

ان کا کتا (بھی ان کے ساتھ ساتھ) صحن میں ہاتھ پھیلائے (موجود) رہے گا۔ اگر تو ان کے حالات سے آگاہ

عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ

ہو جائے تو تو اُن سے بھاگنے کے لئے پیٹھ پھیر لے اور ان کی وجہ سے رعب سے

رُعْبًا ۝ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَاۗءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ

بھر جائے ۝۱۶ اور اسی طرح ہم نے انہیں (بیکسی کی حالت سے) اٹھایا اس پر وہ آپس میں (حیرت سے) ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے

حل لغات۔ تَحْسَبُهُمْ: حَسِبَ (یَحْسَبُ) سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور حسبہٗ کے معنے ہیں ظَنَّہٗ۔ اس کے بارے میں گمان کیا (اقرب)

اَیْقَاظًا: یہ یقظٌ و یقُظٌ و یقظان کی جمع ہے اور یقِظٌ و یَقُظٌ و یَقْظَانٌ صفت مشبہ کے صیغے ہیں اور یَقِظَ الرَّجُلُ (یَقَظًا) کے معنے ہیں۔ ضِدُّ نَامَ وتَنَبَّہَ للامور وحَذِرَ وفَطِنَ۔ وہ بیدار رہا۔ معاملات میں محتاط ہوا۔ چوکس ہوا۔ سمجھدار ہوا (اقرب)

رُقُوْدٌ: رَاقِدٌ کی جمع ہے۔ اور یہ رَقَدَ سے اسم فاعل ہے۔ اور رَقَدَ الرجلُ (یرقُدُ۔ رَقْدًا و رُقُوْدًا و رُقَادًا) کے معنے ہیں۔ نَامَ سوگیا۔ رَقَدَ الحرُّ سکن۔ گرمی ہٹ گئی۔ رقدعن الامر۔ غفل۔ کسی کام سے غافل ہوا۔ رقد الثوبُ اَخْلَقَ۔ کپڑا بوسیدہ ہوگیا۔ اور الرّاقد کے معنے ہیں۔ النَّائمُ۔ سویا ہوا۔ اس کے علاوہ اس کی جمع رُقَّدٌ بھی آتی ہے۔ (اقرب)

نُقَلِّبُهُمْ: قلّب (باب تفعیل) سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور قلّبہٗ کے معنے ہیں حَوَّلَہٗ عن وجھہ۔ اس کو اصل مقصد سے پھیر دیا۔ قَلَّبَ الشیءَ۔ حَوّلہ وجعل اعلاہ اسفلہ۔ کسی چیز کو اس طرح تبدیل کیا کہ اس کے نیچے کی سطح اوپر آگئی۔ قلّب الشیَٔ للابتیاع۔ تصفّحہ فرأی داخلہ و باطنہ۔ کسی چیز کو خریدنے کے لئے اس کے متعلق پوری واقفیت اور پورا علم حاصل کر لیا۔ قلّب الامرَ ظهرًا لبطنٍ۔ اختبرہٗ۔ معاملہ کا امتحان کیا۔ قلّب القومَ۔ صَرَفَهم۔ لوگوں کو رخصت کیا (اقرب)

وَصِیْدٌ: الفناءُ: گھر کا صحن۔ العتبۃُ۔ دروازہ کی دہلیز۔ بَیْتٌ کالحظیرۃ یُتَّخَذُ من الحجارۃ للمالِ اَیِ الغنمِ وغیرِھا فی الجبالِ۔ باڑے کی طرح کا چھوٹا سا مکان جو پتھروں سے پہاڑی جگہوں میں جانوروں کے لئے بناتے ہیں۔ الجَبَلُ۔ پہاڑ۔ اَلنَّبَاتُ المتقاربُ الاصولِ۔ چھوٹے تنوں والے پودے۔ الضیقُ وَ المطبق۔ تنگ (اقرب)

تفسیر:۔ میرے نزدیک اس آیت میں اصحاب کہف کے ابتدائی ایام کا ذکر نہیں بلکہ ان کی اس وقت کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو قرآن کریم کے وقت میں تھی اور یہ بتایا گیا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ یہ شمالی اقوام جاگ رہی ہیں۔ وہ جاگ نہیں رہیں اس وقت وہ سو رہی ہیں۔

تحسبهم ۱ — ایقاظا ۱ — وصیدا ۲ — رقودا ۱ — نقلبهم ۱

آئندہ زمانہ میں جاگیں گی۔ گویا ان کی موجودہ حالت آئندہ
کی حالت کے مقابل پر ایسی ہے کہ ان کو سوتے ہوئے
سمجھنا چاہیئے۔ اس سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ان
دنوں میں تم اُن کے زور کو توڑ دو تو آئندہ ان کے شر
سے محفوظ رہو گے۔ مگر افسوس حضرت عثمانؓ کے بعد
سے اس قوم کی طرف مسلمانوں کی توجہ کم ہو گئی۔ اگر اس
وقت مسلمان حملہ کر کے بازنطینی حکومت کو تباہ کر دیتے
اور اس کا ان کو حق تھا۔ کیونکہ رومیوں نے حملہ کرنے
میں پہل کی تھی۔ تو یقیناً آج دنیا کا نقشہ مختلف ہوتا۔

وَ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ
میں بتایا ہے کہ ان کو آئندہ زمانہ میں ہم دنیا پر پھیلانے
والے ہیں وہ وقت ان کی بیداری کا ہوگا۔ پس اس وقت
کے آنے سے پہلے مسلمانوں کو اپنی حفاظت کے لئے تدابیر
کر لینی چاہئیں۔

اصحاب کہف کے کتے کی تشریح

وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ
سے رومی بازنطینی حکومت کی طرف اشارہ ہے جو بحیرہ
مارمورہ کے دونوں جانب یورپ کی حفاظت کر رہی تھی۔
اگر بحیرہ مارمورہ کو دیکھا جائے تو بالکل یوں معلوم ہوتا ہے
کہ کوئی کتا دائیں بائیں لاتیں پھیلائے پہرہ دے رہا
ہے۔ ترکوں نے اس علاقہ کو فتح کیا مگر اس وقت تک
مقابلہ کا اصل موقعہ نکل چکا تھا اور شمالی قومیں طاقت
پکڑ چکی تھیں۔ جن کا ترک مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اگر بغداد
اور سپین کی حکومتیں مل کر اپنے زمانہ میں شمالی ملکوں
میں پھیل جاتیں تو وہ ایک زریں موقعہ تھا۔ یقیناً
اس وقت اسلام ان ممالک میں پھیل جاتا اور آج کے
تاریک دن دیکھنے میں نہ آتے۔

کہا جا سکتا ہے کہ الٰہی تقدیر کو کس طرح روکا جا
سکتا تھا لیکن یہ اعتراض الہامی کلام کی حقیقت کی نافہمی
سے پیدا ہوگا۔ الٰہی قانون یہ ہے کہ انذاری پیشگوئیاں
ٹل بھی جاتی ہیں۔ کم سے کم اسلام کو جو ضعف آج پہنچ
رہا ہے۔ ان حالات میں وہ ایسا شدید نہ ہوتا اور یورپ
میں اسلام کے ہمدرد اور مددگار موجود ہوتے جو مسیحی
حملہ کی شدت کو بہت کم کر دیتے۔

یہ جو فرمایا کہ اگر تجھے ان کا علم ہو تو تو اُن سے
مرعوب ہو جائے۔ اس کا تعلق اس وقت سے ہے جبکہ
ان کو شمال اور جنوب میں پھیلا دیا جائے گا۔ چنانچہ دیکھ
لو۔ اس وقت ان شمالی قوموں کا کس قدر رُعب ہے۔
دنیا کی دوسری حکومتیں اگر کوئی ہیں بھی تو اُن کے
رحم پر ہیں۔ اور ان کا رُعب سب دنیا پر چھایا
ہوا ہے۔

وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ سے اس
طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان قوموں میں کتے رکھنے
کا بہت رواج ہوگا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ یوروپین قومیں
عام طور پر کتے رکھتی ہیں جو ان کے گھروں کے پہرے
دیتے ہیں اور پہلا خوف ان کی کوٹھیوں پر جانے والے
کے لئے ان کے کتوں سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ میں آنحضرت صلے اللہ
علیہ وآلہٖ وسلم مخاطب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ نُقَلِّبُهُمْ
کے بعد کی حالت کے اثر کا بیان ہے۔ پس اس میں
ہر سننے والا ہی مخاطب ہو سکتا ہے۔ یعنی ہر ایک پر اُن
کا رُعب طاری ہو جائے گا۔ چنانچہ کچھ عرصہ پیشتر تو ساری
دنیا میں ہی اس قوم کا رُعب مانا جاتا تھا۔ اب اللہ
نے اس قوم کی تباہی کے سامان پیدا کر کے دنیا سے
اس کے رُعب کو کم کر دیا ہے۔ ورنہ اس قوم کا پہلے
اس قدر رُعب تھا کہ لوگ ریل گاڑی کے اول و دوم
درجہ میں بیٹھنے تک سے بھی خوف کھاتے تھے۔ اور
یوروپین لوگوں کی شکل تک دیکھنے سے مرعوب ہو
جاتے تھے ؛

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا

(اور) ان میں سے ایک کہنے لگا (کہ) تم (یہاں) کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو (جو اس کی مخاطب تھے) انہوں نے کہا (کہ) ہم ایک دن

اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ

یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔ (تب) انہوں نے (یعنی دوسروں نے) کہا (کہ) جو (عرصہ) تم (یہاں) ٹھہرے رہے ہو اسے تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے

فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ

پس (اس بحث کو چھوڑ دو اور) یہ اپنے روپے دے کر اپنے میں سے کسی ایک کو اس شہر کی طرف بھیجو

فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ

اور وہ (جا کر) دیکھے کہ اس (شہر) میں سے کس کا غلہ سب سے اچھا ہے پھر (جس کا غلہ سب سے اچھا ہو) اس سے کچھ کھانے کا سامان لے آئے

وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ

اور وہ ہوشیار رہے (لوگوں کی راز کی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کرے) اور تمہارے متعلق کسی کو ہرگز کوئی علم نہ ہونے دے ۝ (کیونکہ) اگر وہ

ٹلہ حل لغات۔ بِوَرِقِكُمْ: اَلْوَرِقُ: اَلدَّرَاهِمُ الْمَضْرُوْبَةُ۔ سرکاری مہر والے سکے (اقرب)

اَزْكٰى: زَكَاهُ (يَزْكِيْ زَكًا) اَلْفَ دِرْهَمٍ۔ نَقَدَهٗ اِيَّاهُ اَوْعَجَّلَ لَهٗ نَقْدَهَا۔ اس کو ہزار درہم نقد دئے یا جلدی ہی ادا کر دئے۔ زَكَا فُلَانًا حَقَّهٗ۔ قَضَاهُ اِيَّاهُ۔ اس کے حق کو ادا کیا (اقرب)، زَكَا الشَّيْءُ (يَزْكُوْ) نَمَا۔ کوئی چیز بڑھ گئی وَ زَكَا الرَّجُلُ صَلُحَ وَتَنَعَّمَ وَكَانَ فِيْ خَصْبٍ۔ کسی شخص کی حالت درست ہو گئی۔ اور وہ آسودہ حال ہو گیا اور خوب عیش سے رہنے لگا (اقرب)

اَلزَّكَاةُ کے معنے اَلطَّهَارَةُ۔ پاکیزگی۔ وَالنَّمَاءُ وَالْبَرَكَةُ ہر چیز کا بڑھنا اور اس میں برکت کا ہونا (تاج)

اَلطَّعَامُ: اِسْمٌ لِمَا يُؤْكَلُ۔ خوراک۔ کھانا۔ وَقَدْ غَلَبَ الطَّعَامُ عَلَى الْبُرِّ۔ اور زیادہ گندم پے طعام کا لفظ بولا جاتا ہے وَرُبَّمَا اُطْلِقَ عَلَى الْحُبُوْبِ كُلِّهَا۔ اور بسا اوقات تمام قسم کے دانوں کیلئے استعمال ہوتا ہے (اقرب)

الرِّزْقُ: مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ۔ ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے۔ مَا يُخْرَجُ لِلْجُنْدِيِّ رَأْسَ كُلِّ شَهْرٍ ہر ماہ کے اخیر پر جو تنخواہ سپاہی کو دی جائے (اقرب)

وَلْيَتَلَطَّفْ: تَلَطَّفَ (باب تفعّل) سے امر کا صیغہ ہے اور تَلَطَّفَ الْاَمْرَ وَفِي الْاَمْرِ کے معنے ہیں تَرَفَّقَ فِيْهِ۔ اس نے کسی معاملہ میں نرمی کی تَخَشَّعَ۔ عاجزی کی تَلَطَّفَ بِفُلَانٍ: اِحْتَالَ لَهٗ حَتّٰى اِطَّلَعَ عَلٰى اَسْرَارِهٖ اس نے حیلوں کے ذریعہ سے اس کے بھیدوں پر اطلاع پائی (اقرب) وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ: يُشْعِرَنَّ شَعَرَ کے باب افعال کا صیغہ مضارع واحد مذکر غائب ہے۔ شَعَرَ کے لئے دیکھو سورہ یوسف

الورق

ازکی

ولیتلطف

الطعام

تفسیر:- اس جگہ بھی ان اصحاب کہف کا ذکر نہیں جو ابتدائی ایام میں غاروں میں چھپتے تھے۔ بلکہ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ کے وقت کا حال بتایا ہے اور بَعَثْنٰهُمْ سے مراد آئندہ زمانہ میں شمالی اقوام کی ترقی کا جوش کا جھٹکا ہوں گی۔ [illegible]

گیا ہے۔ ماضی کے صیغہ سے آئندہ کی خبر دینا قرآن کریم کا عام محاورہ ہے اور جیسا کہ متعدد بار پہلے ثابت کیا جا چکا ہے۔ ماضی کے صیغہ سے آئندہ کی خبر دینے سے اس کے یقیناً واقع ہو جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے جیسا کہ اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ (نحل ع۱) وغیرہ بہت سی آیات ہیں۔ اسی طریق کلام کو یہاں اختیار کیا گیا ہے غرض اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم ایک دن ان

اصحاب کہف کی بعثت سے مراد

قوموں کو جو اس وقت سو رہی ہیں بیدار کریں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آپس میں یہ سوال کریں گی کہ تم کس قدر عرصہ تک سوتے رہے ہو یعنی اب بیدار ہونا چاہیئے چنانچہ صلیبی جنگوں کے وقت ان اقوام میں بیداری پیدا ہوئی اور انہوں نے اسلام کے خلاف جتھہ بازی کی اور اسلامی ممالک پر حملہ شروع کیا۔ یہ جو فرمایا ہے کہ لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اُن کو شک تھا کہ ہم دن یا دن کا کوئی حصہ سوتے رہے ہیں۔ بلکہ اس کے معنے عربی محاورہ میں غیر معین اور لمبی مدت کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن کفار کے سوال و جواب میں بھی یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں

اصحاب کہف کے عرصہ قیام کی تشریح

فرماتا ہے قیامت کے دن ہم کفار سے پوچھیں گے۔ کَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِیْنَ بتاؤ کہ تم دنیا میں کس قدر عرصہ رہے۔ اس کے جواب میں کفار کہیں گے لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّیْنَ۔ ہم دن یا دن کا کچھ حصہ رہے۔ پس آپ اُن سے پوچھیئے جو گننے پر مقرر ہیں۔ (مومنون ع۶) ان آیات میں سوال کی عبارت سے بھی اور جواب سے بھی ظاہر ہے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ ایک غیر معین عرصہ تک ہم رہے۔ یہی معنے اس جگہ ہیں۔ کہ ایک غیر معین عرصہ تک ہم سوئے رہے۔ ایک اور جگہ قرآن کریم میں اس عرصہ کو ایک ہزار سال بتایا گیا ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں فرماتا ہے۔ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ زُرْقًا یَّتَخَافَتُوْنَ بَیْنَھُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا (طٰہٰ ع۵) یعنی جب صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو ہوشیار کر کے کھڑا کر دیں گے جو نیلی آنکھ والے رومی قوم کے ہوں گے وہ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے اور کہیں گے کہ تم دس تک سوتے رہے۔ دس سے مراد دس صدیاں ہیں یعنی ہزار سال تک سوتے رہے۔

زُرْق کا لفظ جو آیت میں آیا ہے اس کے معنے نیلی آنکھوں والوں کے ہیں۔ یورپین لوگوں کی آنکھیں بوجہ رنگ کی سفیدی کے نیلی ہوتی ہیں اور عرب لوگ رومیوں کو ازرق کہتے تھے یعنی نیلی آنکھوں والے۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے ازرق کے معنے دشمن کے بھی ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رُوم اور دیلم کی آنکھیں نیلی ہوتی ہیں اور عرب لوگ ان کو اپنا بڑا دشمن سمجھتے تھے اس لئے آہستہ آہستہ اس لفظ کے معنے عربوں میں دشمن کے ہو گئے (اقرب)

خلاصہ یہ کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ انہیں شبہ تھا کہ وہ شاید تھوڑی دیر تک اس غفلت کی حالت میں رہے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک لمبا غیر معین عرصہ اس حالت میں رہے ہیں۔ سورۃ طٰہٰ میں اس عرصہ کی مقدار ایک ہزار سال بتائی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ایک ہزار سال کا عرصہ شمار کیا جائے تو حساب یوں بنتا ہے۔ رسول کریم صلعم کی پیدائش مطابق شمار سر ولیم میور سنہ ۵۷۰ء میں ہوئی۔ (لائف آف محمدؐ) دعوئ نبوت چالیس سال بعد ہوا یعنی دعویٰ کی تاریخ ہوئی سنہ ۶۱۱ء۔ اس میں ہزار سال جمع کئے جائیں تو سنہ ۱۶۱۱ء یا سنہ ۱۶۱۲ء بنتے ہیں۔ اور یہی وہ تاریخیں ہیں جن میں ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمے۔ سنہ ۱۶۱۱ء میں مغلیہ حکومت نے خلیج بنگال میں کام کرنے کی انگریزوں کو اجازت دی۔ اور سنہ ۱۶۱۲ء میں سُورت میں پہلا

يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ

تم پر غلبہ پا لیں تو یقیناً تمہیں سنگسار کر دیں گے یا (جبراً) تمہیں واپس اپنے

کارخانہ کھولنے کی اجازت دی (مارچ آف مین MARCH OF MAN مطبوعہ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا سوسائٹی) دنیا جانتی ہے کہ یورپ کی ترقی اور اس کے دنیا میں پھیلنے کی یہ پہلی بنیاد تھی۔ یورپ نے انگریزوں کے نقش قدم پر اور ان کے سہارے پر ترقی کی ہے۔ اور انگریزوں کی ترقی کا راز ہندوستان میں ان کا وارد ہونا ہے۔ ہندوستان ہی میں قدم جمنے پر انہوں نے دوسرے ایشیائی ممالک پر اور افریقہ پر قبضہ کیا۔ اور ان کے اس طرح اقتدار حاصل کرنے پر دوسری یوروپین اقوام نے دنیا میں ترقی کی۔

شاید کوئی کہے کہ ذکر تو رومیوں کا تھا انگریزوں کا ان امور سے کیا تعلق؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ تمدن رومی اثر کا ہی نتیجہ ہے اور سب یورپ روم کا شاگرد ہے اور اسی کی تہذیب کی یادگار۔ اور یورپ میں عیسائیت بھی روم کے ہی ذریعہ سے قائم ہوئی ہے اس لئے شاخوں کا کام جڑھ ہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

ازکیٰ۔ ازکیٰ کے معنے اَصلح کے ہوتے ہیں یعنی مناسب حال۔ اور اس کے معنے اعلیٰ درجہ کے بھی ہیں یورپ کی قوموں کے پھیلنے کی بڑی وجہ یہی ہوئی ہے کہ ان کے ملکوں میں غلہ کافی نہیں ہوتا اور وہ غلے اور مصالح ایشیا سے لے جاتے تھے۔ پہلے عربوں کی معرفت وہ چیزیں خریدتے تھے لیکن جب ہندوستان کا راستہ دریافت ہو گیا تو انہوں نے براہ راست ان اشیاء کی تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور آہستہ آہستہ دوسری چیزوں کی تجارت بھی ان کے ہاتھ میں آ گئی۔

طعام کے معنے اس جگہ پکے ہوئے کھانے کے نہیں۔ عربی زبان میں طعام ہر کھانے کی چیز کو کہتے ہیں۔ خصوصاً گندم کو۔ اور جب تک امریکہ نے گندم کی پیداوار میں کوشش نہیں کی جو بالکل قریب زمانہ کی بات ہے ڈیڑھ دو سو سال تک یورپ کو ہندوستان ہی گندم مہیا کرتا رہا ہے۔

گویا انہوں نے اس غلہ خریدنے والے کو ہدایت کی کہ چونکہ ہم نے اس غلہ کو ذخیرہ کرنا ہے اور دیر تک جمع رکھنا ہے اس لئے مناسب طعام دیکھ کر لانا۔

یہ جو فرمایا ہے وَلْيَتَلَطَّفْ یہ مغربی قوموں کا خاصہ ہے۔ ان کے باہر جانے والے افسروں کو خاص ہدایت ہوتی ہے کہ وہ بہت میٹھے طور پر باتیں کریں اور تاجر بھی ایسے میٹھے رہتے ہیں کہ لوگوں میں جوش پیدا نہیں ہوتا۔

وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا اس آیت میں گو اَحَدًا کا لفظ آیا ہے۔ اور ضمائر بھی مفرد کے استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی آدمی کا بھجوایا جانا یہاں مراد ہو۔ قرآن کریم میں حضرت آدم کے قصے میں ابلیس کا ذکر آتا ہے اور سب باتیں اسی کو مخاطب کر کے کہی گئی ہیں لیکن دوسرے مقامات پر اس کے ساتھ اور جماعت بھی تسلیم کی گئی ہے جیسے کہ فرماتا ہے بعضکم لبعض عدو تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہو گئے اسی طرح بعض دوسرے مقامات پر ابلیس کی ذریت کا بھی ذکر کیا ہے پس گو لفظ احدکم کا استعمال ہوا ہے مگر مراد یہ ہے کہ اپنے میں سے بعض کو غلہ خریدنے کیلئے بھجوا دو اور مفرد کا لفظ میرے نزدیک اس نظام پر دلالت کرنے کیلئے رکھا گیا ہے کہ ایک نظام کے ماتحت جائیں اور ذمہ دار اور جواب دہ ایک ہی شخص ہو کسی کو تمہارا علم نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ اپنے وجود کو محسوس نہ ہونے دینا اور یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تمہاری قوم کی نیت ان ممالک میں نفوذ پیدا کرنے کی ہے بلکہ ایسی طرح معاملہ کرنا کہ تمہاری آمد کی اغراض کو لوگ

مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ○ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا

مذہب میں داخل کر لینگے اور اس صورت میں کبھی (بھی) کامیاب نہیں ہوگے ۱۸ھ اور اسی طرح ہم نے (لوگوں کو)

عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ

ان (کے حالات) سے آگاہ کیا ہے تا انہیں معلوم ہو کہ اللہ (تعالٰے) کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے اور (یہ بھی) کہ اس (موعودہ) گھڑی

لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ

(کے آنے) میں کچھ بھی شک نہیں (اور اسوقت کو بھی یاد کرو) جب وہ اپنے کام کے متعلق آپس میں گفتگو کرنے لگے

فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ

اور انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا (کہ) تم ان (کے رہنے کے مقام) پر کوئی عمارت بناؤ - ان کا رب ان (کے حال) کو سب سے بہتر جانتا تھا۔

قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ

(آخر) جنھوں نے اپنے قول میں غلبہ حاصل کر لیا انہوں نے کہا (کہ) ہم (تو) ان (کے رہنے کے مقام) پر

تاڑ نہ جائیں اور تمہارے اصلی منشاء کو نہ پہچانیں۔

اور ایسی شکل دینے والوں کیلئے اور جن کو مشورہ دیا گیا ہے اُن کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اس سے میرے نزدیک اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وفد بھیجنے والی ایک کمپنی ہوگی کوئی بادشاہ یہ کام نہ کریگا. چنانچہ انگریزی وفد جو ہندوستان آیا. یا فرانسیسی وفود جو آئے یہ سب کمپنیوں کی طرف سے تھے۔ ان کا آقا کوئی ایک فرد نہ تھا بلکہ کمپنیاں تھیں۔

۱۸ھ حل لغات - يَظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ : ظَهَرَ (يَظْهَرُ عليه) غَلَبَہٗ - اس پر غالب آیا۔ ظهر فلانٌ علٰى سِرّه - اطّلع عليه - کسی بھید پر مطلع ہوا (اقرب)

يَرْجُمُوْكُمْ : رَجَمَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے. رَجَم کے معنے کے لئے دیکھو سورۃ حجر ۱۶ھ

المِلّة - اس کے لئے دیکھو ابراہیم ۱۴ھ

تفسیر :- اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر ان اقوام کو جن کی طرف تم وفد بھیجتے ہو تمہارا علم ہوگیا (ظهر على السِرّ کے معنے ہوتے ہیں اس کو راز معلوم ہوگیا) یا یہ کہ اگر جھگڑا ہوگیا اور قدم جمانے سے پہلے ان سے لڑائی ہوگئی اور تم مغلوب ہوگئے تو وہ تم کو اپنے ملکوں سے نکال دیں گے۔ (رجم کے معنے دھتکار دینے کے بھی ہوتے ہیں) یا اگر نہ نکالیں تو تم کو مجبور کریں گے کہ ان کے مذاہب میں داخل ہو جاؤ۔ اور اگر ایسا ہُوا یعنی تم کو انہوں نے ملک سے نکال دیا، یا یہ کہ تم کو اپنے مذاہب میں داخل کر دیا۔ تو تمہارا زور ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائیگا اور پھر کبھی ترقی نہ کرسکو گے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ یوروپین قومیں سیاسی اغراض کی وجہ سے ہمیشہ عیسائی مذہب کی مدد کرتی رہیں اور دوسری اقوام کے خیالات اپنے اندر پھیلنے سے روکنے کے لئے ہر قسم کی تدابیر اختیار کرتی رہتی ہیں۔

یظهروا

یرجموکم

~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

مَّسۡجِدًا ۝ سَیَقُوۡلُوۡنَ ثَلٰثَۃٌ رَّابِعُہُمۡ کَلۡبُہُمۡ ۚ وَ

مسجد (ہی) بنائیں گے ۵؎ وہ (لوگ جو حقیقتِ حال سے بےخبر ہیں ضرور) غیب کے متعلق نشانہ بازی کرتے ہوئے (کبھی) کہیں گے (کہ وہ فقط) تین آدمی

یَقُوۡلُوۡنَ خَمۡسَۃٌ سَادِسُہُمۡ کَلۡبُہُمۡ رَجۡمًۢا بِالۡغَیۡبِ ۚ

تھے جن کے ساتھ چوتھا ان کا کتا تھا اور (کبھی) کہیں گے (کہ وہ) پانچ تھے جن کے ساتھ چھٹا ان کا کتا تھا۔

۲۰؎ حل لغات۔ اَعۡثَرۡنَا: اَعۡثَرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور اعثر فلانًا علی السِر وغیرہ کے معنے ہیں۔ اَطۡلَعَہٗ۔ اس کو بھیدوں پر مطلع کیا۔ اَعۡثَرَ فلانًا علی اصحابہ دَلَّہٗ علیہم۔ کسی کو اپنے دوستوں کے متعلق آگاہ کیا۔ اَعۡثَرَ بِہٖ عند السلطان قَدَحَ فِیۡہِ و طلبَ توریطَہٗ اَنۡ یَقَعَ فی عاثورٍ۔ بادشاہ کے ہاں اس پر جرح کی اور اس کے مرتبہ کو گرایا۔ (اقرب)

السّاعۃ: کے لئے دیکھو سورۃ نحل ۲۸؎

رَیۡبٌ: راب (یَرِیۡبُ رَیۡبًا) کا مصدر ہے اور رَابَ کے معنے ہیں۔ اَوۡقَعَہٗ فی الرِّیۡبِ اَوۡصَلَ الیہ الرِّیۡبَۃَ۔ اسے شک میں ڈالا نیز الریب کے معنے ہیں اَلظِّنَّۃُ و التُّہۡمَۃُ۔ ظن، تہمت۔ الشک۔ شک۔ الحاجۃ۔ حاجت (اقرب)

یَتَنَازَعُوۡنَ: تنازع سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تنازَعُوۡا کے معنے ہیں اِخۡتَلَفُوۡا۔ انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ تنازعوا فی الشیءِ تخاصَمُوۡا کسی چیز میں جھگڑا کیا (اقرب)

بنیانًا: بنی کا مصدر ہے اور بناہ (یبنیہ بنیانًا) کے معنے ہیں۔ نقیضُ ھَدَمَہٗ۔ کسی چیز کو بنایا۔ بنی الارضَ۔ بنی فیہا دارًا و نحوھا۔ کسی زمین میں مکان بنایا (اقرب)

المسجِدُ و المسجَدُ: الموضع الّذِی یسجد فیہ وہ جگہ جہاں سجدہ کیا جائے۔ کلُّ موضعٍ یُتَعَبَّدُ فیہ۔ ہر وہ جگہ جہاں عبادت کی جائے۔ وقیل انّ المسجَدَ بالکسر اسم لموضع العبادۃ یُسۡجَدُ فیہ اَوۡ لم یُسۡجَدۡ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مسجِد (بکسر جیم) مطلق عبادت کی جگہ کو کہتے ہیں۔ خواہ اس میں سجدہ کیا جائے یا نہ (اقرب)

تفسیر:۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ یہ اقوام جو عرصہ تک دنیا سے الگ رہی تھیں۔ اس طرح پھر دنیا سے روشناس ہوگئیں اور دنیا کو معلوم ہوگیا کہ مسیحی اقوام کے آخری ایام میں غلبہ کی جو خبر ہم نے دی تھی وہ بالکل سچی تھی اور یہ کہ وہ موعود گھڑی جس سے ہم ڈرا رہے تھے ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

اِذۡ یَتَنَازَعُوۡنَ سے پھر اصحاب کہف کی ابتدائی حالت کا کچھ ذکر فرمایا اور ان کی ایک علامت بتائی فرماتا ہے کہ اس قوم نے جب سے ہوش سنبھالی ہے ان میں یہ عادت ہے کہ اپنے وفات یافتوں کے نام پر مساجد یعنی معابد بناتے ہیں۔ جو ان کے بزرگ گذرے ہیں ان کی یاد میں وہ گرجے بناتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو مسیحی ہی ایک قوم ہے جن میں بزرگوں کے نام پر گرجے بنائے جاتے ہیں مسلمانوں کی کوئی مسجد کسی بزرگ کے نام پر نہیں بنائی جاتی اور نہ یہود میں ایسا ہوتا ہے۔ مگر مسیحیوں کے ہزاروں گرجے بزرگوں کی یاد میں ہیں۔ بلکہ گرجوں میں یہ لوگ مُردوں کو دفن بھی کرتے ہیں۔ ابتدائی اصحاب کہف کی یادگار میں بھی کیٹا کومبز میں بہت سے گرجے بنے ہوئے ہیں۔

اعثرنا

رَیۡب

عیسائیوں میں مردوں کے نام گرجے بنانے کی عادت

یتنازعون

بنیانًا

المسجد

وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ

اور (ان میں سے بعض یوں بھی) کہیں گے (کہ وہ) سات تھے اور ان کے ساتھ آٹھواں ان کا کتا تھا تو (انہیں) کہہ (کہ) ان کی (صحیح) گنتی

بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ

کو اللہ (تعالیٰ ہی) بہتر جانتا ہے (اور) تھوڑے لوگوں کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا۔ پس تو ان کے متعلق مضبوط بحث

اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ۟ۧ

ع ۳ / ۱۵

کے سوا کوئی بحث نہ کر اور ان کے بارہ میں ان میں سے کسی سے حقیقت حال دریافت نہ کر ۵۳۰

حل لغات رَجْمًا بالغیب۔ الرجم: اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِالظَّنِّ۔ یقال رَجْمًا بالغیب ای لا یوقف علی حقیقتہ۔ رجم کے معنے ظنی طور پر بات کرنے کے ہیں اور رجما بالغیب انہی معنوں میں ہے کہ اس نے بات تو کی لیکن اس کی حقیقت سے بے خبر تھا۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورہ حجر ۵۳

رَجْمًا — اصحاب کہف کی گنتی کو صرف اللہ ہی جانتا ہے

تُمَارِ: مَارَاهُ (مُمَارَاةً و مِرَاءً) کے معنے ہیں جَادَلَهُ وَنَازَعَهُ۔ اس سے اس نے جھگڑا کیا۔ وَلَاجَّهُ وَطَعَنَ فِي قَوْلِهِ تَزْيِيْفًا لِلْقَوْلِ وَتَصْغِيْرًا لِلْقَوْلِ اس نے نہایت سختی سے جھگڑا کیا اور مدمقابل کی بات کو ساقط قرار دیتے ہوئے طعنہ زنی کی اور کلام کی اہانت کی۔ (اقرب)

تُمَارِ

لَا تَسْتَفْتِ: اِسْتَفْتٰی سے نہی کا صیغہ ہے۔ اور اِسْتَفْتٰى فُلَانٌ الْعَالِمَ فِي مَسْئَلَةٍ (استفتاءً) کے معنے ہیں سَأَلَهُ اَنْ يُّفْتِيَهُ فِيْهَا۔ اس نے کسی عالم سے چاہا کہ وہ اس کے متعلق اُسے واقفیت بہم پہنچائے (اقرب)

لَا تَسْتَفْتِ

تفسیر:۔ اس آیت میں پھر ابتدائی اصحاب کہف کی نسبت ایک اور بحث کا ذکر فرمایا ہے کہ کوئی ان کو تین بتاتا ہے کوئی چار کوئی پانچ۔ مگر یہ سب ظنی باتیں ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے۔

بعض نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سات تھے۔ کیونکہ پہلے اعداد کے ساتھ تو فرمایا یہ ظنی باتیں ہیں اور اس آخری تعداد کو بعد میں بیان کیا ہے معلوم ہوا یہ قول درست ہے۔ حالانکہ یہ قول بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔ بلکہ دوسروں کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ تو ان سب لوگوں سے کہہ دے کہ اللہ ان کی گنتی کو جانتا ہے۔ اگر یہ آخری گروہ صحیح اندازہ بیان کرنے والا ہوتا تو ان کو یہ کیوں کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ ان کی گنتی کو جانتا ہے۔ پھر تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ تو ان لوگوں سے کہہ دے کہ تمہارا بیان صحیح ہے۔ پس درحقیقت اس قول والوں کی بھی تردید کی گئی ہے کیونکہ اصحاب کہف پانچ سات نہ تھے۔ بلکہ وہ تو مختلف اوقات میں غاروں میں چھپتے رہے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ پس اصل بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی گنتی کوئی نہیں جانتا۔ مَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ۔ کے یہ معنے نہیں کہ تھوڑے سے لوگوں کو ان کی گنتی معلوم ہے۔ بلکہ یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی گنتی کوئی بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ قلیل کا لفظ عربی میں اسی طرح نفی کے لئے آتا ہے جس طرح انگریزی میں فیو FEW کا لفظ نفی کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں قلیل من الرجال یقول ذالک۔ اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں۔ کہ کوئی یہ

وَلَا تَقُوۡلَنَّ لِشَایۡءٍ اِنِّیۡ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ۙ﴿۲۴﴾ اِلَّاۤ

اور تو کسی بات کے متعلق (دعویٰ سے) ہرگز نہ کہہ (کہ) مَیں کل یہ (کام) ضرور کر دوں گا سوائے اس (صورت)

اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ۫ وَاذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ وَقُلۡ

کے کہ اللہ (تعالیٰ کسی امر کے متعلق ایسا کہنا) پسند کرے۔ اور جب (کسی وقت) تو بھول جائے تو (یاد آ جانے پر) اپنے رب کو یاد (کیا) کر اور (لوگوں سے) کہہ دے

عَسٰۤی اَنۡ یَّہۡدِیَنِ رَبِّیۡ لِاَقۡرَبَ مِنۡ ہٰذَا رَشَدًا ﴿۲۵﴾

(کہ مجھے کامل) امید ہے کہ میرا رب مجھے اس (وقت) پر چلائیگا جو ہدایت پانے کے لحاظ سے اس (زیر موجودہ طریق) سے (ترقی تکمیل کے) زیادہ قریب ہوگا ۔ ۲۱

نہیں کہنا (اقرب) یا پھر اس آیت میں چونکہ گنتی کا لفظ نہیں اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اصحاب کہف کی حقیقت کو تھوڑے آدمی جانتے ہیں یعنی وہ جو صحیح تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ابتدائی مسیحی لوگ تھے جو کیٹا کومبز میں چھپا کرتے تھے ۔ باقی لوگ ان کے بارہ میں مختلف قصوں سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ چنانچہ ان قلیل کے علم کا ہی نتیجہ ہے کہ آخر ان کی اصل حقیقت ظاہر ہو گئی۔

آگے فرمایا کہ ان کے بارہ میں سوائے اصولی بات کے اور کوئی بات نہ کرو۔ یعنی تفاصیل دنیا کو معلوم نہیں ہیں۔ پس صرف اصولی باتیں کرو اور تفاصیل میں نہ پڑو۔ اور یہ کہہ کر کہ لوگوں سے ان کے بارہ میں سوال نہ کرو یہ بتایا ہے کہ تاریخ کا یہ حصہ مٹ گیا ہے کوئی بھی پوری تفصیل اس واقعہ کی نہیں بتا سکتا۔ اس لئے اگر تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہو گے تو غلطی کرو گے ۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس حکم کے باوجود کتنے کا رنگ اور اس کا قدنک یہود و نصاریٰ سے پوچھنے کی کوشش کی اور اسطرح تفاسیر میں بے ثبوت روایات کا وہ ذخیرہ جمع کر دیا کہ اُسے پڑھ کر رونا آتا ہے۔

۲۱ **حل لغات** ۔ الغد : کے معنے ہیں۔ اَلۡیَوۡمُ الَّذِیۡ یَاۡتِیۡ بَعۡدَ یَوۡمِکَ عَلٰی اِثۡرِہٖ ثُمَّ تَوَسَّعُوۡا فِیۡہِ حَتّٰی اُطۡلِقَ عَلَی الۡبَعِیۡدِ الۡمُتَرَقَّبِ۔ کل۔ دوسرا دن۔ آئندہ زمانہ کا کوئی دن جس کا انتظار ہو (اقرب)

تفسیر:۔ اس آیت میں پھر اس قوم کی ترقی کے زمانہ کے متعلق ایک خبر دی ہے اور وہ یہ کہ اس قوم کے مقابلہ پر دعویٰ نہ کرنا اور یہ نہ کہنا کہ بس ہم کل ان کو تباہ کر دیں گے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ان کے متعلق کوئی خبر دے یعنی الہام سے بتائے کہ ان سے اب فلاں سلوک ہونے والا ہے۔

بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ اے محمد رسول اللہ کوئی بات بغیر اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ کے نہ کہا کرو۔ اور اس حکم کے متعلق بعض نہایت افسوسناک روایات نقل کی ہیں جن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صریح ہتک ہے۔ حالانکہ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں اِنۡ شَآءَ اللّٰہ کہنے کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر وہ مضمون ہوتا تو الفاظ یوں چاہیے تھے اِلَّا اَنۡ تَقُوۡلَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہ۔ مگر یہاں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ۔ یعنے اوپر والا فقرہ اس وقت تک نہ کہیو جب تک کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس فقرہ کے کہنے کا حکم نہ دے۔ پس آیت کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس قوم کا مقابلہ مسلمان اپنی طاقت سے نہ کر سکیں گے۔ بلکہ وہ ان کا مقابلہ کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے ان کے مقابلہ کے لئے کھڑا کرے گا۔

الغد ۲۱

وَلَبِثُوۡا فِیۡ کَہۡفِہِمۡ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیۡنَ وَ ازۡدَادُوۡا

اور (یہ بھی کہتے ہیں کہ) وہ (اس) اپنی سیع پہاڑی پناہ گاہ میں تین سو سال تک رہے تھے اور (اس عرصہ پر) نو سال انہوں نے

تِسۡعًا ﴿۲۶﴾ قُلِ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ۚ لَہٗ غَیۡبُ

اور بڑھائے تھے ۵۲۲ تو (انہیں) کہہ (کہ) جو (عرصہ) وہ ٹھہرے ہی تھے اسے اللہ (تعالیٰ) بہتر جانتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا غیب

اس آیت میں مسلمانوں کی اس وقت کی حالت کی طرف اشارہ ہے جب وہ ان اقوام کی ترقی کو دیکھکر جوش میں آئیں گے اور ان کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کریں گے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوں گے۔ دوسرے اس زمانہ کے مسلمانوں کی حالت بتائی ہے کہ وہ کام کی بجائے کل کی امیدوں پہ آجائیں گے اور ہمیشہ یہ کہیں گے کہ ہم کل یہ کر دکھائیں گے یعنی قوتِ عملیہ مفقود ہو جائیگی اور ڈراوے اور دھمکیاں رہ جائیں گی اور ہمیشہ کل کا لفظ بولتے رہینگے کبھی وہ کل آج کی صورت اختیار نہ کرے گا۔ چنانچہ دیکھ لو کہ اس زمانہ میں یہ صداقت ساری مسلمان اقوام کے اعمال سے اس طرح ظاہر ہو رہی ہے کہ افسوس بھی آتا ہے۔ اور تعجب بھی۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت کیطرف اشارہ

اصحاب کہف کے قیام رکے عرصہ ۳۰۹ سال کا ثبوت

وَاذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ کہہ کر یہ بتایا کہ اگر کبھی جوش میں آکر ان قوموں کے مقابلہ کا خیال تمہارے دل میں پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو یاد کر لیا کرو کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ایک دن مسلمانوں کو ان کے حملہ سے بچائے گا اور غیب سے مسلمانوں کی نجات کے سامان پیدا کرے گا۔ اس لئے الٰہی تدابیر کے سوا دوسری تدابیر کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔

وَقُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّہۡدِیَنِ رَبِّیۡ لِاَقۡرَبَ مِنۡ ہٰذَا رَشَدًا میں بھی یہ سبق دیا کہ تمہاری ظاہری تدابیر تو سینکڑوں سالوں میں ان اقوام کو تباہ نہیں کر سکتیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بہت جلد ایسے سامان پیدا کر دیگا کہ تم ان فتنوں سے محفوظ ہو جاؤ۔

مسلمانوں کو نصیحت کہ خدا کے فضل سے ہی اقوام کے فتنوں سے بچو گے۔

افسوس مسلمانوں نے اس نصیحت سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اور یوروپین اقوام کے مقابل پر بار بار جہاد کے اعلانات کرکے اسلام کے رعب کو اور بھی مٹا دیا۔ بلکہ جن خیرخواہوں نے ان کو اس قسم کی باتوں سے روکا ان کو اسلام کا دشمن قرار دیا اور یہ نہ سمجھے کہ جو قرآن کریم کی تعلیم کی طرف بلاتے ہیں وہ اسلام کے دشمن نہیں بلکہ وہ دشمن ہیں جو باوجود قرآن کریم کے منع کرنے کے پھر بھی غلط طریقہ کو استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔

۵۲۲ تفسیر:۔ اس آیت میں قدیم اصحاب کہف کی مصیبتوں کا زمانہ بتایا ہے جس زمانہ تک کہ ان پر ظلم ہوتے رہے اور ان کو بار بار غاروں میں جا کر چھپنا پڑا۔ فرماتا ہے کہ وہ تین سو نو سال کا زمانہ ہے۔ تاریخ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ مصائب کا زمانہ حضرت مسیحؑ کے صلیب پانے کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور پورا امن کانسٹنٹائن (بانی قسطنطنیہ) کے عیسائی ہو جانے کے وقت حاصل ہوا ہے۔ کانسٹنٹائن ۳۳۷ء میں عیسائی ہوا ہے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۵ ص ۲۷۶) بظاہر یہ زمانہ قرآنی بیان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم مسیحی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ غلط ہے۔ اصل سال جس میں کانسٹنٹائن بادشاہ روم عیسائی ہوا ۳۰۹ء ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود مسیحی جغرافیہ نویسوں نے تسلیم کیا ہے کہ مسیحی کلنڈر میں غلطی ہو گئی ہے چنانچہ آرچ بشپ اشرز (USHERS) نے اپنی کتاب علم تاریخ (CHRONOLOGY) میں

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ

(کا علم) اسی کے لئے (مسلّم) ہے۔ وہ خوب ہی دیکھنے والا اور خوب ہی سننے والا ہے۔ ان (لوگوں) کا اس کے سوا

دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ؗ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝

کوئی بھی مددگار نہیں ہے اور وہ اپنے حکم (اور اپنے فیصلوں) میں کسی کو (اپنا) شریک نہیں بناتا اور

وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ؕ لَا مُبَدِّلَ

تیرے رب کی کتاب میں سے جو (حصہ) تجھ پر وحی (کے ذریعہ سے نازل) ہوتا ہے اسے پڑھ (کر لوگوں کو سنا) اس کی باتوں کو کوئی بھی

اور ڈاکٹر کٹو KITTO نے اپنی کتاب "ڈیلی بائبل السٹریشنز" میں ثابت کیا ہے کہ جو تاریخ مسیحی کلنڈر میں واقعہ صلیب کی دی گئی ہے وہ غلط ہے اور یہ غلطی ۵۲۶ء میں لگی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ سے صرف چار یا چھ سال پہلے مسیحؑ پیدا ہوئے تھے۔ پس اس وقت انکی عمر صرف چار سے چھ سال تک کی ہوتی ہے۔ لیکن وہ صلیب پر تینتیس سال کی عمر میں لٹکائے گئے تھے۔ اب اس بیان کے مطابق اگر چار اور چھ کی اوسط نکال لی جائے تو پانچ بنتی ہے۔ چونکہ مسیح کو صلیب تینتیسویں سال میں دیا گیا تھا اس لئے مسیحی سن میں سے اٹھائیس سال منہا کرنے پڑینگے کیونکہ مسیحی کلنڈر سے اٹھائیس سال بعد صلیب کا واقعہ ہوا ہے۔ اب اٹھائیس سال کو ۳۲۵ء میں سے نکالو تو پورے ۳۰۹ سال ہوتے ہیں۔ یہ تو مسیحی روایات کو صحیح تسلیم کر کے ہے ورنہ اگر یہ شہادت نہ بھی ہوتب بھی قرآن کریم جس کی سب خبریں بائبل کے مقابل میں صحیح ثابت ہوتی ہیں اسکی بات کو بہرحال مقدم رکھنا ہوگا۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ لمبے مصائب سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ہم سے پہلے مسیحی جماعت کو تین سو نو سال تک دکھ دئے گئے۔ لیکن انہوں نے صبر سے کام لیا اور آخر اس صبر کا نہایت شیریں پھل کھایا۔ پس تم کو جلدی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے اور استقلال سے مصائب کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

۲۳ ۵حل لغات۔ اَلْغَیْبُ۔ غَیْبٌ غَابَ کا مصدر ہے اور غیب کے معنے کے لئے دیکھو رعد ۱۰ ۵

اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ۔ دونوں فعل تعجب ہیں۔ یعنی وہ کیا ہی خوب دیکھنے والا ہے۔ اور کیا ہی خوب سننے والا ہے۔

تفسیر۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کہہ کر بتایا کہ مسیحیوں کی تاریخیں اس بیان کی مخالفت کریں گی جیسے کہ ان کے ہاں ۳۲۵ء کی مدت لکھی ہے لیکن ان کی بات کا اعتبار نہ کرنا اللہ جانتا ہے کہ ان کی غلطی ہے۔ چنانچہ بعد کی تحقیق نے ان کی غلطی ثابت بھی کر دی۔

اگر کہا جائے کہ اس جگہ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا آیا ہے اس سے تو پتہ لگتا ہے کہ پہلی بات غلط تھی اس کا جواب یہ ہے کہ اگر پہلا قول لوگوں کا ہوتا تو اس فقرہ سے اس کی تردید نکلتی۔ لیکن پہلی آیت میں چونکہ کفار کا قول نقل نہیں کیا بلکہ بغیر ان کے حوالہ کے زمانہ بتایا ہے اس لئے اس جملہ سے تردید نہیں نکلے گی بلکہ تاکید نکلے گی اور مطلب یہ ہوگا کہ اس زمانہ کے بارہ میں لوگ اختلاف کریں گے مگر وہ غلطی پر ہوں گے صحیح زمانہ یہی ہے۔

اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ۔۔ وہ خوب دیکھنے والا اور سننے والا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا بیان درست ہے دوسروں کا نہیں۔ نیز ان الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا

لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○ وَاصْبِرْ

تبدیل کرسکنے والا نہیں، اور اسے چھوڑ کر تو کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائے گا ۲۷ اور اپنے آپ کو

نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ

ان لوگوں کے ساتھ رکھ جو اپنے رب کو اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے

وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ

صبح و شام پکارتے ہیں اور ورلی زندگی کی زینت چاہتے

عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ

ہوئے تیری آنکھیں ان سے آگے نہ بڑھیں۔ اور جس کے دل کو

کہ انسانوں کے حالات کو اللہ تعالےٰ خوب جانتا ہے جب تک انسان شرک سے پاک رہیں وہ ان کی مدد کرتا ہے جب شرک میں مبتلا ہو جائیں اللہ تعالیٰ کی نصرت جاتی رہتی ہے۔

۲۷ حل لغات

اُتْلُ — اُتْلُ: تَلَا يَتْلُوْ سے امر کا صیغہ ہے اور تلا الکلام تلاوۃً کے معنے ہیں قرأہٗ۔ اس کو پڑھا (اقرب) پس اُتْلُ کے معنے ہیں پڑھ۔

الملتحد — اَلْمُلْتَحَدُ: الملجأ۔ پناہ گاہ (اقرب)

تفسیر:۔ اس آیت میں یہ مضمون آکر کھول دیا کہ اس واقعہ کو ہم بطور قصہ نہیں بیان کر رہے بلکہ اسی طرح تیری امت کے ساتھ بھی ہونے والا ہے اور یہ بھی کہ جو مضمون اوپر بیان ہوا ہے اس کے بعض حصے پیشگوئی کے طور پر ہیں اور بعض اخبار صادقہ ہیں۔ اس مضمون کا اشارہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ کے الفاظ سے نکلتا ہے اگر یہ پیشگوئی نہ ہوتی تو یہ کیوں فرماتا کہ خدا کی باتوں کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ سابق کے واقعات کے بدلنے یا نہ بدلنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ پس اس آیت نے میری اوپر کی تفسیر کی تصدیق کر دی ہے اور اس سے ظاہر

اصحاب کہف کا واقعہ بطور پیشگوئی ہے۔

ہوتا ہے کہ جنہوں نے اوپر کی آیات کو صرف ماضی کا ایک واقعہ سمجھا ہے انہوں نے غلطی کی ہے۔ ان میں کچھ سابق کے واقعات ہیں اور کچھ اصحاب کہف کے قائم مقاموں اور ان کی آئندہ نسل کے متعلق پیشگوئیاں ہیں۔

ایک اور رنگ میں بھی یہ آیات پیشگوئیوں پر مشتمل ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس قصہ کے بتانے میں یہ بھی حکمت ہے کہ ایسے ہی واقعات مسلمانوں کے ایک حصہ کو بھی پیش آنے والے ہیں۔ یعنی ان کو بھی اللہ تعالےٰ کے کلام پر ایمان لانے کی وجہ سے تکالیف دی جانے والی ہیں۔ چنانچہ اس کی تصدیق حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے آپ فرماتے ہیں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحابُ الکھفِ اَعْوَانُ المَھْدِی (در منثور بحوالہ ابن مردویہ) یعنی اصحاب کہف مہدی کے مرید اور اس پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔ اب اس کے یہ معنے نہیں کہ پہلے کوئی اصحاب کہف نہیں گذرے۔ کیونکہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اصحاب کہف کی ہڈیاں تک دیکھی ہیں (جیسا کہ اوپر روایت گذر چکی ہے) بلکہ اس کے صرف

مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ

ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہو اور اس نے اپنی گری ہوئی خواہش کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہو

اَمۡرُهٗ فُرُطًا ○ وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ فَمَنۡ شَآءَ

اس کی فرمانبرداری مت کر ۲۵؎ اور (لوگوں کو) کہدے کہ) یہ سچائی تیرے رب کی طرف سے ہی نازل ہوئی ہے پس جو چاہے

یہ معنے ہیں کہ اصحاب کہف کا سا معاملہ مہدی پر ایمان لانے والوں سے بھی گذرے گا اور ان کو بھی خدا کے کلام پر ایمان لانے کی وجہ سے تکالیف دی جائیں گی۔

۲۵؎ حل لغات ۔ وَاصۡبِرۡ: صَبَرَ سے امر کا صیغہ ہے۔ اور صَبَرَ نفسہٗ علی کذا کے معنے ہیں حَبَسَھَا۔ نفس کو کسی بات پر روکے رکھا (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو رعد ۲۳؎۔

الغَدٰوۃ: الغداۃ کے معنے صبح۔ صبح کی نماز سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک کا وقت۔ اس کی جمع غُدُوٌّ ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو رعد ۱۶؎۔

العشیّ: اٰخر النَّھارِ وقیل مِنۡ صَلٰوۃ المغرب الی العَتَمَۃ۔ دن کے آخری حصہ کو عشی کہتے ہیں بعض کے نزدیک مغرب سے عشاء تک کا وقت عشی کا ہے (اقرب) اَلۡوَجۡهُ۔ نفس الشیءِ۔ خود ہی چیز۔ الوجہ من الدھر: اوّلہٗ۔ زمانہ کی ابتداء۔ سیّدُ القَوۡمِ۔ قوم کا سردار۔ اَلۡجَاہُ۔ عزت۔ اَلۡجِہَۃُ: طرف۔ ما یتوجہ الیہ الانسانُ من عَمَلٍ وغیرہٖ مطمح نظر۔ القصدُ والنیّۃُ۔ قصد اور ارادہ۔ المرضاۃ: رضامندی (اقرب)

لَا تَعۡدُ: عَدَا (یَعۡدُوۡ وعدوًا) سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے اور عَدَّی فلانًا عن الامرِ کے معنے ہیں صَرَفَهٗ وشغلہ۔ اس کو کسی کام سے ہٹایا اور روکے رکھا۔ عَدَا الاَمۡرَ وعَنِ الاَمۡرِ جَاوَزَہٗ وتَرَکَہٗ۔ کسی کام کو ترک کر دیا اور چھوڑ دیا۔

اَغۡفَلۡنَا: اَغۡفَلَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور اَغۡفَلَ الشیءُ بمعنے غفل عَنۡہ (ترکہ وسھا عنہ) کسی چیز کو ترک کر دیا۔ اور اسے بھول گیا۔

اَلۡھَوٰی: ارادۃُ النفسِ۔ نفس کا ارادہ، خواہش۔ الھوٰی العشقُ یکونُ فی الخیرِ والشرِّ۔ کسی عمدہ یا بری چیز کی خواہش کی شدت الھوٰی محمُودًا کان او مذمومًا ثُمَّ غَلَبَ علی غیرِ المحمودِ۔ جس سے محبت کی جائے۔ خواہ وہ محبوب پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کا استعمال بُرے معنوں میں ہونے لگ گیا ہے۔ اور جب فلان اتَّبَعَ ھواہُ کا محاورہ بولتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگا رہا۔ اور یہ بول کر مذمت مقصود ہوتی ہے (اقرب)

فُرُطًا: الفُرُطُ: الظلمُ والاعتداءُ: ظلم اور زیادتی۔ الامرُ المجاوزُ عن الحدِّ۔ حد اور اندازہ سے بڑھا ہوا۔ الامرُ المتروکُ چھوڑا ہوا کام۔ جیسے کہتے ہیں۔ کَانَ اَمۡرُہٗ فرطًا۔ وقیل اسرافًا وتضییعًا۔ اور بعض نے فرط کے معنے اسراف اور تضییع کے کئے ہیں (اقرب)

تفسیر:۔ اس آیت نے اوپر کے معنوں کو اور واضح کر دیا ہے۔ اس آیت کے مخاطب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں۔ بلکہ قرآن کریم کے پڑھنے والے وہ شخص ہیں جن کو اس زمانہ کے دیکھنے کا موقعہ ملے۔ ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو خود نمازیں پڑھایا کرتے تھے ان کو کس طرح کہا جا سکتا تھا کہ جو صبح وشام نمازیں

الھوٰی

اصبر

الغداۃ

العشی

الوجہ

فرطا

لا تعدُ

اس آیت کا مخاطب ہر قرآن پڑھنے والا ہے نہ کہ آنحضرت صلعم

فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ

(اس پر) ایمان لائے۔ اور جو چاہے (اس کا) انکار کر دے مگر یہ یاد رکھے کہ) ہم نے ظالموں کے لئے یقیناً ایک

نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا

آگ تیار کی ہے جس کی چار دیواری نے (اب بھی) انہیں گھیرا ہوا ہے اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ایسے پانی

بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ

سے انکی فریاد رسی کیجائیگی جو پگھلے ہوئے تانبے کیطرح ہوگا (اور) چہروں کو جھلس دیگا۔ وہ بہت بُری پینے کی چیز ہوگی۔

وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

اور وہ (یعنی آگ) بُرا ٹھکانا ہے ۲۶ (ہاں) یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک (اور مناسب حال) عمل کئے ہیں

بڑھ رہے ہیں توان کے ساتھ رہ۔

اصل میں یہاں یہ بتایا ہے کہ مسیحی اقوام کی ترقی کے وقت ایک ایسی جماعت ہوگی جو اسلام پر قائم ہوگی اور ان کے ساتھ لوگوں کو ملنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت کے مخاطب یقیناً وہ مسلمان ہیں جو اس زمانہ میں اسلام کی ترقی کو سیاسی اسباب کے ساتھ وابستہ قرار دیتے ہونگے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس غلطی میں مبتلا نہ ہونا بلکہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہوجانا جو صبح شام نمازوں میں دُعائیں کر رہے ہونگے اور اللہ تعالےٰ کے فضل کو دعاؤں کے ذریعہ سے بلا رہے ہونگے۔ پھر فرماتا ہے اس نمازی جماعت سے اپنی نظریں ہٹا کر اور طرف نہ لے جانا کیونکہ گو دنیا کی زینت اور اس کی ترقی کے سامان ان سے باہر ملینگے لیکن اس میں خدا تعالیٰ کی رضا تو حاصل نہ ہوگی۔ پس دنیاوی لالچوں کیوجہ سے اس بظاہر حقیر نظر آنیوالی جماعت کو حقیر مت جاننا اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرنا جو ذکر الٰہی اور تبلیغ سے غافل ہونگے اور ڈنڈے کے زور سے ان قوموں کو سیدھا کرنا چاہیں گے اور افراط و تفریط کی مرض اور سیاسیات کی ہوا و ہوس میں مبتلا ہوں گے۔

اس آیت میں اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس زمانہ میں تین باتیں مسلمانوں کے مصائب کا موجب ہونگی۔ ایک تو لوگ عبادات سے غافل ہوجائیں گے عبادت کیطرف توجہ نہ رہیگی دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کے دل میں دنیا کے اموال کی محبت بڑھ جائیگی۔ تیسری بات یہ ہے کہ عیش و عشرت کا بڑا زور ہوگا۔ ایسے وقت میں مومن کیلئے ضروری ہوگا کہ وہ عبادت میں مشغول رہے اور مال کیطرف رغبت نہ کرے اور اپنی جائز ضروریات پوری کرکے باقی حصہ مال کا دین کی اشاعت میں خرچ کرے۔

۲۶ حل لغات۔ سُرَادِق: کے معنے ہیں (۱) وہ سائبان جو صحن پر لگایا جاتا ہے (۲) پردہ یا قنات۔ یا خیمہ کے چاروں طرف کا پردہ (۳) کپڑے کا خیمہ (۴) غبار (۵) دھوئیں کا بگولہ (اقرب)۔ اَلْمُهْلُ: مہل سب معدنیات کو کہتے ہیں مثلاً چاندی لوہے وغیرہ کو (۲) پتلا تیل۔ سیال چیز جس میں جل اٹھنے کا مادہ ہوتا ہو (۳) زہر (۴) پیپ (۵) خصوصاً مُردہ کی پیپ (۶) پگھلا ہوا تانبا (۷) تیل (۸) تلچھٹ یعنی تیل کی میل جو اس کی تہ میں بیٹھ جاتی ہے (اقرب)۔ يَشْوِي۔ شَوٰی سے مضارع ہے اور شوی اللحمُ کے معنی ہیں جَعَلَهٗ مَشْوِيًّا گوشت کو بھونا۔ الماءَ اسخنَهٗ۔ پانی کو گرم کیا (اقرب)
مُرْتَفَقًا: المرتفق: ارتفق الرجلُ۔ طلب رفیقًا۔

الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ۝

(وہ بڑے اجر پائیں گے) جنھوں نے اچھے کام کئے ہوں ہم ان کا اجر ہرگز ضائع نہیں کیا کرتے ۝

اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ

ان لوگوں کے لئے دائمی رہائش کے باغات (مقدر) ہیں (ان میں) ان کے (اپنے انتظام کے) نیچے

الۡاَنۡہٰرُ یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ وَّ

نہریں بہتی ہوں گی ان کے لئے ان میں سونے کے کنگنوں کی قسم کے زیور بنوائے جائیں گے

یَلۡبَسُوۡنَ ثِیَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ

وہ باریک ریشم کے اور موٹے ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے۔

اس نے کسی ساتھی کی تلاش کی۔ اِسۡتَعَانَ - مدد مانگی۔ اِتَّکَاُ علی مرفقٍ وقیل علی مخدۃٍ۔ کہنی یا تکیہ پر ٹیک لگائی۔ اِرۡتَفَقَ الاناء - امتلأ۔ برتن (پانی وغیرہ سے) بھر گیا۔ ارتفق القومُ: ترافقُوا فی سفرٍ۔ لوگ سفر میں ایک دوسرے کے رفیق بنے۔ المرتفَقُ ارتفق سے اسم مفعول ہے اس کے معنے ہیں المتکأ۔ تکیہ اور سہارا لگانے کی چیز (اقرب)

تفسیر:- وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ - تو کہہ دے۔ کہ یہ بات جو میں نے بتائی ہے یعنی مسلمانوں کی ترقی اور ان قوموں کی تباہی۔ یہ ہو کر رہے گی۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ پیشگوئی ہے۔

فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ الآیۃ

یعنی دین کے معاملہ میں زبردستی تو ہے نہیں۔ جو شخص جس بات کو چاہے اختیار کرے وہ اپنے عمل کا نتیجہ بھگتے گا مگر جبراً نہیں منوایا جائے گا۔

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ جہاد کا زمانہ نہ ہوگا۔ بلکہ تبلیغ کا زمانہ ہوگا۔ لوگوں کے سامنے صداقت رکھنا مسلمانوں کا فرض ہوگا آگے کوئی مانے یا نہ مانے۔

کسی سے جنگ کرنی جائز نہ ہوگی۔

چونکہ یہ سوال ہوسکتا تھا کہ اگر جنگ اور جہاد نہ ہوگا تو مسلمانوں کی کمزور حالت کس طرح بدلے گی۔ اس کا جواب یہ دیا کہ ہم اس کے سامان خود پیدا کریں گے۔ یوروپین اقوام کو جنگ کا عذاب گھیر لے گا۔ اور گویا جنگ ان کے گھروں کے گرد خیمے لگالے گی۔ اور جس قدر وہ امن کے لئے کوشش کریں گے اور امن امن کہہ کے چلائیں گے۔ اسی قدر پگھلتا ہوا لوہا اور تانبا ان کے مونہوں پر ڈالا جائے گا۔ یعنی امن کی پکار تو ہوگی لیکن نتیجہ توپوں کے گولے اور بم ہی نکلے گا۔ اور ان کے ملک رہائش کے قابل نہ رہیں گے بلکہ بُرا ٹھکانا بن جائیں گے۔

یورپین اقوام کی تباہی جنگ کے ذریعہ مقدر ہے۔

ارتفق کے معنے تعاون اور رفاقت کے بھی ہوتے ہیں۔ ان معنوں کے رُو سے معنے یہ ہوں گے کہ قومیں امن کی خاطر دوسری قوموں سے دوستیاں کریں گی۔ لیکن ان دوستیوں کا نتیجہ جنگ ہی نکلے گا نہ کہ صلح۔

تفسیر: یعنی اس کے مقابل پر جو لوگ خدا کے کلام پر ایمان لائیں گے اور اس ایمان کے مطابق عمل کریں گے ان کے اجر ضائع نہ ہوں گے۔ یعنی باوجود

مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَ

ان (بہشتوں) میں آراستہ پلنگوں پر تکئے لگائے (ہوئے بیٹھے) ہونگے یہ کیا ہی اچھا اجر ہے اور

حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ

ع ۴ ۹ ۱۶

وہ بہت ہی اچھا ٹھکانا ہے ۵۲۸ اور تو ان کے سامنے ان دو شخصوں کی حالت بیان

اس کے وہ ظاہر شان وشوکت سے محروم ہوں گے پھر بھی ان کے اعمال آہستہ آہستہ دنیا میں امن کی صورت پیدا کرتے چلے جائیں گے۔

یحلّون

۵۲۸ حل لغات۔ یُحَلَّوْنَ: حَلّٰی سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ یَحُلُّوْنَ ہے اور یُحَلَّوْنَ اس سے مجہول کا صیغہ ہے۔ اور حلّی المرأۃ تحلیۃ کے معنے ہیں البسہا حلیًا۔ عورت کو زیور پہنائے (اقرب)

ثیابًا

ثِیَابًا: ثوب کی جمع ہے اور ثوب کے معنے ہیں۔ اللباس من کتان وقطن وصوف وخز وفراء۔ روئی۔ اُون۔ ریشم۔ پوستین وغیرہ کے کپڑے (اقرب)

سندس

سُنْدُس: کے معنے ہیں نہایت باریک اور نفیس ریشمی کپڑا یا دیبائے نازک۔ اور کلیات میں اس کے معنی ریشمی گدیلے اور بستروں کے کئے ہیں (اقرب)

استبرق

اِسْتَبْرَق۔ الدیباج الغلیظ: موٹا ریشم۔ اسے معرب یعنی غیر عربی زبان کا قرار دیا گیا ہے (اقرب)

اَلْاَرَائِكُ۔ اَرِیْکَۃ کی جمع ہے اور اریکۃ کے معنے ہیں۔ سریرٌ منجدٌ مزیّنٌ فی قُبَّۃٍ اَوْ بیت۔ ایسا مزیّن تخت جو کسی قبہ یا خیمہ میں لگایا گیا ہو۔ (اقرب)

سونے کے کڑے اور ریشمی کپڑے پہننے سے مراد

تفسیر:۔ سونے کے کڑوں پر اعتراض ہوتا ہے کہ مردوں کے لئے سونے کے کڑے پہننے ناجائز ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تو اس سے مراد دنیا ہو تو اس سے مراد یہ لی جائے گی کہ ان کو بادشاہتیں ملیں گی۔ سونے کے کنگن پہننے سے مراد بادشاہت ہے۔ پرانے زمانہ میں سونے کے کنگن بادشاہ پہنا کرتے تھے۔ پس یہاں بتایا ہے کہ مسلمانوں کو بادشاہ بنایا جائے گا اور اگر اس سے مراد اگلا جہان ہو تو اس جہان کی ہر شئے روحانی ہے۔ وہاں سونے کے کڑوں سے مادی سونے کے کڑے مراد نہیں ہو سکتے۔ بلکہ خاص قسم کے اعزاز مراد لئے جائیں گے۔

مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ۔ یعنی جیسے ریشمی کپڑا پہننے سے آرام اور لذت محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح وہاں بھی ایسا لباس ملے گا جس سے لذت اور آرام محسوس ہوگا اور اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ چیزیں جن کے لائق ہوں گی ان کو پہنائی جائیں گی۔ جیسے حضرت عمرؓ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک ریشمی کپڑا دیا تو انہوں نے کہا یارسول اللہ مجھے آپ نے یہ کیسے دیا۔ مردوں کے لئے تو ریشم پہننا ناجائز ہے اس پر آنحضرت صلعم نے فرمایا تم اسے اپنی بیوی کو پہنا سکتے ہو۔

نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا۔ یعنی قرآن کریم پر سچا ایمان لانے والوں کو جو انعامات ملیں گے وہ تباہی کی طرف نہ لے جائیں گے بلکہ ان کے نتیجہ میں امن اور اطمینان پیدا ہوگا اور حسنت مرتفقا سے یہ بتایا۔ کہ قرآنی تعلیم پر چل کر جو دوستیاں اور رفاقتیں ہوں گی وہ چونکہ اخلاص پر مبنی ہوں گی اور ذاتی اغراض ان کے پیچھے پوشیدہ نہ ہوں گی۔ ان دوستیوں کے نتیجہ میں لڑائیاں نہیں ہوں گی بلکہ امن حاصل ہوگا ؎

جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا

کہ جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیئے تھے۔ اور انہیں ہم نے کھجوروں کے درختوں

بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ

سے ہر طرف سے) گھیر رکھا تھا۔ اور ہم نے ان کے درمیان کچھ کھیتی (بھی) پیدا کی تھی۔ ان دونوں باغوں نے اپنا (اپنا)

اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا

پھل (خوب) دیا۔ اور اس میں سے کچھ (بھی) کم نہ کیا۔ اور ان کے درمیان ہم نے ایک نہر جاری کی

نَهَرًا ۝ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ

(ہوئی) تھی لٰلہ اور اسے بہت پھل حاصل (ہوتا) تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے ساتھی کو اس سے باتیں

لٰلہ حل لغات وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا کے معنی ہیں ان کے سامنے مثال بیان کر مزید تشریح کے لئے دیکھو ابراہیم ۲۵

جنّتین: جنۃ کا تثنیہ مزید تشریح کے لئے دیکھو رعد

حففنٰهما حففنا۔ حفّ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور حفّہ القومُ وبہ وحوالیہ کے معنی ہیں اَحْدَقوا بہ اطافوا واستداروا لوگوں نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا اور اسکے گرد حلقہ بنا لیا (اقرب) پس حَفَفْنٰهُمَا کے معنی ہوں گے۔ کہ ان دونوں کو ہم نے گھیر رکھا تھا۔

ولم تَظْلِمْ منہ شیئاً۔ تظلم ظلم سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور ظلمہ فلاناً حقہ کے معنی ہیں نَقَصَہ اِیّاہ اسے اس کے حق سے کم دیا۔ اور لَمْ تَظْلِمْ منہُ شیئاً کے معنی ہیں لم تنقص۔ کہ اس سے کچھ بھی کم نہ دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اکثر مفسرین کا خیال ہے۔ کہ یہ ایک مثال ہے۔ جنہوں نے اس کو واقعہ کہا ہے۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں۔ کہ دو آدمی یہودیوں سے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عرب میں سے تھے۔ لیکن دو باغ کی حیثیت والا کوئی آدمی اس رتبہ کا نہیں سمجھا جا سکتا جس کا ذکر تاریخ میں کیا جائے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یا تو یہ تسلیم کیا جائے۔ کہ اس قسم کے فخریہ کلمات دنیا میں اور کوئی شخص نہیں کہتا بس اسی شخص نے کہے تھے۔ اور یا یہ تسلیم کیا جائے۔ کہ اس زمانہ میں دنیا بھر میں کوئی درخت نہ تھے بس ایک اس شخص کے دو باغ تھے۔ اس لئے اس کے واقعہ کو تاریخ میں محفوظ رکھا گیا۔

اس مثال کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سے ہمیں کچھ سمجھانا مقصود ہے۔ ورنہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

میرا خیال ہے کہ الٰہی کتابوں میں جب کوئی ایسی مثال ہو جو ادبی نہ ہو بلکہ اس میں کسی باریک مضمون کی طرف اشارہ ہو تو اس کی حقیقت معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ یہی ہے۔ کہ اپنی عقل سے کام لینے کی بجائے ہم تعبیر رویاء کے علم سے مدد لیں۔ کیونکہ خواب بھی ایک تمثیلی زبان ہے اور ضروری ہے کہ دونوں قسم کی تمثیلیں جن کا منبع ایک ہے آپس میں مشابہت رکھتی ہوں۔

حففنٰهما

لم تظلم

باغ کی تشریح ہم دنیاوی لحاظ سے مال و دولت
سے کر سکتے ہیں۔ اور درختوں سے یہ مراد لے سکتے ہیں کہ
باغ کی تشریح
وہ کھیت کی حفاظت کرتے تھے۔ کیونکہ زمینداروں کے
کھیت کی حد بندی درختوں سے اچھی طرح ہوسکتی ہے۔
بے شک یہ بھی ایک تعبیر ہے۔ جو ہم اپنے ذہن سے
کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم کیوں نہ علم تعبیر سے مدد لیں۔ اور
پھر قرآن کریم کو دیکھیں۔ کہ کیا وہ ان معنوں کی تصدیق
کرتا ہے یا نہیں۔

علم تعبیر الرؤیا میں باغ دیکھنے کے متعلق لکھا ہے:
وَرُبَّمَا دَلَّ الْبُسْتَانُ عَلَى الزَّوْجَةِ وَالْوَلَدِ وَالْمَالِ
وَطِيْبِ الْعَيْشِ وَزَوَالِ الْهُمُوْمِ وَرُبَّمَا دَلَّ عَلَى
دَارِ السُّلْطَانِ الْجَامِعَةِ لِلْجُيُوْشِ وَالْجُنُوْدِ
(تعطیر الانام) یعنے اگر کوئی خواب میں باغ
دیکھے تو اس سے مراد بعض دفعہ بیوی۔ اولاد۔ مال۔ زندگی
کے اچھے سامان غموں کا دور ہونا ہوتا ہے۔ اور بعض
دفعہ شاہی محل مراد ہوتا ہے جس میں فوج اور لشکر جمع ہوتے
ہیں یعنی چھاؤنیاں یا ہیڈکوارٹرز۔ اور انگور خواب میں
دیکھنا رزق حسن پر دلالت کرتا ہے۔ اور ایسے دائمی و
وسیع رزق پر جس کا ذخیرہ رکھا جائے۔ اور اس نفع پر جو لوگوں
کے ذریعے پہونچے (تعطیر الانام)

کھجور کی تعبیر
کھجور کے متعلق لکھا ہے کہ مَنْ مَلَكَ نَخْلًا كَثِيْرًا
فَإِنَّهُ يَتَوَلَّى عَلَى رِجَالٍ بِقَدْرِ ذَالِكَ وَإِنْ كَانَ تَاجِرًا
ازْدَادَ تِجَارَتُهٗ (تعطیر الانام) یعنی جو خواب میں دیکھے
کہ وہ کھجور کا مالک ہوا تو اسی تعداد میں آدمیوں پر وہ
حکومت کریگا اور اگر وہ تاجر ہو تو اس کی تجارت میں
زیادتی ہوگی۔ پھلوں کے متعلق لکھا ہے اَلْاَثْمَارُ كَرَامَةٌ
جَدِيْدَةٌ طَرِيَّةٌ یعنی تازہ بتازہ عزت کے سامان۔
وَمَنْ رَأَى أَنَّهٗ زَرَعَ فِي أَرْضٍ فَهُوَ لِلسُّلْطَانِ
سَعَةٌ فِي مَمْلَكَتِهٖ وَالزَّرْعُ يَدُلُّ عَلَى الْعَمَلِ یعنی
جو دیکھے کہ اس نے کسی زمین میں کھیتی کی ہے۔ تو اگر وہ
بادشاہ ہے تو اس کی حکومت وسیع ہوگی۔ اور باقی لوگوں
کے لئے کھیتی سے مراد عمل ہوتا ہے۔

نہر کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے مراد ذی شان
انسان ہوتا ہے۔ (تعطیر الانام) اسی طرح لکھا ہے۔ کہ جو
خواب میں دیکھے کہ اس کے گھر سے نہر نکلی ہے۔ اس کی
تعبیر یہ ہوگی۔ کہ وہ نیک تعلیم دے گا جس سے لوگ فائدہ
اٹھائیں گے۔

تو اب معنی یہ ہوں گے کہ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا
جَنَّتَيْنِ ہم نے ان میں سے ایک کے لئے دو باغ بنائے
تھے یعنی مال اور اولاد عطا کی تھی۔ اور من اعناب کے
معنی دائم رہنے والے کے بھی ہیں پس مراد یہ ہے۔ کہ
ان کے مال اور اولاد کی ترقی لمبی ہوگی۔ چنانچہ قرآن کریم
اس کی تصدیق کرتا ہے۔ جیسا کہ آگے فرمایا انا اکثر
منك مالا واعز نفرا۔ کہ میں مال اور تعداد میں تجھ
سے زیادہ ہوں۔ حالانکہ پہلی آیات میں تعداد کا کوئی ذکر
ہی نہ تھا وحففنٰهما بنخل پہلے بتایا جا چکا ہے۔
کہ نخل سے مراد آقا کے غلام ہوتے ہیں۔ پس انگور کے
باغ کا احاطہ نخل سے کرنے کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ فوجی طاقت
سے وہ اپنے مال اور اولاد اور ملک کی حفاظت کریگا۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا۔ زرع کے معنی عمل کے ہوتے
ہیں۔ پس دونوں باغوں کے درمیان عمل ہوگا کے یہ معنی ہونگے
کہ ادھر بھی بادشاہت ہوگی۔ جس کی حفاظت فوجیں کر رہی ہوں گی
اور ادھر بھی بادشاہت ہوگی جس کی حفاظت فوجیں کر رہی ہونگی۔ اور ان دونوں کے درمیان زراعت
ہوگی یعنی درمیان میں معمولی حیثیت کی جائداد ہوگی جو بے حفاظت ہوگی۔

وکلتا الجنتين اتت اکلها یعنی یہ دونوں باغ اپنے
اپنے وقت پر پھل دیتے رہے۔

وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا۔ اور کبھی انہوں نے اپنے پھل
دینے میں کمی نہیں کی۔

یہ عبارت بھی بتا رہی ہے۔ کہ اس جگہ باغ تمثیلی ہیں
معروف باغ مراد نہیں۔ کیونکہ یہ قانون قدرت ہے کہ کبھی

یُحَاوِرُہٗۤ اَنَا اَکۡثَرُ مِنۡکَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَ دَخَلَ

کرتے ہوئے (فخریہ طور پر) کہا (کہ دیکھ) تیری نسبت میرا مال زیادہ اور جتھا معزز ہے ۳۵ اور (ایک دفعہ)

کسی سال زیادہ آتا ہے کسی سال کم آتا ہے۔ نیز اس آیت سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ گو دو باغوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن باوجود ان کے ایک جہت سے دو ہونے کے دوسری جہت سے وہ ایک ہی تھے۔ کیونکہ ان باغوں کے لئے ضمیر مفرد کی استعمال کی ہے۔ یعنی اٰتَتَا کی جگہ اٰتَتْ فرمایا ہے۔ اور لَمْ تَظْلِمَا کی جگہ لَمْ تَظْلِمْ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور یہ دونوں واحد مونث کے صیغے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس فرق سے یہی مضمون پیدا کرنا مقصود ہے کہ بظاہر دو باغ ہیں۔ لیکن اصل میں ایک ہی باغ ہے۔ یا یوں کہو کہ ایک باغ کے دو حصے ہیں (اس میں کوئی شک نہیں کہ کلتا کی طرف لفظاً ضمیر واحد مونث بھی پھرائی جا سکتی ہے۔ لیکن معناً ضمیر تثنیہ کی آنی چاہیئے جیسا کہ علامہ بیضاوی نے لکھا ہے۔ وفی الحاشیۃ السعدیۃ فانہ اسم مفردا للفظ عند البصریین ومثنی المعنی ومثنی لفظاً ومعنی عند البغدادیین (تفسیر بیضاوی زیر آیت کلتا الجنتین) کہ حاشیہ سعدیہ میں ہے کہ بصریوں کے نزدیک کلتا کا لفظ بلحاظ معنی تثنیہ ہے۔ اور بلحاظ لفظ کے مفرد ہے مگر بغدادیوں کے نزدیک کلتا لفظاً اور معناً دونوں طرح تثنیہ ہے۔

القنوی علی البیضاوی میں لکھا ہے۔ کہ حریری نے دُرّۃ الغواص میں کہا ہے۔ کہ یقولون کلا الرجلین خرجا وکلتا المرأتین حضرتا۔ یعنی عرب کِلَا اور کِلْتَا کے بعد فعل تثنیہ لاتے ہیں۔

پس بغدادی ائمہ لغت کے مذہب کی بنا پر تو قرآنی آیت میں اٰتَتَا آنا ضروری تھا۔ اور حریری کے قول کے مطابق بھی اسی کو ترجیح حاصل ہے۔ صیغہ تثنیہ کا لانا بہرحال جائز تو ہے پس میرا استدلال یہ ہے کہ اول تو تثنیہ کا صیغہ استعمال کرنا انسب تھا کم سے کم جائز تھا۔ اور لفظی طور پر انسب کو چھوڑ کر دوسرے طریق کو اختیار کرنا قرآن کریم کے مسلمہ اصول کے مطابق ضرور کوئی معنوی حکمت رکھتا ہے۔ اور اس کی مثالیں کثرت سے قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ کہ وہ جائز اور صحیح الفاظ اور صفائر کے انتخاب میں بھی حکمتوں اور نئے مضمونوں کو مدنظر رکھتا ہے۔

دونوں باغوں کیلئے واحد کی ضمیر لانے میں نکتہ

۳۵ حل لغات۔

ثمر کے لئے دیکھو ابراہیم ۳۳ یحاورہ۔ حاور سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور حاورہ (محاورۃً) کے معنی ہیں جاوبہ اس سے بات چیت کی۔ راجعہ فی الکلام اس کی بات کا جواب دیا (اقرب)

اعز۔ یہ عَزَّ سے اسم تفضیل ہے۔ اور عَزَّہٗ (یَعُزُّ۔ عَزًّا) کے معنی ہیں۔ قوّاہ۔ اس کی طاقت بڑھائی۔ اسے تقویت دی۔ غلبہ اس پر غالب آگیا۔ اور عَزَّ (یَعِزُّ عِزًّا) کے معنی ہیں صار عزیزًا وہ معزز ہو گیا زبردست ہو گیا قَوِیَ بعد ذلّۃ کمزور ہونے کے بعد طاقتور ہو گیا ضَعُفَ چونکہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ اس لئے اس کے معنی کمزور ہو جانے کے بھی ہیں۔ (اقرب)

نفرا۔ الناس کلھم تم لوگ من ثلاثۃ الی عشرۃ وقیل الی سبعۃ من الرجال تین سے دس مردوں تک کا گروہ اور بعض کے نزدیک تین سے سات اشخاص تک کے گروہ کو نفر کہتے ہیں (اقرب)

تفسیر۔ کان لہ ثمر۔ یعنی اس کی محنت کے بڑے بڑے نتیجے پیدا ہو رہے تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میرا مال تجھ سے زیادہ ہے۔ اور قوم کے لحاظ سے بھی تجھ سے زیادہ معزز ہوں۔

اب میں اس تمثیل کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔ سورۃ کے

شروع میں بتایا گیا تھا۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ والوں کو خدا کا پیغام پہونچایا۔ اور یہود کو پہونچانے والے ہیں۔ اسی طرح آپ مسیحیوں کو بھی بیدار کرنے والے ہیں۔ اور پھر مسیحی قوم کی ابتدائی تاریخ بتائی کہ یہ قوم ان حالات میں شروع ہوئی تھی۔ کہ توحید کے لئے انہوں نے سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ مگر بعد میں مشرک ہوگئی اور دُنیا کے پیچھے پڑ گئی۔

اس تمثیل میں باغ سے مراد مسیحی قوم ہے

اب اس تمثیل کے ذریعہ سے مسلمانوں اور مسیحیوں کے مقابلہ کا ذکر آتا ہے۔ اس تمثیل میں باغ والے سے مراد مسیحی قوم ہے۔ اور انگوروں کے باغ کی تمثیل اس لئے دی ہے۔ کہ مسیحی قوم کو انگور کا باغ خود حضرت مسیح ناصری نے قرار دیا ہے۔ اور اس باغ کی تمثیل ان آیات کی تمثیل سے ملتی ہے۔ حضرت مسیح کہتے ہیں۔ "ایک شخص نے انگور کا باغ لگایا۔ اور اس کے چاروں طرف گھیرا اور رَس کے حوض کی جگہ کھودی۔ اور ایک بُرج بنایا۔ اور اسے باغبانوں کے سپرد کرکے پردیس گیا۔ پھر موسم میں اس نے ایک نوکر کو باغبانوں کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ باغبانوں سے انگور کے باغ کے پھل میں سے کچھ لے۔ انہوں نے اسے پکڑ کے مارا۔ اور خالی ہاتھ بھیجا۔ اس نے دوبارہ ایک اور نوکر کو ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے اس پر پتھر پھینکے۔ اس کا سر پھوڑا۔ اور بے حرمت کرکے پھیر بھیجا پھر اس نے ایک اور کو بھیجا۔ انہوں نے اسے قتل کیا۔ پھر اور بہتیروں کو ان میں سے بعضوں کو پیٹا اور بعضوں کو مار ڈالا۔ اب اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو اس کو پیارا تھا۔ آخر کو اس نے اسے بھی اس کے پاس یہ کہہ کے بھیجا۔ کہ وے میرے بیٹے سے دبیں گے۔ لیکن ان باغبانوں نے آپس میں کہا یہ وارث ہے۔ آؤ ہم اسے مار ڈالیں۔ تو میراث ہماری ہو جائے گی۔ اور انہوں نے اسے پکڑ کر قتل کیا۔ اور انگور کے باغ کے باہر پھینک دیا۔ پس باغ کا مالک کیا کریگا۔ وہ آویگا اور ان باغبانوں کو ہلاک کرکے انگوروں کا باغ اوروں کو دیگا۔ کیا تم نے یہ نوشتہ نہیں پڑھا۔ کہ وہ پتھر جسے معماروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔" (مرقس باب ۱۲، آیت ۱ تا ۱۰)

اس تمثیل میں حضرت مسیح نے مذاہب کو انگور کے باغ سے تشبیہہ دی ہے۔ اور باغ کا مالک خدا تعالےٰ کو بتایا ہے۔ باغ کے متعلق وہی تشریح ہے جو قرآن کریم میں ہے۔ کہ بیچ میں انگور اور چاروں طرف باڑ۔ صرف یہ فرق ہے۔ کہ قرآن کریم نے باڑ کے درختوں کا نام بھی بتایا ہے جس سے زائد معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ غرض حضرت مسیح نے نبیوں کی مخاطب امتوں کو باغ بتایا ہے۔ اور ان کی نگرانی کرنے والے علماء اور بادشاہوں کو مالی۔ وہی معنی قرآن کریم میں ہیں۔ باغ سے مراد عیسائیت ہے اور انگور سے مراد مال اور دولت اور اولاد کی زیادتی ہے۔ اور کھجوروں سے مراد یہ ہے۔ کہ مسیحیت اپنی ترقی کے زمانہ میں فوجوں پر انحصار رکھے گی۔ اور اپنی حفاظت کے زبردست سامان کرے گی۔ اور باغ کو ایک لحاظ سے دو اور ایک لحاظ سے ایک اس لئے قرار دیا ہے۔ کہ سابق قوموں کے برخلاف مسیحیت کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔ کہ اس کی ترقی دو زمانوں میں ہوئی ہے۔ ایک اسلام سے پہلے اس کی ترقی کا زمانہ تھا۔ اور دوسرا زمانہ اسلام کے تین سو سال بعد شروع ہوا اور سات سو سال میں جا کر تکمیل کو پہونچا۔ یعنی سترھویں صدی میں۔ ان ترقی کے دو زمانوں کے درمیان ان کی حالت زرع کی سی رہی۔ کہ وہ جانوروں کے پاؤں تلے روندے جانے اور اکھیڑے جانے کے خطرہ میں ہوتی ہے۔ اور ان دونوں زمانوں کے درمیان جو مسیحیت کے باغ کھلانے کے مستحق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک نہر چلا دی تھی یعنی اسلام کا زمانہ رکھ دیا تھا۔ جس نے مسیحی قوم کے دونوں باغوں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا تھا۔ ان دونوں زمانوں کے درمیان ایک عظیم الشان انسان پیدا ہوا۔ اور اللہ تعالےٰ نے امر معروف کا سلسلہ جاری کیا۔

جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ

وہ اپنی جان پر ظلم کرتے ہوئے اپنے باغ میں داخل ہوا۔ (اور وہ اس طرح کہ) اس نے (اپنے ساتھی سے) کہا۔

هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۙ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ

(کہ) میں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی تباہ ہو سکے اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ (موعود) گھڑی (کبھی) آنے والی ہے۔ اور اگر (بالفرض)

رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ○

مجھے میرے رب کی طرف لوٹا (بھی) دیا جائے۔ تو میں (وہاں بھی) یقیناً اس سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا ؏

پھر بتایا ہے کہ جب اسلام دنیا میں آ گیا۔ تو دو باغوں کے مالک نے یعنی عیسائی قوم کے لیڈروں نے مسلمانوں کو طعنہ دینا شروع کیا۔ کہ تمہاری کیا طاقت ہے۔ ہم کو تو غیر معمولی طور پر دو زمانوں میں حکومت ملی ہے۔ خصوصاً دوسرا زمانہ ترقی کا جو مسلمانوں کے زمانہ میں آیا۔ وہ تو بہت ہی شاندار ہوگا۔ اس پر انہیں خاص ناز ہوگا۔ کیونکہ اسی سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوگا۔

۳۱ حل لغات۔ تَبِیْد بَادَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور بَادَ (یَبِیْدُ۔ بُیُوْدًا) کے معنی ہیں ھَلَکَ کوئی چیز ہلاک ہوگئی (اقرب) پس ما اظن ان تبید ھذہ ابدًا کے معنی ہوں گے۔ کہ میں خیال نہیں کرتا کہ وہ کبھی تباہ و ہلاک ہو۔

تفسیر۔ اب فرماتا ہے کہ وہ اپنی حکومتوں اور شان و شوکت پر بہت ناز کریں گے اور سخت بے دین ہوں گے کیونکہ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ اور پھر ان کو یہ خیال ہوگا کہ ہماری حکومت کبھی تباہ نہ ہوگی۔ اس جگہ جنت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ باغ دو تھے۔ کیونکہ گو مسیحی قوم کو ناز اپنی پہلی تاریخ پر بھی ہے۔ مگر اصل ناز ان کو آخری زمانہ کی ترقی پر ہے۔ اور اسلام کے مقابل پر وہ اسی کو پیش بھی کرتے ہیں۔ اس لئے اب اس جگہ سے دو باغوں کا ذکر ترک کر کے سب مفرد کے صیغے ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ جنتین کی بجائے جنت کہنے سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ ان دونوں جنتوں کو ایک لحاظ سے ایک ہی سمجھنا چاہیئے کیونکہ درحقیقت یہ ترقی ایک ہی قوم کی ہے گو ایک وقفہ پڑ جانے کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ان معنوں کے رو سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ کِلْتَا کے لئے باوجود تثنیہ کی ضمیر کے استعمال کی اجازت ہونے کے جو مفرد کی ضمیر پھیری گئی ہے۔ اس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ کہ من حیث[1] وہ دونوں باغ ایک ہی باغ سمجھے جانے چاہئیں۔

۳۲ حل لغات۔ اَظُنُّ۔ ظَنَّ سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور ظَنَّ الشَّیْءَ کے معنی ہوتے ہیں عَلِمَهٗ کسی چیز کو جانا وَاسْتَیْقَنَهٗ۔ کسی چیز کے متعلق یقین کر لیا۔ وَتَاْتِیْ ظَنَّ لِلدَّلَالَۃِ عَلَی الرُّجْحَانِ۔ اور بعض اوقات راجح خیال کو ظاہر کرنے کے لئے بھی ظنّ کا فعل استعمال کرتے ہیں۔ (اقرب) پس ما اظن کے معنی ہوں گے۔ میں یقین نہیں کرتا۔ میں نہیں سمجھتا۔

السَّاعَۃ کے لئے دیکھو سورۃ ۱۵ ؏

مُنْقَلَبًا۔ یہ اِنْقَلَبَ سے مصدر بھی ہے اور ظرف مکان بھی ہے اِنْقَلَبَ کے معنی ہیں اِنْکَبَّ الٹ گیا۔ رَجَعَ لوٹا (اقرب)

تفسیر۔ اس میں یہ اشارہ کیا ہے کہ اس قوم میں دو خیالات کے لوگ ہوں گے ایک تو وہ جو قیامت کے قائل نہ

تبیسد[1]

ظن[1]

[2] عیسائی قوم کو اپنی آخری زمانہ کی ترقی پر ناز ہوگا۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ

اس کے ساتھی نے اس سے سوال و جواب کرتے ہوئے کہا (کہ) کیا تو نے اس (ہستی) کا انکار کر دیا ہے۔ جس

خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًاؕ

نے تجھے (اولاً) مٹی سے (اور پھر نطفہ سے پیدا کیا۔ (اور) پھر اس نے تجھے پورا آدمی بنایا ۳۳ تمہارا

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝ وَلَوْلَاۤ

تو یہ حال ہے) لیکن (میں تو یہ کہتا ہوں کہ) حق تو یہ ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ ہی میرا رب ہے لیکن کسی کو بھی) اپنے رب کا شریک نہیں بناتا ۳۴

ہوں گے۔ سب کچھ اسی دنیا کو سمجھیں گے۔ اور دوسرا اگر وہ قیامت کا قائل ہوگا۔ مگر اس کا یہ خیال ہوگا۔ کہ اگلے جہان کے انعامات بھی انہی کے لئے مقرر ہیں۔ چنانچہ یہی حال مسیحیوں کا ہے۔ کچھ ان میں سے اس امر کے قائل ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں بلکہ قومی ارتقا کے معنی ہی جنت کے ہیں۔ اور یہ مسیحیوں کو مل گئی ہے۔ اور مل جائے گی۔ اور بعض بعث بعد الموت کے تو قائل ہیں۔ لیکن ان کا یہ خیال ہے کہ چونکہ مسیح نے ہمارے گناہ اٹھا لئے ہیں۔ اور دوسروں کے گناہ اٹھانے والا کوئی نہیں۔ اس لئے ہم تو نجات پا جائیں گے دوسرے سب لوگ دوزخ میں جائیں گے۔

نُطْفَة

۳۳ **حل لغات** - نطفة کے معنی کے لئے دیکھو نحل ۵

سَوّٰك

سَوّٰكَ رَجُلًا۔ سَوَّى الشَّيْءَ کے معنی ہیں جَعَلَهٗ سَوِيًّا کسی چیز کو ٹھیک اور مکمل بنا دیا (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر ۳۰ - پس سوّٰك رجلاً کے معنی ہوں گے تجھے پورا مکمل آدمی بنا دیا۔

تفسیر - یہ تمثیلی زبان میں مسلمانوں کی طرف سے جواب دیا ہے۔ یعنی اس مثال میں ایک اور بھی شخص تھا۔ اس نے اس تکبر کرنے والے کو نصیحت کی۔ اور کہا کہ کیا تم خدا تعالےٰ کا انکار کرتے ہو۔ جس نے تم کو پیدا کیا پھر ادنےٰ حالت سے ترقی دیکر کمال تک پہنچایا۔ یعنی تمہاری حالت عملاً اللہ تعالےٰ کے انکار کے مترادف ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ پر حقیقی ایمان رکھتے ہوئے کوئی ایسے خیالات نہیں رکھ سکتا جیسے کہ تمہارے ہیں۔

قرآن کریم کا یہ عام طریق ہے کہ جب کسی کو یہ کہنا ہے۔ کہ اپنی ترقی پر غرور نہ کر تو اس کی ابتدائی حالت کی طرف توجہ دلاتا ہے جس طرح مسلمانوں کو کہا ہے۔ کہ تم مایوس نہ ہو۔ یہ جو اس وقت کی ترقی یافتہ قومیں ہیں یہ بھی پہلے کمزور تھیں۔ اب عیسائیوں کو فرمایا۔ کہ تم یہ خیال نہ کرو۔ کہ مسلمان کمزور ہیں۔ تم اپنی پہلی حالت کو دیکھو کہ وہ کس قدر کمزور تھی۔ اور جسمانی پیدائش بھی انسان کی مٹی اور پھر نطفہ سے ہی ہوتی ہے۔

اس تمثیل میں دونوں اشخاص کی گفتگو کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ جس سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ ان دونوں قوموں میں مباحثات ہوں گے۔ اور مباحثات کے دوران میں مسیحی لوگ مسلمانوں کی کمزوری اور اپنی قوت کو اپنے سچا ہونے کی دلیل قرار دیا کریں گے۔

۳۴ **تفسیر** - یعنی میرا سہارا اور اطمینان اپنی تدبیر پر نہیں مجھے تو جو کچھ دے گا خدا تعالےٰ ہی دیگا۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ہمیں اسی نہ ہونے پر فخر ہے کہ تازہ بتازہ خدا تعالےٰ کے نشانات دیکھتے رہتے ہیں۔ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا میں کیا لطیف بات بیان فرمائی ہے

إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا

اور جب تو اپنے باغ میں آیا تھا تو کیوں نہ تو نے کہا (کہ وہی ہوگا) جو اللہ (تعالیٰ) چاہے گا (کیونکہ) اللہ (تعالیٰ) ہی (کے

بِاللَّهِ ۚ إِنْ تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ۝

فضل) سے ہر ایک قوت (حاصل ہوتی) ہے۔ اگر تو مجھ (ناچیز) کو اپنی نسبت مال اور اولاد میں کم سمجھتا ہے۔ تو بالکل ممکن ہے

فَعَسَىٰ رَبِّي أَنْ يُؤْتِيَنِ خَيْرًا مِنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ

کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے کوئی بہتر (باغ) دے دے۔ اور اس (تیرے باغ) پر اوپر سے کوئی آگ

عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحَ صَعِيدًا زَلَقًا ۝

کا شعلہ گرائے۔ جس کی وجہ سے وہ ایک صاف اور چٹیل میدان ہو جائے۔ ۳۶

کہ خدا تو نے لا نے تم کو دیا ہے۔ اور پھر تم اس کے ساتھ شریک ٹھیراتے ہو۔ لیکن خدا تعالےٰ نے مجھے دُنیا کا مال نہیں دیا۔ پھر بھی میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ٹھیراتا۔ یعنی شبہ تو مجھے ہو سکتا تھا۔ کہ شائد دو خدا ہوں۔ کہ تمہارے خدا نے تم سے حسن سلوک کیا۔ اور میرے خدا نے نہ کیا۔ مگر میں تو غربت میں بھی ایک ہی خدا کا ماننے والا ہوں۔

۳۵ تفسیر مسلمان کے دل میں پھر بھی ہمدردی ہے وہ اسے کہتا ہے۔ کہ کیوں تو نے باغ میں داخل ہوتے ہوئے یہ نہ کہا۔ کہ سب قوت اللہ تعالےٰ کو ہی ہے اور اپنے آپ کو طاقتور سمجھا۔

یہ جو فرمایا ہے مَا شَاءَ اللّٰہُ اس میں ما موصولہ ہے اور اس سے پہلے مبتدا محذوف ہے۔ جو اَلْاَمْرُ کا لفظ ہے۔ اور ترجمہ یہ ہے کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تھا تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے

اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْکَ مَالًا وَّوَلَدًا۔ اس جملہ کا مضمون اگلی آیت سے ملکر مکمل ہوتا ہے۔ اور درحقیقت دونوں آیتیں ملکر پورا مطلب دیتی ہیں۔ شرط تو اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔ اور جزا اگلی آیت میں۔

۳۶ حل لغات - حُسْبَانًا۔ حُسْبَان۔ حَسَبَ (یَحْسِبُ) کا مصدر ہے حَسَبَہٗ کے معنی ہیں عَدَّہٗ اسے شمار کیا۔ اور حُسْبَان کے معنی ہیں الحساب۔ حساب۔ العذاب۔ عذاب۔ البلاء والشر۔ آفت مصیبت۔ العجاجُ۔ غبار۔ الجراد۔ ٹڈی دل۔ النار۔ آگ (ملخص از اقرب) صعیدًا کے معنی کے لئے دیکھو سورۃ ہذا ۵

زَلَقًا۔ اَلزَّلَقُ موضع الزلق لا یثبت علیہ قدم پھسلنے کی جگہ جہاں پاؤں جم نہ سکے۔ اَرْضٌ زَلَقٌ ای مَلْسَاءُ لیس بھا شیٔ چٹیل میدان بے آب وگیاہ زمین (اقرب)

تفسیر - اس آیت میں بھی جنت کا لفظ جو ایک باغ پر دلالت کرتا ہے استعمال ہوا ہے۔ اور اس کے بعد یُرْسِلَ عَلَیْھَا فرمایا ہے عَلَیْھِمَا نہیں فرمایا۔ کیونکہ ایک باغ اسلامی زمانہ سے پہلے ہلاک ہو چکا تھا اس پر فخر تو اس رنگ کا تھا۔ جیسے کہ لوگ اپنے آباء کی بڑائی پر فخر کرتے ہیں۔ اصل فخر موجودہ زمانہ کے باغ پر ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اگر تو مجھے ادنیٰ حالت میں دیکھتا ہے۔ اور اس پر نازاں نہ ہو کیونکہ یہ بات ناممکن نہیں کہ میرا رب تیرے باغ سے بہتر باغ مجھے دے دے۔ اور

اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ○ وَ

یا اس کا پانی خشک ہو جائے (اور) پھر تو اس کی تلاش کی (بھی) طاقت نہ پائے (چنانچہ ایسا ہی ہوا) لکھ اور

اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ

اس کے (تمام) پھلوں کو تباہ کر دیا گیا۔ اور وہ اس حال میں کہ وہ (یعنی باغ) اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا تھا۔ اس (مال)

فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ

پر جو اس نے اس (باغ کی ترقی) کے لئے خرچ کیا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ ملنے لگا۔ اور کہنے لگا (کہ) اے

لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ○ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ

کاش میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا۔ اور (اس وقت) کوئی جماعت بھی اس کے ساتھ نہ ہوئی

صرف یہی نہیں بلکہ آسمانی عذاب نازل کرکے تیرے باغ کو جلا دے۔ اور تیرے ہمیشہ حکومت کرنے کے دعاوی دھرے کے دھرے رہ جائیں۔

اس جگہ صعیدًا زلقًا کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہیں جو شروع سورۃ میں خدا تعالےٰ کا بیٹا بنانے والوں کی نسبت آچکے ہیں جس سے ظاہر ہوگیا۔ کہ اس قوم کے متعلق اس جگہ مثال بیان کی گئی ہے۔

مِنَ السَّمَاءِ میں یہ بتایا ہے۔ کہ زمینی تدابیر سے اس قوم کا مقابلہ نہ ہوسکیگا۔ چنانچہ یاجوج ماجوج کے متعلق جو مسیحیت کی دنیاوی ترقی کے دو ظہور ہیں لکھا ہے۔ کہ لَا يَدَانِ لِاَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ (مسلم جلد ۲ باب ذکر الدجال) کہ ان سے لڑنے کی کسی کو طاقت نہ ہوگی۔ ان کا مقابلہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا۔

یاجوج ماجوج سے لڑنے کی کسی کو طاقت نہ ہوگی

۳۷ حل لغات غَوْرًا غَارَ الْمَاءُ غَوْرًا کے معنی ہیں ذَهَبَ فِي الْاَرْضِ وَسَفَلَ فِيْهَا پانی زمین میں جذب ہو کر نیچے چلا گیا۔ الغور غار کا مصدر ہے۔ نیز اس کے معنی ہیں المَاءُ الْغَائِرُ ایسا پانی جو زمین میں جذب ہو کر خشک ہو گیا ہو۔ (اقرب)

احیط

غوراً

تفسیر۔ اس آیت سے ظاہر ہوگیا کہ نہر سے مراد یہی باغ کا پانی نہ تھا۔ کیونکہ اس آیت کی نسبت فرماتا ہے کہ اس کے باغ کا پانی زمین میں ہی غائب ہو جائے۔ اور نہروں کا پانی زمین میں غائب نہیں ہوتا۔ بلکہ باہر سے آتا ہے۔ پس ان باغوں کا پانی الگ تھا۔ جو ان باغوں میں موجود تھا۔ اور اس کے زمین میں ہی غائب ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ یعنی اس قوم کی اندرونی طاقتیں تباہ ہو جائیں گی اور وہ ذہنی قوتیں جو پہلے باغوں کو آباد کرنے کا موجب تھیں خشک چشموں کی طرح ہو کر باغ کے اجڑنے کا موجب بن جائیں گی۔

۳۸ حل لغات۔ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ۔ اُحِيْطَ کے معنی ہیں۔ دَنَا هَلَاكُهٗ اس کی ہلاکت کا وقت آپہونچا۔ (اقرب) نیز جب محاورہ بولیں۔ اَلسَّنَةُ الْمُجْدِبَةُ تُحِيْطُ بِالْاَمْوَالِ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں تُهْلِكُهَا کہ قحط سالی نے مالوں کو تباہ کر دیا (تاج) پس احیط بثمرہ کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کے پھل کو تباہ کر دیا گیا۔

اَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ۔ اَیْ يَتَنَدَّمُ جب اصبح

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ

جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اس کی مدد کرتی۔ اور نہ وہ (اس کا کوئی) انتقام ہی لے سکا۔ اس موقع پر مدد اللہ

الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝

ع ۱۲ — ۵ — ۱۷

(تعالیٰ) کی ہی (مفید) ہوتی ہے۔ جو معبود حقیقی ہے۔ اور وہ بدلہ دینے میں (بھی) سب سے اچھا ہے۔ اور اچھا انجام (پیدا کرنے) میں (بھی) سب سے اچھا ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ

اور تو ان کے سامنے اس ورلی زندگی کی حالت (بھی کھول کر بیان کر (کر وہ) اس پانی کی طرح (ہے) جسے ہم نے بادل سے

يُقَلِّبُ کا محاورہ بولیں تو یہ مراد ہوتی ہے۔ کہ وہ نادم ہو گیا (اقرب)

خَاوِيَةٌ۔ خَوٰی يَخْوٰی یا خَوٰی يَخْوِیْ سے اسم فاعل مونث کا صیغہ ہے۔ خَوَتِ الدَّارُ کے معنی ہیں اَقْوَتْ وَسَقَطَتْ وَتَهَدَّمَتْ مکان اجڑ گیا۔ گر گیا منہدم ہو گیا خَوِيَتِ الدَّارُ کے معنی ہیں خَلَتْ مِنْ اَهْلِهَا گھر رہنے والوں سے خالی ہو گیا۔ (اقرب)

عُرُوْشٌ۔ عَرْشٌ کی جمع ہے اور العَرْشُ مِنَ الْبَيْتِ کے معنی ہیں سقفہ گھر کی چھت (اقرب) پس خَاوِيَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا کے معنی ہوں گے۔ کہ وہ اپنی چھتوں پر گرا ہوا تھا ؛

تفسیر۔ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ یعنی جو نتائج پہلے ان کی محنتوں کے نکلتے تھے۔ پھر نہ نکلیں گے۔ اور وہ افسوس کرنے لگ جائیں گے کہ اس قدر روپیہ خرچ کر کے جو سامان تیار کئے تھے اب کسی کام کے نہیں رہے۔ جو اقوام دنیوی شان و شوکت پر روپیہ خرچ کرتی ہیں۔ ان کے اندر تباہی کے وقت سخت حسرت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ وہی عمارتیں جن پر وہ فخر کرتے تھے۔ اب ان کی مرمتیں بھی ان کے لئے مشکل ہو جاتی ہیں۔ لیکن جو قومیں اپنے اموال اپنی قوم کی علمی اور اخلاقی ترقی کے لئے خرچ کرتی ہیں۔ ان کا خرچ ان کے لئے کبھی حسرت کا موجب نہیں ہوتا۔ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا کہہ کر بتایا کہ ان میں بڑی بڑی عمارتیں تیار کرنے کا مرض ہو گا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا باغ کے لئے نہیں آ سکتا۔

اس وقت ان میں افسوس پیدا ہو گا کہ کیوں شرک کیا اور توحید کو قبول کر کے اور ناصح کی نصیحت کو مان کر ہم اس عذاب سے نہ بچ گئے۔

خاویۃ علی عروشہا میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ان پر ایسے عذاب آئیں گے۔ کہ شہر برباد ہو جائیں گے اور عمارتیں گرا دی جائیں گی۔

۴۵ حل لغات۔ الفئۃ۔ الطائفۃ گروہ الجماعۃ۔ جماعت (اقرب)

مُنْتَصِرٌ۔ اِنْتَصَرَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور اِنْتَصَرَ کے معنی ہیں اِنْتَقَمَ مِنْهُ اس سے انتقام لیا۔ اِنْتَصَرَ عَلَيْهِ استظہر اس پر غالب آیا (اقرب) پس مُنْتَصِرٌ کے معنی ہیں انتقام لینے والا۔

تفسیر یعنی اس قوم کو مسیح کی تائید پر بہت بھروسہ ہو گا۔ لیکن اس دن مسیح بھی ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔

۴۶ تفسیر اس آیت سے صاف ظاہر ہو گیا۔ کہ اس جگہ پیشگوئی کا ذکر ہے۔ کیونکہ فرماتا ہے۔ اس موقعہ پر حکومت اللہ تعالیٰ ہی کی ہو جائے گی۔ اور وہ ان لوگوں پر فضل کرے گا۔ جو اس کے موحد بندے ہوں گے۔ اور

مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ

برسایا پھر اس میں زمین کی روئیدگی مل گئی۔ پھر (آخر) وہ (دیکھو کہ) چورا بن گئی۔ جسے

هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

ہوائیں اڑاتی (پھرتی) ہیں۔ اور اللہ (تعالیٰ) ہر بات پر خوب قدرت رکھنے والا

مُّقْتَدِرًا ۝ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ

ہے مال اور بیٹے اس ورلی زندگی کی زینت ہیں۔ اور باقی رہنے والے نیک

الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ

(اور مناسب حال) کام جو ان چیزوں سے ملنے جائیں) تیرے رب کے نزدیک بدلے کے لحاظ سے

دنیا کی بجائے آخرت کی طرف توجہ کرنے والے ہوں گے۔

حل لغات۔ اِخْتَلَطَ بِہٖ: کے معنی ہیں اِمْتَزَجَ مل گیا (اقرب)

اختلط

الھشیمُ ھشیم کے معنی ہیں اَلْمَکْسُوْرُ ٹوٹا ہوا۔ نَبْتٌ یَابِسٌ مُتَکَسِّرٌ خشک شکستہ پودہ یابس کُلّ کَلَاءٍ شَجَرٍ۔ ہر خشک گھاس دو درخت (اقرب)

تذروہ

تَذْرُوْہُ ذرا سے مضارع مونث غائب کا صیغہ ہے۔ اور ذرت الرّیحُ التراب کے معنی ہیں فرّقتہ واطارتہ واذھبتہ ہوا نے مٹی کو اڑا کر بکھیر دیا (اقرب) پس تذروہ کے معنی ہوں گے اسے ہوائیں اڑاتی ہیں

مقتدرا

مُقْتَدِرًا۔ اِقْتَدَرَ (جو قدر سے نکلا ہے) سے اسم فاعل ہے اِقْتَدَرَ عَلَیْہِ کے معنی ہیں قَوِیَ عَلَیْہِ وتمکّن منہ۔ اس پر پوری قدرت پالی۔ اس پر قابو پالیا (اقرب) پس مقتدرا کے معنی ہوں گے خوب قدرت والا

سابق تمثیل کے مضمون کی مزید وضاحت

تفسیر۔ اس زندگی کی مثال میں سابق تمثیل کے مضمون کو ایک اور تمثیل سے واضح فرمایا گیا ہے۔ فرماتا ہے کہ دنیوی زندگی پہلے نہایت خوبصورت نظر آتی ہے۔ مگر اس کا انجام بڑا بدنما ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل دینی زندگی پہلے بظاہر بدنما ہوتی ہے۔ مگر اس کا انجام نہایت خوش شکل ہوتا ہے۔

جب مادی پانی آسمان سے اترتا ہے۔ تو کسی قدر سبزی اس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ٹہنیاں کثرت کی وجہ سے ایک دوسری میں گھسی جاتی ہیں۔ لیکن پھر سب سبزہ خشک ہوکر ہوا میں اڑتا پھرتا ہے۔ لیکن اس کے مقابل پر روحانی پانی سے جو کھیتی تیار ہوتی ہے۔ وہ کبھی بھی خشک نہیں ہوتی بظاہر اس مثال پر یہ اعتراض پڑتا ہے۔ کہ کھیتی تو خشک ہوکر ہی کھانے کے کام آتی ہے۔ مگر اس جگہ کھانے والے کی تمثیل نہیں دی کھیتی کی تمثیل دی ہے بتایا ہے کہ دنیادی ترقی کے وقت قومیں بہت لہلاتی نظر آتی ہیں۔ مگر زوال کے وقت ان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ اس کے برخلاف جو قومیں دین کی طرف توجہ کرتی ہیں۔ اگلے جہان میں تو ان کو عزت ملے گی سو ملے گی۔ اس دنیا میں بھی ان کی عزت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ نوح کی کوئی قوم باقی نہیں۔ مگر دیکھو نوح کی آج بھی عزت ہے یہی حال ابراہیم کا ہے۔ یہودی ذلیل ہوئے ہیں۔ مگر موسیٰ کی عزت بدستور ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی دنیاوی فتوحات جاتی رہیں۔ لیکن ان کی دینی خدمات کی

ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى

(بھی) بہتر ہیں۔ اور امید کے لحاظ سے (بھی) بہتر ہیں اور (اس دن بھی ان کے بہتر نتائج نمودار ہونگے) جس دن ہم ان پہاڑوں کو

الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۝

(اپنی اپنی جگہ سے) چلا دینگے اور تو سب (اہل) زمین (کو ایک دوسرے کے مقابل میں) نکلتا ہوا دیکھیگا۔ اور ہم ان (سب) کو اکٹھا کرینگے۔ اور ان میں کسی کو (بھی باقی) نہیں چھوڑینگے

وجہ سے آج بھی ان میں سے ادنیٰ سے ادنیٰ کے نام پر جانیں قربان کرنے والے لوگ موجود ہیں۔

۴۲ حل لغات۔ اَلْاَمَلُ کے لئے دیکھو حجر ۴۵

تفسیر۔ اس جگہ پر بھی تشریح فرما دی کہ نبات الارض سے کیا مراد ہے۔ پہلی تمثیل میں باغ بیان کرکے اس کی تشریح میں اس صاحب الجنۃ کا یہ قول بیان کیا تھا اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا کہ میرے پاس مال زیادہ ہے اور میری تعداد بھی زیادہ ہے۔ اس جگہ پر نبات الارض بیان فرماکر اس کی تعبیر میں فرمایا۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ جس سے ظاہر ہے کہ جنت سے یہی مراد تھی اس آیت میں بتایا ہے کہ مال اور اولاد بے شک دنیا کی زینت ہیں لیکن اگر انہیں صحیح طور پر استعمال کیا جائے یعنی دین میں مال خرچ ہوں۔ اور دین کی خدمت کے لئے اولاد لگا دی جائے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو بھی دوام بخش دیتا ہے روپیہ خرچ ہو جاتا ہے لیکن اس کا نیک اثر باقی رہ جاتا ہے۔ اولاد مر جاتی ہے لیکن ان کا ذکر خیر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ اور ان کی وجہ سے ان کے ماں باپ کا ذکر خیر بھی زندہ رہتا ہے۔

اَلْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ کُلُّ عَمَلٍ صَالِحٍ نیک اور اچھے کام باقیات صالحات کہلاتے ہیں۔

خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا اس کے دو معنی ہیں (۱) نیک کام کا دنیا میں نیک نتیجہ نکلتا ہے۔ اور اس کے متعلق آئندہ بھی اچھی امیدیں ہوتی ہیں گویا ثوابًا دنیا کے نتیجہ کے متعلق ہے۔ اور املاً آخرت کے متعلق ہے (۲)

ثوابًا سے مراد خود اس عمل کرنے والے کی ذات کے متعلق بہتر نتائج کا پیدا ہونا ہے۔ اور املاً سے مراد آئندہ نسل کے لئے بہترین امیدوں کا ہونا ہے مطلب یہ کہ نیک کاموں کا نتیجہ تم کو بھی نیک ملیگا۔ اور تمہاری اولادوں کو بھی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ نیک کی اولاد کو بھی فائدہ پہونچاتا ہے۔

۴۳ حل لغات۔ بَارِزَةً۔ بَرَزَ يَبْرُزُ بُرُوْزًا سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ بروز کے معنی ہیں خروج نکل آیا (اقرب) پس بارزۃ کے معنی ہوں گے نکلنے والی۔

بارزۃ

حشرناھم حشر سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور حشر کے لئے دیکھو سورۃ حجر ۲۵

لَمْ نُغَادِرْ۔ نُغَادِرُ۔ غادر سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور غَادَرَہٗ کے معنی ہیں تَرَکَہٗ وَاَبْقَاہُ اس کو چھوڑ دیا۔ اور باقی رکھا (اقرب) پس لَمْ نغادر کے معنی ہوں گے کہ ہم باقی نہیں رکھیں گے۔ ہم نہیں چھوڑیں گے۔

لم نغادر

تفسیر جبل کے معنی بڑے آدمی کے بھی ہوتے ہیں۔ اور سیّر کے معنی چلانے کے۔ اس جگہ جبال سے مراد بڑے لوگ ہی ہیں۔ کیونکہ اس جگہ آدمیوں کا ذکر ہے پہاڑوں دریاؤں کا ذکر نہیں۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ یہ سب پیشگوئیاں اس دن پوری ہوں گی۔ جب بڑے بڑے لوگ جنگوں کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔ اور تو ساری زمین کو یعنی سب اہل زمین کو دیکھیگا کہ جنگ کے لئے ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑے ہو جائیں گے۔ اور ایسی جنگ ہوگی کہ گویا ان میں سے ایک بھی نہ بچے گا۔

خیر عند ربک الخ کے دو معنی

وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا

اور وہ صف باندھے ہوئے تیرے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے (اور ان سے کہا جائیگا کہ) تم (اب) یقیناً (اسی طرح بے سروسامان) ہمارے پاس آئے ہو جس طرح

خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۫ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ

(کی حالت میں) ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا (اور تم یہ امید نہیں رکھتے تھے) بلکہ تمہیں دعویٰ تھا کہ ہم تمہارے لئے کوئی وعدہ (کے پورا ہونے)

مَّوْعِدًا ۝ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ

کی ساعت مقرر نہیں کرینگے [۴۴] اور (ان کے اعمال کی) کتاب (ان کے سامنے) رکھ دی جائے گی۔ پس (اے مخاطب) تو ان

مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ

مجرموں کو اس کی وجہ سے جو اس میں (لکھا) ہوگا۔ ڈرتے دیکھیگا۔ اور (اس وقت) وہ کہیں گے کہ اے (افسوس)

هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ

ہماری تباہی (سامنے کھڑی ہے) اس کتاب کو کیا (ہوا) ہے (کہ) نہ کسی چھوٹی بات کو اس کا احاطہ کئے بغیر

اس واقعہ کی طرف انجیل میں بھی اشارہ ہے حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ آخری زمانہ میں قوم قوم پر اور بادشاہت بادشاہت پر چڑھائی کرے گی۔" (متی باب ۲۴ آیت ۷)

الارض سے مراد اہل الارض

الْاَرْض سے مراد اہل ارض (اہل زمین) ہیں۔ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ بعض دفعہ مضاف کو محذوف کردیا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ یوسف میں آتا ہے وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا یہاں القریۃ اور العیر سے مراد اہل قریہ اور اہل عیر ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ الارض سے ادنیٰ طبقے کے لوگ مراد ہوں۔ اور الجبال سے مراد بڑے لوگ یعنی اس دن ایک طرف سے جبال یعنی بڑے لوگ یا دوسرے لفظوں میں ڈکٹیٹرز نکلیں گے۔ اور دوسری طرف سے ارض یعنی ڈیماکریسز کے حامی اور حکومت عوام کے نمائندے نکلیں گے۔ اور آپس میں خوب جنگ ہوگی

الارض الجبال سے مراد ڈکٹیٹرز اور ڈیماکریسز

حَشَرْنٰهُمْ۔ حشر کے معنی کھڑا کردینے کے ہوتے ہیں۔ اور حشر لشکر کے لئے بھی آتا ہے کیونکہ وہ بھی سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ فرمایا ہم ان سب کو ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑا کردیں گے۔ اور سب کو سزا دیں گے۔

[۴۴] **تفسیر**۔ وہ اپنے رب کے حضور صفیں باندھ کر کھڑے کئے جائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ان کے متعلق جاری کیا جائیگا۔ خدا کے حضور پیش ہونے میں باطنی صفیں ہی مراد ہے ظاہری صفوں کا ہونا مراد نہیں جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی تباہی کا فیصلہ کرتا ہے۔ تو وہ انکی قیامت ہی ہوتی ہے

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا تم ہمارے پاس آئے ہو۔ جیساکہ ہم نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ یعنی پھر تم ماتحت ہوگئے ہو کیا تمہارا خیال تھا کہ ہم نے تمہارے لئے کوئی وعدہ مقرر نہیں کیا تھا۔ یعنی تمہاری تباہی کا وقت مقرر نہ تھا۔

اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ یہ دوسری تمثیل پہلی کی شرح ہے کیونکہ پہلی تمثیل میں بھی یہ کہا گیا تھا مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا

أَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ

چھوڑتی ہے۔ اور نہ کسی بڑی بات کو۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا (ہوا) ہوگا۔ اُسے (اپنے سامنے) حاضر پائیں گے۔ اور تیرا رب

رَبُّكَ أَحَدًا ۝ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ

کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ۵۰ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو کہا تھا (کہ) تم آدم کے ساتھ (ساتھ) سجدہ کرو

فَسَجَدُوْٓا إِلَّآ إِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهٖ ۭ

تو انہوں نے (تو اس حکم کے مطابق) سجدہ کیا مگر ابلیس نے (نہ کیا) وہ جنوں میں سے تھا پھر اس نے اپنے رب کے حکم کی

أَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ

نافرمانی کی۔ تو کیا تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی نسل کو (اپنے) دوست بناتے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ظالموں

لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ مَآ أَشْهَدْتُّهُمْ

کے لئے وہ (یعنی شیطان خدا تعالیٰ کا) بدل ہونے کے لحاظ سے بہت ہی بُرا ہے ۵۱ میں نے انہیں نہ آسمانوں

(ع ۶ — ۱۸)

۵۰ حل لغات ۔ مُشْفِقِيْنَ ۔ أَشْفَقَ سے اسم فاعل مُشْفِقٌ آتا ہے۔ اور مشفقون اس کی جمع ہے اشفق علیه کے معنی ہیں خاف وحاذر ڈرا اور اس نے بچاؤ کیا (اقرب)

أَحْصٰهَا ۔ احصی الشیئ احصاءً کے معنی ہیں عدّہٗ اسے شمار کیا۔ (اقرب)

تفسیر وضع الکتاب ۔ کتاب کے رکھا جانے کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ ان میں جاری ہو جائیگی۔ یعنی اس کا فیصلہ نافذ ہو جائیگا۔ وَضَعَ السیفَ فیهم کے معنی ہوتے ہیں کہ تلوار نے ان میں اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ یعنی خوب قتل کرنے لگ گئی۔

فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ ۔ یعنی ان اقوام کے دل سے وہ خیال مٹ جائے گا کہ ہماری حکومت ہمیشہ رہے گی بلکہ دلوں میں ڈر پیدا ہو جائیگا۔ کہ جس تہذیب پر ہم کو اس قدر ناز تھا وہ تباہ ہونے کو ہے۔ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ سے اس طرف اشارہ ہے۔ کہ تمام گزشتہ غلطیوں کی سزا ایک ایک کرکے ملنی شروع ہو جائیگی۔ اور ان کے دل محسوس کریں گے کہ اس دُنیا کا حاکم خدا ہے۔ جو انسانی اعمال کو بغیر نتیجہ کے نہیں چھوڑتا اور وہ سب اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتیں گے۔

آخر میں یہ بتایا کہ گو انجام بڑا تلخ ہوگا۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ظلم نہ ہوگا۔ بلکہ اعمال کے مطابق جزا ہوگی

۵۱ حل لغات ۔ لِاٰدَمَ ۔ ل بمعنی مع ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو سورۃ بنی اسرائیل ۶۲

اسجدوا ۔ سَجَدَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ تشریح کے لئے دیکھو حجر ۳۰

ابلیس کے لئے دیکھو رعد ۲۸

الجن کے لئے دیکھو حجر ۲۸

فَسَقَ کے لئے دیکھو یونس ۳۴

بدلًا ۔ البدل کے معنی ہیں العوض۔ بدلہ الخلف قائمقام (اقرب)

مشفقین

وضع کتاب کے معنی

خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا

اور زمین کی پیدائش (کے موقعہ) پر حاضر کیا تھا۔ اور نہ (خود) ان کی (اپنی) جانوں کی پیدائش کے موقعہ پر

كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝ وَيَوْمَ يَقُوْلُ

اور نہ ہی میں گمراہ کرنے والوں کو (اپنا) مددگار بنا سکتا تھا ۝ اور اس دن کو بھی یاد کرو جبکہ

نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ

(یعنی خدا نے برتر مشرکوں کو) کہیگا (کہ اب) تم میرے (ان) شریکوں کو بلاؤ جن کے (شریک ہونے کے) متعلق تم دعوے کرتے تھے۔ چنانچہ

تفسیر۔ قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر جہاں کسی ایسی تباہی کا ذکر ہو۔ جو مامور کی معرفت دنیا پر آئی ہو۔ وہاں آدم کے واقعہ کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ اس سے لوگوں کو اس طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے۔ کہ اے لوگو تم سے پہلے آدم کا واقعہ گذر چکا ہے۔ اس سے فائدہ حاصل کرو۔ اور شیطان کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

(حاشیہ: تباہی کے ذکر کے بعد آدم کے واقعہ کا ذکر)

اس آیت کے ذریعہ گویا لوگوں کو ہوشیار کیا گیا ہے۔ کہ مسلمانوں کو اور دوسری قوموں کو ہوشیار رہنا چاہیئے کہ پہلے بھی شیطان نے آدم کو گمراہ کرنا چاہا تھا۔ اور وہ شیطان کے پیچھے چل پڑے تھے۔ مگر اے آدم کی ذریت تم ہوشیار رہنا اور شیطانی آواز کی اطاعت نہ کرنا۔

حل لغات۔ عَضُدًا: اَلْعَضُدُ مَا بَيْنَ الْمِرْفَقِ اِلَى الْكَتِفِ کسی سے کندھے تک بازو کے حصہ کو عضد کہتے ہیں و يُسْتَعَارُ الْعَضُدُ لِلْمُعِيْنِ۔ استعارۃً مددگار اور معاون کو بھی عضد کہتے ہیں (مفردات)

(حاشیہ: عضد)

تفسیر۔ مَا اَشْهَدْتُّهُمْ میں ھم کی ضمیر شیطان اور اس کی ذریت کی طرف جاتی ہے اور اس میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ اے لوگو تم شیطان کو کیا اس لئے دوست بناتے ہو کہ اس سے ترقی حاصل کر لوگے۔ حالانکہ تمہاری پیدائش میں اس کا کوئی دخل نہ تھا۔ اور نہ انکا کوئی حصہ زمین آسمان کی پیدائش میں تھا بلکہ انسان کی تمام قوتیں نیکی کی خاطر پیدا کی

(حاشیہ: مَا اَشْهَدْتُّهُمْ میں ھم کی ضمیر کا مرجع)

گئی تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ گمراہ کرنے والوں کو اپنا ساتھی اور خدمت گذار نہیں بنا سکتا۔ پس دنیا میں اگر کوئی قوم جو خدا تعالیٰ سے دُور ہو ترقی بھی کر جائے۔ تو کبھی یہ نہ خیال کرنا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ اب دُنیا کا کام اس کے ہاتھ میں دے دیگا۔ اللہ تعالیٰ تو دنیا کی حکومت اپنے ہی ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اور رکھے گا۔ ایسے لوگوں کی کامیابیاں تو محض عارضی ہوتی ہیں۔ اور خدا تعالیٰ پھر انسان کو نیکی کی طرف لے آتا ہے۔

اس آیت پر ذرا سا تدبر کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں ایک عظیم الشان مضمون بیان کیا گیا ہے گزشتہ مضمون بتا رہا ہے۔ کہ شیطان یا اس کی ذریت کو زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں کوئی دخل حاصل ہونا تو الگ رہا ان کو اس سے کوئی دُور کا تعلق بھی نہیں۔ پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اس میں بعض آدم کے مخالف یا دین سے بے بہرہ لوگ ایک نئی دنیا کے بسانے کے مدعی ہونگے اور کہیں گے کہ وہ اپنے زور سے ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ اور ایک نیا نظام قائم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے اور فرماتا ہے۔ کہ کیا کبھی پہلے ایسا ہوا ہے کہ نئی دنیا اور نیا نظام بنانے میں اللہ تعالیٰ نے شیطان اور اس کی ذریت سے مدد لی ہو۔ اگر پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ تو

يَسْتَجِيبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ○ وَرَاٰ

وہ نہیں بلائینگے۔ مگر وہ انہیں (کوئی) جواب نہیں دیں گے۔ اور ان کے (اور ان کے شریکوں کے) درمیان ہم ایک ذریعۂ ہلاکت بنا دیں گے[1] اور

الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ

مجرم اس آگ کو دیکھیں گے اور سمجھ جائیں گے۔ کہ وہ اس میں پڑنے والے ہیں۔ اور وہ اس سے (بچنے یا) ہٹنے

يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ○ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا

ع ۱۹

کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے ۴۹ اور ہم نے اس قرآن میں یقیناً ہر ایک (ضروری)

آئندہ کس طرح ممکن ہے ہمیشہ نئی دنیا اور نیا نظام اللہ تعالیٰ آدم اور فرشتوں کے ذریعہ سے بنایا کرتا ہے۔ پس اب بھی اسی طرح ہوگا۔ نیا نظام اور نئی دنیا بھی آدم ہی کے ذریعہ سے بنائے جائیں گے۔ اور انسان کی تخلیق یعنی بنی نوع انسان کے اندر جو خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ان کی اصلاح کرکے انسان کو از سرِ نو درست کرنے کا کام بھی دنیاوی تدابیر سے نہ ہوسکیگا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت کے ماتحت ہوگا۔

قرآن کریم کا یہ کتنا بڑا معجزہ ہے۔ تیرہ سو سال پہلے اس نے ان اصطلاحات تک کو بیان کر دیا ہے۔ جو آخری زمانہ میں استعمال ہونے والی تھی۔

NEW ORDER اور NEW WORLD

کا ذکر کن خوبصورت الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے کر دیا ہے اور کس طرح اس کا بھی جواب دے دیا ہے۔ کہ آجتک نئی دُنیا اور نیا نظام آدم کے مخالفوں کے ہاتھ سے خدا تعالیٰ نے تیار نہیں کروایا۔ بلکہ ہمیشہ آدم اور فرشتوں کے ہاتھ سے کروایا ہے۔ اسی طرح اب ہوگا۔

۴۸ حل لغات موبقا۔ وَبَقَ یُوْبِقُ کا مصدر یا اسم ظرف ہے۔ وَبَقَ کے معنی ہلاک ہونے کے ہیں۔ موبق مصدر کے معنی کسی مصیبت میں پھنس کر ہلاک ہونے کے ہیں۔ اور اگر ظرف ہو تو اس کے مندرجہ ذیل معنی ہوں گے اَلْمَهْلَكُ ہلاکت کی جگہ اَلْمَوْعِدُ وعدہ کی جگہ اَلْمَحْبِسُ قیدخانہ۔ کل شَیْءٍ حَالَ بَیْنَ شَیْئَیْنِ ہر ایسی چیز جو دو چیزوں کے درمیان آڑ ہو جائے دقیل مسافۃ تھلک فیھا الاحمر[ط] لبعدھا۔ بعض نے اس کے معنی دشوار گزار سفر کے کئے ہیں۔ (اقرب)۔

تفسیر۔ یعنی اس وقت اپنے معبودانِ باطلہ کو بلائیں گے کبھی اپنے اولیاء کو پکاریں گے جن کو شفاعت کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ کبھی حضرت مسیح کو پکاریں گے کبھی ان کی والدہ کو لیکن ان میں سے کوئی ان کی دعا نہ سنیگا۔

وَجَعَلْنَا بَیْنَھُمْ مَّوْبِقًا۔ موبق کے معنی علاوہ اور معنوں کے پردہ اور روک کے بھی ہوتے ہیں۔ اور ہلاکت کے بھی ہیں۔ پردہ کے لحاظ سے اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ان جنگوں میں وہ لوگ ایک دوسرے کا پورا پورا بائیکاٹ کریں گے۔ اور ہلاکت کے معنوں کے لحاظ سے یہ معنی ہوں گے کہ ایک دُوسرے کو ہلاک کریں گے۔ اور اگر بینھم کی ضمیر معبودان باطلہ اور پرستش کرنے والوں کی طرف پھیری جائے۔ تو اس میں پہلے مضمون کی تاکید سمجھی جائیگی یعنی ایسے پردے درمیان میں آجائیں گے۔ کہ انکی کوئی آواز نہ سنی جائیگی۔ یا یہ کہ ان معبودان کی ارواح ہی ان کے خلاف دعاؤں میں لگ جائیں گی۔

[1] موبق کے مختلف معنی

[1] موبق

۴۹ حل لغات۔ مُوَاقِعُوْھَا۔ وَاقَعَ سے مواقعوھا

[2] مواقعوھا

الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ

بات کو مختلف پیراؤں میں بیان کیا ہے۔ اور (وہ ایسا کیوں نہ کرتے کہ) انسان سب سے بڑھ کر بحث

اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا

کرنے والا ہے ۵ اور ان لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی۔

اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ

تو اس بھی ایمان لانے اور اپنے رب سے بخشش چاہنے سے صرف اس بات نے

اسم فاعل مواقع آتا ہے۔ اور مواقعون اس کی جمع ہے وقع (وقوعاً) کے معنی ہیں سَقَطَ گر گیا۔ وقع فی الشَّرَكِ جال میں پھنس گیا (اقرب) پس مواقعوھا کے معنی ہوں گے اس میں پڑنے والے ہیں۔

الجمل

مَصْرِفاً یہ صَرَفَ سے اسم ظرف ہے صَرَفَهُ کے معنی ہیں رَدَّهُ عَنْ وَجْهِهِ اس کو اس کے قصد سے پھیر دیا (اقرب) پس مصرف کے معنی ہوں گے پھرنے کی جگہ۔

مصرفاً

تفسیر یعنی اس وقت انہیں ہلاکت نظر آنے گی نار کے معنی جنگ کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ۔ (مائدہ ع ۹) یعنی جب بھی یہود جنگ کی آگ بھڑکائیں گے اللہ تعالیٰ اسے بجھا دیگا۔ ان معنوں کے رو سے یہ مطلب ہوگا کہ جنگ کا خطرہ پیدا ہو جائیگا۔ اور انہیں یقین ہو جائیگا۔ کہ اب اس جنگ سے چھٹکارا نہیں۔ اور بہتیری تدبیریں اس جنگ کو روکنے کی کریں گے۔ لیکن کوئی صورت بھی اس جنگ سے محفوظ رہنے کی نہ پیدا ہو سکے گی۔

نار کے معنی جنگ کے

اس آیت میں جو ظنُّوا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی یقین کے ہیں خیال یا شک کے نہیں۔ ظن کا لفظ عربی میں اضداد میں سے ہے یعنی اس کے معنی گمان کے بھی ہوتے ہیں۔ اور یقین کے بھی ہیں۔

ظنوا بمعنی یقین

۵ **حل لغات** الجدل۔ شدۃ الخصومۃ سختی سے جھگڑنا۔ (اقرب)

تفسیر اکثر شیء جدلاً کے دو معنی ہیں (۱) اکثر شیء یتاتی منه الجدل یعنی سمجھانے کی جو تدبیریں کی جائے اس کے نتیجہ میں اس کی طرف سے جھگڑے کا پہلو ہی پیدا کر لیا جاتا ہے۔ اطمینان حاصل کرنے کی وہ کوشش نہیں کرتا۔ (۲) جَدَلُ الْاِنْسَانِ اَكْثَرُ مِنْ كُلِّ مُجَادِلٍ یعنی انسان سب مخلوق کی نسبت زیادہ جھگڑا کرتا ہے مطلب یہ کہ اسے تو ہم نے عقل اس لئے دی تھی۔ کہ روحانی ترقیات کرے۔ اور خدا تعالیٰ کا عرفان حاصل کرے۔ مگر وہ اس قوت کو جو اسے دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ایک بڑے امتیاز کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اس کے ذریعہ سے دوسرے حیوانوں سے افضل بنے۔ وہ ان سے بھی ادنیٰ حالت میں چلا جاتا ہے۔

اس آیت میں الناس تمام انسانوں کے متعلق ہے۔ اور الانسان ان انسانوں کے متعلق جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم میں تمام مسائل کو خوب اچھی طرح سے اور مختلف پیراؤں میں بیان کیا ہے۔ کہ بنی نوع انسان اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مگر وہ قسم انسانوں کی جن کا ذکر اوپر گذرا ہے۔ اسے جھگڑنے کا ذریعہ بنا لیتی ہے۔ جو ان ہی تفصیلات کو جو ان کے فائدہ کے لئے ہیں۔ اعتراض کا نو

تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝

روکا کہ پہلے لوگوں کی سی حالت ان پر (بھی) آئے۔ یا پھر عذاب ان کے سامنے آ کھڑا ہو ۵۱

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ

اور ہم رسولوں کو صرف بشارت دینے والا اور (عذاب کی آمد سے) آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجتے ہیں۔ اور

وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا

جن لوگوں نے انکار کیا ہے۔ وہ جھوٹ کے ذریعہ سے اس لئے جھگڑتے ہیں۔ کہ اس کے ذریعہ

بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ۝ وَمَنْ

سے حق کو مٹا دیں۔ اور انہوں نے میرے نشانوں کو اور (میرے) انذار کو ہنسی کا نشانہ بنایا ہے ۵۲ اور اس

اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ

شخص سے زیادہ ظالم کون (ہو سکتا) ہے۔ جسے اس کے رب کے نشانوں کے ذریعہ سے سمجھایا گیا (لیکن) پھر

نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ

(بھی) وہ ان سے روگرداں ہوگیا۔ اور جو کچھ اس کے ہاتھوں نے (کما کر) آگے بھیجا تھا۔ اسے اس نے بھلا دیا

اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ

ان (لوگوں) کے دلوں پر ہم نے یقیناً کئی پردے ڈال دیئے ہیں۔ کہ وہ اسے سمجھیں۔ اور ان کے کانوں میں

سمجھ لیتی ہے۔ یہیں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ کبھی لوگ شریعت کی تفصیلات کو لعنت قرار دیکر ان سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ تفصیلات انسان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے بیان کی گئی ہیں۔

۵۱ حل لغات ۔ السنۃ کے لئے دیکھو حجر ۱۴

قُبُلًا۔ القُبُل نقیض الدُبر۔ سامنے کا حصہ (اقرب)

تفسیر۔ یعنی قرآن کریم میں ہدایت کا ایسا سامان موجود ہے کہ اس کے بعد ہدایت میں کوئی روک نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ اور چاہیئے تھا کہ اس کے مضامین کو سنکر یہ لوگ اپنے غلط عقاید سے تائب ہوتے لیکن یہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ گویا یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم تو ضرور عذاب ہی لینگے سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اس سے مراد آخری ہلاکت ہے اور اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا سے مراد درمیانی عذاب ہیں یعنی دونوں قسم کے عذابوں کو یہ بلا رہے ہیں۔

۵۲ حل لغات ۔ الباطل کے لئے دیکھو نحل ۷۳

لِيُدْحِضُوْا بِہٖ۔ دَحَضَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ادحض قدمہ کے معنی ہیں ازلقہا پاؤں کو پھسلا دیا۔ ادحض الحجۃ اَبْطَلَہَا دافعہا ودفعہا دلیل کو پوری طرح رد کیا دور کیا مٹایا (اقرب) پس لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ کے معنی ہوں گے۔ کہ وہ حق کو مٹا دیں۔ دور کر دیں۔

تفسیر لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ کے معنی یہ ہوئے کہ کافر لوگ باطل کو لے کر جھگڑا اور بحث کرتے ہیں۔ تاکہ اس کے ساتھ حق کو (دنیا سے نکال دیں) باطل کر دیں۔

وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا یعنی ہم نشانات تو دکھاتے

تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝ وَ

گمراہی (پیدا کردی ہے) ۔ اور اگر تو انہیں ہدایت کی طرف بلائے تو (ایسا کہ تجھ سے اعتقاد رکھتے ہیں کہ) اس صورت میں وہ ہدایت کو (بھی) کبھی قبول نہیں کریں گے ۵۲

رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا

اور تیرا رب بہت ہی بخشنے والا (اور بہت ہی) رحمت کرنے والا ہے ۔ اگر وہ اس کی وجہ سے جو انہوں نے (اپنی جانوں کے لئے) کمایا ہے ۔ انہیں ہلاک

لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا

کرنا چاہتا تو وہ ان پر فوراً عذاب نازل کر دیتا ۔ (مگر وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کے لئے ایک میعاد (مقرر) ہے جس والے (یعنی پیشتر) اس کے

مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ۝ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا

کہ عذاب کو بھگتیں) ہرگز کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے ۵۳ اور وہ (گذشتہ نبیوں کے مخالفوں کی) بستیاں جو ہیں تو (انکا واقعہ یوں ہے کہ) ہم نے اس وقت انہیں

ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝ۧ وَاِذْ قَالَ

ہلاک کیا جب انہوں نے ظلم کیا ۔ اور ان کی ہلاکت کے لئے (بھی) ہم نے ایک میعاد مقرر کر دی تھی ۔ (تا وہ چاہیں تو توبہ کر لیں) ۵۵ اور (تم اس وقت کو بھی یاد کرو)

ہیں بلکہ ہنسی ہی کرتے ہیں ۔ اس وقت یورپ والوں کی یہی حالت ہے نشانات کی طرف ان کی بالکل توجہ نہیں ۔ بلکہ ان امور کو بیوقوفوں کے توہمات سمجھتے ہیں ۔ اور عقلی ڈھکوسلوں کی طرف توجہ جاتے ہیں ۔ مگر خدائی نشانوں کو حقیر سمجھتے ہیں ۔

۵۳؎ تفسیر ۔ فرماتا ہے اس سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے جیسا اس کے رب کی باتیں سنائی جائیں تو وہ ان کو حقیر سمجھے ۔ اور ان سے اعراض کرے اور اس بات کو نہ سوچے کہ میں نے خود اپنی عقل سے جو کام کئے ہیں ۔ وہ کس طرح فساد فتنہ اور جنگ کے موجبات ہو رہے ہیں ۔ پس باوجود اس تجربہ کے کہ وہ اپنی عقل سے امن پیدا نہیں کر سکا پھر بھی خدائی امداد اور ہدایت کی طرف اس کا توجہ نہ کرنا گویا اپنے تجربہ کو ٹھکرا دینے کے مترادف ہے پھر وہ قوم جو تجربوں پر اپنے کاموں کی بنیاد رکھنے کی مدعی ہے وہ کس قدر مجرم اور غافل ہوتی ہے کہ جزئی تجربوں کو تو اتنی قدر و قیمت دیتی ہے ۔ مگر ساری قوم کے تجربہ اور اس کے نتیجہ سے فائدہ نہیں اٹھاتی ۔ فرماتا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا تھا کہ جب انہوں نے سمجھ سے کام لینے سے انکار کر دیا ہے تو ہم بھی ان کو سمجھ سے محروم کر دیں ۔ اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں ۔ کہ خواہ کوئی کتنی ہی انہیں نصیحت کرے یہ فائدہ نہ اٹھا سکیں ۔

۵۴؎ تفسیر ۔ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۔ اگر ان کو خدا تعالیٰ ان کے اعمال کی وجہ سے سزا دینے لگتا تو کبھی کا ہلاک کر دیتا مگر خدا تعالیٰ ہوشیار کئے بغیر کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا ۔ اس لئے وہ پہلے ان کو ہوشیار کرے گا ۔ اور زمانہ کے مامور کے ذریعہ سے حجت پوری کر کے پھر پکڑے گا ۔ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ان کے لئے وعدہ مقرر ہے ۔ وہ ہرگز اس سے ہٹ کر کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے یعنی خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اور کوئی بھی نجات کی جگہ ان کو نہ مل سکے گی ۔

۵۵؎ تفسیر ۔ یعنی ہزاروں قومیں گذر چکی ہیں جب انہوں نے ظلم کیا یعنی اللہ تعالیٰ کے انذار کی قدر نہ کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا ۔ اور ان کی ہلاکت کی پہلے سے خبر دے دی جس کے مطابق وہ ہلاک ہو گئے ۔ پس اس قوم کو بھی سوچنا چاہیئے کہ ان کو خواہ کس قدر ترقیات ہی کیوں نہ ملی ہوں پھر بھی وہ انسان ہیں ۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جب پہلے انسان خدا تعالیٰ سے منہ پھیر کر ہلاک ہوئے تو یہ ہلاک نہ ہوں ۔ آجکل قریباً ۹۹ فیصدی لوگوں کا خیال ہے کہ اب یورپ تباہ نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بیوقوفی کی بات ہے پہلی بادشاہتوں کے زمانوں میں کون کہتا تھا کہ وہ تباہ ہوں گی مسلمانوں کے متعلق کون کہتا تھا کہ ان کی حکومت تباہ ہو گی ۔ اسی طرح رومیوں کی حکومت اور ایرانیوں کی حکومت کے متعلق بھی کوئی اس وقت گمان نہ کرتا تھا ۔ لیکن ساری تباہ ہو گئیں ۔ اسی طرح ان کی بادشاہت کے تباہ ہونے کے متعلق بھی حیرانی اور تعجب خلاف عقل ہے ۔

مُوْسٰی لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ

جب موسیٰ نے اپنے نوجوان (رفیق) سے کہا تھا کہ، میں (جس رستے پر جا رہا ہوں اسپر قائم رہنے سے) نہیں ہٹونگا یہاں تک کہ ان دونوں سمندروں کے

اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا

اکٹھے ہونے کے مقام پر پہنچ جاؤں یا صدیوں تک (آگے ہی آگے) بڑھتا چلا جاؤں ۵۶ پس جب وہ (دونوں) ان (دونوں سمندروں) کے باہم ملنے کی جگہ پر پہنچے تو وہ اپنی مچھلی

۵۶ حل لغات۔ الفتٰی کے معنے نوجوان کے ہیں۔ اسکی جمع فتیان آتی ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو یوسف ۲۳

لَآ اَبْرَحُ کے لئے دیکھو یوسف ۸۱

اَمْضِيَ: مَضٰی سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے اور مَضٰی الشیءُ (یَمْضِی و یَمْضُو) کے معنے ہیں ذَھَبَ وخلا۔ کوئی چیز گزر گئی اور چلی گئی (اقرب) پس اَمْضِيَ کے معنے ہونگے کہ میں چلتا چلا جاؤں۔

حُقُبًا: حُقُبٌ حُقْبٌ کی جمع ہے۔ اور اس کے معنے ہیں ثمانون سَنَة۔ اسّی سال کا عرصہ۔ وَیُقَالُ اکثر من ذالک اور بعض کہتے ہیں اس سے بھی زائد عرصہ کو حُقُب کہتے ہیں الدھر۔ زمانہ۔ السنة وقیل سنین: مطلق ایک سال کے عرصہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ کئی سال کا عرصہ حقب کہلاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلے تو تمثیلوں سے اس امر کو بتایا کہ عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ گو کمزور اور طاقتور کا مقابلہ ہے لیکن غور کیا جائے تو طاقتور وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتا ہے، وہ نہیں جو دنیا کے کاموں میں مشغول ہے۔ اور اشارۃً یہ بھی بتایا کہ مسیحیت کی ترقی اس رنگ میں مقدر تھی کہ پہلے ایکدفعہ یہ قوم ترقی کرے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہو۔ اور کچھ عرصہ اسلام ترقی کرے۔ پھر دوبارہ انہیں ترقی ملے۔ اب اس مضمون کو آسمانی کتب کے حوالہ سے ثابت فرماتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا کہ میں پہلے بتا آیا ہوں اسلام کے دشمنوں کا یہ اعتراض ہے کہ اس سورۃ میں بغیر تعلق کے واقعات جمع کر دیئے گئے ہیں اور خود مسلمانوں کیلئے بھی ان واقعات کا اجتماع حیرانی پیدا کرنے کا موجب بنا رہا ہے۔ اور انہوں نے یہ کہکر اپنے آپکو تسلّی دی ہے کہ یہود نے کچھ سوالات کئے تھے، ان کا جواب اللہ تعالیٰ نے اکٹھا کر کے دیدیا ہے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے یہ بات نہیں۔ کیونکہ اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق اگر کوئی سوال تھا بھی تو ان دونوں واقعات کے درمیان میں اُوپر کی تمثیلات اور پھر حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ کو جو اس رکوع میں بیان ہوا ہے کیوں رکھدیا گیا ہے۔ کم سے کم ان دونوں سوالوں کے جواب اکٹھے رکھے جاتے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب مضامین ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ اور ہر واقعہ اور تمثیل کو خاص ضرورت سے اپنے اپنے مقام پر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اصحاب کہف کے ذکر کے بعد ان تمثیلات کے رکھنے کی حکمت تو میں بتا آیا ہوں۔ اب میں حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ کو اس جگہ رکھنے کی وجہ بتاتا ہوں۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ عیسائیوں کی قومی زندگی میں ایک عجیب بات پائی جاتی ہے جس کی کوئی اور مثال کم سے کم مجھے معلوم نہیں۔ اور وہ یہ کہ انہیں حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد ایک ترقی کا دَور ملا۔ درمیان میں ایک اور نبی پیدا ہوا اور اس کی قوم کو ترقی کا ایک دَور ملا۔ اس کے بعد پھر مسیحی قوم کی ترقی شروع ہو گئی۔ اس واقعہ کی طرف پہلے تمثیل میں نہر کے لفظ سے اشارہ کیا گیا تھا۔ اب حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کو اس جگہ رکھ کر اس مضمون کو واضح کیا گیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰؑ تھے۔ جیسا کہ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ میں پیشگوئی کی گئی تھی۔ کہ میں

ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرونگا۔ اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالونگا۔ اور جو کچھ میں اُسے حکم دُونگا وہی وہ ان سے کہیگا"۔

آنحضرت کی شباہت موسیٰ سے

قرآن کریم میں بھی اس پیشگوئی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل ع ۱) سو حضرت موسیٰ کے واقعہ کو مسیحیوں کی ترقی کے دونوں دَوروں کے درمیان میں بیان کرکے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مثیلِ موسیٰ ان دونوں دوروں کے درمیان میں پیدا ہونا ضروری تھا۔ تا اس شبہ کا ازالہ کیا جائے کہ اگر مسیحی ترقی کے پہلے دَور کے بعد ایک سچا نبی آیا تھا تو کیوں مسیحی ترقی کا دَور ختم نہیں ہوگیا پس اس دور کا پھر پہلے سے بھی زیادہ زور سے شروع ہوجانا بتاتا ہے کہ درمیانی نبی سچا نہ تھا۔ ورنہ وہ ان کی ترقیات کو روک دیتا۔

ان پیشگوئیوں کی تفصیل جو سورۃ کہف کے واقعات میں مضمر ہے

یہ بات ذوقی نہیں بلکہ حضرت موسیٰ کا جو واقعہ آگے بیان ہوا ہے۔ اس کا مضمون بھی اسی کی تصدیق کرتا ہے جس کی تشریح اگلی آیات میں کی جائے گی۔ سردست میں نے اس طرف اشارہ کردیا ہے کہ چونکہ مسیحی ترقی کے پہلے دَور اور دوسرے دَور کے درمیان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور مقدر تھا۔ اس لئے مسیحی ترقی کے دونوں دَوروں میں فاصلہ رکھا گیا ہے۔ اور درمیان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کردیا گیا ہے جن کے مثیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تا جس طرح واقعات نے ظاہر ہونا تھا اسی طرح ان کا ذکر کیا جائے۔

یہ واقعہ جو اس رکوع میں بیان ہوا ہے۔ اس کے بارہ میں مفسرین میں اختلاف ہے مفسرین اکثر اس طرف گئے ہیں اور بعض احادیث میں بھی اس کا ذکر آتا ہے کہ خضر نامی ایک شخص سے ملاقات کے لئے حضرت موسیٰؑ تشریف لے گئے تھے۔ ان آیات میں اس سفر کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ سفر انہوں نے کیوں کیا تھا۔ اس کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا تعالیٰ سے پُوچھا کہ کیا مجھ سے زیادہ علم والا بھی کوئی شخص ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہاں ایک شخص ہے۔ اور پھر اس شخص کا پتہ بتایا جسپر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس شخص کو ملنے کیلئے گئے۔

ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ بعض لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا آپ سے بڑھ کر بھی کوئی اور عالم ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اسپر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی اور اس شخص کا پتہ دیا، جو ان سے بڑھ کر عالم تھا۔ اور اس پر وہ اس سے ملنے کے لئے گئے۔

درحقیقت اس واقعہ کے سمجھنے میں لوگوں کو غلطی لگی ہے۔ بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا واقعہ سورۃ بنی اسرائیل میں بیان کیا گیا تھا۔ اور اس اسراء کے نتائج بیان کئے گئے تھے کہ آئندہ کیا کیا واقعات ظاہر ہونگے اور مسلمانوں کو کس طرح ترقیات ملینگی۔ پھر اسراء کی بیان کردہ کامیابیوں میں مسلمانوں کے لئے جو خطرات پیش آنے والے تھے ان کا ذکر کیا تھا یعنی یہود اور نصاریٰ کی مخالفتوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ ان عظیم الشان خطرات میں سے ایک بڑا خطرہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰ کی اُمّت کا ایک گروہ جو عیسائی کہلاتے ہیں (اگرچہ وہ اپنے آپکو حضرت موسیٰ کی اُمّت نہ کہیں مگر خدا کے نزدیک وہ حضرت موسیٰ ہی کی امت میں شامل ہیں) مسلمانوں کو آخری زمانہ میں سخت صدمہ پہنچانے والا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی تشریح کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسراء کے علاوہ خود حضرت موسیٰ کے اسراء کو بھی اس جگہ بیان فرمایا ہے۔ جس سے اس امر کی تصدیق مطلوب ہے کہ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غالب آئیں گے اور آپ کی اُمّت کو غلبہ دیا جائے گا۔ اور موسوی اُمّت کا بقیہ حصہ (عیسائی لوگ) غالب نہ ہوسکیگا۔ یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کا ایک کشف ہے،

میرے نزدیک ظاہر جسم کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ انہیں پیش نہیں آیا۔ استاذی المکرم حضرت مولوی نور الدین صاحبؓ کی یہی رائے تھی۔ اور میں اس بارے میں غور کرکے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی یہ رائے درست تھی۔ اور میرے نزدیک بھی یہ کشف ہی ہے جس کے ثبوت میں ذیل میں بیان کرتا ہوں۔

(۱) پہلا ثبوت اس کا یہ ہے کہ اس قسم کے کسی سفر کے واقعہ کا ذکر بائیبل میں موجود نہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ظاہری طور پر ظہور میں نہیں آیا۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ اس کے طرز بیان میں کچھ اختلاف ہوجائے مگر سرے سے ہی اس واقعہ کا نہ پایا جانا ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔

بنی اسرائیل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو بھی معراج ہوا تھا (چنانچہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عزیزم مولوی جلال الدین صاحب شمس نے یہودی روایات لندن میوزیم کی کتب دیکھ کر نکالی ہیں۔ جن میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔ اور یہودی کتب میں اس سفر کو جسمانی سفر قرار دیا ہے۔ مگر ان کا یہ لکھنا ہم پر حجت نہیں۔ مسلمانوں سے بعض نے بھی تو اسراء کو بلکہ معراج کو جسمانی قرار دیدیا ہے)

(۲) بنی اسرائیل کیطرف مبعوث ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ کا ایک ہی سفر ثابت ہے جو مدین کیطرف ہوا۔ قرآن کریم میں بھی متعدد بار اس کا ذکر آیا ہے۔ اور قرآن اور بائیبل دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اس سفر میں وہ اکیلے تھے۔ لیکن زیر بحث واقعہ میں ان کے ساتھ ایک ساتھی کا بھی ذکر ہے جو اُن کا ماتحت معلوم ہوتا ہے کیونکہ فَتیٰ کے لفظ کو جب مضاف بنا کر استعمال کیا جائے۔ اسکے معنی بیٹے یا ماتحت کے ہوتے ہیں۔ پس سفر مدین پر یہ الفاظ چسپاں نہیں ہوسکتے۔ اور اس کے سوا اور کوئی سفر ان کا بائیبل سے ثابت نہیں۔ لہٰذا اسے کشف ہی ماننا پڑیگا۔

(۳) بعثت کے بعد بھی حضرت موسیٰ کا کوئی ایسا سفر ثابت نہیں جو انہوں نے اپنی قوم سے علیحدہ ہوکر کیا ہو۔ بائیبل میں شروع سے لیکر آخیر تک انکے واقعات ترتیب کے ساتھ موجود ہیں لیکن اس سفر کا کہیں ذکر نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر کوئی مادی واقعہ نہ تھا۔

حضرت موسےٰ کے سفر کے کشف ہونے کے ثبوت

(۴) حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل سے چالیس دن کیلئے چند میل دُور پہاڑ پر خدا کا کلام سننے کے لئے گئے تو اتنے ہی دنوں میں بنی اسرائیل نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ جب چالیس دن کی غیر حاضری نے یہ تباہی مچادی تھی تو اتنے لمبے سفر کی صورت میں کیا نتیجہ ہوا ہوگا۔ مگر اس موقعہ پر بنی اسرائیل کے اندر کوئی فساد نہیں ہوا۔ کیونکہ بائیبل میں اس فساد کے علاوہ اور کسی فساد کا ذکر نہیں۔ نیز اس فساد کے بعد یہ دانشمندی کے خلاف ہوتا کہ آپ اتنا لمبا سفر کرتے۔

(۵) چالیس دن کے سفر پر جاتے ہوئے حضرت موسیٰؑ اپنے بعد حضرت ہارون کو خلیفہ مقرر کرکے جاتے ہیں مگر اس ایک دفعہ کے واقعہ کے بعد کہیں بھی ثابت نہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارون یا کسی اور کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہو۔ اگر سفر کا ذکر نہیں تھا تو کم از کم اس نیابت کا ذکر تو ضرور تورات میں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر چونکہ ایسا کوئی ذکر بائیبل میں نہیں ہے۔ تو یہی ماننا پڑتا ہے کہ ایسا کوئی جسمانی سفر واقعہ نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ تو ہرگز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کہ حضرت موسیٰؑ سفر پر گئے ہوں اور اپنا جانشین مقرر نہ کر گئے ہوں۔

(۶) یہ امر انبیاء کی سنت کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے بعد وہ اپنی قوم سے ایک لمبے عرصہ کے لئے الگ ہوئے ہوں۔ جن انبیاء کا تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ایک کی سوانح میں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا۔ بیشک ہمارے عقیدہ کی رُو سے حضرت مسیح اپنی قوم سے الگ ہوئے۔ مگر وہ درحقیقت ایک حصہ قوم سے جُدا ہوکر دُوسرے حصہ کی طرف گئے تھے۔ اور آپکی

مثالیں بکثرت انبیاء میں پائی جاتی ہیں۔ کہ انہوں نے اپنی قوم کے اندر تبلیغی سفر کئے ہیں۔ مگر حضرت موسیٰ کا یہ سفر تبلیغی نہیں۔ نہ اپنی قوم کے علاقہ میں ہے۔ بلکہ وہ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے اپنی امت کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں کہ ایک شخص مجھ سے بھی زیادہ عالم ہے۔

(۷) حضرت ابن عباسؓ نے اسی واقعہ کے اندر جو کنز کا ذکر ہے اسکی تعبیر میں فرمایا ہے۔ ما کان الکنز الا علمًا (ابن کثیر) یعنی اس واقعہ میں جو کنز کا ذکر ہے۔ اس سے علم کے سوا اور کچھ مراد نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تعبیر ہے اور تعبیر کشف ہی کی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کنز علم تھا تو یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دیوار جو حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھی نے بنائی وہ بھی مادی دیوار نہ تھی۔ اور کھانا طلب کرنے کا واقعہ بھی مادی نہ تھا۔ اور جب یہ حصہ کشف تھا تو ظاہر ہے کہ سارا واقعہ ہی کشف تھا۔

(۸) واقعہ کی اندرونی شہادت بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ یہ کوئی جسمانی واقعہ نہیں۔ مثلاً خرق سفینہ کے واقعہ کو لے لو۔ اس میں جو لکھا ہے کہ انہوں نے کشتی میں بڑا سوراخ کر دیا۔ تاکہ بادشاہ اس کو چھین نہ لے۔ اسپر سوال یہ ہے کہ کیا اس شگاف سے وہ کشتی بے کار ہوگئی تھی؟ اگر کہا جائے کہ نہیں۔ تو اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بادشاہ نے اس کو کیوں نہ چھینا جبکہ وہ ابھی کارآمد تھی۔ اور اگر کہو کہ بالکل نکمی ہوگئی تھی۔ تو پھر سوال ہوتا ہے کہ اس سوراخ کی وجہ سے وہ دریا میں غرق کیوں نہ ہوگئی۔

اس واقعہ کے کشف ہونیکا ثبوت اندرونی شہادتوں کر

ظاہری طور پر کوئی ایسی کشتی جس کا تختہ نکال کر اس کو بالکل بیکار کر دیا گیا ہو غرق ہونے سے بچ نہیں سکتی تھی۔ ہاں کشف میں یہ نظارہ دیکھنا خلاف عقل نہیں ہوتا کہ کوئی تختہ بھی نکال دیا جائے اور کشتی غرق بھی نہ ہو۔

پھر قتل نفس کا واقعہ ہے۔ یہ بھی ظاہری واقعہ نہیں مانا جا سکتا۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ کو سبق سکھانیوالا یا کوئی نبی ہوگا یا کوئی بڑا بزرگ۔ لیکن قتل نفس بغیر نفس تو کوئی ادنیٰ مومن بھی نہیں کر سکتا۔ کجا یہ کہ ایک عظیم الشان نبی ایسے فعل کا ارتکاب کرے۔

اس کے جواب میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس نوجوان نے چونکہ آئندہ قتل کرنے تھے۔ اس لئے اس کو قتل کر دیا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی ظلم ہے اور خلاف شریعت۔ اگر ارتکاب جرم سے پہلے محض علم کی بنا پر سزا دینا جائز ہے تو پھر خدا تعالیٰ کو سب لوگوں کے گناہوں کا قبل از وقت علم ہے وہ کیوں سب کو سزا نہیں دیتا۔

شریعت کا اصولی قانون یہی ہے کہ جب تک کوئی کسی گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے، اس کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس اصل پر شرائع کا اختلاف اثر انداز نہیں ہو سکتا یعنی بعض کہتے ہیں کہ وہ عملاً قتل کیا کرتا تھا مگر اس کا پتہ نہ لگتا تھا۔ یہ جواب بھی نہایت بودا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو قرآن مجید کو چاہیئے تھا کہ یہ وجہ بتاتا۔ تاکہ لوگوں کی تسلی ہو جاتی۔ اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ بلا وجہ اس نوجوان کو قتل نہیں کیا گیا۔

آخری واقعہ دیوار کا ہے۔ اس کو بھی ظاہری حالت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اپنے ساتھی کے دیوار بنا دینے پر حضرت موسیٰؑ جیسا وسیع الحوصلہ اور عظیم الشان نبی اس لئے اعتراض کرے کہ شہر کے لوگوں نے ہمیں کھانا نہیں کھلایا۔ شہر والوں کے کھانا نہ کھلانے کا الزام ان پر تھا نہ کہ ان دو بے کس یتیموں پر جن کی وہ دیوار تھی۔ اور یوں بھی یہ بات حضرت موسیٰؑ کی شرافت نفس سے بہت بعید ہے کہ وہ دو یتیموں کی دیوار پر اجرنہ لینے پر اعتراض کریں۔

غرض واقعہ کی اندرونی شہادت بھی ثابت کرتی ہے کہ یہ ایک کشف ہے نہ کوئی ظاہری واقعہ۔

(۱۰) یہ سارا واقعہ بحیثیت مجموعی بھی ثابت کرتا ہے کہ یہ ایک کشف تھا۔ کیونکہ جو تین باتیں اس سفر میں بتائی گئی

ہیں۔ اگر وہ ظاہری لی جائیں تو وہ ایسی نہیں ہیں کہ اُن کیلئے کوئی معمولی مومن بھی سفر کرے کجا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو ان باتوں کے سیکھنے کے لئے بھیجا جاتے۔ کیا حضرت موسیٰؑ یہ سیکھنے گئے تھے۔ کہ کشتی کا تختہ کیسے توڑا جاتا ہے یا قتل کیونکر کیا جاتا ہے یا دیوار کے بنانے کی کیا ترکیب ہے۔ یا اسے اجر لینا چاہیئے یا نہیں۔ ان باتوں کے سیکھنے کے لئے تو ایک جاہل گنوار بھی سفر نہ کریگا۔ غرض ان باتوں میں سے کوئی بھی تو ایسی بات نہیں کہ جس کو ظاہر صورت میں مان کر حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم اور ذی شان نبی کا سفر جائز اور معقول قرار دیا جا سکے۔

(۱۱) ماوردی نے روایت کی ہے کہ جس شخص کے پاس حضرت موسیٰؑ گئے تھے، وہ ایک فرشتہ تھا (ابن کثیر)

پس یہ واقعہ کشف ہی ماننا پڑے گا ورنہ ظاہری سفر کرکے فرشتے کے پاس جانے کے کیا معنے ہونگے۔ فرشتہ تو پل مارنے میں خود ان کے پاس آ سکتا تھا۔

(۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "وَدِدْنَا ان موسیٰ کان صبر حتی یقص اللہ علینا من خبرھما (بخاری کتاب التفسیر) کاش موسیٰؑ صبر کرتے اور خاموش رہتے تاکہ خدا تعالیٰ ہمیں ان کی اور خبریں بھی بتا دیتا۔

اگر اس واقعہ کو ظاہری واقعہ سمجھا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ارفع ہے میں بھی اپنے ذہن میں ان امور کے معلوم کرنے کا کوئی شوق نہیں پاتا اور نہ ہی میرے نزدیک کوئی سمجھدار انسان ایسی سطحی باتوں کے متعلق زیادتی علم کی خواہش کر سکتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ آئندہ کی اخبار تھیں جو کشفی رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر ہوئیں اور چونکہ وہ غیب پر مشتمل تھیں اور آئندہ اُمت محمدیہ کے حالات کو ظاہر کرتی تھیں اس لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خواہش تھی کہ کاش موسیٰ خاموش رہتے۔ اور اور بھی باتیں کھل جائیں۔ ان دلائل سے ثابت ہے کہ یہ واقعہ کشف کا واقعہ ہے۔

اگرچہ مصدقہ بائیبل کا کوئی حوالہ ہمیں نہیں ملا جس میں اس واقعہ کا کسی رنگ میں بھی ذکر ہو۔ مگر یہود کی روایات کی کتب میں ایسی روایات موجود ہیں اور مسلمانوں کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں بھی یہود میں ضرور اس قسم کی روایات پائی جاتی تھیں ورنہ مسلمان انہیں کہاں سے لے سکتے تھے۔ مگر یہود کی روایات کا ہماری تحقیق پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا جب تک قرآن کریم عقل اور مشاہدہ ان کی تصدیق نہ کرے۔ ہم ان کو ماننے پر مجبور نہیں۔ بلکہ بغیر ان قیود کے ان کا ماننا خطرہ سے خالی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ عقل ونقل اس واقعہ کو ایک کشف قرار دیتے ہیں۔

۲ حضرت خلیفہ اول کے نزدیک بندے مراد آنحضرت تھے

وہ شخص جس سے حضرت موسیٰؑ اسراء میں سبق لینے گئے تھے۔ اس کے متعلق استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ کی رائے تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود متمثل ہوا تھا۔ میں نے جب اس پر غور کیا۔ تو میں بھی اس یقین پر پہنچا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی حضرت موسیٰؑ کو متمثل ہو کر نظر آئے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواہش کی کہ کاش موسیٰ خاموش رہتے۔ تو ہمیں اور حالات بھی معلوم ہو جاتے۔ یعنی ہمیں پتہ لگ جاتا کہ ہمارے ساتھ کیا واقعات پیش آنے ہیں۔

۲ آنحضرت کے زمانہ کے حالات حضرت موسیٰ پر کشفی طور پر ظاہر ہوئے

میرا اپنا یہ خیال ہے۔ گو یہ خیال ایک ذوقی نظریہ ہے کہ جس وقت کوہ سینا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت موسیٰؑ کو بشارت دی گئی (دیکھو استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸) اور نہیں معلوم ہوا کہ ایک عظیم الشان نبی میرے بعد پیدا ہونے والا ہے۔ تو اُن کے دل میں یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کہ وہ کونسی تجلی ہوگی جو اس نبی پر

ظاہر کی جائے گی۔ جسپر انہوں نے عرض کیا" رَبِّ اَرِنِي انظر الیكَ " ذرا مجھ پر بھی وہ محمّدی تجلّی ظاہر فرما۔ تاکہ میں بھی تو دیکھوں۔ کہ اسپر توکس شان سے ظاہر ہوگا۔ اس کا انہیں یہ جواب دیا گیا۔ کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص اپنے مناسب حال ہی تجلّی دیکھ سکتا ہے۔ میرے اس بیان کی تائید اس سے بھی ہوجاتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ اس سے پیشتر روحانی تجلّی دیکھ چکے تھے۔ جیسا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۔ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (طٰهٰ ع) پھر جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تجلّی دیکھ چکے تھے تو اُن کے اس قول کے کیا معنے ہوئے کہ اے اللہ مجھے اپنا آپ دکھا۔ اگر اسکے یہ معنے کئے جائیں کہ پہلے روحانی تجلّی دیکھی تھی اب وہ اللہ تعالیٰ کو اسکی اصل صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے برگزیدہ نبی کو بیوقوف قرار دیا جائے نعوذ باللہ من ذالك۔ کیونکہ کسی کا یہ کہنا کہ اے خدا تو مجھے مجسم ہوکر نظر آ۔ نادانی کی بات ہے۔ اور یہ بات حضرت موسیٰؑ کی طرف ہرگز منسوب نہیں ہوسکتی۔ پس یہ رؤیت کی درخواست رُوحانی ہی قرار دیجا سکتی ہے۔ اور چونکہ موسوی تجلّی پہلے انپر ہوچکی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب جو خواہش انہوں نے کی تو وہ کسی اور رؤیت کے لئے تھی۔ اور چونکہ اس درخواست سے معًا پہلے انہیں محمد رسول اللہ صلعم کی بشارت دی گئی تھی۔ میں یہی قیاس کرتا ہوں۔ کہ یہ درخواست ان کی محمدی تجلّی کے دیکھنے کے بارہ میں تھی۔ جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ" لَنْ تَرٰىنِيْ " کہ تو مجھے اس صورت میں نہیں دیکھ سکتا۔ جس صورت میں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھنا ہے۔ کیونکہ اس کے دیکھنے کے لئے محمدی مرتبہ کی ضرورت ہے، جو تجھے حاصل نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ" لَنْ تَرٰىنِيْ " کہکر پھر اللہ تعالیٰ نے وہ جلوہ دکھایا۔ چنانچہ موسیٰؑ نے دیکھ لیا۔ کہ واقعہ میں وہ اس جلوہ کے مطابق ظرف نہ رکھتے تھے، اس وجہ سے وہ اس جلوہ کو دیکھتے ہی بے ہوش ہوگئے۔

۱ حضرت موسےٰ نے خدا تعالیٰ کی اس تجلی کو دیکھنے کی تاب نہ رکھی جو آنحضرت پر ہوئی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسول کریم صلعم کی شان اعلیٰ کے دکھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ کشف دکھایا اور اس کشف کا خضر میر احمدؐ ہی ہے جس کے ساتھ چلنے کی موسیٰ علیہ السلام کو طاقت نہ تھی۔ اللّٰھم صل علیٰ محمد وعلیٰ اٰلِ محمد و بارك وسلم انك حمید مجید

واذ قال موسیٰ لفتٰه۔ فتی کے متعلق روایات میں لکھا ہے کہ وہ یوشع بن نون تھے۔ کوئی تعجب نہیں کہ کشف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ہی ساتھ دیکھا ہو لیکن میری اپنی رائے یہ ہے کہ یہ دُوسرا شخص حضرت عیسٰی علیہ السلام تھے۔ جنہوں نے موسوی سلسلہ کے سفر کے آخری دَور میں قوم کی راہنمائی کرنی تھی۔ اور گویا موسوی سفر کا اختتام انکی معیت میں ہونا تھا۔

۲ حضرت موسےٰ کے ساتھ کا جوان حضرت عیسےٰ تھے

اس کا ثبوت میرے نزدیک اس آیت سے بھی ملتا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام گھر سے ایک نوجوان کو لے کر چلے۔ بلکہ خود ان کے چلنے کا بھی ذکر نہیں۔ ذکر ہے تو یہ کہ موسیٰ نے اپنے آپکو سفر کی حالت میں دیکھا اور اس وقت ان کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ انہوں نے اس نوجوان سے کہا کہ جب تک میں مجمع البحرین تک نہ پہونچ جاؤں میں اپنا سفر ختم نہ کرونگا۔ خواہ مجھے صدیوں تک ہی کیوں نہ سفر کرنا پڑے۔ زمانہ کے لئے جو لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے۔ وہ حُقُب کا ہے۔ اور یہ لفظ حُقْبٌ کی جمع ہے۔ حُقُب کے معنے اسّی سال یا اس سے زیادہ سالوں کے ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہ لفظ عربی میں صدی کا قائم مقام ہے۔ پس حُقُبٌ جو جمع ہے۔ اس کے معنے ہوئے صدیاں۔ مگر بعض دفعہ اس لفظ کو ایک سال یا کئی سال کیلئے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ اگر یہی معنے لئے جائیں تو بھی آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ سالوں چلتا جاؤنگا۔ یا یہ کہ دسیوں سال چلتا چلا جاؤنگا۔ ظاہر ہے کہ ایک نبی کا اُمت سے سالہا سال تک جُدا رہنا عقل کے خلاف ہے۔ بلکہ خود نبوت کی

۳ مجمع البحرین سے مراد زمانہ اختتام حضرت موسےٰ

ضرورت کو مشتبہ کر دیتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ ہجرت کرنی پڑی۔ تو آپؐ نے مکہ سے صحابہ کو وہاں بھجوا دیا اور پھر خود مدینہ میں بھی آپؐ پر ایمان لانے والے موجود تھے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اگر سالہا سال کہا ہے۔ تب بھی یہ ثبوت ہے کہ یہ کشف تھا۔ اور اگر صدیوں کہا ہے اور میرے نزدیک یہی کہا ہے۔ تو پھر تو یہ قطعی طور پر ثابت ہے۔ کہ ان الفاظ کو موسیٰؑ کے منہ سے نکلوا کر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ موسیٰؑ کا رُوحانی سفر یعنی ان کی اُمت کا زمانہ صدیوں تک ممتد چلا جائیگا۔

میرے نزدیک اس فقرہ کے اس جگہ بیان کرنے کی بھی ایک حکمت ہے اور وہ یہ کہ موسوی سفر کی اس منزل میں جہاں کہ فتیٰ آپ کے ساتھ شامل ہونا مقدر تھا۔ ایک حصہ قوم میں یہ خیال پیدا ہونے والا تھا کہ اب موسیٰؑ کا سفر ختم ہو گیا۔ اب اس نوجوان یعنی حضرت عیسیٰ کا سفر شروع ہوگا۔ یعنی بعض لوگوں میں یہ شبہ پیدا ہونے والا تھا۔ کہ حضرت عیسیٰؑ کے آنے سے موسوی شریعت ختم ہو گئی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نیا دین جاری کیا ہے۔ ان الفاظ میں اس شبہ کا ازالہ کیا ہے اور موسیٰؑ کے مُنہ سے یہ کہلوایا ہے کہ اس نوجوان کے ملنے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سفر ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ مجمع البحرین پر یعنی ظہور محمد صلعم کے زمانہ پر جا کر ختم ہوگا۔ گویا عیسےٰ علیہ السلام کے ظہور پر کسی نئے دین کا اجراء نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ موسوی دین کی تائید کرینگے۔ اور موسیٰ کے سفر کو ختم کرنے والے نہ ہونگے۔ بلکہ موسیٰ کی نیابت میں ان کے سفر کو پورا کریں گے۔ خود حضرت مسیح نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

" یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں " (متی ۵/۱۷)

اس کشف سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو حضرت موسیٰ نے جب یہ کشف دیکھا تو اس کا شروع ہی یہ تھا کہ گویا وہ ایک راستہ پر ایک نوجوان کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اور منزل مقصود نہ ملنے پر حیران ہیں یا یہ کہ اس سے پہلے بھی حصہ کشف کا تھا۔ جس میں لمبے سفر کا ذکر تھا مگر اس کو غیر ضروری سمجھ کر قرآن کریم نے چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وہی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ جب تک مجمع البحرین تک نہ جا پہنچوں چلتا چلا جاؤنگا خواہ صدیاں چلنا پڑے جو ایک عرصہ تک راستہ تلاش کر کے حیران ہو رہا ہو کہ منزل مقصود کہاں گئی۔ میرے نزدیک یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ نوجوان حضرت مسیحؑ تھے۔ جو موسوی سفر کے اختتام کے قریب آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملے اور پھر اس رُوحانی سفر میں ان کے ہمرکاب ہو گئے۔

مجمع البحرین کے ظاہراً کسی مقام پر چسپاں ہونے کی تردید

اس آیت میں جو لفظ مجمع البحرین آیا ہے یہ بھی اس پر روشنی ڈالتا ہے کہ یہ کشفی واقعہ ہے کیونکہ مجمع البحرین کسی معروف جگہ کا نام نہیں۔ اور سوائے اس کے کہ اس کے معنے دو سمندروں کے ملنے کی جگہ کے لئے جائیں اور کوئی معنے ظاہر میں نہیں کئے جا سکتے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت کے بعد کی رہائش میں قریب ترین علاقے جہاں دو سمندر ملتے تھے یہ تین تھے۔ باب المندب۔ جہاں بحیرہ احمر اور بحر الہند ملتے ہیں۔ دردانیال۔ جہاں بحیرہ رُوم اور بحیرہ مارمورہ ملتے ہیں یا پھر البحرین جہاں خلیج فارس کا سمندر بحر الہند سے ملتا ہے۔ یہ تینوں علاقے قریباً ہزار ہزار میل دور ان کے وطن سے تھے۔ اور اس زمانہ کے حالات کو مد نظر رکھکر کوئی سال بھر کا سفر بنتا تھا۔ لیکن چونکہ کشف سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کے کنارے کنارے آپ سفر کر رہے تھے۔ اس لئے دردانیال کا درہ ہی ظاہری سمندر بنتا ہے کیونکہ تینوں جگہوں میں سے صرف وہی جگہ ہے۔ جس تک موسیٰؑ کی جائے رہائش سے۔ سمندر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے۔ مگر یہی وہ راستہ ہے جس میں کنعان پڑتا ہے۔ اور جس کے متعلق بائیبل شاہد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی میں وہاں نہیں جا سکے۔ پس یہ واقعہ بھی اس امر کا

حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ○ فَلَمَّا

(وہاں) بھول گئے۔ جس پر اس نے تیزی سے بھاگتے ہوئے سمندر میں اپنی راہ لی۔ ۵۷ پھر جب وہ (اُس جگہ سے)

ثبوت ہے کہ یہ ایک کشف تھا، اور مجمع البحرین کسی جگہ کا نام نہیں۔ بلکہ ایک تعبیر طلب نام ہے۔ چنانچہ تعطیر الانام میں لکھا ہے۔ "اَلْبَحْرُ فِي الْمَنَامِ يَدُلُّ عَلٰى مَلِكٍ قَوِيٍّ مُهَابٍ عَادِلٍ شَفِيْقٍ يَحْتَاجُ إِلَيْهِ الْخَلَائِقُ" اور پھر لکھا ہے۔ "رُبَّمَا دَلَّ الْبَحْرُ عَلَى التَّسْبِيْحِ وَالتَّهْلِيْلِ" (تعطیر الانام)

مجمع البحرین کی تعبیر

سمندر سے مراد زبردست بادشاہ جو عادل ہو، شفیق ہو، اور دنیا اس کی محتاج ہو۔ ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی سمندر کے معنے تسبیح و تہلیل کے بھی ہوتے ہیں۔ اور اس میں گویا "سُبحان الذی اسرٰی بعبدہٖ" کیطرف اشارہ ہے۔

پس مجمع البحرین سے مراد درحقیقت وہ زمانہ تھا۔ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ختم ہوا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ شروع ہوا۔ یعنی وہ گھڑی جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلا الہام نبوت ہوا مجمع البحرین تھی۔ وہاں موسیٰ جو ایک رُوحانی عادل، شفیق اور دنیا کے لئے ضروری بادشاہ تھے انکا علاقہ ختم ہوتا تھا، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اور بھی بڑے روحانی سمندر تھے ان کا زمانہ شروع ہوتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کشف میں دو بڑے سمندروں کے ملنے کا مقام دکھا کر گویا یہ بتایا گیا کہ اس زمانہ تک آپکی اُمت کا زمانہ ہے۔ آگے ایک اور سمندر شروع ہوتا ہے۔ آپکا زمانہ ختم ہو کر اس نئے نبی کا کام شروع ہوگا۔ اور وہی شخص رُوحانی زندگی کا سامان حاصل کر سکیگا جو اس سمندر میں غوطہ لگائیگا۔

اس رؤیا میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ موسوی سلسلہ محمدی سلسلہ کیلئے بطور ارہاص ہے۔ اور آخر یہ سمندر اس سمندر میں جا کر مل جائے گا۔ اسی وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کشف دکھایا گیا تھا اس میں تو یہ نظارہ دکھایا گیا تھا کہ جبریل خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ نظارہ دکھایا کہ وہ مجمع البحرین کی طرف اپنے ساتھی کو لیکر گئے اور وہاں جا کر ان کا سفر ختم ہوگیا۔

۵۷ حل لغات۔ الحوتُ کے معنے ہیں اَلسَّمَكُ وَقَدْ غلب فی الكبير۔ مچھلی اور زیادہ تر بڑی مچھلی پر بولا جاتا ہے

اَلسَّرَبُ: حُجر الوحشی۔ وحشی جانور کے رہنے کی جگہ۔ الحفير تحت الارض۔ زمین کے اندر گڑھا۔ القناة: يدخل منها الماء۔ پانی کی نالی۔ نیز سَرَبٌ مصدر بھی ہے جس کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ (اقرب)

الحوت

سربًا

تفسیر۔ نَسِيَا حُوتَهُمَا:۔ حوت کے معنے علم التعبیر میں یہ لکھتے ہیں۔ "ربما دلّت رؤيته على معبد الصالحين و مسجد المتعبدين" (تعبیر الانام)

حوت کی تعبیر

حوت یعنی مچھلی کا دیکھنا بہت نیک لوگوں کی عبادت کی جگہ اور عبادت گزاروں کی مسجد پر دلالت کرتا ہے۔

جیسا کہ اس آیت سے اور اگلی آیت کے بعد کی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین کے مقام کی شناخت یہ بتائی گئی تھی کہ وہاں مچھلی غائب ہو جائے گی۔ پس نَسِيَا حُوتَهُمَا کے معنے یہ ہوئے۔ کہ جس مقام پر ان لوگوں کے ہاتھوں سے نیک لوگوں کی عبادت گاہیں اور عبادت گزاروں کی مساجد نکل جائینگی، وہی مقام مجمع البحرین کا ہوگا۔ یعنی جہاں موسوی سلسلہ ختم ہو جائے گا اور محمدی سلسلہ شروع ہوگا۔

یہ مضمون کس قدر واضح ہے۔ ایک نئے نبی کے آنے سے نیکی اور عبادت پہلی قوم سے چھین لی جاتی ہے۔ اور اس نبی کی قوم کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اسی کیطرف اس کشف میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ سلسلہ محمدیہ کے اجراء پر بنی اسرائیل یعنی موسوی سلسلہ کے لوگوں کی عبادات خدا تعالیٰ کے حضور میں مقبول نہ رہینگی۔

اور محمد رسول اللہ کی امت کی عبادتیں ہی مقبول ہونگی اور عبادت اور صلاحیت کے جو آثار ہیں موسوی سلسلہ کے لوگوں سے غائب ہو جائینگے۔ اور نَسِیَا حُوْتَهُمَا کہکر یہ بتایا ہے کہ خالص اسرائیلی قوم تو اسوقت سے پہلے ہی صحیح عبادت اور تقویٰ کو کھو چکی ہوگی۔ صرف وہی قوم عبادت اور صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہوگی جو صرف موسیٰ کی قوم نہیں کہلا سکتی، بلکہ موسیٰ اور اس کے فتی کی قوم کہلا سکیگی۔ یعنی حضرت مسیح کے آنے کے بعد مسیحیوں میں عبادت رہ جائیگی بنی اسرائیل اس سے محروم ہو جائیں گے لیکن چونکہ حضرت مسیح حضرت موسیٰ کے سلسلہ ہی کے نبی ہونگے۔ اس لئے ان کی حوت بھی ایک رنگ میں موسیٰ کی حوت ہوگی۔ اس لئے وہ دونوں کی طرف منسوب ہوگی۔ مگر جب مجمع البحرین کا مقام آئیگا تو اس قوم کے ہاتھ سے بھی جن کے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام مشترک طور پر معلم ہونگے۔ عبادت اور صلاحیت جاتی رہیگی۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کشف تھا۔ کیونکہ ظاہری مجمع البحرین تو ایسی جگہ ہوتی ہے کہ اسے کوئی بھول ہی نہیں سکتا اور اس کے لئے کسی حوت کی علامت کی ضرورت نہیں۔ پس یہ رُوحانی مجمع البحرین ہے جو علامتوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ظاہر میں اس کی کوئی علامت نہیں ہوتی۔ بلکہ لوگ دوسرے بحر کے زمانہ میں اس کی مخالفت کرتے اور اسے جھوٹا کہتے ہیں۔ اور یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ مجمع البحرین آگیا ہے۔ یعنی پہلے نبی کا زمانہ ختم ہوگیا ہے اور دوسرے نبی کا زمانہ شروع ہوگیا ہے۔ اس کی علامت یہی ہوتی ہے کہ پہلے نبی کی قوم کی عبادات اور صلاحیت جاتی رہتی ہے۔ اور عقلمند لوگ اللہ تعالیٰ کے سلوک میں اس فرق کو دیکھ کر کہ اب وہ پہلی قوم کی عبادات کی کوئی قدر نہیں کرتا اور دوسری قوم کی عبادتوں کو قبول کرتا اور اس کی دُعاؤں کو سنتا ہے سمجھ جاتے ہیں کہ مجمع البحرین آگیا ہے۔

اس مضمون کی طرف قرآن کریم میں ایک اور آیت میں کھلے لفظوں میں بھی اشارہ کیا گیا ہے فرماتا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ (فتح ع ۴). یعنی محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں کفار کے مقابل پر بہت سخت ہیں۔ اور آپس میں بہت رحم کرنے والے ہیں۔ تو ان کو دیکھیگا کہ رکوع اور سجدوں میں لگے رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں۔ ان کے مونہوں سے ان کے سجدوں کی قبولیت کے آثار ظاہر ہیں۔ یہ ان کی مثال تورات میں بیان ہو چکی ہے۔ اس آیت میں صاف بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ اور ان کی جماعت کی سچائی کا ثبوت یہ ہوگا۔ کہ ان کے چہروں سے یہ معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے ان کے سجدوں کو قبول کر لیا ہے۔ جبکہ ان کے مخالفوں کی عبادتیں رد کر دی جائینگی۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے آثار ان کے چہروں سے ظاہر ہوں گے۔

نسیا حوتہما سے اشارہ ہے کہ موسیٰ اور ان کے فتی کی قوم سے عبادت کی توفیق اٹھ جائیگی

میں اس آیت کو دیکھتے ہوئے سمجھتا ہوں کہ تورات میں اس کشف کا ذکر تھا۔ مگر یہود میں سے بعض نے جہاں اور تحریفیں تورات میں کیں وہاں اسے بھی نکال دیا۔ کیونکہ اس سے ان کی قوم پر ایک زد پڑتی تھی لیکن ان کی زبانی روایات میں اس کشف کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔ جیسا کہ یہود کے دوسرے لٹریچر میں اس کشف کا بگڑی ہوئی صورت میں وجود پایا جاتا ہے۔

یہ کشف تورات سے تحریف کرکے یہود نے نکالدیا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ موسوی سلسلہ محمدی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ کیونکہ مجمع البحرین کا ظاہر میں کوئی نشان نہ ہونا بتاتا ہے کہ یہ دونوں سمندر اس طرح آپس میں ملے تھے۔ کہ دو سمندر نہ معلوم ہوتے تھے بلکہ اگلا سمندر پہلے کا تسلسل ہی معلوم ہوتا تھا۔ گویا پہلے سمندر کا پانی دوسرے میں آملا تھا۔ ایک دوسرے کے مقابل کے

جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ

آگے نکل گئے تو اس نے اپنے نوجوان (رفیق) سے کہا (کہ) ہمارا صبح کا کھانا ہمیں دے۔ ہمیں یقیناً اپنے اس

سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ۝ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى

سفر کی وجہ سے تکان ہو گئی ہے۔ ۵۵۸ اس نے کہا (کہ) بتائیے (اب کیا ہوگا) جب ہم (آرام کے لئے) اس چٹان پر ٹھہرے

الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۫ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ

تو میں مچھلی (کا خیال) بھول گیا - اور مجھے یہ (بات) شیطان کے سوا کسی نے نہیں

اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ

بھلائی اور اس نے سمندر میں عجیب طرح سے اپنی راہ لے لی

عَجَبًا ۝ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى

۵۵۹ اس نے کہا (کہ) یہی وہ (مقام) ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ پھر وہ اپنے پاؤں کے

سمندر نہ تھے کہ ان کے ملنے کی جگہ کا کچھ نشان نظر آتا۔

۵۵۸ حل لغات - غَدَآءَنَا :- اَلْغَدَآءُ کے معنے ہیں طَعَامُ الْغُدْوَةِ - صبح کا کھانا - (اقرب)

غدونا

نصبًا - نصبٌ کے معنے تھکان کے ہیں - مزید تشریح کے لئے دیکھو حجر ۵۴۱

نصبًا

تفسیر - یہ ضروری نہیں کہ ان تمام واقعات کی تعبیر ہی کی جائے - کیونکہ بعض دفعہ کشف کی صورت میں بعض ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں جو صرف رؤیا کو ایک مکمل نظارہ کی صورت دینے کے لئے شامل کئے جاتے ہیں - خود وہ تعبیر کے قابل امور کا حصہ نہیں ہوتے - مثلاً ایک شخص خواب میں ایک موت کا نظارہ دیکھتا ہے تو اس کے ساتھ کوئی مکان وغیرہ بھی دیکھ لیتا ہے - وہ مکان تعبیر طلب نہیں ہوتا - بلکہ صرف وہ نظارہ جس سے کسی کی موت پر دلالت کی جاتی ہے تعبیر طلب ہوتا ہے - لیکن اگر اس قسم کی بھی تعبیر کی جائے تو مضمون میں وسعت ہی پیدا ہوتی ہے - اس لئے میں اس کی بھی علم تعبیر کے مطابق تشریح کر دیتا ہوں -

غداء کے معنے علم التعبیر میں یہ لکھے ہیں کہ جو اپنا غداء طلب کرے - اسکے یہ معنے ہیں کہ وہ تھک جائیگا - (تعطیر الانام)

ان معنوں کے رُو سے یہ مراد ہوگی کہ جب مجمع البحرین یعنی رسول کریم صلعم کا زمانہ آ جائیگا تو حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کی قوم اس سے فائدہ نہ اٹھائیگی (کیونکہ یقیناً اس کشف میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے مراد انکی قومیں ہیں نہ کہ وہ خود - کیونکہ انہوں نے محمد رسول اللہ صلعم کا زمانہ نہیں پایا بلکہ انکی قوم نے یہ زمانہ پایا) بلکہ انکا انکار کرکے اپنے سفر کو جاری رکھیگی اور اپنے مذہب کے زمانہ کے ختم ہونے کو تسلیم نہ کریگی - تب ایک لمبے سفر کے بعد وہ اپنے اندر تکان محسوس کریگی حیران ہوگی کہ ہمیں جو کہا گیا تھا کہ ایک رسول کامل آنیوالا ہے وہ کیوں نہیں آیا - اسوقت تھک کر وہ سوچ میں پڑ جائے گی کہ کہیں ہم سے غلطی تو نہیں ہوئی - کہیں وہ آ تو نہیں چکا - اور ہم اس کے ماننے سے محروم تو نہیں رہ گئے -

۵۵۹ حل لغات - عجبًا - العجب کے لئے دیکھو یونس ۵۰ھ

اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۝ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ

نشان دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔ ٦٦ تو انہوں نے ہمارے (برگزیدہ) بندوں میں سے ایک ویسا بندہ وہاں

تفسیر۔ الصخرۃ۔ اَلْحَجَرُ الْعَظِیْمُ الصَّعْبُ (اقرب) یعنی عربی زبان میں بڑے اور سخت پتھر کو کہتے ہیں اور علم تعبیر میں صخرہ کے معنے لکھے ہیں۔ وتدلّ علٰی قَسِیْمٍ مِّنَ الفجور (تعطیر الانام) یعنی خواب میں کوئی صخرہ دیکھے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ نہایت گندے فسق و فجور میں مبتلا ہوگیا ہے۔ اس تعبیر کی رُو سے اِذْ اَوَیْنَا اِلَی الصَّخْرَةِ کے معنے یہ ہونگے۔ کہ جب ہم سخت فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے اور میں بتا آیا ہوں کہ اس کشف میں موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰؑ سے مراد ان کی اقوام ہیں۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلعم کا زمانہ انہوں نے پایا تھا نہ کہ خود حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے پس یہ تعبیر ہمیں دھوکے میں نہیں ڈال سکتی۔ مراد یہ ہے۔ کہ جب وہ قوم جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی مشترکہ تھی۔ فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے گی وہی زمانہ مجمع البحرین کا ہوگا یعنی اسوقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہونگے اور یہ ظاہر ہے کہ نبی تبھی دنیا میں آتے ہیں جبکہ اسوقت کے لوگ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

پس اس نظارہ کی تعبیر یہ ہوگی۔ کہ جب مسیحی قوم فسق و فجور میں مبتلا ہوگئی تھی وہی وقت محمد رسول اللہؐ کے ظہور کا تھا اور یہ خیال مسیحیوں کو ایک لمبے عرصہ کے بعد اپنے سفر میں تھک جانے اور اپنی کوششوں میں ناکام رہنے کے بعد پیدا ہوگا اور وہ افسوس کرینگے کہ ہمنے اس زمانہ کو کیوں کھویا۔

وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ نے اس مضمون کو اور بھی واضح کر دیا ہے یعنی محمد رسول اللہ کی پہچان سے ہم شیطانی وساوس کیوجہ سے محروم رہے، ورنہ جبکہ ہماری قوم کے ہاتھ سے عبادت کے ثمرات جاتے رہے تھے۔ اور ہم فسق و فجور میں مبتلا ہوگئے تھے۔ تو کیوں ہم نے یہ نہ سمجھ لیا کہ اب مجمع البحرین کا مقام آگیا ہے۔ اور ہماری قوم سے خدا تعالیٰ نے اپنی مدد ہٹالی ہے۔ اور موعود نبی کا زمانہ آچکا ہے۔ اور وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ عَجَبًا۔ جو فرمایا اس میں وہ اپنی اس غلطی پر تعجب کرتے ہیں کہ حوت ہمارے ہاتھ سے نکل کر کس طرح اس دوسرے سمندر میں چلی گئی، یعنی عبادت کے ثمرات مسلمانوں کی طرف منتقل ہوگئے اور ہم خالی ہاتھ رہ گئے۔

الصخرۃ کی تعبیر

اور ہماری قوم کا فسق و فجور میں مبتلا ہونا

یہ نظارہ بھی کشف پر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ مجمع البحرین کے سمجھانے کے لئے کسی ظاہری مچھلی کے نشان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور اگر ظاہری طور پر مچھلی کو دیکھ کر وہ دونوں چل رہے تھے۔ تو پھر بھولنے کے معنے ہی کوئی نہیں۔ کیا کبھی اس دنیا میں ایسا ہوا ہے کہ مثلاً کوئی شخص موٹر میں سفر کر رہا ہو۔ پھر ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد وہ بھول جائے کہ میں موٹر میں سفر کر رہا تھا۔ اور پیدل سفر کرنے لگ جائے۔ اور کچھ دُور جا کر اُسے یہ بات یاد آئے۔ غرض جب مچھلی کے نشان پر وہ چل پڑے تھے۔ تو وہ ایک قدم بھی مچھلی کے بغیر چل نہیں سکتے تھے۔ اس میں بھولنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔

٦٦ حل لغات

نَبْغِ

نَبْغِ :- بغاہ کے معنے ہیں طلبہ اسے چاہا۔ (اقرب) نبغ جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کے معنے ہوں گے۔ کہ ہم چاہتے ہیں۔

تفسیر۔ یعنی اس موقعہ پر وہ سمجھ جائیں گے، کہ انہوں نے غلطی سے اپنا اگلا سفر جاری رکھا۔ مجمع البحرین کو تو وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں

آتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا

پایا جسے ہم نے اپنے حضور سے رحمت (کی سیرت) بخشی تھی۔ اور اسے ہم نے اپنی جناب سے (خاص) علم (بھی) عطا

عِلْمًا ۝ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ

کیا تھا۔ ۵۱۳ موسیٰؑ نے اس سے کہا (کہ) کیا میں اس (مقصد کے لئے) آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔ کہ جو علم آپکو عطا

تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝ قَالَ اِنَّكَ لَنْ

ہوا ہے۔ اس میں سے کچھ رشد (کی باتیں) مجھے بھی سکھائیں۔ ۵۱۴ اسنے کہا (کہ) تو میرے ساتھ رہ کر

تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ

ہرگز صبر نہیں کرسکے گا ۵۱۵ اور جس بات کے علم کا تو نے احاطہ نہیں کیا اس پر تو صبر

۵۱۱ تفسیر۔ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا۔ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عبدؔ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ سورۃ الجن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا۔ (الجن ع) کہ آپ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ تو لوگ آپ پر ہجوم کرکے امڈ آتے ہیں۔ صوفیاء نے تو یہاں تک بحث کی ہے کہ عبد کا مقام سب درجات سے بڑا درجہ اور بلند مقام ہے۔ اور سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی کامل عبد نہیں ہے۔

عبد سے مراد آنحضرت ہیں

اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا میں بھی آپکے وجود کیطرف اشارہ فرمایا ہے۔ جیساکہ فرماتا ہے۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (انبیاء ع) یعنی ہم نے تجھے سب جہان کے لئے رحمت ہی رحمت بناکر بھیجا ہے۔

رشد

عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ یعنی اس کو خاص علم دیا گیا ہے جو پہلوں کو نہ ملا۔ سورۃ انعام میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۔ (نساء ع) کہ اے رسول ہم نے تجھے وہ کچھ سکھایا ہے جو تو پہلے نہ جانتا تھا اور تجھ پر اس ذریعہ سے بہت بڑا فضل کیا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمْ (انعام ع) یعنی اس نبی کے ذریعہ سے تم کو وہ علم عطا کیا گیا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہیں دیا گیا۔ اور پہلوں میں موسیٰ بھی شامل ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (نمل ع) یعنی تجھ کو قرآن حکیم اور علیم خدا کی طرف سے سکھایا جاتا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا سکھائی گئی ہے کہ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰہٰ ع) یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا کر کہ الٰہی میرا علم اور بڑھا میرا علم اور بڑھا۔

۵۱۲ حل لغات۔ رُشْدٌ:۔ حق کے راستہ پر استقامت اختیار کرنا رشد کہلاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت سے موسوی مقام اور محمدی مقام کا مقابلہ کرکے دکھایا گیا ہے اور بتایا ہے کہ موسوی مقام محمدی مقام کے تابع ہے اور جن امور کی تہ تک محمدی علوم پہنچے ہیں۔ ان تک موسوی علوم نہیں پہنچے۔ اور کشف میں اس لطیف مقابلہ کو ایک مکالمہ اور مصاحبت کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

۵۱۳ تفسیر۔ اس آیت میں گویا لن ترانی والے مضمون کو

تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ

کر (بھی) کیونکر سکتا ہے۔ ۶۷؎ اسنے کہا (کہ) اگر اللہ (تعالیٰ) نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔ اور

بیان کیا گیا ہے کہ محمدی کمالات کی بلندی کو موسوی کمالات نہیں پہنچ سکتے۔ اور بتایا ہے کہ محمدی قوم کا صبر اور مرتبہ رکھتا ہے اور موسوی قوم کا صبر اور مرتبہ رکھتا ہے۔ جن ابتلاؤں اور مشکلات کا مسلمانوں نے مقابلہ کیا، موسوی سلسلہ کے لوگ وہاں آکر رہ گئے۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ کہ گو مسیحی سلسلہ کے لوگوں نے ایک لمبے عرصہ تک مشکلات برداشت کیں۔ مگر وہ مشکلات جسمانی تھیں۔ علمی آزمائشیں نہ تھیں۔ علمی مشکلات کا وہ مقابلہ نہیں کر سکے۔ چنانچہ خود حضرت مسیحؑ شاکی رہے کہ میرے مقام کو کوئی نہیں سمجھا۔ حتیٰ کہ انجیل میں تو یہاں تک لکھا ہے۔ کہ مسیحؑ نے اپنی فلسطینی زندگی کے آخری سال میں جبکہ صلیب کا واقعہ قریب تھا۔ اپنے سب سے مقرب شاگرد پطرس سے پوچھا کہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ اور جب انہوں نے بتایا کہ میں تو آپکو مسیح سمجھتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے (متی باب ۱۶ آیت ۱۶) جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اور تو اور حواری بھی انکو مسیح ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ صرف ایک معمولی نبی سمجھتے تھے۔ پس پطرس کے ایمان کو دیکھ کر انکو خوشی ہوئی۔

اس آیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰؑ کی طبیعتوں کا بھی مقابلہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ جلد سوال کرنے لگ جاتے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہی آپؐ پر ہر بات ظاہر کرتا۔ اور یہی فرق دونوں کی اُمتوں میں تھا۔

تورات پر نظر ڈالو۔ کہ بنی اسرائیل سوال پر سوال

محمدی کمالات کی بلندی

کر رہے ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم کا یہ حال ہے کہ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم انتظار کیا کرتے تھے، کہ کوئی اعرابی آوے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی سوال پوچھے۔ تا ہم بھی سُن لیں۔ گویا اس قدر وقار اور صبر نفس حاصل تھا۔ کہ خود نہ پوچھا کرتے تھے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ (بقرہ ع۱۳) کہ کیا تم میں سے بعض موسیٰؑ کی قوم کی طرح سوال کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا نہ کرنا۔ وہ لوگ انہیں بار بار خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے پر اور ہر بات کے متعلق سوال کرنے کے لئے مجبور کیا کرتے تھے۔

آنحضرت کے صبر نفس کا مقابلہ موسوی قوم سے

چنانچہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے صحابہؓ نے ادب کے طریق کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حال تھا کہ جو خدا تعالیٰ بتاتا سُن لیتے ورنہ صبر سے انتظار کرتے۔ اور اس حکم پر عمل فرماتے کہ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰہٰ ع۶) یعنی قرآن کریم کو اپنے وقت پر نازل ہونے دو۔ اور اس کی وحی کے آنے سے پہلے سوال نہ کیا کرو۔ اور یہ دُعا کیا کرو۔ کہ الٰہی میرے علم کو بڑھاتا رہ۔

۶۴؎ حل لغات لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا:۔ کہتے ہیں۔ اَحَاطَ بِهٖ عِلْمًا اى اَحْدَقَ علمُه بِهٖ مِن جميع جهاتِهٖ وعَرَفَهٗ۔ کسی بات کی خوب واقفیت اور آگاہی حاصل کی۔ (اقرب) پس لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا کے معنے ہونگے کہ جس بات کے علم کا تو نے احاطہ نہیں کیا۔

تحط بہ خبرا

تفسیر۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ موسوی

صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ○ قَالَ فَاِنِ

میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ ۵۶۵ اُسنے کہا (کہ) اچھا

اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰۤى اُحْدِثَ

اگر تو میرے ساتھ چلے۔ تو تو کسی چیز کے متعلق جب تک کہ میں اسکے متعلق تجھ سے ذکر کرنے

ع ۹

لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ○ فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِي

میں پہل نہ کروں مجھ سے سوال مت کیجیو ۵۶۶ پھر وہ (دونوں وہاں سے) چل پڑے۔ یہاں تک کہ جب

سلسلہ کے لوگوں کے لئے محمدی علوم کا سمجھنا واقعہ میں مشکل ہوگا۔ کیونکہ اس دین میں بہت سے مسائل نئے بتائے جائیں گے۔ اور اس شخص کے لئے جو اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہو۔ نئی بات کو ماننا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ کفار جن کے دل صاف تختی کی طرح تھے۔ وہ تو بہت جلد آپ پر ایمان لے آئے۔ مگر یہود و نصاریٰ جن کے پاس خدا کا کلام موجود تھا محروم رہے۔ کیونکہ ہر بات جو اسلام میں ان کی کتب کے خلاف ہوتی تھی۔ ان کے صبر کے پیمانہ کو چھلکا دیتی تھی۔ اور وہ ابتلاء میں پڑ جاتے تھے۔ حضرت مسیحؑ کے وقت میں بھی اسی وجہ سے یہود ہدایت سے محروم رہے۔ اور غیر قومیں اصرار کرکے اس دین میں شامل ہونے لگیں۔

یہود کے برکات سے محروم رہنے کی وجہ کثرت سوال تھی

۵۶۵ تفسیر۔ موسےٰؑ نے کہا۔ کہ تو مجھے صابر پائیگا۔ اور میں تیرے حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ اس آیت سے بھی ظاہر ہے۔ کہ یہ خواب تھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ جو مستقل نبی تھے، دوسرے شخص سے خواہ وہ کوئی ہو، یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ اُمور روحانیہ میں میں تیری فرمانبرداری کرونگا۔

اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ موسوی قوم میں سے جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کو پائیں، ان کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت فرض ہے۔ اور اسی کی طرف حدیث میں ان الفاظ میں اشارہ ہے۔ کہ "لو کان مُوسٰی وَعِیسٰی حیّین لما وسعھما الا اتّباعی"۔ (ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۲۴۶) اگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو وہ بھی میری پیروی کرتے۔

۵۶۶ حل لغات۔ اُحْدِثُ: اَحْدَثَہٗ کے معنے ہیں۔ ابتدأہٗ۔ اس کی ابتدا کی، پہل کی۔ (اقرب) پس حَتّٰۤى اُحْدِثَ کے معنے ہوں گے۔ یہاں تک کہ میں پہل کروں۔

تفسیر۔ یعنی اس عبد نے کہا۔ کہ بہت اچھا، چلو میرے ساتھ مگر جب تک میں خود نہ بولوں تم نہ بولنا۔

یہ عجیب لطیفہ ہے۔ کہ موسیٰ سے پہلے سے اس قدر عہد لئے گئے۔ اور پھر بھی وہ پوچھتے چلے گئے۔ مگر محمد رسول اللہ صلعم کے اسراء میں ان سے جبریل نے کوئی عہد نہ لیا۔ مگر پھر بھی جب دنیا اور شیطان کے تمثیلی وجودوں کے کرنے کے موقعہ پر جبریل نے آپ کو سوال کرنے سے روکا، تو آپؐ نے اس کی بات مان لی اور سوال نہ کیا۔ حالانکہ آپؐ نے کوئی عہد نہ کیا تھا۔ اس سے بھی محمدی مقام اور موسوی مقام کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا

وہ کشتی میں سوار ہوئے۔ تو اس (خدا کے برگزیدہ) نے اس میں شگاف کر دیا۔ اس نے کہا (کہ) کیا آپ نے اس لئے شگاف

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ

کیا ہے کہ آپ اس کے اندر (بیٹھ کر جا نے) والوں کو غرق کر دیں آپ نے یقیناً (یہ) ایک ناپسندیدہ کام کیا ہے ۷۵ اس (برگزیدہ خدا)

۷۶ **حل لغات**۔ انطلقا:۔ انطلق سے تثنیہ کا صیغہ ہے اور انطلق کے معنے ہیں۔ ذھب چلا گیا (اقرب) پس انطلقا کے معنے ہونگے وہ دونوں چل پڑے۔

خرقھا:۔ خرق الثوب کے معنے ہیں۔ مزّقہٗ کپڑے کو پھاڑ دیا (اقرب) الخرق:۔ قطع الشیئ علی سبیل الفساد من غیر تدبر و لا تفکر۔ کسی چیز کو خراب کرنے کے لئے بغیر سوچے سمجھے کاٹ دینا (مفردات)

اِمرًا:۔ الامر کے معنے ہیں العجیب عجیب۔ المنکر اوپرا۔ ناپسندیدہ (اقرب)

تفسیر:۔ اس مقام سے حضرت موسیٰ کے اسراء کا اصل واقعہ شروع ہوتا ہے۔ اور امت محمدیہ اور امت موسویہ کے حالات کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسراء اور حضرت موسیٰ کے اسراء میں یہ فرق ہے کہ رسول کریم صلعم نے سوال سے پرہیز کیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے صبر نہ کیا۔ اس سے بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی امت صبر سے دین پر قائم رہے گی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت بے صبری کر کے دین کو چھوڑ بیٹھے گی۔ یہ ایک لطیف نکتہ ہے اور واقعات اسکی تصدیق کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ فرماتے تھے کہ آنحضرت صلعم کے اسراء میں بھی تین واقعات دکھائے گئے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسراء میں بھی تین ہی واقعات دکھائے گئے ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے مزید علم یہ بخشا ہے۔ کہ صرف تین واقعات میں ہی مشابہت نہیں بلکہ دونوں کے اسراء میں جو واقعات دکھائے گئے ہیں انکی تعبیر بھی وہی ہے۔ اور صرف تمثیلی زبان میں فرق ہے ورنہ حقیقت ایک ہی ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا کیونکہ موسوی اسراء میں محمدی ظہور کی خبر دی گئی تھی پس ضروری تھا کہ محمدی اسراء کے واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا۔

مجھے یاد نہیں کہ حضرت مولوی صاحب سفینہ کے کیا معنے کیا کرتے تھے۔ میں جو اسکے معنے کرتا ہوں وہ مال کے ہیں۔ علم تعبیر الرؤیا میں سفینہ کی بہت سی تعبیریں لکھی ہیں۔ اور ان میں سے ایک تعبیر مال ہے (تعطیر الانام) میرے نزدیک اس کشف میں یہی تعبیر مراد ہے اور قرآن کریم بھی اسی کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا۔ (بنی اسرائیل ع ۷) یعنی تمہارا رب وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر میں کشتیاں چلائی ہیں تا کہ تم اللہ تعالیٰ کے فضل کو یعنی مال و دولت کو حاصل کرو۔ وہ تم پر بہت مہربان ہے۔ پس میرے نزدیک سفینہ سے مراد دنیاوی مال ہیں۔ اور کشتی میں دونوں کے سوار ہونے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کی امتوں پر ایک وقت ایسا آنے کو کہ انہیں دنیوی مال یا فراغت ملے گا

آگے لکھا ہے جب وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو اس ساتھی نے کشتی کو پھاڑ دیا۔ خرق الثوب کے معنے ہوتے ہیں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پس خرقھا

انطلقا ۱

خرقھا ۱

اِمرًا ۱

آنحضرتؐ کے اسراء اور موسیٰؑ کے اسراء میں فرق

کے معنے ہوئے۔ اس کے تختے نکال کر کشتی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یا دوسرے لفظوں میں ان کی قوم نے اعتراض کیا کہ کیا تیرا منشاء یہ ہے کہ اس کشتی کے سوار غرق ہو جائیں۔ تُو نے یہ کام بہت بُرا کیا ہے میرے نزدیک خَرَقَ سَفِیْنَہ سے مراد یہ ہے۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی دُنیا کو بہت سے شرعی احکام سے چھید ڈالا ہے۔ مثلاً اوّل زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جس سے مال کم ہوتا ہے پھر صدقات کا حکم دیا ہے پھر سود سے منع کر کے دولت کو نقصان پہنچایا ہے۔ پھر ورثہ کا حکم دیکر مال کو تقسیم کر دیا ہے۔ اور دولت کو بڑھنے سے روک دیا ہے۔ گویا دنیا داروں کی نگاہوں میں اپنی قوم کی دنیاوی زندگی تباہ کر دی ہے اور نیکو کاروں کی نگہ میں قوم کو دُنیا کی محبت کے بد اثرات سے اور قوم کو امراء کی غلامی سے بچا لیا ہے۔ یہ تعلیم موسوی سلسلہ کے لوگوں پر سخت گراں گزرتی ہے یہود پر بھی اور نصاریٰ پر بھی۔ کیونکہ گو نصاریٰ منہ سے تو یہی کہتے ہیں کہ سوئی کے ناکہ میں اونٹ کا گزر جانا آسان ہے لیکن دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا بہت مشکل ہے (مرقس باب آیت ۲۵) لیکن عمل ان کا یہ ہے کہ ان کے ممالک کے سب قوانین دولتمندوں کے اموال کے بڑھانے میں ممد ہیں۔ زکوٰۃ کا کوئی حکم ان میں نہیں۔ سود کی کھلی اجازت ہے جوئے کی اجازت ہے جائداد کو بہت سے ورثاء میں تقسیم کرنے کا کوئی حکم نہیں۔ بہت سے اُمراء اپنے بڑے بیٹوں کو دولت سپرد کر کے خاندان کی دولت کو بڑھاتے جاتے ہیں۔ اسی طرح انکی شریعت میں مزدوروں کے حقوق کی حفاظت نہیں۔ حالانکہ اسلام نے اس کے لئے بھی قواعد مقرر کئے ہیں تاکہ چند امراء غرباء کو غلام بنا کر اپنے اموال نہ بڑھاتے رہیں۔ ان امتیازات کی وجہ سے یہود اور نصاریٰ اسلام میں داخل ہونے سے کتراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام نے قوم کو غرق کرنے کی راہ کھول دی ہے۔

خرقِ سفینہ سے مراد

آنحضرت کی قوم اور موسےٰ کی قوم کے خیالات میں فرق

جس طرح یہ پہلا سبق ہے۔ جو اسراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا ہے بالکل اسیطرح رسول کریم صلعم کو اسراء کے دن پہلے ایک بڑھیا دکھائی گئی۔ اور اس کے بعد جب پیالے پیش ہوئے تو ان میں پہلا پیالہ پانی کا تھا۔ اور حضرت جبریل نے عورت کی بھی یہی تعبیر کی۔ کہ یہ بڑھیا دنیا تھی اور پانی کی بھی یہی تعبیر کی کہ یہ مال تھا۔ کیونکہ انہوں نے کہا کہ اگر تو پانی پی لیتا تو تو بھی غرق ہو جاتا اور تیری امت بھی غرق ہو جاتی یعنی دُنیا کے کاموں میں منہمک ہو جاتی اور اللہ تعالےٰ سے تعلق کمزور پڑ جاتا۔

دیکھو حضرت موسیٰ کی قوم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات میں کتنا فرق ہے۔ رسول کریم صلعم کو تو جبریل یہ کہتا ہے۔ کہ اگر تو پانی پی لیتا تو تیری قوم غرق ہو جاتی۔ گویا وہ بے عیب سفینہ کو یعنی دُنیاوی زندگی کو غرق ہونا قرار دیتے ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ یا دوسرے لفظوں میں انکی قوم ٹوٹی ہوئی سفینہ کا یعنی زکوٰۃ وغیرہ قواعد سے دُنیاوی اموال کے چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے کو روکنے کا نام قوم کا غرق ہونا رکھتے ہیں۔ جہاں اس قدر اختلاف آراء ہو وہاں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کس طرح ہو سکتا ہے۔ اور ایک فریق دوسرے کی ہیئت پر کب تک صبر کر سکتا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کشف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عبداللہ پر اعتراض کیا ہے کہ کشتی کے چندے میں سوراخ کیوں کیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کی قوم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا ہے۔ کہ چندے وغیرہ لے کر قوم کو تباہ کیوں کرتے ہو چنانچہ قرآن کریم میں یہود کا یہ اعتراض ان الفاظ میں بیان ہوا ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ (مائدہ ع ۹) یعنی یہود چندوں وغیرہ کے مطالبات کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ انہوں نے قوم پر بوجھ ڈال دیا ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کے خزانوں میں کمی ہے کہ ہمارے محدود اموال کو وہ خرچ کرائے گا جس کو اس نے

لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ○ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ

نے کہا۔ (کہ) کیا مَیں نے (تجھے) کہا نہیں تھا (کہ) تو میرے ساتھ رہ کر ہرگز صبر نہیں کرسکے گا۔ اُس نے کہا (کہ اس دفعہ) آپ مجھ پر گرفت نہ کریں

بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ○

کیونکہ میں (آپ کی ہدایت کو) بھول گیا تھا اور آپ میری (اس) بات کی وجہ سے مجھ پر سختی نہ کریں ۵۶۹

دیتا ہوگا تو دے گا۔ دوسرے لوگوں سے غرباء کی خدمت کیوں کروائی جاتی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہ کشتی والوں کی کشتی کیوں چھیدا جاتا ہے۔ اسی طرح عام کفار کے متعلق بھی قرآن میں آتا ہے اور ان میں یہود و نصاریٰ سب ہی شامل ہیں کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (یٰس ع۳) یعنی جب لوگوں کو محمد رسول اللہ یہ تعلیم دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو مال تم کو دیا ہے وہ صرف تمہارے لئے نہیں ہے سب دنیا کے لئے ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کے غریب بندوں پر خرچ کرو۔ تو وہ آگے سے مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ خود ان کو نہیں کھلا سکتا۔ پھر جب خدا نے باوجود بڑے بڑے خزانوں کے اُن کو نہیں کھلایا تو ہم کس طرح اُن کو اپنے اموال میں سے حصہ دیں۔ اور پھر یہ کہ کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم تو بڑے ہی بے راہ ہو کہ اس طرح اپنے اموال کو تباہ کرتے ہو۔ پس یہ اعتراضات اسلام کی تعلیم پر یہود اور دوسرے کفار کی طرف سے بکثرت ہوتے رہے ہیں اور آج تک ہو رہے ہیں لیکن خدا کا عاشق ٹوٹی ہوئی کشتی میں ہی اس دنیا کا سفر کرنا زیادہ پسند کرتا ہے بہ نسبت اس سلامت کشتی کے جو اس کے دل سے خدا تعالیٰ کی یاد کو بھلا دے۔

نصاریٰ کے لئے یہ ابتلاء سب سے زیادہ ہے کیونکہ وہ زیادہ مالدار ہیں۔ اس آیت سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ کشف ہے ورنہ جب کشتی میں چھید کیا تھا تو کشتی غرق کیوں نہ ہو جاتی۔

۵۶۸ تفسیر۔ یعنی مَیں نے تو پہلے سے ہی کہہ دیا تھا کہ میری تعلیم اور تمہاری تعلیم میں زمین و آسمان کا فرق ہے تم لوگ میرے ساتھ سفر نہیں کرسکتے جب تک اپنے نفوس کو بالکل مار نہ دو۔

۵۶۹ حل لغات۔ تُرْهِقْنِيْ۔ اَرْهَقَهٗ عُسْرًا کے معنے ہیں کلّفہٗ ایّاہ۔ اس پر سختی کی (اقرب) پس لَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا کے معنے ہونگے کہ آپ مجھ پر میری بات کی وجہ سے سختی نہ کریں (اقرب)

ترہقنی

تفسیر۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اچھا اس دفعہ معاف کرو۔ پھر ایسی بات نہ کروں گا۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ شروع شروع میں یہود و نصاریٰ محمد رسول اللہ صلعم سے صلح کرینگے مگر بعد میں اعتراضات شروع کردینگے اور آخر قطع تعلق ہو جائے گا۔ چنانچہ جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو پہلے یہود نے آپؐ سے صلح کی۔ اور آپؐ کی پارٹی میں شامل ہوئے۔ مگر جب ان قربانیوں کو دیکھا جو آپؐ کے ساتھ مل کر کرنی پڑی تھیں تو جھگڑا شروع کر دیا چنانچہ بنو قینقاع نے آپؐ سے اس بات پر اختلاف کیا کہ ایک تاوان جو بعض مسلمانوں پر پڑا تھا اور جس میں حصہ لینا معاہدہ کے رُو سے یہود پر بھی فرض تھا۔ اس میں حصہ لینے کے لئے یہود کو کیوں کہا جاتا ہے۔

نصاریٰ کا بھی یہی حال تھا۔ شروع شروع میں وہ مسلمانوں سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ حتّٰی کہ آپؐ نے جب بادشاہوں کو خطوط لکھے تو قیصر نے شروع میں آپؐ کی تعریف کی لیکن

نصاریٰ کے لئے مالی قربانی ابتلاء

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ

پھر (دونوں وہاں سے) چل پڑے یہاں تک کہ جب ایک لڑکے کو ملے تو اس (خدا کے بندہ) نے اسے مار ڈالا۔ (اس پر) اس (یعنی

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ

موسیٰ نے) کہا (کہ) کیا (یہ صحیح نہیں کہ) آپ نے (اس وقت) ایک پاکباز (اور بے گناہ) شخص کو کسی (کے خون) کے عوض کے بدوں

شَيْـًٔا نُّكْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ

(ناحق ہی) مار ڈالا ہے۔ آپ نے یقیناً (یہ) بہت برا کام کیا ہے۔ اس (خدا کے پیارے) نے کہا (کہ) کیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا (کہ)

بعد میں جب دیکھا کہ اسلامی سیاست مسیحی سیاست سے ٹکراتی ہے تو اسلام سے جنگ شروع کر دی۔ جس کا خمیازہ اس نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایسا بھگتا کہ صدیوں تک اس کا اثر نہ مٹا۔

قتل سے مراد حربی عیسائیوں کی شکست

حل لغات

نکر — نُكْرًا :- اَلنُّكْرُ۔ اَلْمُنْكَرُ ناپسندیدہ بات۔ اَلْاَمْرُ الشَّدِيْدُ مشکل کام۔ اَلْقَبِيْحُ برا۔ (اقرب)

زکیۃ — زَكِيَّةً :- یہ زکٰی (یزکو) سے فعیل کے وزن پر ہے۔ اور زکی الشیئ کے معنی ہیں نما۔ اس چیز نے نشوونما پائی۔ زکی الرجل۔ صلح وہ نیک و پاک ہوگیا۔ تنعم و کان فی خصب۔ خوب نازونعمت اور آسودگی میں ہوگیا بیضاوی نے غلامًا زکیًا کے معنے طاھرًا من الذنوب نامیًا علی الخیر کے کئے ہیں یعنے گناہوں سے پاک اور نیکی میں نشوونما پانے والا لڑکا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس موقعہ پر بھی حضرت استاذی المکرم یہ توجہ دلاتے تھے کہ اسراء کی حدیث میں آنحضرت صلعم کو جب جبریل باربار انطلق انطلق کا لفظ کہتے تھے موسیٰ کے واقعہ میں بھی انطلقا کا لفظ بار بار آیا ہے بس یہ بھی دلیل ہے کہ یہ اسراء روحانی تھا۔

نوجوان کو خواب میں دیکھنے کی تعبیر

حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ جب ایک نوجوان کو ملے تو اسے اس ساتھی نے قتل کر دیا حضرت استاذی المکرم فرماتے تھے۔ اس جگہ ان اعتراضوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو موسوی امت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کرنے والی تھی۔ کہ کعب بن اشرف وغیرہ کو انہوں نے کیوں قتل کروایا ہے اور اس کا جواب دیا ہے۔

میرے نزدیک یہ نظارہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے نظارہ کے مشابہ ہے اور اسی کے ہم معنی ہے۔ رسول کریم صلعم نے واقعہ اسراء میں بڑھیا کے دیکھنے کے بعد دیکھا تھا کہ کوئی شخص آپ کو اپنی طرف بلاتا ہے مگر آپ نے اسے جواب نہ دیا۔ نیز اس نظارہ کی تشریح کے لئے آپ کے سامنے شراب کا پیالہ پیش کیا گیا جس کے پینے سے آپ نے انکار کر دیا۔ اور جبریل نے اس آدمی کی تعبیر شیطان کی۔ اور اس پیالہ کی تعبیر غوایۃ۔ جو شیطان کا کام ہے۔ اسی طرح دوسرا نظارہ حضرت موسیٰ کو غلام کا دکھایا گیا ہے جس کو محمدی جمال نے قتل کر دیا۔ اب ہم علم تعبیر رؤیا میں نوجوان آدمی کو خواب میں دیکھنے کی تعبیر دیکھتے ہیں۔ تو علاوہ اور تعبیروں کے ایک تعبیر یہ لکھی ہے " تدل علی الحرکۃ والقوۃ والجھل (تعطیر الانام) یعنی خواب میں نوجوان مرد کو دیکھے تو اس کے معنے قوت نشاط اور جہالت کے ہوتے ہیں اور یہی امور انسان کو شیطان کے پیچھے چلانے والے ہوتے ہیں۔ یعنی ایک طرف طاقت ہو۔ دوسری طرف

تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ إِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ

تو میرے ساتھ رہ کر ہرگز صبر نہیں کر سکے گا ۷۱ اس نے کہا (کہ) اگر اس کے بعد میں نے کسی بات کے متعلق آپ سے پوچھا

شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي ۖ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ

تو (بیشک) آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے گا۔ (اس صورت میں) آپ یقیناً میری طرف سے معذور سمجھے جانے کی حد

لَدُنِّي عُذْرًا ۝ فَانْطَلَقَا ۗ حَتَّىٰ إِذَا أَتَيَا أَهْلَ

تک پہنچ چکے ہوں گے ۷۲ پھر وہ (وہاں سے بھی) چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی کے لوگوں

قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا

کے پاس پہنچے تو اس (بستی) کے باشندوں سے انہوں نے کھانا مانگا۔ مگر انہوں نے انہیں (اپنے) مہمان بنانے سے انکار

فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ فَأَقَامَهُ ۝

کردیا۔ پھر انہوں نے اس (بستی) میں ایک ایسی دیوار پائی جو گرنے کو تھی۔ اس (خدا کے بندہ) نے اسے درست کردیا

سیر تماشے دیکھنے کی خواہش ہو۔ اور تیسری طرف علم روحانی سے ناواقفیت ہو۔ یہ تین چیزیں جب جمع ہو جاتی ہیں تو انسان شیطان کے پیچھے چل پڑتا ہے پس یہ دونوں نظارے بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰؑ کے اسراء میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

اور یہ جو دکھایا گیا کہ اس عبد نے اس غلام کو مار دیا اور اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی دوسری تعلیم جو نصاریٰ کے لئے قابل اعتراض ہوگی وہ اسلام کا لغو امور لہو و لعب اور شراب سے روکنا ہوگا۔ اس پر موسوی سلسلہ کے لوگ (یعنی خصوصاً مسیحی۔ کیونکہ میں بتا چکا ہوں کہ دوسرا ساتھی جو حضرت موسیٰ نے دیکھا ہے وہ حضرت مسیح ہیں۔ اور مجمع البحرین کے پاس حضرت موسیٰ کی وہی امت باقی تھی جو حضرت مسیح ناصری کے ذریعہ سے آپ کو ملی تھی۔ ہاں دوسرے درجہ پر یہود بھی اس میں شامل ہیں) یہ اعتراض کریں گے کہ اسلام جوانی کو مارتا ہے اور انسان کو زندگی کا لطف لینے نہیں دیتا۔ اور یہ ظلم ہے اللہ تعالیٰ نے یہ طاقتیں زندگی کا مزہ لینے کے لئے دی ہیں نہ اس لئے کہ ان کو تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ غور کر کے دیکھ لو کہ ان شیطانی اعمال کی وجہ سے بالعموم مسیحی لوگ اسلام سے متنفر ہیں کیونکہ اس میں انہیں ان شیطانی افعال سے روکا گیا ہے اور ان کے نزدیک گویا جوانی کا اسلام نے خون کر دیا ہے۔

مسیحیوں کے نزدیک اسلام انسانی جذبات کا خون کرتا ہے۔

۷۱ **تفسیر** - یہ آیت بھی ثبوت ہے اس کا کہ یہ کشف ہے کیونکہ جاگتے ہوئے کسی کو بلا وجہ قتل کر دینا قطعاً حرام ہے۔

۷۲ **تفسیر** - یعنی اب کی دفعہ جانے دو اور تعلق نہ توڑو۔ پھر ایسا ہی کیا تو تعلق توڑ دینا۔ اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ بار بار مسلمانوں سے معاہدات کریں گے لیکن پھر ان کو توڑ دیں گے اور وہ عداوت جو

قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ○ قَالَ هٰذَا

(اسپر) اس نے (یعنی موسیٰ نے) کہا (کہ) اگر آپ چاہتے تو یقیناً اسکی کچھ (نہ کچھ) اُجرت لے سکتے تھے ۹۵؎ اس (خدا کے برگزیدہ) نے

انہیں اسلام سے پہلے ان پر غالب آجائے گی۔

۹۵؎ **تفسیر**۔ اَهْلَ قَرْيَةٍ سے مُراد قوم ہے کیونکہ قوموں کو جب دکھایا جاتا ہے گاؤں کی شکل میں دکھایا جاتا ہے اور ضیافت کی تعبیر تعاون ہوتی ہے لکھا ہے ضیافۃ خواب میں اجتماع علے خیر کے معنے رکھتی ہے (تعطیر الانام) یعنی کسی نیک بات میں باہم تعاون کرنے کا فیصلہ ضیافت کی شکل میں دکھایا جاتا ہے پس "دونوں نے کھانا مانگا" کی تعبیر یہ ہوگی کہ دونوں نے تعاون کی درخواست کی۔ اور ضیافت کے انکار کے معنے ہوں گے کہ قوم نے دونوں کے سوال کے جواب میں تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔

(حاشیہ: الطعام کی ضیافت سے انکار کی تعبیر)

اس کے بعد لکھا ہے کہ انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنے کو تھی۔ تعطیر الانام میں لکھا ہے کہ جب کوئی دیوار دیکھے جس میں خرابی ہوگئی ہو تو اس سے مُراد کوئی عالم یا امام ہوتا ہے جس کا مال جاتا رہتا ہے پھر اگر یہ دیکھے کہ اسکی مرمت کر دی گئی ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس عالم کے کام کو درست کر دیا جائے گا۔ اور اگر دیکھے کہ مرمت نہیں کی گئی تو اس کا کام تباہ ہو جائے گا اور نیز امام ابن سیرین کے تعبیر نامہ میں لکھا ہے کہ دیوار کے کچھ حصہ میں خرابی دیکھ کر اسے درست کرنے کی تعبیر اس جگہ کے والی کی بجائے دوسرے والی کا مقرر ہونا ہوتا ہے۔

(حاشیہ: دیوار بنانے کی تعبیر اور اس سے استدلال)

ان تعبیروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس سارے نظارہ کا یہ مطلب ہوگا کہ حضرت موسیٰ اور وہ اللہ کا بندہ جس کے ساتھ وہ چلے تھے ایک جماعت سے تعاون چاہیں گے مگر وہ تعاون نہ کرے گی۔ اور وہ کسی بزرگ کے کام کو خراب ہوتا دیکھیں گے۔ اسپر موسیٰ علیہ السلام تو خاموش رہیں گے لیکن وہ عبد اللہ اس کام کو درست کر دے گا یا یہ کہ اس قوم کے لئے دوسرا حاکم مقرر ہو جائیگا موسیٰ علیہ السلام اس امر کو دیکھ کر کہیں گے کہ اسپر کوئی اجر لیتے تو اچھا ہوتا مگر وہ اس بات کو سُن کر ناراض ہو جائیگا اور کہے گا کہ بس اب ہمارا تمہارا تعلق ختم ہے۔

(حاشیہ: اجرت نہ لینے پر اعتراض کرنے سے یہود کی تجارتی حرص کی طرف اشارہ ہے۔)

اس حصہ کی تعبیر حضرت استاذی المکرم مولوی نور الدین صاحب یہ فرمایا کرتے تھے کہ یا تو اوس اور خزرج مراد ہیں کہ دیر سے یہ قومیں ترقی سے محروم تھیں۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلعم کو مدینہ لے گیا۔ اور ان کے لئے بھی ترقی کی راہیں کھل گئیں یا فرماتے تھے کہ مُراد حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق کی اولاد ہے کہ ان کا کام خراب ہو رہا تھا ایک کے حق کی حفاظت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کر دی۔ اور دوسرے کے حق کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

میری رائے میں اس نظارے کا پہلا حصہ بتاتا ہے کہ قریہ سے مراد عالم یہودیت اور نصرانیت ہے جب اس سے تعاون کی درخواست کی گئی تو اس نے انکار کر دیا۔ اور دیوار سے یہود و نصاریٰ کے بزرگ مراد ہیں اور اس کے گرنے کے قریب پہنچنے سے مُراد ان کے بزرگوں کے اثر کا زائل ہونا ہے اور مرمت کرنے کے یہ معنے ہیں کہ انکی تعلیم کو پھر سے قائم کر دیا اور ان کے اندر ایک نیا والی یا حاکم مقرر کر دیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے جو کہا کہ اجر کیوں نہ لے لیا۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ موسوی قوم میں تجارتی حرص بہت بڑھ جائے گی اور وہ ہر اک کام کو اس کے دنیوی فائدہ کا اندازہ لگا کر کریں گے اور خالصتہً للہ کام کرنا ان کے لئے مشکل ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ موسوی سلسلہ کی آخری کڑی یعنی مسیحیت کا یہ حال ہے کہ انکی تعلیم بھی

دنیوی اغراض سے ہوتی ہے۔ انکی ہمدردی بھی دنیوی اغراض سے ہوتی ہے۔ حتّٰی کہ وہ تبلیغ کرتے ہیں تو اس میں بھی سیاسی اور دنیوی فوائد مدّنظر ہوتے ہیں خالصۃً للّٰہ کام جس میں کوئی دنیاوی خیال مدّنظر نہ ہو ان میں قریباً مفقود ہے۔

یہ جو فرمایا کہ اہل کتاب سے اپنے کاموں میں تعاون کی خواہش کی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ کی زندگی میں تو یہ موجود ہے کہ جب وہ اپنی قوم کو کنعان کا ملک دیئے جانے کا وعدہ دیکر مصر سے لائے اور کئی چھوٹی اقوام سے جنگیں ہونے کے بعد انکو اہل کنعان پر حملہ کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے جواب میں انہوں نے کہا۔ قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ ع ۵) یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ دشمن پر حملہ کرکے موعود ملک کو لیا جائے تو انہوں نے جواب دیا کہ وعدہ یا خدا کا تھا یا تمہارا تھا ہم اس وعدہ کے پورا کرنے کے لئے کیوں اپنی جانیں گنوائیں اے موسیٰ تم اور تمہارا خدا جاکر لڑو۔ اور اپنے وعدہ کو پورا کرو۔ ہم تو اپنی جگہ سے نہ ہلیں گے ہاں جب آپ دونوں اس ملک کو فتح کرلیں گے تو ہم بھی ملک میں داخل ہو جائیں گے اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے عین اس وقت جب اللہ تعالےٰ کا وعدہ پورا ہونے کو تھا ایک لغو عذر کی بناء پر حضرت موسیٰؑ سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کے بعض وعدے اس کے بندوں کے ذریعہ سے پورے کرائے جاتے ہیں اور بندوں کا فرض ہوتا ہے کہ اس قسم کے وعدوں کے پورا کرانے میں انبیاء سے تعاون کریں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عدم تعاون کی مثال قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران ع ۷) یعنے اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ کو یہ دعوت دے کہ آؤ اپنی ضدیں چھوڑ کر ایک بات میں تو ہم سے مل کر کام کرو اور وہ یہ کہ ہم سب مل کر توحید کو قائم کریں نہ خدا تعالےٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کریں اور نہ عقیدۃً اس کا کسی کو شریک قرار دیں اور نہ ناواجب طور پر جتھا بندی کریں بلکہ اللہ تعالےٰ کی مرضی کے مطابق عدل اور انصاف سے دُنیا میں کام کریں (گویا اللہ تعالےٰ اور بندوں سے صلح رکھنے کے بارہ میں اشتراک عمل کرنے کی ان سے درخواست کر) پھر فرماتا ہے کہ اگر یہ لوگ ایسی منصفانہ بات بھی نہ مانیں اور اس مشترک پروگرام پر عمل کرنے اور تعاون کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو اے مسلمانو! تم ہی ہمارے رسول کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان یہود و نصاریٰ سے کہہ دینا کہ جاؤ تم تعاون نہیں کرتے تو نہ کرو ہم اپنے خدا کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کے رسولؐ سے تعاون کریں گے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو مسیح کی قوم نے بھی ان سے تعاون نہیں کیا کیونکہ صلیب کے موقعہ پر سب لوگ حضرت مسیحؑ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

دعوت سے انکار میں یہود کے منکر ہونے سے عدم تعاون کی طرف اشارہ ہے۔

عیسائیوں نے حضرت مسیح سے تعاون نہ کیا۔

فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَالَمْ

کیونکہ یہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان جُدائی (کا وقت) ہے۔ جس بات پر تو صبر نہیں کر سکا میں ابھی

تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ

تجھے اس کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں ۵۷۴ کشتی تو چند مساکین کی تھی

لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ

جو دریا میں کام کرتے ہیں اور ان کے سامنے (دریا پار) ایک (ظالم)

اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ

بادشاہ تھا جو ہر ایک کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ اس لئے میں نے چاہا

سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ

کہ اسے عیبدار کر دوں ۵۷۵ اور اس لڑکے (کے واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس) کے ماں باپ

۵۷۴ تفسیر۔ یعنی عبداللہ نے جب یہ معاملہ دیکھا کہ برابر اعتراض ہوتے ہی چلے جاتے ہیں تو اس نے کہہ دیا کہ ہم آپس میں جُدا ہوتے ہیں اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا کہ باوجود دعوتِ اشتراک اور توحید کے نقطہ پر جمع ہو جانے کی درخواست کے جب اہلِ کتاب باز نہ آئیں گے اور اپنے شرک کو نہ چھوڑیں گے تو محمد رسول اللہؐ یہود اور نصارٰی سے قطع تعلق کریں گے اور آپس میں مقابلہ شروع ہو جائے گا۔

۵۷۵ تفسیر۔ اس آیت میں وہ تشریح بیان کی گئی ہے جو گزشتہ واقعات کی اس عبداللہ نے بیان کی ہے۔

بعض دفعہ خواب میں بتائی ہوئی تعبیر بھی تعبیر طلب ہوتی ہے۔

اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض دفعہ انسان خواب میں ہی تعبیر کرتا ہے کبھی وہ تعبیر واضح ہوتی ہے اور کبھی وہ جزئی انکشاف کرتی ہے اور یقظہ کی حالت میں پھر ایک دوسری تعبیر کی محتاج ہوتی ہے وہی معاملہ یہاں ہے جو تشریح عبداللہ نے کی ہے وہ کسی قدر اغلاق کو ضرور دُور کرتی ہے مگر واضح تعبیر نہیں بلکہ اس امر کی محتاج ہے کہ مادی دُنیا کے اصول کے مطابق اس کی دوبارہ تشریح کی جائے۔

سب سے پہلے عبداللہ نے سفینہ والا معاملہ لیا ہے اور اس کی تشریح یہ کرتے ہیں کہ یہ کشتی مسکینوں کی تھی جو اس سمندر میں کام کرتے تھے پس میں نے چاہا کہ میں اس کو عیب دار کر دوں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پرے ایک اور بادشاہ ہے جو ہر درست کشتی کو جبرًا چھین لیتا ہے پس اس بادشاہ کے ضرر سے بچانے کے لئے میں نے کشتی کو توڑ دیا۔

باقی سب امور کی تعبیر تو میں پہلے بتا آیا ہوں

مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ

(دونوں) مومن تھے (اور وہ ایمان کا دشمن تھا) اس لئے ہم نے ناپسند کیا کہ وہ (اپنی) سرکشی اور کفر سے انہیں ایذا

كُفْرًاۚ۝ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ

پہنچائے ۹۷۶ اس لئے ہم نے چاہا کہ ان کا رب انہیں پاکیزگی میں ان سے اچھا اور رحم (وشفقت)

صرف مسکینوں اور بادشاہ کی تعبیر باقی ہے۔ سو مسکینوں کی تعبیر تو مسکین دل لوگ مراد ہیں جن کو دُنیا کے اموال اور ترقیات غریبوں کی خبرگیری اور انکی ہمدردی اور ان کے ساتھ مل کر رہنے سے نہیں روکتے۔ اور بادشاہ سے مراد اس نظارہ میں دُنیا پرستی کی رُوح ہے کیونکہ دنیوی بادشاہ دُنیا کا ایک ظہور ہوتے ہیں اور چونکہ جبراً کشتیاں چھین لینے کا ذکر ہے اس لئے اس سے مراد دُنیا کی محبت کی رُوح ہے اور مُراد یہ ہے کہ جنکی دُنیا میں دینی رُوح نہیں ہوتی اور جن کے مالوں کا کافی حصہ غربا اور رفاہ عام کے کاموں کے لئے نہیں نکلتا۔ انکو دنیا کی محبت اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور انکے مال شیطان کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی اُمت کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی سفینوں میں سوراخ کردیں یعنی انکے مال دین کی خدمت اور بنی نوع انسان کی خدمت میں خرچ ہوتے رہیں تاکہ دُنیا کی محبت انکے دلوں پر قابو نہ پالے اور ان کے اموال خدا کے لئے ہونے کی بجائے ظالم دُنیا کے لئے نہ ہوجائیں

اس جگہ یہ لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسراء میں دنیا ایک عورت کی شکل میں دکھائی گئی ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام کو وہی دُنیا انکے اسراء میں ایک ظالم بادشاہ کی شکل میں دکھائی گئی ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کا حملہ اُمت محمدیہ پر نسبتاً کمزور ہوگا۔ اور وہ ایک بڑھیا کی طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کریگی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت پر اس کا حملہ شدید ہوگا اس لئے انکی امت کو مدنظر رکھتے ہوئے دُنیا انہیں ایک ظالم بادشاہ کی شکل میں دکھائی گئی۔

مسکین کی تعبیر

۹۷۶ **تفسیر**۔ میں اوپر بتا آیا ہوں کہ غلام کی تعبیر الحرکۃ والقوۃ والجھل ہوتی ہے چنانچہ عبد الغنی (یعنی النابلسی) نے جو تشریح فرمائی ہے وہ بھی اس کے مطابق ہے وہ کہتے ہیں کہ غلام دو نیک ماں باپ کا بچہ تھا پس ہم ڈرے کہ اگر اسے زندہ رہنے دیا گیا تو وہ اپنے ماں باپ کے لئے سرکشی اور کفر کا موجب ہوگا۔

بادشاہ کی تعبیر

میں یہ تو بتا چکا ہوں کہ سرکش اولاد کو قتل کرنا بغیر کسی جرم کے ناجائز ہے پس یہ نظارہ بھی تعبیر طلب ہے اور جبکہ غلام کی تعبیر حرکت قوۃ اور جہالت کی ہے تو لازماً اسکے ماں باپ بھی اسی قسم کے ہونے چاہئیں کیونکہ حرکت قوت اور جہالت معنوی اشیاء ہیں مادی نہیں ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ حرکت قوت اور جہالت کہاں سے پیدا ہوتی ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشیاء انسانی رُوح اور جسم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رُوح اور جسم میں جو زوجین یعنی میاں اور بیوی کی حیثیت رکھتے ہیں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ مل کر انسان میں حرکت قوت اور جہالت یعنی عواقب سے بے پروا ہوکر کام کرنے کی طاقت پیدا کردیتے ہیں لیکن یہ تینوں چیزیں جہاں انسان کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں وہاں ان کا حدود کے اندر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسانی رُوح اور جسم طغیان اور کفر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

آنحضرت کو دنیا ایک عورت کی شکل میں دکھائی جانے میں حکمت

کسی چیز کے جوش کو کم کردینا عربی زبان میں قتل کہلاتا ہے چنانچہ عربی کا محاورہ ہے قَتَلَ الشَّرَابَ مَزَجَهٗ بِالْمَاءِ یعنی شراب میں پانی ملاکر اسکے جوش کو کم کردیا (اقرب)

قتل الجوع والبرد ونحو ذٰلک کسر شدتہٗ یعنی

زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ

میں (اپنے ماں باپ سے) زیادہ قریب (لڑکا) بدل دے گا اور وہ دیوار اس

لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ

شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا کچھ

جب قتل الجوع والبرد وغیرہ الفاظ بولیں تو مراد یہ ہوتی ہے کہ بھوک سردی وغیرہ کی تیزی کو کم کر دیا۔ (اقرب) قتل غَلِيْلَهٗ سقاہ فزال غلیلہ یعنے قتل غلیلہ کے معنے ہیں اسے پانی پلا کر پیاس کو بجھا دیا (اقرب) غرض قتل کا لفظ صرف جاندار کے لئے ہی نہیں بولا جاتا۔ بلکہ جذبات اور احساسات کیلئے بھی بولا جاتا ہے اور اس سے مراد ان جذبات اور احساسات کی تیزی کو دُور کرنا ہوتا ہے پس عبداللہ کی تاویل کا یہ مطلب ہُوا کہ حرکت قوت اور جہالت کے ماں باپ تو مومن ہیں یعنی ان میں احکام الٰہی کے ماننے کا مادہ ہے انکو اعلیٰ سے اعلیٰ اعمال کی قوت بخشی گئی ہے اور ان قوتوں کو عمل میں لانے کے لئے حرکت قوت اور جہالت کی طاقتیں ان میں سے پیدا کی گئی ہیں یعنی ایک تو رُوح اور دماغ انسانی میں آگے بڑھنے کا شدید مادہ ہے دوسرے بڑے بڑے کام کرنے کی طاقت ہے تیسرے بڑے بڑے خطرات برداشت کرنے کی ہمت ہے ان تینوں قوتوں سے جو رُوح اور جسم کے امتزاج سے انسان میں پیدا ہوتی ہیں وہ اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کر سکتا ہے لیکن اگر ان قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو یہی تو تیں انسانی روح اور انسانی جسم کو نافرمانی اور کفر کی طرف لے جاتی ہیں اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے پسند نہ فرمایا کہ انسانی روح اور انسانی جسم جیسے اعلیٰ اور کارآمد وجودوں کو طغیانی اور کفر میں مبتلا ہونے دے۔ پس اس نے جلوۂ محمدی کے ذریعہ سے ان تین طاقتوں کو قتل کروا دیا۔ یعنی شریعت کے احکام کے ذریعہ سے انکو سمو دیا اور انکی شدت کو کم کر دیا تاکہ اس کے بعد جو جذبات انسان میں کام کریں وہ نیکی کی قیود کے ماتحت اور اس کے حلقہ میں کام کریں۔

عبداللہ کی تاویل کا مطلب

۲ زکوٰۃ کے معنی

۱۰۸ **تفسیر** یعنی یہ قیود اور پابندیاں اس لئے لگائی گئیں تاکہ انسان کے اندر آزاد جذبات کی بجائے پابند احمق جذبات پیدا ہوں گویا پہلے جذبات قتل ہو کر ایک نیا صالح بیٹا ان کو ملے جو انسان کا مطیع ہو اور بجائے اسکو کفر و طغیان کے گڑھے میں گرانے کے اس کو رحمتِ الٰہی کا مستحق بنائے۔

زکوٰۃ کے معنے پاکیزگی اور ترقی کے ہوتے ہیں اور رحم کے معنے رقت اور تلطف کے ہوتے ہیں پس معنے یہ ہوئے کہ جو نیا بیٹا ہوگا وہ ان کی ترقی اور پاکیزگی کا موجب اور ان کی باتیں ماننے والا اور ان کی اطاعت کرنے والا ہوگا یعنے جب آزاد قوائے انسانی کو شریعت کی تلوار سے قتل کر دیا جائے گا۔ اور ان کی وحشیانہ آزادی کی شدت کو توڑ دیا جائے گا تو وہ ایسی شکل اختیار کر لیں گے کہ رُوح و جسم کی بات مانیں گے اور ان کی ترقی اور پاکیزگی کا موجب ہوں گے۔

مگر جیسا کہ بتایا جا چکا ہے موسوی قوم نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اور عیش پرستی اور بے پردگی اور لہو و لعب میں مشغول ہو گئے جس کی وجہ سے ان کی حرکات میں تیزی ان کی قوتوں میں حدت اور ان کی بے باکانہ جرأت میں ایک شان تو ضرور نظر آتی ہے لیکن یہ طاقتیں انہیں طغیان و کفر میں بڑھا رہی ہیں اور نیکی اور تقویٰ سے دُور کر رہی ہیں اور مذہب و عقل جو رُوح اور جسم کے نمائندے ہیں ان کی بات ماننے کے لئے جذبات تیار نہیں ہوتے۔

كَنْزَلَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ

خزانہ (گڑا ہوا) تھا۔ اور ان کا باپ نیک (اور مناسب حال کام کرنے والا) تھا۔ اس لئے تیرے رب نے چاہا کہ

يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً

وہ اپنی مضبوطی کی عمر کو پہنچ جائیں اور (بڑے ہوکر) اپنا خزانہ (خود) نکالیں۔ تیرے رب کی طرف سے (انپر خاص)

مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ

رحم (ہوا) ہے اور یہ (کام) میں نے اپنے نفس کے حکم سے نہیں کیا۔ یہ اس

مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۞ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى ۱۰ ع ۱۲

بات کی حقیقت ہے جس پر تو صبر نہیں کر سکا [شـہ] اور وہ تجھ سے ذوالقرنین کے متعلق

[شـہ] حل لغات ۔ اَلْكَنْزُ: کے معنے ہیں المالُ المدفونُ فی الارضِ ۔ دفینہ وَقِیْلَ اسمٌ لِلْمَالِ اِذا احرز فی وعاءٍ اور بعض اس مال کو کہتے ہیں جو تھیلے وغیرہ میں محفوظ رکھا جائے۔ الذهب سونا ۔ الفضة ۔ چاندی (اقرب)

تاویل ۔ کے معنوں کے لئے دیکھو یونس [شـہ]

تفسیر ۔ یعنی اب ایک سوال حل طلب رہ گیا ہے جس میں ہمارا تمہارا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ تم یہ نہیں سمجھ سکے کہ بغیر کسی ذاتی غرض کے ہم نے ایک گرتی ہوئی دیوار کس طرح بنا دی سو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دیوار ایک خزانہ کی محافظ تھی اور یہ خزانہ دو یتیموں کا تھا جن کا باپ صالح تھا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں دیوار سے مراد یہود و نصاریٰ کے بزرگ ہیں یعنی خود موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے باپ حضرت ابراہیم ہیں جنکی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (نحل ع ۱۶) اور کنز سے مراد وہ علمی خزانہ ہے جسے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیم نے محفوظ کیا ہوا تھا۔ مگر یہود و نصاریٰ کی بے توجہی اور دین سے دوری کی وجہ سے موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کا تصرف جو ان خزانوں کی حفاظت کے لئے کام کر رہا تھا کمزور پڑ گیا تھا۔ محمد رسول اللہ صلعم نے پھر اس دیوار کو بنا دیا یعنے ایک نئے قانون کے ذریعہ سے ان صداقتوں [۱] کو جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیم میں پائی جاتی تھیں محفوظ کر دیا یعنی جو سچائیاں ان میں تھیں خصوصًا وہ پیشگوئیاں جو اسلام اور محمد رسول اللہ صلعم کے ظہور کے متعلق تھیں انکو قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا تاکہ جب کبھی یہود و نصاریٰ کو عقل آئے وہ اپنے بزرگوں کی پیشگوئیوں سے ہدایت پاکر محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لاکر اپنی حالت درست کر سکیں۔

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ یعنی یہ سب کام اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہوا ہے باوجود یہود و نصاریٰ کی سرکشیوں کے اللہ تعالیٰ نے انکو چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ چنانچہ قرآن کریم کے اندر ان خزانوں کو جو محفوظ رکھنے کے قابل ہیں جمع کر دیا گیا ہے تاکہ جب بھی یہود و نصاریٰ کو توجہ ہو اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ دیوار جو نئی بنائی گئی تھی قرآنی دیوار ہے اور قرآن کریم میں (جو خالصتًہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں جیسا کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (نجم ع ۱) میں فرمایا گیا ہے) وہ خزانہ جمع کر دیا گیا۔ پھر اس عبد اللہ کی زبانی یہ کہلوایا گیا ہے کہ اے موسیٰ یہ وہ حقیقت ہے جس کے متعلق تم صبر نہیں کر سکے۔

یہ آخری حصہ موسیٰ علیہ السلام کے کشف کا بھی رسول کریم صلعم کے

[۱] الکنز

[۱] پرانی دیوار سے مراد یہود و نصاریٰ کے بزرگ۔

[۲] نئی دیوار سے مراد قرآنی تعلیم ہے۔

اسراء کے مشابہ ہے کیونکہ آپ کے کشف کا آخری حصہ یہ تھا کہ آپؐ کو حضرت ابراہیم نوح حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام نے سلام کیا جس کے یہ معنے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے کشف کے سب سے آخری نظارہ میں جو خدمت اولاد ابراہیم اور امتِ موسیٰ اور اتباعِ عیسیٰ کی آپؐ نے سر انجام دی تھی اس کا انکشاف چونکہ ان پر ہوگیا وہ آپ کے بیت المقدس تشریف لے جانے کے موقعہ پر اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آگے آئے بیشک موسیٰؑ نے اپنے کشف میں اسکی حقیقت کو پوری طرح نہ سمجھا اور اس پر اعتراض کر دیا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر حقیقت کھول دی تو نہ صرف وہ بلکہ ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام بھی اظہارِ امتنان کے لئے رسول کریم صلعم کو ملے۔ ابراہیم اس لئے کہ انکی دونوں اولادوں اسمٰعیل اور اسحاق کی نجات کے لئے آپؐ نے کوشش کی ایک نسل کی نجات کے لئے آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور دوسری نسل کی نجات کے لئے آپؐ کی قوم اصلی بیت المقدس کی طرف بڑھی۔ اور موسیٰ علیہ السلام جنہوں نے بغیر مزدوروں کے دیوار بنانے پر اعتراض کیا تھا یہ معلوم کر کے کہ یہ دیوار تو وہ خود تھے اور اس کے نیچے کا خزانہ انہی کی تعلیم تھی جسے آنحضرت صلعم نے محفوظ کیا اپنے اعتراض کا کفارہ ادا کرنے کے لئے حضرت مسیح کو ساتھ لے کر جو آنحضرت صلعم کے آپ سے کم ممنون نہ تھے استقبال کے لئے آئے جسکے یہ معنی تھے کہ ہم نے پہلے آپ کی اس خدمت کو بُرا سمجھا تھا مگر اب اللہ تعالیٰ نے ہم پر حقیقت کھول دی ہے اس لئے اے محمدؐ آپ پر سلام ہو آیئے ہمارے گھروں کو برکت دیجئے۔ اور ہماری اُمتوں کو نجات دلایئے۔ اب دیکھو کہ یہ مضمون جو علم تعبیر الرؤیا سے نکلتا ہے یہ تو ایسا ضروری ہے کہ اسکے لئے رسول کریم صلعم فرماتے کہ کاش موسیٰ علیہ السلام خاموش رہتے تو امتِ محمدیہ اور میرے کاموں کی کچھ اور تفصیل ہمیں انکے اسراء سے معلوم ہو جاتی۔ مگر کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم نے یہ فرمایا کہ یہ سینا کچھ دیر اور ہوتا تو ہم بھی کشتیوں کے ٹوٹنے نوجوانوں کے قتل ہونے اور دیواروں کے تعمیر کا نظارہ دیکھتے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَهَبَ لِي مِنْ لَدُنْهُ عِلْمًا رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا وَإِسْلَامًا۔ آمین

اسراء موسیٰ میں بیان کردہ امور کی حکمت

اسراء میں حضرت کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے آنے کی وجہ

کو پڑھ لینے کے بعد جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں یہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ موسیٰ کے اسراء کو اس جگہ پر اس لئے بیان کیا گیا ہے تا یہ بتایا جائے کہ (۱) حضرت مسیح ناصری کی قوم جو امتِ موسویہ کا آخری حصہ ہے اس کے بگڑ جانے کے بعد بعثتِ محمدیہ مقدر تھی۔ (۲) پس جب دورِ توحید کے بعد مسیحی بگڑ گئے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ضروری تھا۔ (۳) اسلام کی تعلیم ایسے قوانین اور ایسے اصول پر مبنی ہے کہ موسوی تعلیم اس سے بعض جگہ شدید اختلاف رکھتی ہے۔ اس وجہ سے موسوی اور عیسوی امتوں کے لئے اس کے ساتھ تعاون کرنا مشکل ہے مگر اس تعلیم کے بغیر نجات بھی نہیں (۴) یہودی اور مسیحی لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے دعویٰ کے وقت نہیں مانیں گے۔ بلکہ بحیثیت قوم ایک لمبے عرصہ کے بعد مانیں گے۔ اس عرصہ میں وہ اپنا رُوحانی سفر الگ طور پر جاری رکھیں گے (۵) آخر ایک لمبے عرصہ کے بعد وہ تھک جائیں گے اور ان کے دل اپنی کوششوں کے ذریعہ امن حاصل کرنے سے مایوس ہو جائیں گے تب وہ اپنی حالت کا جائزہ لیں گے اور سمجھ لیں گے کہ یہ سفر ہم نے بغیر کسی مقصد کے جاری رکھا۔ درحقیقت ہمارا اکیلا سفر بہت پیچھے ختم ہو چکا ہے (۶) اس وقت وہ پیشگوئیاں جو قرآن کریم نے انکی کتب سے محفوظ کر لی ہیں ان کی ہدایت کا موجب ہونگی اور (۷) وہ ان قیود کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے جن کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور اپنے وحشی جذبات کو قتل کر کے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار جذبات پیدا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے تب اللہ تعالیٰ کا رحم ان پر نازل ہوگا اور وہ اس کی رحمت کے سمندر میں داخل ہو جائیں گے جس کا کوئی کنارہ نہیں جس کے بعد کوئی اور سمندر نہیں۔ سوائے اس کے جو اس کا حصہ ہو اور اسی میں سے ہو۔

اسراء موسیٰ ۱۔ ان واقعات اور ان تشریحات

الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ اِنَّا

بھی سوال کرتے ہیں تو (انہیں) کہہ (کہ) میں ضرور اس کے متعلق کچھ ذکر تمہارے سامنے کروں گا ۵۹ہم نے یقیناً

۵۹ **حل لغات** ۔ القرنین : القرنؔ کا تثنیہ ہے اور القرن کے معنے ہیں ۔ الروق من الحیوان جانور کا سینگ ۔ القرن ۔ مائۃ سنۃ ۔ سو سال ۔ القرنان کنایۃ عن مشرق الارض ومغربہا یعنی قرنان کا لفظ بول کر کنایۃً مشرق اور مغرب کے ممالک مُراد لیتے ہیں ۔ (اقرب)

تفسیر :۔ یہ ذوالقرنین کا واقعہ بھی ایسا ہے کہ خدا تعالےٰ نے استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب کو اس کی طرف راہنمائی کرنے کا فخر بخشا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے مضمون پر زمانہ حال کے بعض دوسرے مصنفوں نے بھی روشنی ڈالی ہے اور اس غلط خیال کی تردید کی ہے کہ اس سے مراد سکندر رومی ہے ۔ اور بعض نے ذوالقرنین کے معنے یہ کئے ہیں کہ ایک بادشاہ جس کی حکومت مشرقی اور مغربی ممالک میں پھیل گئی تھی ۔ بلکہ ایک جرمن ڈاکٹر ہربیلاٹ مصنف ببلیا اور ینٹل نے تو یہ کہہ کر کہ اس سے مراد ایران کے ابتدائی بادشاہوں میں سے کوئی ہے قریباً صداقت پر ہاتھ جا مارا ہے ۔ (ویریز کمنٹری آن قرآن) حضرت مولوی صاحب نے ذوالقرنین کے بارہ میں اپنی تحقیق کی بنیاد بائبل پر رکھی ہے ۔ آپ فرماتے ہیں دانیال نبی کی ایک خواب بائبل میں لکھی ہے اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رؤیا میں ایک مینڈھا دیکھا جس کے دو سینگ تھے اور وہ پچھم اتر دکن کی طرف سینگ مارتا تھا اور کوئی جانور اس کے سامنے نہ ٹھہر سکتا تھا ، اور وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا ۔ (دانیال باب ۸ ۳ و ۴) پھر لکھا ہے کہ خدا تعالےٰ نے مجھے یہ خبر بتائی کہ " وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو مادہ اور فارس کے بادشاہ ہیں ۔" (دانیال باب ۸ ۔ آیت ۲۰) اس خواب کی بناء پر جس میں مادہ اور فارس کے بادشاہوں کو دو سینگ والے مینڈھے کی شکل میں دکھایا گیا ہے آپ فرماتے تھے کہ ذوالقرنین سے مراد مادہ اور فارس کا کوئی بادشاہ ہے ۔ نیز آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ بادشاہ کیقباد تھا ۔

القرن

ذوالقرنین کا واقعہ بیان کرنے کی حکمت

ذوالقرنین کے واقعہ کی طرف راہنمائی کا فخر حضرت خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ عنہ کو

حضرت استاذی المکرم کا خیال بیان کرنے کے بعد اب میں اپنی تحقیق بیان کرتا ہوں ۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں ذوالقرنین کے متعلق اپنی تحقیق بیان کروں میں یہ امر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ذوالقرنین کا واقعہ قرآن کریم میں کیوں بیان کیا گیا ہے اور اسے سورۃ کہف کے اس حصہ میں واقعہ اسراء کے بعد کیوں رکھا گیا ہے ۔

میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ سورۃ کہف میں اسلام اور مسیحیت کے مقابلہ کا ذکر ہے خصوصاً اس حصہ کا مقابلہ جو نیم سیاسی کہلا سکتا ہے یعنی ہے تو مذہبی مگر دونوں مذہبوں کی سیاسیات سے وابستہ ہے ۔

سورۃ کہف کے واقعات کی ترتیب کی حکمت

سب سے پہلے اصحاب کہف کا واقعہ بیان کرکے بتایا کہ مسیحیت کی ابتداء کس طرح ہوئی اور وہ کس طرح بگڑ گئے پھر موسیٰ علیہ السلام کے اسراء کے واقعہ کو بیان کرکے بتایا کہ اصحاب کہف کی نسلوں کی ترقی ایک حد تک جا کر رک گئی ۔ کیونکہ موسیٰؑ کے اسراء میں یہ بات بتائی گئی تھی کہ موسیٰؑ کی قوم ایک حد تک جا کر روحانی ترقی سے محروم ہو جائیگی ۔ اور اس وقت ایک اور نبی خدا تعالےٰ کی طرف سے ظاہر ہوگا اور یہ بھی بتایا گیا تھا ۔ کہ موسیٰ کی قوم سے مراد اس جگہ موسوی سلسلہ کا آخری حصہ ہے یعنی مسیحی ۔ ورنہ خالص موسوی حصہ تو پہلے ہی ختم ہو چکا ہے ۔ غرض اصحاب کہف کے واقعہ کے بعد

اسرا رموسیٰ کا واقعہ بیان کرکے بتایا کہ مسیحی قوم کی پہلی ترقی کا دور محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت کیساتھ ختم ہو جائیگا چنانچہ بعد کے واقعات سے یہ پیشگوئی زبردست طور پر پوری ہوئی اور مومنوں کے ایمان کو اس سے بے انتہا تقویت ملی۔ کیونکہ مکی زندگی میں یہ خبر دینا کہ مسلمان عیسائیوں کو زک دیں گے ایک ایسی زبردست پیشگوئی ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس کے بعد ذوالقرنین کا واقعہ مسیحی قوم کی ترقی کے دوسرے دور کی خبر دینے کے لئے بیان کیا گیا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس طریق کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی معمولی طور پر مسیحیت کی ساری ترقی کو اکٹھا بیان کر دیا جاتا تو اس کا یہ جواب ہے کہ دنیاداروں کی نگاہ میں بے شک یہ معمولی بات ہے لیکن جو شخص دین کی اہمیت کو سمجھتا ہو وہ اسے کسی صورت میں جائز نہیں کہے گا۔ بلکہ قرآن کریم کے اختیار کئے ہوئے طریق کو ہی درست اور ضروری قرار دیگا۔

اقوام کی مذہبی اقسام

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ الٰہی قانون کے مطابق جو شروع زمانہ سے چلا آیا ہے اقوام کی مذہبی حالت چار قسم کی ہوتی ہے۔ (۱) وہ قومیں جو نبیٔ وقت پر ایمان لاتی ہیں۔ اور اس ایمان پر ثابت قدم رہتے ہوئے دینی، دنیوی ترقیات حاصل کرتی ہیں۔ (۲) وہ قومیں جو نبیٔ وقت پر ایمان لاتی ہیں لیکن بدکاریوں اور شرارتوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ یہ قومیں گو اللہ تعالےٰ کے غضب کے نیچے ہوتی ہیں لیکن اپنی قومی ہیئت تبدیل کئے بغیر اسی مذہب میں رہتے ہوئے اپنی اصلاح کرکے خدا تعالےٰ کے فضل کو دوبارہ جذب کر سکتی ہیں۔ کیونکہ نبیٔ وقت پر انہیں ایمان ہوتا ہے۔ صرف عمل خراب ہو جاتے ہیں (۳) وہ قومیں جو نہ صرف بدعمل ہو جاتی ہیں بلکہ ان کی خرابی کے زمانہ میں دوسرا نبی آجاتا ہے اور وہ اس کے ماننے سے محروم رہ جاتی ہیں۔ اس وقت ان کی طرف سے کسی قسم کی اصلاح کی کوشش بھی خدا تعالےٰ کو راضی نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنی قومی ہیئت کو نہ بدلیں۔ اور اللہ تعالےٰ کے آخری نبی کو قبول نہ کریں۔ (۴) وہ قومیں جو کسی نبی پر ایمان ہی نہیں رکھتیں اور ان کی سب ترقیات خالص دنیوی ہوتی ہیں۔ اور خدا تعالےٰ سے روحانی تعلق پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ وقت کے نبی پر ایمان لاکر اس کے احکام کے مطابق عمل کریں۔

ان چاروں حالتوں کے سمجھ لینے کے بعد یہ امر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ مسیحی ترقی کے دور اول کا آخری حصہ اس قوم کو دوسری قسم کی اقوام میں شامل کرتا ہے یعنی اس وقت وہ دین سے دور تو جا چکے تھے۔ مگر اپنی ہیئت بدلے بغیر اللہ تعالےٰ سے صلح کر سکتے تھے کیونکہ وہ حضرت مسیح کو جو وقت کے نبی تھے مانتے تھے۔ مگر اس کے بعد اسرا موسیٰ کی پیشگوئی کے مطابق محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ظاہر ہو گئے اور اب مسیحی قسم دوم سے نکل کر قسم سوم میں شامل ہو گئے۔ کیونکہ وہ مجمع البحرین کو بھول کر آگے نکل گئے یعنی ان کی عملی اور اعتقادی حالت ہی خراب نہ رہی بلکہ خدا تعالیٰ سے صلح کرنے کے لئے اب ضروری ہو گیا کہ وہ اپنی سیاست اور اپنے نظام کو بھی ترک کریں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر اسلامی نظام اور اسلامی سیاست میں شریک ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ جب یہ دونوں قسمیں اس قدر مختلف ہوں اور خصوصاً جبکہ گفتگو نیم سیاسی اثرات کے متعلق ہو تو اس عظیم الشان فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جبکہ اس طریق کلام سے مزید فائدہ یہ پہنچتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود مسیحی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ ترتیب نہ صرف ضروری معلوم ہوتی ہے بلکہ ایک معجزانہ ترتیب معلوم ہوتی ہے

خلاصہ یہ کہ پہلے اصحاب کہف کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ مسیحی یا تو نیک تھے یا بگڑ تو چکے تھے مگر نبیٔ وقت کے ماننے والے تھے اور خدا تعالےٰ سے صلح کرنے کے لئے انہیں اپنی قوم اور اپنی سیاست کو چھوڑنے کی ضرورت نہ تھی

اس کے بعد موسیٰ کی زبانی محمد رسول اللہ کے ظہور کی خبر دی اور بتایا کہ اس نبی کے پیدا ہونے کے بعد مسیحی قوم کی حالت بدل جائے گی۔ انہیں پھر بھی ترقی تو ملے گی لیکن اس ترقی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے صلح کرنی ناممکن ہوگی کیونکہ وقت کے نبی کو پیچھے چھوڑ کر وہ آگے نکل چکے ہونگے جب تک وہ واپس آکر اس نبی کے ہمرکاب نہ ہوں گے ان کی ترقیات خالص دنیوی ہوں گی اور آخرت کا اس میں کوئی بھی حصہ نہ ہوگا۔ پس اس زمانہ کا حال الگ بیان کیا کیونکہ اس زمانہ کی مسیحی قوم نہ صرف سیاستاً بلکہ مذہباً بھی پہلے مسیحیوں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

یہاں ایک اور بات قابل تشریح رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ذوالقرنین کا ذکر بیچ میں کیوں کیا۔ جبکہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے کا تھا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ مسیحی ترقی کے دو دوروں کا نام آسمانی کتب میں الگ الگ رکھا گیا ہے۔ ایک دور اصحاب کہف کا دور ہے یعنی جبکہ اصحاب کہف والی کیفیت ان میں پیدا تھی۔ یا وہ اصحاب کہف کی طرح نیک بننے کی قابلیت رکھتے تھے گو عملاً نیک نہ ہوں۔ دوسرا دور آسمانی کتابوں میں دور یاجوج و ماجوج کہلاتا ہے۔ یعنی وہ دور جس میں نیک بننے کی قابلیت ہی ان سے جاتی رہے گی اور ایک نئے نبی کے ظہور کی وجہ سے وہ اپنی ہیئت قومی چھوڑ کر ہی خدا تعالیٰ کو پا سکیں گے اس نئے دور کے ساتھ ذوالقرنین کا تعلق ہے اور ذوالقرنین کے بعض اعمال اس دور کے پیدا ہونے کا موجب ہوئے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ یاجوج و ماجوج ان قوموں کا نام ہے جو شمالی ایشیا اور مشرقی یورپ کے علاقوں میں رہتی تھیں ایشیا کی زرخیزی کی وجہ سے وہ اس پر حملے کرتی تھیں۔ اگر ان حملوں میں وہ کامیاب ہو جاتیں تو جس طرح آریہ قوم ہندوستان میں بس کر دوسری پرانی قوموں میں مل جل گئی ہے یہ قومیں بھی ایشیا کے مختلف ممالک میں پھیل کر دوسری اقوام کے ساتھ مل جاتیں اور ہر ملک کے مطابق مذاہب اختیار کر لیتیں اور کسی ایک مذہب پر جمع نہ ہوتیں لیکن خدا تعالیٰ کی قدرت سے ہوا یہ کہ ذوالقرنین (جس کے متعلق تفصیل آگے آئے گی) نے ان اقوام کے حملوں کو بڑی سختی سے روک دیا۔ اور یہ اقوام ایشیا کے انتہائی شمال مغرب اور یوروپ کے مشرق میں گھر گئیں اور ذوالقرنین نے اس امر کا انتظام کیا کہ ان اقوام کے ایشیا میں آنے کی صورت ہی نہ رہے اور گویا ایک قسم کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اقوام یورپ میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ اور چونکہ یورپ میں مذاہب میں سے صرف مسیحی مذہب تھا باقی بت پرستی ہی بت پرستی تھی۔ اس لئے دنیا کے پرانے مذاہب میں سے ان اقوام کو صرف مسیحیت سے واسطہ پڑا اور یہ اقوام آہستہ آہستہ سب کی سب مسیحی ہو گئیں اور ساری قومیں ایک ہی مذہب میں شامل ہو کر دوسری دنیا کے مقابلہ میں ایک زبردست جتھہ بن گئیں۔ اس طرح مذہبی عداوت کا بیج بویا گیا۔ اس کے علاوہ چونکہ ذوالقرنین کے ماتحت اور اس کی پالیسی پر عمل کر کے سب ایشیا نے ان کو شمال کی طرف دھکیل دیا جو اس زمانہ کے لحاظ سے سب سے ردی اور سب سے حقیر علاقہ تھا۔ ان قوموں کے اندر ایشیا اور مشرق کی طرف آنے کی ایک زبردست خواہش پیدا ہو گئی جو اپنی شدت کی وجہ سے ہر نسل سے دوسری نسل کی طرف وراثۃً منتقل ہوتی چلی گئی اور اس طرح سیاسی عداوت کا بیج بویا گیا۔

مسیحی ترقی کے دو دوروں کا ذکر آسمانی کتب میں

غرض ذوالقرنین ایک لحاظ سے یاجوج ماجوج یا دجالی فتنہ کے پیدا کرنے کا موجب ہوا پس اللہ تعالیٰ نے مسیحی ترقی کے اس دور کا ذکر کرنے سے پہلے ذوالقرنین کا ذکر کیا اور خصوصاً اس کے اس فعل کا جس کی وجہ سے یاجوج ماجوج کی ایک علیحدہ قومی اور سیاسی بنیاد پڑی۔

یاجوج ماجوج اقوام کی تشریح

ذوالقرنین کے ذکر میں ایک اور حکمت بھی ہے اور وہ یہ کہ ذوالقرنین ماذہ اور فارس کا بادشاہ تھا۔ پس اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ یاجوج ماجوج کی پیدائش ایک فارسی نسل کے انسان کے ذریعہ سے ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ

کی سنّت ہے کہ جو اس کے نیک بندے ہوں جب ان کے کسی نیک فعل کے ثانوی ردّ عمل کے طور پر کوئی بدی پیدا ہو تو وہ نبی کی اولاد یا ہم وطن یا مثل کے ذریعہ سے اس بدی کو دُور کرواتا ہے کہ اس کے نیک بندے کے نام سے ایک دور کا عیب بھی منسوب نہ ہو۔ پس ذوالقرنین کا ذکر اس جگہ اسی لئے کیا گیا۔ تا اس خبر کو بطور پیشگوئی بیان کر کے ایک دوسرے ذوالقرنین کی خبر دی جا سکے جو فارسی الاصل ہوگا اور یاجوج ماجوج کا مقابلہ کر کے اس کے زور کو توڑے گا اور اس طرح پہلے ذوالقرنین پر سے الزام کو دور کرے گا اور ذوالقرنین کا نام اس وجہ سے پائے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ اُسے دو قوتوں کا وارث بنائے گا۔ ایک مہدویت کی قوت اور ایک مسیحیت کی قوت۔ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علوم کا وارث ہونے کی وجہ سے مہدی کہلائے گا اور حضرت مسیحؑ کی صفات کو اخذ کرنے کی وجہ سے مسیح کہلائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ لَا الْمَهْدِی اِلَّا عِیْسٰی۔ پس ان دونوں قوتوں کے حاصل ہونے کے سبب سے اس کا نام ذوالقرنین ہوگا۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ وہ بعض پیشگوئیوں کے مطابق دو صدیوں کو پائے گا۔ یعنی ایک صدی کے خاتمہ پر وہ خدا تعالیٰ سے الہام پائے گا اور دوسری صدی کے شروع ہونے پر اپنا کام ختم کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھایا جائیگا۔ اسی کی طرف حدیث ابن ماجہ میں اشارہ ہے کہ لا مھدی الا عیسیٰ یعنی آنے والا موعود ذوالقرنین ہوگا من جہت مہدی اور من جہت عیسیٰ ہوگا۔

ذوالقرنین فارسی الاصل تھا

حضرت مسیح موعود اور ذوالقرنین کے فارسی الاصل ہونے میں مشابہت

یاجوج ماجوج بعض ایک ہی مذہب والوں کے نام ہیں

احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ جو قرآن کریم میں آتا ہے کہ ایک اور جماعت بھی ہوگی جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پھر قرآن پڑھائیں گے اس سے کیا مراد ہے۔ یعنی اگر آپ فوت ہو چکے ہوں گے تو یہ کام کس طرح کریں گے اس کے جواب میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسیؓ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ بِالثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رِجَالٌ مِّنْ ھٰٓؤُلَآءِ (بخاری عن ابی ہریرۃؓ)

ذوالقرنین پر یہ اعتراض ہوگا کہ فارسی الاصل نہیں

اور ابن مردویہ نے سعد ابن عبادہ سے جو روایت کی ہے اس میں لکھا ہے رجال من فارس کہ فارسی لوگ ایمان کو پھر واپس لے آئیں گے۔ اور بعض روایات میں رَجُلٌ کا لفظ بھی آتا ہے (بخاری) یعنی ایک خاص موعود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان سب روایات کو ملا کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص موعود شخص جو فارسی الاصل ہوگا آخری زمانہ میں ایمان کے اُٹھ جانے کے بعد پھر ایمان کو واپس لائے گا۔ اور اس کے اس کام میں بعض اور فارسی الاصل لوگ بھی اس کے مؤید ہوں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا یاجوج ماجوج کے زمانہ سے کیا تعلق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی یہ حالت آخری زمانہ میں ہوگی جبکہ یاجوج ماجوج اور دجّال کا ظہور ہوگا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نام ایک ہی مذہب والوں کے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا لفظ سیاسی فتنہ پر دلالت کرتا ہے اور دجال کا مذہبی فتنہ پر۔ پس دونوں قسم کی روایات کو ملا کر یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ یاجوج ماجوج کے زمانہ میں جو اشاعتِ کفر ہوگی اس کا مقابلہ ایک فارسی مرد کرے گا اور اس کے اس کام میں معاون بعض اور فارسی مرد بھی ہوں گے۔ پس فارسی الاصل ذوالقرنین کے فعل پر جو اعتراض پڑتا تھا۔ اس کا بھی اس کے تفصیلی حالات بیان کر کے ازالہ کر دیا اور اس واقعہ کو قرآن کریم میں بطور پیشگوئی کے۔ بیان کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اگر ایک ذوالقرنین نے دنیوی طور پر یاجوج ماجوج کے حملوں کی روک تھام کی تھی تو ایک اور ذوالقرنین ان کے مذہبی حملوں کی جو آئندہ زمانہ میں ہونے والے ہیں روک تھام کرے گا۔

(صاحبان ذوق کے لئے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح دوسرے ذوالقرنین پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ اصل میں فارسی الاصل نہیں کیونکہ اس کے آباد فارسی ہونے سے پہلے چینی علاقہ کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح ذوالقرنین اول کی نسبت تاریخ میں آتا ہے کہ وہ

اصل میں مادہ کا تھا فارسی صرف عارضی تعلقات کی وجہ سے کہلاتا ہے)

میں اس جگہ ایک اور شبہ کا ازالہ بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ بعض بہائی لوگ ان پیشگوئیوں کو بہاء اللہ پر چسپاں کرتے ہیں کہ وہ فارسی الاصل تھے۔ مگر یہ درست نہیں۔ کیونکہ احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ جس موعود کا ذکر ہے وہ قرآن کریم کی تعلیم دے گا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہوگا۔ کیونکہ سورہ جمعہ کی جس آیت کے متعلق آپؐ نے جو کچھ فرمایا۔ اس کا تو مضمون ہی یہ ہے کہ ایک دفعہ تو اب قرآن کی تعلیم محمد رسول اللہ صلعم نے عربوں کو دی ہے اور ایک دفعہ پھر وہ ایک اور قوم کو جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئی یہی تعلیم دیں گے۔ پس وہی شخص اس پیشگوئی کو پورا کرنے والا ہو سکتا ہے جو (۱) فارسی الاصل ہو (۲) دوسرے محمد رسول اللہ کے شاگرد ہونے کا مدعی اور قرآن کریم کی تعلیم دینے والا ہو (۳) آیات قرآنیہ کو ساتھ ملا لیا جائے تو یہ شرطیں بھی شامل کرنی پڑیں گی کہ وہ ذوالقرنین ہو یعنی دو صدیوں کو پانے والا ہو (۴) وہ یاجوج ماجوج کے فتنہ کو جس کا جزو اعظم بندوں کو خدائی صفات دینا ہے تباہ کرے۔

ان میں سے فارسی الاصل ہونے کے سوا کوئی بات بہاء اللہ میں نہیں پائی جاتی۔ نہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد ہیں نہ قرآن کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں نہ انہوں نے دو صدیاں پائیں اور نہ انہوں نے یاجوج ماجوج کے فتنہ کو توڑا بلکہ انہوں نے تو اپنے آپ کو خدا کہہ کے اس فتنہ کی آگ میں تیل چھڑکا ہے اور اسے اور بھی بھڑکا دیا ہے۔

ان تمہیدوں اور ترتیب مضمون کو بیان کرنے کے بعد اب میں ذوالقرنین کے متعلق اپنی تحقیق بیان کرتا ہوں میں اوپر بتا چکا ہوں کہ جیسا کہ سابق مفسروں اور یورپین محققین کا خیال ہے اور جیسا کہ حضرت مولوی نور الدین صاحبؓ خلیفہ اول جماعت احمدیہ نے بیان کیا ہے۔ میرے نزدیک بھی ذوالقرنین ایرانی بادشاہوں میں سے کسی ایک بادشاہ کا نام ہے۔ حضرت مولوی صاحب رضی اللہ عنہ اس کا نام کیقباد بتلاتے تھے۔

رجل من طرس کی صفات بہا اللہ میں نہیں پائی جاتیں

بعض نے آپ کی تحقیق میں یہ فرق کر دیا ہے کہ اس بادشاہ کو دارا اول قرار دیا ہے۔ مگر میرے نزدیک ہمیں سب سے اول ان شرائط کو دیکھنا چاہیئے کہ جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور پھر اس بادشاہ کی تعیین کرنی چاہیئے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) ذوالقرنین کو الہام یا خوابیں آتی تھیں (۲) وہ اپنے علاقہ سے تو ملک فتح کرتے ہوئے مغرب کی طرف چلا گیا جہاں ایک سیاہ چشمہ میں سورج ڈوب رہا تھا (۳) اس کے بعد وہ مشرق کی طرف متوجہ ہوا اور مشرقی ممالک کو فتح کیا (۴) پھر وہ ایک درمیانی علاقہ کی طرف گیا جہاں سے یاجوج و ماجوج حملہ کر رہے تھے اور اس نے وہاں دیوار بنائی۔

ذوالقرنین کی علامات قرآن کریم سے

ہمیں ذوالقرنین کی تعیین کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو شخص ہمارے ذہن میں مشارٌ الیہٖ ذوالقرنین کہلانے کا مستحق ہے اس میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ خصوصاً اس امر کو کہ وہ صاحب الہام اور خدا تعالےٰ کا مقبول بھی ہے یا نہیں۔

یہ امر تو پہلے طے ہو چکا ہے کہ میڈیا اور فارس کے بادشاہوں میں سے ہی کوئی بادشاہ یہاں مراد ہے کیونکہ دانیال کی رؤیا نے ان ہی کو ذوالقرنین کا نام دیا ہے ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کونسا بادشاہ یہ صفات اپنے اندر رکھتا ہے۔ سب سے اول اور اہم صفت الہام کی صفت ہے۔ اس بارہ میں ہم تاریخ کو دیکھتے ہیں تو فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہم کو ایسا ملتا ہے کہ جسے الہام ہوتا تھا اور جس کی نیکی اور تقویٰ کی تعریف ہم کو دوسرے انبیاء کے کلام سے بھی ملتی ہے اور یہ بادشاہ خورس ہے جسے انگریزی میں CYRUS لکھتے ہیں یسعیاہ نبی

ذوالقرنین کے متعلق اپنی تحقیق

ذوالقرنین سے مراد خورس شاہ ایران ہے۔

اس بارہ میں لکھتے ہیں :-

خورس ملہم تھا

"خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دہرے ہوئے دروازے اس کے لئے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کئے جائیں گے میں تیرے آگے چلونگا اور ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا میں پیتل کے دروازوں کے جدا جدا ٹکڑوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرونگا اور لوہے کے بینڈوں کو کاٹ ڈالوں گا اور میں گڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دونگا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے میں نے اپنے بندے یعقوب **اور اپنے برگزیدے اسرائیل کے لئے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گوکہ تو مجھ کو نہیں جانتا۔**" (یسعیاہ باب ۴۵ ۱ تا ۴)

یسعیاہ نبی کے اس کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ خورس نامی میدؔ اور فارسؔ کا بادشاہ خدا تعالےٰ کی طرف سے برکت دیا گیا کیونکہ اُسے مسیح کہا گیا ہے (یہ حقیقت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خورس کو جو ذوالقرنین تھا مسیح کہا گیا ہے اور مسیح موعود کو ذوالقرنین) پھر لکھا ہے کہ اُسے حکومت اللہ تعالےٰ نے اپنے خاص فضل سے دی تھی۔ یہی قرآن کریم ذوالقرنین کی نسبت فرماتا ہے اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا۔ ہم نے اُسے بادشاہت دی تھی اور ہر ضروری امر کو حاصل کرنے کے ذرائع بخشے تھے اسی طرح لکھا ہے کہ میں تیرے آگے چلوں گا اور تیری ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا جس سے اشارہ ہے کہ وہ بہت سفر کرے گا یہی قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر یسعیاہ کے الہام میں ہے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تجھے نام لے کے بلایا ہے۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے کہ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ ہم نے ذوالقرنین کو نام لے کر پکارا۔ پھر لکھا ہے میں نے تجھے مہربانی سے پکارا ہے۔ پھر لکھا ہے گوکہ تو مجھے نہیں جانتا۔ اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کی پرستش تورات کے ناموں سے نہیں کرتا تھا بلکہ دوسرے ناموں سے۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ زردشت نبی کا پیرو تھا۔

خورس کی بزرگی کا ثبوت تاریخوں سے

خورس کی بزرگی کا ثبوت تمام تاریخوں سے ملتا ہے۔ اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ اس کے دشمن بھی اس سے محبت کرتے تھے۔ بلکہ جب وہ کسی حکومت پر حملہ کرتا تو اس کی نیکی اور اس کے انصاف کی وجہ سے شہر والے دروازے کھول کر اس سے جا کر مل جاتے اور اپنے بادشاہ کو چھوڑ دیتے۔ یسعیاہ نبی نے بھی اپنا الہام اس بارہ میں لکھا ہے جس کے یہ الفاظ ہیں " خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ یہ میرا چرواہا ہے وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔" (باب ۴۴ ۲۸) اس کی نیکی اور اس کے اخلاق کے متعلق مورخین نے جو آراء ظاہر کی ہیں وہ یہ ہیں :-

ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ ص ۵۹۶ (HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD) میں مشہور مورخ ذینوفین کی رائے لکھی ہے کہ :-

" میں نے ایک دفعہ انسانی فطرت پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان کے لئے اپنی فطرت کے مطابق دوسرے جانوروں پر حکومت کرنا آسان ہے مگر انسان پر حکومت کرنا مشکل ہے کیونکہ میں نے غور کیا کہ کتنے ہی آقا ہیں جن کے گھر میں تھوڑے یا زیادہ نوکر ہیں مگر وہ اپنے نوکروں سے بھی اطاعت نہیں کروا سکتے پس اس سے میرا یہی خیال ہوا کہ ایسا ایک بھی آدمی نہیں جو انسان پر حکومت کر سکتا ہو۔ دوسرے جانداروں پر حکومت کرنے والے کئی ہیں مگر یہ سوچتے سوچتے مجھے خورس بادشاہ کا خیال آیا جس نے میری رائے بدل دی اور میں نے کہا کہ انسانوں پر حکومت کرنی مشکل نہیں۔ میں نے دیکھا کہ بعض

ایسے لوگ تھے جنہوں نے خوشی سے سائرس کی ماتحتی اختیار کی۔ حالانکہ بعض ان میں سے ایسے تھے جو اس سے دو مہینے کی راہ پر بعض چار مہینے کی راہ پر تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے کبھی اُسے دیکھا ہی نہ تھا اور ایسے بھی تھے جنہیں اُسے دیکھنے کی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔"

پھر لکھا ہے۔ "اس نے لوگوں کے دل میں ایک پُرزور خواہش پیدا کر دی تھی کہ وہ اُسے خوش رکھیں اور کہ وہ ہمیشہ ان پر حکومت کرتا رہے اس نے اتنی قوموں پر حکومت کی کہ ان کی تعداد کا شمار مشکل ہے مشرق سے مغرب تک اس کی حکومت پھیلی ہوئی تھی۔"

پھر اسی کتاب میں موجودہ زمانہ کے مؤرخین کی رائے کا یہ خلاصہ لکھا ہے

"اگر بڑائی انصاف کے لئے لڑنے بلکہ اس کے لئے جان دینے کے لئے تیار رہنے کا نام ہے تو وہ (یعنی خورس) بڑا بادشاہ تھا۔" پھر لکھا ہے:۔

"وہ محض اپنی ذات کے لئے کچھ نہ کرتا تھا۔ وہ ایسا تھا کہ جب میڈیا کی حکومت، بابل کی حکومت اور مصر والوں نے اتفاق کر کے اس پر حملہ کیا تو اس نے محض دفاع کی خاطر تلوار اٹھائی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ رحم مجسم تھا۔ اس کی ڈھال پر ناجائز خون کا قطرہ نہ گرا تھا۔ نہ بھیانک انتقام یا ظلم سے اُس نے ہاتھ رنگے۔ اس نے مقدونیہ والے بادشاہ کی طرح کبھی شہر نہیں جلائے۔ اس نے دیگر بادشاہوں کی طرح مغلوب بادشاہوں کے ہاتھ پاؤں نہیں توڑے اس نے یہودی بادشاہوں کی طرح کبھی دیواروں پر ان کو نہیں گھسیٹا نہ اُس نے رومیوں کی طرح مغلوب بادشاہوں کو پھانسی دی۔ نہ اُس نے یونانیوں کے پاگل خدا سکندر کی طرح خونریزی کی۔ وہ بے شک ایشیائی تھا مگر وہ ایسے لوگوں میں سے تھا جو اپنے زمانہ سے بہت پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔

وہ دوسرے انسانوں سے بہت نرم دل تھا۔ وہ اپنی قوم کے رواج اور دستور سے بہت آگے نکلا ہوا تھا انسانی نسل کی انتہائی ترقی جو آئندہ ہونے والی تھی اس پر وہ قائم تھا۔ اس نے اپنی زبردست حکومت کی بنیاد اس پر رکھی تھی کہ ملکوں کو فتح کر کے ان کے درجہ کو بڑھایا جائے اور مفتوحوں کو مساوی حقوق دئے جائیں۔ ٹائر کا وہ شہر جس نے نبوکدنضر اور سکندر کے آگے بڑے بڑے محاصروں کے بعد اپنے آپ کو سپرد کیا اس شہر نے اس کے جاتے ہی اپنی مرضی سے اپنے دروازے کھول دئے۔" پھر لکھا ہے کہ:۔

"سب سے بڑھ کر وہ چھوٹی قوم جو یہودی کہلاتی ہے اس نے بابل کے دریا پر اس کا اس طرح استقبال کیا کہ کسی فانی انسان کا استقبال اس نے اس جوش سے کبھی نہیں کیا۔" پھر لکھا ہے:۔

"وہ اپنے زمانہ کی پیداوار نہ تھا۔ بلکہ اس نے زمانہ کو پیدا کیا اور وہ اس کا باپ تھا۔ وہ تاریخ انسانی میں ایک منفرد اور بے مثل بادشاہ تھا۔"

(ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۵۹۶-۶۰۰)

اب میں اس مضمون کو لیتا ہوں کہ وہ خدا تعالیٰ سے سچی خوابیں پانے کا مدعی تھا۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ ایک دفعہ ایک مہم پر جا رہا تھا کہ اس نے خواب دیکھا۔ کہ دارا جو اس کا رشتہ میں بھتیجا تھا۔ اس کے دو پر نکلے ہیں ایک یورپ پر پھیلا ہُوا ہے اور دوسرا ایشیا پر۔ اس نے صبح اس کے باپ کو بلایا جو اس کے ساتھ تھا اور اُسے کہا تمہارا لڑکا معلوم ہوتا ہے میرے خلاف سازش کر رہا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ میں اس یقین کی وجہ بھی بتا دیتا ہوں اور وہ یہ کہ آج میں نے ایسا ایسا خواب دیکھا ہے اور خدا تعالےٰ کا میرے ساتھ اس محبت کی وجہ سے جو وہ مجھ سے رکھتا ہے یہ سلوک ہے کہ ایسے تمام اہم امور جو میری ذات پر گہرا اثر ڈالنے والے ہوں وہ مجھے بتا دیا کرتا ہے۔ (جلد ۲ صفحہ ۵۹۵)

اس خواب کی تعبیر میں گو اس نے غلطی کھائی اور سمجھا

ہے کہ شاید دارا اس کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔

خورس کی ذوالقرنین سے مشابہت از روئے فتوحات

لیکن جو اس کی تعبیر تھی وہ اپنے وقت پر شاندار طور پر پوری ہوئی۔ اور وہ اس طرح کہ خورس کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ ہوا اور اسے لوگوں نے قتل کر دیا۔ اس پر دارا نے چند شہزادوں کے ساتھ مل کر اس غاصب کو قتل کر دیا اور آخر متفقہ فیصلہ سے دارا کو بادشاہ بنایا گیا جس نے یورپ اور ایشیاء کے بڑے حصہ کو فتح کر کے ایرانی حکومت کو بہت بڑھا دیا۔

بائبل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُسے الہام ہوتا تھا۔ کیونکہ بائبل میں لکھا ہے :-

خورس پر الہام ہونے کا ثبوت بائبل سے

" اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو۔ خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل اُبھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا۔ شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوواہ میں ہے۔ اس کے لئے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یوروشلم کو جو شہر یہوواہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے جو یروشلم میں ہے۔" (عزرا ۱/۱ تا ۳)

خورس کی جنگ یاجوج ماجوج سے ہوئی۔

گویا خدا تعالیٰ نے اُسے برگزیدہ کر کے اُسے مملکتیں اور حکومتیں بخشیں پھر اُسے الہام کر کے یوروشلم کا مقدس گھر بنانے اور یہودیوں کے قید سے رہا کرنے کا حکم دیا۔

دوسری علامت قرآن کریم سے ذوالقرنین کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی فتوحات پہلے مغرب کی طرف شروع ہوئیں اور وہ ملک پر ملک فتح کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں اس نے سورج کو ایک ایسے چشمہ میں ڈوبتے ہوئے دیکھا جس میں سیاہ مٹی ملی ہوئی تھی (یعنی اس کے پانی کا رنگ سیاہ تھا اس سے مراد بحیرہ اسود ہے جسے انگریزی میں BLACK SEA کہتے ہیں) چنانچہ خورس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ گذرا ہے۔ جب اُسے اللہ تعالیٰ نے طاقت بخشی تو مغربی ممالک کے بادشاہوں نے ایکا کر کے اس پر حملہ کر دیا اور اس طرح اس کی فتوحات اپنے ملک سے باہر مغربی طرف شروع ہوئیں اور بابل۔ نینوا اور یونانی نوآبادیات جو ایشیائے کوچک کے شمال میں بحیرہ مارمورا تک پھیلی ہوئی تھیں، خورس نے فتح کر لیں اور اس طرح اس چشمہ تک پہنچا۔ جو اس کے ملک کی مغرب کی طرف تھا اور جس کا پانی سیاہ تھا (یہ تمام علاقے تاریخ سے ثابت ہے کہ اس نے فتح کئے تھے)۔ (دیکھو ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ نیز جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۴۰۳)

تیسری علامت قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ مغربی علاقوں کو فتح کرنے کے بعد ذوالقرنین نے مشرق کی طرف توجہ کی اور تاریخ سے اس امر کا بھی پتہ ملتا ہے کہ مغربی علاقوں کی فتح کے بعد خورس نے مشرقی ممالک کو فتح کیا اور افغانستان تک اور بخارا اور سمرقند تک اس کی حکومت پھیل گئی (ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۲ صفحہ ۵۹۳)

چوتھی علامت قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس نے ان کے درمیان بعض علاقوں کی طرف توجہ کی۔ اور وہاں ایک دیوار بنائی کیونکہ یاجوج ماجوج وہاں سے حملے کرتے تھے۔ تاریخ سے مندرجہ ذیل امور کا ثبوت ملتا ہے۔

اوّل۔ خورس کی جنگ یاجوج ماجوج سے ہوئی ہے۔ اور اس نے ان کے حملوں سے اپنی مملکت کے بعض علاقوں کو بچایا ہے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ یاجوج ماجوج کن قبائل کو کہتے ہیں۔ اس کے لئے بھی ہم کو

بائبل سے مدد ملتی ہے بائبل میں یاجوج ماجوج کی نسبت لکھا ہے

" اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روس اور مسک اور توبالسک کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر" (حزقیل باب ۳۸ ۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبل جس نے سب سے پہلے ہمیں یاجوج و ماجوج سے روشناس کرایا ہے شمالی علاقہ کے رہنے والے لوگوں کو یاجوج و ماجوج کہتی ہے اور ان کا مقام روس۔ ماسکو اور توبالسک بتاتی ہے جو سارا علاقہ شمالی ہے۔ اس کے بعد بائبل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ فارس کا کوئی بادشاہ کرے گا کیونکہ لکھا ہے کہ وہ فارس پر قابض ہو گئے ہوئے ہیں چنانچہ لکھا ہے۔

" اور ان کے ساتھ فارس اور کوش اور فوط (ہیں)"

(حزقیل باب ۳۸۔ ۵)

یعنی جب یہ پیشگوئی کی گئی ہے۔ یاجوج کے ماتحت فارس کا علاقہ تھا۔

اب ہم تاریخوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ یاجوج و ماجوج کی نسبت کیا رائے ظاہر کرتی ہیں۔ پرانے مؤرخوں میں کے جوزیفس کا بیان ہے کہ یہ سیدین SEYTHIENS قبائل کا نام ہے۔ تورات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ پیدائش باب ۱۰ ۲ میں لکھا ہے کہ " یافث کے بیٹے یہ ہیں۔ جمر اور ماجوج اور مادی " جمر سمیرینز (CIMMERIANS) کا نام ہے جو ایشیائے کوچک کے مشرقی طرف رہتے تھے۔ اور مادی میدیا والوں کا نام ہے ان دونوں کے درمیان کا علاقہ سیدینز ہی کا علاقہ ہے۔ جیروم لکھتا ہے کہ ماجوج کوہ قاف کے اوپر بحیرہ اخضر کے اوپر رہتے ہیں یہ بھی وہی شمالی علاقہ ہے جس میں سیدین رہتے تھے (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۶ صفحہ ۱۹)

اس تحقیق کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ بائبل نے لکھا ہے کہ یاجوج ماجوج اس زمانہ میں فارس پر حاکم ہو گئے تھے۔ کیا سیدینز کے بارہ میں یہ امر ثابت ہے سو اس کے متعلق ہم تاریخ میں یہ لکھا پاتے ہیں۔ " تب جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں فارس سیدینز کے ہاتھوں میں آگیا یا دوسرے لفظوں میں مادیوں کے بادشاہ کے ہاتھوں میں آگیا (مادیا پر اس وقت سیدینز حکومت کر رہے تھے) جس بادشاہ کا پایۂ تخت اس وقت اکباتانا (ECBATANA) میں تھا جس کے ہاتھ سے فارس کو خورس اعظم نے چھڑوایا" (ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۵۸۰) اس واقعہ کے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج کا قبضہ فارس پر رہ چکا تھا بلکہ یہ بھی کہ خورس نے یاجوج ماجوج کو شکست دے کر فارس کو ان کے قبضہ سے آزاد کرایا تھا۔ ان کا بار بار حملہ کر کے جنوبی اقوام کو تکلیف دینا بھی تاریخ سے ثابت ہے چنانچہ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ سیدینز کوہ قاف اور بحیرہ اخضر کے درمیان سے درّہ دربند کے راستے شمالی ممالک کی طرف سے جنوبی ممالک پر حملے کیا کرتے تھے۔

۱ یاجوج ماجوج کا مسکن از روئے بائبل

دوسری شق آخری علامت کی قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کے حملوں سے بچانے کے لئے ایک دیوار بنائی تھی۔

پہلے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کیا اس علاقہ میں کسی دیوار کا پتہ ملتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں عین اسی مقام پر جسے ہیروڈوٹس نے سیدینز کے حملہ کا راستہ بتایا ہے دیوار بنی ہوئی تھی۔ وہ دربند کی دیوار کے نام سے مشہور ہے۔ اور غالباً دربند اسی وجہ سے اس جگہ کا نام پڑا ہے کہ اس جگہ دیوار کھینچ کر سیدینز کو روکا گیا تھا۔ چنانچہ دربند کے متعلق انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں لکھا ہے کہ اس جگہ ایک دیوار تھی جو اپنی تعمیر کے وقت ۲۹ فٹ اونچی تھی اور دس فٹ چوڑی تھی اس میں لوہے کے دروازے تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر نگرانوں کے لئے منار بنے ہوئے تھے تاکہ وہاں سے نگرانی کرسکیں یہ پچاس میل لمبی ہے اور بحیرہ اخضر

۲ دربند کی دیوار ہی یاجوج ماجوج کی دیوار ہے

سے کوہ قاف تک چلی گئی ہے پھر انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں لکھا ہے کہ یہ دیوار سکندر کی دیوار ہے۔ مگر اُسے قباد نے جو ساسانی بادشاہ تھا دوبارہ مرمت کروایا تھا۔

ان بیانات سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہاں کوئی دیوار موجود تھی۔ مگر یہ کہ اس دیوار کو خورس نے بنایا تھا۔ اس کا ثبوت تاریخ سے اس وقت تک مجھے نہیں مل سکا۔ ہاں میں سمجھتا ہوں کہ سکندر کا اس دیوار کو بنانا بالکل خلاف عقل ہے۔ سکندر کے متعلق تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۳۱ قبل مسیح کی گرمی کے موسم میں اس نے دارا کو آخری شکست دی ہے اور دارا مارا گیا ہے (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا جلد اول ص۵۶۹) لیکن اس فتح سے اُسے ایران پر قبضہ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے مقابل پر کئی صوبوں کے لشکر ابھی موجود تھے اس لئے وہ بغیر دم لئے آگے بڑھتا گیا۔ لیکن جونہی وہ آگے بڑھا پچھلے علاقہ میں بغاوت ہو گئی اور اُسے واپس آنا پڑا۔ بغاوت کو فرو کر کے سکندر کابل کی طرف بڑھا جہاں اس کی فوج میں بغاوت شروع ہو گئی۔ اور مورخین کے نزدیک ۳۲۹ قبل مسیح کی سردی کے موسم میں وہ ہندوستان کی طرف بڑھا۔ یہ سفر اس قدر سرعت سے طے ہوا ہے کہ بعض مورخ اس کے متعلق شک ظاہر کرتے ہیں۔ بہرحال یہ امر ثابت ہے کہ سکندر رستہ میں کہیں ٹھہرا نہیں۔ بلکہ لڑتا بھڑتا ہندوستان کی طرف چلا گیا ہے۔ جہاں سے وہ جہازوں کے راستہ واپس لوٹا۔ اور ۳۲۴ قبل مسیح میں ایران پہنچا۔ وہاں تھوڑا سا عرصہ رہنے کے بعد جس میں اُسے اپنی فوجوں کی بغاوت فرو کرنے کی پھر ضرورت پیش آئی وہ گھر کو روانہ ہوا۔ اور ۱۳ جون ۳۲۳ قبل مسیح راستہ ہی میں مر گیا۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اتنی بڑی دیوار بنانے کا ہرگز موقع نہ مل سکتا تھا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا اس امر سے لگا ہے کہ بعض مسلمان مفسرین کا خیال تھا کہ سکندر ذوالقرنین تھا۔ اس لئے اس سے کئی مصنفوں نے دھوکا کھا کر اس دیوار کو سکندر کی دیوار سمجھ لیا۔

سکندر کا اس دیوار کو بنانا خلاف عقل ہے

مگر صرف اتنا ثابت کرنا کافی نہیں کہ سکندر نے یہ دیوار نہیں بنائی بلکہ اس سے زیادہ ایسے ثبوت کی ضرورت ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ دیوار اگر یقیناً نہیں تو غالباً خورس نے بنائی تھی چونکہ تاریخ سے اس وقت تک کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جس سے قطعی طور پر ثابت ہو کہ یہ دیوار خورس نے بنائی ہے ہم قیاس سے ہی کام لے سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے تاریخی واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ دیوار خورس ہی نے بنائی ہے اور میرے دلائل یہ ہیں

دلائل کہ یہ دیوار خورس نے بنائی۔

(۱) تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا نے جو خورس کے بیٹے کے بعد بادشاہ ہوا اور جس کے متعلق خورس نے خواب دیکھی تھی کہ مشرق و مغرب میں اس کی حکومت ہو گی۔ سیدینز کا زور توڑنے کے لئے یونان میں سے گزر کر یورپ کی طرف سے جا کر سیدینز پر حملہ کیا تھا۔ اب یہ بات خلاف عقل معلوم ہوتی ہے کہ جبکہ سیدینز اس کے شمالی جانب اس کے ملک کے پاس ہی بستے تھے وہ ان پر حملہ کرنے کے لئے یورپ سے گیا ہو۔ پس اس واقعہ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ خورس نے دربند کے پاس دیوار بنا دی تھی اور ایک بڑی فوج کو لے کر ان کے ملک پر صرف چند چھوٹے چھوٹے دروازوں سے حملہ کرنا خالی از خطرہ نہ تھا۔ اور دیوار کو توڑنا اور بھی پرخطر تھا۔ پس دارا نے سیدینز کا زور توڑنے کے لئے یورپ کی طرف سے جا کر حملہ کیا۔ تا کہ ایک طرف سے دیوار ان کو روک رہی ہو اور دوسری طرف سے اس کی فوجیں ان پر حملہ آور ہو جائیں۔

(۲) دوسرا امر جس سے اس بارہ میں قیاس کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ اگر درہ دربند میں دارا سے پہلے دیوار موجود نہ تھی تو دارا اول جیسے عقلمند بادشاہ کی نسبت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے ملک کو ننگا چھوڑ کر ہزار میل کا چکر کاٹ کر سیدینز پر حملہ کرنے کے لئے گیا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ صریح خطرہ موجود تھا کہ اس کے جاتے کے بعد سیدینز بغل میں سے نکل کر اس کے ملک پر حملہ کر دیتے اور نہ دد

مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝

اسے زمین میں حکومت بخشی تھی اور ہم نے اُسے ہر ایک چیز (کے حصول) کا ذریعہ عطا کیا تھا ۵۸؂

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ

تب وہ ایک راستے پر چل پڑا یہاں تک کہ وہ سورج ڈوبنے کے مقام پر پہنچا

وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا

تو اس نے ایسا پایا کہ (گویا) وہ ایک گدلے چشمے میں ڈوب رہا ہے اور اس نے اس کے پاس کچھ لوگ (آباد)

قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّاۤ

پائے (اس پر) ہم نے (اسے) کہا (کہ) اے ذوالقرنین تجھے اجازت ہے کہ ان کو عذاب دے یا ان کے

اپنے ملک کو ہی بچا سکتا۔ نہ اُس کا ملک اس کو ضرورت پر مزید کمک بھجوا سکتا۔ پس اس کا اطمینان سے یورپ کی طرف سے جا کر حملہ کرنا بتاتا ہے کہ دربند کی طرف اس سے پہلے دیوار موجود تھی اور وہ اس امر سے مطمئن تھا کہ سیدینز اس کے ملک پر دیوار کی وجہ سے اس طرف سے حملہ نہیں کر سکتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب میں چاروں علامتوں کو سوائے دیوار والے حصہ کے یقینی طور پر خورس کے حق میں ثابت کر چکا ہوں۔ اور دیوار والے حصہ کے متعلق بھی اس قدر ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ جہاں تک اس زمانہ کے واقعات سے (جو درحقیقت بہت کم ہم تک پہنچے ہیں) قیاس کیا جا سکتا ہے **خورس** ہی **دربند** کے پاس دیوار بنانے والا تھا خصوصاً جبکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ یاجوج ماجوج خورس کے برسر اقتدار آنے سے پہلے اس کے اپنے ملک پر قابض تھے اور ان کے حملے فارس پر اور اس کی وسیع سلطنت پر برابر جاری تھے۔ اور جبکہ ہم کو تاریخ سے یہ مزید ثبوت ملتا ہے کہ دربند کی طرف سے سیدینز کے حملے خورس کے زمانہ کے بعد رک گئے تھے۔

خلاصہ یہ کہ یہ امر ایک ثابت شدہ حقیقت معلوم ہوتا ہے کہ **ذوالقرنین** بادشاہ سے مراد قرآن کریم میں **خورس** بادشاہ ہی ہے اور اس امر کے ثابت کر چکنے کے بعد میں قرآن کریم کی آیات کی تفسیر الگ الگ بیان کرتا ہوں۔

۵۸؂ حل لغات۔ مَكَّنَّا: مَكَّنَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور مَكَّنَهٗ مِنَ الشَّيْءِ کے معنے ہیں جَعَلَ لَهٗ عَلَيْهِ سُلْطَانًا وَّقُدْرَةً۔ اس کو کسی بات پر طاقت قدرت اور غلبہ بخشا (اقرب) پس مَكَّنَّا کے معنے ہوں گے۔ ہم نے اُسے حکومت و غلبہ دیا تھا۔

سَبَبًا: مَا يُتَوَصَّلُ بِهٖ اِلٰى غَيْرِهٖ۔ کسی چیز کے حصول کے ذریعہ کو سبب کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر:۔ یعنی ہم نے ذوالقرنین کو دنیا میں بڑی طاقت بخشی تھی۔ اور ہر قسم کے سامان اُسے بخشے تھے یہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ خورس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے خاص طاقت دی تھی۔ جیسا کہ بائبل اور اس کے اپنے بیانات سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ دیکھو نوٹ ۵۱

دربند کے پاس دیوار بنانے والا خورس ہی تھا

أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ

بارہ میں حسن سلوک سے کام لے ۸۱؎ اس نے کہا (اس میں بھی ایسا ہی کرونگا اور) جو ظلم کرے گا اسے تو ہم

نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكْرًا ۝ وَ

ضرور سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائیگا اور وہ اسے سخت عذاب دے گا ۸۲؎ اور

أَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ

جو ایمان لائے گا اور نیک (اور مناسب حال) عمل کرے گا تو اس کیلئے (خدا تعالیٰ کے ہاں اس کے اعمال کے) بدلہ میں اچھا انجام (مقدر) ہے

حمئۃ

۸۱؎ **حل لغات۔** حَمِئَۃ: اَلْحَمِئَۃُ کے معنے ہیں ذَاتُ الْحَمْأَۃِ۔ کیچڑ والا (اقرب) پس عَيْنٌ حَمِئَةٌ کے معنے گدلا۔ کیچڑ والا چشمہ۔

تفسیر:۔ مَغْرِبَ الشَّمْسِ سے یہ مراد نہیں کہ دنیا کے آخری سرے پر پہنچا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اپنی فتوحات کی مغربی حد تک جا پہنچا اور مراد ایشائے کوچک کی شمالی اور مغربی حد ہے۔

عین حمئۃ سے مراد بحیرہ کیسپین

عَيْنٌ حَمِئَةٌ کے معنے مٹی ملے ہوئے پانی کے ہیں۔ اور مراد بحیرہ اسود سے ہے۔ کیونکہ مٹی سے پانی کا رنگ گدلا اور سیاہی مائل ہو جاتا ہے اور اس سمندر کا پانی بوجہ عمیق گہرائی کے سیاہی مائل ہے۔ مٹی ملے ہوئے کے الفاظ لفظاً بھی اس سمندر پر صادق آتے ہیں۔ کیونکہ یہ سمندر سارے سمندروں سے اس امر میں نرالا ہے کہ اس میں باقی سمندروں کی نسبت نمکین پانی کم شامل ہوتا ہے اور اس کے پانیوں کا بڑا حصہ زمینی دریاؤں کے پانی سے بنتا ہے۔ جو روس آرمینیا اور بلغاریہ کے ملکوں سے آکر اس میں گرتے ہیں (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا زیر لفظ بلیک سی) پس چونکہ اکثر پانی اس کا دریاؤں سے آتا ہے اس میں دوسرے سمندروں کی نسبت مٹی کی آمیزش زیادہ ہے اور نمک سمندروں سے کم ہے۔

یہ جو فرمایا کہ اس میں سورج ڈوبتا ہوا پایا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ چشمہ کے لفظ سے دھوکا نہ کھاؤ۔ چشمہ سے صرف یہ مراد ہے کہ اس کا پانی گہرا ہے اور سطح زمین کے اندر سے نکل کر بھی اس میں پانی ملتا رہتا ہے ورنہ چھوٹا چشمہ مراد نہیں۔ بلکہ وہ اس قدر وسیع ہے کہ اُس کے کنارہ پر کھڑے ہو تو یوں معلوم ہوگا کہ گویا سورج اسی میں ڈوب رہا ہے۔

وجد عندھا قوماً سے مراد وہ حکومت ہے جو ایشیائے کوچک کے مشرقی ساحل پر حکومت کر رہی تھی اور جس نے بابل کی فتح کے بعد دوسری حکومتوں سے مل کر بلا وجہ خورس پر حملہ کر دیا تھا۔

اس قوم کے متعلق فرماتا ہے کہ ہم نے اُسے کہا کہ خواہ اس کی شرارت کی اُسے سزا دو خواہ ان پر احسان کرکے اپنا گرویدہ بنا لو

۸۲؎ **تفسیر:۔** یعنی خورس نے اس الہام کے جواب میں یہ عرض کی کہ میرا یہ منشاء ہے کہ اگر یہ دوبارہ شرارت کریں تو ان کو سزا دوں ورنہ نہیں۔

یہ جو فرمایا ہے ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خورس کا ایک ایسے مذہب سے تعلق تھا جو قیامت پر خاص طور پر ایمان رکھتا تھا چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ خورس زردشتی مذہب کا مخلص پیرو تھا جو مذہب کہ اسلام کے بعد سب مذاہب سے زیادہ بعث بعد الموت پر زور دیتا ہے (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ ص [illegible]) اس میں لکھا ہے کہ یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے کہ خورس خالص زردشتی مذہب کا پیرو تھا۔

وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝

اور ہم (بھی) ضرور اس کے لئے اپنے معاملہ میں آسانی والی بات کہینگے ۵۸۲ پھر وہ ایک اور راستہ پر چل پڑا۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى

یہاں تک کہ جب وہ سورج کے نکلنے کے مقام پر پہنچا تو اس نے اسے ایسے لوگوں پر چڑھتا

قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ ؕ

پایا۔ جن کے لئے ہم نے (ان کے اور) اس کے درمیان کوئی پردہ نہیں بنایا تھا ۵۸۳ وہ ٹھیک (اسی طرح تھا

۵۸۳ تفسیر:۔ اس آیت سے ذوالقرنین کے اخلاق کا پتہ چلتا ہے (جیسا کہ نوٹ نمبر (۱) میں بتایا جا چکا ہے) خورس بہت رحم دل تھا اور مفتوح اقوام سے نہایت محبت اور رحم کا سلوک کرتا تھا

اس جگہ اگر کوئی اعتراض کرے کہ اللہ تعالےٰ نے یہ کیوں کہا کہ چاہو تو سزا دو چاہو تو رحم کرو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک لطیف طریق رحم کی تعلیم دینے کا ہے پہلے عذاب کا ذکر کیا کہ اس قوم نے شرارت تو کی ہے اور تمہارا حق ہے کہ ان کو سزا دو۔ پھر یہ فرما دیا کہ اگر چاہو تو ان پر رحم بھی کر سکتے ہو۔ یعنی ایک راستہ رحم کا بھی کھلا ہے۔ اس طرح رحم کی طرف ایک لطیف اشارہ کر کے ذوالقرنین کو خالص نیکی کا موقعہ عطا کیا۔ اگر حکماً رحم کرنے کو کہا جاتا تو ذوالقرنین کے طبعی نیکی کے اظہار کا موقعہ نہ ملتا۔ لیکن اس حکم کے بعد جو اس نے نیکی کی یہ اس کا ذاتی فعل تھا اور اُسے زیادہ ثواب کا مستحق بناتا تھا

۵۸۴ تفسیر:۔ اس میں ذوالقرنین کے مشرقی سفر کا ذکر فرمایا ہے جو افغانستان تک ہوا۔ لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ وہ قوم ایسی مہذب نہ تھی اور مکان وغیرہ ان میں کم تھے۔ بلکہ جھونپڑوں یا خیموں میں رہتے تھے۔ افغانی قبائل کی اس وقت یہی حالت تھی۔ وہ تہذیب کے اعلیٰ مقام پر نہ تھے۔ مگر میرے نزدیک الفاظ قرآن پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلوچستان کا علاقہ تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا کہ اُس نے سورج کو دیکھا کہ وہ ایسی قوم پر چڑھتا ہے جس کے اور سورج کے درمیان ہم نے کوئی پردہ نہیں بنایا یعنی اوٹ کوئی نہیں۔ سیدھی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ علاقہ چٹیل میدان ہے۔ درخت وغیرہ یا اونچے پہاڑ اس علاقہ میں نہیں۔ عام طور پر مورخین یونانی ہی ہیں اس لئے انہوں نے اپنی طرف کے علاقوں کی فتوحات کا ہی ذکر کیا ہے۔ مشرقی طرف کی فتوحات کا ذکر بالتفصیل نہیں کیا۔ ہاں اختصاراً وہ یہ لکھتے ہیں کہ خورس نے مشرق کی طرف افغانستان کے نواح میں حملہ کیا تھا اور اُس علاقہ کو فتح کر لیا تھا۔ مگر چونکہ سیستان بھی فارسی حکومت میں شامل تھا۔ میرے نزدیک یہ بلوچستان کے علاقہ کا ذکر معلوم ہوتا ہے جہاں ریت کا صحرا اور ٹیلے وغیرہ ہیں۔ لیکن اگر تاریخ کے بیان کو کافی سمجھا جائے تو پھر لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا سے اس صحرا اور میدان میں بسنے والی قوم مراد لی جائے گی جو سیستان اور ہرات کے مغربی جانب اور دُزداب سے شمالی جانب کو مشہد تک کئی سو میل تک لمبا چلا گیا ہے۔

ذوالقرنین کے اخلاق

ذوالقرنین کے مشرقی سفر کے حالات

وَكَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝

اور جو کچھ اس کے پاس تھا اس کا ہم نے (اپنے) علم کے احاطہ کیا (ہوا) تھا ۵۸۵ پھر وہ ایک راستہ پر چل پڑا ۵۸۶

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا

یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اس نے ان کے ورے کچھ ایسے لوگ

قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا

پائے جو بمشکل اس کی بات سمجھتے تھے ۵۸۷ انہوں نے کہا (کہ) اے

الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي

ذو القرنین یاجوج ماجوج یقیناً اس ملک میں فساد پھیلا رہے

الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ

ہیں پس کیا ہم (لوگ) آپ کے لئے کچھ خراج اس شرط پر مقرر کر دیں کہ آپ ہمارے

۵۸۵ **تفسیر**:۔ یعنی جس طرح ہم نے بتایا ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا یعنی اس کا ان علاقوں کو فتح کرنا ایک یقینی بات ہے۔ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا سے مراد یہ ہے کہ ہم اس کی ہر سفر میں حفاظت کرتے تھے کیونکہ اس کی ہر بات کی خبر رکھنے کے یہی معنے ہیں کہ اس کے حالات کی نگرانی کرتے تھے۔

۵۸۶ **تفسیر**:۔ اس تیسرے اَتْبَعَ سَبَبًا میں خورس بادشاہ کے اس سفر کا ذکر ہے جو اس نے ایران سے شمالی جانب بحیرہ کیسپین اور کوہ قاف کے درمیانی علاقہ کی جانب کیا۔

۵۸۷ **حل لغات**۔ السَّدَّيْن: السَّدّ سے تثنیہ ہے اور السدّ کے معنے ہیں الجبل۔ پہاڑ۔ الحاجز بین الشیئین۔ دو چیزوں کے درمیان روک (اقرب)

تفسیر:۔ اس جگہ کے بسنے والوں کی نسبت فرماتا ہے کہ وہ بمشکل ذوالقرنین کے لوگوں کی باتیں سمجھتے تھے یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کاد سے پہلے نفی آئے تو اس کے معنے مثبت کے ہوتے ہیں اور مثبت کا لفظ آئے تو اس کے معنے نفی کے ہوتے ہیں۔ پس اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ بمشکل ذوالقرنین اور اس کی قوم کی بات سمجھتے تھے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ بات کسی حد تک سمجھ جاتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ فارس کے لوگوں کے ہمسائے اور ان کے ساتھ میل ملاپ رکھنے والے تھے۔ پس گو ان کی زبان اور تھی مگر ہمسائگت اور کثرت سے میل جول رکھنے کی وجہ سے فارس اور میدیا والوں کی کچھ کچھ بات وہ سمجھ لیتے تھے۔

جغرافیہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دربند کا علاقہ جس کی نسبت بتایا جا چکا ہے کہ وہاں دیوار بنائی گئی تھی ایسا ہی علاقہ ہے یہ علاقہ مادہ اور فارس کے ساتھ لگتا ہے بلکہ بعد کے زمانہ میں تو فارس کا حصہ ہی بن گیا تھا۔ گو اب روس والوں نے اس علاقہ کو لے کر اپنی حکومت میں شامل کر لیا ہے۔ یہ جو فرمایا ہے کہ بین السدین پہنچا اس سے مراد یہ ہے

بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ

درمیان اور ان کے درمیان ایک روک بنادیں ۵۸۸ اس نے کہا کہ (اس قسم کے کاموں) کے متعلق میرے رب نے

خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ

جو طاقت مجھے بخشی ہے وہ (دشمنوں کے سامانوں سے) بہت بہتر ہے۔ اس لئے تم مجھے (اپنے) مقدور بھر مدد دو تاکہ میں تمہارے درمیان اور ان کے درمیان

رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ

ایک روک بنادوں ۵۸۹ تم مجھے لوہے کے ٹکڑے دو (چنانچہ وہ روک تیار ہونے لگی) یہاں تک کہ جب اس نے (پہاڑی کی) ان

الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ

(دونوں) چوٹیوں کے درمیان برابری پیدا کر دی تو اس نے (ان سے) کہا کہ اب اس پر آگ) دھونکو۔ حتیٰ کہ جب اس نے اُسے (بالکل) آگ کی طرح کر دیا

قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ

تو (ان سے) کہا (کہ اب) مجھے (گلا ہوا) تانبا (لا) دو تاکہ میں (اسے) اس پر ڈال دوں ۵۹۰ پس (جب وہ دیوار تیار ہو گئی تو) وہ (یعنی

کہ اس راستہ کے ایک طرف بحیرہ اخضر ہے اور دوسری طرف کوہ قاف۔ اور یہ دونوں چیزیں دونوں طرف سے سد یعنی روک کا کام دے رہی تھیں۔ صرف درمیانی درہ غیر محفوظ تھا۔

۵۸۸ حل لغات۔ خَرْجًا: الخرج: الخراجُ خرج کے معنے خراج یعنی لگان کے ہیں (اقرب)

تفسیر:۔ یعنی چونکہ یہ لوگ یاجوج و ماجوج کے دروازہ پر تھے وہ کثرت سے ان کے حملوں کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ اس لئے اس علاقہ کے لوگوں نے ذوالقرنین سے خواہش کی کہ ان کے حملوں سے بچنے کے لئے ایک دیوار بنا دی جائے اور اس کا خرچ ہم دیں گے۔

۵۸۹ حل لغات۔ رَدْمًا: اَلرَّدْمُ مَا يَسْقُطُ مِنَ الْجِدَارِ الْمُتَهَدِّمِ۔ گری ہوئی دیوار کا ڈھیر (اقرب)

تفسیر:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کاموں کا خوب علم دیا ہے اور میں اس کام کو خوب اچھی طرح کر سکتا ہوں اس لئے تم مزدوری کے ذریعہ سے میری مدد کرو تاکہ میں یہ دیوار بنا دوں۔

قوۃ سے مراد مزدوری ہے یعنی تم لوگ اس جگہ بستے ہو۔ مزدوری کا کام تم ہی کر سکتے ہو۔ پس میں سکیم تجویز کرتا ہوں تم اس کے پورا کرنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔

خرجاً[1]

۵۹۰ حل لغات۔ زُبَرَ الْحَدِيْدِ: زبر۔ زبرۃ کی جمع ہے اور الزبرۃ کے معنے ہیں اَلْقِطْعَةُ الضَّخْمَةُ بڑا ٹکڑا (اقرب) پس زبر الحدید کے معنے ہونگے لوہے کے ٹکڑے۔ سَاوٰى الشَّيْئَيْنِ وَسَاوٰى بَيْنَهُمَا کے معنے ہیں سوّی دونوں کے درمیان برابری کر دی (اقرب)

زبر الحدید[2]

اَلصَّدَفَيْنِ: الصَّدَفُ سے تثنیہ ہے اور الصدف کے معنے ہیں كُلُّ شَيْءٍ مُرْتَفِعٍ عَظِيْمٍ۔ ہر اونچی بلند چیز الجبل۔ پہاڑ۔ سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ اَيْ بَيْنَ رَاْسَيِ الْجَبَلِ الْمُتَقَابِلَيْنِ۔ آمنے سامنے کے دونوں پہاڑوں کی چوٹیوں کے درمیان برابری پیدا کر دی (اقرب)

الصدفین[2]

اُفْرِغْ: اَفْرَغَ الْمَاءَ کے معنے ہیں۔ صَبَّهٗ۔ اس نے

افرغ[2]

يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ○ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ

یاجوج ماجوج) اس پر چڑھ نہ سکے اور نہ اس میں کوئی سوراخ کر سکے ۹۱؎ (اس پر) اس نے کہا کہ) یہ (کام محض) میرے

مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ

رب کے خاص احسان سے (ہوا) ہے۔ پھر جب (عالمگیر عذاب کے متعلق) میرے رب کا وعدہ (پورا ہونے پر) آئیگا تو وہ اسے (توڑ کر) ایک زمین سے پیوست شدہ ٹیلا

وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ○ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ

بنا دیگا اور میرے رب کا وعدہ (ضرور) پورا ہو کر رہنے والا ہے ۹۲؎ اور (جب اس کے پورا ہونے کا وقت آئیگا تو) اس وقت ہم انہیں ایک دوسرے کے خلاف جوش سے حملہ آور

پانی کو ڈالا۔ اَفْرَغَ الدِّمَاءَ اَرَاقَهَا۔ خون بہایا۔ اَفْرَغَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ: صَبَّهَا فِي قَالِبٍ۔ سونے اور چاندی کو کسی سانچے میں ڈال کر ڈھالا (اقرب)

القطر: اَلنُّحَاسُ الذَّائِبُ۔ پگھلا ہوا تانبا (اقرب)

اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا کے معنے ہوں گے۔ تم مجھے تانبا لا دو کہ میں اس پر ڈالوں۔

القطر

تفسیر:۔ یعنی علاوہ مزدوری کے تم یہ مدد بھی دو کہ لوہا اور تانبا مہیا کرو۔ کیونکہ گو دیوار بنانا حفاظت کے لئے ضروری تھا مگر اس کے ساتھ دیوار میں دروازے بنانے بھی ضروری تھے۔ تاکہ تجارت کو نقصان نہ پہنچے اور تجارتی قافلوں کے آنے جانے کا راستہ کھلا رہے۔ پس مضبوط دروازے بنانے کے لئے لوہے کی اور ان کو زنگ سے بچانے کے لئے تانبے کی ضرورت تھی جو ان سے طلب کیا گیا۔

مومن تکبر سے بچے کی نصیحت

۹۱؎ **تفسیر**:۔ یعنی جب دیوار بن گئی۔ تو یاجوج و ماجوج کے حملے رُک گئے۔ وہ دیوار اس قدر اونچی تھی کہ وہ اس پر چڑھ بھی نہیں سکتے تھے اور اتنی موٹی تھی کہ اس میں نقب بھی نہیں لگا سکتے تھے۔

یہ مراد نہیں کہ دیوار اس قسم کی تھی کہ اس پر چڑھنا یا اس میں نقب لگانا ناممکن تھا۔ بلکہ چونکہ اس میں بُرج اور قلعے تعمیر کئے گئے تھے جہاں سپاہی پہرہ کے لئے مقرر رہتے تھے اس لئے دیوار پر چڑھنا یا نقب لگانا ناممکن تھا۔ کیونکہ پہرہ دار ہر اس شخص کو جو چڑھنے کی کوشش کرے یا نقب لگائے مار سکتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جو دیوار پر چڑھنے میں یا نقب لگانے میں مشغول ہو وہ لڑ نہیں سکتا۔ اور دیوار کے اوپر بیٹھے ہوئے سپاہی اس کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور اُسے روک سکتے ہیں۔

۹۲؎ **تفسیر**:۔ یہ فقرہ اس کے ایمان کے اظہار کے لئے بیان کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ مومن بڑے سے بڑا کام کر کے بھی متکبر نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے کاموں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام خورس کو بتا دیا تھا کہ ایک دن یہ قومیں پھر جنوب مشرق کی طرف بڑھیں گی اور یہ دیوار بیکار ہو جائے گی۔ کیونکہ دیوار ٹوٹنے سے یہی مراد ہے جس کا ثبوت انبیاء ع کی آیات سے ملتا ہے۔ کیونکہ وہاں صاف لکھا ہے کہ یہ قومیں سمندر کے ذریعہ سے دنیا میں پھیلیں گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیوار ٹوٹنے سے مراد مسلمانوں کی حکومت کا زوال ہو۔

فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝ وَّ

ہوتے ہوئے چھوڑ دینگے اور بگل بجایا جائے گا تب ہم ان (سب) کو بالکل اکٹھا کر دیں گے ۹۳؎ اور

عَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ۝

ہم اس دن جہنم کو کافروں کے بالکل سامنے لے آئیں گے ۹۴؎

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَ

جن کی آنکھیں میرے ذکر (یعنی قرآن کریم) کی طرف سے (غفلت کے) پردہ میں تھیں اور

۹۳؎ تفسیر:- یہاں سے اللہ تعالیٰ کا کلام شروع ہوتا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جب اس وعدہ کا وقت آئے گا جس کا ذکر ذوالقرنین نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان اقوام کو پھر ترقی دے گا اور مختلف اقوامِ عالم آپس میں لڑیں گی اور شمالی اور مغربی اقوام، جنوبی اور مشرقی اقوام سے مل جائیں گی اور اللہ تعالیٰ سب دنیا کو جمع کر دے گا۔ یعنی وہ ایسا زمانہ ہوگا کہ سفر آسان ہوں گے اور ساری دنیا ایک ملک کی طرح ہو جائیگی چنانچہ موجود زمانہ ایسا ہی ہے۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ یاجوج وماجوج کے پھیلنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ حَتّٰىٓ اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ (انبیاء ع) یعنی جب یاجوج ماجوج کی روک کو ہم دور کر دیں گے اور وہ سمندر کی لہروں پر سے تیزی سے سفر کرتے ہوئے سب دنیا میں پھیل جائیں گے اس کے بعد ہمارا وعدہ ان کی تباہی کے متعلق پورا ہوگا اور عذاب آئے گا تب وہ حیران ہو کر کہیں گے کہ ہمیں تو اس عذاب کا خیال تک نہ تھا اور ہم تو دنیا پر ظلم کرتے رہے۔ اب ہماری تباہی میں کیا شک ہے۔ اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یاجوجُ ماجوج مشرق کی طرف کسی دیوار کے رخنہ میں سے نہیں بلکہ سمندر کے راستہ سے آئینگے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا سمندروں پر قبضہ ہوگا۔ اور سب دنیا کے سمندروں پر ان کے جہاز چلیں گے۔ کیونکہ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ کے الفاظ آیت میں استعمال ہوئے ہیں جن کے معنے ہیں کہ سمندر کی سب لہروں پر سے وہ آئیں گے۔ نیز اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کے یہ سفر بڑی جلدی سے طے ہوں گے۔ اس سے دخانی جہازوں کی ایجاد کی طرف اشارہ ہے چنانچہ دیکھ لو یہ پیشگوئی کس طرح حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ سمندر ہی کے ذریعہ سے یہ اقوام مشرق میں پھیلیں۔ اور سمندری سفر جس طرح ان کے زمانہ میں جلدی طے ہونے لگا ہے اس کی نظیر پہلے نہیں ملتی۔

۹۴؎ تفسیر:- وہ دن جہنم کے سے ہوں گے ایک دوسرے سے دشمنی بڑھ جائے گی اور ملک ملک پر غلبہ پانے کی کوشش کرے گا اور یہ بھی مراد ہے کہ یہ اقوام سخت بے دین ہوں گی اور اللہ تعالیٰ سے غافل اور ایسے کام کریں گی جو انسان کو جہنم کا مستحق بنا دیتے ہیں۔

كَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ

وہ سننے کی طاقت (بھی) نہیں رکھتے تھے۔ ۹۵ (تو) کیا (یہ سب کچھ دیکھکر) پھر (بھی) وہ لوگ

كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ

جنہوں نے کفر (کا طریق) اختیار کیا ہے (یہ) سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو مددگار بنا سکیں گے ہم نے

۹۵ تفسیر:۔ اس میں بتایا ہے کہ عبادت اس قوم سے بالکل اٹھ جائے گی اور یا تو شروع زمانہ ترقی میں خدا تعالیٰ کے لئے انہوں نے بڑی بڑی تکالیف اٹھائی تھیں اور یا اس زمانہ میں یہ حال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا نام مٹ جائے گا اور یہ لوگ ہر کام کو اپنے کمال کی طرف منسوب کریں گے۔

وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا میں بتایا ہے کہ اس قدر زنگ دل پر لگ جائے گا کہ خدا کا کلام سننے کی طاقت اور رغبت بالکل دلوں سے جاتی رہے گی۔ چنانچہ اس وقت مغربی اقوام کا یہی حال ہے خدا کے نئے کلام کا سننا تو الگ بات ہے۔ وہ اس کلام کی بھی دھجیاں اڑا رہے ہیں جس کو ظاہر میں تسلیم کرتے ہیں اور آئے دن ان میں کتب لکھی جاتی ہیں۔ جن میں کبھی تو حضرت مسیح ؑ کو ایک خیالی وجود ثابت کیا جاتا ہے۔ کبھی بائیبل پر جرح کر کے اسے انسانی کلام ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

رکوع پر اجمالی نظر اوپر کی آیات میں مسیحی اقوام کی آخری زمانہ کی ترقی اور دنیا میں پھیل جانے اور دین سے بے پرواہ ہو جانے اور خدا تعالیٰ کو بھول جانے کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اس ترقی کے بعد اللہ تعالیٰ غیب سے سامان پیدا کرے گا اور ان کی ترقی تنزل سے بدل جائے گی۔ تب مایوس ہو کر موسیٰ ؑ کے کشف کے مطابق ان کو دین کی طرف توجہ ہوگی اور وہ اپنی غلطی کو محسوس کر کے پھر مجمع البحرین کی طرف لوٹیں گے اور اسلام کی طرف رجوع کریں گے۔

میں اس جگہ یاجوج و ماجوج کے انجام کے متعلق جو پیشگوئیاں بائبل میں ہیں انکو بھی لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

مکاشفات ۲۰ میں لکھا ہے کہ "جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائیگا۔ اور ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہونگی یعنی یاجوج ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کیلئے جمع کرنے کو نکلیگا۔" یہاں پر ہزار برس سے مراد سنہ ہجری کے ہزار برس ہیں یعنی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار سال بعد شیطان اپنی قید سے چھوٹے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ۱۶۱۱ء میں ہندوستان میں مغربی اقوام کے قدم جم گئے اور یاجوج کی ترقی کا زمانہ شروع ہوا۔

حزقیل باب ۳۸ و ۳۹ اور مکاشفات کو ملا کر پڑھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی ترقی تو سولھویں صدی میں شروع ہوگی (مکاشفات) اور تمام دنیا پر غالب ہو جانا اور تمام ملکوں پر چھا جانا آخری دنوں میں ہوگا (حزقیل ب ۳۸ - ۱۶)

میں اوپر اشارہ کر آیا ہوں کہ ذوالقرنین کے حالات کے مشابہ حالات آخری زمانہ میں بھی ایک مثیل ذوالقرنین کے لئے مقدر ہیں اور اس واقعہ کو قرآن کریم میں بطور پیشگوئی بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس تفصیلات کے لئے دیکھو بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی کتاب (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۹۰ تا ۹۷ طبع اول)

اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ○ قُلْ هَلْ

(تو) کافروں کی ضیافت کے لئے جہنم کو تیار کر رکھا ہے ۹۶ تو (انہیں) کہہ (کہ) کیا

نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ○ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ

ہم تمہیں ان لوگوں سے آگاہ کریں جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھاٹا پانے والے ہیں (یہ وہ لوگ ہیں) جن کی (تمام تر) کوشش

سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ

اس ورلی زندگی میں ہی غائب ہو گئی ہے۔ اور (اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی) سمجھتے ہیں کہ وہ

يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ

اچھا کام کر رہے ہیں ۹۷ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے نشانوں کا

رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ

اور اس سے ملنے کا انکار کر دیا ہے اس لئے ان کے (تمام) اعمال گر کر (اسی دنیا میں) رہ گئے ہیں۔ چنانچہ

لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ○ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ

قیامت کے دن ہم انہیں کچھ بھی وقعت نہیں دینگے۔ ۹۸ یہ ان کا بدلہ یعنی جہنم اس وجہ سے ہوگا

بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ○ اِنَّ

کہ انہوں نے کفر (کا طریق) اختیار کیا اور میرے نشانوں اور میرے رسولوں کو (اپنی) ہنسی کا نشانہ بنا لیا ۹۹ جو

۹۶ حل لغات۔ نُزُلًا: النزل: مَا هُيِّئَ لِلضَّيْفِ (مہمانی) (اقرب)

تفسیر: یہ اُن ہی لوگوں کا ذکر ہے جو حضرت مسیح ؑ کو نجات دہندہ اور خدا کا بیٹا مانتے ہیں جن کا ابتدائے سورۃ میں ذکر آیا تھا۔ اور اس آیت سے ظاہر ہو گیا کہ اوپر کی آیات میں مسیحیوں کا ہی ذکر تھا نہ کہ کسی اور قوم کا۔

۹۷ حل لغات۔ صُنْعًا: الصنع کے معنے ہیں۔ العملُ۔ کام۔ الاحسان۔ احسان۔ اِيْجَادُ شَيْءٍ مَسْبُوْقٍ بِالْعَدَمِ۔ غیر موجود چیز کی ایجاد کی (اقرب)

تفسیر: یعنی دنیا کو نفع پہنچانے کے لئے ایجادات کرنا ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں دین کی طرف توجہ نہیں۔ بلکہ اُسے فضول سمجھتے ہیں۔

۹۸ تفسیر: یعنی ان کی بنائی ہوئی چیزوں کا نام و نشان باقی نہ رہے گا اور ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔ کیونکہ ان کے تمام اعمال دنیا کے لئے تھے نہ کہ آخرت کے لئے۔

۹۹ تفسیر: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ۔ یعنی ان کے کاموں کا اخروی بدلہ نہ ملنا کوئی سزا نہیں بلکہ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ

لوگ ایمان لاتے ہیں اور انہوں نے نیک (اور مناسبِ حال) عمل کئے ہیں ان کا ٹھکانا یقیناً

جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ

فردوس کے بہشت ہوں گے (وہ) ان (ہی) میں رہا کریں گے (اور) ان سے

عَنْهَا حِوَلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ

الگ ہونا نہیں چاہیں گے [۱۰۰] تو (انہیں) کہہ (کہ) اگر (ہر ایک) سمندر میرے رب کی باتوں (کے لکھنے) کیلئے روشنائی

رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ

بن جاتا تو میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے (ہر ایک) سمندر (کا پانی) ختم ہو جاتا۔ گو (اسے) زیادہ کرنے

لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

کے لئے ہم اتنا (ہی) اور (پانی سمندر میں) لا ڈالتے [۱۰۱] تو (انہیں) کہہ (کہ) میں صرف تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں

ان کی مناسب جزاء ہے۔ جب وہ خدا تعالیٰ کی خاطر کوئی کام نہ کرتے تھے تو اخروی جزاء یا دینی بدلہ کی امید انہیں کس طرح ہو سکتی ہے۔

جھنم، جزاؤھم کا عطف بیان ہے اور مراد یہ ہے کہ جزاء سے ہماری مراد جہنم ہے اور یہ جزاء ان کے کفر اور اللہ تعالیٰ کے نشانات اور اس کے رسولوں سے ہنسی ٹھٹھے کی وجہ سے ہوگی یعنی ان قوموں کی نگاہ میں الٰہی کلام اور اس کے رسولوں کی کوئی عزت نہ ہوگی ایک انسان کو خدا بنا کر سب نبیوں پر ہنسی اور تمسخر کریں گے چنانچہ دیکھو کہ مسیحی لوگ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کی وجہ سے سب انبیاء کی سخت ہتک کرتے ہیں اور ان کے وجود کو لغو اور فضول قرار دیتے ہیں اور شریعت کو لعنت بتاتے ہیں۔

[۱۰۰] حل لغات۔ فِرْدَوْس: کے معنے ہیں الجنّة التی تبنت ضروبًا من النّبت۔ وہ باغ جو کئی قسم کی نباتات اُگاتا ہے۔ البستان یجمع کلّ ما یجمع فی البساتین۔ وہ باغ جس میں تمام وہ اشیاء ہوں جو باغوں میں ہو سکتی ہیں۔ (اقرب)

حِوَلًا: الحول: الزوال والانتقال۔ علیحدہ ہونا۔ الگ ہونا (اقرب) پس لا یبغون عنها حِوَلًا کے معنے ہوں گے۔ کہ وہ اس سے علیحدہ ہونا نہیں چاہیں گے۔

تفسیر:۔ جب ان پر عذاب آئے گا تو مومنوں کی ترقی کا وقت شروع ہوگا اور ان کے صبر کا بدلہ ان کو مل جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے دین کے لئے قربانیوں میں ان کو ایسی لذت محسوس ہوگی کہ باوجود مال اور جان کی قربانیوں کے وہ اپنی حالت کو بدلنا پسند نہ کریں گے بلکہ اس "ٹوٹی ہوئی سفینہ" میں ہی سفر کرنے میں ساری لذت محسوس کریں گے اور اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

[۱۰۱] حل لغات۔ مِدَادًا: کے معنے ہیں المفنس۔ سیاہی۔ روشنائی (اقرب)

يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنۡ كَانَ

(فرق صرف یہ ہے کہ) میری طرف یہ (وحی نازل) کیجاتی ہے۔ کہ تمہارا معبود ایک ہی (حقیقی) معبود ہے۔ پس جو شخص

يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا

اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ نیک (اور مناسب حال) کام کرے اور اپنے

يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۠

رب کی عبادت میں کسی کو (بھی) شریک نہ کرے ۱۱۰؎

تفسیر:۔ یعنی وہ لوگ دعوے کرتے ہیں کہ ہم نے یہ یہ ایجادات کی ہیں اور اتنے علوم دریافت کئے ہیں اور کائنات کا راز دریافت کرنے کے قریب ہیں فرماتا ہے۔ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تو ان سے کہہ دے (یعنی اس زمانہ کے محمد رسول اللہ صلعم کے اتباع ان سے یوں کہدیں) کہ تمہارا راز کائنات کو دریافت کرنے کی کوشش کرنا ہمیشہ روز اول ہی رہیگا اور باوجود اس قدر کوششوں کے تم کولھو کے بیل کی طرح وہیں کے وہیں کھڑے رہو گے اور وہ قوتیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں پیدا کی ہیں۔ ان میں سے اس قدر بھی دریافت نہ کرسکو گے کہ جس قدر سمندر کے مقابل پر ایک قطرہ کی حیثیت ہوتی ہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ تصانیف کا زمانہ ہوگا اور یہ قومیں سائنس پر کثرت سے کتابیں لکھیں گی۔

۱۱۰؎ تفسیر:۔ ان سب پیشگوئیوں اور علوم غیبیہ کے بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ان سے کہہ دے کہ میں تو اس قدر علوم سماویہ کے بتانے کے بعد بھی نہیں کہتا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں یا خدائی صفات میرے اندر ہیں۔ میں تو صرف ایک بشر ہوں جس کی ساری خوبی یہ ہے کہ اس پر اس کے رب نے اپنا کلام نازل فرمایا ہے پس اگر تم بھی ان انعامات کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو آؤ میری طرح موحد ہو جاؤ۔ اور اللہ تعالےٰ کے احکام کے مطابق عمل کرو۔ اور شرک چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ اللہ تعالےٰ کس طرح تم پر فضل کرتا ہے اور غیب کے خزانے تمہارے لئے کھولتا ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کہف کی آخری دس آیات پڑھتا ہے دجّال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ دجّال اور یاجوج ماجوج سے مراد مسیحی فتنہ ہے۔ کیونکہ ان آیات میں اسی قوم کا ذکر ہے۔ جیسا کہ ہر انسان جو ان آیتوں کو سمجھ کر پڑھے معلوم کرسکتا ہے ؞

تَمَّتۡ بِالۡخَيۡر

۱۲ ع ۳

کلیدِ مضامین

مرتبہ
سیّد عبدالحی

اشاریہ

کلیدِ مضامین

جلد چہارم

آ

صداقت

تعلیم

اشاعت

غلبہ کی پیشگوئیاں

ب

تعلیم

○

○

چ

ح

جلد ہذا میں مذکور احادیث

ڈ

ذ

شیطان کی حقیقت

○

○

متفرق

غ

غداری

غذا

ف

○

○

صداقت

فضائل

○

نسخ

قرآنی تعلیمات

ک

کافر/کفار

کامیابی

کائنات

کتاب نیز دیکھئے قرآنِ کریم اور کلامِ الٰہی

ضرورت

نبی کب آتا ہے

خصائص

صفات

یہود کی دو تباہیاں

یہود کے ملعون ہونیکی وجوہات

یہود اور اسلام

یہود کے متعلق پیشگوئیاں

یہود کی سازشیں

اسماء

جلد چہارم

آ

ا

ج

چ

ح

☆

☆

مقام

نزول ملائکہ

مقامات

جلد چہارم

☆

☆

ز

س

ش

ط

ع

☆

حَلّ اللّغات

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفاسیر

تفسیر ابن جریر ۲۸۱، ۲۸۴، ۲۸۹
تفسیر ابن کثیر ۲۹، ۴۲، ۳۶، ۹۷، ۱۱۶، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۳
تفسیر بحر محیط ۵۱، ۸۰، ۲۹۰، ۱۷۰، ۴۰۴، ۴۲۰
تفسیر بیضاوی ۴۴۹
تفسیر درمنثور ۲۹، ۳۸، ۲۴۲، ۲۹۱، ۲۹۳، ۴۰۳، ۴۰۵، ۴۱۹، ۴۴۲
تفسیر روح المعانی ۲۴۲، ۳۴۹، ۳۹۲، ۴۱۹
تفسیر فتح البیان ۳۸، ۲۴۲، ۳۶۸، ۳۹۸، ۴۲۰
تفسیر قرطبی ۳۸
تفسیر کشاف ۹۷، ۲۴۲
القنوی علی البیضاوی ۴۴۹

COMMENTARY ON THE HOLY QURAN
RVD WHERRY ۱۱۹، ۴۹۱

حدیث

جامع صحیح بخاری ۶، ۳۷، ۴۲، ۶۶، ۱۰۴، ۱۱۴، ۲۸۱، ۲۸۴، ۲۸۸، ۴۰۳
فتح الباری شرح بخاری ۲۶۵
صحیح مسلم ۱۲۷، ۲۸۱، ۲۸۸، ۳۷۴
صحیح ترمذی ۲۶۷
سنن ابی داؤد ۲۶۱، ۳۲۳
ابن ماجہ ۲۶۱
مشکوۃ المصابیح ۳۱، ۲۵۱
مسند احمد بن حنبل ۶۸، ۷۵، ۱۶۱، ۲۱۵، ۲۳۵، ۲۸۸، ۳۱۵، ۳۰۹
دیلمی ۲۷۳
مجمع البحار ۳۷، ۵۲
طبرانی ۲۸۸

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام و خلفاء سلسلہ

براہین احمدیہ ۵۰۸
سیر روحانی از حضرت مصلح موعودؓ ۶۶

تاریخ و سیرت

تاریخ طبری ۱۶۹
سیرت ابن ہشام ۲۰۴، ۲۹۳
الخصائص الکبریٰ ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۴
زاد المعاد ۲۹۳
زرقانی شرح مواہب اللدنیہ ۲۸۲، ۲۸۳، ۳۰۶

سیرت عمر مصنفہ عبد الرحمٰن ۱۰۰

LIFE OF MUHAMMAD

BY SIR W. MUIR ۴۴۴،۴۰۹،۱۹

HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD

۴۹۹،۴۹۰،۴۹۶،۳۰۵

THE DECLINE & FALL OF ROMAN EMPIRE

"رومی حکومت کا انحطاط و زوال" گبن ۴۱۹

سٹوری آف روم مصنفہ نارووڈنگ

STORY OF ROME ۴۲۴

THE CATACOMBS AT ROME

BY BEJIMAN SCOTT ۴۲۵،۴۲۲

THE CRUCIFIXION BY AN EYE WITNESS

۴۱۴

اسلامیات

ارض القرآن سید سلیمان ندوی ۱۰۱

تعطیر الانام ۴۸۲،۴۶۹،۴۰۵،۴۰۲،۳۴۸،۲۹۴

۴۱۴

کتب اہل کتاب

بائیبل (عہد نامہ قدیم و جدید)

شبات طالمود ۵۹

THE DAILY BIBLE ILLUSTRATIONS

BY DR. KITTO ۴۴۱

THE TEXT & CANNON OF THE NEW TESTAMENT

BY DR. ALEXENDER SOOTER ۲۵۱

ادب و نحو

مغنی اللبیب ۳۵۹

درۃ الغواص ۴۴۹

اساس

متفرق

پتنجلی کا یوگ شاستر ۲۸۴

ینابیع الاسلام ۲۴

MARCH OF MAN
PUBLISHED BY ENCYCLOPAEDIA
BRITANICA SOCIETY LONDON ۴۲۵

GOLD MINES OF MADIAN

BY BRITON ۱۰۱

لغات و انسائیکلوپیڈیا

اقرب الموارد ۷،۱۰،۱۱،۶

تاج العروس ۲۴۴،۱۱۴،۵۹،۵۱،۲۹

المفردات فی غریب القرآن لامام راغب الاصفہانی ۸۹،۱۰

فقہ اللغۃ ابو منصور ثعالبی ۷۳

القاموس العصری ۱۰

ENCYCLOPAEDIA BRITANICA
انسائیکلوپیڈیا برٹینکا

۴۲۹،۴۲۳،۴۲۲،۳۸۴،۳۹۰،۵۹،۱۶

۵۰۲،۵۰۰،۴۹۹،۴۴۰

ENCYCLOPAEDIA BIBLICA

انسائیکلوپیڈیا ببلیکا ۴۲۲،۲۸۲،۵۹

JEWISH ENCYCLOPAEDIA جیوش انسائیکلوپیڈیا

۵۰۲،۴۹۹،۴۹۸،۲۸۲،۵۹